

# فاتح البرص

الماس ایم اے





## عرض ناشر

الماس ایم اے کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں وہ تاریخ ناول نگاری کی ایک معروف شخصیت ہیں امیر تیمور بغداد جلتا راجپوت سفینے نور جہاں نفیسہ کافرہ حسینہ جاوا وغیرہ ان کے مشہور ناول ہیں اس بار انہوں نے ایک بالکل نئے موضوع پر قلم اٹھایا ہے یعنی فتح الرہا۔

الرہا (اڈیسہ) جو مشرق وسطیٰ کے شمالی علاقہ میں بارہویں صدی عیسوی کی ایک مضبوط عیسائی ریاست تھی چنانچہ موصل کے حکمران عماد الدین زنگی نے الرہا پر قبضہ کر لیا وہاں کی دوسری عیسائی ریاستوں انطاکیہ، پروٹم، طرابلس کے لئے یہ ایک ناقابل اعتبار حادثہ تھا لیکن اس مرد میدان نے اپنی دیگر فتوحات سے یہ بات ثابت کر دی کہ یہ حادثہ نہیں بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جس نے اس فتح کے بعد مسلمانوں پر مشرق وسطیٰ میں فتوحات کے لئے نئے باب کھول دئے یہاں تک کہ اس سلسلہ میں نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی نے نہ صرف پورے مشرق وسطیٰ کو زیر نگین کیا بلکہ عیسائیوں سے ایک بار پھر بیت المقدس واپس لے لیا نہایت فصیح اور بامحاورہ زبان میں ایک خوبصورت ناول۔

محمد علی قریشی

## آواز شکست

عربوں نے پھر عباسی خلافت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ عباسی خلیفہ مقسم باللہ نے ترکوں کا لشکر تیار کر کے عربوں کو حکومت کے بڑے بڑے عہدوں سے بے دخل کر دیا تھا۔ اس وقت سے ترکوں اور عربوں میں اختلاف کی ایسی خلیج پیدا ہوئی جو کبھی نہ بھر سکی۔ ترک برابر ترقی کر رہے تھے اور عرب سردار پس منظر میں چلے گئے تھے۔ حکومت کے ان دونوں دھڑوں میں اکثر جھڑپیں ہوتیں لیکن عباسی خلیفوں کی حمایت کی وجہ سے ترک ہمیشہ کامیاب ہوتے تھے۔

۸۱۳ء میں قبیلہ اسد کے مشہور امیر دبیس بن صدقہ کی سرکردگی میں عربوں نے علم بغاوت بلند کیا۔ یہ خلیفہ مسترشد کا دور خلافت تھا۔ عباسی خلافت دم توڑ رہی تھی لیکن مسترشد نے اسے کچھ سارا دیا تھا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ دبیس بن صدقہ، مدائن کو تباہ کرتا ہوا بغداد کی طرف بڑھ رہا ہے تو شیر کی طرح دھاڑتا ہوا مسند خلافت سے اٹھا۔ اس نے اپنے ترکی محافظ دستے کو تیاری کا حکم دیا۔ فوجوں کو ترتیب دے کر کمان خود سنبھالی، خلافت کا سیاہ جبہ پہنا اور عمامہ باندھا۔ حضور پاکؐ کا چوغہ زیب دوش کیا اور عصائے مبارک ہاتھ میں لے کر نکلا۔ خلیفہ کے گھوڑے پر خاص نگہبرہ پڑا ہوا تھا۔ دجلہ کے ساحل پر موصل کا حکمران البرستی، بصرہ کا حاکم عماد الدین زنگی، قذوۃ العلماء قاضی القضاۃ اور دیگر تمام مجاہدین اور عمائدین سلطنت اس کے استقبال کو موجود تھے۔ سب نے زمیں بوس ہو کر تعظیم پیش کی۔ وفاداری کا حلف اٹھایا اور دشمن سے مقابلہ کو روانہ ہوئے۔

تھا۔ اس نے اس جنگ میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن زنگی کی بات سن کر وہ ہنس کر بولا۔  
”جناب والا اگر اجازت ہو تو ترکمانوں کی ایک کماوت بیان کروں۔“

زنگی نے اس کے ہنسنے پر منہ بنایا مگر نرمی سے پوچھا۔ ”علی! اگر کوئی مقتول بات کہنا چاہتے ہو تو ضرور کہو لیکن یہ خیال رہے کہ یہ مسئلہ بہت اہم ہے۔“

”جناب مجھے اس بات کی اہمیت کا پورا احساس ہے۔“ زین الدین نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”جو بات آپ نے آج کہی ہے یہ بات ایک خلش بن کر نہ معلوم کب سے ہمارے دلوں میں چھب رہی ہے۔ میں دراصل اپنے آپ پر ہنس رہا تھا۔“

”مگر وہ کماوت تو بیان کر دو۔ زنگی نے دل چسپی سے کہا۔“

”جناب ترکمانوں کی مشہور اور مقبول کماوت یہ ہے کہ اگر اپنے سر پر پتھر رکھنا ہی پڑے تو سب سے بلند پہاڑ سے کاٹ کے رکھنا چاہئے۔“ زین الدین علی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”یہ کماوت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ اگر ہمیں کسی نہ کسی کی خدمت کرنا ہی ہے تو پھر ہم سلطان محمود سلجوقی کی خدمت کیوں نہ کریں۔“

”علی!“ زنگی نے آگے بڑھ کر زین الدین کو گلے لگا لیا۔ ”تم نے کماوت نہیں بلکہ ایک عالمگیر حقیقت بیان کی ہے۔ والئی موصل امیر برستی بھی تو سلطان محمود کا خدمت گزار ہے پھر میں امیر برستی کی بجائے براہ راست اور بلا واسطہ سلطان محمود کی خدمت میں کیوں نہ حاضری دوں؟“

عماد الدین زنگی کو زین الدین کی یہ تجویز اس قدر پسند آئی کہ وہ بصرہ کو چھوڑ چھاڑ اپنے ساتھیوں کو لے کر دوسرے ہی دن ہمدان روانہ ہو گیا۔

یہ وہ وقت تھا کہ عباسی خلیفہوں کی حکومت بغداد کی سرحدوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ خلافت عباسیہ کے باقی علاقے خود مختار امیروں اور سرداروں کے زیر حکومت پہنچ گئے تھے۔ ان میں جو سب سے زیادہ طاقتور ہوتا وہ خلیفہ بغداد سے اپنی بادشاہت کا پروانہ حاصل کر لیتا اور اس کا نام خطبے میں خلیفہ کے ساتھ شامل ہو جاتا۔ خلیفہ کی حیثیت سیاسی کی بجائے مذہبی ہو کر رہ گئی تھی۔ اس وقت خاندان سلاجقہ کا زور تھا اور سلطان محمود سلجوقی نے اپنا دار السلطنت ہمدان بنایا تھا۔ سلطان کی طرف سے ایک سلجوقی سردار مجاہد الدین ہرود خلیفہ کے دربار میں وائسرائے کے فرائض انجام دیتا تھا جسے شہنشاہ یا کوتوال بغداد کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

عماد الدین زنگی دربار سلطانی میں پیش ہوا تو سلطان محمود سلجوقی نے اس کی بہت آؤ بھگت کی۔ زنگی کے باپ آق منقو نے سلجوقی سلطانوں کی بڑی خدمت کی تھی۔ آق سقر کو

دہیں بن صدقہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ دجلہ اور فرات کو ملانے والی سرنیل کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ خلیفہ نے بھی اس کے سامنے پڑاؤ ڈالا اور دونوں طرف جنگی تیاریاں ہونے لگیں۔ دوسرے دن طبل جنگ پر چوٹ پڑی اور خونریز لڑائی چمک گئی۔ دہیں کے ساتھ دس ہزار سوار اور بارہ ہزار پیدل تھے۔ اس کے مقابلے میں خلیفہ کے زیر کمان صرف آٹھ ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادے تھے مگر لڑائی اس شدت کی تھی کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ خلیفہ اپنے جانباز گروہ کے ساتھ مورچوں کے پیچھے گھوڑے پر سوار لڑائی کا نظارہ کر رہا تھا۔ حفاظ اور علماء کلام پاک کھولے اس کے سامنے موجود تھے۔

یہاں کا تو یہ حال تھا ادھر بغداد کی تمام مسجدیں مسلمانوں سے بھری تھیں۔ لوگ قرآن شریف پڑھتے اور سجدے میں گر کر خلیفہ کی سلامتی کی دعا مانگتے تھے۔ کتے ہیں جنگ کے دن بغداد کی مسجدوں اور عوام کے گھروں میں کئی ہزار قرآن شریف ختم کیے گئے۔

خلیفہ کے خیمے پر عماد الدین زنگی تھا۔ دہیں کے ایک عرب سردار عطار نے اپنے بدوی سواروں کے ساتھ زنگی پر ایک زبردست حملہ کیا۔ زنگی نے اس طوفانی حملے کو تو روک لیا۔ لیکن اس کے دستوں کو چند قدم پیچھے ہٹنا پڑا۔ عطار سمجھا کہ میدان مار لیا۔ اس نے بدوؤں کو حوصلہ دے کر دوسرا حملہ کر دیا لیکن زنگی اس وقت تک سنبھل چکا تھا۔ اس نے فوراً جوابی حملہ کر دیا اور عطار کو ڈھکیلا ہوا سرنیل تک لے گیا۔ اس وقت اس کی مدد کو برستی بھی پہنچ گیا۔ زنگی اور برستی نے مل کر دہیں کے لشکر کو سر میں ڈھیل دیا۔ دہیں یہ دیکھ کر میدان چھوڑ بھاگا۔ اس کے ہزاروں سوار قتل ہوئے اور بیگناہ فاتحین کے ہاتھ آئیں اور فتح کا سرا موصل کے حاکم البرستی کے سر ہندھا حالانکہ اس کا حقدار عماد الدین زنگی تھا۔

سرنیل کی جنگ میں کارہائے نمایاں انجام دینے کے باوجود جب عماد الدین زنگی کو کوئی اعزاز حاصل نہ ہوا تو وہ دل برداشتہ ہو گیا۔ بصرہ واپس پہنچ کر اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کیا اور بڑی بے دلی سے کہا۔ ”دوستو! تم دیکھ رہے ہو کہ ہماری جاں نثاری اور وفاداری کو کس طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے کہنے کو تو میں بصرہ کا حاکم ہوں مگر حکم چلتا ہے امیر موصل کا اور موصل کے امیر آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیں جہاں چاہتے ہیں بھیج دیتے ہیں اور جس جنگ میں چاہیں جھوٹک دیتے ہیں۔ کیا ہم بہادر نہیں ہیں اگر ہم بہادر ہیں تو ہمیں بہادری کا صلہ کیوں نہیں ملتا؟“

اس مجمع میں زنگی کے بیشتر سردار تھے جنہوں نے سرنیل کی جنگ میں بہادری کے جوہر دکھائے تھے۔ انہیں بھی اس بات پر بہت غصہ تھا کہ جنگ تو انہوں نے جیتی اور نام امیر موصل برستی کا ہوا۔ زنگی کا معتد اور منہ چڑھا سردار زین الدین علی بھی وہاں موجود



دربار میں ندیم خاص کا عمدہ دیا گیا تھا اور اس نے سلجوقی سلطان برکیارق پر اپنی جان نثار کر دی تھی۔ سلطان محمود نے زنگی کو وہی عمدہ دیا اور زنگی تخت سلطانی کے دائیں طرف کھڑا ہونے لگا۔ دربار میں یہ سب سے بڑا اعزاز تھا۔ زنگی اور اس کے ساتھی سلطان کی اس فی اور اس نے پچھاڑیں کھانا شروع کر دیں۔ کندوغی کا جنازہ اٹھنے تک اسے کئی بار غش عزت افزائی سے بہت خوش ہوئے لیکن ان کی یہ خوشی چند ہی دنوں بعد غم میں بدل گئی۔ سلطان کو اس کی حالت پر بڑا ترس آیا۔ وہ قبرستان تک جنازے کے ساتھ گیا اور عماد الدین زنگی کا خیال تھا کہ ندیم خاص کے اعزاز کے ساتھ اسے انعام و اکرام اور پیسے پر کندوغی کے گھر گیا بیوہ اس وقت تک بے ہوش پڑی تھی۔ سلطان نے فوراً اپنا ماہانہ مشاہرہ سے بھی نوازا جائے گا، لیکن اسے جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ اعزاز محض عزت سبب طلب کیا۔ بڑی مشکل سے غم زدہ عورت کو ہوش آیا۔

افزائی ہے۔ اس کے لئے نہ تنخواہ ہے اور نہ ہی انعام و اکرام۔ کچھ عرصے تک زنگی اور اس کے ساتھی اس رقم سے گزر بسر کرتے رہے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے لیکن وہ رقم کسی کا دخل نہیں لیکن ہم یقین دلاتے ہیں کہ کندوغی کا تمام مال و دولت تمہارے پاس کب تک ساتھ دیتی۔ ہاتھ خالی ہوئے تو انہیں روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ سب خاموش ہے گا اور جو مراعات کندوغی کو ہماری طرف سے حاصل تھیں وہ تمہیں منتقل ہو جائیں خاموش رہنے لگے۔ شکوہ گلہ کون کرتا اور کس سے کرتا زین الدین علی کی تجویز کی سب نے لی۔

حمایت کی تھی اور سب اپنی خوشی سے زنگی کے ساتھ ہمدان آئے تھے۔ آخر ایک شب زنگی نے خود ہی یہ قصہ چھیڑا۔ اس نے زین الدین علی سے کہا۔ ”یار در ان کا سایہ ہم پر قیامت تک برقرار رہے مگر میں یہ مال و دولت لے کر کیا کروں گی علی۔ تیری تجویز تو بہت اچھی تھی لیکن اس کا اثر کچھ الٹا ہی ہو رہا ہے۔“ علی خود قسمت کو رو رہا تھا۔ چڑ کر بولا۔ ”جناب تجویز تو تجویز ہی ہوتی ہے۔ میں نے نصیب کی شادی سے ایک ماہ پہلے انتقال کر گیا۔ اب تو میں اس دنیا میں بالکل اکیلی کب کہا تھا کہ آپ اس پر ضرور عمل کریں؟“

گھبراؤ نہیں دوست۔“ زنگی نے نرمی سے کہا۔ ”میرا مطلب تو یہ تھا کہ سب سے اونچے پہاڑ کا پتھر سر پر رکھ تو لیا ہے لیکن اس کے وزن سے گردن دھری ہوئی جا رہی ہے۔ میں نے وزن آخر کب کم ہو گا؟“

علی بھی نرم پڑ گیا۔ بولا۔ ”جو حال آپ کا ہے وہی ہم سب کا۔ اب بصرہ تو واپس جانے سے رہے۔ رہا پتھر بھاری ہونے کا سوال تو یہ کسی دن سلطان کے ایک اشارے سے جواہرات کا تاج بن جائے گا۔“

زین الدین علی کے منہ سے ایسے وقت میں بات نکلی تھی کہ اس کے پورے ہونے کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ سلطان محمود کا ایک چیتا امیر کندوغی تھا۔ یہ خوبصورت جوان بیگم سلطان کا ہم بیالہ اور ہم نوالہ تھا۔ اس کا شمار سلطان کے امیر ترین سرداروں میں تھا۔ کندوغی کو تو واپس نہیں لاسکتے لیکن تمہارے غم کا مداوا ضرور کریں گے اور اگر تم نے کبھی کندوغی کی شادی کچھ ہی عرصہ پہلے ہوئی تھی۔ سلطان نے اس شادی میں بہ نفس نفیس نواہش کی تو ہم تمہیں اپنی بہن کی طرح کسی اور امیر کے ساتھ رخصت کر دیں گے۔“

شرکت کی تھی مگر یہ شادی کندوغی کو اس نے آئی اور صرف چھ ماہ بعد قضائے الہی سے اس دن سے کندوغی کی بیوہ نایاب، سلطان کی بہن مشہور ہو گئی۔ نایاب اپنے منہ وفات پا گیا اس کی جوان بیوہ نے رو رو کر قیامت برپا کر دی۔ سلطان نے جس طرح اس کی لے بھائی نعمان کے ساتھ اکثر سلطان کے سلام کو حاضر ہوتی۔ محل میں اس کی شایان شادی میں شرکت کی تھی اسی طرح اس کی تعزیت میں شریک ہوا۔ ان پذیرائی ہوتی۔ نایاب کو دیکھ کر سلطان کو اپنا ندیم یاد آتا اور وہ دیر تک اس سے گفتگو



کرتا رہتا۔ کندوخی کے انتقال سے سلطان کے تفریحی معمولات میں ایک خلا پیدا ہو گیا تھا اسے چوگان کھیلنے کا بہت شوق تھا اور وہ کندوخی کو ہمیشہ اس کھیل میں اپنا ساتھ چتا کرتا، موجود نہ تھا مگر حکم کی تعمیل تو بہر حال کرتا تھی۔ اس نے فوراً چوگان کھوڑوں کو اکٹھا کرنے کے لئے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔

لیکن اب ایک عرصے سے اس نے چوگان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ ایک دن نایاب اور نعمان سلطان سے مل کر واپس گئے تو وہ دیر تک کندوخی اور نایاب حجب کی دوسری پریشانی یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں .... سلطان کی دوسری بات نہ آئی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے اس بات کا افسوس ہوا کہ اس نے اب تک نایاب رخصتی۔ سلطان نے کہا تھا کہ وہ کندوخی کی بیوہ کی زندگی کے لئے یہ کھیل پھر شروع کر رہا ہے کسی اچھے امیر کا انتخاب کیوں نہیں کیا۔ نایاب جوان اور خوبصورت تھی۔ اس کا اپنے کندوخی اور چوگان کا تعلق تو اس کی سمجھ میں آتا تھا کیونکہ چوگان بازی کے ہر موقع پر طرح اکیلے رہتا اور بیوگی کے دن گزارنا کچھ اچھا نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان کو کندوخی سلطان کا ساتھی ہوا کرتا تھا مگر اس کی بیوہ کا اس کھیل سے کیا تعلق ہو سکتا تھا یہ کے ساتھ گزارے ہوئے دن ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ سیر و شکار، چوگان بازی۔ اب اس کی سمجھ میں کسی طرح نہ آ رہی تھی۔ خواتین اس زمانے میں چوگان بازی میں حصہ سلطان نے یہ سب چھوڑ رکھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تمام تفریحات کندوخی نہیں لیتی تھیں۔ اس کھیل کے موقع پر حجب نے کبھی کندوخی کے ساتھ اس کی بیوی کو ساتھ رخصت ہو گئی تھیں۔

سلطان نے کچھ سوچتے ہوئے حجب کو طلب کیا اور اسے حکم دیا۔ ”کل ہم چار قدر پریشان ہوا کہ اس نے اس مسئلے کو سوچنا ہی چھوڑ دیا۔ حجب نے تمام امراء کو بھی سلطان کا حکم پہنچایا۔ امراء سلطان کی طبیعت کے اس کھیلنے جائیں گے۔ چوگان کے جملہ انتظامات کیے جائیں اور امراء کو حاضری کا حکم۔ حجب پر حیران رہ گئے پھر حجب حجب نے یہ بتایا کہ یہ سب کچھ امیر کندوخی کی بیوہ کے لئے کیا جا رہا ہے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہر ایک نے اس مسئلے پر بہت سراما

پارینہ بن چکا تھا۔ چوگان کے تربیت یافتہ گھوڑے دوسرے کاموں میں استعمال کیے جا رہے تھے۔ سلطان محمود سلجوقی محل سے سوار ہو کر چوگان گاہ میں پہنچا کھیل کے میدان میں تھے۔

سلطان نے حجب کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔ ”تم کس سوچ میں پڑ گئے کیا تم چوگان بار کے تمام امیر موجود تھے۔ سب کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آج کی چوگان بازی کا تعلق امیر کندوخی کی بیوہ سے کسی نہ کسی طور ضرور ہے۔ نایاب کی خوبصورتی اور دولت کے واقف نہیں یا ہم چوگان کھیلنا بھول گئے؟“

”عالی جاہ۔“ حجب نے سنبھل کر کہا۔ ”امیر کندوخی کی .... وفات کے موقع پر پورے میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہر امیر اس مالدار بیوہ سے شادی کا خواہش مند تھا۔“ حجب نے سنبھل کر کہا۔ ”امیر کندوخی کی وفات کے موقع پر پورے میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہر امیر اس مالدار بیوہ سے شادی کا خواہش مند تھا۔“ حجب نے سنبھل کر کہا۔ ”امیر کندوخی کی وفات کے موقع پر پورے میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہر امیر اس مالدار بیوہ سے شادی کا خواہش مند تھا۔“ حجب نے سنبھل کر کہا۔

”ہم جس کھیل کو بند کر سکتے ہیں کیا اسے دوبارہ جاری کرنے پر ہم قادر نہیں؟“ حجب نے سنبھل کر کہا۔ ”امیر کندوخی کی وفات کے موقع پر پورے میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہر امیر اس مالدار بیوہ سے شادی کا خواہش مند تھا۔“ حجب نے سنبھل کر کہا۔ ”امیر کندوخی کی وفات کے موقع پر پورے میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ ہر امیر اس مالدار بیوہ سے شادی کا خواہش مند تھا۔“ حجب نے سنبھل کر کہا۔

سلطان کھیلنے کے لئے تیار ہوا۔ جب ساتھی چنے کا وقت آیا تو اس نے تمام امیروں پر حجب پریشان ہو کر سلطان کے سامنے سے چلا آیا۔ اس نے باہر آکر فوراً سلطان کے سامنے نظر ڈالی۔ امیروں کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں کہ دیکھیں یہ اعزاز کس کو حاصل ہو گا۔ سلطان کے حکم سے آگاہ کیا۔ داروغہ اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ چوگان میدان میں موجود تمام امیر اپنی وفاداری اور شجاعت کے لئے مشہور تھے۔ ہر ایک کو گھوڑے .... اسٹبل کے ایک خاص حصے میں رکھے جاتے تھے اور اب وہاں کوئی امکان تھا کہ سلطان اسے ساتھی منتخب کرے گا لیکن سلطان کی نظریں سب طرف سے



گھوم کر عماد الدین زنگی پر آکر رک گئیں تمام امیروں کی نظریں سلطان پر لگی تھیں معلوم کس طرح بسر کر رہا ہوگا۔

عماد الدین زنگی جو سلطان کے ساتھ ہی محل سے آیا تھا، ایک طرف نظریں جھکائے، سلطان محمود کے امیر اس لعن طعن بھری تقریر سے شرم کے مارے پانی پانی ہو گئے۔ چاہ کھڑا تھا۔ آخر سلطان نے ساتھی کا فیصلہ کر دیا۔ اس نے گھوڑا عماد الدین زنگی انہوں نے زنگی کی طرف سے تعاقب برتا تھا یہ اس وقت کی ایک معاشرتی غلطی تھی۔ طرف بدھاتے ہوئے کہا۔ ”زنگی۔ آج کی چوگان بازی کے تم ساتھی ہو۔“

سلطان کے تمام امیروں پر اوس پڑ گئی۔ انہیں سلطان کے اس فیصلے پر برا غصہ آتا تھا پھر وہ ایک نئے شخص کو کس طرح سارا دیتے۔ ان کے خیال میں دوسرے کا ہاتھ دل ہی دل میں چیخ تاب کھا کر رہ گئے۔ پرانے امیروں کی موجودگی میں ایک نئے آپس کے کامطلب اپنے پیروں میں کھلاڑی مارنا تھا۔

انتخاب جو ابھی پوری طرح امیر بھی نہ بنا تھا، ان کے خیال میں کسی طرح مناسب، سلطان کے ایک امیر نے فحالت سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ ”عالی جاہ! ہم نے واقعی لیکن کسی کو مخالفت کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ ایک دوسرے کا اس طرح منہ دیکھنے غلطی کی ہے۔ دراصل ہم عماد الدین زنگی کی شخصیت کو سمجھ نہ سکے تھے۔ ہمیں زنگی کی جیسے کہ رہے ہوں کہ تم اعتراض کو مگر ملی کے گلے میں کھنٹی کون باندھے سب منہ خدمت کا موقع دیا جائے تاکہ ہم اپنے قصور کا ازالہ کر سکیں۔“

ہی رہ گئے اور چوگان کا کھیل شروع ہو گیا۔ سلطان کے جلال میں کمی آگئی۔ وہ نرمی سے بولا۔ ”ہمیں تمہاری بات سے خوشی ہوئی

کھیل کے اختتام پر سلطان نے تمام امیروں کو اپنے قریب بلایا۔ عماد الدین زنگی امیر۔ ہم تمہیں یہ موقع ضرور دیں گے۔ سنو ہم نے طے کیا ہے کہ ہم امیر کندوخی کی بیوہ طرح دربار میں سلطان کے تخت کے دائیں طرف کھڑا ہوتا تھا اسی طرح یہاں بھی کھڑا اور اپنی منہ بولی بہن نایاب خانم کی شادی عماد الدین زنگی سے کریں اور تم لوگ نایاب کی وہ آج دل میں بہت خوش تھا۔ سلطان نے اسے کوئی انعام تو نہیں دیا تھا لیکن اس شادی کے تمام اخراجات برداشت کرو۔“

یہ کیا کم تھا کہ سلطان نے اسے اپنے تمام امیروں پر فوقیت دے کر اپنا ساتھی منتخب کیا۔ سلطان نے امیروں کو پر رعب لہجے میں مخاطب کیا۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ یہاں کھول کر جیز دیں گے۔“

ایسا شخص سر جھکائے کھڑا ہے۔ جس کی وفاداریاں شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ آنکھیں کر دیکھو اور عماد الدین زنگی کو پچانوئیں نہریں کی جنگ میں اسی نے خلیفہ کے لشکر کے مل کر دہیں بن صدقہ کو شکست دی تھی۔ زنگی اس میدان کا فاتح ہے۔ یہ ایک خانہ لہو لا۔ ”نایاب میری بہن ہیں۔ اس شادی کے تمام اخراجات میں اکیلا برداشت کروں گا۔“

باپ کا بیٹا ہے۔ اس کے باپ آق مسعود نے سلطان برکیارق کو بچاتے بچاتے اپنی جان دی تھی۔ زنگی ہمارے دربار میں آیا۔ ہم نے اسے ندیم خاص کے فرائض سونپے اور بہترین جیز کی پیش کش کر رہا تھا۔ سلطان محمود سلجوقی اپنے امیروں کی باتیں بڑی دل اس کا مشاہرہ مقرر کیا اور نہ اسے انعام و اکرام سے نوازا۔ جانتے ہو اس کی کیا وجہ تھی؟ سن رہا تھا۔ عماد الدین زنگی کا سر اب تک جھکا ہوا تھا۔ وہ سب کچھ سن رہا تھا اس کی وجہ عماد الدین کا اور تم لوگوں کا امتحان تھا۔ ہم یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ زنگی انکار اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سلطان کی پر اثر اور بارعب تقریر سے پہلے قدر قوت برداشت ہے اور کب تک صرف ہماری نظر کرم پر زندہ رہ سکتا ہے۔ کوئی امیر اسے منہ لگانے کا بھی دروازا نہ تھا مگر اب ہر ایک اس کے لئے آنکھیں بچھا رہا ساتھ یہ تمہارا بھی امتحان تھا۔ ہم یہ بھی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ تم ایک قدیم نمکوا۔ اس میں سے بہت سے امیر خود نایاب کی دولت حاصل کرنے کے لئے اس سے شادی کے بیٹے اور ایک بہادر سردار کی کس طرح پذیرائی کرتے ہو۔ زنگی اب تک ہار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اب وہی نایاب کو اپنی بہن بنا کر رخصت کرنے کے خواہاں تھے۔

نظروں پر زندہ ہے لیکن کیا تم میں سے کسی کے پاس اتنا بھی نہیں کہ تم زنگی کو آبا سلطان نے خاموش ہونے کا اشارہ کیا اور بولا۔ ”بہر حال ہم نے تمہیں ایک موقع دیتے یا اس کی دعوت کر دیتے تمہاری غیرت و حمیت کو کبھی جوش نہ آیا کہ تم انہماک کر دیا ہے تم لوگ حسب استطاعت نایاب بیگم کے لیے جو چاہو کر سکتے ہو۔“

کرتے جب کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے اسے کچھ نہیں دیا اور یہ اپنے دن سلطان محمود نے جو شکوہ چھوڑا تھا اس کی بازگشت شہر کے کوچہ و بازار میں سنی گئی۔



”اس کا پورا انحصار تمہاری رضا مندی پر ہے۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو بیان کرو۔ ہم اس پر ضرور غور کریں گے؟“

”سلطان معظم نے میری جو عزت افزائی کی ہے، اس کا بدلہ میں جان نچھاور کر کے بھی ادا نہیں کر سکتی۔“ نایاب نے سنبھل سنبھل کر کہنا شروع کیا۔ ”ایک بیوہ کے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا اعزاز ہو سکتا ہے کہ اسے عالیجاہ کے ندیم خاص کی خدمت کا موقع ملے۔“

”اس کے علاوہ عماد الدین زنگی خاندانی آدمی ہے۔ اس کا باپ بھی اسی عہدے پر فائز تھا۔“ سلطان نے نایاب کے اطمینان کے لئے عماد الدین زنگی کی مزید تفصیل بتائی۔ ”عالیجاہ“ نایاب نے جو اب پوری طرح سنبھل چکی تھی، بوئے اطمینان سے کہا۔ ”کنیز کو معلوم ہے کہ زنگی کا باپ ایک سلجوقی سلطان کے معتد خاص تھا اور اس نے سلطان کے لئے اپنی جان گنوا دی تھی۔“

”خوب تو تم نے زنگی کے متعلق پوری معلومات حاصل کر لی ہیں؟“ سلطان مسکرایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ زنگی کی ذاتی اہلیت اور خاندانی شرافت سے پوری طرح مطمئن ہو؟“

”جی.... ہاں... عالی جاہ۔“ نایاب نے یہ تین الفاظ اس طرح ادا کیے کہ الفاظ کے درمیان کافی وقفہ رہا۔ اس طرح کی ادائیگی اس وقت ہوتی ہے جب خیالات منتشر اور ذہن الجھا ہوا ہو۔

سلطان محمود نے یہ بات فوراً محسوس کر لی۔ اس نے دریافت کیا۔ ”نایاب ہمارا خیال ہے کہ تمہارے ذہن میں کوئی الجھن ہے جسے ہمارے سامنے بیان کرتے ہوئے تم ہچکچا رہی ہو۔ ہم اس معاملے میں تم پر قطعی کوئی جبر نہیں کرنا چاہتے۔ تم اپنی پریشانی صاف صاف بیان کرو؟“

سلطان کی مشفقانہ گفتگو نے نایاب کے تذبذب میں کمی کر دی۔ اس نے کہا۔ ”ندیم سلطنت عماد الدین زنگی کا انتخاب میرے لئے باعث فخر ہے۔ میں سلطان کے حکم کو دل و جان سے تسلیم کرتی ہوں میں اس وقت اس لئے نہیں حاضر ہوئی ہوں کہ ندیم محترم کے بارے میں کوئی رائے زنی کروں۔ مجھے سب سے زیادہ پریشانی اس کی طرف سے ہے۔ یہ ابھی بچہ ہے اگر یہ میری بے توجہی کا شکار ہوا تو ضرور کسی غلط راستے پر چل نکلے گا۔“

نایاب نے یہ بات اپنے قریب بیٹھے ہوئے نعمان کی طرف دیکھ کر کہی تھی۔ سلطان اس کا مطلب سمجھ گیا اور مسکرا کر بولا۔ ”تمہارا نعمان اب بچہ نہیں۔ اس کی ذمہ داری

رات کو قوہ خانوں میں بے فکروں کا یہی موضوع تھا اور ہر ایک اپنی رائے کا اظہار کرتا تھا۔ لوگ عماد الدین زنگی کی ذات پر رشک کر رہے تھے اور شاہی محلات اور عوام کے مکانوں میں نایاب بیگم کی خوش قسمتی کے چرچے تھے جو پہلے سلطان کی بہن بنی اور اب ام کا دھوم دھام سے زنگی جیسے بہادر سے عقد ہونے والا تھا۔

نایاب کو کنیزوں نے جب سلطان کے اعلان کی خبر سنائی تو پہلے تو وہ حیران ہوئی، مسرت سے اس کا دل لبریز ہو گیا۔ اس کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ تھی کہ سلطان نے ندیم خاص سے اس کا عقد ثانی ہو رہا تھا۔ جس کا مرتبہ اس کے شوہر مرحوم سے کسی کم نہ تھا لیکن اس مسئلے پر جب اس نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی شام ہونے تک وہ اس معاملے کے ہر پہلو پر غور کرتی رہی اور آپ ہی آپ الجھتی رہی اسے طرح طرح کے دوسو سو گھیر لیا اور وہ اس قدر پریشان ہوئی کہ اس نے اسی ٹر سلطان سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔

پھر جب قوہ خانوں میں نایاب اور زنگی کے زور شور سے تذکرے ہو رہے تھے نایاب اپنے ساتھ خیرو نعمان کو لئے شاہی انتظار گاہ میں باریابی کی اطلاع کی منتظر تھی سلطان کسی کام میں مصروف تھا۔ نایاب کو تقریباً ایک گھنٹہ کے انتظار کے بعد اندر طلب گیا۔

نایاب اور نعمان نے سلطان کے سامنے پہنچ کر آداب پیش کیا۔ سلطان نے دونوں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جب دونوں بیٹھ گئے تو سلطان نے منہ سے بولنے کی بجائے نایاب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

نایاب نے سلطان کی آنکھوں سے جھانکتا ہوا سوال بھی پڑھ لیا مگر جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھی اس کے لئے اس موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ وہ بہت کچھ سوچ کر آئی تھی قرب سلطانی نے اسے بوکھلا دیا تھا اور وہ سب کچھ بھول گئی۔

آخر سلطان نے گفتگو کا آغاز خود ہی کیا۔ وہ بولا۔ ”نایاب تم نے ہمارا اعلان سن لیا؟“

”جی عالیجاہ! کنیز نے سب کچھ سن لیا ہے۔“ نایاب نے ادب سے جواب دیا۔ ”میں اس مدت پر کوئی اعتراض تو نہیں؟“ سلطان نے نایاب کو گھور کر دیکھا۔ ”میری کیا مجال ہے کہ سلطان کے حکم سے سرتابی کر سکوں۔“ نایاب پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔

”نایاب اس مسئلے کا تعلق ہمارے حکم سے نہیں ہے“ سلطان نے نرمی سے



ہم قبول کرتے ہیں۔ اسے اچھی جگہ لگا دیا جائے گا۔

”خدا سلطان کی عمر دراز کرے“ نایاب نے اطمینان سے کہا۔ ”عالی جاہ نے میرے دل کا آدھا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اس سلسلے میں ایک درخواست اور ہے۔ امید ہے کہ اسے بھی شرف قبولیت عطا ہو گا۔“

”کمو۔ کمو نایاب اور کیا چاہتی ہو؟“

”میں نعمان کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں۔“

”اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ نعمان تمہارا بھائی ہے۔ تم اسے ساتھ رکھ سکتی ہو۔“

”عالی جاہ نے درست فرمایا“ نایاب بولی۔ ”نعمان میرا بھائی ہے اور بیٹا بھی۔ میری خواہش ہے کہ جس طرح سلطان نے اسے میرے ساتھ رہنے کی اجازت دی ہے۔ اسی طرح عماد الدین زنگی کی رضامندی بھی حاصل کر لی جائے تاکہ بعد میں کوئی غیر معمولی بات نہ پیدا ہو جائے۔“

”یہ تمہارا محض ایک موبوم خدشہ ہے۔“ سلطان نے صاف دلی سے کہا۔ ”زنگی سمجھدار انسان ہے۔ نعمان کو تمہارے ساتھ رہنے پر کوئی اعتراض نہ کرے گا۔“

”عالی جاہ جس طرح آپ صاف دل اور ذہن کے مالک ہیں ویسا ہر شخص نہیں ہو سکتا۔“ نایاب نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”عالی جاہ مرد کا دل سمجھنے کے لئے عورت کا دماغ ہونا چاہئے۔ میں اس تجربے سے گزر چکی ہوں۔ اس لئے عرض کر رہی ہوں۔ امیر کندوئی سا شریف انسان تو شاید پوری سلطنت میں نہ موجود ہو لیکن شرافت بھی شک کو ربح نہیں کر سکتی۔ ایک بار امیر کندوئی بھی نعمان کے معاملے میں مجھ سے الجھ پڑے تھے اور مجھے انہیں مطمئن کرنے میں ایک مہینہ لگ گیا تھا۔ آپ نے ابھی فرمایا کہ نعمان بچہ نہیں پھر بھلا عماد الدین کو نعمان کی میرے قریب موجودگی کس طرح گوارا ہو گی؟“

سلطان کو بھی تشویش پیدا ہوئی اور فوری کوئی جواب اسے نہ سوجھا۔ وہ گردن جھکا کر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”تمہاری بات قابل غور ہے نایاب، لیکن زنگی سے اس بارے میں قبل از وقت گفتگو مناسب معلوم نہیں ہوتی۔“

”سلطان مالک ہیں۔ جب اور جس طرح مناسب سمجھیں اس مسئلہ کو حل کریں۔“ نایاب نے بات مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا فرض تھا کہ میں اپنی پریشانی سے عالی جاہ کو آگاہ کر دوں۔ اب مجھے واپسی کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔“

نایاب اپنی فکر سلطان کے ذہن پر ڈال کر وہاں سے اٹھ آئی۔ نعمان اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ یہ شاہی محل کا مردانہ حصہ تھا۔ جگہ جگہ مسلح خواجہ سرا اور سپاہی پہرے

نعمان نے رک کر آہستہ سے آواز دی۔ ”عنبر۔ عنبر۔“

ستون کے پیچھے ایک کونڈا لپکا اور عنبر بل کھاتی، شرابی وہاں سے نکل کر نعمان کے سامنے آگئی۔ نایاب نے اسے دیکھا تو اس کی نازک بندی اور رعنائی پر حیران رہ گئی۔ نایاب خود ہزاروں میں ایک تھی لیکن تیرہ چودہ سال کی یہ لڑکی تو غضب ڈھا رہی تھی۔ درمیانہ قد، چھریا بدن، آنکھیں ایسی مست اور بھری بھری کہ غزال دیکھیں تو شرمائیں۔

”نایاب باجی آداب۔“ عنبر نے کچھ اس انداز سے جسم کو لوچ دے کر اور جھک کر سلام کیا کہ نعمان پر تو جیسے بجلی گر گئی۔ فضاؤں میں ایک لطیف مہک بس گئی۔ نایاب نے محسوس کیا کہ یہ خوشبو عنبر کے عنبریں جسم سے پھوٹ رہی ہے۔

”تمہیں میرا نام کس نے بتایا عنبر؟“ نایاب رک کے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے عنبر کو کریدنا شروع کیا۔

”باجی آپ اعلیٰ حضرت سلطان کی ہمیشہ محترمہ ہیں۔“ عنبر نے جیسے پھول بکھیر دیے۔ ”آپ کا نام تو محلات کی کنیزوں کو معلوم ہے۔“

”عنبر۔“ نایاب نے بزرگانہ انداز اختیار کیا۔ ”راہ چلتے گفتگو کچھ اچھی نہیں لگتی پھر بھی میں اتنا واضح کرنا چاہتی ہوں کہ آج سے پہلے مجھے تمہاری اور نعمان کی شناسائی کا کوئی علم نہیں تھا۔“

”باجی یہ ان کی زیادتی ہے۔“ عنبر نے نعمان پر ایک نظر غلط انداز ڈالی۔ ”مجھ سے تو یہ کہتے تھے کہ انہوں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے اور آپ بہت جلدی میری امی جان سے ملنے والی ہیں۔“

نایاب نے نعمان کو گھور کر دیکھا پھر قدم بڑھاتے ہوئے عنبر سے کہا۔ ”مجھے اس وقت واپس جانے کی جلدی ہے، پھر کبھی تم سے بات کروں گی۔“

گھر پہنچ کر نایاب، نعمان پر برس پڑی۔ ”تمہاری نادانی کوئی نیا گل کھلائے گی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ تم اس قدر احمق ہو۔“

”باجی مجھے معاف کر دیں۔“ نعمان نے سوکھا سامنہ بنا کر کہا۔

نایاب کو نعمان سے بے پناہ محبت تھی۔ اس کی معصومیت پر نایاب کا دل پلچ گیا۔ اس نے محبت سے پوچھا۔ ”آخر یہ لڑکی کون ہے؟“

”عنبر، سلطانہ معظمہ کی خاص کنیز کی دختر ہے۔“ نعمان نے بڑے فخر سے کہا۔

”خاص کنیز کا مطلب تو سمجھتا ہے؟“ نایاب جھلا اٹھی۔

”جی ہاں باجی۔“ نعمان نے اپنی قابلیت گھکاری۔ ”وہ شاہی محل کی تمام کنیزوں کی



سرور ہے۔ اس کا حکم سب پر چلتا ہے۔ اسی طرح غبر کسی سے دب کر نہیں رہتی۔  
 ”نعمان۔ تم ابھی بچے ہو۔ محلاتی سازشوں کو نہیں جانتے۔“ نایاب نے اسے سمجھانا شروع کیا۔

”سلطان ہو یا سلطان ان کے مزاج کا کوئی پتہ نہیں۔ خوش ہو جائیں تو جاگیر بخش دیں اور ناراض ہوں تو کھڑے کھڑے سولی پر چڑھا دیں۔ ایسا ہی مزاج ان کی منہ چڑھی لونڈی غلاموں کا ہوتا ہے۔ وہ کسی کو اپنے پاسک کے برابر بھی نہیں سمجھتیں۔ تم نے ابھی کوئی مقام بھی حاصل نہیں کیا ہے۔ تم ان کی نظر میں کیا چٹو گے؟“  
 ”بابی آپ کو شش تو کیجئے۔“ نعمان نے طفلانہ ضد کی ”اس کی ماں رضا مند ہے۔“  
 ”یہ تم سے کس نے کہا؟“ نایاب نے چونک کر پوچھا۔ ”کیا تم اس کی ماں سے بھی مل چکے ہو؟“

”میں ان سے نہیں ملا مگر غبر نے مجھے یہی بتایا ہے۔ آپ میری بات کا یقین کیجئے بابی۔“ نعمان نے زور دے کر کہا۔

”تو تو بے وقوف ہے ہی۔ مجھے غبر بھی تیری طرح احمق معلوم ہوتی ہے۔“ نایاب بڑبڑانے لگی۔ ”بھلا آج تک یہ کبھی ہوا ہے کہ کوئی جوان بیٹی اپنی ماں سے کہے کہ اس کی شادی فلاں مرد سے کر دی جائے۔ لڑکیاں تیری طرح بے شرم نہیں ہوتیں۔“  
 ”مجھے کیا پتہ بابی۔ غبر نے تو مجھ سے یہی کہا تھا۔“ نعمان خود ہی قائل ہو گیا۔

”تو نے مجھے بڑے غلیان میں ڈال دیا نعمان۔“ نایاب شکستہ آواز میں بولی۔ ”میں سلطان کے پاس اس لئے گئی تھی کہ تجھے میرے ساتھ رہنے کی اجازت مل جائے لیکن تو نے ایک نیا جھگڑا شروع کر دیا۔ میں کس کس جھگڑے کو پٹناؤں گی۔ انسان کو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہئے۔ شاہی محل کے فتنوں سے جس قدر دور رہا جائے بہتر ہے۔“

”رہوں گا تو میں تمہارے ہی ساتھ بابی۔“ نعمان نے نایاب کو منانے کے لئے کہا۔  
 ”اگر غبر کی ماں نے انکار کر دیا تو میں اس کا نام پھر نہ لوں گا۔ آپ بس اس کی ماں سے ایک بار مل لیجئے۔“

”اس کی ماں سے مل لیجئے ہونہ۔“ نایاب نے اسے .... غصیلی نظروں سے دیکھا۔  
 ”تجھے بہن کا تو خیال ہی نہیں۔ میری شادی سر پر کھڑی ہے اور میں تیرا پیغام لے کر غبر کی ماں کے پاس جاؤں۔ کیا سوچے گی وہ۔“

”میں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ آپ فوراً ملنے جائیں۔“ نعمان گھبرا کر بولا۔ ”پہلے آپ کی شادی ہو جائے پھر دیکھا جائے گا مگر آپ وعدہ کیجئے کہ اس کی ماں سے ملیں گی ضرور۔“

پر تھے اس طرف خواتین کا آنا ممنوع تھا کینز بھی کوئی مشکل ہی سے نظر آتی تھی۔  
 نعمان نے چلتے چلتے کہا۔ ”بابی نایاب۔ آپ میرے لئے خوا خواہ پریشان ہیں۔ اب میں بچہ تو نہیں کہ آپ کے بغیر نہ رہ سکوں؟“

”تو تو رہ سکتا ہے مگر میں تیرے بغیر نہیں رہ سکتی نعمان۔“ نایاب نے متا بھرے لہجے میں کہا۔ ”تو نہیں جانتا کہ مجھے تجھ سے کس قدر محبت ہے۔ امی اور ابو نے مجھے وصیت کی تھی کہ میں تجھے ایک لمحے کے لئے اپنے سے الگ نہ کروں۔“  
 ”مگر بابی یہ .... یہ ....“ نعمان کہتے کہتے ٹھنک کر کھڑا ہو گیا۔

نایاب کے بھی قدم رک گئے۔ اس نے حیران نظروں سے نعمان کو دیکھا۔ نعمان کی نظریں اس وقت سنگ مرمر کے ایک بڑے ستون پر جمی ہوئی تھیں۔ جس کے ایک طرف رنگین دوپٹے کا پلو لٹکا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لڑکی اسے دیکھ کر ستون کی آڑ میں ہو گئی ہے۔

”کیا دیکھ رہا ہے ادھر؟“ نایاب نے اسے ہلکے سے ڈانٹا ”یہ شاہی محل ہے نعمان۔ یہاں نظریں جھکا کر چلتے ہیں۔“

”مگر بابی۔ وہ تو وہ ہے۔“ نعمان ادھر سے نظریں ہٹائے بغیر بولا۔  
 ”کون ہے وہ؟“ نایاب نے اسے آگے کی طرف ڈھکیلا۔ ”کیا تو جانتا ہے اسے؟“  
 ”ہاں بابی۔ غبر اس کا نام ہے۔“ نعمان نے آگے بڑھتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”بڑی اچھی لڑکی ہے۔ میں ابھی تم سے ملتا ہوں۔“

نایاب کو پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی اور خوف کی وجہ سے اس کا پورا بدن کانپ اٹھا۔ ”نعمان تجھے کچھ ہوش ہے۔ یہ شاہی محل ہے۔ یہاں کسی لڑکی سے بات کرنا اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ سمجھا کچھ؟“

”آپ بھی کیا بات کہہ رہی ہیں بابی۔“ نعمان نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ ”میں اس سے کئی بار مل چکا ہوں۔ مجھے تو کسی نے کچھ نہیں کہا۔“

”ہائے۔ یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟“ نایاب کو پسینہ چھوٹ گیا۔ ”تو اس سے مل چکا ہے کہاں؟“

”ہیں۔ اسی محل میں بابی۔“  
 اور نایاب کے حلق میں آواز پھنس گئی۔ وہ نعمان کو ڈانٹنا چاہتی تھی لیکن کمال حیرت اور خوف نے اس کی گویائی سلب کر لی اور وہ نعمان کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ دونوں چلتے ہوئے اس ستون کے پاس پہنچ گئے جس کے پیچھے رنگین آنچل لٹکا رہا تھا۔



زرنگار جھولیں پڑی تھیں اور گاڑی کے پیوں پر گنگا جنی کام کیا ہوا تھا۔ ہر امیر نے نایاب کی خدمت کے لئے درجنوں لوہڈی غلام بھی دیئے تھے۔ فرنیچر میں آنوس اور صندل کی لکڑی استعمال ہوئی تھی۔ جس سے فضا منک امھی تھی۔

بارات کا استقبال سلطان کے امیروں نے کیا۔ عقد کے لئے قاضی القضاۃ تشریف لے آئے تھے۔ اب صرف سلطان کا انتظار تھا۔ ذرا دیر بعد نقارے پر چوٹ پڑی۔ دھول تاشے بج اٹھے اور شاہی سواری کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ سلطان معہ اپنی چیتی بیگم کے پورے ترک و احتشام کے ساتھ نایاب کے گھر آیا۔ سلطان کو زنان خانے میں پہنچایا گیا۔ سلطان نے سب سے پہلے جیز کا سامان دیکھنے کی خواہش کی۔ ہر امیر نے اپنے سامان کے الگ خیمے لگوائے تھے۔ اس طرح نو امیروں کے سامان سے ستائیس بڑے خیمے بھر گئے تھے پھر بھی سامان خیموں کے باہر رہ گیا تھا۔

سلطان نے جیز کے سامان پر اطمینان کا اظہار کیا اور امیروں کی دریا دلی کو سراہا۔ یہ تقریب ایک بیوہ کے عقد ثانی کی تھی اس لئے کوئی زیادہ دھوم دھڑکا نہیں کیا گیا تھا۔ خاص بات صرف یہ تھی کہ اس میں سلطان اور سلطانہ شریک تھے اور نایاب کا جیز کسی شہزادی کے جیز سے کسی طرح کم نہ تھا۔ عماد الدین زنگی خوشی سے چوہے نہ سا رہا تھا۔ سلطان نے اسے اپنی مسند کے قریب بٹھایا اور قاضی القضاۃ نے وہیں نکاح پڑھایا۔ ہر طرف مبارک باد کا غلغلہ بلند ہوا ہر کوئی عماد الدین زنگی کے پاس آتا اور اسے گلے مل کر مبارک باد دیتا۔

بارات کا منتظم نعمان اندر باہر بھاگتا پھر رہا تھا۔ ایک بار وہ سلطان کے سامنے سے گزرا تو سلطان نے اسے قریب بلایا اور عماد الدین زنگی سے کہا۔ ”زنگی اس نوجوان کا خیال رکھنا۔ ہم نایاب کے بڑے بھائی اور نعمان اس کا چھوٹا بھائی ہے۔ اسے اپنے ساتھ رکھنا کبھی کام آئے گا۔“

عماد الدین نے نعمان پر سرسری نظر ڈالی اور سر جھکا لیا۔ سلطان نے نایاب سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کر دیا۔ نعمان پھر اپنے کاموں میں لگ گیا۔ نعمان کو بار بار زنان خانے میں جانا پڑتا تھا۔ خبر سے اس کا کئی بار سامنا ہوا مگر خواتین کے جھوم کی وجہ سے گفتگو نہ ہوئی۔ دونوں نے نظروں ہی نظروں میں مجبوری کا اظہار کیا مگر نعمان کو اس گھڑی خبر کی آنکھوں میں غم کی ایک لکیر سی محسوس ہوئی۔ اس کے دل میں الجھن پیدا ہوئی۔ ایک بار خبر نظر آئی تو عورتوں کا مجمع کم تھا۔ خبر کے ساتھ بھی اس کی کوئی سہیلی نہ تھی۔ نعمان نے اشارے سے اسے بلایا اور ایک طرف لے گیا۔

”تم سے تو بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔“ نعمان نے بڑی بے تکلفی اور مسرت

”اچھا بھائی۔ مل لوں گی۔ ضرور ملوں گی۔“ نایاب نے مشکل سے اپنا پیچھا چھڑایا۔ نایاب کی شادی کے ہنگامے میں خبر اور نعمان کا مسئلہ کچھ دنوں کے لئے کھٹائی میں گیا۔ سلطان نے قاضی القضاۃ کے مشورے سے نایاب کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی۔ سلطان محمود سلجوقی کے تمام امراء اس دن کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک سے ایک بڑا رئیس تھا اور ہر ایک دوسرے سے زیادہ جیز دے کر سلطان کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا۔

عماد الدین زنگی اور اس کے ساتھی گو کہ خالی ہاتھ تھے لیکن انہوں نے اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے اپنا تمام سامان فروخت کر کے شادی کا انتظام کیا اور جس وقت بارات چڑی تو دیکھنے والوں کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ عماد الدین جو دہانہ بن کر ایک مال دار بیوہ کو بیاہنے با رہا ہے اس کے گھر میں شام کے کھانے کے لئے روٹی بھی نہیں ہے۔ سلطان کے ایک امیر نے زنگی کو .... سازو سامان سے سچی ایک حویلی دی تھی اور اس سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنی بارات اسی حویلی سے چڑھائے لیکن زنگی کی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ مانگے تاشے کی حویلی سے بارات لے کر نایاب کے گھر جائے۔ اس نے امیر کی حویلی شکرے کے ساتھ اس شرط پر قبول کی کہ وہ دہانہ کو بیاہ کر اس حویلی میں لائے گا لیکن بارات اس کے شکستہ مکان ہی سے جائے گی۔

نایاب نے اپنا مکان بڑی خوبصورتی سے سجایا تھا اور مہمانوں کے بیٹھنے کے لئے بھی اور دعوت کا بھی بڑے اعلیٰ پیمانے پر انتظام کیا تھا۔ نایاب کی طرف شادی کا تمام انتظام نعمان کے ہاتھ میں تھا اور نعمان یہ کام بری نفاست اور شائستگی سے کر رہا تھا۔ اسے علم تھا کہ اس شادی میں سلطان معظم تشریف لا رہے ہیں اور چھوٹی بیگم کے شریک ہونے کا بھی امکان ہے۔ اس لئے اس نے سلطان اور سلطانہ کے لئے شاہانہ مسند لگوائی تھی۔

سلطان محمود کی بیاتہ بیویوں میں چھوٹی بیگم عمر کے لحاظ سے دیگر بیگمات سے کم عمر تھیں اور بیاہ کے بھی سب سے آخر میں آئی تھیں لیکن سلطان نے انہیں سلطانہ کا خطاب دیا تھا اور وہ محلات شاہی میں چھوٹی بیگم کے نام سے پکاری جاتی تھیں۔ سلطان کی اس مہربانی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیاتہ بیگمات میں صرف اسی بیگم سے اولاد زینہ پیدا ہوئی تھی جس کے بارے میں عام خیال تھا کہ وہی سلطان کا وارث تخت و تاج ہو گا۔

نایاب کے لئے اس قدر جیز آیا تھا کہ گھر میں جگہ نہ رہی اور باہر شامیانے لگا کر اسے چن دیا گیا۔ قیمتی پارچہ جات، سونے چاندی کے برتن اور جواہرات کے جڑاؤ زیورات کے علاوہ نایاب کے جیز میں چار گھوڑا گاڑیاں بھی آئی تھیں۔ جن کے گھوڑوں پر کھواب کی



سے کہا۔

”ہاں میں بھی تم سے ملنا چاہتی تھی نعمان۔“ اس کے ساتھ ہی ضبط کے باوجود غبر کی ایک سسکی نکل گئی۔

”غبر۔“ نعمان نے اسے گھبرا کر دیکھا۔ ”کیا ہوا۔ کیا غم ہے تمہیں؟“

”نعمان“ غبر کی آنکھیں بھر آئیں۔ ”تم میری باتوں کو مذاق میں اڑا دیتے ہو۔ جب میں تباہ ہو جاؤں گی تو تمہیں ہوش آئے گا۔ خدا کے لئے جلدی کوئی تدبیر کرو ورنہ میرے بارے میں بات کر رہا ہے۔ اس کی اٹھتی جوانی اور پہلا پہلا پیار تھا۔ جذباتی جوان اس عمر تمہارے ہاتھ سے نکل جاؤں گی۔“ غبر کو جیسے غش آنے لگا۔

نعمان نے اسے پکڑ کر ایک جگہ بٹھایا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”غبر۔ یقین کرو کہ میں شرمندہ ہوا، پھر بات بناتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری قسم غبر۔ میں نے باجی سے تمہارے بارے تمہارا ہوں اور صرف تمہارا رہوں گا۔ میں نے تمہارے بارے میں باجی نایاب سے بات کی تھی اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ..... شادی کے بعد وہ تمہاری ماں تفصیل سے بات کی ہے۔ تم جانتی ہو کہ وہ مجھے کب قدر چاہتی ہیں۔ میں نے ان سے مل کر تمام معاملات طے کر لیں گی۔

صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر میری شادی غبر سے نہ ہوئی تو میں جان دے دوں گا۔“ ”پھر اتنی ہی بات مجھ سے کہی ہوتی۔“ غبر جھنجھلا کے بولی۔ ”بات میں نمک مرچ ہائے اللہ۔ کیسی بد شگونی باتیں منہ سے نکالتے ہوں۔“ غبر گھبرا کر بولی۔ ”خدا موت لگانے اور جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔“ غبر نے سر جھکا لیا اور اس کے منہ سے ایک دے دشمنوں کو۔ تم مر گئے تو پھر میں کیا کروں گی۔ میں بھی اپنی جان دے دوں گی۔“ اور سسکی نکل گئی۔

نعمان دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اس کے ایک ہی جھوٹ نے غبر کا دماغ ٹھکانے کر دیا۔ نعمان کے مزاج میں اب تک سنجیدگی آئی ہی نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں غبر کیسے تمہاری قسم کھاتا ہوں۔“ زیادہ سمجھدار اور سنجیدہ لڑکی تھی۔

غبر نے ذرا رک کر پوچھا۔ ”تو کیا تم نے واقعی باجی نایاب سے یہی کہا تھا؟“ افسردگی سے بولی۔

”غبر۔“ نعمان چہرے پر مصنوعی غصہ طاری کرتے ہوئے بولا۔ ”تم مجھے جھوٹا سمجھتی ہو۔ میرے اوپر اعتبار نہیں ہے تمہیں تم دیکھ لیتا کہ اگر تمہاری مجھ سے شادی نہیں ہوئی انکار کر دیا؟“

”ماں کی بات نہیں ہے نعمان۔ ان سے تو میں نے ابھی ذکر ہی نہیں.....“ غبر عقلمند ”تم ناراض ہو گئے ہو نعمان۔“ غبر ڈر گئی پھر اس نے منت سے پوچھا۔ ”باجی نایاب ہونے کے باوجود غلطی کر گئی۔ اس نے بھی جھوٹ موٹ کہہ دیا تھا کہ اس کی ماں نعمان کو تمہاری بات سن کر بہت ہی پریشان ہوئی ہوں گی۔“

”پریشانی ہی پریشانی۔“ نعمان اکڑ کر بولا۔ ”ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ لیکن ہے کہ میں نے ماں سے پوری طرح بات نہیں کی ہے۔ اصل بلا تو کل جاہ کی ہے۔ وہ بیچ میری خوشامد کرنے۔ میں اپنی ضد پر اڑ گیا تھا اور سوچ لیا تھا کہ اگر باجی نے انکار کیا تو اس میں کوئی پڑا ہے۔“

وقت کچھ کر گزروں گا۔“ ”پھر انہوں نے کیا کہا؟“ غبر نے سنبھلتے ہوئے پوچھا اس کو نعمان کی لفاعی پر کچھ کچھ نیرت سے دیکھا۔

”پہلے کل جاہ کا کوئی واسطہ نہ تھا۔“ غبر نے افسردگی سے بتایا۔ ”تین چار دن پہلے ”سنوگی تو خوش ہو جاؤ گے۔“ نعمان نے جھوٹ پر جھوٹ بولنا شروع کر دیا۔ ”سنوگی جاہ سلطانہ سے ملے آیا تھا۔ وہ سلطانہ کا دور کا بھائی لگتا ہے۔ بڑا بد ذات آدمی ہے۔“



جب محل میں آتا ہے تو کنیزوں کو آماتا رہتا ہے اور انہیں گھیر کر باتیں کرتا ہے۔ کنیزیں اسے پسند کرتی ہوں۔ میرا دل تم سے ملا ہے مگر اب سچ میں ایک آوارہ شہزادہ آگیا ہے۔ چاری سلطانہ کی وجہ سے کچھ نہیں کہتیں۔“

”پھر محل جاہ کا ہوا کیا؟“ نعمان نے بات کاٹ دی۔ ”مختصر طور پر بتاؤ۔ مجھے الجھ اس سے چھٹکارے کی کوئی تدبیر سوچو۔ غصہ کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔“

”غیر تم یوں کرو کہ میرے گھر آجاؤ۔ باجی نایاب سب سنبھال لیں گی۔“ نعمان نے ہونے لگی ہے۔

”یہی تو بتا رہی ہوں۔“ غیر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”میری بد قسمتی کہ اس کی نظر اپنے خیال میں بہترین حل پیش کیا۔“

”تمہاری عقل پر پھر پڑ گئے ہیں۔“ غیر نے کہا۔ ”اپنی آگ میں انہیں بھی گھسیٹ لو۔“

مجھ پر پڑ گئی۔ وہ سلطانہ سے مل کر جا رہا تھا میں ماں سے ملنے سلطانہ کے پاس جا رہی تھی۔

راہداری میں مجھے ملا تو بس ریشہ عطمی ہو گیا۔ باتیں کر کر کے میرا دماغ چاٹ لیا۔ کسی طرح

پہنچا ہی نہیں چھوڑتا تھا۔ میں نے ماں سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا اور غلام گردش

چلی گئی۔ جب کہیں جا کر پیچھا چھوٹا۔“ غیر نے لمبی سانس لی۔

”چلو اچھا ہوا۔ تمہاری جان چھوٹی اس شیطان سے۔“ نعمان نے اطمینان کا سانس

لیا۔

”تم تو سچ سچ میں بول دیتے ہو۔“ غیر ترشی سے بولی۔ ”پیچھا کہاں چھوڑا اس نے تمہارے بارے میں ماں سے بات کی ہے۔“

کچھ دیر اپنے کمرے میں انتظار کرنے کے بعد باہر آئی۔ ابھی راہداری میں قدم رکھا تھا کہ

وہ پھر سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے پاس آگیا اور بڑے

انداز سے بولا۔ ”غیر میں نے تمہیں سلطانہ سے مانگ لیا ہے۔ بس خوش ہو جاؤ۔ بہت جا

تمہیں بیاہ کر لے جاؤں گا۔“

”میں اس کا منہ توڑ دوں گا۔ اس نے یہ کہنے کی جرات کیسے کی؟“ نعمان نے مضطرب

بھینچے ہوئے کہا۔ اسے سخت غصہ آگیا تھا اور اس کے ہونٹ تھر تھرانے لگے تھے۔

”ہوش کے ناخن لو نعمان۔“ غیر سختی سے بولی۔ ”محل جاہ شہزادہ ہے۔ سلطان کا رشتہ

دار اور تم۔ میرا مطلب ہے ہماری تمہاری کیا حیثیت ہے۔ تم اس کا مقابلہ کس طرح

کرتے ہو؟“

”تم نے اسے پھٹکارا نہیں؟“ نعمان کا غصہ کم نہ ہوا تھا۔ ”جو تا مارا ہوتا اس کے

”غیر کچھ جواب دینے والی تھی کہ اس کی نظر اچانک سامنے کی طرف اٹھ گئی۔ اس نے

منہ بنا کر کہا۔ ”نعمان تم نے مثل سنی ہو گی کہ شیطان کا نام لو تو وہ فوراً آجاتا ہے۔ ذرا

سامنے کی طرف تو دیکھو؟“

نعمان نے غیر کے اشارے کی طرف دیکھا۔ ایک دہلا ہوا سا آدمی کنیزوں سے

ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔

”تمہارا اشارہ اس لیے آدمی کی طرف تو نہیں؟“ نعمان نے مسکرا کر کہا۔

”پھر وہی فضول بات۔“ غیر کو بھی غصہ آگیا۔ ”میری اوقات کیا ہے جو اسے

دیتی۔ میری ماں سلطانہ کی کنیز اور میں کنیز کی بیٹی۔ ہم تم ان کی کس طرح برابری

کرتے ہیں۔ لونڈی غلام تو بازار سے خریدا ہوا مال ہیں۔ مالک جس کو چاہے دے دے۔ سلطانہ

جس کو پسند کرے، میرا ہاتھ اسے پکڑا دے۔ میں آنا کالی کروں تو سولی پر ٹانگ دی جاؤں

میرے ساتھ ماں بھی ماری جائے۔ نعمان غصہ تھوک دو اور ٹھنڈے دل سے سوچو۔“



”ہاں ہاں۔ وہی“ غبر ہونٹ دبا کر بولی۔ ”یہی حضرت ظل جاہ ہیں۔ انہیں غور دیکھ لو۔ کس شان سے آئے ہیں یہاں۔ انہیں یہ بھی خیال نہیں کہ یہ کسی غیر کا زنانہ غار ہے۔ پرانی عورتیں بھی موجود ہیں۔ یہ شاہی محل نہیں کہ جہاں چاہیں گھومتے پھریں۔“

”میرا مطلب ہے۔ آپ غبر کی والدہ ہیں؟“ نایاب نے آخر پوچھ ہی لیا۔  
”ہاں نایاب بیگم۔ غبر میری بیٹی ہے۔“ اس نے فخر سے کہا، پھر فوراً تعجب سے پوچھا۔  
”مگر آپ غبر کو کس طرح.... جانتی ہیں؟“

”غبر جاننے اور پہچاننے کی چیز ہے۔“ نایاب مسکرائی ”آپ خوش قسمت ہیں کہ اللہ نے آپ کو ایسی خوبصورت اور ذہین بیٹی عطا کی ہے۔“  
غبر کی ماں اپنی بیٹی کی تعریف سے پھولے نہ سائی تھی غبر کی آج تک کسی نے تعریف نہ کی تھی۔ محل کی دوسری.... کینز زادیاں غبر کے حسن و قابلیت کو دیکھ کر جلتی تھیں اور اس میں ہزار ہزار عیب نکالتی تھیں۔ غبر کی ماں چاہتی تھی کہ نایاب یونہی غبر کی تعریف کرتی رہے اور وہ خوش ہوتی رہے۔ نایاب کا کئی بار جی چاہا کہ وہ نعمان اور غبر کی ملاقاتوں کا اس سے ذکر کرے مگر وہ ایک محتاط خاتون تھی۔ اس نے مناسب نہ سمجھا کہ ایک اجنبی سے پہلی ہی ملاقات میں سب کچھ کہہ ڈالے۔ وہ غبر کی تعریف ہی کرتی رہی۔ نعمان کا ذکر زبان تک نہ لائی۔

”کیا صورت پائی ہے اس خبیث نے۔“ نعمان نے جل کر تبصرہ کیا۔

”انہیں اپنی خوبصورتی پر برا ناز ہے۔“ غبر نے اور گلی میں لگائی۔ ”مجھ سے کہہ دیجئے۔“

تھے کہ انہیں آج تک کوئی لڑکی پسند نہیں آئی۔ اسی وجہ سے کنوارے رہ گئے۔“

”لڑکیاں تو اس لنگور کو دیکھ کر منہ پھیر لیتی ہوں گی۔“ نعمان نے دل کے پھوپھو سے

پھوڑے۔

”کوئی بات بھی نہیں کرنا چاہتی ان سے مگر شہزادے ہیں اس لئے۔“

اسی وقت کھانے کا شور ہوا اور غبر کی بات ادھوری رہ گئی۔ سلطان اور سلطانہ تو بعد ہی چلے گئے تھے۔ سلطان کے کہنے پر سلطانہ نے اپنی خاص کینز کو نایاب کے چھوڑ دیا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ وہ نایاب کے ساتھ دلہا کے گھر جائے۔ غبر بھی اسی گھر سے اب تک ٹھہری ہوئی تھی۔ کھانے کے دوران نعمان نے ظل جاہ کو بہت تلاش کیا۔ وہ کہیں نظر نہ آئے۔ ظل جاہ، سلطانہ کے بہانے اس محفل میں گھس آئے تھے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ غبر اپنی ماں کے ساتھ نایاب کے گھر جا رہی ہے تو اس کا دل بھی نہیں معلوم ہوا کہ سلطانہ واپس جا چکی ہیں اور کینز بھی ان پر کوئی توجہ نہیں دے رہی ہیں تو وہ بڑے مایوس ہو کر چلے گئے۔

کھانے کے بعد مہمان عورتیں اور مرد اپنے گھروں کو چلے گئے نعمان بھی رخصتی کروں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ غبر صحن کے ایک نیم تاریک گوشے میں کھڑے نعمان سے تیار یوں میں لگ گیا۔ گھر میں تنہائی ہوئی تو غبر کی ماں کو نایاب سے گفتگو کا موقع مل گئی۔ اس نے ادب کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔ ”میں سلطانہ کی کینز ہوں۔ مجھے حکم ہوا ہے میں آپ کے ساتھ سردار زرنگی کے گھر جاؤں۔“

”آپ سلطانہ کی کینز خاص ہیں؟“ نایاب نے اسے بڑے تعجب سے دیکھا۔  
”ہاں سلطانہ کی نوازش ہے جو وہ مجھ پر اس قدر مہربان ہیں۔“ غبر کی ماں نے اگلی ماں نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

غبر نے جواب دینا چاہا لیکن ماں آگے بڑھ گئی۔ غبر خاموش ہو کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔



گئی۔ آراستہ پیراستہ گاڑی حویلی کے دروازے سے لگا دی گئی۔ عماد الدین زنگی اپنے اپنے اپنے غم کو محبت سے اپنے پاس بٹھایا غمزداری ڈری اور سہمی ہوئی تھی۔ وہ سمجھی کہ آج اس کے ساتھ دلسن کو رخصت کرانے کے لئے گاڑی کے قریب کھڑا تھا۔ نایاب زنان خانے پر بھاڑ پڑے گی لیکن ماں کا رویہ بڑا نرم تھا۔ ماں نے پیار سے پوچھا۔ ”غمزدہ لڑکا کون ایک ایک سے گلے مل کر روئی۔ غمزدہ کی ماں اسے سارا دیئے ہوئے تھی۔ نایاب کہہ کر آہستہ سسکیاں بھرتی دروازے پر آئی۔ سوائے عماد الدین کے اور تمام مرد دوسری طرف ہٹ گئے۔ نایاب کی طرف سے مردوں میں صرف نعمان اسے رخصت کرنے کے لئے گیا تھا۔

نایاب باہر آئی تو کسی عورت نے سرگوشی کی۔ ”نایاب تمہارا بھائی نعمان کھڑا ہے سے رخصت ہو لو۔“

بات اتنی آہستہ سے کہی گئی تھی کہ غمزدہ کی ماں بھی نہ سن سکی۔ حالانکہ وہ نایاب کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ نایاب نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر نعمان کو دیکھا اور بھائی کہہ کر اس کی طرف بھگی۔

نعمان اسے گلے لگا کر رونے لگا۔ لڑکی کی رخصتی کا منظر بڑا پر اثر ہوتا ہے۔ دوست اس منظر کو دیکھ کر دشمن بھی رو پڑتے ہیں۔ لڑکی پرانے رشتے توڑ کر ایک نئے بسانے جاتی ہے ایک ایسی دنیا جس کے بارے میں اسے بہت کم علم ہوتا ہے۔

نایاب رخصت ہو کر اپنے نئے گھر پہنچ گئی۔ غمزدہ اور اس کی ماں دو روز تک نایاب گھر رہیں۔ اس دوران میں نعمان نے نایاب کے گھر کے کئی چکر لگائے۔ وہ آتا تو اس کی نظریں غمزدہ کو تلاش کرتیں مگر غمزدہ کی نظروں سے بچتی رہی۔ شادی کی رات اس کی نے اسے نعمان سے باتیں کرتے دیکھا تھا۔ غمزدہ سے ڈرتی تھی اس لئے اس نے اپنی طرح کھل اٹھا۔

کی نظروں سے بچتا شروع کر دیا۔ نعمان کو اس کی اس بے رخی پر بڑا غصہ آیا مگر پھر خیال سے اسے صبر آگیا کہ غمزدہ کی ماں نے اسے منع کر دیا ہو گا جیسی وہ گھر میں ہونے باوجود اس کے سامنے نہیں آ رہی تھی۔

غمزدہ کی ماں نے نعمان کو پہلی مرتبہ غمزدہ سے باتیں کرتے دیکھا تھا پھر نایاب کی رات کے وقت جب اس نے نعمان کو نایاب کو گلے لگا کر روتے دیکھا تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ اب تک کیوں نہیں بتایا۔ کیا میں تیری دشمن ہوں؟“

”ہوں۔ اتنی پرانی شناسائی ہے اس سے۔“ ماں نے محبت بھری تلخی سے پوچھا۔ ”مجھے نے چاہا کہ نایاب سے اس لڑکے کے متعلق پوچھے مگر اسے یہ کچھ اچھا نہ معلوم ہوا۔ والی عورتیں کسی جوان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے ہوئے گھبراتی ہیں۔ لوگ! کیا خیال کریں۔ اس دوران اس کا نعمان سے بھی سامنا... ہوا نعمان نے اسے سنبھالتے کرتے ہنس پڑی۔ بولی۔ ”نادان ایسی باتیں لڑکے لڑکیاں خود طے نہیں کرتے۔ کسی سلام کیا۔ اس نے دعائیں بھی دیں لیکن بات دعا اور سلام سے آگے نہ بڑھی۔“

”اور اس رات کو نے میں کھڑے ہو کر اس سے باتیں کرتے ڈر نہیں لگا؟“ ماں غصہ سے سنبھالتے کرتے ہنس پڑی۔ بولی۔ ”نادان ایسی باتیں لڑکے لڑکیاں خود طے نہیں کرتے۔ کسی سلام کیا۔ اس نے دعائیں بھی دیں لیکن بات دعا اور سلام سے آگے نہ بڑھی۔“



”ہاں ماں۔ یہی نعمان بھی کہہ رہا تھا۔“  
 ”کیا کہہ رہا تھا نعمان؟“ ماں نے چونک کر پوچھا۔  
 ”نعمان کہہ رہا تھا کہ میں اپنی باجی کو تمہاری ماں کے پاس بھیجوں گا۔“  
 ”اب باجی نایاب کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ تمہارے پاس آئیں گی۔“  
 ”کیوں آج کیا ہوا ماں؟“ عنبر نے شوخی دکھائی۔  
 ”ارے وہ لم ڈگو۔ صبح سے سلطانہ کے پاس آیا ہوا ہے۔“ ماں نے تسخراڑایا۔  
 ”نعمان کہہ رہا تھا کہ میں اپنی باجی کو تمہاری ماں کے پاس بھیجوں گا۔“  
 ”اب باجی نایاب کی شادی ہو گئی ہے۔ وہ تمہارے پاس آئیں گی۔“  
 ”غل جاہ!“ عنبر کا منہ خوف و دہشت سے کھل گیا۔

”ہوں اب میں سمجھی نایاب مجھ سے ایسی باتیں کیوں کر رہی تھی۔“ ماں سر ہلا کر اس کی ماں باہر جا چکی تھی۔ عنبر کا جی چاہا کہ دوڑ کر ماں کو بتا دے کہ یہ شیطان تو ہوئے بولی۔  
 ”باجی نایاب کچھ کہہ رہی تھیں، نعمان کے بارے میں؟“ عنبر نے ڈرتے ڈرتے پتھر سوچتی ہی رہ گئی اور اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔  
 اس کے دل کی دھڑکنوں میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا۔  
 ”نعمان کے بارے میں نہیں۔“ ماں ایک بلر پھر مسکرائی۔ ”نایاب نے تیری توبہ مل کر واپس جا رہا تھا۔ عنبر کی ماں نے راستہ کاٹ دیا اور دوسری طرف ہو گئی۔ وہ غل کے ایسی پل باندھے کہ میں اس کا منہ دیکھتی رہ گئی۔ اب معلوم ہوا کہ تیرے گنہگارہ کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ غل جاہ اسے جب بھی ملتا جھک کر فرمائشی سلام کرتا تھا۔ گائے جا رہے ہیں۔“  
 ”اور کچھ کہا ہو گا انہوں نے؟“ عنبر اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ ایک کینز کو اس طرح سلام کرنا واقعی معیوب بات تھی۔ عنبر کی ماں دوسرے تھی۔  
 ”استوں سے گزر کر سلطانہ کے پاس پہنچ گئی۔“

”اور کیا کہتی بے چاری وہ تو گھوگٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔“ ماں ہنستے ہوئے سلطانہ نے عنبر کی ماں کو دیکھتے ہی کہا۔ ”آؤ عنبر کی ماں تمہاری بڑی عمر ہے۔ ہم میں نے بتایا کہ میں عنبر کی ماں ہوں تو بس گلی تیری تعریفیں کرنے۔ بڑی نیک ہے نایاب نہیں یاد ہی کر رہے تھے۔“  
 خدا اس کے دکھ درد دور کرے۔ سردار زندگی سے اس کی نبھ جائے گی میں نے بڑی تڑپا۔ عنبر کی ماں سوچ کر آئی تھی کہ وہ عنبر اور نعمان کی شادی کی اجازت بھی حاصل کر لے سنی ہے ان کی۔“  
 لی اور کچھ جیز وہیز کے بارے میں بھی بات کرے گی۔ اس نے سلطانہ کو خوش دیکھا تو فوراً  
 ماں کسی اور طرف چل پڑی۔ عنبر کی طبیعت الجھنے لگی۔ وہ اپنے مطلب کی بات مطلب کی بات منہ پر لے آئی۔ بولی۔ ”سلطانہ معظمہ۔ اب میں عمر کو لے کر کیا کروں گی۔ چاہتی تھی اور ماں، سردار زندگی کے ترانے گانے بیٹھ گئی۔  
 آخر عنبر نے منہ پھوڑ کر پوچھا۔ ”نعمان کے بارے میں کچھ نہیں کہا باجی نے؟“ بیٹھ کر اللہ اللہ کروں گی۔“  
 ماں نے تیز نظروں سے عنبر کو دیکھا۔ ”میں سمجھتی ہوں تیرا مطلب۔ خاموشی سے؟“ ہماری زندگی میں تمہیں کس بات کی فکر ہے۔“ سلطانہ بڑے تکبر سے بولی۔  
 ”تمہارے منہ سے فکر کا نام سن کر ہمیں صدمہ ہوا۔ کیا سلجوقی سلطانہ اپنی کینز خاص کے بیٹھ یہ کام میرا ہے اور میں ہی اسے پٹاؤں گی۔“

عنبر اداس ہو گئی۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ ماں کو اس کی نادانی پر ہنسی آگئی۔ اس نے ہلکے کچھ نہیں کر سکتی؟  
 ”اچھا یہ بتا۔ نعمان تجھے کیسا لگتا ہے؟“  
 ”اچھا بہت اچھا ماں۔“ عنبر بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔  
 ”اچھا بہت اچھا ماں۔“ عنبر بھاگ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔  
 ”تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ ہم عنبر کی طرف سے غافل ہیں؟“ سلطانہ اسی طعنے سے  
 ”آج ذرا خیال سے باہر نکلتا۔ اچھا تو یہ ہے کہ میری واپسی تک تم یہیں رہو۔“

”ماں۔ وہ نایاب ہیں نا۔ باجی نایاب۔“ خوشی کے مارے غم کے منہ سے الفاظ نہ نکلتے تھے۔

”ہوش میں رہ لڑکی۔ کیا ہوا نایاب کو؟“ ماں صدمے سے چڑچڑی ہو گئی تھی۔

”باجی نایاب سلطان سے ملنے گئی ہیں۔“

”سلطان سے ملنے گئی ہیں۔ مگر کیوں؟“ ماں کے کان کھڑے ہو گئے۔

”ماں تم سمجھتی کیوں نہیں۔“ غم نے غم سے کہا۔ ”نعمان کی شادی کی اجازت مانگنے گئی ہیں۔“

”تیرے ساتھ؟“ ماں آگ بگولہ ہو گئی۔

”اور کس کے ساتھ ماں۔“ غم افسردگی سے بولی۔ ”تم بگڑکیوں رہی ہوں ماں کیا ہوا ماں تمہیں؟“

”کان کھول کر سن لے غم۔“ ماں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ ”تیری قسمت میں تو وہی اونٹ لکھا ہے۔“

”کون غل جاہ۔“ غم نے ناک بھونچ رہائی۔ ”میں تو اس کی شکل بھی نہیں دیکھوں گی اور اگر تم نے زبردستی کی تو میں جان دے دوں گی۔“

ماں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”کچھ کر بیٹی۔ یہ تو سلطان کا حکم ہے۔ اسے تو سلطان بھی نہیں ٹال سکتا۔ میں نے لاکھ سرمارہ.... خوشامدیں کیں مگر سلطانہ نس سے مس نہ ہوئی۔ صاف کہہ دیا کہ غم کو میرا بھائی غل جاہ بیاہ کر لے جائے گا۔ مجھے تو اس نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔“

”تم نے انکار کر دیا ہوتا ماں۔“ غم کمر پر ہاتھ رکھ کر غصے سے بولی۔

”انکار کرتی تو تو اور میں دونوں اب تک سولی پر چڑھ گئے ہوتے۔“ ماں نے شدت غم سے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ”ان محل والوں کی آنکھ میں سور کا بال ہوتا ہے۔ اپنے مطلب پر تو سر پر بٹھاتے ہیں، آنکھیں پچھاتے ہیں اور ہمارا کوئی کام پڑ جائے تو آنکھیں سر پر رکھ لیتے ہیں۔ غل جاہ کو آج تک کوئی لڑکی نہیں جڑی۔ اب غم سے شادی کرے گا۔ خدا کرے اسے ڈھائی گھری کا بیضہ ہو اور یہ دلما بننے سے پہلے ہی مر جائے۔“

”غم ماں کے گلے سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔“

”دوسری طرف نایاب نے سلطان سے نعمان کی شادی کی اجازت مانگی۔ سلطان کو کیا عذر ہو سکتا تھا اس نے فوراً اجازت دے دی اور نایاب کے اس ارادے کو خوب سراہا کیوں کہ اس طرح نایاب کا یہ دھڑکا بھی ختم ہو جاتا تھا کہ اس کا شوہر زندگی کیسے اس پر

ہوئی۔ ”غم کی تم سے زیادہ ہمیں فکر ہے۔“

”کنیز کو سلطانہ سے اسی نوازش کی امید تھی۔“ غم کی ماں نے بات سدھارتے ہوئے کہا۔ ”میں اب غم کی شادی کر دینا چاہتی ہوں اس کا رشتہ....“

”رشتہ ہم نے ڈھونڈ لیا ہے۔ تمہیں اس فکر کی ضرورت نہیں۔“ سلطانہ نے کلام کیا۔

”جی۔ رشتہ۔ مگر کہاں، کس سے؟“ غم کی ماں گھبرا کر سلطانہ کا منہ دیکھنے لگی۔

”گھبراؤ نہیں۔ ہم غم کو کسی کو بخشیں گے نہیں۔ اس کی باقاعدہ شادی ہو گی سلطانہ مسکرائی۔

”مگر کس سے سلطانہ عالیہ؟“ غم کی ماں کانپ اٹھی۔

”غم کو شہزادہ غل جاہ اپنی بیوی بنا کر لے جائے گا۔“ سلطانہ بولی۔ ”تم اس کا غلام سے رشتہ کرنا چاہتی ہو گی اور ہم نے اس کے لئے ایک شہزادے کو پسند کیا ہے۔“

”غل جاہ۔“ غم کی ماں کے دل پر چوٹ سی پڑی۔ اس نے لڑکھائی آواز میں کہا۔

”مگر سلطانہ عالیہ میں نے غم کا رشتہ پہلے ہی طے کر دیا ہے۔“

”کس سے رشتہ طے کیا ہے؟“ سلطانہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

”وہ جی نایاب بیگم ہیں نا۔ امیر عماد الدین زنگی کی بیوی۔“ غم کی ماں نے سہم کر کہا۔

”ان کا ایک بھائی ہے نعمان۔ اس سے طے کیا ہے رشتہ۔“

”نایاب۔“ سلطانہ نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ”ایک تو وہ زبردستی سلطان کی بہن بیٹی ہے اور اب اپنے بھائی کو بھی محل میں گھسیڑنا چاہتی ہے۔ یہ نہیں ہو گا۔“

”مگر سلطانہ....“

غم کی ماں نے کچھ کہنا چاہا مگر سلطانہ نے اسے ڈانٹ دیا۔ ”فضول بکواس کی ضرورت نہیں۔“ اور سلطانہ نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اب مزید گفتگو کی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ غم کی ماں سمجھ گئی تھی کہ سلطانہ معاملے میں ایک لفظ بھی سنتا نہیں چاہتی۔ وہ خوشی خوشی ملکہ کے پاس آئی تھی اور وہ ہوئی واپس چلی۔

غلام گردش میں اپنی کوشمیری پر پہنچی تو غم کو دروازے پر کھڑے پایا۔ وہ سر جھکا کر آگئی لیکن غم نے دوڑ کر اسے لپٹا لیا۔ غم خوشی سے پاگل ہو رہی تھی۔

ماں نے جھٹکا دے کر اسے الگ کیا اور غصے سے بولی۔ ”قارون کا خزانہ مل گیا۔ کیوں اتنا خوش ہو رہی ہو؟“



ہی ایک بیٹی تھی جسے اپنے بھتیجے سلطان محمود سے بیاہ دیا تھا۔ سلطان محمود کو بادشاہت بھی سلطان عظیم کی کوششوں سے ملی تھی۔ ان دو وجوہات کی بنا پر سلطانہ کا مرتبہ تمام بیگمات میں بلند تھا۔

سلطانہ غصے میں بھری بیٹھی تھی لیکن سلطان کے آنے پر اس نے خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ سلطان نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سلطانہ اگر یاد نہ کرتیں تب بھی ہم آج ان سے ملنے آ رہے تھے۔“

”اس کرم نوازی کا سبب؟“ سلطانہ کے لہجے میں کوشش کرنے کے باوجود آغاز سے تلخی پیدا ہو گئی۔

”وہ تمہاری کنیز ہے۔ غمبر کی ماں۔“

”کیا وہ آپ کے پاس گئی تھی؟“ سلطانہ نے سختی سے بچ ہی میں ٹوک دیا۔ سلطان نے اس سختی کو محسوس تو کیا مگر سلطانہ کا ایک انداز محبوبانہ سمجھ کر نظر انداز کر گیا۔ ”وہ نہیں ہمارے پاس تو سردار زنگی کی بیوی نایاب آئی تھی۔“

”اچھا تو سلطان کی بہن تشریف لائی تھیں۔“ سلطانہ اور جل گئی۔ ”اس نے تو شاہی محل کا دروازہ ایسا دیکھا ہے کہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتی۔“

”تھیں تو خوش ہونا چاہئے سلطانہ۔ وہ تمہاری کنیز کی بیٹی کا رشتہ لائی تھی۔“ سلطان نے پھر بھی سلطانہ کے سخت لہجے سے درگزر کیا۔ ”وہ اپنے بھائی نعمان کی شادی غمبر سے کرنا چاہتی ہے۔“

”سلطان نے کیا جواب دیا؟“

”ہم نے کہہ دیا کہ شادی ہو سکتی ہے۔“ سلطان بے پروائی سے بولا۔ ”نایاب کا خیال تھا کہ شاید غمبر کی ماں اسے پسند نہ کرے۔ ہم نے کہہ دیا کہ اس سلسلے میں ہماری سلطانہ کوشش کریں گی۔ اسی لئے ہم ادھر آنے کا ارادہ کر رہے تھے۔“

”غمبر کی ماں پسند کرے تب بھی یہ شادی نہیں ہو سکتی۔“ سلطانہ نے بڑی سختی سے انکار کر دیا۔

سلطان نے حیرت سے سلطانہ کو دیکھا۔ اسے گمان گزرا کہ کہیں سلطانہ پاگل تو نہیں ہو گئی۔ اس کی سخت کلامی کو برداشت کرنے کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ سلطان کی بات کو اس انداز میں رد کر دے۔

”کیوں نہیں ہو سکتی؟“ سلطان محمود کا شاہانہ وقار عود کر آیا۔

سلطانہ نے سلطان کی بھاری آواز سنی تو ایک دم ہوش میں آ گئی۔ اسے اپنے تلخ و

شک نہ کرنے لگے۔ سلطان نے اس کا صاف الفاظ میں اظہار بھی کیا۔ ”نایاب ہم تمہارے اس خیال کی پوری تائید کرتے ہیں۔ ہم نے زنگی کو نعمان کے بارے میں بتا دیا ہے مگر شک کی گنجائش پھر بھی رہتی ہے۔ نعمان کی شادی کے بعد یہ قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔“

”ایک گزارش اور ہے سلطان معظم۔“ نایاب کے پیش نظر دوسرا پہلو بھی تھا۔ ”میرا خیال ہے کہ غمبر کی ماں اس رشتے سے انکار نہ کرے گی پھر بھی اگر حضور والا اس سلسلے میں اعانت فرمائیں تو کرم گستری ہو گی۔“

”تم اس کی فکر نہ کرو نایاب۔“ سلطان نے تسلی دی۔ ”غمبر کی ماں ہماری سلطانہ کی خاص کنیز ہے۔ ہم آج سلطانہ سے کہہ دیں گے کہ غمبر کی ماں انکار نہ کرنے پائے۔“

نایاب نے شکریے کا سلام پیش کیا پھر خوشی خوشی سلطان کے پاس سے اٹھ آئی۔ اقتصر سلطانی کے برابر سلطانہ کا بھی محل تھا۔ اس کا دل چاہا کہ خود بھی اسی وقت نایاب کی ماں سے بات صاف کر لے۔ دونوں محلوں کو ایک راہداری کے ذریعے ملایا گیا تھا۔ نایاب سلطانہ کے محل کی طرف چلنے لگی مگر تھوڑی دور چل کر وہ رک گئی۔ اسے خیال آیا کہ سلطان نے کہا ہے کہ وہ آج سلطانہ سے مل کر غمبر کی ماں پر زور ڈلوائے گا اس صورت میں اگر اس وقت وہ غمبر کی ماں سے ملنے گئی تو بات بگڑ بھی سکتی ہے اور شاہی وقار کی تذلیل کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ وہ فوراً ہلٹی اور صدر دروازے کی طرف چلنے لگی۔

سلطان عام طور سے سلطانہ کو اپنے محل میں طلب کیا کرتا تھا لیکن کبھی کبھی خود بھی اس کے پاس چلا جاتا تھا۔ وہ ابھی سلطانہ کو بلوانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ سلطانہ کی ایک کنیز آ گئی۔ اس نے کورنش پیش کیا اور اذن گویائی کے لئے سر جھکایا۔

”کو۔“ ملکہ نے کیا پیغام بھیجا ہے؟“ سلطان نے اسے بولنے کی اجازت دی۔ ”سلطانہ عالیہ نے پیغام دیا ہے کہ سلطان معظم خود ان کے پاس تشریف لے آئیں! انہیں قدم بوسی کی اجازت مرحمت فرمائیں؟“

”کوئی خاص کام ہے سلطانہ کو؟“ سلطان فکر مند ہو گیا۔ ”کنیز یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن بات کچھ ایسی ہے۔“ سلطان ایک دو لمحے سوچ کر بولا۔ ”سلطانہ سے کہو کہ ہم آ رہے ہیں۔“

سلطانہ کا دوسری بیگمات کے مقابلے میں زیادہ وقار ہونے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو وہ سلطان محمود کے بیٹے شہزادہ داؤد کی ماں تھی دوسرے یہ کہ سلطانہ کا باپ سلطان خیر تھا جو تاریخ میں ”سلطان عظیم“ کے نام سے مشہور ہے۔ سلطان عظیم سلجوقیوں کی بزرگ ترین شخصیت تھی۔ اس کے حکم پر سب ہی سر جھکاتے تھے۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا صرف سلطانہ

نے عہد کی شادی اپنے بھائی گل جاہ کے ساتھ طے کر دی ہے۔  
 نایاب گھبرا گئی۔ پوچھا۔ ”سلطان نے سلطان سے نہیں پوچھا؟ سلطان نے تو مجھے

اجازت دی ہے؟“  
 ”مجھے کچھ پتا نہیں ہے بائی۔“ اور نعمان بچوں کی طرح سسکنے لگا۔ نایاب اسے تسلی دے رہی تھی کہ سردار عماد الدین زنگی گھر میں داخل ہوا۔ اس کی پہلی نظر ان دونوں پر پڑی۔ نایاب، نعمان کی طرف جھکی ہوئی کچھ کہہ رہی تھی۔ زنگی کو دیکھ کر سنبھلی اور جلدی سے سر پر دوش ڈال لیا۔ زنگی اسے تیز نظروں سے دیکھتا ہوا ایک کمرے میں چلا گیا۔ نایاب نے نعمان کو سمجھا بھجا کر واپس بھیجا اور تیز تیز قدموں سے شوہر کے پاس پہنچی۔ زنگی بغیر لباس تبدیل کیے مسہری پر لیٹا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ نایاب کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ زنگی اس وقت غصے میں بھرا ہوا ہے۔ اس نے زنگی کے ... شانے پر محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”سنئے۔ ایک مصیبت آپڑی ہے۔ آپ کچھ مدد کیجئے۔“

عماد الدین زنگی نے کروش لے کر نایاب کو قہر آلود نظروں سے دیکھا اور سخت لہجے میں بولا۔ ”مصیبت تو تم خود اپنے ساتھ لے کر آئی ہو۔ مجھ سے مدد مانگتے ہوئے شرم آتی چاہئے۔“

نایاب ہکا بکا رہ گئی۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ اس نے مردہ آواز میں کہا۔ ”سردار یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“

پھر جو نایاب نے رونا شروع کیا ہے تو خدا کی پناہ۔ آنسوؤں کی تھری لگ گئی اس کی سسکیوں پر تمام کنیزیں جمع ہو گئیں۔ وہ نایاب کو جتنا سنبھالتیں اتنا ہی نایاب مچھلی کی طرح زیادہ ترپتی۔ رو رو کر اس نے جان ہکان کر لی۔ عورت کے آنسو دیکھا بڑے دل گردے کا کام ہے، پھر ایسی عورت جس سے مرد کو محبت ہو۔ ایسی عورت کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر ہی سنگدل سے سنگدل مرد کا دل موم ہو جاتا ہے۔

زنگی گم سم بنا مسہری پر بیٹھا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا تھا۔ اسے اپنے اوپر بھی غصہ آرہا تھا۔ بغیر نایاب کی بات سننے اس نے شک کیوں کیا نعمان کے بارے میں تو سلطان

نے بھی اسے سمجھایا تھا پھر اس نے جلد بازی کیوں کی کچھ پوچھا ہوتا۔ تحقیق کی ہوتی۔ زنگی مسہری سے اٹھا اس نے کنیزوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا، پھر نایاب کے قریب بیٹھ کر اس کا سراپے زانوں پر رکھ لیا۔ نایاب کی سسکیاں بند ہو گئیں۔

زنگی نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”جان زنگی۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔“

ترش لہجے کا بھی افسوس ہوا۔ اس نے فوراً پیار و محبت کا سہارا لیا اور ہونٹوں پر مصغرتہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی۔ ”سلطان معظم۔ شادی بیاہ کے معاملات خواتین طے کرتی ہیں۔ ہم نے عہد کو اپنے بھائی گل جاہ کے لئے پسند کر لیا ہے۔ عہد اسی سے بیاہی جائے گی۔ سلطان کو اس وقت اسی لئے زحمت دی گئی ہے کہ وہ اس کی منظوری عطا فرمائیں۔“  
 سلطان کا جلال ابھی کم نہ ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”سلطانہ کو کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ کرنا چاہئے تھا۔ تمہیں ہماری بات رد کرنے کا حق کس نے دیا ہے؟“

سلطانہ مصالحت پر اتر آئی تھی۔ نرمی سے بولی۔ ”یہ حق مجھے خود عالیجاہ نے عطا فرمایا ہے۔ ہماری شادی کی پہلی شب میں سلطان نے فرمایا تھا کہ محل کے تمام اندرونی معاملات میں سلطانہ خود مختار ہوگی بشرطیکہ وہ ملکی معاملات میں دخل نہ دے۔ میں سلطان کے حکم پر عمل پیرا ہوں۔ عہد کی شادی محل کا اندرونی مسئلہ تھا جس کے لئے مجھے خود مختار کر دیا گیا ہے۔“

سلطانہ نے اپنی شادی اور پہلی شب کا ذکر کیا تو سلطان کے تصور میں شادی کا نقشہ گھوم گیا۔ اس کیفیت میں وہ ایسا ڈوبا کہ سب کچھ بھول گیا۔ اس نے سلطانہ کو پیار بھر نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”سلطانہ تمہیں شادی کی شب اول اب تک یاد ہے۔“  
 سلطانہ شرما گئی۔ سر جھکا کر بولی۔ ”کوئی عورت ان یادگار لمحوں کو زندگی بھر نہیں بھولتی۔“

نعمان اور عہد کی شادی کا مسئلہ الجھ کر رہ گیا۔ نایاب نے محل سے واپس آنے نعمان کی شادی کی تیاری شروع کر دی تھی۔ سلطان کے رضا مند ہو جانے کے بعد تو کچھ جھگڑے کا امکان ہی نہ تھا مگر تیسرے ہی دن نعمان منہ لٹکائے ہوئے اس کے پاس آیا۔ نعمان اب تک نایاب کے محل میں منتقل نہ ہوا تھا اور پرانی حویلی میں رہ رہا تھا مگر نایاب کے یہاں بلاناغہ آتا تھا کبھی کبھی تو اس کے دن میں تین تین پھیرے ہو جاتے تھے۔ نایاب نے نعمان کو افسردہ دیکھا تو وہ ترپ اٹھی۔ وہ بھائیوں کی طرح اسے چاہتی تھی۔ اس نے ہنس کر پوچھا۔ ”کیا ہوا میرے شہزادے کو کیا عہد سے لڑائی ہو گئی؟“

”نہیں بائی۔“ نعمان نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”وہ بیچارہ تو خود ہی مصیبت کا پھنس گئی ہے۔ اسے تو ایک لمحہ بھی قرار نہیں ہے۔“

”اب قرار آجائے گا۔“ نایاب نے ہنس کر کہا۔ ”دو چار بدن بعد میں سردار زنگی ساتھ لے کر عہد کی ماں کے پاس جاؤں گی۔ شادی کی تاریخ اسی دن کی ہو جائے گی۔“  
 ”میری شادی عہد سے نہیں ہو سکتی بائی۔“ نعمان غمگین لہجے میں بولا۔ ”سلطانہ



ساری خوشی خاک میں ملا دی ہے۔“ نایاب افسردہ ہو گئی اور اس کے آنسو چھلک آئے۔  
سلطانہ کے نام سے سردار زنگی بھی مرعوب ہو گیا۔ آہستہ سے پوچھا۔ ”کیا علیہ سلطانہ کو نعمان پسند نہیں؟“

”نعمان کو انہوں نے دیکھا ہی نہیں۔“ نایاب نے کہا۔ ”سلطانہ کے دور کے رشتے کے ایک بھائی ہیں، ظل جاہ۔ انہوں نے آتے جاتے کہیں عنبر کو دیکھ لیا۔ بس لٹو ہو گئے اس پر۔ انہوں نے سلطانہ سے کہا اور سلطانہ نے اعلان کر دیا کہ عنبر کی شادی ظل جاہ سے ہوگی۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ زنگی کو بھی فکر لگ گئی۔ ”علیہ سلطانہ کا کہا سلطان بھی نہیں ٹال سکتا۔ اب کیا کیا جائے؟“

”یہی پوچھنے تو میں آپ کے پاس آئی تھی؟“  
”خیر دیکھا جائے گا۔ میں کسی موقع پر سلطان سے ذکر کروں گا۔ اللہ نے چاہا تو بات بن جائے گی۔“ زنگی جانے کے لئے کھڑا ہو گیا۔  
”آپ موقع کا انتظار کرتے رہیں گے اور عنبر بیاہ کر ظل جاہ کے پاس چلی جائے گی۔“ نایاب مایوسی سے بولی۔

”فکر نہ کرو نایاب۔ میں آج ہی سلطان سے بات کرنے کی کوشش کروں گا۔“  
عماد الدین زنگی، سلطان کے پاس پہنچا تو اسے بہت فکر مند پایا۔ سلطان کا چہرہ پھیکا پڑ گیا تھا اور وہ مینوں کا پیار لگ رہا تھا۔

”زنگی۔“ سلطان نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”سلجوقی امیروں میں ہمیں تم پر سب سے زیادہ اعتماد ہے ہمیں افسوس ہے کہ ہم تمہیں اب تک نظر انداز کرتے رہے لیکن اب ہم تمہاری صلاحیتوں کے قائل ہو گئے ہیں۔ ہم نے ایک فرمان جاری کیا ہے جس کی رو سے.... تمہیں، امیر کا خطاب دیا گیا ہے۔“

”عالیجاہ میری جان آپ پر قربان ہو۔“ زنگی نے تشکر آمیز لہجے میں کہا۔ ”میرے لئے تو حضور کی خدمت ہی سب سے بڑا اعزاز ہے میں کوشش کروں گا کہ سلجوقی خاندان کی خدمت کرتے کرتے میری عمر گزر جائے۔“

”ہم نے تم سے بڑی امیدیں لگا رکھی ہیں امیر زنگی۔“ سلطان نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ ”اس وقت ہم نے تمہیں اس لئے بلایا ہے کہ سلطانہ کی طبیعت ایک دم خراب ہو گئی ہے۔ سلطانہ چونکہ سلطان عظیم کی بیٹی ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ان کا علاج بڑے معقول طریقے سے کیا جائے۔ اس علاج کی ذمہ داری ہم تمہیں سونپتے ہیں۔ شاہی طبیب

نایاب سنبھل کر بیٹھ گئی۔ پلو سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے بولی۔ ”آپ مجھ سے م مانگ کر گنہگار نہ کیجئے۔ غلطی میری ہے۔ میں نے کیوں ایک غیر بچے کو بھائیوں کی را چاہا۔“

”نہیں نایاب۔“ زنگی نے اس کے منتشر بال سمیٹتے ہوئے کہا۔ ”میرا دل تمہا طرف سے صاف ہو گیا۔ میں نعمان کو تمہارا بھائی ہی سمجھوں گا۔ سلطان نے مجھے حکم دیا کہ میں نعمان کو ساتھ رکھوں اور اس کی وفاداری پر شک نہ کروں۔“

”سردار۔ آج کے واقعے نے مجھ لرزا دیا ہے۔“ نایاب نے استغفال سے کہا۔ ”نعمان کو منع کر دوں گی کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ شادی سے پہلے سلطان معظم اور نہ کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہ تھا لیکن آپ میرے سر تاج اور محافظ ہیں۔ میں آپ کی بزد سب کچھ قربان کر دوں گی۔ آپ نعمان کو یہاں کبھی نہ دیکھیں گے۔“

”نادان۔“ زنگی نے نایاب کے گال تھپ تھپائے۔ ”جب میں نے کہہ دیا کہ مجھے نہ سے کوئی شکایت نہیں تو پھر اسے روکنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو اسے اپنے ہا سواروں میں شامل کر رہا ہوں۔“

نایاب کی ویران آنکھوں میں چمک اگئی اور اس نے زنگی کو کچھ اس انداز سے کہ اس پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ اسی وقت کینز نے اطلاع دی کہ شاہی چوہدار آیا۔ سلطان نے زنگی کو فوراً طلب کیا۔ زنگی محبت سے پر اس باحول کو چھوڑنا نہیں چاہتا اس نے کینز سے کہا۔ ”چوہدار کو روکو۔ میں تیار ہو کر ابھی آتا ہوں۔“

کینز کے جانے کے بعد زنگی نے پوچھا۔ ”جان زنگی۔ وہ بات تو بتاؤ جو میرے شکا تمہارے آنسوؤں میں بہہ گئی تھی کیا مصیبت آ پڑی ہے تم پر۔ تمہاری مصیبت ہا مصیبت ہے ہم دونوں مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔“

”سرتاج میں نے نعمان کی شادی طے کی تھی۔“  
”ارے واہ۔ تم نے ہمیں خبر ہی نہ کی۔“ زنگی نے خوشی سے نایاب کی بات ڈی۔

”یہی بتانے تو میں آپ کے پاس آئی تھی۔“ نایاب نے کہنا... شروع کیا۔ ”نعمان سلطانہ کی کینز خاص کی بیٹی عنبر کو پسند کیا ہے میں نے اسے دیکھا ہے۔ بڑی خوبصورت نیک بچی ہے۔“

”تو پھر نیک کام میں دیر کیسی۔ فوراً شادی کر دو۔“ زنگی نے پھر بات کاٹ دی۔  
”سنئے تو میں نے شادی کی چپکے چپکے تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں لیکن سلطانہ

کے علاوہ دور اور نزدیک کے جس طبیب کو تم چاہوں بلا سکتے ہو۔ ہمیں سلطانہ سے علاوہ تمام علاقوں پر صلیبیوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ انہیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ اس قدر محبت ہے خدا خواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو ہم بھی زندہ نہ رہیں گے۔“

”غل سبحانی قطعی فکر نہ کیجئے۔ زنگی سلطانہ کے علاج میں اپنی جان لڑا دے گا۔“ سلطان کی طویل بیماری نے ملک میں خانہ جنگی کی صورت پیدا کر دی تھی۔ سلطان کے بھائی زنگی اپنے گھر واپس آیا۔ اس نے نایاب کو سلطانہ کی بیماری کی خبر سنائی اور اسی اور دوسرے عزیز اپنے اپنے لشکر درست کر رہے تھے تاکہ سلطان کے مرتے ہی حکومت پر ایک تیز رفتار سوار کو بغداد روانہ کیا اسے معلوم تھا کہ بغداد کے دربار خلافت سے کئی قبضہ کر لیں۔

قسم کے طبیب وابستہ ہیں۔ اس نے سوار کو خلیفہ کے نام ایک خط دیا تھا جس میں اس درخواست کی تھی کہ سلجوقی سلطانہ کی جان بچانے کے لئے وہ اپنے خاص طبیب فوراً روانہ کر دیں۔

انسان لاکھ تدبیر کرے مگر تقدیر پر کسی کا زور نہیں چلتا۔ زنگی کا سوار ابھی بغداد راستے ہی میں تھا کہ سلطانہ کا انتقال ہو گیا۔ ہمدان کے طبیب اس کے مرض کی تشخیص نہ کر پائے تھے کہ سلطانہ اس دنیا سے منہ موڑ گئی۔ زنگی جس وقت نایاب کو ساتھ لے شہابی محل میں پہنچا تو وہاں قیامت کا منظر تھا۔ سلطان محمود کی عزیز ترین بیگم کی موت طوفان برپا کر دیا تھا۔ غلام اور کنیزیں دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ امراء سلطان کو گم ہوئے اسے سنبھال رہے تھے۔ سلطان ایک شب پہلے بڑھال ہو گیا تھا اس وقت تو اس حال نہ دیکھا جاتا تھا۔ کبھی سر کے بال نوچتا کبھی منہ پر ٹھانچے مارتا۔ اس کا گریبان چاک اور دیوانوں کی طرح محل کے کمروں میں بھاگتا پھرتا تھا۔ نو عمر شہزادہ داؤد اپنی ماں کی

سے چٹ کر بچپانیں کھا رہا تھا۔ ظہر کی نماز کے بعد سلطانہ کے جنازے کا خاموش جلوس آخر منزل کی طرف ہوا۔ سلطان محمود برہنہ سر اور برہنہ پا جنازے کے ساتھ تھا۔ چوبیس گھنٹے کے اندر ہنتی بولتی سلطانہ ہزاروں من مٹی کے نیچے دب گئی۔ سلطانہ کا باپ سلطان سنجر عظیم جنازے میں شریک نہ ہو سکا۔ وہ پانچویں دن ہمدان پہنچ سکا۔

سلطان محمود سلجوقی کو ممکن ہے کوئی پوشیدہ بیماری بھی ہو لیکن سلطانہ کی موت اسے ہمیشہ کے لئے صاحب فراش کر دیا اس نے دربار میں جانا ترک کر دیا۔ صرف چند کو اس سے ملنے کی اجازت تھی۔ شہابی دربار اجڑ گیا سلطانہ کا محل اس سے پہلے ہی گیا تھا۔ غبر کی ماں محلات کی سرداری تھی۔ سلطانہ کی آنکھ بند ہوتے ہی اس کی ماتحتوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ سلطان بیمار تھا۔ وہ کسی سے شکایت بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صلیبی، اسلامی سلطنتوں پر چھاتے چلے جا رہے تھے۔ مسلمانوں ایک ایک کر کے کئی علاقے انکے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ دمشق، حماہ، حمص اور حلب

ایک شب امیر زنگی نے نایاب سے کہا۔ ”میں سمجھتا تھا کہ یہ لڑکا صرف عشق و عاشقی میں آگم بھانا جانتا ہے لیکن اس نے تو کمال کر دیا۔“

نایاب چمک کر بولی۔ ”آخر بھائی کس کا ہے۔ یہ بھی آپ نے غور فرمایا ہے؟“

”وہ تو خیر ظاہر ہی ہے۔“ امیر زنگی ہنسا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمام محلات میں غبر کی ماں کو تلاش کرایا تھا لیکن کہیں پتہ نہ چل سکا۔ نعمان بے چارے کا نہ معلوم کیا حال ہو گا۔“

”امیر محترم۔ نعمان کے حق میں یہ اچھا ہی ہوا۔“ نایاب نے کہا۔ ”نہ اس کا دل ٹوٹا



اور نہ اس سے یہ بہادری ظاہر ہوتی۔“  
 ”یہ تو ٹھیک ہے نایاب۔“ امیر افسردگی سے بولا۔ ”مگر اسے خبر ملنا چاہئے۔ غزالی طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی تھیں۔ شخصی حکومت میں اگر بادشاہ دو دن کے لئے نہ معلوم اسے لئے کہاں کہاں پھر رہی ہوگی۔“

اس رات کے بیشتر حصے میں میاں یوی نعمان ہی کا ذکر کرتے رہے۔  
 امیر عمادالدین زنگی نے تمام چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کو زیر کیا اور موصل، جیت میں دل چسپی ظاہر کی۔ عیسائیوں نے حارم کی نصف آمدنی دینے کی زنگی کو پیش

انتظامات سے پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد اس نے شام کے ان علاقوں کا رخ کیا۔ امیر نے یہ بات منظور کر لی اور کامیاب و کامراں موصل واپس ہوا۔  
 پر صلیبیوں نے قبضہ جمالیا تھا۔ شام میں صلیبیوں کا سب سے بڑا قلعہ اثارب تھا۔ قلعہ اثارب اور حارم کی فتوحات پر دنیائے اسلام میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں مرکز سے نکل کر صلیبی، مسلمان علاقوں پر یورش کرتے تھے۔ امیر زنگی نے ۱۲۳۱ء میں اسی وقت سلجوقی سلطنت میں صف ماتم بچھ گئی۔ امیر عمادالدین نے ابھی موصل میں اثارب پر فوج کشی کی۔ صلیبیوں نے قلعہ سے نکل کر مقابلہ کیا۔ بڑی خونریز جنگ لڑا گیا تھا کہ سلطان محمود سلجوقی کش کش حیات سے آزاد ہو گیا۔ سلجوقی امراء اور شاہی صلیبیوں نے بہت زور مارا مگر زنگی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ صلیبیوں کو ہمدان کے افراد میں جو لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا، وہ سلطان کی موت کی خبر آتے ہی فاش ہوئی۔ مسلمانوں کی عیسائیوں کے خلاف یہ پہلی فتح تھی۔ اس فتح سے دنیائے اسلام پر اثر پڑا۔ سلطنت کے دعویدار غم ٹھوٹک کر سامنے آگئے۔ امیروں کی وفاداریاں کئی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

فتح کی رات زنگی نے پھر نایاب سے کہا۔ ”نعمان نے آج ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہادر شہسوار ہے۔“  
 ”میرے سر نایاب یوں نہیں کیوں کہتے کہ نعمان شہسوار ہونے کے ساتھ ساتھ بھائی بھی ہے۔“ اور نایاب کھل کھلا کر ہنس پڑی۔  
 ”اب تو مجھے بھی خبر کی فکر ہو گئی ہے۔“ زنگی نے فکر مندی سے کہا۔ ”میرا“ عمادالدین زنگی کے باپ کا نام بھی تھا) سلطان کے کم سن بیٹے داؤد کو تخت نشین کر

ہے کہ وہ بغداد گئی ہوگی۔ میں کل ہی دربار خلافت میں عرضی بھیجوں گا اور طلبہ درخواست کروں گا کہ اس بے سارا کو تلاش کرانے میں میری مدد کریں۔“  
 صبح کو حارم کے قلعے کی طرف روانہ ہونے سے پہلے اس نے اس مضمون لکھے اس وقت کا دستور تھا کہ خلیفہ بغداد سے سند مانگی جاتی تھی عباسی خلیفہ مسترشد برسر عریضہ دربار خلافت میں مجبواً دیا۔ اثارب کے قلعے پر قبضے کے بعد زنگی نے اسے ہمدان کا دار الخلافہ بنایا۔ اس جنگ میں بے شمار عیسائی مارے گئے تھے، باقی بھاگ کر حارم کے قلعہ ہشامت کی سند عطا کی جائے۔ اسی دوران داؤد کا چچا مسعود اپنا لشکر لے کر ہمدان پہنچ گیا۔ گئے تھے۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا مرکز تھا۔ امیر زنگی نے حارم پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کرنے لگا۔ امیر نے بھی اپنی بادشاہت کی سند کے لئے خلیفہ کو درخواست بھیج دی۔

عیسائیوں کو کھلے میدان میں جنگ کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ امیر خلیفہ مسترشد، تھا تو نام کا خلیفہ لیکن سلجوقیوں کے اثر سے آزاد ہونے کی فکر میں لگا محاصرہ سخت سے سخت تر کرتا چلا گیا۔ قلعہ والے گھبرا اٹھے۔ اثارب کا حال وہ دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلجوقیوں کا کوئی ایسا سلطان بنے جو اس کے اثر میں رہے اس تھے۔ حارم کا بھی انہیں وہی حشر نظر آ رہا تھا۔ چند ہی دنوں بعد عیسائیوں نے صلح کی دونوں درخواستیں رکھ لیں اور خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔

چیت شروع کر دی۔  
 امیر عمادالدین زیادہ دن تک موصل سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ادھر سلطان ممقور سے لاؤ لشکر کے ساتھ خود ہی بغداد پہنچ گیا۔ سلجوق شاہ کا ساتھ امیر عمادالدین قزاقہ ساتی

”کیوں خیر تو ہے؟“ نعمان گھبرایا۔

”ہاں.... یہ.... انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“ زنگی نے گفتگو میں وقفہ دے کر اپنا

دے رہا تھا جس کے ساتھ خوزستان اور فارس کا بہت بڑا لشکر تھا۔ خلیفہ مسترشد نے بھی خوش آمدید کہا اور محل میں اتارا۔

امیر عماد الدین زنگی کی ہمدردیاں مسعود کے ساتھ تھیں مسعود کو معلوم ہوا کہ بغوم ادا کر دیا۔ نعمان نے سر کھاتے ہوئے کہا۔ ”بابی یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بغداد ہم پہلے شاہ بغداد پہنچ گیا ہے تو اس نے خلیفہ کو ایک دھمکی آمیز خط لکھا کہ اگر اسے سند نہ دیا اور اس کا نام خطبہ بغداد میں نہ پڑھا گیا تو وہ قوت استعمال کرے گا۔ خلیفہ کے پاس مرتبہ جارہے ہیں۔ آپ ساتھ ہوتیں تو خوب سیر کرتے۔“

”پہلے ہی بت سیر ہو چکی ہے۔“ نایاب نے جل کر کہا۔ ”ان مسلسل جنگوں نے تو وقت اپنی فوج کے علاوہ قراجہ ساتی کا کثیر لشکر موجود تھا۔ اس نے مسعود کی دھمکی پر واد نہ کی۔ مسعود کا سب سے بڑا حلیف امیر عماد الدین زنگی تھا۔ مسعود نے اسے حکم دیا کہ فوراً بغداد پہنچے اور سلجوق شاہ کو وہاں سے نکالے۔“

نایاب کی شادی جس دن سے زنگی کے ساتھ ہوئی تھی اسے ایک دن بھی چھین تھا۔ امیر زنگی کسی نہ کسی جنگ میں الجھا رہتا۔ وہ نایاب کو عام طور سے اپنے ساتھ لے جاتا۔ نایاب جنگ اور جنگی مناظر دیکھتے دیکھتے تھک گئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ امیر زنگی مینے کہیں تک کر بیٹھے مگر زنگی کو تو گھوڑے کی پیٹھ ہی پر لطف آتا تھا۔

نایاب نے امیر زنگی کے بغداد جانے کی سخت مخالفت کی۔ اس نے کہا۔ ”ان کا جواب دے سکتے ہو۔“ پھر ذرا ٹھہر کر بولا۔ ”نعمان میرا خیال ہے اس دفعہ تم نایاب کے اور بادشاہوں کو تو بس حکم دینا آتا ہے۔ آخر یہ لوگ کیوں نہیں دیکھتے کہ کسی کو گھرا پاس ہی رہو۔“

نعمان نے اس کا جواب پہلے ہی سوچ لیا تھا اس نے فوراً جواب دیا۔ ”امیر محترم۔ کیا ہے کچھ دن عیش و عشرت کی زندگی بھی گزارنا ہے۔“

”نایاب۔“ امیر زنگی نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہارا امیر جس دور سے ہے اس دور میں اگر اس کی تلوار کا خون خشک ہو جائے تو اس کی عزت، شہرت اور ختم ہو جاتی ہے۔“

”تو کیا آپ عمر بھی یونہی میدانوں میدانوں گھومتے پھریں گے؟“ نایاب ادا سے بولا۔

آپ ہی آپ شرمگنی اور سر جھکا کر کہا۔ ”امیر آپ جانتے ہیں کہ مجھے بھی ان دونوں کر گھرنیہ گیا ہے۔ یہ بات شاید بابی نایاب بھی پسند نہ کریں۔“

نایاب چاہتی تھی کہ بغداد کی جنگ کچھ عرصے کے لئے ٹل جائے اور دونوں ہی موصل بغداد نہیں لے جاؤں گا۔

”واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ نایاب تیزی سے بولی۔ ”کیا میں یہاں اکیلی رہوں گارہتا پسند ہے لیکن میں اپنے بھائی پر جس نے امیر کے ساتھ شہرت حاصل کی ہے، بزدلی کا میں نعمان کو تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔“ امیر کے منہ سے نکلا تھا کہ نعمان کو نہ لگنے دوں گی۔

میں داخل ہوا۔ ”نو وہ نعمان آگیا۔ اس سے پوچھتے ہیں۔“

نعمان کے کان میں اپنے نام کی آواز پڑ گئی تھی۔ اس نے امیر اور نایاب کو اور بڑی سعادت مندی سے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

”نعمان اس بار تمہاری بابی ہمارے ساتھ نہیں جا رہی ہیں۔“



ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔“

”خواتین؟ مجھ سے؟“ امیر نے بوکھلا کر کینز کو دیکھا۔

نایاب نے اسی وقت نکلنا لگایا۔ ”امیر آپ کی شہرت چار دانگ عالم میں پھیل رہی ہے۔ ابھی تو خواتین ملنے آئی ہیں کچھ دونوں کے بعد خواتین کے پیغامات آنا شروع ہو جائیں گے۔“

امیر زنگی کھیانا سا ہو گیا۔ اس نے نایاب کو گھور کر دیکھا۔ نعمان نے نایاب کے اظہارے خوب لطف اٹھایا لیکن فوراً سر جھکا لیا تاکہ امیر اس کے سامنے شرمندگی نہ محسوس کرے۔

کینز نے خواتین کو انتظار کے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ امیر زنگی کمرے میں داخل ہوا وہاں دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ دونوں زنگی کے لئے اجنبی تھیں۔ عورتیں اسے دیکھ کر توجہ کے لئے کھڑی ہو گئی۔

امیر عماد الدین زنگی نے نرمی سے پوچھا۔ ”بہن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آپ کہاں دیکھا ہے پھر بھی آپ فرمائیے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ عورتوں میں ایک عمر رسیدہ تھی۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ”کیا نعمان آپ ساتھ رہتے ہیں؟“

”ہاں ہاں وہ میرے ہی ساتھ رہتا ہے۔“ امیر نے جواب دیا۔ ”اس وقت گھر موجود ہے۔“

”اے اللہ! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ عورت نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اے امیر! کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ میری بیٹی ہے۔ نعمان کی امانت۔ اگر نعمان اسے قبول کرے تو میں سمجھوں گی کہ مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔“

”تمہاری بیٹی؟“ امیر نے حیرت سے ان دونوں کو دیکھا ”کیا یہ غبر ہے۔ تم غبر کی ماں ہو؟“

”جی ہاں امیر۔ میں غبر کی ماں ہوں۔“ اور اس عورت کے آنسو بہنے لگے۔ ”ارے نایاب۔“ امیر وہیں سے چلایا۔ ”جلدی آؤ۔ دیکھو کون آیا ہے۔ نعمان تم آؤ غبر کی اماں آئی ہیں۔“

امیر کی آواز پر نایاب اور نعمان تیزی سے کمرے میں آئے نعمان کی نظر سب سے پہلے غبر پر پڑی۔ اس کی زبان سے صرف ”غبر“ نکل سکا غبر بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور نعمان کہہ کر رونے لگی۔

نایاب نے غبر کی ماں کو سلام کیا اور غبر کو گلے لگا کر تسلی دینے لگی۔ یہ بلا

چپ اور خوش گوار ملاپ تھا۔ غبر..... اور نعمان کو ایک دوسرے سے ملنے کی کوئی امید نہ تھی۔ غبر کی ماں غبر کو لئے خاک چھانی بغداد پہنچی۔ خلیفہ کے پاس امیر زنگی کا خط پہنچ چکا تھا۔ خلیفہ مسترشد، امیر زنگی کی بڑھتی ہوئی طاقت سے بہت خائف تھا اور اسے پسند نہ کرتا تھا۔ لیکن ہمدان اور بغداد میں جو حالات پیدا ہو رہے تھے اس کے پیش نظر خلیفہ نے پورے بغداد میں غبر کی ماں کو تلاش کرایا غبر اور اس کی ماں برآمد کر لی گئیں۔ خلیفہ نے اسی وقت پانچ محافظوں کے پرے میں غبر اور اس کی ماں کو موصل بھجوا دیا۔

امیر نے خلیفہ کے آدمیوں کو انعام و اکرام سے نبال کر کے بغداد واپس بھیج دیا اور اسی شام نعمان اور غبر کا عقد پڑھایا گیا کیوں کہ دوسرے دن امیر زنگی اور نعمان کو بغداد روانہ ہونا تھا۔

امیر نے رات کو نایاب سے کہا۔ ”اب تم اکیلی نہیں رہو گی نایاب۔ اپنے گھر غیبی فرشتے آگئے۔“

”مگر امیر۔“ نایاب شوخی سے بولی۔ ”کیا یہ نعمان پر ظلم نہ ہو گا کہ اسے دلہن سے ایک دن کے بعد جدا کر دیا جائے؟“

”نایاب یاد رکھو۔“ امیر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ”سپاہی کو جو لطف میدان جنگ میں ملتا ہے وہ اسے پھولوں کی سچ پر حاصل نہیں ہوتا۔“

نایاب اپنے شوہر کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ دوسرے دن امیر عماد الدین زنگی اور نعمان لشکر لئے بغداد جا رہے تھے۔

بوللا۔ ”میرے آقا! یہ باتیں آپ مجھے ہر پڑاؤ پر سمجھاتے ہیں اور انھیں سنتے سنتے میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ میں امیر زنگی کا واقعی باغی ہوں اور میرے دل میں ان کے لیے نفرت سی پیدا ہونے لگتی ہے۔“

”شاباش یوسف“ ساتھی نے خوش ہو کر کہا۔ ”ہم دونوں کو اپنا ذہن انہی خطوط پر ڈھالنا ہے۔ اگر ہم شہنشاہ قسطنطنیہ کے سامنے خود کو امیر زنگی کا باغی ثابت کرنے میں ناکام رہے تو ہمیں یا تو کسی قید خانے میں ڈال دیا جائے گا یا پھر غلام بنا کے فروخت کر دیا جائے گا۔“

”آقا، آپ اطمینان رکھیے۔ امیر زنگی نے ہم پر اعتماد کیا ہے ہم ان کے اعتماد کو مجروح نہ ہونے دیں گے۔“ یوسف نے بڑے جوش سے کہا

”تو پھر بسم اللہ کرو۔“ ساتھی نے کہا۔ ”اپنے گھوڑے کو پیچھے ہٹا کر اس تیز رفتاری سے چوکی میں داخل ہو کہ رومی یہ سمجھیں کہ تمہارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“

یوسف اور گرائڈیل سوار اپنے گھوڑوں کو کچھ دور پیچھے ہٹا کے لے گئے پھر ایڑے کر آہٹھی اور طوفان کی طرح گھوڑے بھگانے لگے۔ ابھی رات کا پہلا حصہ تھا اور چوکی کے رومی سوار اور پیادے کھانے کا انتظام کر رہے تھے۔ انھوں نے دو اجنبی سواروں کو چوکی میں بے تحاشا داخل ہوتے دیکھا تو ہکا بکا رہ گئے مگر وہ فوراً ”سنبھلے اور گھوڑوں پر سوار ہو کے ان کے پیچھے بھاگے۔“ یوسف اور اس کے ساتھی نے تھوڑی دور جا کر گھوڑوں کی رفتار کم کر دی اور جب رومی ان کے پاس پہنچے تو دونوں گھوڑے روک کر نیچے اتر آئے۔

”قیصر روم کی دہائی ہمیں دشمنوں سے بچالو۔“ یوسف نے ہانپتے ہوئے کہا۔ وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا اور بار بار پیچھے کی طرف گھوم کے خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

رومی انھیں بڑی حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ ان دونوں کے لباس سے انھیں اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ مسلمان ہیں پھر بھی ایک رومی سردار نے دریافت کیا۔ ”تم لوگ مسلمان معلوم ہوتے ہو؟“

”ہاں سردار ہم مسلمان ہیں۔“ یوسف نے سانس سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن اب مسلمان ہی ہمارے دشمن ہو رہے ہیں۔ ہم تمہیں حضرت یسوع مسیح کا واسطہ دیتے ہیں۔ ہمیں ان کے حوالے نہ کرنا۔ وہ ہمیں مار ڈالیں گے۔“

”کس کے حوالے نہ کرنا؟ کون ہے تمہارا دشمن؟“ سردار نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ یوسف نے سہمی نظروں سے مشرق کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ موصل سے ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔ ہمیں بچاؤ، اپنی پناہ میں لے لو۔“

سردار کو یوسف کی حالت پر رحم آگیا۔ اس نے یوسف کی پیٹھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا

## خوبصورت قیدی

سلطنت روما کی مشرقی چوکی روشنیوں میں جگمگا رہی تھی۔ جاسوسوں نے راسیں کھینچ کے گھوڑے روک لیے۔ یہ دونوں سوار گزشتہ دو ماہ سے مسلسل سفر کرتے آرہے تھے۔ موصل سے قسطنطنیہ کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں لیکن وہ دن کے بجائے رات میں سفر کرتے تھے۔ اس سفر میں وہ مسلم علاقے سے بھی گزرے اور نصرانیوں کی زمین بھی ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کے نیچے رہی۔ وہ مسلمان تھے اگر چاہتے تو مسلم آبادیوں میں ٹھہر سکتے تھے۔ ان کا تعلق امیر عماد الدین زنگی کی سلطنت سے تھا اور اس سلطنت کے مسلمان اپنے مجاہدانہ کارناموں کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں شہرت رکھتے تھے لیکن انھیں مسلمانوں اور نصرانیوں سے اپنی شخصیت چھپانا تھی تاکہ وہ بغیر کسی پریشانی کے مشرقی رومی سلطنت کے دار السلطنت قسطنطنیہ پہنچ سکیں۔ اور قسطنطنیہ ہی ان کی کارروائیوں کا مرکز تھا۔

گرائڈیل سوار نے چوکی کی روشنیوں پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ”یوسف! خدا کا شکر ہے کہ ہم اس مقام پر آپہنچے جہاں سے ہمیں اپنے کام کا آغاز کرنا ہے۔ یاد رکھو ہم امیر زنگی کے باغی سوار ہیں۔ امیر نے ہماری گرفتاری کے لیے اپنا ایک دستہ مقرر کیا ہے اور ہم اس سے جان بچاتے یہاں تک پہنچے ہیں۔“

کم عمر جوان جو اپنے ساتھی کی باتیں غور سے سن رہا تھا، اس کے خاموش ہونے پر



”آپ ہماری سفارش تو کر سکتے ہیں؟“

”تم کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔“ سردار ناگواری سے بولا۔ ”قیصر روم کے دربار میں سفارش کرنا تو الگ بات ہے وہاں داخل ہونے کے لیے بڑے بڑے والیان ریاست کو مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں پہلے وزیر سلطنت جان قوش (جان کوس) کو مطمئن کرنا ہو گا۔ وہ چاہیں تو تمہاری سفارش کر سکتے ہیں۔“

یوسف اور اسد الدین کی حلاشی شروع ہوئی۔ انھوں نے رومی چوکی میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنی تلواریں اور کمائیں جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں پوشیدہ کر دی تھیں۔ سوائے خنجر کے انکی پاس سے اور کچھ نہ نکلا۔ اسد الدین اس دوران بالکل خاموش رہا تھا مگر جب انھیں مسلح سواروں کے پہرے میں ایک خیمے میں رکھا گیا تو اسد الدین نے آہستہ سے کہا۔ ”میں گھبرا رہا تھا کہ کہیں تمہارے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے کہ ہم پہلی ہی بیڑھی پر پکڑے جائیں مگر تم نے کمال کر دیا۔ سردار ہماری طرف سے مطمئن ہو گیا ہے۔“

”آقا یہ سب آپ کی مہربانی اور تربیت کا طفیل ہے۔“ یوسف نے بڑے ادب سے کہا۔ ”سب سے کٹھن وقت تو وہ ہو گا جب ہمیں قیصر کے سامنے پیش کیا جائے گا۔“

”قیصر نہیں یوسف۔“ اسد الدین نے ٹوکا۔ ”پہلے ہمارا وزیر سلطنت سے سابقہ پڑے گا۔“

”آپ نے ٹھیک فرمایا آقا۔“ یوسف نے غلطی تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”پتہ نہیں یہ وزیر سلطنت درمیان میں کہاں سے آگیا۔ معلوم نہیں کس دماغ کا ہے وہ۔“

”آگے میں سنبھال لوں گا، تمہیں فکر کی ضرورت نہیں۔“ اسد الدین نے اسے تسلی دی۔ ”وزیر سلطنت اور قیصر سے میں گفتگو کروں گا۔ تم صرف اس وقت بولنا جب تم سے سوال کیا جائے اور جواب دیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا کہ تم عماد الدین زنگی کے باغی ہو۔ زنگی کی جس قدر ہو سکے برائی کرنا ہی ہمارے لیے مفید ہے۔“

یوسف نے جواب دیا۔ ”آقا! میں آپ کے حکم کی پوری تعمیل کروں گا مگر اب جو ایک نئی مشکل آپری ہے اس کا آپ نے کیا حل سوچا ہے؟“

”یوسف!“ اسد الدین نے سخت لہجے میں کہا۔ ”مشکل کا نام نہ لو۔ ہم مشکلات ہی سے کھیلنے تو آتے ہیں۔ ہمارے اس سفر اور منصوبے کی بنیاد ہی مشکلات پر رکھی گئی ہے۔ ہمیں انہی کانٹوں کے درمیان سے راستہ بنانا ہے۔“

یوسف سمجھ گیا۔ بولا۔ ”آقا مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آپ ایک مانے ہوئے شمشیرزن ہیں۔ آپ کے جوہر میدان جنگ میں کھلتے ہیں۔ یہ جاسوسی کی ذمہ

”گھبراؤ نہیں۔ تم اب قیصر روم شہنشاہ جان کامنی نس کی حدود مملکت میں ہو۔ یہاں سوائے ہمارے کوئی اور تم پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ اب بتاؤ تم کون ہو اور تم پر کیا جاتی ہے؟“

”میرا نام یوسف ہے۔“ یوسف نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ”اور یہ ہیں میرے آقا اسد الدین۔ میرے آقا امیر موصل عماد الدین زنگی کے ایک معتمد سردار تھے لیکن امیر کے بعض سرداروں سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ میرے آقا بہت بڑے شمشیرزن ہیں۔ انھیں غصہ آگیا اور بارہ سرداروں کو انھوں نے اکیلے قتل کر دیا۔ سردار آپ غور کیجئے یہ بہادری کا کتنا بڑا کارنامہ تھا مگر امیر موصل نے میرے آقا کو قید خانے میں ڈال دیا۔ اپنے آقا کے بغیر میری زندگی اجیرن ہو گئی۔ میں جان توڑ کوشش کر کے آقا کو قید خانے سے نکال لایا۔ جب سے اب تک ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے، پھر ہم نے یہی مناسب سمجھا کہ رومی سلطنت میں داخل ہو کے ہم آپ سے پناہ مانگیں۔“

سردار یہ باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”یوسف تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ایک امیر یا بادشاہ کے مجرم ہو اور کسی دوسرے ملک کے شاہی مجرم کو مجھ جیسا ایک چوکی کا سردار پناہ نہیں دے سکتا۔“

”مگر سردار، اگر ہمارے دشمن یہاں آجائیں اور آپ سے ہمیں طلب کریں تو آپ ہمیں واپس تو نہیں کیجئے گا۔“ یوسف نے گھبراتے ہوئے کہا اور پر امید نظروں سے سردار کو دیکھنے لگا۔

سردار نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”رومی سرحد میں کوئی داخل ہونے کی جرات نہیں کر سکتا اور اگر تمہارے دشمن یہاں آگئے تو تمہیں واپس کرنے کی بجائے ہم انھیں بھی گرفتار کر لیں گئے۔“

”میں اور میرے آقا آپ کے شکر گزار ہیں۔“ یوسف نے کہا۔

”اپنے ہتھیار اور دوسری چیزیں ہمارے حوالے کر دو۔“ سردار نے گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم کل ہی تمہیں قسطنطنیہ بھیج دیں گے۔ تم وزیر سلطنت کے سامنے اپنی روداد پیش کرنا۔ انھوں نے مناسب سمجھا تو وہ تمہیں قیصر روم کے سامنے پیش کر دیں گے، ورنہ انکے خیال میں تم جس قاتل ہو اس کے مطابق تمہارے ساتھ سلوک کیا جائے گا۔“

”سردار! کیا آپ کو امید ہے کہ شہنشاہ روم یا وزیر سلطنت ہمیں پناہ دے دیں گے؟“

یوسف نے بڑے بھولے پن سے پوچھا۔

”میں اس کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتا۔“

داری۔۔۔۔۔

”اب ان باتوں کے سوچنے سے کچھ حاصل نہیں“ اسد الدین نے اس کی بات کا رد دی۔ ”تم نے دیکھا نہیں کہ محترم امیر عماد الدین زنگی نے اس کام کے لیے پچاس سرداروں میں سے میرا انتخاب کیا۔ جس طرح تم میرے حکم کی تعمیل کرتے ہو اس طرح میرا فرض ہے کہ میں اپنے امیر کے اعتماد کو برقرار رکھوں خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔“

یوسف نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسد الدین کو معا“ خیال آیا۔ اس نے پوچھا۔ ”یوسف تم کسی مشکل کا ذکر کر رہے تھے مجھے بتاؤ۔ میں اسے حل کرنے کی کوئی تدبیر کروں گا“ یوسف نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”آقا“ اب تک ہمارا رابطہ کسی نہ کسی طرح امیر زنگی سے قائم تھا مگر رومی علاقے میں داخل ہونے کے بعد یہ رابطہ ختم ہو گیا ہے۔ ہم موصول کوئی خبر کسی طرح پہنچا سکیں گے؟“

”یوسف تم ذہین ضرور ہو لیکن یہ بات تم نے ذرا دیر میں سوچی۔“ اسد الدین نے نرمی سے کہا۔ ”اس مسئلے پر میں نے پہلے ہی غور کر لیا تھا۔ صاف بات تو یہ ہے کہ رومی علاقے میں ہمیں بغیر کسی رابطے اور سارے کے کام کرنا ہو گا لیکن اشد ضرورت کے وقت ہم مصری سفارت خانے کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ آج کل سلطنت مصر اور قیصر قسطنطنیہ کے درمیان صلح کا معاہدہ ہے اور مصری سفارت خانہ قسطنطنیہ میں کام کر رہا ہے۔ یہ بات مجھے امیر زنگی نے بتا دی تھی اور میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ضرورت کے وقت مصری سفارت خانے سے کام لوں گا۔“

”آفرین ہے آپ کی عقل و دانش پر۔“ یوسف نے مسرت سے کہا۔ ”جس طرح آپ میدان جنگ کے شیر ہیں اسی طرح سیاسی چالوں کو بھی خوب سمجھتے ہیں۔“

”وقت سب کچھ سکھا دیتا ہے یوسف۔“ اسد الدین نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”میرے خاندان کو قلعہ ٹکرت سے جس ذلت کے ساتھ ٹکنا پڑا ہے، اسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اپنے خاندان کی تباہی کا میں ذمہ دار ہوں اور جب تک اپنے خاندان کو وہی عزت اور شہرت واپس نہ دلاؤں گا، مجھے چین نہ ملے گا۔ مجھے قسمت نے ایک سنہری موقع دیا ہے اگر میں امیر کے اس کام کو بخیر و خوبی انجام دے سکا تو میرے خاندان کے لیے ترقی کے راہیں کھل جائیں گی۔“

”بے شک آقا“ محترم۔ آپ صحیح فرما رہے ہیں۔“ یوسف نے اس کی تائید کی۔ اسد الدین کو محسوس ہوا کہ کوئی خیسے کے پردے سے اندر کی طرف جھانک رہا ہے۔

فورا“ خاموش ہو گیا۔ شاید اس کی آواز تیز ہو گئی تھی اور محافظ اپنے اطمینان کے لیے اندر جھانک رہا تھا۔۔۔۔۔ اسد الدین اور یوسف اپنی زبان میں گفتگو کر رہے تھے، اس لیے انھیں اطمینان تھا کہ اگر محافظ نے کوئی جملہ سن بھی لیا ہے تو وہ اس کے پلے نہیں پڑے گا۔

سوائے سخت پرے کے انہیں اس خیسے میں کوئی تکلیف نہ ہوئی اچھا کھانا دیا گیا اور آرام وہ بستر لگایا گیا۔ وہ بڑے اطمینان سے صبح تک سوتے رہے۔ دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے انھوں نے تیمم کیا اور خیسے کے ایک کونے میں دو فرض ادا کیے۔

چوکی سردار نے ان کے جانے کا رات ہی میں انتظام کر دیا تھا۔ صبح انھیں گھوڑوں پر سوار کر دیا گیا اور دس مسلح محافظوں کی معیت میں انھیں قسطنطنیہ روانہ کر دیا گیا۔ دوسرے دن اسد الدین اور یوسف بحر اسود کے کنارے آہٹائے باسنورس پہنچ گئے۔ باسنورس کے اس کنارے سے قسطنطنیہ کا عظیم الشان قلعہ اور شہر کے بلند و بالا محلات نظر آرہے تھے۔ جب وہ کشتیوں کے ذریعے آہٹائے باسنورس پار کر کے دوسری طرف پہنچے تو شہر کی شان و شوکت دیکھ کے ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

قسطنطنیہ کا قلعہ اور شہر شاخ زریں پر آباد ہے۔ اس کے ایک طرف باسنورس ہے اور دوسری طرف بحر اسود کی ایک پتلی بٹی خشکی میں دور تک گھمتی چلی گئی ہے۔ اس طرح قسطنطنیہ کے تین طرف سمندر کی قدرتی فصیلیں موجود ہیں صرف چوتھی سمت خشکی ہے جہاں قلعہ کا صدر دروازہ ہے۔ اپنے اس محل وقوع کی وجہ سے قسطنطنیہ اس وقت ناقابل تخریب تھا۔ یہ وہی قسطنطنیہ ہے، جس کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی فرمائی تھی۔

”تم ضرور قسطنطنیہ فتح کر لو گے۔ وہ فتح بھی خوب ہے اور اس کا امیر بھی خوب ہے۔“

اس کے ساتھ ہی حضور نے یہ بھی فرمایا تھا کہ۔

”میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر پر حملہ کرے گا اس کو اللہ نے بخش دیا ہے۔“ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر مسلمانوں کے لیے کس درجہ اہمیت کا حامل تھا اور مسلمانوں نے اس پیشین گوئی کی سعادت حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہو گا چنانچہ اس پر پہلا حملہ امیر معاویہ کے عہد میں ۶۳۸ء میں ہوا۔ حضرت معاویہ نے جو لشکر بھیجا اس میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ حضرت ابن زبیرؓ حضرت ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ وغیرہ شامل تھے حضرت ابو ایوب انصاریؓ قسطنطنیہ کے محاصرے کے دوران بیمار ہو کر وفات پا گئے تھے اور انھیں قلعہ کی فصیل کے قریب دفن کیا گیا تھا۔ دوسرا حملہ سلیمان بن عبد الملکؓ

تیسرا ہشام چوتھا عباسی خلیفہ ممدی کے زمانے میں ہوا تھا۔ عباسی لشکر کا سپہ سالار ہارون بن ابی اسحاق سے اتر کر ان کے پاس آیا اور دونوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ پہلے ان کی حاضری رشید تھا۔ پانچواں حملہ ملک شاہ سلجوقی نے کیا تھا۔ اس وقت تک یہی پانچ حملے ہوئے تھے۔ دفتر میں درج کی گئی پھر اچھی طرح تلاشی ہوئی۔ اس کے بعد انھیں محل کے خادم لیکن قلعہ فتح نہ ہو سکا تھا۔

قلعہ کی پرشکت تعمیر دیکھ کر یوسف اور اسد الدین کے دماغ میں اس کی پوری تیار ہر کی لیکن دفتر کے ناظم نے اس کی درخواست رد کر دی۔ مگر کچھ سوچ کر اس نے گھوم گئی۔ امن و امان کا زمانہ تھا اس لیے قلعے کے دروازے ہر فرد و بشر کے لیے کھلائے دیے۔

ہوئے تھے وہ امرا کے محلات کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک بہت بڑے محل کے سامنے وزیر سلطنت کا محل ایک قلعے کی مانند تھا۔ جگہ جگہ پہرہ لگا تھا، اور ہر دروازے پر پوچھ پھر گئے اس محل کے سامنے فوجی بیرکیں تعمیر تھیں۔ ذوق برق لباس اور چمکتے ہتھیاروں کا ہجوم ہوتی تھی۔ یوسف اور اسد محل کے خادم کے ساتھ ایک عظیم الشان محل کو حیرت بھری ساتھ ہزار سے زیادہ سوار اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ محل کی سیڑھیوں پر بیچے سے ان نظروں سے دیکھتے ہوئے راہداریاں، روشیں اور دروازے پار کرتے رہے۔ آخر وہ ایک تک سینکڑوں نیزے بردار کھڑے تھے۔

”آقا! ہم قیصر کے محل پر آگئے ہیں۔“ یوسف نے آہستہ سے کہا اسد الدین جوار تھا۔ پہلا پردہ موتیوں کی جھال کا تھا۔ اور دوسرا حریری معلوم ہوتا تھا۔ خادم انھیں باہر چھوڑ دینے والا تھا کہ ایک محافظ سوار نے اس سے کہا۔ ”مسلمان کہتے۔ تمہیں یہاں رکنا ہو اگر اندر چلا گیا۔ یوسف اور اسد سینکڑوں سے پردے کے دوسری طرف دیکھنے کی کوشش کر میں وزیر سلطنت کے دفتر جا رہا ہوں وہاں سے جو حکم ملے گا۔ اس پر عمل کیا جائے گا۔“ رہے تھے، مگر انھیں کچھ بھی نظر نہ آیا۔ کسی کسی وقت موسیقی کی مدھر آواز پردے سے سوار کی اس تحقیر آمیز گفتگو سے اسد الدین کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ یوسف نے گہرا لکڑائی ہوئی ان کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی۔

اسے ملتی تھی۔ اسد الدین کو بھی شاید وقت کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ اب رات ہو چکی تھی اور پورا محل رنگ برنگی روشنیوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ یوسف اور اس نے فوراً اپنا سر جھکا لیا۔ سوار گھوڑے سے اتر کر بیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر گیا اور اسد کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ڈر رہے تھے کہ کہیں وزیر کے دفتر کی طرح یہاں عالی شان محل کی بھل، صلیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔ باہر دھوپ پھیلی تھی اور سیڑھیوں پر بھی انھیں کئی دن انتظار نہ کرنا پڑے۔ اسی وقت خادم آیا اور جاسوسوں کو اپنے ساتھ آنے کسی کو چڑھنے کے اجازت نہ تھی۔ یوسف اور اسد الدین اپنے محافظوں کے ساتھ تمام محل کا اشارہ کیا۔ پردے کے پیچھے ایک بڑا ہال تھا۔ اس ہال سے ایک راستہ دوسری طرف جاتا دھوپ میں کھڑے تھے۔ محافظوں کو بھوک لگی تو وہ کہیں سے کچھ کھانے کے لیے لے آئے۔ انھوں نے دونوں ہال طے کیے، لیکن وزیر انھیں پھر بھی نہ دکھائی دیا۔ آخر یہ پورا آئے ورنہ یہ دونوں بھوکے ہی رہتے۔ شام کو ان کا سردار محل سے واپس آیا اور یوسف ہفت خواں طے کر کے ایک دروازے پر ٹھہرے۔ یوں تو ہال بیش قیمت سالن سے سجا ہوا اور اسد الدین کو ساتھ لے کر فوجیوں کی بیرک میں گیا۔ وہاں ان سب کو رہنے کے لیے تھا، لیکن اس دروازے پر جو پردہ پڑا تھا، اس میں جواہرات جگمگا رہے تھے۔ خادم اندر گیا، ایک خیمہ دے دیا گیا۔

اگلے ایک ہفتے تک ان قیدیوں یا جاسوسوں کو جانوروں کی طرح ہٹکا کر محل کی سیڑھیوں تک لے جایا جاتا اور وہ شام تک اپنی باری کے انتظار میں گرمی اور پیاس کی شدت برداشت کرتے پھر ناکام واپس آجاتے۔ آٹھویں دن جب محافظ سردار وزیر سلطنت کے پاس پیش ہونے سے معذور ہو گیا تو اس نے اپنے ساتھیوں سے مشورے کے بعد طے کیا کہ اب وزیر سے ملاقات کی کوئی امید نہیں اس لیے دونوں جاسوسوں کو قسطنطنیہ کے جیلر کے حوالے کر دیں تاکہ وہ اپنی طلبی تک وہاں محفوظ رہ سکیں لیکن شاید قدرت کو ان دونوں رحم آگیا جس وقت یہ واپسی کے حکم کا انتظار کر رہے تھے، اسی وقت محافظ سردار بھاگتا ہوا آگیا۔ قلعہ مینا اور ساغر کی جھنکار سے کمرے کا سکوت ٹوٹا اور جڑتا رہا۔



نفس کی حرارت بڑھی تو وزیر سلطنت نے ایک جھرجھری لی، اور محوور آنکھوں میں  
البدین کو دیکھا۔ یوسف اس کے پیچھے دھکا ہوا تھا۔ وزیر نے دو ایک بار آنکھیں میچا کر  
بولی۔ ”اے ذلیل کتے، تو نے سلطنت روم میں جاسوسی کی کیسے جرات کی؟“

اسد الدین نے وزیر سے آنکھیں ملائیں اور پر سکون لہجے میں کہا۔ ”اے سلطان میں فروخت کر دیا جائے“  
کے ذی قدر وزیر اعظم۔ اپ نے مجھے کتے کا خطاب دیا اس کا مجھے گلہ نہیں، مگر ”سزا!“ اسد الدین نے وزیر کو حیرت سے دیکھا۔ ”وزیر اعظم ہمیں کس جرم کی سزا  
مجھے جاسوس کہہ کے میری توہین کی ہے۔“

وزیر سلطنت کو شاید اسد کے جواب پر تعجب ہوا۔ اس نے آنکھیں میچا کر ”دیکھو بحث نہ کرو، ورنہ یہ سزا بدھ بھی سکتی ہے“ وزیر سلطنت نے ایک جام خالی کر  
ہوئے کہا۔ ”تو کس ملک کا باشندہ ہے کہ کتا کہنے پر تو خوش ہوا اور جاسوس کے نام پر  
کر رہا ہے؟“

”وزیر اعلیٰ مقام۔“ اسد نے اور سنبھل کے کہا۔ ”میں نے رومی سرحد کے کہ۔“ لیکن میں ایک درخواست ضرور کروں گا۔ امید ہے کہ آپ کی فیاض طبیعت اسے  
بتایا تھا کہ میں ریاست موصل کے حاکم عماد الدین کا معتمد سردار ہوں۔ ایک غلام پر قبول کرے گی۔“

ناراض ہو کر اس نے مجھے قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ میں وہاں سے فرار ہوا اور اپنی خواہش ظاہر کر۔ میں پورا کرنے کی کوشش کروں گا“  
زور بادشاہ کی پناہ میں آنے کے لیے رومی حدود میں داخل ہو گیا۔ یہ تھا آپ کی پہلی۔ ”اگر وزیر اعظم کا یہ فیصلہ اہل ہے کہ مجھے اور میرے ساتھی کو غلام بنا کر فروخت کر  
جواب۔ دوسری بات کا یہ جواب ہے کہ کتا اپنے دو خصلتوں کی وجہ سے میرے خیالے تو اس سلسلے میں ایک عرض ہے“ اسد نے سانس لی اور بولا۔ ”مجھے بازار میں بیچ  
انسان سے بہتر ہے ایک تو یہ کہ کتا اس وقت تک کسی کو نہیں کاٹتا جب تک اس کی کسی اور کا غلام بنانے کی بجائے اگر کسی بڑے رومی سردار کا غلام بنایا جائے تو عین  
پیر نہ رکھا جائے اس جانور کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے مالک کا اس کی اولاد سے ش ہوگی۔“

وفا دار ہوتا ہے۔“

”تیری باتوں میں کچھ کچھ سچائی محسوس ہوتی ہے۔“ وزیر کا رویہ کچھ نرم ہوا۔ ”لام بننا چاہتا ہے مجھے اس کا نام بتا؟“

”مقتدر وزیر اعظم۔“ اسد نے فوراً جواب دیا۔ ”میں تو یہاں کے راستوں سے بھی

ہیں بتایا گیا ہے کہ تجھے سرحد پر جاسوسی کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا ہے“

”یہ غلط ہے وزیر محترم“ اسد الدین نے بے خوفی سے کہا۔ ”ہمیں گرفتار ہرگز نہیں۔ سرحد سے سیدھا مجھے یہاں لایا گیا ہے۔ آپ سلطنت روم کی پہلی عظیم ہستی

کیا گیا بلکہ ہم نے قیصر روم شہنشاہ قسطنطنیہ کی مضبوط پناہ میں آنے کے لیے خود کو جس نے مجھے شرف باریابی بخشا ہے۔“

محافظوں کے حوالے کیا تھا۔ ہم نے ان سے درخواست کی تھی کہ ہمیں شہنشاہ یا وزیر نے جیسے اطمینان کے سانس لیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ”تو یہاں کسی کو جانتا بھی

کے سامنے پیش کیا جائے“

وزیر کچھ سوچنے لگا۔ اسد نے یوسف کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر کھڑا کر لیا۔ چند لمحوں کے بعد

وزیر نے سر اٹھا کر پوچھا۔ ”تیرا نام کیا ہے؟“

”اسد الدین“

”اور تیرا یہ ساتھی؟“

”یہ میرا غلام ہے وزیر اعلیٰ مقام، اس کا نام یوسف ہے“

”مگر تو“ وزیر کتے کتے رکا۔ ادھر ادھر نظریں دوڑائیں پھر کہا۔ ”مگر تم پر اعتبار کس

کیا جاسکتا ہے۔ تم مسلمان ہو اور ایک دوسرے ملک کے بھاگے ہوئے فوجی بھی ہو؟“

”وزیر محترم۔“ اسد الدین نے محسوس کر لیا کہ وزیر کی نرمی بے وجہ نہیں کیونکہ اس

نے اس دفعہ ”تو“ کے بجائے تم سے مخاطب کیا تھا۔ اس بات کو پیش نظر رکھ کر  
 کہا۔ ”انجبی انسان رکھ کے یا پرکھ کے دیکھا جاتا ہے۔ میں یہاں رہا نہیں ہوں، نوجوان تم کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ وزیر نے جیسے خواب میں کہا۔ ”تم سے  
 پرکھ کے دیکھ سکتے ہیں۔“  
 وزیر کو اسد الدین کی ذات سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہارا یوسف نے اسد الدین کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔“ اپنے آقا کی خدمت کرنا میرا  
 سے کیوں ناراض ہوا تھا۔“

”میرے ہاتھ سے ایک آدمی قتل ہو گیا تھا“ اسد نے مختصر سا جواب دیا۔  
 وزیر نے فوراً ”سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔“ تم ذرا باہر ٹھہرو۔ میں اس نوجوان کا  
 یوسف جو خاموش کھڑا تھا۔ اسے اپنے آقا کے اس مختصر جواب سے اطمینان لینا چاہتا ہوں۔ اگر یہ میرے مقصد کا آدمی نکلا تو تم لوگ دنیا کی تمام فکروں سے  
 اس نے فوراً ”داخل دیا۔“ ”مہربان وزیر اعظم! مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت دی جاوے۔“ میں تمہیں اپنے ملازموں میں شامل کروں گا اور تمہیں ایسی آسائش مہیا  
 ”ہاں اے خوبرو نوجوان میں تمہاری بات بھی سنتا چاہتا ہوں“ وزیر اعظم نے انہیں مہی کی کہ تم اپنے وطن اور عزیزوں کو بالکل بھول جاؤ گے۔“  
 ہوئے کہا۔

”ذی قدر وزیر اعظم۔“ یوسف متانت سے بولا۔ ”یہ دو سال پہلے کا واقعہ ہے اور وزیر سلطنت جان قوش شہنشاہ قسطنطنیہ کا سوتیلا بھائی تھا لیکن مشرقی روما کے تخت و تاج  
 موصل کے بڑے بازار میں آقا کا شر کو تو ال کے بھائی سے جھگڑا ہو گیا۔ دونوں مل کا حق تسلیم نہیں کیا گیا تھا کیونکہ جان قوش ایک کثیر زادے کو تخت و تاج کا نا اہل  
 تلواریں کھینچ گئیں اس کے ساتھ گیارہ آدمی تھے، لیکن آقا نے اسے قتل کر دیا جاتا تھا۔ جان قوش کو ماں کی طرف سے بہت بڑی جاگیر ملی تھی اور مال اور دولت بھی  
 کو تو ال کے بھائی کے گیارہ ساتھی زخمی ہو کر بھاگ گئے مگر امیر زنگی نے میرے آقا ہاتھ لگی تھی۔ وہ بڑا چالاک انسان تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ قسطنطنیہ سے دور اپنی  
 رہا۔“

”تم بھی اس لڑائی میں شریک تھے؟“ وزیر نے پوچھا۔  
 ”نہیں عالی جناب! میں بعد میں پہنچا تھا۔“ یوسف نے بتایا۔ ”مجھے بھی ان کا جان کامنی نس کے کئی سوتیلے بھائی دعویدار بن کے اٹھے لیکن چالاک جان قوش  
 گرفتار کیا گیا تھا۔“  
 ”اس کا مطلب ہے کہ تم نے اب تک تلوار نیام سے نہیں نکالی“  
 ”ایسی بات نہیں ہے وزیر محترم۔“ اسد الدین نے فوراً ”اسے اپنی طرف تاج کے دوسرے دعویداروں نے جگہ جگہ فتنے کھڑے کیے اور بغاوتوں کے بیج بوئے مگر  
 لیا۔“ ”یہ خوبرو نوجوان جو دیکھنے میں آپ کو بھولا بھالا نظر آتا ہے لڑائی کے وقت قوش بالکل غیر جانبدار رہا اور فتنوں کے دوران اس نے قسطنطنیہ سے باہر قدم نہ نکالا۔  
 سفاک اور سنگدل بن جاتا ہے۔ میں جس قید خانے میں تھا اس کے سپرے پر اڑا کہ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تمام فتنے ختم ہو گئے تو شہنشاہ جان کامنی نس نے اسے وزیر  
 بھائی متعین تھا۔ ہم جب وہاں سے نکلے تو اس نے اپنے بھائی پر پہلا وار کیا تھا۔“ ”تو بنا دیا اور اسے ایک عالیشان محل رہنے کے لیے دیا۔ جان قوش کو جب شہنشاہ کی  
 ”اچھا“ وزیر نے یوسف کو تعجب سے دیکھا۔ ”تمہیں اپنے بھائی پر تلوار چلانے کی حمایت حاصل ہوئی تو اس نے ہاتھ پیر نکالے اور اپنے محل کو ایک عظیم عشرت  
 سے میں تبدیل کر دیا۔ اس کے محل میں ملک ملک کی حسین ترین عورتیں موجود تھیں  
 ”عالی مقام وزیر اعظم“ یوسف نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”سپاہی یہ نہیں دیکھتا دن محفل رقص و سرود جی رہتی تھی۔ شہنشاہ کو اس بات کا علم تھا لیکن اس نے  
 کے سامنے کون ہے۔ اسے تو اپنے مالک کے حکم کی تعمیل کرنا ہوتی ہے۔ بھائی کمال بھائی کی وفاداری کی وجہ سے اس پر کوئی پابندی نہ لگائی پھر وہ دور ہی ایسا تھا کہ  
 ت روم کے ہر سردار، امیر و وزیر کی عشرت گاہیں پرستان بن کر رہ گئی تھیں اور تمام  
 ل سے دوشیزائیں اور جاذب نظر عورتیں قسطنطنیہ کھینچ چلی آ رہی تھیں۔“

شہنشاہ کامنی نس کی بڑھی ہوئی ناز برداری کی وجہ سے جان قوش کچھ اس درجہ پر مجروح نہ ہونے دوں گا۔“ قوش کا لہجہ قلفیانہ اور پراسرار بن تھا کہ اس نے کئی دوشیزاؤں کو زبردستی محل میں اٹھوا لیا تھا۔ ان میں جو دوشیزا ”کسی مجبور پر رحم کھانا انسانی فطرت ہے۔“ قوش کا لہجہ قلفیانہ اور پراسرار بن دکھائی اسے قتل کرا کے لاش سمندر میں بہادی جاتی تھی۔ جب اس طرح کی دور ”جس ہستی کو ہمیں اس دنیا سے دوسرے عالم پہنچانا ہے وہ تم سے کمزور ہے بلکہ اس ہوئے اور لوگوں نے شور وغل مچایا تو شہنشاہ نے لوگوں کے جذبات کو سرد کرنے کی اس قدر ہلکا اور نازک ہے کہ تم اسے سر سے بلند کر کے دور پھینک سکتے ہو۔ اس تحقیقات کا حکم دیا۔ سب کو شبہ تھا کہ یہ قتل جان قوش کے محل میں ہوئے ہیں حالات دیکھ کر تمہارے دل میں رحم کے جذبات بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔“ قوش اپنی دولت اور شہنشاہ کی قربت داری کی وجہ سے صاف بچ گیا تھا لیکن اتنا ”وزیر محترم! فرض کی ادائیگی اور حکم کی بجا آوری میں کوئی جذبہ حائل نہیں ہوا ہوا کہ جان قوش نے اس طرح کے قتل کرانا بند کر دیے۔“

جان قوش شاید یوسف سے اس قسم کا کوئی کام لینا چاہتا تھا۔ تنہائی ہوتے ہی یوسف کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ یوسف اور قریب ہو گیا۔ ”بیٹھ جاؤ یوسف۔“ قوش نے بڑی ملائمت سے کہا۔ یوسف تخلیل فرش پر جس میں اس کے پیر دھنے جا رہے تھے۔ قوش کے بیٹھ گیا۔

”دیکھو یوسف“ قوش نے کہنا شروع کیا۔ ”مجھے سلطنت روما میں ایک امیر حاصل ہے۔ کسی وجہ سے میں حکومت نہ حاصل کر سکا لیکن حکم میرا ہی چلتا ہے۔“ قوش نے کہا۔ ”تو قوش نے اس کام کو پوری طرح انجام نہ دیا تو پہلے کچھ ہے مگر میں پھر بھی اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہوں اور میرا لشکر، محل میں میرے پر چلنے والے کینز و غلام دراصل میرے دشمن ہیں اور شہنشاہ کے لیے جاسوسی کرتے قوش یہ کہہ کر خاموش ہو گیا اور غور سے یوسف کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ لحاظ کی وجہ سے اپنی نظریں نیچی کر لیں۔ قوش نے اپنے آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا۔ وقت تھا کہ میرے ایک ادنیٰ اشارے پر دشمنوں کے سر قلم ہو جاتے تھے لیکن اب مجبور ہو گیا ہوں کہ میں اس ہستی کو قتل نہیں کرا سکتا جس نے مجھ سے میرا سکون ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم ایک بہادر اور خوب صورت جوان ہو۔“

یوسف الجھ رہا تھا کہ جان قوش ایک ہی بار تمام باتیں کیوں نہیں کہتا کہ وہ دنیا میں اس کا اشارہ کرنے کا اشارہ کیا۔ یہ ان کے ساتھ چلنے لگے۔ غلام انھیں لے کر محل کے ”یوسف میں چاہتا ہوں کہ اس خدمت پر میں تمہیں مامور کروں۔ کیا تم میں ہنسیک غلام نے کہا۔“ تم دونوں وزیر مملکت کے مہمان ہو۔ باہر ایک خادم اور ایک کینز ہر اس ہستی کو تم میرے لیے قتل کر دو؟“

”وزیر اعلیٰ مقام۔“ یوسف نے جواب دیا۔ ”اگر آپ ایک اجنبی اور غلاموں کے جانے کے بعد اسد الدین نے کہا۔“ یوسف یہ تو میں بعد میں پوچھوں گا کہ مسلمان پر اعتماد کر سکتے ہیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ اس ہستی کا سر ایک لمحے میں میرے ہاتھ سے کیا باتیں ہوئیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ کیوں کہا کہ ہمیں میرے ساتھ گرفتار قدموں میں لوٹنا نظر آئے گا خواہ وہ مجھ سے دگنی طاقت کا مالک کیوں نہ ہو۔ میں



کر کے موصل کے قید خانے میں ڈالا گیا تھا۔

”آقا۔۔۔ مجھے اپنی غلطی کا اسی وقت احساس ہو گیا تھا۔“ یوسف شرمندگی

”سرحد کے سردار کو ہم نے یہ بتایا تھا کہ میں نے آپ کو قید سے رہائی دلائی تھی۔  
اپنی غلطی پر انہوں نے مجھے معاف کر دیتے آقا۔“

”آئندہ احتیاط برتا یوسف۔“ اسد الدین نے تنبیہ کی ”اگر سرحد کے سردار  
ہماری گفتگو کی پوری تفصیل لکھ بھیجی ہوتی تو ہم دروغ بیانی میں پکڑے جاتے۔ خیر اب  
نے کہا کیا؟“

”آقا۔ وزیر کے ہاتھ بڑی ابھی ابھی تھیں۔“ یوسف ایک دم رک کر  
پریشان نظروں سے کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا، پھر دوڑ کے کھڑکی کے پاس پہنچا۔

کھڑکی سے ذرا ہٹ کے ایک خوبصورت کنیز کھڑی تھی۔ یوسف کو باہر جھانکتا دیکھا  
قریب آئی اور مسکرا کر بولی۔ ”کیا میں مہمانوں کی لیے غسل کا انتظام کروں؟“  
”شکریہ۔ ابھی نہیں۔“ یوسف نے شائستہ لہجے میں کہا۔

کنیز تازک قدم اٹھاتی چلی۔ یوسف نے اسے روکا۔ ”سنو۔ ایک بات کا جواب  
کی؟“

”میں آپ کی کنیز ہوں“ کنیز نے اٹھلا کے جواب دیا۔ ”ہر بات کا جواب دوں گی۔“  
”اچھا تو یہ بتاؤ کہ جب کمرے میں دروازہ موجود ہے تو پھر کھڑکی سے جھانکنے کا  
ضرورت تھی؟“ یوسف نے ذرا سختی سے پوچھا۔

کنیز گھبراہٹی پھر سنبھل کر بولی۔ ”میں اس غلطی کی معافی چاہتی ہوں۔ دراصل مجھے  
کیا تھا کہ دو مسلمان جو آج وزیر سلطنت سے ملاقات کے لیے آئے ہیں۔ بہت  
صورت ہیں۔“

یوسف کو اطمینان نہ ہوا۔ اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تمہیں مہمانوں کی خدمت  
لگایا گیا ہے۔ تم یوں کرو کہ پہلے اندر آکر ہمیں اچھی طرح دیکھ لو پھر کوئی اور کام کرنا“  
”مجھے معاف کر دیجیے۔“ کنیز کچھ شرارتے اور کچھ شرمندہ ہوتے ہوئے بولی۔  
”دروازے پر موجود رہوں گی اور جب آپ بلائیں گے اسی وقت آؤں گی۔“

یوسف کھڑکی سے اسد الدین کے پاس آیا اور منہ ہٹا کے بولا۔ ”آقا یہ محل عجب  
خانہ ہے وزیر نے بھی معمول میں باتیں کیں اور یہ کنیز اسے تو میں سمجھ ہی نہیں سکتا۔“  
اسد الدین نے مسکرا کر کہا۔ ”وزیر کی باتوں کا مجھے علم نہیں لیکن اس کنیز نے کوئی  
بات نہیں کی۔ میرے خیال میں تم نے اس پر ظلم کیا۔ وہ بچاری تم سے محبت کی بات

رہی تھی اور تم اس سے اگلے سیدھے سوال پوچھ رہے تھے۔“

”پیار۔ محبت!“ یوسف نے تعجب سے کہا۔ ”آقا۔ آپ نے اس کی صورت اور گفتگو  
کرنے کا انداز نہیں دیکھا۔ آخر اسے اس طرح اندر جھانکنے کی کیا ضرورت تھی؟“  
”تم جیسے خوبہ جوان کو دیکھنے کی کون لڑکی خواہش نہیں کرے گی؟“ اسد الدین نے  
مزاحیہ انداز میں کہا۔ ”تم ایک ایسے جوان ہو جس کا چہرہ دو شیرازوں کے تصور میں گھوما کرتا  
ہے۔“

”آقا۔ آپ مجھے کیوں بنا رہے ہیں۔“ یوسف جھینپ گیا ”میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ  
آپ جیسا قد آور اور بھلا جوان امیر زنگی کے پورے لشکر میں موجود نہیں۔۔۔۔۔۔“  
”اچھا چھوڑو ان باتوں کو۔۔۔۔۔۔“ اسد الدین نے قطع کلام کیا۔ ”اس عیار بوڑھے  
نے کیا کہا؟“

یوسف نے سوچ سوچ کر پوری رام کہانی اسد الدین کو سنادی۔ اسد پوری توجہ سے سن  
رہا تھا۔ یوسف کی بات ختم ہونے کے بعد وہ گہری سوچ سے نکلنے ہوئے بولا۔ ”معاہدہ الجھا  
ہوا کم، مگر عین زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ آخر وہ کون سی ایسی ہستی ہے جسے وہ کسی رومی سردار  
سے قتل نہیں کرا سکتا۔ اسے کس بات کا ڈر ہے؟ وہ صاحب اقتدار ہے اگر دو چار آدمیوں  
کو قتل کرا کے باغ کے کسی کونے میں دفن کرا دے تو اس سے کون پوچھنے آئے گا اگر وہ  
ہستی وزیر کے قبضے میں ہے تو اسے قتل کرانے کی بجائے زہر بھی دلوایا جاسکتا ہے۔“

”آقا۔ مجھے ایک بات کا اور شبہ ہو رہا ہے۔“  
”شبہ تو مجھے بھی بہت کچھ ہو رہا ہے۔“ اسد الدین نے کہا۔ ”تم اپنا شبہ بیان کروں۔  
ممکن ہے کہ ہم تم ایک ہی نتیجے پر پہنچے ہوں۔“

”میرا خیال ہے کہ وزیر جسے قتل کرانا چاہتا ہے وہ مرد نہیں بلکہ عورت ہے۔“  
”بالکل ٹھیک ہے۔“ اسد خوش ہو گیا۔ ”تمہیں صرف شبہ ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ  
عورت اور صرف عورت ہے اور عورت بھی ایسی کہ جس کے قتل میں وہ اپنا نام ملوث  
نہیں ہونے دینا چاہتا۔ اور کسی رومی کے بجائے مسلمان سے قتل کرانا چاہتا ہے تاکہ اگر  
بات کھل جائے تو وہ تم کو فوراً قتل کرا کے اس راز پر ہمیشہ کے لیے پردہ ڈال دے۔“

یوسف کے چہرے پر لمحہ بھر کے لیے پریشانی کے آثار پیدا ہوئے لیکن وہ خود کو سنبھالتے  
ہوئے بولا۔ ”آقا۔ آپ کو میرا ضامن کیا گیا ہے۔ میں انشاء اللہ آپ پر کوئی آنچ نہ آنے  
دوں گا۔ میں وزیر کے حکم کی ضرورت تعمیل کروں گا خواہ مجھے اس کے لیے انسان سے حیوان  
کیوں نہ بننا پڑے۔“

”تم میری فکر نہ کرو یوسف۔“ اسد نے سے سمجھایا۔ ”اگر تمہاری ناکامی کی ضرورت ہوگی۔ چونکہ ابھی اصل معاملے کی نوعیت نہ معلوم ہو سکتی ہے۔“ اس کا خاتمہ ضروری ہے میں ایک لمحہ کو بھی اسے برداشت نہیں ہم دونوں کو آگاہی نہیں۔ اس لیے میں تمہیں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ سوائے اس سکتا۔“

کہ اگر تم خدا نخواستہ ناکام ہو جاؤ اور تمہیں پناہ کی ضرورت ہو تو مصری سفارت خانہ ”تمہ آپ کو فیصلہ بدلنے کی ضرورت ہے اور نہ برداشت کرنے کی۔“ یوسف نے اس دروازہ ضرور کھٹکھٹانا۔ پورے قسطنطنیہ میں تمہیں صرف وہیں پناہ مل سکتی ہے۔“ اہدائی کیفیت کو پرسکون کرنے کے لیے کہا۔ ”آپ نے اس کا معاملہ میرے سپرد کا ہے“ خدا نہ کرے کہ وہ وقت آئے اور مجھے پناہ کی ضرورت پڑے۔“ یوسف نے بی اسے جلد سے جلد آپ کے خیالوں سے نکال دینا چاہتا ہوں۔

اپنے آپ سے کہا۔ ”میں اپنے آقا کے لیے خود اپنی جان دے دوں گا۔“ ”تم میرے پاس اس کی سفارش کرنے نہیں آؤ گے۔“ وزیر سلطنت نے تنبیہ کی۔ اس رات اور دوسرا تمام دن دونوں اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کرتے رہے۔ یوسف چونک پڑا۔ اسے محسوس ہوا کہ وزیر اس وقت جوش انتقام یا شدید جذبہ نفرت کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ دوسری شام یوسف وقت مقررہ پر وزیر سلطنت کے محل جا رہے تھے۔ وزیر سلطنت کو جو اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا بڑی لیے تیار ہو رہا تھا کہ پہلے والے دونوں غلام آگئے۔ ایک غلام نے آگے بڑھ کے یوسف کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ ”آپ کو عالی جنس کی سفارش کروں گا اور نہ رحم کھاؤں گا۔“ حالانکہ یوسف کو ابھی یہ بھی معلوم نہ تھا وزیر سلطنت یاد فرما رہے ہیں۔“

یوسف اور اسد الدین کو غلاموں کے اس بدلے ہوئے رویے پر تعجب سا ہوا۔ وزیر سلطنت نے اپنی آنکھیں بند کیں۔ ہاتھ کی انگلیوں سے آنکھوں کو دبایا پھر سر کو وہ اس کا اظہار زبان سے نہیں کر سکے۔ یوسف نے اسد کی طرف جھک کے آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا۔ ”وہ رومی“ گورنر قیمل مائس کی بیٹی ہے۔ سرحدی علاقے کے دورے کے ”آقا خدا حافظ! آپ میری کامیابی کی دعا کیجیے۔“

”خدا تمہیں کامیابی اور سرخروئی سے ہم کنار کرے۔“ اسد نے دعا دی۔ یوسف غلاموں کے ساتھ ہو لیا۔ وزیر سلطنت کے دروازے پر پہنچ کے یوسف جھجکا۔ اس نے پلٹ کے غلاموں کو دیکھا۔ ”آپ بے تکلف تشریف لے جائیے۔“ ایک غلام نے کہا۔ ”اندر اطلاع تو کر دو۔“

”اطلاع کی ضرورت نہیں۔“ دوسرے غلام نے جواب دیا۔ ”وزیر سلطنت نے اطلاع سے آپ کے منظر ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ نہیں جاسکتے۔“

یوسف نے دل ہی دل میں بسم اللہ پڑھی اور بڑی بے خونی سے اندر پہنچ گیا۔ سلطنت واقعی بڑے اضطراب کے عالم میں کمرے کے میں ٹھل رہا تھا۔ ”تم آگئے یوسف!“ وزیر اضطرابی کیفیت میں بولا۔ ”میں اس بوجھ سے نجات ہوں۔ ذہنی دباؤ سے میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔“

”مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بتائیے میں منٹوں میں اس ہستی کو ختم کر دینا چاہتا ہوں۔“ یوسف نے اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے

اس کی ہوس کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ یوسف کے دل میں برجیس کو دیکھے بغیر کے لیے رحم اور ہمدردی کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا مگر اس نے اس جذبے کو کٹی ہوئی کشتی کے ساتھ دیا۔ اس کا ضامن اس کا آقا اسد الدین تھا۔ اگر وہ برجیس کو قتل کرنے میں ناکام رہا تو اسے تھیں جھاڑیوں سے بندھی ایک کشتی ملے گی۔ اس پر بیٹھ کے ساحل کے ساتھ الدین فوراً قتل کر دیا جائے گا۔ یوسف کو اپنے آقا سے زیادہ کوئی عزیز نہ تھا۔ یوسف اس کا کوئی اور تھا ہی نہیں۔

یوسف نے بڑے عزم سے کہا۔ ”وزیر سلطنت میری طرف سے بالکل بے فکر میں اس ذلیل لڑکی کو دیکھتے ہی قتل کر دوں گا۔ آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“

”یوسف اس حکم کے ساتھ ایک اور بات بھی ہے۔“ وزیر نے بڑی سنجیدگی سے یوسف حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔ ”اس سلسلے میں جتنی باتیں ہوں گی مجھے سے آگاہ کر دیجئے حضور۔“

”پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری کامیابی کا ذمہ دار تمہارا آقا ہے۔“ وزیر نے کہا۔ ”دوسری بات یہ ہے کہ برجیس ایک حسین ساحرہ، معجزہ اور کسی اور دنیا کی حور ہے۔ اس کے دیکھے سے دل کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ وہ تم کے تیر پھینکے گی، خوشامد کرے گی، اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرنے کی قسمیں گی۔ اس وقت اگر تمہارے قدم بہک گئے تو تم اپنے آقا کی صورت کبھی نہ دیکھ سکتے۔ میں اس کے ٹکڑے کرا کے تمہارے سامنے ڈالوں گا۔“

”نہیں نہیں۔“ یوسف کانپ گیا۔ ”میں ایسا وقت نہیں آنے دوں گا۔“

جان قوش نے اپنی بیجانی کیفیت پر قابو پالیا اور اپنی پشت کے دروازے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ ”تم اس دروازے سے نکلو گے تو اس دروازے کے بالمقابل دوسرے سرے پر ایک دروازہ نظر آئے گا جو باہر کی طرف راہداری میں کھلتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بارہ دری ہے اس کا دروازہ باہر سے بند ہے۔ تم اسے کھول کے اندر جانا۔ اس بارہ دری کے پہلے ہی کمرے میں تمہیں وہ خطرناک ناگن نظر آئے گی۔ تمہیں قتل کرنا ہے مگر خبردار اس پر ٹکوار نہ اٹھانا اور اپنے آپ کو اس کا ہمدرد نہ کرنا۔ تم اسے اپنے خوب صورت پیکر سے ضرور متاثر کر لو گے۔ جب تمہیں اسے حاصل ہو جائے تو اسے بتانا کہ تم نے اس کے فرار کے تمام انتظامات کر لیے ہیں۔ وہ تم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اسے لیکر محل کی چار دیواری کے پاس دیواری کے چور دروازے کا قتل کھلا ہو گا۔ باہر نکل کر دیکھو گے تو دائیں بائیں دکھائی دیں گے۔ بائیں جانب کا راستہ گھوم کر اس محل کے صدر دروازے کی طرف

”مجھے تم سے ایسی ہی امید ہے۔“ قوش بولا۔ ”تمہارا ساتھی زیادہ طاقت ور ہے۔ میں اسے بھی خفیہ کر سکتا تھا لیکن اس سے کسی نری کی امید نہیں کی جا سکتی۔ تم چونکہ عورتوں کے لیے بہت جاذب نظر ہو اور صرف تم ہی اس خطرناک لڑکی کو پھسلا کر اس کے قتل تک لے جا سکتے ہو۔ شام ہو رہی ہے، چراغ روشن ہوتے ہی تم اپنا کام شروع کر دینا اور یہ بات اپنے ذہن میں رکھنا کہ اس محل سے سطح سمندر تک میری آنکھیں تمہارے تعاقب میں رہیں گی۔“

جان قوش دوسرے کمرے میں چلا گیا اور یوسف اس سنگین معاملے کے مدو جز پر غور کرنے لگا۔ اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ برجیس کو باسنورس کی لہروں



کے حوالے کر کے اپنے آقا کی جان بچائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اندھیرا پھیل گیا اور سوائے کمرے کے درمیان میں ایک محدود جگہ پڑتی ہوئی چاندنی کے ایک پُنے کے اور کچھ نہ مل سمعوں سے جگمگا اٹھا۔ اس عرصے میں سوائے شمعیں جلائے والی کینڑی اس کے دکھائی دیا۔ کوئی نہ آیا۔ حالانکہ وہ اس وقت بھی جان قوش کی نظروں میں تھا۔ جان قوش وہاں اٹھ کے دوسرے کمرے میں ایسی جگہ جا کے بیٹھ گیا تھا جہاں سے وہ یوسف کے چہرہ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ کے دوسری جگہ پہنچ گیا۔ پورے تاثرات دیکھ سکتا تھا۔

یوسف، وزیر کے اس وسیع کمرے میں ایک الجھن میں گرفتار تھا۔ اسے یاد آیا کہ انتظار کے بعد یوسف نے نہایت ملامت سے کہا۔ ”برجیس! میں جان قوش نہیں ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ مجبوری کی حالت میں وہ برجیس کو قتل کر سکتا تھا لیکن اس کے پاس نہ خنجر، پھر وہ کس طرح برجیس کا خاتمہ کرے گا۔ اس خیال سے وہ سخت تھیں اور نہ خنجر، پھر وہ کس طرح برجیس کا خاتمہ کرے گا۔ اس خیال سے وہ سخت تھا۔ اس نے پورے کمرے میں ادھر ادھر گھوم کے دیکھا لیکن وہاں اسلحہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وقت گزر رہا تھا اور اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس دروازے کے پار جس سے قوش دوسرے کمرے میں گیا تھا لیکن وہ دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔

کا بڑا دروازہ بھی۔ جس سے وہ داخل ہوا تھا وہ بھی باہر سے بند تھا۔ آخر یوسف نے بغیر اسلحے کے اپنا کام شروع کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس دروازے پاس گیا جس سے اسے باہر نکلتا تھا۔ اس نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ فوراً کھل گیا۔ نے احتیاط کے طور پر گردن نکال کر راہداری میں دونوں طرف دیکھا۔ سوائے مدم کے اسے دور دور تک کوئی نظر نہ آیا۔ باہر میدان میں سفید چاندنی ٹکھری ہوئی تھی۔ راہداری میں آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ستون کے ساتھ تلواریں اور خنجر ہوئے ہیں۔ یوسف، وزیر کی دور اندیشی اور احتیاط پر بڑا حیران ہوا۔ یہ اسلحہ اسے وزیر دے سکتا تھا لیکن شاید اسے شبہ تھا کہ وہ تلواریں پاتے ہی کہیں اس پر حملہ نہ کر دے۔ لیے اس نے اسلحے کا انتظام اپنے کمرے سے باہر کیا تھا۔

یوسف نے خنجر کمر میں اڑس لیا اور تلواریں ہاتھ میں لئے راہداری سے نیچے اترا۔ نے تمام راستہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ وہ اپنے تلے قدم اٹھاتا اس بارہ درمی میں پہنچ گیا۔ میں اس کا شکار قید تھا۔ اس قید خانے کے تمام دروازوں پر بڑے بڑے قفل لگے تھے صاف سامنے کے دروازے پر زنجیر تھی۔۔۔۔۔ یوسف نے بڑی احتیاط سے زنجیر کھولی اور با تیزی سے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا صرف ایک چھوٹا روشندان کھلا تھا جس سے چمن چمن کے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ یوسف دروازے کے ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور تلواریں نام سے نکال کر مضبوطی سے پکڑا۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے برجیس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن

یوسف نے خنجر کمر میں اڑس لیا اور تلواریں ہاتھ میں لئے راہداری سے نیچے اترا۔ نے تمام راستہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ وہ اپنے تلے قدم اٹھاتا اس بارہ درمی میں پہنچ گیا۔ میں اس کا شکار قید تھا۔ اس قید خانے کے تمام دروازوں پر بڑے بڑے قفل لگے تھے صاف سامنے کے دروازے پر زنجیر تھی۔۔۔۔۔ یوسف نے بڑی احتیاط سے زنجیر کھولی اور با تیزی سے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا صرف ایک چھوٹا روشندان کھلا تھا جس سے چمن چمن کے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ یوسف دروازے کے ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور تلواریں نام سے نکال کر مضبوطی سے پکڑا۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے برجیس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن

کے حوالے کر کے اپنے آقا کی جان بچائے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اندھیرا پھیل گیا اور سوائے کمرے کے درمیان میں ایک محدود جگہ پڑتی ہوئی چاندنی کے ایک پُنے کے اور کچھ نہ مل سمعوں سے جگمگا اٹھا۔ اس عرصے میں سوائے شمعیں جلائے والی کینڑی اس کے دکھائی دیا۔ کوئی نہ آیا۔ حالانکہ وہ اس وقت بھی جان قوش کی نظروں میں تھا۔ جان قوش وہاں اٹھ کے دوسرے کمرے میں ایسی جگہ جا کے بیٹھ گیا تھا جہاں سے وہ یوسف کے چہرہ فوراً اپنی جگہ سے ہٹ کے دوسری جگہ پہنچ گیا۔ پورے تاثرات دیکھ سکتا تھا۔

یوسف، وزیر کے اس وسیع کمرے میں ایک الجھن میں گرفتار تھا۔ اسے یاد آیا کہ انتظار کے بعد یوسف نے نہایت ملامت سے کہا۔ ”برجیس! میں جان قوش نہیں ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ مجبوری کی حالت میں وہ برجیس کو قتل کر سکتا تھا لیکن اس کے پاس نہ خنجر، پھر وہ کس طرح برجیس کا خاتمہ کرے گا۔ اس خیال سے وہ سخت تھیں اور نہ خنجر، پھر وہ کس طرح برجیس کا خاتمہ کرے گا۔ اس خیال سے وہ سخت تھا۔ اس نے پورے کمرے میں ادھر ادھر گھوم کے دیکھا لیکن وہاں اسلحہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ وقت گزر رہا تھا اور اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اس دروازے کے پار جس سے قوش دوسرے کمرے میں گیا تھا لیکن وہ دروازہ دوسری طرف سے بند تھا۔

کا بڑا دروازہ بھی۔ جس سے وہ داخل ہوا تھا وہ بھی باہر سے بند تھا۔ آخر یوسف نے بغیر اسلحے کے اپنا کام شروع کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس دروازے پاس گیا جس سے اسے باہر نکلتا تھا۔ اس نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ فوراً کھل گیا۔ نے احتیاط کے طور پر گردن نکال کر راہداری میں دونوں طرف دیکھا۔ سوائے مدم کے اسے دور دور تک کوئی نظر نہ آیا۔ باہر میدان میں سفید چاندنی ٹکھری ہوئی تھی۔ راہداری میں آیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ستون کے ساتھ تلواریں اور خنجر ہوئے ہیں۔ یوسف، وزیر کی دور اندیشی اور احتیاط پر بڑا حیران ہوا۔ یہ اسلحہ اسے وزیر دے سکتا تھا لیکن شاید اسے شبہ تھا کہ وہ تلواریں پاتے ہی کہیں اس پر حملہ نہ کر دے۔ لیے اس نے اسلحے کا انتظام اپنے کمرے سے باہر کیا تھا۔

یوسف نے خنجر کمر میں اڑس لیا اور تلواریں ہاتھ میں لئے راہداری سے نیچے اترا۔ نے تمام راستہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ وہ اپنے تلے قدم اٹھاتا اس بارہ درمی میں پہنچ گیا۔ میں اس کا شکار قید تھا۔ اس قید خانے کے تمام دروازوں پر بڑے بڑے قفل لگے تھے صاف سامنے کے دروازے پر زنجیر تھی۔۔۔۔۔ یوسف نے بڑی احتیاط سے زنجیر کھولی اور با تیزی سے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا صرف ایک چھوٹا روشندان کھلا تھا جس سے چمن چمن کے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ یوسف دروازے کے ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور تلواریں نام سے نکال کر مضبوطی سے پکڑا۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے برجیس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن

یوسف نے خنجر کمر میں اڑس لیا اور تلواریں ہاتھ میں لئے راہداری سے نیچے اترا۔ نے تمام راستہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ وہ اپنے تلے قدم اٹھاتا اس بارہ درمی میں پہنچ گیا۔ میں اس کا شکار قید تھا۔ اس قید خانے کے تمام دروازوں پر بڑے بڑے قفل لگے تھے صاف سامنے کے دروازے پر زنجیر تھی۔۔۔۔۔ یوسف نے بڑی احتیاط سے زنجیر کھولی اور با تیزی سے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا صرف ایک چھوٹا روشندان کھلا تھا جس سے چمن چمن کے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ یوسف دروازے کے ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور تلواریں نام سے نکال کر مضبوطی سے پکڑا۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے برجیس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن

یوسف نے خنجر کمر میں اڑس لیا اور تلواریں ہاتھ میں لئے راہداری سے نیچے اترا۔ نے تمام راستہ ذہن نشین کر لیا تھا۔ وہ اپنے تلے قدم اٹھاتا اس بارہ درمی میں پہنچ گیا۔ میں اس کا شکار قید تھا۔ اس قید خانے کے تمام دروازوں پر بڑے بڑے قفل لگے تھے صاف سامنے کے دروازے پر زنجیر تھی۔۔۔۔۔ یوسف نے بڑی احتیاط سے زنجیر کھولی اور با تیزی سے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ پورا کمرہ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا صرف ایک چھوٹا روشندان کھلا تھا جس سے چمن چمن کے چاندنی اندر آ رہی تھی۔ یوسف دروازے کے ایک طرف ہٹ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور تلواریں نام سے نکال کر مضبوطی سے پکڑا۔ اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے برجیس کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن

ہوئے جواب دیا۔

”میں کہہ تو رہا ہوں کہ تمہیں چھڑانے آیا ہوں۔“ یوسف نے اسے پھر فرمایا۔ ”اگر تم نے دیر کی تو تمہارے ساتھ میں بھی قتل کر دیا جاؤں گا۔“ یوسف کا آخری جملہ کام کر گیا۔ برہیں نے ٹھہرے لیے میں کہا۔ ”یقین تو نہیں آتا واقعی قتل کر دیے جاؤ گے۔ تم مجھے قتل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے ہو۔ لاؤ خنجر کبھی موت کو بھی رحم آسکتا ہے۔ میں شمع جلا رہی ہوں۔ پتہ نہیں میرے دل میں مجھے دو۔ میں خود اپنا خاتمہ کر لوں گی۔ میں تمہاری آستینوں پر اپنے خون کے چھینٹے نہیں موت کو دیکھنے کی خواہش کیوں پیدا ہوئی ہے“

”برہیں! مت کرو ایسی باتیں۔“ یوسف نے محبت بھرے لہجے میں احتجاج کیا۔ ”میں اس وقت بہت طاقت ور ہوں۔ جن بلند و بالا فیصلوں اور دروازوں کو پھلانگ کر میں یہاں تک پہنچا ہوں اسی طرح یہاں سے باہر نکلوں گا۔ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ برہیں۔“ یوسف نے اس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ برہیں ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”یوسف نادان نہ بنو۔ اگر یہ یقین کر لیا جائے کہ تم اپنی کوشش سے یہاں تک پہنچے ہو تو یہ قطعی ممکن نہیں کہ تم مجھے محل سے باہر لے جا سکو۔ یہاں کے چپے چپے پر پہرہ ہے۔ تمام لوگ جان قوش کے غلام ہیں۔ کئی ماہ سے میں اس قید میں ہوں لیکن کھانا پہنچانے والے کے سوا اور کوئی میرے پاس نہیں آیا۔“

”کیا جان قوش بھی نہیں آتا؟“

”وہ غیبت تو اپنی منحوس صورت کے ساتھ روز آتا ہے“ اس نے بڑی نفرت سے کہا۔ آج دوپہر اس نے آخری بار مجھے رضامند کرنے کے کوشش کی تھی۔ جب میں نے انکار کر دیا تو اس نے بتایا کہ میں کل کے سورج کی روشنی اس روشن دان سے اندر آتے نہ دیکھ سکوں گی۔ اس لیے میں نے آج شمع بھی روشن نہیں کی تھی۔ میں اپنے قاتل کا خوفناک چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر تم۔۔۔ تم نہ معلوم کون ہو یوسف۔ مجھے واقعی پچانا چاہتے ہو یا موت نے کوئی اور پھندہ میرے لیے تیار کیا ہے۔“

”سب پھندے کھل گئے ہیں۔“ یوسف اطمینان سے بولا۔ ”تم دیکھو گی کہ میں کس آسانی سے تمہیں باہر لے جاتا ہوں۔“

یوسف اس کا ہاتھ پکڑے باہر آیا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چودھویں کی تیز اور شفاف چاندنی میں نظریں دوڑانے پر بھی برہیں کو کوئی پہرے دار نظر نہیں آیا۔ یہ بڑی حیرتناک بات تھی پھر جب برہیں نے محل کے چور دروازے کا قفل کھلا ہوا دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا ہو گئی۔ اسے یاد آیا کہ ایک ماہ قبل ایک اندھیری رات میں اسے اس

”میں کہہ تو رہا ہوں کہ تمہیں چھڑانے آیا ہوں۔“ یوسف نے اسے پھر فرمایا۔ ”اگر تم نے دیر کی تو تمہارے ساتھ میں بھی قتل کر دیا جاؤں گا۔“

یوسف کا آخری جملہ کام کر گیا۔ برہیں نے ٹھہرے لیے میں کہا۔ ”یقین تو نہیں آتا واقعی قتل کر دیے جاؤ گے۔ تم مجھے قتل کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے ہو۔ لاؤ خنجر کبھی موت کو بھی رحم آسکتا ہے۔ میں شمع جلا رہی ہوں۔ پتہ نہیں میرے دل میں مجھے دو۔ میں خود اپنا خاتمہ کر لوں گی۔ میں تمہاری آستینوں پر اپنے خون کے چھینٹے نہیں موت کو دیکھنے کی خواہش کیوں پیدا ہوئی ہے“

”برہیں! مت کرو ایسی باتیں۔“ یوسف نے محبت بھرے لہجے میں احتجاج کیا۔ ”میں اس وقت بہت طاقت ور ہوں۔ جن بلند و بالا فیصلوں اور دروازوں کو پھلانگ کر میں یہاں تک پہنچا ہوں اسی طرح یہاں سے باہر نکلوں گا۔ چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ برہیں۔“ یوسف نے اس کا ایک ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ برہیں ہاتھ چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ”یوسف نادان نہ بنو۔ اگر یہ یقین کر لیا جائے کہ تم اپنی کوشش سے یہاں تک پہنچے ہو تو یہ قطعی ممکن نہیں کہ تم مجھے محل سے باہر لے جا سکو۔ یہاں کے چپے چپے پر پہرہ ہے۔ تمام لوگ جان قوش کے غلام ہیں۔ کئی ماہ سے میں اس قید میں ہوں لیکن کھانا پہنچانے والے کے سوا اور کوئی میرے پاس نہیں آیا۔“

”کیا جان قوش بھی نہیں آتا؟“

”وہ غیبت تو اپنی منحوس صورت کے ساتھ روز آتا ہے“ اس نے بڑی نفرت سے کہا۔ آج دوپہر اس نے آخری بار مجھے رضامند کرنے کے کوشش کی تھی۔ جب میں نے انکار کر دیا تو اس نے بتایا کہ میں کل کے سورج کی روشنی اس روشن دان سے اندر آتے نہ دیکھ سکوں گی۔ اس لیے میں نے آج شمع بھی روشن نہیں کی تھی۔ میں اپنے قاتل کا خوفناک چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔۔۔ مگر تم۔۔۔ تم نہ معلوم کون ہو یوسف۔ مجھے واقعی پچانا چاہتے ہو یا موت نے کوئی اور پھندہ میرے لیے تیار کیا ہے۔“

”سب پھندے کھل گئے ہیں۔“ یوسف اطمینان سے بولا۔ ”تم دیکھو گی کہ میں کس آسانی سے تمہیں باہر لے جاتا ہوں۔“

یوسف اس کا ہاتھ پکڑے باہر آیا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ چودھویں کی تیز اور شفاف چاندنی میں نظریں دوڑانے پر بھی برہیں کو کوئی پہرے دار نظر نہیں آیا۔ یہ بڑی حیرتناک بات تھی پھر جب برہیں نے محل کے چور دروازے کا قفل کھلا ہوا دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا ہو گئی۔ اسے یاد آیا کہ ایک ماہ قبل ایک اندھیری رات میں اسے اس

یوسف جلدی سے آگے بڑھا۔ اس نے برہیں کے شانے پکڑ کے اسے کھڑا کر دیا اور والمانہ انداز سے بولا۔ ”یہ وہ سر نہیں ہے جو کسی کے سامنے جھکے۔ میں اس سر کو بلند کرنا گا اور حوصلہ دوں گا کہ تم سر اٹھا کر چل سکو“

برہیں نے حیرت سے دیکھا اور پوچھا۔ ”اے کمزور دل قاتل! کیا نام ہے تمہارا؟“

دروازے سے محل میں لایا گیا تھا۔ باہر آکر وہ دونوں تیز قدموں سے چلتے ہوئے رہا سمندر پر آگئے۔ یوسف نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اسے ایک جھاڑی سے کشتی بڑا دکھائی دی۔ اس نے کشتی کھولی اور دھکیل کر پانی میں اتاری۔ برہیں کو سارا دے کر پانی میں سوار کر لیا۔ اب کشتی شاخ زریں کے پانی میں آہستہ آہستہ رواں تھی۔ کشتی کا آبنائے باسنورس کی طرف تھا۔

وہ دونوں خاموش تھے۔ برہیں کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا وہ واقعی قید سے رہا ہے۔ یوسف کون ہے اور یہ اسے پہچانا چاہتا ہے یا دور سمندر میں لے جا کر غرق کر دے۔ یوسف کے دل و دماغ میں طوفان اٹھا ہوا تھا۔ جان قوش نے اسے برہیں کے قتل پر ہمار کیا تھا۔ اس کا آقا اسد الدین اس کا ضامن تھا۔ دوسری طرف ایک بے گناہ حسینہ جس کی صرف یہ خطا تھی کہ وہ جان قوش کے حکم پر سر تسلیم خم نہ کر سکی۔ اس نے عصمت کی خاطر جان کی بازی لگا دی۔ ایک ایسی حسینہ کا قتل اس کے خیال میں کسی طرح جائز نہ تھا۔ یوسف کے ہاتھ پتھر پر تھے لیکن نظریں سطح آپ پر کچھ تلاش کر رہی تھیں دماغ کہتا کہ برہیں کو غرق کر کے جان قوش کی خوشنودی حاصل کر اور اپنے آقا کی جان بچا کر دل ایک معصوم کی جان لینے پر کسی طرح آمادہ نہ تھا۔

”ہم کہاں جا رہے ہیں یوسف؟“ برہیں نے نہ جانے کس آس اور پیار سے کہا کہ یوسف کا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔

یوسف نے پہلے سمندر میں پڑتے ہوئے ماہتاب کے عکس کو دیکھا پھر برہیں کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس نے اپنے پورے حوصلے کو بروئے کار لاتے ہوئے کہا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ جان قوش نے مجھے تمہاری ہلاکت پر مامور کیا ہے تو تم کیا جواب دوں گی؟“

برہیں کی رگوں میں خون جم کے رہ گیا۔ اس نے کھٹی آواز میں جواب دیا۔ ”یوسف مجھے اس بات کا پہلے بھی یقین تھا اور اب بھی تمہاری بات پر اعتبار کرتی ہوں لیکن اللہ کا یہ ہے کہ تم میرے خون ناحق کا داغ اپنے دامن پر لگا رہے ہو۔ میں تمہارے منجرت اپنے آپ کو ختم کرنا چاہتی تھی۔ کاش تم نے اس وقت میری بات مان لی ہوتی۔“

”اس سے تمہیں کیا فرق پڑتا برہیں۔“ یوسف نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ ”جان قوش چاہتا ہے کہ تمہیں قتل کرنے کے بجائے باسنورس کی لہروں کے سپرد کر دیا جائے۔ میں بھی یہ ناگوار فرض ادا کرنے پر مجبور ہی سے آمادہ ہوا ہوں۔ چلاک جان قوش نے میرے آقا کی عزت کے طور پر اپنی حراست میں رکھا ہے اگر میں اس کام سے انحراف کروں تو میرا آقا قتل کر دیا جائے گا۔“

”مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔“ برہیں اکتاہٹ سے بولی۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھے فریب دیا لیکن میں نہیں چاہتی کہ میری موت تمہارے ہاتھ سے ہو۔ میں خود اپنی جان دیے دیتی ہوں۔“ برہیں کھڑی ہو گئی اور چاہا کہ سمندر میں چھلانگ لگا دے۔

یوسف بجلی جیسی تیزی سے اپنی جگہ سے اچھلا اور برہیں کو مضبوطی سے دبوچ لیا۔ ”برہیں میں تمہیں اس جوانی میں نہیں مرنے دوں گا۔“ یوسف نے اسے بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں بچاؤں گا برہیں۔ انسان کو آس کا دامن کبھی نہ چھوڑنا چاہیے۔ میں نے پہلے جو کچھ کہا وہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ میں کن حالات کے تحت اس بیت ناک قتل پر آمادہ ہوا۔“

”میں تمہاری ہمدردی کی شکر گزار ہوں یوسف۔“ برہیں سسکیوں میں بولی۔ ”مجھے مر جانے دو۔ جب تک میں زندہ ہوں جان قوش چین سے نہ بیٹھے گا۔“

”ان باتوں کو چھوڑو۔“ یوسف نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ قسطنطنیہ میں تمہیں کس جگہ پناہ مل سکتی ہے؟“

”کہیں بھی نہیں۔“ برہیں نے بے بسی سے انکار میں سر ہلایا۔ ”قسطنطنیہ کا ہر گھر اور ہر راستہ میرے خون کا پیاسا ہے۔ جان قوش کے اقتدار سے سب ڈرتے ہیں۔ جس کے گھر پناہ لوں گی وہ جان قوش سے منہ مانگا انعام حاصل کر کے مجھے اس کے حوالے کر دے گا۔

میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم مجھے بچا کے اپنی اور اپنے دوست کی جان داؤ پر لگاؤ۔ مجھے تو بہر صورت قتل ہونا ہے۔ میں تم دونوں کو اس میں کیوں شریک کروں؟“

”برہیں! میں تمہیں کنواری حضرت مریم کی قسم دیتا ہوں کہ سمندر میں چھلانگ لگانے کی کوشش نہ کرنا۔“ یوسف نے جذبات سے پر لہجے میں کہا ”اگر تمہارے بچاؤ کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو میں تمہارے ساتھ ہی سمندر میں کود جاؤں گا۔“

”یوسف! برہیں اور کچھ نہ کہہ سکی اور یوسف کو حیرت اور محبت کے طے جملے جذبے سے نکلنے لگی۔

یوسف اپنے خیالوں میں کھو گیا۔ کشتی سطح آپ پر رواں دواں تھی اور یوسف کے خیالات اسے نہ جانے کہاں سے کہاں اڑائے پھر رہے تھے۔ معا ایک خیال تیزی سے اس کے دماغ میں آیا۔ اس نے پوچھا۔ ”برہیں، تمہیں معلوم ہے کہ قسطنطنیہ میں حکومت مصر کا سفارت خانہ ہے۔“

”مجھے علم ہے یوسف۔“ برہیں نے ٹھنڈی سانس لی۔ دو سال پہلے میں مصری سفارت خانے کی ایک تقریب میں اپنے باپ کیساتھ شریک ہوئی تھی۔ میرا باپ سرحد ———



گورنر بنا اور شادی اپنی مفلسی سے پریشان ہو کر داوین سے نقل مکانی کر کے بغداد پہنچا تو بہروز نے پرانی دوستی کی بنا پر شادی کو تکریت کے ناقابلِ تحییر قلعہ کا حاکم مقرر کرا دیا۔ شادی کے مرنے کے بعد یہ عمدہ اس کے بڑے بیٹے نجم الدین ایوب کو دیا گیا۔ بہروز کو جب علم ہوا کہ اس کے قلعہ دار نجم الدین نے اس کے دشمن عماد الدین زنگی کو تکریت میں پناہ دی تھی تو وہ غصے سے بھڑک اٹھا اور نجم الدین کو معزول کرنے کی فکر میں لگ گیا۔ اسی زمانے میں نجم الدین کے چھوٹے بھائی اسد الدین کے ہاتھ سے کوئی ذی اثر آدمی مارا گیا۔ اس کے عزیزوں نے بغداد پہنچ کر عباسی خلیفہ سے فریاد کی۔ بہروز کو اچھا موقع ہاتھ لگا۔ اس نے خلیفہ سے کہہ کر نجم الدین کو معزول کرایا۔ خلیفہ بغداد نے اپنے حکم میں لکھا کہ نجم الدین فوراً تکریت سے چلا جائے اور وہ دوسری صبح کا سورج دریا پار کسی اور جگہ دیکھے۔

حاکم تکریت نجم الدین کو عباسی خلیفہ کا فرمان شام کے وقت موصول ہوا۔ فرمان پڑھ کے نجم الدین کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ ایک تو صبح ہونے سے پہلے تکریت چھوڑنے کی فکر دوسرے یہ غم کہ اس کی بیوی امید سے تھی اور بچے کی پیدائش کسی بھی وقت متوقع تھی۔ فرمان سے سرتابی کی اس میں ہمت نہ تھی لیکن ایک ہی رات میں یہ سب کچھ ہونا مشکل نظر آ رہا تھا، پھر بھی اس نے تکریت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور سامان باندھا، جانے لگا مگر رائے قسمت کہ نصف شب کے فوراً بعد سامان باندھنے کی دوڑ دھوپ کے درمیان زمان خانے میں ایک نومولود بچے کی پہلی چیخ بلند ہوئی۔ یہ نجم الدین کا پہلا بیٹا تھا اور اگر حالات درست ہوتے تو اس ولادت پر جس قدر بھی خوشی منائی جاتی وہ کم تھی لیکن نجم الدین تو غموں کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس نئی فکر سے وہ اس قدر گھبرایا کہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

ایسی رات اور ایسے گمبیر وقت میں کسی بچے کی پیدائش کو خوشی اور بدشگونی سمجھا جاتا ہے لیکن قدرت نے شاید اس بدشگونی اور وہم کو رد کرنے کے لیے اس بچے کو پیدا کیا تھا کیونکہ توہم پرستوں کے خیال کے برعکس یہی بچہ جب جوان ہوا تو اس نے مجاہد کبیر صلاح الدین ایوبی کا نام پایا جس کے نام سے یورپ اور ایشیا کے بڑے بڑے اپالوں میں زلزلہ آجاتا تھا۔

نجم الدین نے خلیفہ کے فرمان کی تعمیل کی۔ وہ زچہ بچہ اور دیگر اہل خاندان کو ساتھ لے کر صبح سے پہلے ہی دریائے دجلہ پار کر گیا۔ دوسری طرف پہنچ کے اسے موصل کے حاکم امیر عماد الدین زنگی کا خیال آیا۔ زنگی اس سے چلتے وقت کہہ گیا تھا کہ نجم الدین اسے جب بھی آواز دے گا زنگی کو دجلہ کے کنارے کھڑے پائے گا۔

”مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔“ یوسف نے اس کی بات کا ردی۔ ”یہ بتاؤ کہ سفارت خانہ کس جگہ ہے؟“

برجیس نے جھگڑاتے ساحل کی روشنیوں پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ کشتی سفارت خانے کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ شہنشاہ نے احتیاط کے طور پر تمام سفارت خانوں کو شہر سے باہر منتقل کر دیا ہے۔“

”اگر ہم کشتی ساحل پر لے جائیں تو کیا تم سفارت خانے کے راستے کی رہنمائی کر سکو؟“ یوسف نے بے تابی سے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ میں قسطنطنیہ کی گلیوں میں کھیل کر جوان ہوئی ہوں۔“ برجیس نے جواب دیا۔ ”تمام سفارت خانوں کو آبادی سے الگ رکھا گیا ہے۔ اس طرف کسی رومی کو جانے کی اجازت نہیں۔“

”بہت خوب۔“ یوسف خوش ہو گیا۔ ”خدا نے چاہا تو ضرور کوئی صورت نکل آئے گی۔“

یوسف نے کشتی ساحل کی طرف موڑ دی اور برجیس نے جس جگہ نشاندہی کی وہاں کشتی ساحل سے لگ گئی۔ یوسف نے کشتی ایک رسی سے درخت سے باندھ دی۔ اس با ساحل سنان پڑا تھا نہ کوئی سوار تھا نہ پیدل۔ برجیس اسے لیے ہوئے مختلف راستوں سے گزر کر سفارت خانے کی عمارت کے سامنے پہنچ گئی۔

موصل کا امیر عماد الدین زنگی تھا۔ یہ وہی عماد الدین زنگی ہے جس نے سلجوقی شہزادہ کی جانشینی کی جنگ میں قراچہ ساتی سے شکست کھائی تھی۔ زنگی اپنے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ قلعہ تکریت پہنچا۔ وہاں کے ایک غیر معروف حاکم نجم الدین ایوب نے اسے قلعہ کی بڑی عزت سے اتارا اور خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ نجم الدین اور عماد الدین زنگی میں شناسائی تک نہ تھی۔ نجم الدین نے زنگی کے ساتھ جو سلوک کیا وہ وقت نزاکت اور انسانی ہمدردی کے تحت کیا لیکن زنگی کے رخصت ہونے کے بعد نجم الدین اس مہمان نوازی کا بڑا سخت خمیازہ بھگتنا پڑا۔

کہتے ہیں کہ مجاہد الدین بہروز ایک بڑا سلجوقی امیر تھا۔ سلجوقی شہزادوں کی تخت نشینی جنگ کے وقت وہ سلجوقی سلطان کی طرف سے بغداد کا شہنہ (گورنر) تھا۔ موصل کا زنگی بغداد کا بہروز دونوں ہم عصر تھے اور دونوں میں لاگ وراثت رہتی تھی زنگی بڑی جہیزی ترقی کر رہا تھا اور یہ بات بہروز کو پسند نہ تھی۔ بہروز دمنجا کے علاقے داوین کا رہنے والا تھا اسی جگہ شادی نام کا ایک شخص رہتا تھا جو بہروز کا گہرا دوست تھا۔ جب بہروز بغداد

نجم الدین نے فوراً موصل کا رخ کیا۔ عماد الدین نے اسے سر آکھوں پر بٹھایا اور  
الدین اور اس کے بھائی اسد الدین کو اپنے خاص سرداروں میں داخل کر لیا۔

سلجوقی سلطنت کا جس تیزی سے شیرازہ بکھر رہا تھا اسی تیزی سے زنگی خاندان کا سورج  
چڑھ رہا تھا۔ زنگی دیکھتے ہی دیکھتے سلجوقی سلطنت کا سب سے زیادہ طاقت ور امیر بن گیا۔ پہلی  
وہ زمانہ تھا جب ملک شام اور جزیرہ میں صلیبی سورا اودھم مچائے ہوئے تھے۔ کسی میں  
انھیں روکنے کی طاقت نہ تھی۔ بارین سے لے کر مصر کی سرحد تک لہرائیوں کا قبضہ تھا۔  
مسلمان امیر خانہ جنگی میں الجھے ہوئے تھے۔ امیر زنگی ان سیلیوں سے کئی جہزیں کر چکا تھا  
لیکن ان سے بڑا مورچہ لینے سے پہلے اسے چھوٹے مسلمان حکمرانوں کو زیر کرنا تھا۔

حکمریت سے واپس آنے کے بعد عماد الدین زنگی چار سال تک اندرونی حالات کو  
درست کرتا رہا۔ اس عرصے میں اس نے مسلم حکمرانوں کے علاوہ لہرائیوں کے مضبوط قلعہ  
اٹارب پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اب وہ لہرائیوں کے مخالف جہاد کے لیے پوری طرح تیار تھا  
لیکن جہاد کی کامیابی کے لیے دمشق پر قبضہ ضروری تھا۔ دمشق کا حکمران مجیر الدین تھا لیکن  
اصل اقتدار اس کے سپہ سالار معین الدین انز کے ہاتھ میں تھا۔ انز اور زنگی میں بڑے  
 سخت اختلافات تھے ۱۱۳۵ء میں زنگی نے دمشق پر حملہ کیا، لیکن سپہ سالار انز کی جنگی چالوں  
اور تدبیر کے سامنے زنگی کی ایک نہ چلی اور اس کا یہ حملہ پسا کر دیا گیا۔

اس فتح کے بعد زنگی اپنے مستقر موصل واپس آ گیا۔ اسے قلعہ بارین کے محاصرے  
کے دوران ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اٹارب کے لہرائی قلعہ کی فتح کے بعد ہی سے پورے  
یورپ پر صلیبی جنگوں کا بخار چڑھ گیا تھا۔ شکست خوردہ لہرائی پادری پاپائے روم جو  
لہرائیوں کا سب سے بڑا پیشوا تھا، کے دربار میں پہنچ گئے تھے اور پاپائے روم نے یورپ کے  
تمام لہرائی بادشاہوں اور خصوصاً "شہنشاہ قسطنطنیہ جان کامنی نس" پر زور دیا تھا کہ وہ زنگی  
سے عیسائی علاقے واپس لے اور اسے اس زیادتی کی خاطر خواہ سزا دے۔ امیر موصل کی  
دور میں نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ یورپ کے مذہبی جنونیوں کا طوفان کسی وقت بھی ایشیا میں  
داخل ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ بارین سے فوراً واپس آ کر اپنی جنگی تدبیروں میں لگ گیا۔

امیر زنگی کو سب سے بڑا خطرہ شہنشاہ قسطنطنیہ سے تھا۔ وہ ایشیا کے تمام چھوٹے بڑے  
لہرائی لارڈوں اور شاہوں سے بچہ آزمائی کر چکا تھا۔ شاہ پروٹلم کا زور بھی اس نے بارین  
کے محاصرہ میں دیکھ لیا تھا لیکن شہنشاہ قسطنطنیہ کے بارے میں اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ زنگی  
کے میدان میں آنے سے پہلے تمام مسلم امیر، لہرائیوں سے خوف زدہ رہتے تھے۔ شہنشاہ  
قسطنطنیہ تو ان کے خیال میں ایک ایسی عظیم طاقت تھی جس سے مقابلے کا تصور بھی نہیں  
کیا جاسکتا تھا

یہاں یہ وہ موقع تھا جب زنگی نے اپنے بڑے سرداروں کو صلاح مشورے کے لیے بلایا۔  
نجم الدین ایوب اور اس کا بھائی اسد الدین زنگی دربار سے منسلک تھے۔ دونوں بھائیوں نے  
زنگی کے ساتھ تمام جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ اور شجاعت کا اعلیٰ مظاہرہ کیا تھا۔ زنگی نے نجم  
الدین کو بعلبک کا حاکم بنا کر بھیجا تھا اور چھوٹا بھائی اسد الدین زنگی کے سرداروں میں

شامل تھا۔ زنگی نے اپنے سرداروں کو شہنشاہ قسطنطنیہ کے خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے ملک میں داخل ہوا تو کون سا راستہ اختیار کرے گا، اور اگر ضرورت پڑے تو اسے کہا۔ ”بہادر سردارو“ نصرائیوں کے سب سے بڑے پیشوا پیائے روم نے قسطنطنیہ کے حکم سے بدلہ لینے کی تاکید کی ہے۔ مسلمان سوائے خدا کے دنیا کے کسی شہنشاہ سے ڈرتے لیکن دشمن کو کمزور سمجھنا ایک بڑی غلطی ہے۔

زنگی کے سرداروں نے فوراً ”تکواریں بلند کر کے اپنی وفاداری اور جہاد میں شہید زنگی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”اسد الدین تمہیں فوراً“ قسطنطنیہ جانا ہے اور

کا بڑے جوش سے اعلان کیا۔ زنگی نے ان کے جذبے کو سراہا اور کہا۔ ”میں تمہاری بہادری اور جذبے کے تمام باقوں کا پتہ لگانا ہے جس میں میرے تمام جاسوس ناکام رہے ہیں۔ ہوں لیکن مجھے اب ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہے جو دشمن پر تکوار کے بجائے اپنی اور کسی طرح یہ اطلاعات جلد سے جلد مجھ تک پہنچاتا ہے۔ میں تمہیں صرف یہ مشورہ و فراست سے حملہ کرے۔ جنگ تکوار اور فراست دونوں سے لڑی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہوں کہ اگر تم کسی مصیبت میں پھنس جاؤ تو مصری سفارت خانے کا تعاون جنگی حکمت عملی ہے۔“

سرداروں کی سمجھ میں زنگی کی بات نہ آئی۔ وہ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ ”یہ یقین دلایا ہے کہ یہ وہ حکم کار میری در پردہ مدد سے اسد الدین ہمت کر کے بولا۔ ”امیر محترم! یوں تو آپ کا ہر سردار اطاعت و فرماں برداری سے نوازا گیا ہے۔“

بہادری میں اپنی مثال آپ ہے۔ آپ جس کو جس کام کے لیے منتخب کریں گے وہ کرے گا۔ عہد الدین زنگی نے اسد سے کوئی مزید گفتگو نہ کی اور اسے فوراً روانہ ہونے کا حکم حکم بجلائے گا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں عقل اور فراست کا مالک ہوں پھر بھی لے کر رخصت کر دیا۔ یہی وہ حکم تھا جس کے تحت اسد الدین اپنے غلام یوسف کے کام کے لیے جس تک ہماری عقل کی اب تک رسائی نہیں ہو سکی میں اپنی خدمات اتمہ راستے کی صعوبتیں برداشت کرتا رومی سرحد پر پہنچا اور خود کو رومیوں کے حوالے کر کرتا ہوں اور امید ہے کہ امیر مجھے اس کے بجلائے گا حکم دیں گے۔“

زنگی نے مسکرا کے کہا۔ ”اسد الدین تمہاری تکوار کے جوہر میں نے میدان جنگ لیا لیکن اس بوڑھے مکار وزیر نے اسے اور یوسف کو جس امتحان میں ڈالا اسے سوچ دیکھے ہیں۔ مجھے تمہاری لڑائی کا انداز بھی پسند ہے لیکن تم نہایت منجملہ جوان ہو اور بچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جان قوش نے یوسف کو کس بے گناہ بڑے مبروہ قتل کا ہے۔“

اسد الدین کے بعد تمام سرداروں نے باری باری اپنی خدمات پیش کیں۔ زنگی کماقت میں بیٹھا تھا رات گزرتی جا رہی تھی اور اسد پر ایک نامعلوم خوف طاری ہوتا جا رہا غور کرنے کے بعد بولا۔ ”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کام پر سب سے پہلے میں اسد لا۔“

کو مامور کروں گا کیونکہ اس نے پہلے اس کی خواہش کی ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ ناکام ہو۔ اس صورت میں کسی دوسرے کا انتخاب کیا جائے گا۔“

زنگی کے دوسرے سرداروں نے اسد الدین کو مبارک باد دی۔ اسد الدین کا سینہ ہموں کی چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

سے پھول گیا۔ سرداروں کو رخصت کرنے کے بعد زنگی نے اسد الدین سے کہا۔ ”تم سو رہے ہو چوکیدار؟“ یوسف نے ذرا رعب سے کہا۔ ”نہیں جناب۔“ چوکیدار نے آنکھیں پٹ پٹائیں۔ ”مگر آپ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں نے شہنشاہ قسطنطنیہ کے خطرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میرے جاسوس یہ اطلاع

ہیں؟

”مجھے اسی وقت سفیر سے ملنا ہے۔“  
 ”اس وقت؟“ چوکیدار نے بات کاٹ دی۔ ”سفیر صاحب آرام فرما رہے ہیں۔“  
 ملاقات ہو سکتی ہے۔  
 ”جس طرح تم سو رہے ہو اسی طرح تمہارا ذہن بھی نیند میں ڈوبا ہوا ہے۔“  
 ”اس کی رہنمائی میں یہ دونوں بیڑھیاں چڑھ کے ایک دروازے کے سامنے رکے اسی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک شخص نے باہر نکل کے کہا۔“ مالک بن خضر آپ کو خوش نے اور زیادہ رعب سے کہا۔

”میں قاہرہ سے آیا ہوں اور شاہ مصر کا ایک ضروری پیغام سفیر مصر کو پہنچانا ہے۔“  
 چوکیدار نے بڑی حیرت سے یوسف کو سر سے پیر تک دیکھا اور فوراً ”جھک کر“  
 ”صاحب آپ صرف چند لمحے یہاں انتظار فرمائیے میں ابھی صاحب کو خبر کرتا ہوں۔“  
 چوکیدار نے لوہے کا گیٹ کھولا اور اندر جا کر اسے دوسری طرف سے بند کر دیا۔  
 باوجود گھبراہٹ کے اس نے گیٹ کھلا نہیں چھوڑا، پھر وہ لے لے ڈگ بھرتا حویلی میں یوسف نے برہنہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ان خاتون کو کسی جگہ بٹھا ہو گیا۔“

برہنہ نے پوچھا۔ ”تم شاید عربی بول رہے تھے۔ کیا کہا اس سے۔“ میرے گیٹ کا چوکیدار واپس جا چکا تھا۔ سفیر نے دروازے کے ساتھ لٹکتی ریٹم کی ایک بتایا؟“  
 یوسف خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر برہنہ کو دیکھا۔ بولا۔ ”میرے پاس پہنچ گیا۔“

عربی نہ بولتا تو وہ مجھ سے بات بھی نہ کرتا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں شاہ مصر کا ایک ”ان خاتون کو عزت سے دوسرے کمرے میں بٹھاؤ۔“  
 سفیر کے لیے لایا ہوں۔“  
 تم نے اس سے جھوٹ کہا ہے کہیں اس کا الٹا اثر نہ ہو۔ برہنہ گھبرا گئی تھ کرے میں آگیا۔ یہ کمرہ کافی روشن تھا اور ہر طرف بھینی بھینی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔  
 ”جھوٹ نہیں برہنہ، یہ مصلحت تھی۔“ یوسف نے سمجھایا۔ ”سفیر مصر سے اذیت کرے کا جائزہ لے رہا تھا لیکن مالک شاہی پیغام کے لیے بے چین تھا۔ اس سے نہ گفتگو کرنے کی صرف یہی تدبیر ہو سکتی تھی۔“  
 ”اور اگر سفیر نے بگڑ کر تمہاری مدد کرنے سے انکار کر دیا تو؟“ برہنہ نے پوچھا۔ ”میرے لیے شاہ کا کیا حکم ہے؟“

ظاہر کی۔  
 ”امید پر دنیا قائم ہے برہنہ۔“ یوسف نے کہا۔ ”اگر سفیر نے پناہ دینے سے انکار کر دیا تو؟“  
 ”آپ قطعی پریشان نہ ہوں۔“ یوسف نے کہا۔ ”میں آپ کو یہ یاد دلانا چاہتا ہوں

”یوسف“۔ برہنہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”تم میرے ساتھ مرنے کی کوشش کرو۔“  
 ہو۔ مجھے اجازت دو کہ میں واپس جا کر سمندر میں چھلانگ لگا دوں اور تم جا کر دروازہ کھلو، کیا آپ مجھے بتائیں گے کہ شاہ مصر یا امیر زنگی سے آپ کا کیا تعلق ہے؟“  
 ”محترم مالک صاحب! آپ نے یہ تو اندازہ لگا لیا ہو گا کہ میرا کسی حکومت سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ میں اس راز کو بھی جانتا ہوں جس تک عام آدمی کی قطعی پہنچ نہیں۔“ یوسف

یوسف نے کوئی جواب نہ دیا۔ چوکیدار تیزی سے واپس آ رہا تھا۔



نے اطمینان سے کہا۔ ”آپ کسی الجھن میں نہ پڑیے۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔ یوسف ہے۔ میں اور میرے آقا اسد الدین امیر موصل عماد الدین زنگی کے خاص ہیں۔ آپ کو یہ سن کر تعجب نہ کرنا چاہیے کہ ہم دونوں اس وقت وزیر سلطنت کا ملازمت کر رہے ہیں۔ جان قوش نے ایک خاص کام سے مجھے ساحل پر بھیجا تھا کہ اندازہ لگا لیا ہوگا۔ اس کے علاوہ نصرانی دوشیزہ برجیس سے مجھے کچھ تعلق خاطر بھی ہے۔ مجھے سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں۔“ یوسف نے رک کر مالک بن خضر کو دیکھا۔ اس کا اندازہ لگا لیا ہوگا۔ اس کی پوری حفاظت کریں گے۔“

”عالی جناب سفیر مصر۔“ یوسف نے باوقار انداز میں کہا۔ ”میرے امیر والی نے مجھے حکم دیا تھا کہ اگر مجھے کسی وقت ضرورت پڑے تو میں سفیر پوری تعاون حاصل کر سکتا ہوں۔ کیا آپ شاہ مصر کے حکم کے مطابق مجھ سے تعاون فرمائیں؟“

”مگر آپ .... برادر یوسف .... آپ کیا واقعی امیر زنگی کے کارندے ہیں؟“ مالک بن خضر نے یوسف کو دیکھا اور خوب صورت جواب دیا۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی خاطر نہیں کر سکا۔“

”مگر آپ .... برادر یوسف .... آپ کیا واقعی امیر زنگی کے کارندے ہیں؟“ مالک بن خضر نے یوسف کو دیکھا اور خوب صورت جواب دیا۔ ”جیسے آپ کی مرضی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی کوئی خاطر نہیں کر سکا۔“

یوسف نے اس کی حالت کا اندازہ کر لیا اور کہا۔ ”محترم سفیر۔ آپ کو میری باتیں معلوم ہوتی تھیں۔“

”آپ کا بہت بہت شکریہ۔“ یوسف نے جذبہ احسان مندی سے کہا۔ ”اگر خدا باتیں ہیں جن پر مشکل ہی سے یقین کیا جاسکتا ہے لیکن یہ سب حقیقتیں ہیں جن کی درخواست میں مارا جاؤں یا مجھے کہیں اور جانا پڑے تو آپ برجیس کو کسی طرح قاہرہ پہنچا دیجیے میں پھر کسی وقت بیان کروں گا۔ آپ مجھ پر اعتبار کیجئے۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔“

یوسف کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس نے کہا۔ ”اس وقت آپ سے یہ التماس ہے کہ یہ لڑکی جسے میں آپ کی پردگی میں دے رہا ہوں۔ میرے منصوبے میں نے سن لیا یوسف۔“ برجیس خوشی اور کسی نا معلوم جذبے کی شدت سے کانپنے

یوسف کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ اس نے کہا۔ ”اس وقت آپ سے یہ التماس ہے کہ یہ لڑکی جسے میں آپ کی پردگی میں دے رہا ہوں۔ میرے منصوبے میں نے سن لیا یوسف۔“ برجیس خوشی اور کسی نا معلوم جذبے کی شدت سے کانپنے

گئی تھی۔ ”یوسف مجھے اجازت دو کہ میں شکرگزاری کے اظہار کے طور پر تمہارے ”جی۔۔۔ وزیر محترم“ آپ کے حکم کی تعمیل ہو گئی۔“  
 ”یہ کہتے ہوئے برہمن نے اس کا ہاتھ پکڑا۔“  
 ”نہیں برہمن۔“ یوسف نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ”میرا مذہب یہ اجازت نہیں دیتا کہ کوئی مرد سوائے اپنی بیوی کے کسی اور عورت کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرے۔“  
 ”تو پھر مجھے اپنے پیر چھونے کی اجازت دو۔“ برہمن نے بھری بھری نظروں سے دیکھا۔  
 ”آپ اس رات کو کہہ رہے ہیں۔“ یوسف نے پاگلوں جیسے انداز میں کہا۔ ”میرے

رے تو ہزاروں راتیں گزر گئیں۔“ وزیر محترم۔ جس پر ندے کو اپنی موت کا یقین ہوا اس نے مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔ برہمن کو قید خانے میں خاموش رکھنا اسے رہائی کا فریب دے کر سمندر تک لے جانا کسی ملک کے فتح کرنے سے کسی طرح کم نہیں۔ میں نے میدان ”تم بہت عظیم ہو یوسف۔“ برہمن ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”تمہاری بیوی بیگم میں کتنوں کے گلے کاٹنے ہیں، خون کے سمندر میں گھوڑا تیرایا ہے۔ مرنے والوں کی بڑی خوش قسمت عورت ہے جسے تم جیسا شوہر میسر آیا۔“  
 برہمن کے الفاظ پر یوسف ایسے نازک حالات میں بھی اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ لے سکا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔“ یوسف نے پاگلوں جیسے انداز میں کہا۔ ”میرے

رے تو ہزاروں راتیں گزر گئیں۔“ وزیر محترم۔ جس پر ندے کو اپنی موت کا یقین ہوا اس نے مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔ برہمن کو قید خانے میں خاموش رکھنا اسے رہائی کا فریب دے کر سمندر تک لے جانا کسی ملک کے فتح کرنے سے کسی طرح کم نہیں۔ میں نے میدان ”تم بہت عظیم ہو یوسف۔“ برہمن ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”تمہاری بیوی بیگم میں کتنوں کے گلے کاٹنے ہیں، خون کے سمندر میں گھوڑا تیرایا ہے۔ مرنے والوں کی بڑی خوش قسمت عورت ہے جسے تم جیسا شوہر میسر آیا۔“  
 برہمن کے الفاظ پر یوسف ایسے نازک حالات میں بھی اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ لے سکا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔“ یوسف نے پاگلوں جیسے انداز میں کہا۔ ”میرے

رے تو ہزاروں راتیں گزر گئیں۔“ وزیر محترم۔ جس پر ندے کو اپنی موت کا یقین ہوا اس نے مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔ برہمن کو قید خانے میں خاموش رکھنا اسے رہائی کا فریب دے کر سمندر تک لے جانا کسی ملک کے فتح کرنے سے کسی طرح کم نہیں۔ میں نے میدان ”تم بہت عظیم ہو یوسف۔“ برہمن ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”تمہاری بیوی بیگم میں کتنوں کے گلے کاٹنے ہیں، خون کے سمندر میں گھوڑا تیرایا ہے۔ مرنے والوں کی بڑی خوش قسمت عورت ہے جسے تم جیسا شوہر میسر آیا۔“  
 برہمن کے الفاظ پر یوسف ایسے نازک حالات میں بھی اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ لے سکا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔“ یوسف نے پاگلوں جیسے انداز میں کہا۔ ”میرے

رے تو ہزاروں راتیں گزر گئیں۔“ وزیر محترم۔ جس پر ندے کو اپنی موت کا یقین ہوا اس نے مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔ برہمن کو قید خانے میں خاموش رکھنا اسے رہائی کا فریب دے کر سمندر تک لے جانا کسی ملک کے فتح کرنے سے کسی طرح کم نہیں۔ میں نے میدان ”تم بہت عظیم ہو یوسف۔“ برہمن ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”تمہاری بیوی بیگم میں کتنوں کے گلے کاٹنے ہیں، خون کے سمندر میں گھوڑا تیرایا ہے۔ مرنے والوں کی بڑی خوش قسمت عورت ہے جسے تم جیسا شوہر میسر آیا۔“  
 برہمن کے الفاظ پر یوسف ایسے نازک حالات میں بھی اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ لے سکا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔“ یوسف نے پاگلوں جیسے انداز میں کہا۔ ”میرے

رے تو ہزاروں راتیں گزر گئیں۔“ وزیر محترم۔ جس پر ندے کو اپنی موت کا یقین ہوا اس نے مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔ برہمن کو قید خانے میں خاموش رکھنا اسے رہائی کا فریب دے کر سمندر تک لے جانا کسی ملک کے فتح کرنے سے کسی طرح کم نہیں۔ میں نے میدان ”تم بہت عظیم ہو یوسف۔“ برہمن ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ”تمہاری بیوی بیگم میں کتنوں کے گلے کاٹنے ہیں، خون کے سمندر میں گھوڑا تیرایا ہے۔ مرنے والوں کی بڑی خوش قسمت عورت ہے جسے تم جیسا شوہر میسر آیا۔“  
 برہمن کے الفاظ پر یوسف ایسے نازک حالات میں بھی اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ لے سکا۔ ”تم نہیں جانتیں کہ مسلمانوں میں کرنا کس قدر مشکل ہے۔“ یوسف نے پاگلوں جیسے انداز میں کہا۔ ”میرے

”وزیر عالی مقام۔“ یوسف نے غمزہ آواز میں کہا۔ ”وطن میں نے خود چھوڑا  
امیر زنگی کی زندگی میں موصل کا ذرہ ذرہ میرا دشمن رہے گا، پھر اس دنیا میں آقا اس  
کے علاوہ میرا کوئی عزیز و اقارب نہیں۔ میرے لیے سب سے بڑا یہ اعزاز ہے کہ مجھے  
میرے آقا کو آپ کے قدموں میں جگہ مل گئی۔“

## برجیس

برجیس کو مصری سفارت خانے میں رہتے ہوئے ایک مہینہ گزر گیا۔  
اسے یہ تو اطمینان تھا کہ وہ جان قوش کی قید سے آزاد ہو کر ایک محفوظ جگہ آگئی تھی  
لیکن اس کا مستقبل کیا ہو گا۔ اس کے بارے میں اسے کوئی علم نہ تھا اس کا باپ اگرچہ  
روی سرحد کا ناظم تھا لیکن وزیر سلطنت جان قوش کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہ  
تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے والدین اس کے اغوا کو قتل سمجھ کے اسے روپیٹ چکے  
ہوں گے اور وقت نے ان کے زخموں پر مرہم رکھ دیا ہو گا ایسی صورت میں اگر وہ اپنے  
والدین کے پاس واپس جانے کی کوشش کرے تو اس کا انجام کیا ہو گا۔ اس تصور ہی سے وہ  
لڑا سختی تھی۔ وزیر سلطنت تو قیامت برپا کر دے گا اور اس کا باپ جو اسے صبر کر چکا ہے  
ایک ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے گا جس کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔  
اس قسم کے خیالات اسے ہر وقت گھیرے رہتے۔ جب وہ زیادہ الجھتی تو اپنے محسن  
یوسف کے بارے میں سوچنے لگتی۔ یوسف پر کیا گزری اس کا اس کو صحیح علم تو نہ تھا سوائے  
اس کے کہ مصری سفیر مالک بن خضر نے اسے بتایا تھا کہ یوسف اور اس کا ساتھی بدستور  
وزیر سلطنت کی ملازمت میں ہیں اور بظاہر خوش و خرم نظر آتے ہیں۔ مصری سفیر برجیس پر  
بہت مہمان تھا اور دن میں ایک بار اس کی مزاج پرسی اور تسلی دینے کے لئے آتا تھا۔  
دوسری طرف یوسف اور اسد الدین کے دن رات بغیر کسی خاص واقعے کے گزر رہے  
تھے۔ وزیر سلطنت نے انہیں اب تک کوئی اہم کام سپرد نہیں کیا تھا۔ وزیر سلطنت کے

اس اظہار کے بعد کہ شہنشاہ قسطنطنیہ امیر موصل کے خلاف ایک زبردست صلیبی شروع کرنے والا ہے۔ ان کی پریشانیاں بڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے بہت کھوج لگا کر کوشش کی کہ جنگی تیاریوں کے بارے میں کوئی تفصیل معلوم ہو سکے مگر وزیر سلطنت منہ میں زبان ہی نہ رکھتا تھا۔ اس نے اس سلسلے میں مزید کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ نے یوسف کو منع کر دیا تھا کہ وہ فوجی تیاریوں کے سلسلے میں کھوج نہ کرے کیونکہ اس جان قوش کو شبہ ہو سکتا تھا۔

یوسف کو برہم کی فکر الگ لاحق تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ برہم پر کیا کر ہے اور مصری سفیر کا اس کے ساتھ کیا رویہ ہے اسے زیادہ پریشانی اس بات کی تھی کہ برہم جلد بازی میں سفارت خانے سے فرار ہو کر اپنے باپ کے پاس پہنچے کوشش نہ کرے کیونکہ اس کے خیال میں برہم کا یہ قدم اس کی اور اس کے والدین ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے اور خود یوسف اور اس کی تباہی کا بھی سامان ہو سکتا تھا۔ ادھر کئی دن سے وزیر سلطنت نے مصری سفیر کو کئی بار بلوایا تھا۔ یوسف اور اس کے لئے یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ وزیر سلطنت مصری سفیر سے گفتگو میں محتاط اور بد یوسف یا اس کو اس کا ایک لفظ نہ بتاتا۔ ایک بار یوسف اور مصری سفیر مالک بن خراہداری میں سامنا ہو گیا۔ مصری سفیر وزیر سلطنت کے دو غلاموں کے پہرے میں گفتگو بعد واپس آ رہا تھا اگر غلام ساتھ نہ بھی ہوتے تو بھی یوسف اس سے گفتگو کا خطرہ مول لیتا۔ دونوں کی صرف آنکھیں چار ہوئی تھیں۔ لیکن نظروں کے اس لحاقی تصادم میں مصری سفیر نے وہ سب کچھ کہہ دیا جس کے لئے یوسف اور اس کے بے چین تھے۔ یوسف دیکھ کر مصری سفیر کے چہرے پر ہلکی سی چمک اور مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اور آگے میں اطمینان کی جھلک تھی۔ یوسف کو اس بے زبانی کی زبان سے یہ اندازہ ہو گیا کہ بالکل خیریت سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی اطمینان ہوا کہ مصری سفیر کا سلطنت کے پاس بار آنا برہم یا ان کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اس نے اسد کو بتایا تو اس نے اس خیال کی تائید کی۔

ایک دن جب یوسف اور اسد راہ داری میں کھڑے گفتگو کر رہے تھے۔ تو شہنشاہ چوہدار آنا دکھائی دیا۔ یہ شہنشاہ جان کا منی نس کا خاص غلام تھا۔ اس کی وردی نہایت اور بھولہ تھی۔ سر پر جو ٹوپی تھی اس پر سونے چاندی کا کام کی ہوئی جھار لک رہی تھی اور ہاتھ میں چاندی کا ایک لمبا عصا تھا جس کے سرے پر نیزے کی انی لگی تھی۔ "خدا خیر کرے۔ شاہی چوہدار کا آنا ضرور کوئی معنی رکھتا ہے۔" اسد الدین نے

سے کہا۔

یوسف نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ "آقا درست فرما رہے ہیں۔ آج پہلی بار یہ وزیر سلطنت کے محل میں دکھائی دیا ہے۔" "میرا خیال ہے کہ شہنشاہ نے جان قوش کو طلب کیا ہے۔" اسد نے خیال ظاہر کیا۔ "ہو سکتا ہے کہ وزیر سلطنت کی طلبی جنگی تیاریوں کے سلسلے میں ہو۔"

"جی ہاں آقا۔ میں بھی یہی کہنے والا تھا۔" یوسف نے فوراً جواب دیا۔ "مجھے معلوم ہوا کہ رومی فوجوں کی نقل و حرکت کی پوری ذمہ داری وزیر سلطنت کے سپرد ہے۔" "اس حد تک تو مجھے بھی علم ہے۔" اسد الدین اس طرح مسکرایا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں یہاں کے حالات سے تجھ سے کہیں زیادہ باخبر ہوں۔

شاہی چوہدار بڑی رعوت سے قدم اٹھاتا ان کے قریب سے گزر کر وزیر کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ دروازے کے دونوں مسلح سپردار فوراً اس کے سامنے جھک گئے اور بغیر کوئی سوال کئے دروازہ کھول دیا۔ چوہدار بڑی شان سے اندر چلا گیا۔ اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

وزیر سلطنت باتوں میں مصروف تھا۔ دروازہ اچانک کھلا تو اس نے سراٹھا کر قہر آلود نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا چوہدار کو دیکھتے ہی اس کا غصہ ختم ہو گیا اور چہرے پر معنوی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے چوہدار کے استقبال کو کھڑا ہو گیا۔

"آئیے آئیے۔ آپ کا آنا مبارک۔ خداوند یسوع مسیح کی آپ پر برکتیں ہوں۔" وزیر سلطنت نے اس قدر عاجزی سے کہا جیسے وہ چوہدار کی بجائے شہنشاہ کا استقبال کر رہا ہو۔ چوہدار نے وزیر سلطنت کو کوئی تعظیم پیش نہیں کی اور اس کے قریب پہنچ کے بڑے کھڑے لہجے میں بولا۔

"شہنشاہ عالم کے حضور وزیر سلطنت کی طلبی ہے۔" "نکتا مبارک حکم ہے۔ شہنشاہ عالم نے مجھ ناچیز کو قدم بوسی کے لئے طلب کر کے کتنی بڑی عزت بخشی ہے۔ میں شہنشاہ کی اس نوازش۔۔۔۔۔"

"میرے پاس باتوں کا وقت نہیں ہے۔" چوہدار نے رعب دار آواز میں قطع کلام کیا۔ "اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"ضرور کیوں نہیں" وزیر سلطنت نے لجاجت سے کہا۔ جان قوش فوراً چوہدار کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا اور سفیر مصر سے کہا "مالک بن خضر" میں اس وقت شہنشاہ کی قدم بوسی کو جا رہا ہوں۔ آپ کو پھر کبھی بلوا لوں گا۔"



جان قوش کی آدمی جان نکلی گئی۔ لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔ عالیجاہ۔ انسان ہونے کی حیثیت سے میں غلطیاں کر سکتا ہوں لیکن حضور والا کو یقین دلاتا ہوں کہ میں شہنشاہ عالی مقام کے خلاف خواب میں بھی ایک لفظ کہنے کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں ہمیشہ سے شہنشاہ کی اس غلامی میں مرنا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں کیا ہو گیا ہے جان قوش!“ شہنشاہ نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”ہمیں تم سے کوئی شکایت نہیں اور اگر تم نے ہمارے خلاف ایک لفظ بھی کہا ہوتا تو تم ایک لمحہ بھی زندگی نہیں رہ سکتے تھے۔ ہم تو ان دو جاسوسوں کے بارے میں پوچھنا چاہتے تھے جو تمہارے محل میں بڑی آزادی سے گھومتے پھر رہے ہیں۔ کیا یہ غلط ہے کہ وہ دونوں ذلیل مسلمان ہیں؟“

”عالیجاہ کو صحیح اطلاع دی گئی کہ دو مسلمان گرفتار کر کے میرے پاس لائے گئے ہیں۔“

جان قوش نے سنبھل کر کہا۔ ابھی وہ اس کی تفصیل بیان کرنا چاہتا تھا کہ شہنشاہ بول

”جان قوش۔ تمہیں جاسوسوں کو ہمارے سامنے پیش کرنا تھا۔“ شہنشاہ کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”عالیجاہ۔ مجھے اس غلطی کی وضاحت کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔“ جان قوش نے حواس پر قابو پاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

”اجازت ہے۔“

”عالیجاہ۔ میرے پاس موجود دونوں مسلمانوں میں سے ایک کا نام اسد الدین ہے اور دوسرا اس کا غلام یوسف ہے۔“

جان قوش نے ہر سکون لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ”ان دونوں کا تعلق ہمارے دشمن امیر عماد الدین زنگی کے لشکر سے ہے۔“

”کیا وہ موصل کے حاکم کے آدمی ہیں؟ شہنشاہ نے بے چینی سے پوچھا۔

”جی عالیجاہ۔“ جان قوش نے تائید کی۔ ”اسد الدین والی موصل کا خاص سردار تھا۔ لیکن اس کا کوئی فعل امیر زنگی کو ناگوار گذرا اور اسد الدین اور اس کے غلام کو قید میں ڈال دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد یہ قید سے نکل بھاگے اور چھپتے چھپاتے رومی سلطنت کی سرحد پر آگئے۔ انہیں ہماری سرحدی چوکی کے محافظوں نے گرفتار نہیں کیا بلکہ ان دونوں نے اپنے آپ کو ان کے حوالے کر دیا اور پناہ کے لئے طلب گار ہوئے۔ سرحد کے ناظم نے انہیں سخت پھرے میں مزید تفتیش کے لئے میرے پاس بھیج دیا۔“

”تو کیا تم نے انہیں پناہ دے دی؟“ شہنشاہ نے جلدی سے پوچھا۔

مالک بن خضر سلام کر کے کمرے سے نکلا۔ اس کے پیچھے چوہدار اور چوہدار کے بیٹے وزیر سلطنت سر جھکائے ہوئے نکلا۔ وزیر سلطنت کا رنگ اڑا ہوا تھا اور پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ سخت متحکم اور گھبرایا ہوا تھا۔ شہنشاہ کا کسی امیر وزیر کو گھر سے طلب کرنا کسی مصیبت کا پیش خیمہ ہوتا تھا۔ ایک دن پہلے ہی شہنشاہ نے دربار خاص لگایا تھا اور اس میں وزیر سلطنت بھی حاضر تھا پھر اسے کیوں طلب کیا گیا۔ دربار میں وزیر سلطنت کے اشارے دشمن موجود تھے اور اس اہم عہدے سے اسے ہٹانا چاہتے تھے۔ کیونکہ وزیر سلطنت میں سوائے سوتیلے بھائی ہونے کے اور کوئی خوبی نہ تھی۔ نہ اسے امور سلطنت کی سوجھ بوجھ تھی اور نہ جنگی ضرورتوں اور مصلحتوں کا اسے علم تھا۔

جان قوش بھیگی ملی بنا شہنشاہ کے حضور پیش ہوا۔ شہنشاہ اس وقت بالکل تنہا صرف دو کنیزیں ساقی گری کی خدمت انجام دے رہی تھیں۔ شہنشاہ قسطنطنیہ جان لے کر مشرقی یورپ میں نصرائیوں کی سب سے بڑی طاقت تصور کیا جاتا تھا۔ ایک طرف وہ کی فاطمی سلطنت پر آئے دن حملے کیا کرتا تھا۔ دوسری طرف یورپ کی تمام ریاستوں کا ساتھ دیتا تھا۔ شہنشاہ کا محل دربار اور ہر کمرہ اپنی سجاوٹ اور دل آویزی میں اپنی آپ تھا۔ اس کی تفصیل کے لئے ایک الگ باب کی ضرورت ہے۔

جان قوش نے فرش تک جھک کر اسے سلام پیش کیا۔ شہنشاہ نے ساقی کنیزوں کو جانے کا حکم دیا۔ کنیزیں ساغر و مینا سیٹھی جلدی سے باہر نکل گئیں۔

”جان قوش۔“ شہنشاہ نے کچھ اس رعب سے کہا کہ جان قوش کا بدن لرز اٹھا۔

جان قوش نے جواب کے لئے منہ کھولا مگر شاہی رعب۔۔۔۔۔ سے اس کا حلق

ہو گیا۔ وہ اپنے سر کو اثبات میں صرف ہلا سکا۔

”جان قوش“ شہنشاہ نے اس کی حالت کا اندازہ کرتے ہوئے اپنی آواز نرم اور ملائم کر دیا ”خوف کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف مجرموں کے لئے قہر ہیں۔ تمہاری رگڑ تو ہمارے باپ کا کچھ نہ کچھ خون موجود ہے۔“

جان قوش کی جان میں جان آئی۔ آہستہ سے بولا۔ ”یہ ناچیز تو صرف عالی نوازشوں پر زندہ ہے۔ اگر غلام سے کوئی نادانستہ غلطی ہوئی ہو تو ازراہ الطاف خیروان فرمایا جائے۔“

”نہیں جان قوش۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ہمارے وفادار ہو اور ہم اپنے وفاداروں کو کھول کے انعام و اکرام سے نوازتے ہیں۔“ شہنشاہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

ایک بات کا افسوس ضرور ہے اور اس کی وضاحت۔

”عالیجاہ۔ غلام یہ جسارت کیسے کر سکتا تھا“ جان قوش نے جوش سے کہا۔ ”دنیا کا اختیار کیا“ عالیجاہ نے جس خیال کا اظہار کیا ہے۔ میری عقل اس تک نہیں پہنچی تھی۔ اس دینے والے تو شہنشاہ قسطنطنیہ جان کا ہی نس ہیں۔“

”بے شک بے شک۔ ہم تمہاری بات سے خوش ہوئے جان قوش“ شہنشاہ نے شہنشاہ کا اقبال بلند ہے وہ سلطنت روما کا کچھ بگاڑ تو نہ سکیں گے لیکن خواہ مخواہ کی مشکلات کا اظہار کیا۔ ”اب وہ دونوں کہاں اور کس حال میں ہیں؟“

”عالیجاہ۔ میں نے انہیں اپنے پاس اس لئے روک لیا تھا کہ ان کے بارے میں پورا تحقیق کروں۔ اگر وہ جاسوس ثابت ہوں تو شہنشاہ کے حکم سے انہیں قتل کرا دوں یا غلام کے بازار میں فروخت کرا دوں۔“ ”لیکن عالیجاہ۔“ جان قوش جان بوجھ کے کہتے کہتے انصوبہ پیش کروں۔ آپ شہنشاہ عالم ہیں۔ میں تو حکم کا بندہ ہوں“ جان قوش نے اپنی بلا ٹال گیا۔

”اپنی بات پوری کرو جان قوش“ شہنشاہ نے تحکمانہ لہجے میں کہا ”انہیں کب پیش رہے ہو ہمارے سامنے؟“

”عالیجاہ۔ میں عرض کر رہا تھا کہ ان کے بارے میں مزید کچھ اور معلومات حاصل سفارت خانے سے کام لو“ جان قوش بوکھلا کے شہنشاہ کا منہ دیکھنے لگا اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سفارت خانے لوں پھر دونوں کو آپ کی قدم بوسی کے لئے لے آؤں گا۔ میں نے اپنی طرف سے واقعات معلوم کئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں کام کے آدمی ہیں اور حضور سے آخر کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ ”عالیجاہ آپ کا قیمتی مشورہ غلام کی سمجھ میں نہ آسکا۔ مجھ پر انہیں کوئی خدمت سپرد کریں تو اسے پورا کرنے میں دریغ نہ کریں گے۔ وہ دراصل سلطنت مرہائی فرمائیے اور حکم دیجئے کہ مجھے کیا کرنا ہے؟“

روما کی پناہ میں آنا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ انہیں امیر زنگی کو کسی قیمت واپس نہ کیا جائے۔

شہنشاہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”جان قوش کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ مسلمانوں کا خلاف ہماری کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ کچھ بھی نہ کرے گا“ ”عالیجاہ میرا خیال ہے کہ وہ اس سے زیادہ اہم خدمات انجام دے سکتے ہیں“ جان قوش نے شہنشاہ کی خوشنودی کے لئے کہا ”شہنشاہ اگر مناسب خیال فرمائیں تو انہیں بلا کر مر یہ یقین دلا دیں کہ ان کی جانوں کا ہر صورت میں تحفظ کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس ہر قسم کا کام لیا جا سکتا ہے۔“

”عالیجاہ میرا خیال ہے کہ وہ اس سے زیادہ اہم خدمات انجام دے سکتے ہیں“ جان قوش نے شہنشاہ کی خوشنودی کے لئے کہا ”شہنشاہ اگر مناسب خیال فرمائیں تو انہیں بلا کر مر یہ یقین دلا دیں کہ ان کی جانوں کا ہر صورت میں تحفظ کیا جائے گا۔ اس صورت میں اس ہر قسم کا کام لیا جا سکتا ہے۔“

”جان قوش“ شہنشاہ نے کسی فوری خیال کے تحت کہا۔ ”ہمیں سلطنت مصر کی طرف سے پورے اطمینان کی ضرورت ہے۔ مصر نے بظاہر تو یہی معاہدہ اور اعلان کیا ہے کہ ہمارے خلاف کسی حکومت کا ساتھ نہیں دے گا لیکن مصر کا قاطعی اور موصل کا زنگی دلا مسلمان ہیں۔ ان کے درمیان کوئی خفیہ معاہدہ بھی ہو سکتا ہے۔“

”شہنشاہ کی عقل و دانش کو بھلا کون پہنچ سکتا ہے“ جان قوش نے خوشامد انداز

”دوسرا کام“ شہنشاہ نے چونک کے پوچھا ”اور کیا کام لیا جا سکتا ہے ان سے؟“

”عالیجاہ۔ اگر مصری سفیر نے ذرا بھی اس بات کا اشارہ کیا کہ مصر اور موصل درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہے یا کسی قسم کا کوئی رابطہ قائم کیا جا رہا ہے تو ہم فوراً مصری طرح وزیر کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں۔“

سفارت بھیج سکتے ہیں اور یہ سفارت انہی دونوں کے سپرد کی جاسکتی ہے۔ ”جان قوش“ نے اس بات کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے آتے ہی مسکرا کر کہا۔ کیا خبر ہو یوسف بات ختم کر کے شہنشاہ کو دزدیدہ نظروں سے دیکھا۔

”بہت خوب جان قوش“ شہنشاہ نے بڑی مسرت سے کہا ”تم بہت دور کی کوڑی لے کر آئے ہو۔ یوسف نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی اور کہا ”ہاں تم ہی کو بلایا ہے شونخ چشم۔ میرا ہو مگر ان دونوں کو ایک ساتھ ضائع نہ کر دیتا۔ پہلے ایک سے کام لینا اور اگر وہ ناکام جائے تو پھر دوسرے کو آزمانا۔ ہم یہ کام تمہارے سپرد کرتے ہیں۔ تم جس طرح چاہو ایک کام کر دو گی؟“

پاؤنجیل تک پہنچا سکتے ہو۔ ”جان قوش شاہی محل سے واپس ہوا تو خوشی کے مارے اس کے قدم زمین پر نہ پڑ سکے۔“

”ہم دیکھتے سرکار شونخ چشم چمک کے بولی ”آپ کا کام کرنے میں اگر جان بھی گنونا“



”جان قوش کی شاہی محل میں طلبی اچانک ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد یوسف نے اسد نے وہاں ٹھہرنا مناسب خیال نہ کیا اور اپنی قیام گاہ پر واپس آگئے۔ ان کا خیال تھا کہ اسے واپسی پر جان قوش انہیں بلائے گا اور انہیں بتائے گا کہ اسے کیوں طلب کیا گیا۔ لیکن پورا دن گزر گیا۔ رات بھی ہو گئی لیکن جان قوش کی طرف سے کوئی بلاوا نہ آیا۔ اس کی قیام گاہ پر ان کی خدمت کے لئے دوسرے غلاموں کے ساتھ اس شونخ چشم کنیز کو مقرر کیا گیا تھا۔ شونخ چشم کنیز۔ یوسف پر کچھ اس درجہ فریفتہ ہو گئی تھی کہ دن رات کے دروازے پر موجود رہتی اور یوسف یا اسد جب کسی کام کے لئے غلام کو بلائے تو کنیز اسے روک کر خود اندر چلی جاتی اور ان کا حکم بجالاتی۔ اسد نے اسے ایک بار ڈانٹا تھا۔ اس لئے وہ اس کی طرف تو توجہ نہ دیتی مگر جب تک اندر رہتی چور نظروں سے یوسف کو دیکھتی رہتی۔ اسد دل ہی دل میں اس کی بے وقوفی پر ہنستا رہتا لیکن شب تک جب جان قوش نے انہیں طلب نہ کیا تو خود اسد الدین نے یوسف سے کہا ”یوسف میرا ذہن سخت پریشان ہے۔ ہمیں تو ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کم بخت محل سے واپس آ بھی کہ نہیں۔“

”نہیں شونخ چشم۔ اس وقت بالکل بھوک نہیں ہے۔ تم میرا کام کرو۔“

”شونخ چشم۔ اسے گھورتی اور ملکتی ہوئے باہر چلی گئی۔“

”بڑی چالاک ہے یہ کنیز“ اسد الدین بڑبڑایا۔

”آقا اگر وہ کوئی اچھی خبر لاتی تو یہ اس کی چالاک کا ہی طفیل ہوگا“ یوسف نے کہا۔

”رات کے وقت تو وزیر کی خواب گاہ کے قریب کوئی پھنک بھی نہیں سکتا“

یوسف کا اندازہ صحیح ثابت ہوا۔ شونخ چشم نصف گھنٹے کے اندر ہی اندر وزیر مملکت کے محل کا چکر لگا کر واپس آگئی اور ہنستے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اسد الدین بھی اس کی باتیں سننے

کہ میرا آقا سخت مذہبی آدمی ہے۔ شراب کباب تو اس کی زندگی سے بالکل خارج ہیں۔  
 ”تو پھر اس محل میں آنے کی کیا ضرورت تھی“ شوخ چشم نے ناگوار لہجے میں کہا ”اس  
 محل کو تو وزیر سلطنت نے جنت بنا دیا ہے۔ عیش عشرت کے تمام سامان یہاں موجود ہیں۔  
 کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ وزیر سلطنت کو ہم لوگ پسند نہیں کرتے لیکن وہ ہم لوگوں میں  
 بے تحاشا مال و دولت تقسیم کرتا ہے جس کی وجہ سے ہم سب کے منہ بند ہو گئے ہیں اور  
 ہم جان قوش کے خلاف کوئی سازش کامیاب نہیں ہونے دیتے۔“  
 یوسف کو یہ اطلاع غی معلوم ہوئی۔ اس نے کرید کی ”کیا جان قوش کے خلاف کوئی  
 سازش ہوئی تھی؟“

”ایک بار کیا اسے کئی بار قتل کرانے کی کوشش کی گئی لیکن ہم نے اسے بچا لیا۔“  
 شوخ چشم نے سنجیدگی سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ درباری امیر اسے وزیر مملکت کے عہدے سے ہٹانا چاہتے ہوں  
 گے؟“

یوسف نے اسے ٹھٹھا ”اس کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے؟“  
 ”ہاں۔ ایک درجہ اور ہے“ شوخ چشم بولی ”جان قوش کو تروتازہ غنچے اور پھول مسلے  
 کا شوق ہے۔ اس بری لت نے اسی بہت بدنام کیا۔ شہنشاہ کو بھی خبر ہو گئی اور معاملہ بڑی  
 مشکل سے رفع دفع ہوا مگر چور چوری سے جاتا ہے ہیرا بھیری سے باز نہیں رہتا پچھلے مہینے  
 اس نے ایک لڑکی کو کہیں سے اٹھوایا تھا اور اسے محل کی بارہ دری میں قید کر دیا تھا“  
 یوسف کا جسم کانپ اٹھا۔ اسد الدین نے بھی کان کھڑے کیے۔ شوخ چشم کا اشارہ  
 برہمن کی طرف تھا۔ یوسف نے اپنے حواس درست کیے اور آہستہ سے پوچھا ”کیا وہ لڑکی  
 اب تک قید ہے؟“

شوخ چشم ہنس کر بولی ”بڑے بھولے ہیں آپ۔ ایسی لڑکیاں زیادہ دن قید نہیں رکھی  
 جاتیں۔ جان قوش نے اسے ٹھکانے لگا دیا۔“  
 ”یعنی وہ قتل کر دی گئی؟“ یوسف نے تھوک نگلتے ہوئے کہا ”مگر کہاں۔ کیسے۔ کس  
 نے اسے قتل کیا؟“

”ان باتوں میں ہم لوگ نہیں پڑا کرتے۔ یہ جان قوش کا ذاتی فعل ہے“ شوخ چشم  
 نے بے پروائی سے بولی ”میں تو اسے دیکھ بھی نہیں سکی۔ جن لوگوں نے اس کبھی جھلک  
 دیکھی ہے وہ کہتے ہیں کہ وہ پری معلوم ہوتی تھی۔ دنیا میں اس قدر خوبصورت لڑکیاں پیدا  
 نہیں ہوا کرتیں“

کے لئے بے چین تھا۔ اس نے اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے شوخ چشم کی طرف  
 کر لی مگر اس جگہ بیٹھ گیا جہاں سے وہ اس کی گفتگو آسانی سے سن سکتا تھا۔

یوسف نے شوخ کو خوش دیکھ کر یہ تو سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی  
 بھی اس نے سوال کیا ”کو شوخ چشم کچھ پتہ لگا؟“

شوخ چشم نے ادھر ادھر دیکھا اور اطمینان کر کے کہ اسد الدین کی اس کی طرف  
 آواز دبا کے بولی۔ ”خبرو یوسف حکم دیں اور میں پتہ نہ لگاؤں یہ کیسے ہو سکتا ہے“  
 ہوئے شوخ چشم کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

”ذرا آہستہ بولو۔ آقا نے سن لیا تو غضب ہو جائے گا“ یوسف نے تاکید کی۔  
 شوخ چشم نے اس کی طرف جھک کر اور زیادہ دلی آواز میں کہا ”آپ کے آگے  
 میں جوان ہیں پھر انہیں میری باتوں سے کیوں الجھن ہوتی ہے؟“

”انہیں چھوڑو۔ تم اپنی بات کرو“ یوسف نے بے چینی سے پوچھا۔  
 ”سنئے میرے سرکار“ شوخ چشم نے بھاری پلکیں جھکائیں۔

”جان قوش محل سے واپس آگیا ہے اور وہ بہت خوش ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ  
 نے اسے ڈانٹنے پھنکارنے کے بجائے کوئی انعام دیا ہے“

”مگر شوخ چشم“ یوسف نے سوچتے ہوئے کہا ”رات کے وقت اس کے کمرے  
 پاس سے کوئی گزر بھی نہیں سکتا پھر تمہیں اس کی خوشی کا اندازہ کیسے ہوا؟“

”ہونہ۔ تو آپ بھی یہاں کے قاعدہ قانون سے واقف ہو گئے“ شوخ چشم اٹھالی  
 ”جان قوش جب پریشان ہوتا ہے تو کمرہ اندر سے خود بند کر کے پڑ جاتا ہے۔“

دنوں میں اس کے پاس دو ساتی کنیزی موجود رہتی ہیں لیکن اس وقت اس کا یہ عالم ہے  
 اس کا کمرہ کھلا ہوا ہے۔ تمام شمعیں روشن ہیں اور دو کنیزوں کی بجائے ایک درجن

زیادہ کنیزیں ہاتی گری کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ ایسی صورت صرف اس وقت  
 ہوتی ہے جب وہ بہت خوش ہو اس نے کوئی خاص کارنامہ انجام دیا ہو“

یوسف کو ادھر سے اطمینان ہوا تو ہنس کر بولا ”وزیر کی ساتی گری کا تمہیں کتنی  
 موقع ملا ہے؟“

لعنت ہو اس بوڑھے پر ”شوخ چشم نے تنک کے اپنی صفائی پیش کی ”بغیر  
 ضرورت کے میں اس رہداری کے قریب سے بھی نہیں گزرتی۔ ہاں اگر کبھی تمہاری

کی ساتی گری کا موقع ملے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی“  
 ”خاموش“ یوسف نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ”تمہیں خیال رکھنا پڑا“

”میرے آقا“ یوسف رات بھر کی فحشی توڑتے ہوئے بولا۔ ”ایک دل میں صرف ایک ہی تصویر آویزاں ہو سکتی ہے اور وہ پہلے ہی موجود ہے۔ پتہ نہیں ابھی ہمیں جان قوش کے ساتھ کتنے دن گزارنا ہیں اگر شوخ چشم جیسی چالاک کنیز کا تعاون مجھے محض ہنس بول کے حاصل ہو جائے تو یہ سودا بہت سستا ہے“ یہ کہتے ہوئے یوسف نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

”مجھے یہی امید ہے“ اسد الدین جواب دے کر پھر خیالوں میں کھو گیا۔

”آقا کھانا نازل فرمائیے۔ پیٹ خالی ہو تو خیالات بھٹکنے لگتے ہیں“

اسد کو یوسف کی بات پر ہنسی آگئی اور وہ کھانا کھانے پر آمادہ ہو گیا۔

ابھی انہوں نے پہلا نوالہ توڑا تھا کہ شوخ چشم پڑی تیزی سے اندر آئی اور ادب سے بولی ”میں معذرت خواہ ہوں کہ مجھے پھر آنا پڑا۔ وزیر سلطنت نے آپ دونوں کو فوراً طلب کیا ہے“

اسد الدین کے چہرے پر ابھرتی ہوئی شکستیں برابر ہو گئیں۔ اس نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے اور یوسف کو ساتھ لے کر وزیر سلطنت کی طرف روانہ ہوا۔ دونوں کو خیالات نے گھیر رکھا تھا۔ تمام راستے وہ کوئی گفتگو نہ کر سکے۔ وزیر سلطنت کے کمرے کے دروازے پر ایک مسلح محافظ نے ان کا استقبال کیا۔

”اندر تشریف لے جائیے۔ حضور بہت بے چینی سے آپ کا انتظار فرما رہے ہیں“ محافظ نے ادب سے کہا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

دوپہر کا وقت تھا اور باہر دھوپ پھیلی ہوئی تھی لیکن جان قوش کے کمرے میں صدمہ شمعیں اپنی روشنیاں بکھیر رہی تھی اور پورا کمرہ بقیعہ نور ہوا تھا۔ اسد اور یوسف نے اندر پہنچ کر سامنے نظر ڈالی تو جھج کر کھڑے ہو گئے اور ان کی نظریں شرم سے جھک گئیں۔ درجنوں کنیزیں جان قوش کے گرد پروانوں کی طرح منڈلا رہی تھیں مگر ان کے لباس صرف نام کے تھے۔ عریانی اور نیم عریانی لباس کے اس بے محابہ جلوے نے اسد اور یوسف کو خجالت اور شرم کے پینے میں منلا دیا۔ ان کی نظریں فرش پر گڑ کے رہ گئیں اور جسم ساکت ہو گئے۔

اسی وقت جان قوش کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی ”ارے آؤ۔ آگے آؤ۔ دروازے میں رک کیوں گئے تمہیں معلوم ہے کہ کل شہنشاہ نے مجھے کیوں بلایا تھا۔ یہ میرے دشمن“ جان قوش کہتے کہتے ایک دم رک گیا۔ دونوں شرم کے مارے زمین میں دھسے جا رہے تھے۔ جان قوش چپ ہوا تو وہ سمجھے کہ

”اسد الدین نے جو منہ گھمائے بیٹھا تھا، محسوس کیا کہ مطلب کی تمام باتیں معلوم، چکی ہیں اور شوخ چشم بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اس نے زور سے چھینک ماری اور کمر ہو گیا اور اس کے ساتھ یوسف اور شوخ چشم کی باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ شوخ چشم کو پہلا بار یوسف سے اس قدر کھل کے باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ تمام رات باتیں ہوتی رہیں مگر وہ اسد الدین سے ڈرتی تھی۔ اس نے نازک انگلیوں سے یوسف کو سلاہ کیا اور باہر چلی گئی شوخ چشم کی باتوں سے اسد الدین کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا لیکن وہ تمام رات بے چین رہا۔ رات کا کھانا نہ کھانے کی وجہ سے اس کی طبیعت ست ہو گئی تھی۔ یوسف نے کئی بار اپنے آقا کو اطمینان دلانے کا ارادہ کیا لیکن اس کی بے چینی بکمر اس درجہ بڑھی ہوئی تھی کہ یوسف کو ہمت نہ پڑی اور چپ چاپ اپنے بستر پر پڑا آقا کو کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ صبح کو اسد الدین کی طبیعت میں تساہل کے ساتھ چڑچڑاہٹ پیدا ہو گیا۔ یوسف پھر بھی خاموش رہا یہاں تک کے دوپہر ہو گئی اور شوخ چشم بغیر طلب کے ان کا کھانا لے آئی۔

”کھانا کس نے منگایا ہے؟“ اسد الدین پر غصہ سوار تھا اس نے شوخ چشم پر غصہ اتارنا شروع کر دیا۔

شوخ چشم گھبرا گئی۔ اسد الدین کی بھاری آواز نے اسے سہا دیا اس نے بڑے ادب سے سر جھکا کر کہا ”مہمان محترم کنیز نے حکم کی تعمیل کی ہے“

”کس نے حکم دیا تھا؟“ اسد الدین بھر دھاڑا اور یوسف کو گھور کے دیکھا۔

”میرے فرض نے۔ معزز مہمان“ شوخ چشم نے فوراً جواب دیا۔ اسد الدین اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یوسف نے کھانا منگایا ہے لیکن شوخ چشم نے یہ الزام اپنے اوپر لے لیا

شوخ چشم نے اسد الدین کو بولنے کا موقع منہ دیا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”کنیز مہمانوں کی میزبانی پر مامور ہے اس لئے کنیز کا فرض ہے کہ اگر مہمان کھانے کے وقت پر کسی کام یا فکر میں گرفتار ہوں تو ان کے کام میں حارج ہوئے بغیر ان کی ضرورت کا خیال رکھا جائے۔ مہمان نوازی کا یہی تکاضا ہے معزز مہمان“

شوخ چشم کی مہذب حاضر جوابی نے اسد الدین کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ اس نے کہا ”اچھا تم باہر جاؤ“

اس کے جانے کے بعد اس نے یوسف سے کہا ”یوسف یہ کنیز بلا کی ذہین ہے۔ اس کی باتوں میں عجب طرح کا سحر ہے۔ میں تمہیں اس سے ہشیار کرنا چاہتا ہوں“



درمیان نامہ و پیام جاری ہے۔ شہنشاہ کی طبیعت اس اطلاع سے مکدر ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انہیں اصل حالات معلوم ہوں تاکہ وہ اس کے مطابق کوئی قدم اٹھائیں۔  
دوسرے ہر اس بارے میں کیا کر سکتے ہیں۔ یہ تو حکومتوں کے معاملات ہیں۔ یوسف نے بظاہر اپنی بے دلی کا اظہار کیا حالانکہ یہی مسئلہ ان کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔

”خیر یہ تو میں بعد میں بتاؤں پہلے یہ سنو کہ شہنشاہ نے مجھے کیوں بلایا تھا“ جان قوش نے کہا ”تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں شہنشاہ کا بڑا بھائی ہوں مگر میں نے خود ہی شہنشاہیت پسند نہیں کی اور اپنا حق جان کامنی نس کو دے دیا۔ شہنشاہ اسی وجہ سے ہر دم مجھ سے خائف رہتا ہے۔ کسی نے شہنشاہ کو اطلاع دی کے میں نے دو مسلمان جاسوسوں کو اپنے محل میں پناہ دے رکھی ہے۔ اس خبر سے وہ اس قدر بدحواس ہوا کہ مجھے فوراً بلا بھیجا۔ مجھ سے تمہارے بارے میں پوچھا تو میں نے اسے بتایا کہ موصل کے دو جوان میرے محل میں زیر حراست ہیں لیکن وہ جاسوس نہیں ہیں پھر میں نے تم دونوں کی اتنی تعریفیں کیں کہ شہنشاہ تمہیں دیکھنے کا مشتاق ہو گیا اسے دوران مصری سفارت خانے کا ذکر آگیا۔ شہنشاہ نے مجھ سے کہا کہ اگر تمہیں ان آدمیوں پر اعتماد ہے تو پھر ان میں سے ایک کو مصری سفیر کے پاس بھیجو اور اس سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ اگر سلطنت روما اور موصل کے حکمران کے درمیان جنگ چھڑ جائے تو مصر کس کا ساتھ دے گا“

مصری سفارت خانے کا نام سن کے یوسف کے دل میں گدگدی ہو چکی تھی مگر اسد الدین نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود بولا ”وزیر عالی مقام اگر ہمیں اس آناٹس میں ڈالنا چاہتے ہیں تو وہ ہمیں ثابت قدم پائیں گے۔ ہم مصری سفیر کے دل میں جگہ پیدا کریں گے اور اس سے وہ سب کچھ اگوا لیں گے جو اس کے دل میں ہے“

”شاباش اسد الدین۔ تم ہماری بات پوری طرح سمجھ گئے“ پھر وزیر نے یوسف کی طرف گھوم کر کہا ”کیوں یوسف اگر یہ کام تمہارے سپرد کیا جائے تو کیا تم کر سکو گے؟“

یوسف نے ایک لمحے کے لئے اسد الدین کی طرف دیکھا پھر سنبھل کے کہا ”آقا نے محترم میں بالکل تیار ہوں اور اس دفعہ بھی آپ کا کام پورا کر کے سرخرو ہوں گا“

”تمہیں بھی شاباش ہے یوسف“ جان قوش نے تعریف کی اور کچھ سوچنے لگا۔ ذرا دیر بعد بولا ”اسد الدین تمہارے چہرے پر دہشت اور سختی ہے یوسف تمہارے مقابلے میں خوش

رو اور بھولا معلوم ہوتا ہے۔ میں یہ کام بھی اسی کے سپرد کر رہا ہوں۔ اس دوران تم اپنی قیام گاہ پر رہو گے اگر یوسف نے کوئی گڑبڑ کی تو تم اس کے ذمہ دار ہو گے“

”میں حکم کی تعمیل کروں گا اور گھر سے باہر نہیں جاؤں گا“ اسد نے وزیر کو یقین

شاید اسے ان کی حالت کا اندازہ ہو گیا ہے مگر ان کا یہ خیال غلط تھا جان قوش کی آواز پھر بلند ہوئی اب وہ ان کے بجائے کینروں اور ساقی لڑکیوں سے مخاطب تھا۔

”کم بختو۔ تم اب تک یہاں کھڑی ہو۔ جاتی کیوں نہیں۔ دیکھتی نہیں کہ میں شہنشاہ عالم کا ذکر کر رہا ہوں۔ جاؤ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔“

اسد اور یوسف کو کپڑوں کی سرسراہٹ اور ساغر وینا اٹھانے کی آوازیں سنائی دیں۔ لمحہ بھر میں تمام گندگی قہقہے لگاتے ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اسد اور یوسف نے آنکھیں کھولیں اور سر اٹھا کر جان قوش کو دیکھا۔

جان قوش معصومیت سے بولا ”یہ شراب خانہ خراب انسان کی عقل پر پروے ڈال دیتی ہے۔ میں بھول گیا کہ کنزس یہاں موجود ہیں اور ان کے سامنے ہی وہ راز کی باتیں بتانے لگا جو صرف تمہیں سنانا تھیں“

”وزیر محترم“ یوسف نے شرارت سے کہا ”شراب کے ساتھ اگر شباب شامل ہو جائے تو اسے دو آتشہ کہتے ہیں۔ اس عالم میں تو عقل سلام کر کے رخصت ہو جاتی ہے“

”ٹھیک۔ ٹھیک کہہ رہے ہو تم“ جان قوش نے سر کو کئی بار جھٹکے دیے جیسے نشہ اتار رہا ہو

”آپ نے ہمیں طلب فرمایا ہے؟“ اسد نے کوشش کی کہ جان قوش جلد سے جلد اصل بات پر آجائے۔

”ہاں بات تو تم سے رات ہی میں کرنی تھی۔“ جان قوش بے شکے پن سے ہنسا۔  
”لیکن رات یہاں اس قدر ہنگامہ تھا کہ تم لوگ یاد ہی نہیں آئے“

”یہ ہماری بد نصیبی ہے وزیر محترم“ اسد الدین نے جل کر کہا۔  
”گھبرائو نہیں۔ یہ بد نصیبی اب خوش نصیبی میں بدل جائے گی“ وزیر نے پر سکون

ہوتے ہوئے کہا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ مصری سفارت خانے کون جائے گا؟“

اسد اور یوسف کے پیروں سے زمین نکل گئی۔ وہ یہ سمجھے کہ بھانڈا پھوٹ گیا ہے اور ان کے قتل کا حکم ہونے والا ہے۔ یوسف نے ہمت کر کے کہا ”مصری سفارت خانے سے

ہمارا کیا تعلق ہے ہم نے تو آپ کے قدموں میں پناہ حاصل کی ہے کیا آپ ہمیں اپنے سے جدا کر رہے ہیں؟“

یہ بات نہیں ہے یوسف“ جان قوش نے سنجیدگی سے کہا ”تمہیں شاید علم نہیں کہ مصر اور سلطنت روما ایک معاہدہ کے تحت آپس میں دوست ہیں لیکن شہنشاہ کو قاہرہ کے

ایک جاسوس نے اطلاع دی ہے کہ مصر کے فاطمی خلیفہ اور تمہارے امیر موصل زندگی کے

جذبات سے پر تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اسے برجیس سے اس قدر جلد اور اتنے اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع میسر آ جائے گا۔

رومی راہنما سوار یوسف کو سفارت خانے کی عمارت کے سامنے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ یوسف نے گھوڑا بدھایا۔ اس کے دل میں مدبا ارمان گردشیں لے رہے تھے اسے وہ تاریک شب یاد آئی جب وہ برجیس کو لے کر یہاں آیا تھا امید اور بیم میں ڈوبا ہوا اس کے برعکس آج وہ بڑے فاتحانہ انداز سے سفارت خانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ گیٹ کے چوکیدار نے ایک سوار کو آتے دیکھا تو حیران ہو کر کھڑا ہو گیا۔ یہ وہی چوکیدار تھا جس سے یوسف کی ملاقات اس خطرناک رات ہوئی تھی۔

یوسف نے گھوڑے سے اتر کر چوکیدار کو ”السلام علیکم“ کہا۔

چوکیدار نے آنکھیں جھپکائیں۔ دو ایک بار سر کو جھٹکا دیا پھر بڑی حیرت سے بولا۔ ”وعلیک السلام کیا آپ۔ آپ وہی ہیں؟“

یوسف مسکرایا۔ بولا ”بالکل وہی ہوں لیکن کیا تم رات دن یہاں پر اسیٹے ہو؟“ ”نہیں جناب“ چوکیدار نے سنبھلتے ہوئے کہا ”جب آپ پہلے آئے تھے تو میری رات کی ڈیوٹی تھی اور آج کل میں دن میں پر ا رہتا ہوں“ پھر ذرا رک کے کہا ”آپ بہت دن بعد آئے۔ میرے لئے کیا حکم ہے؟“

”حکم کوئی نہیں“ یوسف نے ہنستے ہوئے کہا ”سفیر کو میرا سلام کو میں ملاقات کے لئے آیا ہوں“

چوکیدار نے فوراً ”گیٹ کھول دیا“ اندر آجائیے۔ میں ابھی اطلاع کرتا ہوں جب تک آپ مہمان خانے میں تشریف رکھتے

چوکیدار نے یوسف کو گھوڑا ایک طرف باندھ دیا اور اسے مہمان خانے میں پہنچا کر اندر چلا گیا۔ یوسف کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ برجیس اسے اچانک یہاں دیکھے گی تو پتہ نہیں اس کا خوشی سے کیا حال ہو گا۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھا کہ مالک بن حضرت حیرت سے منہ کھولے مہمان خانے میں داخل ہوا۔ یوسف نے اسے بھی سلام کیا۔

سفیر اس قدر حیران اور پریشان تھا کہ سلام کا جواب دینے کے بجائے اس نے کہا۔ ”جناب آپ۔ اس وقت دن کی روشنی میں خیریت تو ہے؟“

”بالکل خیریت ہے وزیر محترم“ یوسف مسکرایا ”خدا کا شکر ہے کہ میں جان قوش کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور اب اس قابل ہوں کہ آپ سے دن رات کسی بھی وقت بھی مل سکتا ہوں“

دلایا۔

”میں مصری سفارت خانے جاؤں گا اور وزیر سلطنت نے جو باتیں کہی ہیں ان پر زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا“ یوسف کے الفاظ سے خوش ہوئی تھی۔ اس کی مراد بر آئی تھی اور برجیس کا نقشہ اس کے تصور میں گھومنے لگا تھا۔ وزیر جان قوش بھی بہت پر امید تھا اس نے سوچا اگر یوسف یہ کام بھی حساب کر گیا تو اس کی وقعت شنشہ کی نظروں میں بڑھ جائے گی۔ اس کے دشمن ذلیل ہو اور اسے اپنی من مانی کرنے کا موقع مل جائے گا۔

”تم کل کسی وقت مصری سفارت خانے چلے جانا۔“ جان قوش نے یوسف کو کیا۔

”جی ہرگز۔“ یوسف یہ کہنا چاہتا تھا کہ مصری سفارت خانے کی طرف ہر ممانعت ہے۔ اس نے فوراً اپنی زبان بند کر لی۔

”کو یوسف۔ کیا تمہیں سفارت خانے کا راستہ نہیں معلوم؟“ وزیر نے اسے دیکھ کے پوچھا۔

وزیر نے یوسف کی مشکل خود ہی آسان کر دی۔ یوسف نے کہا ”جی وزیر محترم قسطنطنیہ کے راستوں کا کوئی علم نہیں۔ میں نے تو ابھی شہر کا ایک کونا بھی نہیں دیکھا“ اس کا انتظام کر دیا جائے گا“ جان قوش بولا ”تمہیں ایک حکم نامہ بھی جا جائے گا جسے دکھا کر تم قصر شاہی کے علاوہ کسی مقام پر بھی جا سکتے ہو۔ تمہیں کوئی روکے گا“

وزیر نے کچھ اور بھی ہدایات دیں جنہیں یوسف غور سے سنتا رہا۔ اسد الدین باتیں سن رہا تھا اور دل میں مسکرا رہا تھا کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ یوسف کو خانے جانے کا کیا اچھا موقع ہاتھ لگا ہے۔



یوسف جب مصری سفارت خانے جا رہا تھا تو اس کے پیروں میں جیسے پر لگے وہ بار بار گھوڑے کو ایڑ لگا دیتا اور اس کا رہنما اس سے آہستہ چلنے کی درخواست یوسف کو سفارت خانے کا راستہ بتانے کے لئے ایک سوار مقرر کیا گیا تھا جسے حکم نامہ یوسف کو سفارت خانے کی عمارت کے قریب تک پہنچا آئے۔ یوسف کا دل

”بڑی حیرت کی بات ہے یوسف صاحب“ مالک نے حیرت کا تاثر ختم کرتے ہوئے  
 ”برجیس کے متعلق کیا جان قوش کو اطمینان ہو گیا؟“

یوسف خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا ”برجیس بے چاری تو اس میں جناب میں کباب میں بڑی نہیں بننا چاہتا“ یہ کہ کے مالک گھوم کر دوسری طرف  
 خیال میں کب کی ملک عدم سدھار چکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر اور بھی تعجب ہو گا کہ  
 آپ کے سفارت خانے کی جاسوسی پر مقرر کیا گیا ہے۔“

”سفارت خانے کی جاسوسی“ مالک کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”آپ میری جاسوسی کرتے ہاتھ سے دستک دی۔“  
 ”آئیے ہیں؟“

”جی ہاں“ یوسف خوش دلی سے بولا ”مجھے یہ معلوم کرنے پر مامور کیا گیا ہے کہ  
 اور موصل کی جنگ کی صورت میں فاطمی خلیفہ کیا رخ اختیار کریں گے“ پھر وہ فوراً  
 موضوع بدلتے ہوئے بولا ”خیر یہ تو باتیں ہوتی رہیں گی۔ برجیس کے بارے میں بتاؤ  
 خیرت سے تو ہے؟“

”یوں تو برجیس بالکل خیریت سے ہے“ مالک نے کہنا شروع کیا ”میں نے اس  
 رہائش کے لئے باغ کی طرف کا کمرہ دیا ہے۔ اس کی دیواریں اونچی ہیں۔ میں نے کہا کہ  
 وہ جب چاہے باغ میں جاسکتی ہے لیکن وہ تو کمرے سے باہر ہی نہیں نکلتی ہر وقت  
 سہمی سے رہتی ہے۔ میری بیگم گھڑی دو گھڑی کو اس کے پاس جا بیٹھی ہیں۔ ان سے  
 بہت کم گفتگو کرتی ہے۔ ہر وقت اس پر خوف سا طاری رہتا ہے۔ اس سے اس کی  
 کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہے۔“

”آپ فکر نہ کیجئے“ یوسف مسکریا ”میں آگیا ہوں سب کچھ ٹھیک کر لوں گا“  
 ”مگر وہ بے چاری کب تک یہاں قیدیوں کی سی زندگی بسر کرتی رہے گی؟“ مالک  
 بڑی ہمدردی سے پوچھا۔

”یہ تو میں خود بھی نہیں جانتا“ یوسف نے لمبی سانس لی ”اللہ نے اس کی جان  
 ہے۔ وہی یہاں سے نکلنے کی کوئی صورت پیدا کرے گا“

”برجیس سے ملنے کا نہیں؟“ مالک نے ہنستے ہوئے کہا  
 ”کیوں نہیں“ یوسف بھی مسکرایا ”پہلے وہ کس کمرے میں ہے؟“

مالک بن خضر اسے ساتھ لے کر چلے گا۔ ایک راہداری سے گزر کر وہ دروازے کے  
 راہداری میں داخل ہوا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”دروازے پر دستک دیجئے۔ برجیس اسی کمرے میں ہے“ مالک نے یوسف کو اشارہ دیا  
 بھری آنکھوں سے دیکھا۔

”ہاں۔ اب اطمینان ہو گیا۔“ برجیس دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی ”تم چلے تو نہیں جاؤ گے؟“  
 چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے۔ تمہائی مجھے کھائے جارہی ہے یوسف“  
 ”نہیں بھئی نہیں جاؤں گا۔ میری بات تو سنو تم“ یوسف نے اسے پرکھ رہا کروں یوسف“ برجیس جذبات سے مغلوب آواز بولی۔ ”میرے دل کو یقین نہیں لے لے۔

برجیس نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ اپنی رو میں بولی ”میں نے فراموش نہیں کیا سوچھی اسے کہ ایک نیا بھڑکیلا جوڑا پہن لیا۔ مالک صبح سے تمہاری سلامتی کے لئے کتنی دعائیں مانگی ہیں۔ رات دن دعائیں مانگی ہیں۔ اسے درجنوں کپڑے بھجوائے تھے مگر وہ کپڑے نہ بدلتے۔ آج کچھ ایسا دل خوش ”تم نے خدا سے دعا مانگی تھی نا؟“ یوسف نے اسے محبت سے دیکھا۔ اس نے نیا جوڑا پہن لیا۔ بال بنائے اور چہرے پر غاڑہ لگایا۔ جب نئے لباس اور سج و ”اور کیا تمہیں یقین نہیں آتا میرا؟“  
 ”تو پھر یہ سمجھو خدا نے تمہاری دعا قبول کر لی اور میں تمہارے پاس آیا، انشاء اللہ۔ سبحان اللہ۔ اس وقت تم واقعی دلن لگ رہی ہو“ یوسف پیار سے بولا۔  
 برجیس کو فوراً ایک خیال آگیا۔ اس نے یوسف کو خیران نظروں سے دیکھا۔ ”میں ہفتوں کپڑے تبدیل کرتی تھی مگر آج پتہ نہیں چلے کپڑے پہننے کو کیوں دل چاہا“

”مگر تم آئیے گئے۔ دن کے وقت کسی نے دیکھا نہیں تمہیں؟“  
 ”سب نے دیکھا ہے“ یوسف ہنسا ”مجھے جان قوش نے بھیجا ہے تمہارے ایک ٹھنڈی سانس لے کر افسردہ ہو گیا وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی وہ وقت آئے گا برجیس نے حیرت اور شک کی نظروں سے اسے دیکھا۔ ”یوسف! کیا تم نے برجیس کو دلن بنا کر رخصت کرائے گا وہ سلطنت روا میں تھا۔ خود تو شاید اپنی جان کہ میں یہاں ہوں۔ یہ کیا کیا تم نے۔ وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میری اہل سکتا لیکن برجیس کو یہاں سے نکال کے لے جانا شیر کے منہ میں ہاتھ ڈالنے سے دے گا یہ بہت برا ہوا یوسف بہت برا“  
 یوسف گھبرا گیا اس نے دیکھا کہ برجیس نے مضطرب ہو کر کرسی سے سر اٹھا دیا دیکھ کر برجیس کے چہرے پر بھی غمگین پر چھائیاں دوڑنے لگیں اور چند آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے ہیں۔

”برجیس۔ برجیس“ یوسف نے اس کا سر سیدھا کرتے ہوئے کہا ”تم غلط نہیں کا دل کچھ ہلکا ہو گیا۔“  
 میں اگر جان قوش کو بتاتا کہ برجیس اب تک زندہ ہے تو وہ مجھے کب چھوڑا یوسف نے کہا ”برجیس دل مضبوط رکھو۔ سختیوں کا زمانہ ابھی ختم نہیں ہوا لیکن ہر یقین ہو گیا ہے کہ تم اس دنیا میں موجود نہیں ہو“

برجیس نے بھاری پلکیں جھپکائیں تو موتیوں نے ٹپکنا شروع کر دیا ”کاشی ہے۔“  
 ”تم؟“ برجیس نے بے یقینی کے انداز میں کہا۔  
 بالکل سچ برجیس ”یوسف نے اپنے کرتے کے دامن سے اس کے آئینہ یوسف کی باتوں کا اس کی طبیعت پر اچھا اثر ہوا اسے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ اس سے اب برابر ملتا رہے گا۔ برجیس سے تفصیلی گفتگو کرنے اور اسے تسلیاں دینے کے بعد یوسف وہاں سے اٹھ کے مالک بن خضر کے پاس گیا۔  
 ”ایسا پھر نہ کہنا یوسف“ برجیس نے منت کے لئے ہاتھ جوڑے ”میرا ایک بڑی بے چینی سے یوسف کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے خوش خوش دیکھ کر مالک نے

”مجھے معلوم ہے“ یوسف نے اس کے جڑے ہوئے ہاتھ کھول دیے

کما ”برجیس سے یہ اچانک ملاقات مبارک ہو“

یوسف کچھ جھینپ گیا۔ سر جھکائے بولا ”یہ سب آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے۔“  
 وزیر سلطنت کو یہ خادم کورنش پیش کرتا ہے۔ ”یوسف نے دروازے کے پاس کھڑے  
 برجیس کو پناہ نہ دیتے تو یہ وقت کیسے آسکتا تھا“  
 ہوئے اسے کورنش پیش کیا۔

”خیر چھوٹی اس قصے کو“ موضوع بدل دیا۔ اب یہ فرمائیے کہ آپ وزیر  
 اپنی کیا کارکردگی دکھائیں گے۔ مصر کی پالیسی کے بارے میں اس رات بھی میں  
 تھا۔ میں جانتا ہوں کہ سلطنت روما اور پورے یورپ میں صلیبی جنگ کی تیاریاں  
 سے جاری ہیں۔ اس کی خبر ہماری فاطمی خلافت کو بھی ہوگی۔ یہ تو میں نہیں کہ  
 اپنی غیر جانب دارانہ پالیسی چھوڑ دے گا لیکن موجودہ حالات میں اس میں  
 کی امید کی جاسکتی ہے۔“

”آپ کا اندازہ بالکل درست ہے“ یوسف نے کہا ”امیر موصل عماد الدین  
 خواہش ہرگز نہیں کہ مصران کے حلیف کی حیثیت سے شہنشاہ قسطنطنیہ کے  
 آئے۔ وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ مصر بدستور اپنی غیر جانبداری قائم رکھے  
 معلوم ہے مصر نے اس طرف واضح اشارے کیے ہیں اور درپردہ ہماری مدد  
 ہے“

”ٹھیک ہے یوسف صاحب“ مالک نے کہا ”یہ وہ باتیں ہیں جن سے ہم لیکن  
 ہیں لیکن اس وقت تو یہ سوال سامنے ہے کہ آپ یہاں سے واپس جا کر وزیر محترم نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا ہے میں نے کہا کہ قسطنطنیہ میں سوائے مصری  
 قوش کو کیا جواب دیں گے؟“  
 ”جی ہاں۔ بالکل یہی سوال میرے ذہن میں گھوم رہا ہے“ یوسف نے جواب دیا اس سے درخواست کی کہ وہ مجھے گاہے گاہے ملاقات کی اجازت دے تاکہ میں تنہائی کا  
 یوسف اور مالک اس مسئلے پر دیر تک گفتگو کرتے رہے اور جب وہ اٹھ کر نہ ہو جاؤں۔“  
 ”پھر اس نے کیا جواب دیا؟“ وزیر نے بے چینی سے پوچھا۔

”وزیر سلطنت میری خوش قسمتی دیکھیے کہ سفیر مصر بھی اپنی تنہائی سے پریشان ہے“  
 چار گھنٹے کی طویل ملاقات کے بعد وہ وزیر سلطنت کے محل میں پہنچا اس نے خود اس کی خواہش ہے۔ وہ سفارت خانے کی تنہائی سے تنگ آگیا ہے اس نے بتایا کہ  
 روشن کی جا رہی تھی۔ یہ وقت جان قوش کی بے نوشی کا تھا۔ ساقی لڑکیاں الہامیے والے آئے جانے پر اسے اس لیے اور بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ سلطنت مصر خود  
 اٹھلا کر جام پیش کر رہی تھیں لیکن یوسف یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وزیر کے بھی موصل کے امیر اور سلطنتی سلطان کو پسند نہیں کرتی۔ سلجوقی علاقے بغداد کے عباسی  
 میں ساٹا پڑا ہے۔ شمعیں روشن ہیں اور جان قوش ایک آرام دہ کرسی پر سرخیزہ کو تسلیم کرتے ہیں جب کہ مصر میں فاطمی خلافت ہے۔ یہ دونوں خلافتیں مسلمانوں کے  
 بند کئے نیم دراز ہے۔

یوسف کو دیکھ کر نیزہ بردار محافظ ایک طرف ہو گیا تھا۔ جان قوش کو اس  
 کر یوسف کو اندازہ ہوا کہ وہ اس کی واپسی کے لئے پریشان ہو گا ورنہ شراب

”یوسف۔ تمہاری باتوں سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ مصر اور امیر موصل کبھی ایک نہیں  
 کئے“ وزیر نے اندازہ لگایا۔



اسی وقت شوخ چشم نے دروازہ کے قریب آکر اندر آنے کی اجازت مانگی۔ شوخ چشم مایوس ہو کے جانے لگی۔ ابھی وہ کمرے کے اندر ہی تھی کہ یوسف نے وقت اتنا خوش تھا کہ یوسف کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بول پڑا "آجاؤ شوخ چشم۔" اسے پکارا "سنو" شوخ چشم خوش ہو کے واپس آگئی اور یوسف کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

یوسف اور اسد پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ باہر نکلے اور وزیر سلطنت کے غلام کے ساتھ  
 وزیر سلطنت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا ان کی تعظیم پر وہ مسکرایا اور بولا ”تم  
 اس کے غضب آنے سے فوری حکمت عملی کا دھارا بدل گیا ہے۔ نئی نئی تبدیلیاں ہو رہی  
 اور عجب عجیب باتیں سننے اور دیکھنے میں آرہی ہیں“

یوسف نے رک کر اپنے غلام کو دیکھا جو اب تک ہاتھ بندھے کھڑا تھا اور وزیر  
 سلطنت کی گفتگو بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ وزیر چپ ہوا تو اس نے گھبرا کر وزیر کی طرف  
 دیکھا اور بڑی تیزی سے باہر نکل گیا۔

وزیر نے ہنس کر کہا ”دیکھا تم نے یہ میرا خاص ملازم ہے مگر شہنشاہ کی طرف سے  
 میری جاسوسی پر مقرر ہے مجھے اتنا بھی اختیار نہیں کہ اسے تبدیل کر سکوں۔ اب تم ہی بتاؤ  
 کہ یہاں کس پر اعتبار کیا جائے۔ میں نے بھی اسے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے میں اس  
 کے سامنے صرف وہ باتیں کہتا ہوں جو مجھے شہنشاہ تک پہنچانا ہوتی ہیں ارے تم لوگ بولتے  
 ہیں نہیں کچھ کہو؟“

”آپ ہم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔ ہم آپ کے سامنے کیا کہہ سکتے ہیں“ یوسف نے  
 فرمایا ”آپ کل شہنشاہ کے پاس تشریف لے گئے تھے“ اتنا کہہ کر  
 وزیر سلطنت خاموش ہو گیا اس نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ وزیر کے آج پھر شاہی محل جانے سے  
 باز رہا۔

”ہاں۔ میں کل شہنشاہ کے پاس گیا“ وزیر بولا۔ میں اپنے ساتھ وہ مسودہ بھی لے گیا  
 تھا جو مجھے مصر کے سفیر نے دیا تھا۔ تمہارے کارنامے سن کر شہنشاہ بہت خوش ہوا۔ اس  
 نے مجھے حکم دیا کہ میں اس مسودہ کو سلطنت روم کی طرف سے منظور کر کے سفیر کو واپس  
 کر دوں اور سفیر اس منظور شدہ مسودہ کی ایک نقل قاہرہ بھیج کر فاطمی خلیفہ کے دستخط اور  
 شہنشاہ نے اس سلسلے میں آپ کی خدمات کو ضرور سراہا ہوگا“ یوسف نے وزیر سلطنت  
 کو خوش کرنے کے لئے بڑے خوشاندہ انداز میں کہا ”اس معاہدے کی تکمیل کا سرا آپ  
 ہی کے سر ہندھے گا“

وزیر کی باتیں کھل گئیں۔ بولا ”معاہدے کو اب مکمل ہی سمجھو۔ شہنشاہ نے مجھے آج  
 ہی بلایا تھا“

”آج بلایا تھا؟“ یوسف نے مصنوعی تعجب کا اظہار کیا تھا۔  
 ”ہاں۔ آج بلایا تھا اور وہاں ایک بالکل نئی بات ہوئی جس کا کوئی امکان ہی نہ تھا“

یوسف نے کہا ”شوخی چشم کیا یہ ممکن ہے کہ تم وزیر سلطنت کے محل سے  
 کرو کہ وہ اس وقت کس کام میں مصروف ہیں؟“  
 ”کیا آپ لوگ یہ معلوم کرنے کے لئے اس قدر پریشان ہیں؟“ شوخی چشم  
 سوال کر دیا۔

”یہی سمجھ لو“ یوسف نے ٹالنے کے لئے کہا ”وزیر نے اب تک طلب نہیں کیا  
 ”آپ بیکار انتظار کر رہے ہیں“ شوخی چشم نے فوراً جواب دیا۔ ”وزیر سلطنت  
 محل میں نہیں ہیں۔ آپ کو بلوائے گا کون؟“

اسد الدین نے چونک کے شوخی چشم کو دیکھا ”شوخی چشم کیا تم یقین سے کہہ  
 وزیر سلطنت محل میں نہیں ہیں؟“  
 معزز مہمان۔ مین محل کی دوسری کنزوں کی طرح جھوٹ نہیں بولتی“ شوخی  
 سے بولی۔

ابھی دو گھنٹے پہلے شاہی چوہدار انہیں بلانے آیا تھا اور اپنے ساتھ ہی شہنشاہ کے  
 میں لے گیا ہے۔ آپ کے اطمینان کے لئے میں یہ بھی بتا دوں کہ وزیر سلطنت  
 غلاموں اور کنیزوں کے درمیان یہ زبانی معاہدہ ہے کہ وہ وزیر سلطنت کی نقل و حرکت  
 فوراً ایک دوسرے کو مطلع کر دیں گے۔ آج جب میں صدر دروازے کی طرف جا رہا تھا  
 تو میں نے اپنی آنکھوں سے وزیر مملکت کو شاہی چوہدار کے ساتھ باہر جاتے دیکھا تھا  
 جس وقت بھی واپس آئیں گے محل کے فرد و شر کو ان کی واپسی کی اطلاع پہنچا دے  
 گی۔ میں نے یہ بات اسی لئے اتنے یقین سے کی ہے“

اسد الدین کو اس کی بات پر یقین کرنا پڑا اس نے شوخی چشم سے کھانا منگوایا اور  
 خاموشی سے کھانا کھانے لگے شوخی چشم چپ چاپ ہاتھ باندھے کھڑی رہی۔ کھانے  
 وہ خالی برتن اٹھا کر چل گئی لیکن چند ہی لمحوں بعد ہنسی ہوئی واپس آئی اس کی شوخی  
 کر آئی تھی۔

”مبارک ہو وزیر سلطنت واپس آگئے ہیں“  
 اسد نے اطمینان کا سانس لیا۔

”دوسری اطلاع یہ ہے“ شوخی چشم نے یوسف کو مخاطب کیا۔ ”وزیر سلطنت  
 سے واپس آتے ہیں آپ کو طلب کیا ہے“

”آپ دونوں مہمانوں کو“ شوخی چشم نے بڑی محبت سے کہا ”وزیر سلطنت  
 ملازم دروازے پر آپ کا انتظار کر رہا ہے“

وزیر سلطنت اس وقت خواہ مخواہ مسکرائے جا رہا تھا۔

اسد الدین کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے کن آنکھوں سے یوسف کو دیکھا اور اس کا فورا تدارک بھی سوچ لیا۔

رہا ہو کہ وغیرہ اس نئی بات کی تفصیل پوچھے۔ یوسف نے سنبھل کے کہا۔ ”وزیر محترم اگر مناسب سمجھیں تو اس نئی بات پر ہماری ذمہ داریاں ہیں۔ آپ نے ضرور اس کا توڑ سوچا ہوگا۔“

آگاہ کریں۔ اور جنہیں کس لئے بلایا ہے؟“ وزیر نے کہا ”صبح جب میں شاہی چوہدار کے محل میں پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں مصری سفیر بیٹھا ہے۔“

”مصری سفیر!“ یوسف کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور وہ گھبرا کر وزیر سلطنت لگا

یہی تو نئی بات تھی ”وزیر کی مسکراہٹ قائم تھی“ شہنشاہ نے میرے آنے سے پہلے کو مہمان خانے میں انتظار کرنے کا حکم دیا اور مجھے راز داری سے بتایا کہ مصری سفیر کا قاصد آیا ہے۔ مصری سفیر کو فورا قاہرہ طلب کیا گیا ہے۔“

یوسف کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی وہ سوچنے لگا کہ اگر مصری سفیر قاہرہ چلا گیا تو بڑے بڑے گا۔ وہ کہاں رہے گی اور خود وہ سفارت خانے کس بہانے سے جائے گا۔ یوسف اچھا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

وزیر سلطنت جان قوش یوسف کے جواب پر توجہ نہ دی اور کہا ”میں نے شاید خیال ظاہر کیا کہ مصری سفیر کی طلبی بڑی معنی خیز ہے۔ ممکن ہے کہ فاطمی خلیفہ موصل سے کوئی معاہدہ کر لیا ہو اس قسم کی کوئی بات ہو جس کے لیے خلیفہ نے اسے بلوایا ہو۔“

اسد الدین نے دخل دیتے ہوئے کہا ”وزیر سلطنت نے بالکل صحیح خیال ظاہر کیا۔ امیر موصل بہت چالاک آدمی ہے۔ اس نے خلیفہ کو اپنے ساتھ ملانے کی ضرورت کو ہوگی کیونکہ امیر موصل اور شہنشاہ کے درمیان اگر جنگ چھڑ گئی اور اس وقت مصر سے کوئی شرارت ہوئی تو رومی سلطنت کے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔“

عقل مند ہو اسد الدین ”جان قوش نے تعریف کی“ میرے دماغ میں یہی خیال پیدا ہوا تھا اور میں نے اس کا فورا تدارک بھی سوچ لیا۔

اسد الدین کے دل میں کھلبلی مچ گئی مگر وہ وزیر سلطنت سے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ جان قوش چند لمبے بعد بولا ”یوسف تمہیں تیسری ذمہ داری سونپی جا رہی ہے“

”مجھے؟“ یوسف نے چونک کے جان قوش کو دیکھا۔ ”ہاں۔ تم معاہدے کا مسودہ لے کر سفیر کے ساتھ قاہرہ جاؤ گے۔“

”جی۔ میں قاہرہ جاؤں گا۔ یعنی میں اور میرے آقا سفیر کے ساتھ جائیں گے؟“

”تم اور صرف تم جاؤ گے۔“

”اور میرے آقا؟“

اسد الدین میرے پاس تمہارا ضامن بن کے رہے گا۔“ جان قوش نے بھاری آواز سے کہا ”تم سلطنت روما اور شہنشاہ کے نمائندے کی حیثیت سے فاطمی خلیفہ سے ملو گے اور اس بات پر قائل کرو گے کہ مصر کا مفاد سلطنت روما کی دوستی میں ہے۔ اس سلسلے میں امیر موصل کے مزموم ارادوں کی جس طرح کٹ کر سکتے ہو اس میں دریغ نہ کرنا۔ اگر فوجی معاہدے پر فاطمی خلیفہ کے دستخط اور مہر لگوانے میں کامیاب ہو گئے تو میری اور شہنشاہ کی نظروں میں بلکہ پوری سلطنت روما میں تم سے زیادہ وفادار کوئی اور نہیں ہوگا۔“

یوسف کو اس بات کی خوشی تھی کہ قدرت نے برجیس کی رہائی کی ایک صورت پیدا کر دی تھی لیکن وہ اپنے آقا اسد الدین کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔ اس کا آقا قسطنطنیہ میں اس کا ضامن بن کے رہ گیا تھا اور اب علم نہ تھا کہ اس کے مصر جانے کے بعد کیا حالات باہوں گے اور اسد الدین پر کیا گزرے گی۔ اسد الدین بڑا حوصلہ مند انسان تھا۔ یوسف نے جب اس سے اپنی خدشات کا ذکر کیا تو وہ ذرا بھی ہراساں ہوا۔ اس نے یوسف کو تسلی دیا کہ اس کے مصر جانے سے کم از کم بے گناہ لڑکی کو آزادی مل جائے گی۔ رہا اس کا ال تو ابھی اسے قسطنطنیہ میں بہت سے کام کرنے تھے جس کے لئے وہ ہر قسم کے مصائب برداشت کرنے کے لئے تیار تھا۔

نہرے دن مصری سفیر مالک بن سحر اہل و عیال کے ساتھ ایک رومی بحری جہاز

برص سے ملنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ خواہ مخواہ کوئی شک پیدا ہو سکتا تھا۔ فاطمی خلیفہ حافظ کی خلاف کا آغاز ہی غلط طریقے سے ہوا حافظ نے مقتول الامری مالک کے گھروالوں کے ساتھ نقاب ڈالے جہاز پر سوار ہوئی تھی اور وہ سفر میں اس نصیحت کے مطابق ہزر کو قلم دان وزارت دیا لیکن فاطمی پہ سالار رضوان بن وٹش نے احتیاط کرتی رہی کہ اس پر کسی رومی ملاح کی نظر نہ پڑ سکے۔

رومی جہاز بحر متوسط (بحر روم) کا سینہ چیرتا ہوا اسکندریہ میں لنگر انداز ہوا۔ وزارت ملی۔ ابو علی نے خلیفہ کے تمام اختیارات سلب کر لئے اور شاہی خزانہ اپنے گھر اٹھا رومی جہنڈا لہرا رہا تھا اس لئے اس سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ اسکندریہ سے قاہرہ کے لئے ہجرت کر گیا پھر اس نے خلیفہ کو قید کر دیا اور اس کے قتل پر آمادہ ہوا۔ ابو علی کے ساتھی اس خشکی کے راستے طے کیا گیا اور یہ سب کے سب بخیریت قاہرہ پہنچ گئے۔ مالک کے بڑے اور چوگان کھیلنے کے دوران اسے قتل کر دیا۔ خلیفہ حافظ کو قید سے نکال کر مہمان خانے میں اتارا گیا اور یوسف کو رومی سلطنت کے نمائندے کے طور پر ایک بارہ خلافت پر متمکن کیا گیا۔ حافظ نے یانس کو وزیر مقرر کیا لیکن ایک سال بعد ہی اسے عالی شان محل میں جگہ دی گئی۔

علاقوں اور کوہستانوں سے تعلق رکھتے تھے اور فطری طور پر جنگجو اور شجاع تھے۔ مصر میں خلیفہ اور وزیر میں یہ کشمکش ہو رہی تھی کہ عیسائی حاکم راجہ ثانی بحریہ اور برقیہ ممالک زیادہ طاقت ور تھے اور انہی کے نمائندے حکومت پر چمکے۔ اسی سوجن کی کشمکشوں کے ساتھ ساحل افریقہ پر برقہ کے مقام پر ارتلا یہ علاقہ فاطمی خلافت تھے۔ ان میں سے جسے موقع ملا وہ طاقت کے زور پر مصر کا وزیر اعظم بن جانا اور میں تھا۔ راجہ ثانی نے برقہ کے بیشتر مردوں کا قتل کرا دیا اور عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر کے لے گیا۔ قاہرہ یہ خبر پہنچی تو کرام بیچ گیا۔ رعایا نے اوہم عمار دیا اور حافظ کے سپہ اعظم خلیفہ کے بجائے حکومت چلاتا تھا۔

القاسم بن خلیفہ مستنصر باللہ سرپر خلافت پر متمکن ہوا اور اپنا لقب حافظ الدین اختیار کیا۔ یہ خلیفہ بالکل ان پڑھ تھا مگر اپنی چالاکی اور غیر معمولی ذہانت کے زور سے ان دونوں کی آنکھیں کھول دیں۔ دونوں میں صلاح مشورے شروع ہوئے اور طے سال تک حکومت کرتا رہا۔ اس کے زمانے میں موصل کی حکومت عباد الدین زنگی نے لے لیا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ جان کامنی نس کا تعاون حاصل کیا جائے۔ قسطنطنیہ میں مقیم مصری سفیر آئی اور امیر نے دو صلیبی جنگوں میں عیسائیوں کو شکست دے کر ان سے بیت المقدس کو واپس لینے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس پر کوئی عمل نہ ہوا۔

تھا۔ اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ مصری سفیر کو قاہرہ بلا کر رومی سلطنت کے معلوم کئے جائیں۔ مالک بن خضریٰ قاہرہ میں آمد اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ حافظ کو جب یہ معلوم ہوا کہ سفیر کے ساتھ رومی سلطنت کا ایک نمائندہ بھی وہ بہت خوش ہوا۔ اس نے اپنے سفیر کو گفتگو کے لئے فوراً طلب کر لیا۔ گفتگو رضوان بن و غش بھی موجود تھا۔ سب کو اس بات پر بڑھتجب تھا کہ شہنشاہ روم مسلمان کو اپنا نمائندہ بنا کر کیوں بھیجا ہے۔

خلیفہ حافظ نے سفیر سے پہلا سوال اسی کے بارے میں کیا۔ اس نے پوچھا تم اس بات پر روشنی ڈال سکتے ہو کہ جان کامنی نس نے ایک مسلمان کو اپنا نمائندہ کیوں بھیجا؟

”اے امیر المومنین“ مالک نے ادب سے کہا ”میرے ساتھ آنے والے رومی کے نمائندے کا نام یوسف ہے یہ خوب نوجوان اپنے آقا اسد الدین کے ساتھ رومی قسطنطنیہ آیا اور ان دونوں نے اپنے آپ کو امیر مومصل عماد الدین زنگی کا باغی بتایا اور دونوں امیر مومصل کے خاص آدمی ہیں اور انہیں رومی سلطنت کی جاسوسی کے لئے بھیجا گیا ہے“

”مگر کیا جان کامنی نس کی عقل پر بالکل چھڑ گئے ہیں کہ وہ باغی اور جاسوس نہ کر سکا؟“ سپہ سالار رضوان و غش نے سفیر کو ٹوکا۔

”سالار محترم۔ یہ دونوں اس قدر چالاک اور شاطر ہیں کہ کوئی بھی ان سے نہ کہتا ہے“ سفیر نے جواب دیا ”روم کے وزیر سلطنت جان قوس نے بہت زور مارا کہ اس طرح ان کی اصلیت معلوم کرے مگر وہ ناکام رہا۔ دوسری طرف ان لوگوں نے شہنشاہ قسطنطنیہ کے بعض اہم کام اسی خوبی سے انجام دیے کہ وہ دونوں ان پر پورا کرنے لگے اور جب میرے ساتھ ایک نمائندے کو بھیجنے کا سوال پیدا ہوا تو اس نے انہیں یوسف سے زیادہ بہتر اور قابل اعتماد آدمی اور کوئی نظر نہیں آیا“

”خیر اس مسئلے پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے“ خلیفہ نے بات کا رخ موڑا اس مسودے کا کیا بنا جو تمہیں دیا گیا تھا ہمیں اس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ کے تعاون کی ضرورت ہے کیونکہ عقیدہ (سلسلے) کے حاکم راجر ثانی نے برقعہ پر حملہ کر کے بڑی ہے“ ”امیر المومنین کو یہ سن کے خوش ہوگی کہ رومی سلطنت نے فوجی معاہدے کی کر دی“

”کیا۔ تم سچ کہہ رہے ہو مالک؟“ خلیفہ نے کمال مسرت اور حیرت سے پوچھا۔

”میں امیر المومنین کے حضور دروغ بیانی کا جرم نہیں کر سکتا“ مالک نے بڑے فخر سے کہا ”امیر المومنین کو علم ہے کہ عراق اور شام کے نصرانیوں نے صلیبی جنگ کا آغاز کر دیا ہے اور امیر مومصل عماد الدین زنگی جنہا کا نعرہ لگا کر ان کے سامنے آگیا ہے۔ امیر مومصل نے دو جنگوں میں نصرانیوں کا زور توڑ کر رکھ دیا ہے۔ نصرانیوں کی اس شکست کی بازگشت پاپائے روم کے دربار تک پہنچی ہے اور اس نے شہنشاہ قسطنطنیہ کو امیر مومصل کے خلاف کارروائی کرنے کا حکم دیا ہے۔ شہنشاہ کو امیر مومصل کی طاقت کا صحیح اندازہ نہیں ہے کیونکہ ان دونوں جاسوسوں نے غلط اعداد و شمار پیش کر کے شہنشاہ کو خوف میں مبتلا کر دیا ہے“

خلیفہ حافظ کا چہرہ خوشی سے دکنے لگا۔ اس نے مسکرا کے کہا ”شاید یہی وجہ ہے کہ شہنشاہ نے اس معاہدے پر توجہ دی ہے۔ مسودہ کہاں ہے شہنشاہ نے اس میں کیا ترمیم کی ہے؟“

”مسودہ تو یوسف رومی نمائندہ کی حیثیت سے آپ کے حضور میں پیش کرے گا“ مالک نے بتایا۔ ”شہنشاہ نے مصر کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ہمارے معاہدے کو اور زیادہ نرم کر دیا ہے اس نے ایک نئی شق یہ شامل کی ہے کہ قسطنطنیہ اور مومصل کی جنگ میں مصر غیر جانبدار رہے گا اور اگر مصر پر کسی نصرانی سلطنت نے حملہ کیا تو شہنشاہ اپنے لشکر سے مصر کی مدد کو پہنچے گا۔“

”بہت خوب“ خلیفہ کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں ”ہم نے تمہیں اس لئے بلوایا تھا کہ تمہارے ذریعہ شہنشاہ کو اس بات پر آمادہ کیا جائے کہ قتیلہ سے حملے کی صورت میں وہ ہماری مدد کرے“

”امیر المومنین۔ قدرت نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ جو بات ہم چاہتے تھے شہنشاہ نے ہمارے لئے بغیر ہی اسے تسلیم کر لیا ہے۔ دراصل شہنشاہ پر عماد الدین زنگی کا ایسا ہوا بیٹھ گیا ہے کہ وہ ہر حال میں مصر سے فوجی معاہدے کی تکمیل چاہتا ہے تاکہ مومصل سے جنگ کی صورت میں مصری لشکر نصرانیوں پر پیچھے سے حملہ نہ کر دے“

سفیر سے گفتگو کے دوران ہی خلیفہ نے یوسف کو بھی بلوا لیا۔ یوسف نے اسلامی طریقے سے خلیفہ کو تعظیم پیش کی۔ خلیفہ نے مسکراتے ہوئے کہا ”تمہارے بارے میں مالک نے ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے۔ امیر مومصل کے ساتھ تمہاری وفاداری قابل رشک ہے۔ ہمیں امیر زنگی نے کوئی پر خاش نہیں۔ مومصل اور قسطنطنیہ کی آویزش میں ہم لوٹ نہیں ہوا چاہتے ہم شہنشاہ روم سے امن کا معاہدہ کر رہے ہیں ہمارے خیال میں تمہارے امیر کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا“



”امیر المومنین نے بجا ارشاد فرمایا“ یوسف ادب سے بولا ”امیر المومنین کی غیر داری سے امیر کو ضرور مسرت ہوگی۔ اگر امیر المومنین اس امر کی اطلاع کسی طرح ہو بھجوا سکیں تو عین نوازش ہوگی“

خلیفہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سراٹھا کر اپنے سپہ سالار سے کہا۔ ”رضوان تمہارے کوئی ایسا معقول آدمی ہے جو ہمارا پیغام جلد از جلد موصل تک پہنچا دے“  
رضوان بن وئش کے ذہن میں فوری طور پر کوئی نام نہ آسکا۔ اس نے کہا ”امیر المومنین - قاصد کا کام تو ہر کوئی کر سکتا ہے میں چند سواروں کو ابھی امیر المومنین کے خطے کے لئے بھیجتا ہوں ان میں جسے مناسب سمجھا جائے اسے موصل بھیج دیا جائے گا“  
”نہیں ابن وئش خلیفہ تند لہجے میں بولا ”یہ اتنا اہم کام ہے جسے صرف کوئی مستزاد ہی انجام دے سکتا ہے“

”امیر المومنین پھر یہ ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا پیغام لے کر خود ہی موصل چلا جاؤں ابن وئش نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ خلیفہ نے اسے گھور کے دیکھا مگر معلوم نہیں کہ ضبط سے کام لیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس وقت فاطمی خلیفہ کا اقتدار برائے رہ گیا تھا اور اصل طاقت وزیر کے ہاتھ میں آگئی تھی“

خلیفہ نے اسے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس تلخی کے بعد مجلس برخاست کر یوسف نے خلیفہ سے اجازت حاصل کر لی۔ کہ وہ سفیر کے ساتھ رہے گا کیونکہ شمالی اس کی طبیعت گھبراتی ہے۔ سفیر کو بھی اس پر کو اعتراض نہ تھا اس لئے خلیفہ نے یوسف کو اجازت دے دی۔ یوسف اور سفیر مالک ایک ساتھ ہی دربار سے اٹھے۔ یوسف کا برجیس سے ملنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا اور وہ جلد از جلد مالک کی رہائش گاہ پر چاہتا تھا لیکن مالک اسے اپنے عزیزوں سے ملانے لے گیا جو قاہرہ میں رہتے تھے مالک شاہی مہمان خانے ہی میں رکھا گیا تھا۔ اس لئے وہ اب تک اپنے عزیزوں سے بھی ملا نہ کر سکتا تھا۔

یوسف پہلی بار قاہرہ آیا تھا۔ قاہرہ قسطنطنیہ جیسا بارونق اور بڑا شہر تو نہ تھا لیکن اور شام میں سوائے بغداد کے اور کوئی شہر اس کے مقابلے کا نہ تھا۔ موصل کا شہر کے پاسنگ کا برابر بھی نہ تھا۔ شہر میں ہر طرف دلچسپیاں پھیلی تھیں لیکن یوسف نے طرف دھیان بھی نہیں دیا۔ اس کے ذہن پر تو برجیس سوار تھی۔ راستے میں وہ سر جھکا چلا رہا۔ مالک نے اسے اپنے جس عزیز سے ملایا وہ ملا تو ضرور مگر محض ظاہر داری کے پر مالک کافی عرصے کے بعد قاہرہ آیا تھا۔ وہ عزیزوں سے مل کے شہر سے نہ ہوا

اس لئے یوسف کی افسردگی اور بے دلی محسوس نہ کر سکا۔  
کئی گھنٹوں تک شہر میں گھومنے اور ملاقاتیں کرنے کے بعد جب دونوں واپس آئے تو یوسف کا دل کچھ کھلا برجیس مالک کے اہل خانہ کے ساتھ مقیم تھی اور یوسف کو مالک کے ساتھ قیام کی اجازت مل گئی تھی۔ مالک کی رہائش گاہ پر پہنچ کے یوسف کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ اس کے چہرے سے مسرت چمکی پڑتی تھی چند لمحوں بعد برجیس سے اس کی ملاقات ہونے والی تھی مگر وائے قسمت کہ مالک کا ملازم اسے دیکھ کر بھاگتا ہوا آیا اور ہانپتے ہوئے کہا ”صاحب۔ امیر المومنین نے آپ دونوں کو فوراً طلب کیا ہے۔ خلیفہ کا ہر کارہ تین بار آچکا ہے۔ آپ ابھی قصر خلافت تشریف لے جائے“  
ملازم کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ خلیفہ کا ہر کارہ چوتھی بار آتا ہوا دکھائی دیا۔ ملازم کی نظر اس پر پڑی تو گھبرا کر بولا ”صاحب وہ پھر آیا“

مالک اور یوسف نے گھوم کر دیکھا ہر کارہ بڑی شان سے چلا آرہا تھا۔ ان کے قدم جم کے رہ گئے مالک کو اندر جانے کی بھی مہلت نہ ملی۔ یوسف کا دل تو جیسے زخمی ہو گیا۔ کتنی دعاؤں کے ساتھ تو وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ برجیس کی شکل آنکھوں میں پھر رہی تھی کہ ہر کارے نے قریب پہنچ کر اس کے شوق ملاقات کا گلا گھونٹ دیا۔ ہر کارے نے مالک کو خلیفہ کا حکم سنایا اور تاکید کی وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کے ساتھ ہی چلیں اور قسطنطنیہ سے آئے ہوئے نمائندے کو بھی ساتھ لے لیں۔ یوسف دل مسوس کر رہ گیا۔

فاطمی خلیفہ حافظ ان دونوں کا انتظار کر رہا تھا۔ انہیں فوراً ہی اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ خلیفہ نے تحلیہ کا حکم دیا تمام کینز اور غلام وہاں سے ہٹ گئے۔ خلیفہ نے دہلی زبان میں مالک سے کہا ”مالک کچھ باتیں ایسی ہیں جنہیں ہم ابن وئش کے سامنے نہیں کہنا چاہتے تھے۔ وزارت اور سپہ سالاری کے عہدے حاصل ہونے کے بعد اس میں خود سری پیدا ہو گئی ہے۔ خیر یہ تو اک الگ مسئلہ ہے۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم امیر موصل کے پاس یوسف کو بھیجیں۔ یوسف اسی کا آدمی ہے اور ہمارے خیالات کی بہتر طور پر ترجمانی کر سکتا ہے۔“

یوسف گھبرا گیا۔ اس نے کہا ”امیر المومنین کے حکم کی تعمیل کرنا میرے لئے عین سعادت ہے لیکن مجھے جس وقت قسطنطنیہ سے یہاں بھیجا گیا تھا تو میرے آقا اسد الدین کو حفاظت کو طور پر حراست میں لے لیا گیا تھا اگر میری واپسی میں تاخیر ہوئی تو آقا کسی مصیبت میں گرفتار ہو سکتے ہیں اور ممکن ہے کہ انہیں قتل کر دیا جائے“  
”تمہیں فکر کی ضرورت نہیں“ خلیفہ نے کہا ”ہم معاہدے پر دستخط کر کے قسطنطنیہ

بھیج دیں گے اور شہنشاہ کو مطلع کر دیں گے ہم نے مزید صلاح مشورے کے لئے ان الوطن پر جو بوازش کی ہے۔ اسے میں تمام عمر نہ بھلا سکوں گا۔  
 نمائندے کو قاہرہ میں روک لیا ہے۔  
 ”مگر امیر المومنین“ یوسف کی آواز اس کا ساتھ نہ دے سکی اور اس نے بے بسی حاصل کرنا تھی۔ خلیفہ سے رخصت ہو کر وہ سیدھے برہیس کے پاس آئے۔ مالک چاہتا تھا کہ اس مسئلے کو فوراً ”نپٹا دیا جائے تاکہ برہیس اور یوسف کو سکون حاصل ہو۔۔۔۔۔۔ یوسف مالک کو دیکھا۔  
 مالک سمجھ گیا تھا کہ یوسف کی ہچکچاہٹ کی اصل وجہ برہیس ہے جسے شاید وہ قاہرہ اکیلا نہ چھوڑنا چاہتا ہو۔ اس نے خلیفہ سے کہا ”امیر المومنین۔ یوسف نے جس غصے سے دیکھا بھی تھا لیکن وہ اندر آنے کے بجائے باہر ہی سے واپس چلے گئے تھے۔ برہیس کے دل اظہار کیا ہے اس پر قطعی شبہ نہیں کیا جاسکتا ہے لیکن یوسف کی موصول جانے پر ایک چوٹ سی لگی تھی اور کئی طرح کے دوسے بھی پیدا ہوئے تھے۔ برہیس خود کو قاہرہ ہچکچاہٹ کی وجہ ایک اور بھی ہو سکتی ہے۔ یہ یوسف کا خالص ذاتی معاملہ ہے اور میں اس میں غلطی سے کبھی زیادہ محفوظ محسوس کر رہی تھی لیکن وہ ایک غیر مذہب یوسف کی اجازت کے اسے بیان نہیں کر سکتا۔“

”ذاتی معاملہ“ خلیفہ نے الجھتے ہوئے پوچھا ”یوسف تم ہم پر اعتبار کر سکتے ہو اور مصیبت بن جاتی ہیں۔“  
 کسی مصیبت میں ہو تو ہم تمہاری مدد کریں گے اور اگر یہ کوئی راز ہے تو وہ ہمارے دل بھی راز بن کے رہے گا۔“  
 ”امیر المومنین سے بڑھ کر کس پر اعتبار کیا جاسکتا ہے“ یوسف نے جواب دیا۔  
 مجھے اس کے اظہار میں شرم محسوس ہوتی ہے بھائی مالک جس طرح چاہیں آپ سے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے اپنی بیوی کو آواز دے کر بلا لیا اور یہ تینوں ایک ساتھ کھڑے ہوئے۔

یوسف کے اجازت دیتے ہی مالک بن خضر نے یوسف اور برہیس کے رومان کی یاد دہانی کی۔  
 قاطمی خلیفہ کے گوش گزار کر دی۔ خلیفہ نے بڑی دلچسپی اور توجہ سے یہ رومان انگیز ان کی بیوی کو دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔  
 سنی۔ یوسف کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ شرم سے پانی پانی ہو رہا تھا۔  
 خلیفہ نے احوال سننے کے بعد کہا۔ یوسف اب یہ تمہارا مسئلہ نہیں۔ برہیس حفاظت کی ہم ذمہ داری لیتے ہیں لیکن ہمارا مشورہ ہے تم سب سے پہلے برہیس سے کر لو تاکہ تمہارا اس سے ملنا جلنا شرعی حدود میں آجائے تو زیادہ بہتر ہے ورنہ یہاں اہل کتاب ہیں اور ان سے رشتہ قائم کرنے کی مسلمانوں کو اجازت ہے۔“

بلی کے بھاگوں جھینکا ٹوٹا۔ یوسف چاہتا ہی یہی تھا۔ مگر شرم کی وجہ سے کچھ نہ بولا۔  
 اور پر امید نظروں سے مالک کو دیکھنے لگا۔ مالک نے خلیفہ سے کہا ”یوسف کو امیر المومنین کے ہونے پر خوشی ہوئی ہوگی۔“  
 شکر گزار ہونا چاہیے۔ برہیس سے عقد ہی یوسف کی ذہنی پریشانی کا علاج ہے۔“

”ہم یوسف کی زبان سے بھی کچھ سننا چاہتے ہیں“ خلیفہ نے مسکرا کر یوسف کی طرف اشارہ کیا۔  
 دیکھا۔ یوسف نے ہنستے اور شرہاتے ہوئے کہا۔ ”امیر المومنین نے جب یہ معاملہ انجمن کے سامنے لایا تو میں اب کیا بول سکتا ہوں سوائے اس کے کہ امیر المومنین میں لے لیا ہے تو میں اب کیا بول سکتا ہوں سوائے اس کے کہ امیر المومنین۔“

برہیس کو یہ خیال تھا کہ آج اس کے بارے میں کوئی خاص فیصلہ ہونے والا ہے مگر یوسف کی طرف اس کا ذہن نہ گیا تھا۔ مالک کی زبان سے پیغام سن کر وہ بھونچکا رہ گیا۔  
 مالک کی بیوی نے اس کی مدد کی۔ وہ دونوں کچھ دیر کھسپھر کرتی رہیں پھر مالک کی

یہی نے کہا ”میں برجیس کی نمائندہ کی حیثیت سے اطلاع دیتی ہوں کہ برجیس کو یہ رشتہ منظور ہے۔ اس سلسلے میں کوئی خاص شرط ہو تو اس کا اظہار کیا جائے؟“

مالک نے یوسف سے چند منٹ گفتگو کے بعد کہا ”شادی کے لئے یوسف کی طرف کوئی شخص یہ انگلی نہ اٹھا سکے کہ یوسف نے ایک عیسائی لڑکی سے شادی کی ہے“

”مرجبا۔ برجیس۔“ ”مرجبا“ مالک کی بیوی نے اک دم آواز لگائی ”تم نے خلوص دل رکھتی ہیں۔ مگر یہ مسئلہ امیر المومنین خلیفہ حافظ الدین نے پہلے ہی طے کر دیا ہے انہوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ عیسائی قطع نظر اپنے افعال اور کردار کے آسمانی کتاب مقدس انجیل پر دیکھو کہ اس لئے مسلمان کا عقد عیسائی خاتون سے ہو سکتا ہے خواہ وہ اپنا مذہب تبدیل کرے“

اس وقت برجیس نے مالک کی بیوی سے کچھ کہا۔ اس کی بات سن کر مالک کی بیوی نے ”اس بات کا جواب برجیس خود دینا چاہتی ہیں“

برجیس جو کہنا چاہتی ہیں ضرور کہیں ”مالک جلدی سے بولا۔ مگر یوسف نے کوئی کہنے سے لگایا۔ مالک نے یوسف کو مبارک باد دی۔

عائد نہیں کی ہے۔ وہ عیسائی مذہب رکھتے ہوئے بھی یوسف سے عقد کر سکتی ہیں“

برادر محترم ”برجیس نے خود جواب دینا شروع کیا ”یہ ٹھیک ہے کہ میں عیسائی ہوں کہ جس طرح عیسائی بننے کے لئے ہزاروں مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے کچھ اسی طرح یہاں میں پیدا ہوئی میرے والدین عیسائی ہیں لیکن میرے ہم مذہب جان قوش نے مجھ بے کرمی ہو گا مگر میں ایک لمحے میں عیسائی سے مسلمان ہو گئی“

جو اذیتیں دی ہیں ان کے تصور سے میرا جسم لرزے لگتا ہے اس نے کسی وقت یہ سوچا کہ میں بھی اسی طرح کی عیسائی مذہب اور گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ جان کی بیوی نے ہنس کے کہا۔

برجیس کا سر حیا سے جھک گیا۔

مالک نے کہا ”برجیس ہمیں افسوس ہے کہ اب ہم تمہیں یوسف سے براہ راست گفتگو کی اجازت نہیں دے سکتے کیونکہ تمہیں اب دلن بنا کے مائیوں (ماجھے) بٹھانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یوسف بھی ایک اچھے اور سعادت مند دلہا کی طرح اپنے دل کو سنبھالے رکھیں گے اور تمہیں پریشان نہیں کریں گے“

یوسف مالک کی اس خوش کلائی پر مسکرا دیا۔

یوسف بن خضر کے قسطنطنیہ جانے کا ابھی کوئی امکان نہ تھا۔ اس نے خلیفہ سے اپنے آبائی مکان میں جانے کی اجازت مانگی جو اسے مل گئی۔ مالک شاہی مہمان خانے میں تمام آسائشوں کے باوجود کچھ زیادہ خوش نہ تھا۔ اپنے مکان میں آکے اسے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ یہ مکان ایک طویل اور عریض حویلی تھی اس کی غلام گردش میں صرف ایک غلام میں نے اس وقت یہ بھی سوچا تھا کہ جب یوسف جیسا جوان جسے سوائے حکم کی ہڈی پر اور کوئی چارہ نہ تھا وہ تمہیں موت کے منہ سے بچا لایا تو میں تمہیں پھر کس جان قوش کے حوالے کر سکتا تھا“

نے برجیس اور یوسف پر اخلاقی پابندی لگا دی تھی ایک جگہ رہتے ہوئے دونوں کا آپس میں اولاد کی طرف سے اس کے تخت کو کوئی خطرہ نہ رہے۔  
اکثر ہو جاتا لیکن وہ سوائے سلام کرنے کے اور کوئی لفظ زبان پر نہ لاتے تھے۔  
برجیس اور یوسف کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ خلیفہ کی طرف سے قیمتی پارچہ کی طرح قاہرہ میں نہ جانے کتنے جوان اپنے سینے میں ارمان دبائے ایک ماہ سے زیادہ عرصے اور زیورات بھیجے گئے مالک نے بھی یوسف اور برجیس کو اپنا ہی سمجھا اور شادی کے ایک ہفتے کی طرح حالات پر قابو پا لیا تو ایک دن سفیر نے دنبہ الفاظ میں خلیفہ پورے انتظامات کیے۔ خلیفہ کی ہدایت پر صرف محدود مہمانوں کو دعوت نامے بھیجے گئے اور خلیفہ حافظ نے پوری طرح حالات پر قابو پا لیا تو ایک دن سفیر نے دنبہ الفاظ میں خلیفہ احتیاط اس لئے برتی گئی کہ خلیفہ نے یوسف کے عقد میں شریک ہونے کی رضامندی ظاہر کی کیونکہ عوام کے جذبات بھڑکے ہوئے تھے اور خلیفہ کو ایک تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ کل صبح بارات مالک کے ایک بھائی کے گھر عام جگہ کوئی حادثہ پیش آ سکتا تھا۔

چڑھنی تھی۔ یوسف کو شام کے وقت مالک کے بھائی کے گھر بھیج دیا گیا تھا بارات کے پورے اور برجیس کی شادی بظاہر پھینکی سی رہی۔ مالک نے صرف پندرہ مہمانوں کو مدعو آنے والا بری کا جوڑا اور لوازمات بھی وہیں بھجوا دیے گئے تھے۔ یوسف اور برجیس ملاقات کے درمیان صرف آج کی رات اور کل کا دن حائل تھا مگر یہ رات پہاڑ بن یوسف اور برجیس سے یہ رات کاٹے نہ کتنی تھی ہزاروں کروٹیں بدل بدل کے دونوں سویر کیا ہو گا لیکن یہ سویر رات سے بھی زیادہ تاریک تھا۔ رات کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا تھا جس نے دن کے سورج کو گمنا دیا تھا۔ مصر کے مرد آئین وزیر اور سپہ سالار رضوان دغش کو کسی نے رات کے اندھیرے میں قتل کر دیا تھا۔ پورے قاہرہ میں کھرام مچا ہوا لوگوں کو شبہ ہی نہیں بلکہ یقین تھا کہ وزیر رضوان بن دغش کو خلیفہ حافظ نے کرایا ہے کیونکہ جب رضوان بن دغش فاطمی افواج کا سپہ سالار تھا اس میں اور خلیفہ بہت اچھے تعلقات رہے۔ خلیفہ ہمیشہ ابن دغش کی بات کو مقدم رکھتا تھا لیکن جب سالار نے بزور شمشیر وزارت پر قبضہ کر لیا تو دونوں میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ خیال ہے کہ تاریخ اسلام میں سوائے فاطمی خلیفہ حافظ کے کوئی اور خلیفہ یا بادشاہ ایسا جس نے اپنے دور اقتدار میں یکے بعد دیگرے سات وزیر بدلے ہوں اور انہیں قتل کرایا ہو۔

خلیفہ حافظ نے پہلے وزیر ہزہ کو معزول کر کے قتل کرایا پھر ابو علی بن افضل اس حکم سے مارا گیا۔ اس طرح فاطمی حکومت کے سات وزیر ایک کے بعد ایک آئے اور ہوتے رہے۔ ان میں اس کے دو بیٹے بھی شامل ہیں جن میں پہلا بیٹا اپنی موت مراد دوسرا باپ کے حکم سے قتل ہوا۔ آخری وزیر اور سپہ سالار رضوان بن دغش کے بعد حافظ نے وزارت کا عہدہ ہی ختم کر دیا اور تمام کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ساتھ ہی حافظ نے اپنے بیٹے ابو منصور اسماعیل کو اپنا ولی عہد مقرر کر دیا تاکہ کم

اور قسطنطنیہ دونوں کے حالات بدل چلے تھے۔

دوسرے ہفتے خلیفہ نے مالک بن خضر کو قسطنطنیہ اور یوسف کو موصل جانے کا حکم دیا۔ مالک بن خضر بحری رستے سے روانہ ہوا یوسف کے ساتھ برجیس تھی اس لئے اس نے ایک قافلے کے ساتھ ریگستانی راستہ اختیار کیا تاکہ بحر روم کے ساحل کے ساتھ ساتھ پہیلی ہوئی۔ اصرانی ریاستوں سے اسے نہ گزرنا پڑے۔ ادھر مالک بن خضر قسطنطنیہ پہنچا اور دوسری طرف یوسف اور برجیس نے موصل کے شہر میں قدم رکھا لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ موصل اور قسطنطنیہ دونوں کے حالات بدل چلے تھے۔

”بکواس بند کرو!“ کلائڈ نے جیسے حکم دیا ”میں کہتا ہوں یہ ساغر تم ہی لو“  
”میں نہیں جیتی کیوں بیوں؟“ شہزادی اکر کر بولی۔

”میں نے آدھا ساغر خالی کیا ہے۔ باقی تم ہی گے۔ یہ میرا حکم ہے“  
”میں اس جھوٹے ساغر اور تم پر لعنت بھیجتی ہوں“

”جینا!“ کلائڈ چیخ پڑا ”تم نہیں جانتی میں کون ہوں؟“

”مجھے معلوم ہے کہ شاہ یرو ظلم کے بھتیجے ہو۔ تمہارا رعب مجھ پر نہیں چل سکتا“

”میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہوں جینا“ کلائڈ نے دوسرا قہقہہ لگایا۔

”اس کے علاوہ تم ایک آوارہ مزاج جوان ہو اور میں ایسے لوگوں کو کا دماغ صحیح کرنا جانتی ہوں“ شہزادی کی دونوں مٹھیاں اور زیادہ کس گئیں۔

”اچھا تو میں تیرا غرور ابھی توڑے دیتا ہوں“

شہزادہ کلائڈ لڑکھڑاتا ہوا میز کے گرد چکر لگا کر شہزادی جینا لو پر جھپٹا۔ شہزادی نے اندازہ کر لیا تھا کہ کلائڈ نشے میں دمت ہے اور اس کا جسم اس کے قابو میں نہیں ہے۔ وہ

تیار کھڑی تھی۔ کلائڈ نے اسے پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور جواب میں شہزادی کا دایاں ہاتھ بلند ہوا۔ اس کی بند مٹھی نے گھونے کی شکل اختیار کی اور یہ گھونسا اتنی شدت سے کلائڈ کے منہ پر پڑا کہ کلائڈ لڑکھڑا کر ایک رقصہ سے نکل گیا۔ رقصہ نے ہستے ہوئے اسے سارا دے کر سیدھا کیا اور آگے بڑھ گئی۔

شہزادی جینا لو کا خیال تھا کہ کلائڈ نشے کی وجہ سے زمین پر گر جائے گا اور وہ اس میز سے ہٹ کر کسی محفوظ جگہ چلی جائے گی مگر کلائڈ اس حملے کو برداشت کر گیا۔ اس نے سر جھک کر آنکھیں کھولیں اور کسی بیٹھنے کی طرح نتھنے پھلا کر ڈکارا ”تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ میں تیرے خون میں اپنا خنجر ڈبوؤں گا“

کلائڈ کمر سے خنجر کھینچ کر شہزادی جینا لو کی طرف خونخوار درندے کی طرح بڑھا شہزادی کو اس خطرے کی قطعی توقع نہ تھی۔ اس نے مدد کے لئے چاروں طرف نظریں دوڑائیں کوئی بھی ان کی طرف متوجہ نہ تھا۔ سب اپنے رنگ میں مت تھے کسی کو کسی کی خبر نہ تھی شراب کے چھوٹے بڑے پیالے اور گلاس چل رہے تھے، جھلک رہے تھے اور نکل کر لٹ رہے تھے ایسے میں شہزادی کی مدد کون کرتا۔ اگر کسی نے کلائڈ کو دیکھا بھی ہو گا تو یہی سمجھا ہو گا کہ یہ شاہانہ دعوت کی عام خوش فلیوں کا ایک حصہ ہے۔

شہزادی کو شدید خطرے کا احساس ہوا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اگر اس نے خود اپنی مدافعت نہ کی تو کلائڈ اسے ضرور زخمی کر دے گا۔ کلائڈ کی کمینہ حرکتوں سے تمام لشکر

## نامراد کلائڈ

شاہ یرو ظلم بالذہون کے وسیع اور عریض خیے میں شاہانہ دعوت ہو رہی تھی گردش میں تھے اور بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، رقصاں ابرو دست و پا اور کمر کے بیچ و خم سے حاضریں محفل کو محفوظ کر رہی تھیں شاہ نو عمر بھانجی شہزادی جینا لو تالیاں بجا بجا کر داؤدے رہی تھی۔ شہزادی بہت خوش تھی اس لئے کہ یہ اس کی زندگی کی پہلی بڑی محفل تھی جس میں مشرق وسطیٰ کے تاج بادشاہ مع اپنی بیگمات اور شہزادیوں کے شریک ہوئے تھے۔

ایکایک شہزادی جینا لو کے چہرے کے سامنے ایک تھرکتا ہوا ساغر آگیا۔ شہزادی بجاتے ہاتھ ایک دم رک گئے۔ اس نے گھبرا کر سر پیچھے کر لیا اور کرسی کی ٹیک لڑتا ساغر پھر اس کے منہ کے قریب آگیا۔ شہزادی نے غصے سے سامنے کی طرف کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

”کیا بد تمیزی ہے کلائڈ! تم آداب محل بھی نہیں جانتے؟“

غصے کے مارے اس کا جسم کانپنے لگا۔

”تمیز!“ کلائڈ نے ایک بد مست قہقہہ لگایا ”تم.... اور مجھے تہمت سکا رہی“

جینا

”نادان تم ہو کلائڈ“ شہزادی نے دونوں مٹھیاں بند کر لیں ”کیا میزبانی کا یہ طہ کہ تم دوسروں کو بلا کے انہیں ذلیل کرو؟“



واقف تھا۔ وہ روز کسی نہ کسی شہزادی یا عام لڑکی کو چھیڑتا اور ایک فساد کھڑا ہو جاتا۔ یروثلیم سے کوئی شکایت نہ کرتا سب کو معلوم تھا کہ کلائیڈ شاہ یروثلیم کا منہ چڑھا ہوتا تھا۔ کلائیڈ لوگوں کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا رہا تھا اور اس کی بیابانیاں اور آوارگیاں بڑھ رہی تھیں۔

اس ہنگامہ ہوا ہو میں نہ کسی نے کلائیڈ کی ہاتھ میں کھلا ہوا خنجر دیکھا اور نہ کسی شہزادی کی بے بسی پر گئی۔ کلائیڈ جھومتا ہوا شہزادی کے قریب پہنچ چکا تھا۔ شہزادی نظریں پورے خیمے میں گھومتی ہوئی اپنے باپ پر پڑیں مگر وہ بھی دوسرے مہمانوں کی مشغولۂ فتنہ میں لگا ہوا تھا اور ایک خوب صورت کنیز اسے جام پر جام پیش کر رہی تھی۔ اس کی پشت شہزادی کی طرف تھی اور خیمے میں اس قدر شور تھا کہ وہاں تک آواز قطعی ناممکن تھا شہزادی نے فوراً خود کو سنبھالا اور تیزی سے خیمے کے دروازے کی بھاگی اس کے راستے میں کتے ہی میخوار رقاصاؤں اور کنیزوں کو پکڑے تھرکتے پھر رہے شہزادی انہیں دھکیلتی ہوئی آگے بڑھتی رہی۔ وہ پلٹ پلٹ کر کلائیڈ کو بھی دیکھتی جاتی تھی اسی طرح خنجر تانے ہوئے اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ کئی مقام پر تو کلائیڈ بالکل اس قریب پہنچ گیا تھا مگر شہزادی نے بڑی پھرتی سے میزیں الٹ کر راستہ روک دیا تھا۔

شہزادی نے خیمے سے باہر آ کر ایک طرف بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ اس کا پڑاؤ یہاں سے قریب تھا مگر اس خیمے میں کوئی نہ تھا۔ وہ تنہا اپنے باپ کے ساتھ جنگ کا ثواب حاصل کرنے آئی تھی اور اس کا باپ دعوت والے خیمے میں رنگ رلیوں مصروف تھا۔ شہزادی خیموں کے اس شہر میں پناہ حاصل کرنے کے لئے بھاگ رہی تھی تاہم نظر خیموں کا جنگل بکھرا ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کے مشہور قلعہ شیزر کا محاذ تھا اور سورہا ایک ہفتے سے اس قلعہ کو گھیرے ہوئے تھے۔

شہزادی جان بچا کر بھاگی تھی۔ اس لئے اس کے قدم تیز تیز اٹھ رہے تھے۔ وہ تھی کہ اگر وہ سانس لینے کے لئے کہیں رکی تو شہزادہ کلائیڈ اسے دوچ لے گا۔ برخلاف کے کلائیڈ نے خوب پی رکھی تھی اس کی رفتار ست تھی اور قدم لڑکھڑا رہے تھے پھر بھی شہزادی پر نظریں جمائے ہوئے سیدھا چلا آ رہا تھا۔ اس رات پندرہویں کا چاند تھا دودھیا چاندنی ہر طرف چمکی ہوئی تھی۔ شہزادی جس خیمے سے بھاگی تھی وہ شاہ یروثلیم خیمہ گاہ تھی۔ اس کے قریب ہی شاہ اٹھاکیہ یعنی شہزادی جینا لو کی اپنی خیمہ گاہ تھی مگر نے ادھر کا رخ نہ کیا تھا اور وہ نصرانی شاہ اڈیہ کی خیمہ گاہ کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی تھی۔ وہ مدد کے لئے برابر چینیں مار رہی تھی۔ خیموں کے باہر مسلح پہرے دار گھڑے

شہزادی کی پیچ پکار پر کان نہ دھر رہے تھے بلکہ ایک دوسرے کو اشارے کر کے ہنس رہے تھے۔ شہزادی جینا لو اور شہزادہ کلائیڈ کی ان کے لئے اجنبی نہ تھی مگر وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ شہزادی شہزادے کا مذاق کا کھیل ہے اور وہ ایک دوسرے کو پریشان.... کر رہے ہیں۔

اڈیہ والوں کی حدود ختم ہو گئیں اور شہزادی طرابلس کے نصرانی شاہ کے خیموں کے قریب پہنچ گئی۔ وہاں بھی پناہ نہ مل سکی۔ پہرے دار اسے ہنس کر تیز دوڑنے کو کہہ رہے تھے۔ شہزادی کی سانس پھولنے لگی تھی اور اس کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ اسی وقت اس کی نظر ایک بڑے خیمے پر پڑی خیمے کے اوپر ایک پرچم لہرا رہا تھا اور اس پرچم پر چاند کا نشان تھا جو صلیبی دیوانوں کے ساتھ مل کے خود اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہا رہے تھے۔

شہزادی نے ایک لمحہ رک کر فوراً ایک خطرناک فیصلہ کیا اور اب اس کے قدم مسلم خیموں کی طرف اٹھ رہے تھے۔ اسی وقت بڑے خیمے سے دو آدمی نکلے۔ شہزادی نے انہیں دیکھے ہی دُور سے آواز لگائی۔ ”بچاؤ بچاؤ... مسلمانو تمہیں اپنے خدا کی قسم ہے مجھے اس ظالم سے بچاؤ“

دونوں مسلمان ایک دم رک گئے۔

”آگے بڑھ کر دیکھو سرم!“ ایک نے کہا ”کوئی مظلوم عورت ہے۔ اس نے ہمیں خدا کا واسطہ دیا ہے“

”سردار اسد الدین! آپ فکر نہ کریں“ سرم نے پر جوش لہجے میں کہا ”میں بھی اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ مظلوم کی مدد نہ کرنا سب سے بڑی بزدلی ہے“

سرم آگے بڑھ گیا۔ شہزادی اس کے قریب آگئی تھی۔

”مجھے کلائیڈ سے بچاؤ مسلم سردار!“ شہزادی کی سانس پھول رہی تھی۔ الفاظ اس کی زبان سے ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔

”آپ خود کو سنبھالیے خاتون!“ سرم نے ادب سے کہا۔ ”اب آپ مسلمانوں کی پناہ میں ہیں میرے سردار سامنے کھڑے ہیں۔ آپ ان کے پاس چلی جائیے میں اس بد معاش سے نمٹتا ہوں“

شہزادی تیزی سے اسد الدین کے پاس پہنچ گئی۔ سرم کی آواز اسد الدین تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے شہزادی سے کہا ”خاتون! تم نے خدا کا واسطہ دے کر مدد مانگی ہے۔ تم محفوظ پناہ میں آگئی ہو کسی بات کی فکر نہ کرو۔ تمہارا پیچھا کرنے والا کوئی بھی ہو اب اس کا ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکتا“

”س طرح لے جاؤ گے۔ خنجر کے زور پر؟“ سرم مسکرانے لگا۔  
 ”اوہ۔۔۔ ذیل مسلمان! میرا مذاق؟“ ڈاتا ہے۔ ہٹ جا میرے راستے سے“ اس کے

سرم کے بظلوں میں دبے ہوئے ہاتھ بجلی جیسی تیزی سے ہوا میں لہرائے اور دوسرے  
 سرم کے ہاتھ کی کلائی سرم کے مضبوط پنچے میں تھی۔ سرم نے اس کی کلائی موڑی اور خنجر  
 کلائی کے ہاتھ سے جھوٹ کر دور جاگرا۔ کلائی نے حیران نظروں سے سرم کو دیکھا اس کا  
 سارا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔

”خنجر اٹھا کے کمر میں لگا لو اور چپ چاپ میرے ساتھ چلو“ سرم نے حکم دیا۔  
 ”تم مجھے کہاں لے جاؤ گے؟“ کلائی گڑگڑایا۔ مجھے معاف کر دو سردار میں تم سے

شرمندہ ہوں

”تم نے مجھ پر حملہ کیا ہے میں تمہیں معاف نہیں کر سکتا“ اور سرم نے اسے چلنے کا  
 اشارہ کیا کلائی نے خنجر کمر میں لگا لیا اور خاموشی سے سرم کے ساتھ چلنے لگا۔

”سردار! آپ نے دیکھا۔۔۔ اس بچے نے مجھ پر وار کیا؟“ قریب پہنچ کر سرم نے  
 اسد الدین سے کہا۔

اسد الدین نے سرم کو جواب دینے کی بجائے کلائی کو مخاطب کیا ”شاہ یروٹلم کے  
 پیچھے! جانتے ہو اسلحہ کون استعمال کرتا ہے؟“

کلائی پہلے ہی پریشان تھا اسد الدین کے سوال نے اسے اور گھبرا دیا۔ وہ حیرت اور  
 تجسس سے اسے دیکھنے لگا۔

”سنو۔ اگر نہیں جانتے تو میں تمہیں بتاتا ہوں“ اسد الدین مسکرایا ”حکومت وہ لوگ  
 کرتے ہیں جن کی تلوار میں طاقت ہو اور اسلحہ وہ لوگ استعمال کرتے ہیں جن کے ہاتھ  
 مضبوط ہوں۔ تمہارے نازک ہاتھ بوجھ کو برداشت نہیں کر سکتے تم سے دو جرم سرزد ہوئے  
 ہیں۔ ایک تو تم نے ایک معزز شہزادی کو پریشان کیا دوسرے تم نے والئی دمشق کے محافظ  
 سرم پر خنجر سے حملہ کیا۔ آج کی رات تم ہمارے ممان رہو گے۔ صبح تمہارا مقدمہ پیش کیا  
 جائے گا“

”مجھے کس کے سامنے پیش کیا جائے گا؟“ کلائی کا خون خوف سے کانپ اٹھا۔

”تم نے والی دمشق مجبر الدین آبق کی خیمہ گاہ میں جرم کیا ہے تمہیں ان کے سامنے  
 پیش کیا جائے گا۔ اگر انہوں نے کوئی سزا دی تو تمہیں بھگتنا ہوگی اور اگر معاف کر دیا تو  
 تمہیں شاہ یروٹلم کے پاس پہنچا دیا جائے گا“

مگر مسلم سردار۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ”شہزادی سے کھڑا نہیں رہا گیا۔ وہ پتھر ٹلی زمین پر  
 گئی۔“

”تم سانس لے لو خاتون“ اسد الدین نے اسے تسلی دی ”تمہارا کوئی کچھ نہیں ہا ساتھ ہی کلائی نے سرم پر خنجر کا بھرپور وار کیا۔“

شہزادی نے جلدی جلدی کئی سانسیں لیں پھر قدرے سنبھل کر بولی ”میرا پیچھا کر  
 والا شہزادہ کلائی ہے۔ وہ شاہ یروٹلم بالذون کا بھتیجا ہے۔ کیا تم اسے روک سکو گے؟“

”شاہ یروٹلم کا بھتیجا“ اسد الدین نے حقارت سے کہا ”خاتون تم نے جس خدا کا واسطہ  
 دیا ہے اس کے لئے تو مسلمان اپنی جانیں قربان کر دیتے ہیں۔ شاہ یروٹلم کے بھتیجے کی  
 مجال ہے اگر خود شاہ یروٹلم بھی تمہیں ہماری پناہ سے لے جانا چاہے تو بھی ہم انکار کر  
 دیتے“

”میں تمہاری بہت احسان مند ہوں مسلم سردار شہزادی نے بڑے خلوص سے کہا اور  
 زمین سے اٹھ کر اسد الدین کے برابر کھڑے ہو گئی۔

دوسری طرف شہزادہ کلائی خنجر بکٹ لڑکھاتا ہوا آیا تو اس نے راستے میں سرم  
 کھڑے دیکھا۔ سرم بیچ راستے میں دونوں ہاتھ پھیلا کے اس طرح کھڑا تھا جیسے بچوں کو آگ  
 بڑھنے سے روکا جاتا ہے۔

”تو کون ہے“ ہٹ جا سامنے سے!“ کلائی نے اپنی شہزادگی بگھاری۔

”اور تو کون ہے جو ایک مظلوم لڑکی کے پیچھے خنجر تانے ہوئے چلا آ رہا ہے؟“  
 کلائی نے اسے گھورا میں شہزادہ ہوں شہزادہ۔۔۔۔۔

”یقین نہیں آتا کہ تمہاری رگوں میں شاہی خون ہے“ سرم نے منہ بنا کر کہا  
 شہزادے لڑکیوں پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے“

”وہ میری محبوبہ ہے۔ مجھ سے ناراض ہو کر بھاگی ہے“

”محبوبہ کو خنجر سے نہیں پیار سے منایا جاتا ہے“

”میں اسے پیار سے متا کر لے جاؤں گا“

”مگر اب تو وہ مسلمانوں کی پناہ میں ہے۔ ہمارے سردار اسد الدین نے اسے پناہ دے  
 ہے“ سرم نے اطمینان سے کہا اور پھیلے ہوئے ہاتھ سمیٹ کر بظلوں میں دبائے۔

”مگر تم ہو کون۔ شہزادے کلائی یعنی شاہ یروٹلم۔۔۔۔۔ بالذون کے بھتیجے کو روکنے ک

تم نے کیسے ہمت کی۔“ کلائی کا دماغ پھر الٹ گیا اور وہ بڑبڑانے لگا ”شہزادی جینا لو کسی  
 مسلمان کی پناہ میں نہیں رہ سکتی میں اسے واپس لے کر جاؤں گا۔“

شہزادہ کلائیڈ کے دماغ میں غرور کا کیزا پھر کاٹنے لگا۔ اس نے ذرا اکڑ کے کہا۔  
الدین ہمارے شاہ یروٹلم کا ماتحت ہے۔ اس کے سامنے پیش ہونا میری توہین ہے  
میرے چچا شاہ یروٹلم کے سامنے پیش کیا جائے۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو کلائیڈ! اسد الدین کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”والہی دمشق شہزادہ  
الدین نے سلیسوں سے دوستی کا معاہدہ کیا ہے۔ وہ کسی کے ماتحت نہیں ہیں۔“

”اچھا میں خود والی دمشق کے سامنے صبح کو پیش ہو جاؤں گا مجھے اس وقت اپنے  
میں جانے دو۔“ شاہ یروٹلم آج بیمار ہیں ان کی دی ہوئی دعوت کا اہتمام میرے سپرد ہے  
ان کی طرف سے میزبانی کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔ تمہیں ایک معزز شہزادہ  
زبان پر اعتبار کرنا چاہیے۔“

”معزز شہزادے نے اپنے فرائض کا ذکر کر کے اپنا جرم اور زیادہ سنگین کر لیا ہے۔  
اسد الدین نے چڑ کے کہا۔ ”کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ جس محفل کے تم میزبان  
اس محفل کی ایک معصوم شہزادی پر تم نے خنجر اٹھایا۔ کیا تمہارا یہ اقدام قابل نفرت  
ہے۔“

اسد الدین یہ کہتے ہوئے اپنے خیمے کی طرف چلا شہزادہ کلائیڈ اور سرم اس کے  
پیچھے خیمے میں آگئے۔

کلائیڈ کو اپنی غلطی پر بڑا افسوس ہوا۔ اس نے ملتی نظروں سے شہزادی جینالو کی طرف  
دیکھا شہزادی سردار اسد الدین کی پشت پر کھڑی کلائیڈ کو قرآں آلود نظروں سے دیکھ رہی تھی  
اسد الدین نے کلائیڈ سے پوچھا۔

”یروٹلم کے شہزادے شاید تم شہزادی سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟“ کلائیڈ کی نظریں جلا  
گئیں۔

”تم گفتگو کر سکتے ہو لیکن میں پہلے شہزادی سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“ اسد الدین

شہزادی جینالو کی طرف دیکھا اور شہزادی پر نظر پڑتے ہی وہ چونک سا پڑا شہزادی  
محمویت کے عالم میں شاہی محافظ سرم کو دیکھ رہی تھی اور سرم کی نظریں بھی شہزادی کے  
چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

”شہزادی“ ایک دو لمحوں بعد اسد الدین نے شہزادی کو چونکا دیا۔

”جی۔۔۔ ہاں سردار۔۔۔!“ شہزادی کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

”سامنے کھڑا ہوا شخص جو خود کو شاہ بالڈون کا بھتیجا بتاتا ہے کیا تمہارا منگیتر ہے؟“

اسد الدین نے چند ثانیوں تک شہزادی کو سنبھلنے کا موقع دینے کے بعد نرمی سے

”ہرگز نہیں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔۔۔“

شہزادی جینالو نے صاف انکار کیا۔ ”یہ بات ٹھیک ہے کہ کلائیڈ شاہ یروٹلم کا بھتیجا اور  
معزز شاہ کے نام پر دمبہ لگا رہا ہے۔“

”کلائیڈ تمہارا دور یا نزدیک کا عزیز ہے؟“

”یہ بات بھی نہیں ہے“ شہزادی نے واضح لفظوں میں تردید کی ”میں شاہ انطاکیہ کی

بھانجی ہوں۔ پورے یروٹلم میں میرا کوئی عزیز نہیں ہے۔“

”یہ تم سے اپنی غلطی کی معافی مانگنا چاہتا ہے“ اسد الدین نے کلائیڈ کی طرف دیکھا

”کیا تم اس سے گفتگو کرنا پسند کرو گی؟“

”میں اس کی سنگین غلطی معاف کر کے اسے اس سے زیادہ سنگین جرم کی شہ نہیں

سکتی“ شہزادی جینالو نے غصے سے کہا ”آپ اگر اسے معاف بھی کر دیں گے تو بھی میں

اپنا مقدمہ شہنشاہ قسطنطنیہ جان کاسنی نس کے سامنے پیش کروں گی۔ شہنشاہ ہم سب کے

سردار اعلیٰ ہیں اور وہی اس بدگام شہزادے کو سزا دے سکتے ہیں۔“

”کلائیڈ! تم نے شہزادی کا جواب سنا“ اسد الدین مسکرایا ”یہاں سے جان چھوٹنے کے

بعد بھی وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گی تمہیں اپنے شہنشاہ کا بھی سامنا کرنا ہوگا۔“

”شہزادی جینالو! مجھے ان مسلمانوں نے پہلے ہی بہت ذلیل کیا ہے۔ اب مجھے شہنشاہ کی

نظروں سے نہ گراؤ۔“

سرم کو کلائیڈ کی بات بہت ناگوار گزری اس کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ”شرم کرو کلائیڈ!

تم کہتے ہو کہ ہم نے تمہیں ذلیل کیا ہے تم نے مجھ پر خنجر سے وار کیا اگر میں وہی خنجر

تمہارے سینے میں پوسٹ کر کے بیشہ کے لئے تمہارے وجود سے یہ دنیا پاک کر دیتا تو مجھ

سے کون پوچھتا۔ تم بے شرم ہی نہیں احسان فراموش بھی ہو۔“

کلائیڈ کی نظریں پھر جھک گئیں اور شہزادی نے بڑی نفرت سے کلائیڈ کی طرف سے منہ

پھیر لیا۔



موسل کا زنگی امیر عماد الدین بڑی خاموشی سے جنگی تیاریوں میں مصروف تھا دراصل یہ  
تاریاں نصرانی ریاستوں کے خلاف جہاد کی تھیں مسلم علاقے ایک تو غیر محفوظ تھے دوسرے  
مسلم والیان ریاست آپس میں دست و گریباں رہتے تھے۔ امیر زنگی نے ایسے امراء کو کسی

نہ کسی طرح درست کیا۔ بعض علاقوں پر قبضہ کیا اور بعض کا تعاون حاصل کیا لیکن  
کی مسلم ریاست پر اس کا کوئی زور نہ چلا تھا کہنے کو تو وہاں کا امیر مجیر الدین تھا مگر پھر زنگی اور نصرانیوں کی جنگ میں مصر غیر جانبدار رہے گا۔ شہنشاہ قسطنطینہ کے ملک شام  
کی باگ ڈور دراصل وہاں کے وزیر معین الدین انز کے ہاتھ میں تھی۔ انز اور زنگی داخل ہونے کی خبر خود شہنشاہ کے ایک وفد نے امیر زنگی تک پہنچائی۔ امیر موصل عماد  
شدید مخالفت تھی۔ زنگی کو علم تھا کہ جب تک دمشق پر قبضہ نہیں ہوتا اس وقت بین زنگی کو شہنشاہ کے سفیر کی آمد کی اطلاع دی گئی تو وہ حیرت زدہ رہ گیا اسے جنوب اور  
نصرانیوں کے خلاف کوئی مضبوط قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ انز بھی زنگی کے اس خیال پر غمگین ہو گیا لیکن اسے یہ نہ معلوم ہوا سکا کہ شہنشاہ جان کامنی نس ایک لشکر  
تھا۔ اس نے اسی وجہ سے عیسائی (نصرانی) ریاستوں سے دوستانہ تعلقات پیدا کر کے اپنی تیاریاں کر رہی ہیں لیکن اسے یہ نہ معلوم ہوا سکا کہ شہنشاہ جان کامنی نس ایک لشکر  
اور نصرانیوں کی مدد سے اس نے دمشق پر امیر زنگی کے دو حملے پسپا کر دیئے تھے۔

اسی دوران امیر زنگی کو خبر ملی کہ قسطنطینہ کا نصرانی شہنشاہ جان کامنی نس شام کی طرف سے دوستی کا پیغام لایا تھا بلکہ شہنشاہ نے امیر زنگی کے پاس تحائف بھی بھیجے  
ریاستوں کی مدد کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ امیر نے فوراً اپنے سردار اسد الدین کو اطلاع دیا کہ شہنشاہ نے امیر زنگی کے پاس تحائف بھی بھیجے  
قسطنطینہ جاسوس بنا کر بھیج دیا تاکہ شہنشاہ قسطنطینہ کے عزائم سے پوری طرح واقف ہو سکے۔ ان تحفوں میں شکاری باز اور چیتوں کا ایک جوڑا تھا یہی نہیں بلکہ شہنشاہ نے اپنے  
اسد الدین نے اپنے ساتھی یوسف کے ساتھ دربار قسطنطینہ میں قدم جمالیے لیکن ان تحفوں سے ایک دوستی کا معاہدہ بھی بھیجا تھا جس میں درج تھا کہ نصرانی لشکر امیر زنگی کے  
دوران یورپ میں صلیبی جنگ کا غلطہ بلند ہوا اور پیپائے روم نے شہنشاہ قسطنطینہ جان کامنی نس کی شرائط بڑی پر فریب تھیں۔ خود امیر زنگی بھی پوری تیاری کے بغیر شہنشاہ قسطنطینہ  
نس کو حکم دیا کہ وہ بلا تاخیر شام کا رخ کرے اور عیسائیوں کے وہ علاقے و انزار کرائے۔ یروشلیم کا شاہ بالڈون اور انطاکیہ اڈیسہ اور  
پر امیر زنگی نے قبضہ کر لیا تھا اس وقت جان کامنی نس مصر سے غیر جانبدار رہنے کی شرطیں پیش کیں۔ شہنشاہ قسطنطینہ نے اس سے مل گیا ہے  
رہا تھا اور اس کام پر اسد الدین کے غلام یوسف کو مامور کیا گیا تھا۔ اسد الدین بطور ریاست دمشق کا شاہ مجیر الدین بھی اپنے وزیر انز کے کہنے پر شہنشاہ قسطنطینہ سے مل گیا ہے  
قسطنطینہ میں مقیم تھا۔

پیپائے روم کے حکم پر جان کامنی نس کو سر تسلیم خم کرنا پڑا اور وہ تمام علاقوں کو شہنشاہ کا فریب ہے لیکن دوستی کا معاہدہ کر کے جنگی تیاریاں جاری رکھی جائیں۔  
بالائے طاق کرہ کر قسطنطینہ سے روانہ ہوا۔ شہنشاہ کی روانگی سے صرف دو دن پہلے قسطنطینہ کے وزیر سلطنت جان قوش کو اس وقت قتل کیا گیا جب اسد الدین شہنشاہ کے حضور توجہ دے کر رخصت کر دیا لیکن اس معاہدے کا فریب جلد ہی کھل گیا۔ شہنشاہ معاہدے  
تھا اور شہنشاہ اس سے موصل کے امیر زنگی کی فوجی طاقت کے سلسلے میں تفصیلات حاصل کر لیا۔ اس معاہدے پر دستخط کر دیے اور سفیر کو  
رہا تھا

ورنہ ممکن تھا کہ اس قتل کا الزام اسد الدین پر لگایا جاتا اس کا غلام یوسف بھی اگر کافروں کے ساتھ معاملات کرتے وقت ہر قسم کی قسم توڑتا اور معاہدے کی خلاف  
گیا ہوا تھا۔ اس نے جان قوش کے قتل کے سلسلہ میں ان دونوں پر کوئی شبہ نہیں کیا مگر زنگی کو براہ راست اپنی پناہ میں لے لیا اور حکم دیا کہ شام کے علاقے پہنچے شہنشاہ جان کامنی نس نے براہ پر حملہ کر کے اس معاہدے کے خلاف دھجیاں بکھیر  
اسد الدین کو شہنشاہ نے براہ راست اپنی پناہ میں لے لیا اور حکم دیا کہ شام کے علاقے پہنچے شہنشاہ جان کامنی نس نے براہ پر حملہ کر کے اس معاہدے کے خلاف دھجیاں بکھیر  
وہ صلیبی لشکر کی رہنمائی کرے۔

شہنشاہ قسطنطینہ کی روانگی بالکل غیر متوقع تھی اسد الدین نے بہت کوشش کی کہ اسے روکا جائے اور یہاں حضرت عقیل بن ابی طالب کا مزار مبارک ہے۔ سلیسوں نے قلعہ اور  
زنگی کو قسطنطینہ کے شہنشاہ کی طرفانی روانگی کی اطلاع دے سکے لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس نے اپنی بیوی اور بچے کو بڑھائے اور خواتین تک ظلم و  
مصر سے یوسف اس کے پاس پہنچ چکا تھا جس سے امیر زنگی کو صرف یہ اطلاع مل سکی کہ شہنشاہ جان کامنی نس نے دمشق کو چھوڑ دیا۔ پھر موت کے لہرائے ہوئے سائے، سلیسوں کی خون آشام تلواریں

تک پہنچ گیا۔ شیراز یا شیراز کا مشہور قلعہ حما سے ایک منزل کے فاصلے پر دریائے کارکن کے کنارے ایک نہایت بلند پہاڑی پر واقع تھا۔ قلعے تک پہنچنے کے لیے صرف ایک پل کا واسطہ تھا جس پر دربار قسطنطنیہ میں تھی جو لکڑی کے پل پر سے گزرتی تھی۔ خطرے کے دوران لکڑی کے اس پل کو توڑ دیا۔ اس نے کئی بار ارادہ کیا کہ نصرانی لشکر چھوڑ کے امیر زنگی کے پاس چلا جائے مگر اسے تھا اور اس طرح یہ قلعہ ناقابلِ تسخیر بن جاتا تھا۔ یہاں کا حاکم سلطان ابو عساکر نے اپنے دوست غلام، یوسف کے بارے میں کچھ علم نہ تھا کہ وہ کہاں ہے۔ اب اگر وہ بھی کے امیر زنگی سے گھرے مراسم تھے۔ قلعہ شیراز صدیوں سے ایک آزاد مسلم ریاست تھی جسے کو چھوڑ کر چلا گیا تو پھر یہاں کی خبریں امیر زنگی کو کس طرح پہنچیں گی۔ یہی طور پر چلا آ رہا تھا۔ شیشین اور نصرانیوں نے بارہا اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر اسے نصرانی لشکر میں روکے ہوئے تھا۔

شہنشاہ قسطنطنیہ نے قلعے کا سخت محاصرہ کر لیا تھا۔ تمام نصرانی والیان ریاست اور اپنے ہر موقع پر خاموشی اختیار کی تھی۔ اس کی مصلحت یہی اس بات کی اجازت نہ دیتی کہ مسلم بادشاہ اس کے ساتھ تھا۔ اس لیے اسے امید تھی کہ بہت جلد قلعے پر قبضہ ہو گا کہ وہ شہنشاہ کی ہاں میں ہاں ملائے۔ دراصل وہ کسی مناسب وقت کا منتظر تھا اور وہ وقت آگیا کہ اس کی تمام کوششیں بیکار ہو گئی تھیں اور محاصرہ طول کھینچتا جا رہا تھا۔ دمشق اب قریب آگیا تھا۔

شہزادہ کلائیڈ کی اس تازہ حرکت نے شہنشاہ کو لاطینی شہزادوں کی طرف سے اور دمشق کے لشکر میں سب سے پہلے اس کی ملاقات سرم سے ہوئی۔ یہ نوجوان والٹی بل کر دیا۔ اسد الدین اور سرم نے کلائیڈ کو رات بھر اپنے خیمے میں روکے رکھا۔ اور دمشق کے خاص محافظ دستے میں شامل تھا۔ اسد الدین کی مردانہ وجاہت اور سنجیدہ گفتگو نے رات گئے محفل شباب کا اختتام ہوا تو قائم مقام میزبان یعنی شہزادہ کلائیڈ کی تلاش سرم کو پہلی ہی ملاقات میں ایسا مسحور کیا کہ وہ اسد الدین کا گرویدہ ہو گیا اور اس نے اسد کلائیڈ، جس وقت دعوتی خیمے سے نکلا تھا تو محفل اپنے شباب پر تھی شراب کی دھندلک اپنے ہی خیمے میں ٹھہرا لیا۔ قلعہ شیزار کے طویل محاصرے کے دوران میں ان کی شدت نے ان کی آنکھوں پر پہلے ہی پردہ ڈال رکھا تھا پھر کسے فرصت تھی کہ وہ کلائیڈ کی اور زیادہ گہری ہومبئی تھی اور وہ ہمہ وقت ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ پچھلی رات

”اچھا تو شہنشاہ بھی شرکت نہیں کر سکے۔“  
 ”جی عالی جاہ! ان کے نہ آنے کا ہم سب کو بہت افسوس ہوا۔“

”سالار! شہنشاہ قسطنطنیہ کی مزاج پرسی کو کون گیا تھا؟“  
 ”عالی جاہ!“ سپہ سالار گھبرا گیا۔ ”غلام تو انتظام۔۔۔ میں مصروف تھا۔ ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی۔“

”کلائڈ گیا ہوگا؟“ شہنشاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔  
 ”جی عالی جاہ!۔۔۔ وہ۔۔۔ رات۔۔۔“ سپہ سالار کے حلق میں الفاظ انک گئے۔  
 ”وہ بھی مصروف تھا؟“ شہنشاہ نے ناگواری کا اظہار کیا۔ ”ہم نے تم سے کتنی بار کہا کہ کلائڈ غیر ذمے دار شہزادہ ہے اسے کوئی غیر معمولی کام نہ سونپا جائے۔ بھلا غور تو کرو شہنشاہ ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہوگا وہ ہم سب کا مہمان ہے۔ کل وہ ہماری دعوت میں مدعو تھا۔ بیماری کی خبر ملتے ہی تمہیں یا کلائڈ کو ان کے پاس جا کر ہماری طرف سے عیادت کرنا تھی۔“

”مگر عالی جاہ! شہزادہ کلائڈ کل رات۔۔۔؟“  
 ”کل رات اس نے اتنی پی لی تھی کہ اسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا تھا۔ یہی کہنا چاہتے ہوئے۔“ شاہ ترشی سے بولا۔ ”اسے اب تک ہوش آیا کہ نہیں جاؤ اسے ہمارے پاس بھیجو۔“

”عالی جاہ! شہزادہ کلائڈ رات سے غائب ہے۔“ سپہ سالار نے ہمت کر کے کہہ دیا۔  
 ”نظر ڈالو ورنہ ذلت اور رسوائی تمہارا مقدر بن جائے گی؟“  
 ”میں شرمندہ ہوں شہنشاہ! میں یقین دلاتا ہوں کہ۔۔۔“

”تمہاری شرمندگی شہزادی جینالو کے زخموں کا مرہم نہیں بن سکتی۔“ شہنشاہ نے قطع کلام کیا۔ ”ہم مجبوراً تمہارا مقدمہ اپنی عدالت سے خارج کرتے ہیں لیکن شاید معاملہ دب نہ سکے۔ شہزادی اپنے شاہ یا تمہارے شاہ یروٹلم سے فریاد کر سکتی ہے۔ اگر شہزادی نے یہ خطرناک قدم اٹھایا تو جاننے ہو اس کا کیا نتیجہ ہوگا۔ شاہ انطاکیہ اور شاہ یروٹلم میں اختلاف پیدا ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ ہمارے یہ دونوں حلیف ایک دوسرے سے لڑ پڑیں پھر اس کا مکرے کا کیا ہوگا۔ کیا ہمارے عزائم خاک میں نہ مل جائیں گے۔“

”شہنشاہ! مجھے اجازت دی جائے کہ میں شہزادی جینالو سے معافی مانگ لوں“ کلائڈ نے لاٹری درخواست کی۔

”ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔“ شہنشاہ نے شہزادی جینالو کو دیکھا۔ ”اگر شہزادی سچے دل

بھی یہ دونوں چاندنی کا لطف اٹھانے خیمے سے نکلے تھے کہ ان کی مدد بھیڑ شہزادہ شہزادی جینالو سے ہو گئی۔

رات ختم ہو گئی اور صبح کا سورج بلند ہوا تو شاہ بالڈون والٹی یروٹلم کے کلائڈ کی اور زیادہ فکر ہوئی ان کا خیال تھا کہ شہزادہ کلائڈ شراب کے نشے میں کسی کنیز یا رقاصہ کے خیمے میں پڑا ہوگا اور صبح ہوتے ہی اپنے خیمے میں واپس آجائے گا۔ کلائڈ اب تک واپس نہ آیا تھا اور اسے تلاش کرنے والے تھک ہار کے بیٹھے شاہ بالڈون کے سپہ سالار کے لیے کلائڈ کی گمشدگی کو چھپانا اب مشکل ہو گیا تھا۔ یہ ضروری خیال کیا کہ شاہ کو اس خبر بد اثر سے آگاہ کر کے اپنی پوزیشن صاف کر کے خیمے پر پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ شاہ کی طبیعت اب بحال ہے۔ اور انہوں نے معمول صبح کا پورا ناشتہ کیا ہے۔ سپہ سالار ڈرتا خیمے میں داخل ہوا اور شہنشاہ کو کور کیا۔

”سالار! شاہ بالڈون مسکرایا۔“ ہمیں افسوس ہے کہ ہم رات دعوت میں کر سکے۔ ہمارے دوستوں نے ہماری کم تو ضرور محسوس کی ہوگی؟“  
 ”جی عالی جاہ!“ سپہ سالار نے خوشامد کے انداز میں کہا۔ شاہ انطاکیہ، شاہ شاہ طرابلس، عالی جاہ کو بار بار پوچھ رہے تھے۔ سب کہہ رہے تھے کہ عالی جاہ کی عدم کی وجہ سے محفل کا لطف آدھا رہا گیا۔“

”ہاں سالار!“ شاہ بالڈون نے ایک سرد سانس بھری۔ ”ہم کیا کریں پتہ نہیں کل کیا ہو گیا تھا بستر سے اٹھنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ خیر تم۔۔۔ تم نے اور محفل کو سنبھال تو لیا ہوگا۔ کسی کو شکایت کا موقع تو نہیں ملا ہم نے کلائڈ کو خاص تھی۔“

”عالی جاہ! آپ کی دعوت میں کسی کو شکایت ہو سکتی ہے۔“ سپہ سالار نے چاہا۔ ”دعوت کا اختتام پر سب نے فردا“ فردا“ دعوت کے اعلیٰ انتظام کی تعریف کی اور کی عدم موجودگی پر اظہار افسوس کیا تھا۔“  
 شاہ بالڈون ایک لمحہ خاموش رہا پھر بولا۔ ”شہنشاہ قسطنطنیہ جان کا منی نس کا تو نے خاص خیال رکھا ہوگا۔ انہوں نے ہماری اچانک بیماری اور دعوت کے بارے تبصرہ کیا؟“

”عالی جاہ! رات کو کچھ عجب اتفاق ہوا۔“ سپہ سالار نے سانس لے کر اپنے سنبھالا۔ ”ادھر آپ کی طبیعت نا ساز ہوئی ادھر شہنشاہ عالی جاہ بیمار پڑ گئے۔ انہو بہت معذرت کی تھی۔“



سے ہمیں معاف کر دے تو یہ بات ہمیں پر ختم ہو سکتی ہے۔“

”شہنشاہ عالی مقام!“ شہزادی نے تیز نظروں سے کلائیڈ کو دیکھا۔ ”دروندے کے خون لگ جائے تو وہ بار بار حملہ کرتا ہے میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ شاہ انطاکیہ کی روٹھم کے درمیان اختلاف پیدا ہو۔ اس لیے میں کسی اور کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کروں گی لیکن کلائیڈ نے میری جو بے عزتی کی ہے اسے میں نہیں بھلا سکتی اور نہ ہی معاف کروں گی۔“

”ہم شہزادی کو کسی بات پر مجبور نہیں کرتے۔“ شہنشاہ نے پہلو بدلا۔ ”کلائیڈ کی اجازت دی جاتی ہے اور شہزادی جینالو کو حفاظت کے ساتھ شاہ انطاکیہ کی خبر پہنچا دیا جائے۔“

کلائیڈ اجازت ملتے ہی سر پر پیر رکھ کر ایسا بھاگا کہ اس نے اپنے خیمے میں جا لیا۔ شہزادی جینالو بری پڑمرہ ہو رہی تھی۔ اس نے کھڑے ہو کر شہنشاہ کو سلام کیا۔ شہنشاہ کی شکر گزار ہوں مگر میں کلائیڈ سے بدلہ لیے بغیر نہ رہوں گی۔

”میں شہنشاہ کے حکم کی تعمیل کروں گی۔“ شہزادی چلنے کے لیے تیار ہو گئی۔ ”تم جو چاہو کر سکتی ہو شہزادی!“ شہنشاہ نے کہا ”لیکن بدلہ لیتے وقت اس پر ضرور خیال رکھنا کہ انطاکیہ اور یروٹھم کے لشکر آپس میں نہ ٹکرانے پائیں۔ اس کے علاوہ شہزادی کے باپ کو گھنگو میں مصروف کر کے شہزادی کو موقع فراہم کیا کہ وہ سرم سب کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”اسد الدین! شہزادی کو ان کی لشکر گاہ تک پہنچانے کی ذمہ داری تمہارے ہوتی ہے۔“ شہنشاہ نے پلٹ کر اسد الدین سے کہا۔ ”اگر شاہ انطاکیہ کو اس واقعے کی خبر ہو چکی ہو اور وہ تم سے اس سلسلے میں کوئی بات کریں تو تمہارا فرض ہے کہ ایسی بات ہرگز نہ نکالنا جس سے ہمارے وقار کی توہین ہوتی ہو۔ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ شہزادی مسلم خیمہ گاہ کی بجائے ہمارے لشکر میں رات گزاری ہے اور اس کی نگرانی ہم نے کی ہے۔“

”عالی جاہ کے حکم کی اسی طرح تعمیل ہوگی۔“

اسد الدین نے سرخم کر کے کہا اور بڑھ کر شہزادی کے پاس آگیا۔ اس نے کہا۔ ”شہزادی اگر اجازت ہو تو میں سرم کو اپنے ساتھ اپ کی خیمہ گاہ تک لے واپسی میں ہم دونوں باتیں کرتے آئیں گے اور دل بھل جائے گا۔“

شہزادی سمجھ گئی کہ اسد الدین نے اس پر پیار بھرا طنز کیا ہے پھر بھی وہ انکار نہ کی۔ ”سردار کی مرضی ہے، وہ جسے چاہیں ساتھ لے سکتے ہیں۔“

شہزادی جینالو نے شہنشاہ قسطنطنیہ کی بات گمراہ میں باندھ لی تھی۔ وہ اپنے خیمے کی

اس نے کلائیڈ کی بات کو طول دیا اور یہ خبر شاہ انطاکیہ تک پہنچی تو ممکن ہے انطاکیہ اور یروٹھم کے لشکر ایک دوسرے کا خون بہانے پر آمادہ ہو جائیں آخر وہ بھی نصرانی شہزادی تھی، وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی قوم آپس میں ٹکرا کر ملیسوں کی کمزوری کا باعث ہو۔ اس لیے اس نے باپ کے پاس پہنچ کر کلائیڈ کی نازیبا حرکت کو محض اک اتفاقیہ حادثہ بنا کر پیش کیا اور تمام الزام اس کی میٹھواری پر ڈال دیا۔ اس طرح یہ معاملہ دب گیا اور اس کی اطلاع شاہ انطاکیہ کو نہیں ہو سکی۔

شہزادی اور اس کے باپ نے اسد الدین اور سرم کی بڑی خاطر مدارات کی۔ اسد الدین کی خاطر داری اس وجہ سے بھی کی گئی کہ وہ شہنشاہ قسطنطنیہ کا مقرب خاص تھا۔ تمام نصرانی والیان ریاست اس کی عزت کرتے تھے۔ ہر خیمہ گاہ اور مورچے میں اسد الدین کو گھومتے پھرنے کی کھلی آزادی تھی۔ شہزادی جینالو زیادہ تر سرم کی خاطر میں لگی رہی۔ ایک تو سرم نے اس کی مدد کی تھی۔ دوسرے اس دشمنی جو ان کی شخصیت نے شہزادی کے دل پر نقش کر لیا تھا۔ اسے سرم سے کھل کر گھنگو کا موقع نہ ملا تھا مگر اس کے خیمے میں اسے پوری آزادی تھی۔ اسد الدین خود بھی چاہتا تھا کہ سرم اور شہزادی دل کھول کر باتیں کر سکیں۔ وہ شہزادی کے باپ سے گھنگو میں مصروف ہو گیا۔ دوسرے الفاظ میں اسد الدین نے شہزادی کے باپ کو گھنگو میں مصروف کر کے شہزادی کو موقع فراہم کیا کہ وہ سرم سے خیمے میں گھنگو کر سکے۔

شہزادی اور سرم خیمے میں تنہا تھے مگر دونوں خاموش خاموش۔ بات شروع کرنے میں تاخیر ہوئی کی جھکی ہوئی نظریں تھوڑی دیر بعد اٹھتیں پھر ٹکرا کر جھک جاتیں شہزادی نے اسد الدین اور سرم کو دوپہر کے کھانے کے لیے روک لیا تھا مگر اس طرح خاموش بیٹھے رہنے سے وقت بڑی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ آخر شہزادی نے خاموشی کا قص توڑا۔ ”آپ کا نام شاید سرم ہے؟“

”شاید نہیں میں یقیناً سرم ہوں۔“ سرم مسکرایا۔ ”مگر آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”آپ کے سردار نے اسی نام سے آپ کو مخاطب کیا تھا۔“ شہزادی بھی مسکرا دی۔

اس کے بعد پھر دونوں خاموش ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا بات کریں۔ شہزادی نے پھر حوصلہ کیا۔ ”خاموشی بری بری چیز ہے۔ مجھے اس سے ابھرن ہوتی ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں خود بھی زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکتا۔“

”تو کیا پھر یہ اچھا نہ ہوگا کہ ہم کچھ نہ کچھ باتیں کرتے رہیں۔“

”شنزادی کا خیال نیک ہے۔ میں باتیں کرنے پر تیار ہوں۔“

”تو پھر باتیں کیجئے نا۔“

”ہاں باتیں کیجئے۔۔۔ ضرور کیجئے۔“

شنزادی پھر الجھ گئی۔ کیا باتیں کی جائیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ آخر

اسے سارا دیا۔ اس نے پوچھا۔ ”آپ نے اپنے والد محترم سے کلائیڈ کے بارے میں ہوگا تو انہیں غصہ تو بہت آیا ہوگا۔“

شنزادی مسکرائی۔ ”شکر ہے آپ نے گفتگو کا کوئی موضوع تو تلاش کر لیا۔“

”پھر گفتگو شروع کیجئے۔ میں آپ کے جواب کا انتظار کر رہا ہوں۔“ سرم نے

دکھائی۔

”دیکھو سرم!“

”میں اس بے تکلفی کے لیے شنزادی کا شکر گزار ہوں۔“ سرم نے پر شوق سے شنزادی کو دیکھا۔

”میں چاہتی ہوں کہ تم بھی اسی طرح بے تکلف ہو جاؤ۔“ شنزادی نے ہنسنے

کہا۔ ”مجھے شنزادی کی بجائے اگر جینا لویا جینا کہہ کر مخاطب کرو تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔“

”میں جینا کے حکم کا خیال رکھوں گا۔“

”اچھا تو کس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی تھی۔۔۔۔؟“ شنزادی نے مصو

پوچھا۔

سرم کو اس کی مصویت بہت پیاری لگی۔ ”موضوع کلائیڈ ہے جینا۔“

شنزادی ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ ”سرم! یہ ہمارا قومی مسئلہ ہے۔ شہنشاہ

خواہش کی تھی کہ میں اس بات کو طول نہ دوں ورنہ نصرانی دوسرے نصرانی کا خون

لگے گا۔ اس سے ہماری نصرانی قوم کو نقصان پہنچے گا۔ میں اپنی قوم کو کمزور نہیں

چاہتی۔۔۔۔ اس لیے میں نے اپنے باپ کو سمجھا بچا کے خاموش کر دیا ہے۔ وہ بھی

طرح اپنی قوم کے ہمدرد ہیں۔“

سرم اس کی سنجیدہ گفتگو سن کر پریشان ہو گیا۔ اسے کوئی جواب نہیں سوجھا۔

شنزادی نے چند لمحے انتظار کے بعد کہا۔ ”سرم! خاموش کیوں ہو۔ کیا تمہیں

قدم پسند نہیں آیا؟“

”نہیں یہ بات نہیں جینا۔“ سرم جلدی سے بولا۔ ”تم نے معا ملہ کرنا

قوم کی خدمت کی ہے، مجھے تمہارے اقدام سے بہت خوشی ہوئی ہے۔“

شنزادی نے سرم کو پریشان دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید کلائیڈ کو اس طرح معاف کر دینا

سرم کو اچھا نہیں معلوم ہوا۔ اس نے اپنی صفائی میں دلیل دی۔ ”سرم سچ بتاؤ اگر تم

میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے۔ تم مسلمان ہو۔ اگر مسلمان دوسرے مسلمان سے ٹکرا جائے

تو ہمیں ضرور صدمہ ہوگا۔ کیا میں نے غلط کہا ہے؟“

”تم نے درست کہا ہے جینا۔“ سرم نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہر شخص اپنی قوم کا

ہمدرد ہونا ہے تمہاری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا لیکن میرا اپنا معاملہ اس سے مختلف ہے۔

بعض اوقات بھائی کو بھائی کا گلا کاٹنے دیکھ کر خاموش رہنا پڑتا ہے۔“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ سکی سرم!“ شنزادی جینا لویا لہجے لگی۔

”مطلب صاف ہے جینا!“ سرم نے بوے دکھ سے کہا۔ ”کیا تم دیکھتی نہیں کہ میرا

بادشاہ مجید الدین مسلمان ہے اور وہ نصرانی لشکر کے ساتھ قلعہ شیزار کا محاصرہ کیے ہوئے

ہے۔ قلعہ کا حاکم بھی تو ایک مسلمان ہی ہے۔ کیا یہ بات قومیت کے خلاف نہیں؟“

”سرم! مجھے افسوس ہے کہ میری بات سے تمہیں تکلیف پہنچی ہے۔“ شنزادی نے

نوراؔ بات بتائی۔ ”یقین کرو سرم! تمہارا دل دکھانے کے لیے یہ بات ہرگز نہیں کہی تھی۔

میں اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں۔“

شنزادی کی خوب صورتی کے ساتھ اس کی مصویت بھی سرم کے دل و دماغ پر چھاتی

چلی جا رہی تھی۔ جینا لویا کا تعلق انطاکیہ کے شاہی گھرانے سے تھا مگر اس میں ذرا بھی غرور

نہ تھا۔ سرم کے ساتھ گفتگو کے دوران وہ بالکل ایک عام گھریلو لڑکی معلوم ہوتی تھی۔

برخلاف اس کے کہ سرم کسی بوے گھرانے سے نہ تھا۔ اس کا آبائی پیشہ سپہ گری تھا اور وہ

اپنے اس پیشہ پر فخر کرتا تھا۔ سرم کا باپ دمشق کے موجودہ بادشاہ مجید الدین کے والد کے

وقت میں شاہی محافظ دستے میں محض پانچ سواروں کا سردار تھا لیکن جب ایک موقع پر وہ شاہ

وقت کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان گنوا بیٹھا تو اس کے خاندان کی وقعت بڑھ گئی اور

حکم دیا گیا کہ اس خاندان کے ہر فرد کو شاہی محافظ دستوں میں شامل کیا جائے۔ اپنے باپ

کی جال شادی کے طفیل ہی سرم کو شاہی محافظوں میں ملازمت ملی تھی۔

شنزادی جینا لویا کی لہراتی زلفوں اور کٹورا جیسی بڑی آنکھوں میں دوسرے سرم کا دل

ڈول رہا۔ ان کی باتوں کا موضوع بدلتا رہا مگر جب بھی آنکھیں چار ہوتیں دونوں طرف سے

ایک ہی پیغام ہوتا اور وہ پیغام تھا پیار و محبت کا۔ شنزادی اپنے وقار کو بھول کر اس کی محبت

کے سائے میں سانس لیتی رہی اور سرم بے خودی کے عالم میں بنا کی۔ مسکراہٹوں میں

کھویا رہا۔ ادھر اسد الدین شترادی کے باپ کو گفتگو میں مصروف رکھے ہوئے تھا کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو اس نے سرم کو بلوایا۔

کھانے پر بھی سرم اور شترادی کی دہلی دہلی گفتگو جاری رہی۔ اسد الدین کو خطرہ کہیں شترادی کے باپ کو سرم اور شترادی کی گفتگو ناگوار نہ گزرے مگر اس کا یہ خیال ثابت ہوا۔ شترادی کا باپ بھی درمیان درمیان میں ان دونوں کی گفتگو میں دخل دے کبھی کبھی زور زور سے قہقہے بھی لگاتا۔ کھانے کے بعد سرم اور شترادی جینالو روایتی نام کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ دونوں کے چہرے فق تھے اور زبان لڑکھاتی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہے ہیں یا کسی ایسے محاذ جنگ پر جا رہا ہے جہاں سے واپسی کی بہت کم امید تھی حالانکہ دشمن انطلاک کی خیمہ گاہوں کا درمیانی فاصلہ اتنا کم تھا کہ بغیر گھوڑے پر سوار ہوئے پیدل طے کیا جا سکتا تھا۔ شترادی نے اسی شام کو سرم سے اس کے خیمے میں ملنے کا وعدہ کیا تھا مگر سرم پھر بھی گھبرایا ہوا تھا اور وقت رخصت شترادی کو بڑی حسرت ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

بزاع اور کفر تاب کی تباہی نے زنگی دربار میں قیامت پیا کر دی۔ ان علاقوں کی آبادی کو نصرانی لشکر نے تہ تیغ کر دیا تھا۔ چند آدمی جو جان بچا کر بھاگ نکلے تھے انہوں نے سیدھے زنگی دربار کا رخ کیا۔ امیر زنگی نصرانیوں سے معاہدہ کرنے کے بعد بڑی سے جنگی تیاریاں کر رہا تھا لیکن جس وقت بزاع اور کفر تاب کے تباہ حالوں نے دربار پہنچ کر نصرانیوں کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی تو ہر آنکھ آبدیدہ ہو گئی۔ بعض لوگوں نے چنیں تک نکل گئیں۔ ہر طرف جہاد جہاد اور انتقام انتقام کی صدا اٹھنے لگی۔ امیر زنگی کو یہ تو خیال تھا کہ نصرانیوں کا یہ سیلاب کچھ نہ کچھ آفت ضرور لائے گا لیکن یہ اس کے تصور میں بھی نہ تھا کہ معاہدے کے فوراً بعد نصرانی بزاع اور کفر تاب مسلم علاقوں کو خاستہ کر کے رکھ دیں گے۔ اس کا خون کھول کے رہ گیا۔ اس کے بڑے جوش میں تھے اور جہاد کے نعرے لگا رہے تھے۔ امیر نے بڑی مشکل سے ان کا ٹھنڈا کیا۔ اور صلاح و مشورے ہونے لگے۔ امیر زنگی، نصرانیوں سے معاہدہ کرتے ہوئے بچکا رہا تھا اور نصرانیوں کے خلاف فوراً جہاد کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے مشیر اور جاسوس اسد الدین۔۔۔۔ جو شہنشاہ قسطنطنیہ کے لشکر میں موجود تھا۔۔۔۔ نے امیر کو معاہدہ کا مشورہ دے کر اسے تیاری کرنے کا موقع دیا تھا۔ امیر نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور اس وقت اس کے گرد ایک عظیم لشکر اکٹھا ہو گیا تھا جو اگرچہ نصرانیوں کے مقابلے میں ایک تہائی سے بھی کم تھا مگر لشکر کا جوش و جذبہ دیکھتے ہوئے امیر زنگی کو اپنی کامیابی

امید تھی۔ دوپہر تک مجلس مشورت جی رہی اور جنگی تدابیر پر غور ہوتا رہا۔ دوپہر کا کھانا صبح سے دوپہر تک مجلس مشورت جی رہی اور جنگی تدابیر پر غور ہوتا رہا۔ دوپہر کا کھانا امیر نے سرداروں کے ساتھ کھایا۔ اس کے بعد پھر گفتگو ہوئی۔ امیر نے ہر سردار کی بات غور سے سنی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ تمام سردار جوش جہاد سے سرشار ہو رہے ہیں اور اب انہیں مزید صبر کی تلقین کرنا مصلحت کے خلاف ہوگا۔ اسی وقت امیر کو اطلاع دی گئی کہ ایک سوار کسی دور دراز علاقے سے آیا ہے اور امیر سے فوراً ملاقات کا خواہش مند ہے۔ امیر نے اسے فوراً دربار میں طلب کر لیا۔

سوار بہت تھکا ماندہ معلوم ہوتا تھا۔ امیر نے اسے حکم دیا کہ شام تک آرام کرے۔ مشورت کی محفل کے بعد اس سے گفتگو کی جائے گی مگر سوار نے آرام کرنے سے انکار کر دیا اور بڑی بے خوفی سے بولا۔ ”اے امیر آپ مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں جب کہ میری ریاست، میرا قلعہ، میرا حاکم اور رعیت بے آرام اور بے سکون ہے۔ خدا را میری بات سنئے۔ اور جلد فیصلہ کیجئے ورنہ۔۔۔۔۔ ورنہ قیامت کی روز شہیدوں کی رو جس آپ کے گریباں میں ہاتھ ڈالیں گی اور داور محشر آپ کی غفلت کی باز پرس کرے گا۔“

سوار کی باتیں سن کر امیر عماد الدین زنگی کا پورا وجود ہل کے رہ گیا اور پورا دربار دم بخور ہو گیا۔ امیر نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ”اے اجنبی مسافر! میں اپنے کلام پر شرمندہ ہوں۔ جلد بتاؤ! مجھ سے کیا غفلت ہوئی ہے جس کے لیے تم مجھے حشر کا منظر دکھا رہے ہو؟“ ”اے امیر محترم!“ سوار نے سنبھل کر کہا۔ ”میں شاہ ابو عساکر حاکم قلعہ شیراز کا پیامبر ہوں۔ قلعہ شیراز کے گرد کے تمام مسلم علاقوں پر ظالم نصرانیوں کا قبضہ ہو گیا ہے اور ان کی قلعہ شکن سختیقتیں مسلمانوں کے بلند قلعے پر پتھر برس رہی ہیں۔ شاہ ابو عساکر نے آپ کو سلام اور اپنی دیرینہ دوستی کا واسطہ دیا ہے اور صاف الفاظ میں کہا ہے کہ اگر اسلام کا یہ قلعہ سرنگوں ہو گیا تو نصرانیوں کے ظالم ہاتھوں سے حلب کو کوئی نہ بچا سکے گا۔ آپ خدا کے خوف سے ڈریے اور فوراً شیراز کو بچانے کے لیے قدم بڑھائیے ورنہ شیراز اور حلب کا وہی حشر ہوگا۔۔۔۔۔ جو بزاع اور کفر تاب کا ہوا ہے۔“

امیر زنگی کے دربار میں اب تک تو بزاع اور کفر تاب کی تباہی کا رونا رویا جا رہا تھا۔ شیراز تک نصرانیوں کے پہنچنے کی خبر سے امیر زنگی چند لمحوں کے لیے بدحواس سا ہو گیا۔ شیراز کی تباہی کے بعد سلیسوں کو حلب اور امیر زنگی کے مستقر موصل تک پہنچنے سے کون روک سکتا تھا۔ امیر زنگی نے فوراً خود کو سنبھالا وہ کوئی اعلان کرنے ہی والا تھا کہ پہرے دار نے پھر حاضر ہو کر امیر کو ایک اور سوار کے آنے کی اطلاع دی۔ امیر نے اس سوار کو

بھی دربار میں بلا لیا۔ آنے والے سوار نے امیر کو ایسے غیر مایوس طریقے سے سلام کرنے کا ایک خاص طریقہ بتا دے تاکہ جب وہ امیر کے دربار میں پہنچے تو امیر اس کے سلام تمام درباری حیران رہ گئے۔ سلام کا یہ طریقہ موصل یا اس کے گرد و نواح میں راہی کا انداز دیکھ کر اسے فوراً شناخت کرے۔

مگر اس سلام کا امیر پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے درباریوں سے چند لہجوں کی اجازت طلب اور سوار کا ہاتھ بڑے دوستانہ انداز میں پکڑ کر ایک الگ کمرے میں چلا گیا۔

”اسد الدین کا کیا حال ہے اور اس نے کیا پیغام بھیجا ہے؟“ امیر نے بے چینی سے پوچھا۔

”اے امیر عالی مقام! سردار اسد الدین خیریت سے ہیں۔۔۔ اور انہوں نے دربار کی درخواست کی ہے کہ امیر فوری طور پر قلعہ شیزار کی مدد کو تشریف لائیں۔ نصرانیوں نے قلعہ محاصرہ کیا ہے اور اگر خدا نخواستہ یہ قلعہ نصرانیوں کے ہاتھ آگیا تو مسلم علاقوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔“

امیر زنگی کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ”نیا تم اسد الدین تک ہمارا پیغام پہنچا سکو“

”میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں امیر محترم!“ نووارد نے جواب دیا۔ ”سردار اسد الدین“

آپ کی آمد کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔“

”اسد الدین سے کہہ دینا کہ ہم جلد سے جلد شیزار پہنچ رہے ہیں۔“ امیر اس گفتگو کے بعد اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”امیر محترم! سردار نے ایک پیغام اور بھی دیا ہے۔“

”ہاں! ہاں ضرور کو۔“

”سردار نے دریافت فرمایا ہے کہ اگر امیر مناسب خیال فرمائیں، وہ موصل آجائیں۔“

”نہیں، نہیں۔ اسد الدین کا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ اگر ہم نے مناسب سمجھا تو پہنچ کے اس کے بارے میں کچھ فیصلہ کریں گے۔“

”بہتر ہے امیر! کیا اب مجھے واپس جانے کی اجازت ہے؟“

”بہتر تو یہ تھا کہ تم ہمارے ساتھ چلے اگر تمہیں جلدی ہے تو چوبیس گھنٹے آرام کرنا۔“

”واپس جاسکتے ہو۔“

اسد الدین کو جب امیر زنگی نے قسطنطنیہ کے دربار میں بھیجا تھا تو اسے کچھ غلط فہمی تھی کہ اسد الدین نے یہ بات پہلے ہی سوچ لی تھی کہ اسد الدین کی مصیبت میں بھی پڑ سکتا ہے۔ اس کے لیے امیر نے اسے سمجھایا تھا کہ اگر وہ گرفتار جائے یا کوئی خاص پیغام بھیجنا چاہے تو جس شخص کو اس کام کے لیے مقرر کرے اسے

اسد الدین کو جب امیر زنگی نے قسطنطنیہ کے دربار میں بھیجا تھا تو اسے کچھ غلط فہمی تھی کہ اسد الدین نے یہ بات پہلے ہی سوچ لی تھی کہ اسد الدین کی مصیبت میں بھی پڑ سکتا ہے۔ اس کے لیے امیر نے اسے سمجھایا تھا کہ اگر وہ گرفتار جائے یا کوئی خاص پیغام بھیجنا چاہے تو جس شخص کو اس کام کے لیے مقرر کرے اسے

اسد الدین کو جب امیر زنگی نے قسطنطنیہ کے دربار میں بھیجا تھا تو اسے کچھ غلط فہمی تھی کہ اسد الدین نے یہ بات پہلے ہی سوچ لی تھی کہ اسد الدین کی مصیبت میں بھی پڑ سکتا ہے۔ اس کے لیے امیر نے اسے سمجھایا تھا کہ اگر وہ گرفتار جائے یا کوئی خاص پیغام بھیجنا چاہے تو جس شخص کو اس کام کے لیے مقرر کرے اسے

موقع نہ دیا جائے اور ان پر فوراً حملہ کر دیا جائے مگر امیر نے ان کی رائے سے انحراف نہ کیا اور قلعے سے کئی فرسنگ پہلے لشکر کو ڈیرے ڈالنے کا حکم دیا پھر اس نے چند سواریاں لشکر بھیج کر ان کے مقابلہ آگے روانہ کیا تاکہ وہ دشمن کی پوزیشن کا صحیح اندازہ لگائیں۔ ان جاسوس سواروں نے دشمن کی خیمہ گاہوں تک چکر لگایا اور چھ گھنٹے بعد جب وہ واپس آئے تو امیر نے سامنے ایک نیا انکشاف کیا۔

”اے امیر! نصرانیوں کے لشکر نے پہاڑیوں میں بڑے مضبوط اور محفوظ مورچے بنائے ہیں ان کا جو لشکر میدانی حصے کی طرف ہے۔ اس نے خندقیں کھود لی ہیں اور فرید و فروخت کا بازار گرم ہوتا۔ راتیں جانتیں اور شراب اور کباب کی محفلیں جتیں۔ چٹانوں پر تیر اندازوں کے پرے جے ہوئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نصرانی لشکر جنگ لڑنا چاہتا ہے۔“

یہ اطلاع امیر زنگی کے لیے بڑی پریشان کن تھی، پھر بھی اس نے ہمت نہیں ہاری اور میدان میں خندقیں کھود کر مورچے بنانے پڑے۔ دوسرے دن اس کی سواروں اور پیادہ فوج کے چھوٹے چھوٹے دستے قائم کر کے نصرانی لشکر پر عام حملے کا ارادہ کر دیا۔ اس نے دستور کے مطابق پہلے طبل جنگ بجوایا اور نصرانیوں کو میدان میں

مقابلے کی دعوت دی مگر دوسری طرف بالکل خاموشی طاری رہی۔ امیر دوپہر تک نصرانیوں کے میدان میں آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن ان کا ایک سوار بھی پہاڑیاں چھوڑے آیا۔ آخر امیر نے چاروں طرف سے اپنے دستوں کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جب اس کے سوار چٹانوں کے قریب پہنچے تو اوپر سے تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ ہتھیاروں سے لڑنے والے تھے۔ ان کا رخ بھی امیر کے لشکر کی طرف تھا اور من من بھر کے بھاری پتھر امیر کے سواروں پر گرنے لگے۔ امیر نے فوراً واپس دیا اور اس کے دستے مورچوں میں واپس آگئے۔ امیر زنگی تمام دن اور پوری رات صورت حال پر غور اور مشورہ کرتا رہا مگر کوئی حکمت عملی سمجھ میں نہ آئی۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی آگے بڑھنے کی کوشش کی لیکن اسے چنداں کامیابی نہ جس وقت امیر کے دستے آگے بڑھتے اسی وقت قلعے کے اوپر سے بھی نصرانیوں بھاری پتھر پھینکتے جاتے مگر نصرانیوں نے ایسے محفوظ مورچے قائم کیے تھے کہ ان پر اثر نہ ہوتا۔

امیر زنگی کے روزانہ حملوں کا یہ اثر ضرور ہوا کہ نصرانیوں کے لشکر کی توجہ قلعے سے ہٹ کر امیر زنگی کی طرف ہو گئی اور قلعہ نصرانی حملے سے محفوظ ہو گیا۔ اسی طرح دن بعد میدان جنگ کی یہ صورت ہو گئی کہ نصرانی لشکر تو قلعہ شیزار کو گھیرے ہوئے

نصرانی لشکر کے گرد امیر زنگی نے گھیرا ڈال رکھا تھا کہنے کو تو جنگ کا تقاریر روز بچتا۔ اسلامی لشکر بھی آگے بڑھتا مگر بے مقصد۔ نصرانی لشکر کسی صورت میں میدان میں نکل کے مقابلہ کرنے پر تیار نہ ہو رہا تھا اور امیر زنگی کے لیے یہ تقریباً ناممکن تھا کہ اس قدر عظیم لشکر کو ان کے مورچوں سے باہر نکال دیتا۔

نصرانیوں کے اگلے مورچوں کی پشت پر پہاڑیوں کے دامن میں کاروبار زندگی جاری تھا۔ خیمہ گاہوں میں لوگ آزادی سے گھومتے پھرتے تھے۔ دن میں کافی دکانیں لکٹیں اور خرید و فروخت کا بازار گرم ہوتا۔ راتیں جانتیں اور شراب اور کباب کی محفلیں جتیں۔ لاطینی شاہ اور شہزادے راگ و رنگ میں مصروف رہتے۔ نصرانی لشکر کے ساتھ سامان رسد کی اس قدر فراوانی تھی کہ اگر باہر سے اسے کچھ نہ ملتا تو بھی وہ چھ سات ماہ تک اپنا گزارہ کر سکتا تھا۔ امیر زنگی کا خیال تھا کہ اگر محاصرہ طویل کھینچ گیا تو نصرانی لشکر میں سامان رسد کی کمی واقع ہوگی اور وہ میدان میں نکلے گا مگر اس کا یہ خیال، خیال ہی رہا اور اس طرح ایک ماہ کا عرصہ گزر گیا۔

امیر زنگی کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ نصرانی اس طرح جم گئے تھے جیسے وہ ان پہاڑوں میں ہمیشہ کے لیے آباد ہو گئے ہیں۔ دونوں لشکروں کے آمنے سامنے ہونے سے قلعہ شیزار اور اسد الدین سے امیر زنگی کا رابطہ بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ نصرانی لشکر بڑی تندی سے اپنے چاروں طرف نظریں رکھے ہوئے تھے۔ رات کے وقت ان کا پہرہ زیادہ سخت ہو جاتا تھا۔ اسد الدین نے کئی بار کوشش کی کہ وہ امیر کو نصرانی لشکر کے حالات سے آگاہ کرے مگر وہ سخت پہرے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکا۔

سرم اور شہزادی جینالو کی ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ روزانہ جھڑپوں کی وجہ سے انہیں کچھ زیادہ ہی موقع مل گیا تھا۔ شہزادی کا باپ صبح ہوتے ہی شاہ انطاکیہ کے خیمے میں چلا جاتا اور شاہ انطاکیہ اسے ساتھ لے کر شہنشاہ قسطنطنیہ کے دربار میں حاضری دیتا تھا۔ شہنشاہ کا خیمہ پہلی جگہ سے ہٹا کر زیادہ محفوظ جگہ پر نصف کیا گیا تھا۔ اس کے دربار میں تمام لاطینی بادشاہ روز حاضر ہوتے تھے۔ میدان جنگ میں صرف جنگ کی باتیں ہوتی ہیں لیکن تمام لاطینی بادشاہ جنگ پر بہت کم تبصرہ کرتے۔ ان کی باتیں عام طور پر ذاتیات تک محدود ہوتی تھیں۔ چونکہ جنگ محدود پیمانے پر ہو رہی تھی۔ اس لیے انہیں جنگ کی بالکل فکر نہ تھی۔ وہ کہیں ہانکتے، شراب پیتے اور ایک دوسرے کی بدگوئی کرتے تھے۔ شہزادی جینالو اور شاہ انطاکیہ کا واقعہ ایسا سنگین تھا کہ یروشلیم کے شاہ بالڈون کو اس کے بارے میں تحقیقات کرنا کامیاب تھی۔ اسد الدین نے شہنشاہ کو بتایا تھا کہ کلائیڈ کی کمپنی حرکت کی اطلاع شاہ

یروشلیم کو مل گئی ہے مگر اس نے کلائیڈ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔  
 حوصلے اور بڑھ گئے تھے اور وہ ہر محفل میں اسی قسم کی سوچا نہ حرکتیں کر رہا تھا۔  
 اس دو طرفہ مگر محدود جنگ میں شہنشاہ قسطنطنیہ کی جنگی حکمت عملی بری عجیب  
 شہنشاہ نے دونوں مورچوں پر اپنا لشکر لگا رکھا تھا خاکینہ، طرابلس، اڈیسہ یا یروشلیم  
 سوار بھی اس جنگ میں شامل نہ تھا۔ شہنشاہ نے لاطینی لشکریوں کو خیمہ گاہوں میں لے کر  
 حکم دیا تھا۔ بظاہر شہنشاہ نے سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ ابھی کوئی بڑی جنگ  
 ہو رہی ہے اور وہ موصل کے لشکر کو تھکا رہا ہے اس لیے لاطینی لشکر کو آرام کرنے  
 جس وقت میدان کارزار گرم ہوگا۔۔۔ لاطینی لشکر بھی جنگ میں شریک ہو جائے گا۔  
 شہزادی جینالو نے اپنی تقریحات اور نیک و دو کو سرم کے خیمے تک محدود کر رکھا۔  
 باپ کے جانے کے بعد جینا تیر کی طرح سرم کے خیمے میں پہنچ جاتی پھر جو باتوں کا ذکر  
 ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا۔ سرم شاہ دمشق کے محافظ دستے میں شامل تھا۔ اسے دن  
 صرف آٹھ گھنٹے شہنشاہ دمشق کے خیمے کے اندر باہر سپرد دینا ہوتا تھا لیکن شاہ دمشق  
 اس وقت نو عمر تھا اور سرم کا بھی عنوان شباب تھا اس لیے آقا اور غلام کا رشتہ دوڑنے  
 بدل گیا تھا اور سرم بادشاہ کا مصاحب اور ہم پالہ، ہم نوالہ ہو گیا تھا۔ اس بات کا  
 لوگوں کو بھی تھا اس لیے اگر سرم اپنی محبوبہ شہزادی جینالو سے گفتگو کرتے وقت اس  
 سے بھی غیر حاضر ہو جاتا تو اس سے کوئی باز پرس نہ ہوتی۔ شاہ کو معلوم تھا کہ سرم کو  
 امیر زنگی کے باقی سردار اسد الدین میں گہری چھٹی ہے اس لیے اس نے سرم کو اور  
 دے رکھی تھی۔ بظاہر حکومت دمشق اور حکومت موصل میں شدید اختلاف  
 اختلاف دراصل موصل کے امیر زنگی اور دمشق کے وزیر معین الدین انز کے درمیان  
 شاہ دمشق مجیر الدین کا اس اختلاف اور دشمنی سے کوئی تعلق نہ تھا مگر حکومت کی  
 اصل میں انز کے ہاتھ میں تھی اور مجیر الدین محض ایک کٹھ پتلی بادشاہ تھا اس لیے  
 اپنے وزیر کا ہر مشورہ ماننا پڑتا۔ حالانکہ شاہ دمشق، امیر زنگی کی مبادری اور فرات  
 سے قدر دان تھا۔

جس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اسلامی علاقوں کی طرف بڑھانے  
 بادشاہ نے اپنے وزیر سے درخواست کی تھی کہ وہ بجائے نصرانی شہنشاہ کے مسلم امیر  
 ساتھ دے تاکہ مسلم دشمن طاقتوں کو پیچھے دھکیلا جاسکے۔ وزیر چونکہ امیر زنگی کا  
 اس لیے وہ دمشق لشکر لے کر شہنشاہ قسطنطنیہ جان کامنی نس کی خیمہ گاہ میں  
 اور شہنشاہ کو اپنی دوستی کا یقین دلایا۔ شہنشاہ کو دراصل اپنے لاطینی حلیفوں ہی پر  
 یروشلیم کو مل گئی ہے مگر اس نے کلائیڈ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔  
 حوصلے اور بڑھ گئے تھے اور وہ ہر محفل میں اسی قسم کی سوچا نہ حرکتیں کر رہا تھا۔  
 اس دو طرفہ مگر محدود جنگ میں شہنشاہ قسطنطنیہ کی جنگی حکمت عملی بری عجیب  
 شہنشاہ نے دونوں مورچوں پر اپنا لشکر لگا رکھا تھا خاکینہ، طرابلس، اڈیسہ یا یروشلیم  
 سوار بھی اس جنگ میں شامل نہ تھا۔ شہنشاہ نے لاطینی لشکریوں کو خیمہ گاہوں میں لے کر  
 حکم دیا تھا۔ بظاہر شہنشاہ نے سب کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ ابھی کوئی بڑی جنگ  
 ہو رہی ہے اور وہ موصل کے لشکر کو تھکا رہا ہے اس لیے لاطینی لشکر کو آرام کرنے  
 جس وقت میدان کارزار گرم ہوگا۔۔۔ لاطینی لشکر بھی جنگ میں شریک ہو جائے گا۔  
 شہزادی جینالو نے اپنی تقریحات اور نیک و دو کو سرم کے خیمے تک محدود کر رکھا۔  
 باپ کے جانے کے بعد جینا تیر کی طرح سرم کے خیمے میں پہنچ جاتی پھر جو باتوں کا ذکر  
 ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا۔ سرم شاہ دمشق کے محافظ دستے میں شامل تھا۔ اسے دن  
 صرف آٹھ گھنٹے شہنشاہ دمشق کے خیمے کے اندر باہر سپرد دینا ہوتا تھا لیکن شاہ دمشق  
 اس وقت نو عمر تھا اور سرم کا بھی عنوان شباب تھا اس لیے آقا اور غلام کا رشتہ دوڑنے  
 بدل گیا تھا اور سرم بادشاہ کا مصاحب اور ہم پالہ، ہم نوالہ ہو گیا تھا۔ اس بات کا  
 لوگوں کو بھی تھا اس لیے اگر سرم اپنی محبوبہ شہزادی جینالو سے گفتگو کرتے وقت اس  
 سے بھی غیر حاضر ہو جاتا تو اس سے کوئی باز پرس نہ ہوتی۔ شاہ کو معلوم تھا کہ سرم کو  
 امیر زنگی کے باقی سردار اسد الدین میں گہری چھٹی ہے اس لیے اس نے سرم کو اور  
 دے رکھی تھی۔ بظاہر حکومت دمشق اور حکومت موصل میں شدید اختلاف  
 اختلاف دراصل موصل کے امیر زنگی اور دمشق کے وزیر معین الدین انز کے درمیان  
 شاہ دمشق مجیر الدین کا اس اختلاف اور دشمنی سے کوئی تعلق نہ تھا مگر حکومت کی  
 اصل میں انز کے ہاتھ میں تھی اور مجیر الدین محض ایک کٹھ پتلی بادشاہ تھا اس لیے  
 اپنے وزیر کا ہر مشورہ ماننا پڑتا۔ حالانکہ شاہ دمشق، امیر زنگی کی مبادری اور فرات  
 سے قدر دان تھا۔

جس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ اسلامی علاقوں کی طرف بڑھانے  
 بادشاہ نے اپنے وزیر سے درخواست کی تھی کہ وہ بجائے نصرانی شہنشاہ کے مسلم امیر  
 ساتھ دے تاکہ مسلم دشمن طاقتوں کو پیچھے دھکیلا جاسکے۔ وزیر چونکہ امیر زنگی کا  
 اس لیے وہ دمشق لشکر لے کر شہنشاہ قسطنطنیہ جان کامنی نس کی خیمہ گاہ میں  
 اور شہنشاہ کو اپنی دوستی کا یقین دلایا۔ شہنشاہ کو دراصل اپنے لاطینی حلیفوں ہی پر

سرم تو ہر وقت احساس کمتری میں گرفتار رہتا تھا۔ شہزادی کی باتوں سے یہ تو معلوم نہ ہو





”تم چاہتے ہو کہ میں اپنے والد سے تمہارے بارے میں بات کروں؟“

”میں تو اور بھی بہت کچھ چاہتا ہوں جینا! سرم نے پیار سے بھرپور لہجے میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔ بات کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔“

”سرم! تم اس قدر غیریت کی باتیں نہ کیا کرو۔“ جینا نے بھی اسی انداز میں کہا۔ ”تمہارا کہنا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔“ ”میں تم سے یہ پوچھ رہی ہوں ان بگڑے ہوئے حالات میں کہیں میرا کتنا اثر الٹا اثر تو نہ کرے گا۔“

سرم ایک نیک فطرت سپاہی زادہ تھا۔ معاملے کی یہ تک پہنچنا اس کے لیے تھا۔ سادگی سے بولا۔ ”جینا! میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم کسی مصیبت میں اگر اس وقت کتنا مناسب نہ ہو تو انتظار کیا جا سکتا ہے، مجھے تمہاری باتوں اعتماد ہے۔“

”میں تمہارے اعتماد کو کبھی نہیں نہ جھٹے دوں گی۔“ جینا نے یقین دلایا۔ ”میر کا رخ دیکھ رہی ہوں اور کس مناسب موقع پر ابا جان سے بات کروں گی۔“ وہ دیکھ دیں گے۔ اس بارے میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن تمہیں یہ یقین ضرور دے گا کہ اب میں تم سے الگ نہیں رہ سکتی۔ میں دنیا کا ہر بندھن اور ہر قانون توڑ کر پاس پہنچ جاؤں گی۔“

”سرم کا چہرہ مسرت سے دکنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شہزادی بول پڑی میں سوائے تمہارے پاس آنے کے اور کہیں نہیں جاتی اس لیے جو بھی اہم خبر سے مجھے ضرور آگاہ کرنا تاکہ مجھے کوئی فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔“

”اطمینان رکھو جینا! میں تمہیں دم دم کی خبریں پہنچاتا رہوں گا۔“

سرم نے ایسا ہی کیا۔ نصرانی خیمہ گاہ کے حالات بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہے تھے اور سرم اس تبدیلی کی خبر شہزادی کو پہنچاتا رہتا تھا۔

امیر زنگی نے اسد الدین کے مشورے سے جو شگوفہ چھوڑا تھا، اس نے رگ امیر نے اچھی طرح اندازہ کر لیا تھا کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کے مضبوط پہاڑی مورخہ مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اس لیے اس نے اپنی حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کام اس نے یہ کیا کہ ایک قاصد شہنشاہ کے پاس بھیجا۔ قاصد کو امیر نے خوب بھیجا تھا اور اسے حکم دیا تھا کہ وہ شہنشاہ سے تمام لاطینی والیان ریاست کے بارے میں خبر لے کرے اور گفتگو کے دوران اس قدر سخت الفاظ استعمال کرے کہ شہنشاہ اور اس حواری اشتعال میں آجائیں۔

چنانچہ امیر کا قاصد سفید علم لے کر پہاڑیوں میں داخل ہوا۔ جنگی اصول

کے ساتھ حفاظت میں لے لیا گیا اور اس کے کہنے کے مطابق اسے شہنشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ قاصد کی تیوریوں پر پہلے ہی سے بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے پہلے تو یہ حرکت کی کہ شہنشاہ قسطنطنیہ کے سامنے بیچ کر اسے سلام تک نہیں کیا پھر فوراً بولنا شروع کر دیا۔

”میں نصرانی سپہ سالار کے پاس امیر عماد الدین زنگی والی موصول کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“

”نصرو! قاصد! شاہ یروشلیم بالڈون نے قاصد کو ٹوکا۔ بالڈون، شہنشاہ کے دائیں جانب ہاتھ دیا۔ اسے قاصد پر سخت غصہ آ رہا تھا کہ اس نے شہنشاہ کو سلام تک پیش نہیں کیا اور گفتگو کا آغاز کر دیا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”قاصد! کیا تمہارے امیر نے تمہیں اپنی آداب بھی نہیں سکھائے اس مجلس میں قابل احرام شہنشاہ قسطنطنیہ جان کا منی نس صرف فرما ہیں اور تم نے انہیں کورٹش تک نہیں پیش کیا؟“

قاصد نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”مجھے غلط سمجھا جا رہا ہے۔ میں امیر عالی مقام غیر نہیں بلکہ قاصد ہوں اور قاصد کا کام صرف پیغام سنانا ہوتا ہے۔ اگر پیغام نہیں سنا تو میں واپس جا رہا ہوں۔“

اسی وقت شہنشاہ نے دخل دیا۔ ”قاصد پیغام بیان کرے۔“

قاصد نے بڑے رعب سے کہا۔ ”امیر عالی مقام نے فرمایا کہ اگر نصرانی مقابلے کے آئے ہیں تو انہیں میدان میں نکل کر جنگ کرنا چاہیے اور اگر وہ صلح کر کے اپنے لشکر ماری گواروں سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم انہیں اسی طرح امان دینے پر تیار ہیں جس اہم نے ان کے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ امان کا وعدہ کیا ہے۔“

شہنشاہ نے حیرت سے قاصد کو دیکھا۔ قاصد! کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ ہمارے کسی نے تمہارے امیر سے صلح کی بات چیت کی ہے اگر ایسا ہے تو ہمیں اس سردار یا حکام بتایا جائے؟“

”نصرانی سپہ سالار کو معلوم ہونا چاہیے کہ امیر کا پیغام ختم ہو چکا ہے۔“ قاصد نے تلبیج میں کہا۔ ”مجھے صرف ہاں یا نہیں میں جواب چاہیے۔“

شہنشاہ تذبذب میں پھنس گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ بالڈون میں مورچے قائم کر کے مدافعتی جنگ اس کی حکمت عملی تھی۔ میدان جنگ سے وہ مصلحت کی بنا پر گریز کر رہا تھا مگر قاصد کی باتوں نے اسے شے میں ڈال دیا تھا۔ اس نے قاصد کو دیکھا کہ اس کے ساتھی درپردہ امیر سے کوئی معاہدہ کر رہے تھے۔

”قاصد! تم واپس جا سکتے ہو۔“ شہنشاہ نے مردہ آواز میں حکم دیا۔ ”اس پیغام کا جواب

تمہارے امیر کو بھیج دیا جائے گا۔  
قاصد اسی طرح بغیر سلام کیے اٹھا اور خیمے سے باہر نکل گیا۔ شہنشاہ نے  
قاصد کو حفاظت سے سوچوں کے باہر بچا دیا جائے۔

”میرے دوستوں اور ساتھیو! شہنشاہ نے قاصد کے جانے کے بعد لاطینی  
مخاطب کیا۔ ”مجھے بتایا جائے کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں جہاں تک میرا تعلق ہے۔  
لیے یہ واضح رہے کہ میں پاپائے روم کے حکم پر اور اس علاقے کے تمام بادشاہوں  
درخواست پر قسطنطنیہ سے اپنا لشکر لے آیا ہوں۔ میرے دل میں اپنے مظلوم نصرانی  
ہے جو مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے ہیں۔ میں مذہبی اور مقدس جنگ لڑ رہا ہوں  
لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ لوگ ایک طرف تو اپنے خیموں میں  
عشرت کی محفلیں جلاتے ہیں اور دوسری طرف اپنے سب سے بڑے دشمن امیرزنگی

چھپ چھپ کے صلح کی بات چیت کر رہے ہیں۔“

”یہ غلط ہے، بالکل جھوٹ ہے۔“ شاہ بالڈون نے احتجاج کیا۔ ”میں نے آج تک  
زنگی کے پاس اپنا کوئی آدمی نہیں بھیجا۔“

”شاہ بالڈون!“ شہنشاہ کو طیش آگیا۔ ”ہمیں صفائی کی ضرورت نہیں ہے۔  
ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک یہی کہے گا کہ اس نے امیرزنگی سے رابطہ قائم نہیں کیا۔  
آپ کے بیان کی تردید امیرزنگی کا قاصد پہلے ہی کر چکا ہے ہمیں تو صرف یہ بتایا جائے

آپ لوگ اس مقدس جنگ کو جاری رکھنا چاہتے ہیں یا نہیں؟“

بالڈون اور دوسرے لاطینی بادشاہ شہنشاہ جان کو بہت دیر تک یہ باور کرائے  
کرتے رہے کہ انہوں نے امیر سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا اور یہ کہ قاصد نے  
ہے۔ وہ واضح نہیں تھا اس لیے شہنشاہ اپنا دل صاف کر لیں مگر شہنشاہ کے پیش  
لیکچر مئی تھی وہ ختم نہ ہو سکی بلکہ ان کی باتوں سے اس کا شبہ یقین میں بدلتا گیا۔

اسدالدین اس گفتگو کے دوران بڑے غور سے باتیں سنتا رہا۔ اس نے محسوس کیا  
امیرزنگی نے اچھے وقت پر پانسہ پھینکا ہے شہنشاہ اور لاطینی بادشاہوں کی غلط فہمیاں

سامنے آگئی تھی اور لاطینی بادشاہوں کو شہنشاہ کی باتیں ناگوار گزری تھیں۔ اب  
اس بات کی تھی کہ اختلاف کی اس خلیج کو اور زیادہ وسیع کیا جائے اور لاطینی بادشاہوں

کان میں کوئی ایسی بات پھونکی جائے جس سے وہ بھڑک اٹھیں۔ اسدالدین کا ہر  
میں آنا جانا تھا اور شہنشاہ کا مشیر ہونے کی وجہ سے سب ہی اس کی عزت کرتے

اسدالدین اگر چاہتا تو وہ لاطینی بادشاہوں کے درمیان کوئی گل کھلا سکتا تھا مگر وہ  
اور اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ جس سے بننا ہوا کام

نصرانی لشکر قلعہ شیزار کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔۔۔۔ اور وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لیتا  
تھا۔ ادھر امیرزنگی نے ایک اور چال چلی۔ وہ اپنا لشکر شیزار سے ہٹا کر حمات لے آیا۔ اس  
طرح اس نے ایک طرف تو نصرانیوں کو یہ موقع دیا کہ اگر وہ میدان میں نکلنا چاہیں تو نکل  
آئیں اور اگر قلعے سے محاصرہ اٹھا کر جانا چاہیں تو ان کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔  
امیرزنگی کی اس حکمت عملی سے نصرانی اور زیادہ پریشان ہو گئے۔ ابھی تک وہ شہنشاہ  
قسطنطنیہ کی بدگمانی سے پریشان تھے۔ اب انہیں یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کہیں امیرزنگی یہاں  
سے ہٹ کے ان کے علاقوں پر حملہ نہ کر دے۔ پس نصرانی خیمہ گاہ کی یہ کیفیت ہو گئی کہ  
شہنشاہ قسطنطنیہ کا دربار صبح کو لگتا، جس میں تمام لاطینی بادشاہ بھی شریک ہوتے لیکن شام کے  
وقت لاطینی بادشاہ، شاہ یروشلم بالڈون کے خیمے میں جمع ہوتے اور تازہ حالات پر غور کیا  
جاتا۔

اسدالدین کو ہر بات کی اطلاع مل رہی تھی۔ اس کا بڑا دل چاہتا تھا کہ وہ لاطینی  
بادشاہوں کی محفل میں کسی طرح پہنچ جائے مگر کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ شہزادہ کلائڈ  
ہی صرف ایسا شخص تھا جس کے توسط سے اسدالدین، شاہ یروشلم تک پہنچ سکتا تھا مگر کلائڈ  
کے پاس بغیر کسی وجہ کے جانا اور اس سے شاہ یروشلم سے ملاقات کی درخواست کرنا خود  
اپنے لیے بڑی کٹھالی مارنے کے مترادف تھا مگر جب قدرت کوئی کام بنانا چاہتی ہے تو اس کے  
خودی اسباب پیدا کر دیتی ہے۔

ایک شام اسدالدین اور سرم خیمے کے باہر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ شہزادی جینالو  
توڑی دیر پہلے ہی سرم سے ملاقات کر کے واپس گئی تھی اور ان کی باتیں اسی کے بارے  
میں ہو رہی تھیں کہ شہزادہ کلائڈ آتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے دیکھ کر سرم کی آنکھوں میں خون  
آز آیا۔ اسدالدین کو بھی اس اچانک آمد پر تعجب سا ہوا۔ سرم نے آہستہ سے کہا۔  
”سرور! یہ کم بخت آج ادھر کیوں آیا۔ ضرور کوئی فتنہ کھڑا کرے گا۔“

”کلائڈ کا آنا واقعی تعجب خیز ہے۔ بہر حال، اب وہ آ رہا ہے تو تم بھی خوش دلی سے  
اسدالدین نے اسے سمجھایا۔“

کلائڈ نے قریب پہنچ کر اسدالدین اور سرم کو بڑے سلیقے سے سلام کیا۔ ان دونوں  
نے بھی اسے خوش آمدید کہا۔

”شہزادے خیریت تو ہے۔ آج آپ کو ہماری یاد کیسے آگئی؟“ اسدالدین مسکرایا۔  
”میں آپ ہی کے پاس آیا ہوں سرور!“ کلائڈ نے دلی زبان سے جواب دیا۔

”فریاد! میں آپ کی کوئی خدمت کر کے خوش محسوس کروں گا۔“  
”میں آپ سے اور سرم سے اس رات کی گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔“

”میں آپ کا لباس بدلوا کر شاہ کے خیمے میں لے جاؤں گا۔ وہاں کوئی بھی موجود نہ ہو گا۔“

”شنزادے! میں یہ جرات نہیں کر سکتا۔ میں چوروں کی طرح ملنے نہیں جاؤں۔“  
اسد الدین نے صاف انکار کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کھلے عام ملنے سے اس طرح چھپ کر زیادہ خطرناک تھا۔

”کلائڈ بہت ایوس ہوا۔“ شاہ یروٹلم آپ سے ملنے کے لئے بہت بے چین ہیں۔“  
اسد الدین سنبھل چکا تھا۔ اس نے متانت سے کہا۔۔۔۔۔ ”شنزادے! شاہ جس سرزمین پر بادشاہ ہیں اس کا ذرہ ذرہ ہمارے لئے مقدس ہے۔ میں خود شاہ سے ملنا چاہتا ہوں مگر یہاں ایک صورت ممکن ہے بشرطیکہ شاہ اس کے لئے رضامند ہوں۔“

”کیا صورت ہے؟“ کلائڈ بے تاب ہو گیا۔ ”مجھے بتائیے سردار! میں شاہ کو آمادہ کر لوں گا۔“

”میں شام کے وقت اگلے مورچے دیکھنے جاتا ہوں۔ کل میں ذرا دیر سے جاؤں گا۔“  
اسد الدین نے ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ ”رات ہو رہی ہو گی۔ شاہ بھی تمہارے ساتھ لے ہوئے سامنے کی پہاڑی پر تشریف لے آئیں۔ وہاں ملاقات ہو گی۔۔۔۔۔ لوگ اسے محض اتفاق سمجھیں گے۔ اس سے زیادہ خطرہ میں نہیں مول لے سکتا۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔ میں شاہ کو لے آؤں گا۔“ کلائڈ نے فوراً حامی بھری۔  
اسد الدین اور کلائڈ نے ملاقات کا وقت اور مقام ایک بار پھر طے کیا اور کلائڈ خوشی واپس ہو گیا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تھا۔ شاہ یروٹلم کو معلوم تھا کہ اسد الدین سخت سردار ہے۔ وہ ملاقات پر کسی صورت میں راضی نہ ہو گا اس لئے اس نے کلائڈ کو کہہ دیا تھا کہ اگر تم اسد الدین کو ملاقات پر رضامند نہ کر سکتے تو شاہانہ مراعات سے ہم کر دے جاؤ گے۔ اسد الدین اپنی جگہ خوش تھا۔ وہ شاہ یروٹلم سے باعزت طریقے سے ملنا چاہتا تھا اور اب تو اس کی ملاقات شاہ کی درخواست پر ہو رہی تھی۔

”سرمے دن شام کو اسد الدین اور شاہ یروٹلم کی مقررہ جگہ پر ملاقات ہوئی۔ شاہ وہاں سے موجود تھا۔ اسد الدین نے اسے ادب سے سلام کیا۔“

”مسلّم سردار! ہمیں خوشی ہے کہ تم ملاقات کے لئے آ گئے شاہ نے بھی اسی خلوص کا اظہار کیا۔“ ہمیں معلوم ہے کہ تم شہنشاہ قسطنطنیہ کے نمک خوار اور وفادار ملازم ہو۔ ہم تمہیں دلاتے ہیں کہ ہم کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جس سے تمہارے آقا کی توہین ہو سکے۔“

”میں شاہ کے خیالات کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔“ اسد الدین نے رسمی سا جواب دیا۔

اسد الدین ہنس پڑا۔ ”بس اتنی سی بات تھی شنزادے! آپ نے بیکار زحمت اس بات کو بھول گئے ہیں، کیوں سرم! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ اسد الدین دیکھا۔

”آپ بالکل ٹھیک فرما رہے ہیں سردار!“ سرم بھی ہنس کے کہا۔ ”ایسی معر ہو ہی کرتی ہیں۔ انہیں دل میں تھوڑی ہی رکھا جاتا ہے۔“

”کیوں شنزادے! اب تو آپ کو اطمینان ہو گیا۔ آپ شاہ یروٹلم کے میرے دل میں شاہ کی بڑی قدر ہے۔“

”میں شاہ یروٹلم کے بارے میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔“ کلائڈ۔  
لجہ اختیار کیا۔

شاہ یروٹلم کے نام پر اسد الدین اور سرم چونک سے گئے۔ اسد الدین نے کہا۔ ”شنزادے! اگر شاہ یروٹلم کا کوئی ذاتی کام ہے تو میں دل و جان سے حاضر! جہاں تک شاہ اور شہنشاہ کے اختلاف کا معاملہ ہے اس سلسلے میں کچھ نہ کر سکتا ہوں۔“

”ایسی کوئی بات نہیں سردار!“ کلائڈ جلدی سے بولا۔ ”شاہ کو آپ کے با پوری واقفیت ہے۔ وہ ایسی کوئی بات نہیں کہیں گے جس سے آپ پر الزام آئے۔“

”تو پھر فرمائیے! میں شاہ کے کس کام آسکتا ہوں۔۔۔۔۔؟“ اسد الدین بڑی سے پوچھا۔ وہ تو اسی کوشش میں تھا کہ کسی طرح شاہ یروٹلم تک اس کی رسائی وقت شاہ کا پیامبر اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ اور کلائڈ نے چور نظروں سے سرم دیکھا۔

اسد الدین اس کا مطلب سمجھ گیا۔ ”سرم! ذرا تم خیمے میں چلے جاؤ۔ میں سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کے ساتھ ہی اسد الدین نے سرم کو کوئی اشارہ بھی کیا اور سرم مسکرا کر چلا گیا۔ اسد الدین نے سوالیہ نظروں سے شنزادے کو دیکھا۔

کلائڈ کی زبان سے یہ نکلا تو اسد الدین کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ بلی کے ہونٹا مگر اسد الدین نے دل پر جبر کیا اور بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ”شنزادے! بھلا تمہیں کیسے جاسکتا ہوں اگر شہنشاہ کو علم ہو گیا تو میں کہیں نہ رہوں گا۔“

”سردار! آپ کی ملاقات راز میں رکھی جائے گی۔“ کلائڈ نے بڑے رازدارانہ

”سردار! تمہیں اس بات سے تو انکار نہ ہو گا کہ شہنشاہ اور ہمارے درمیان کرم بھی اختلاف ہم سب کے لئے مشکلات اور تباہی کا باعث ہو سکتا ہے؟“ شاہ نے اسد الدین کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

”اس خدشے سے کون انکار کر سکتا ہے شاہ معظم۔“

”اسد الدین! شاہ ذرا بے تکلف ہوا۔ ”کیا تمہارا بھی یہی خیال ہے کہ شہنشاہ پر جو شک کیا ہے اس میں کوئی .... حقیقت ہے؟“

”شاہ معظم!“ اسد الدین نے سنبھل کر کہا۔ ”جہاں تک آپ کی ذات کا تعلق مجھے یا شہنشاہ قسطنطنیہ کو آپ کے بارے میں کوئی شبہ نہیں لیکن آپ تنہا نہیں اڑیہ“ شاہ انطوکیہ اور شاہ طرابلس بھی تو آپ کے ساتھ ہیں کیا یہ ممکن نہیں ہے میں سے کسی نے امیر زنگی سے رابطہ قائم کیا ہو؟“

اسد الدین کی اس معقول بات پر شاہ یروٹلم فکر میں پڑ گیا۔ اسے اس بات ہوئی کہ شہنشاہ کو کم از کم اس پر تو شبہ نہیں ہے۔ ”اس کا مطلب ہے کہ شہنشاہ طرف سے دل صاف ہے؟“ شاہ یروٹلم نے اپنا اطمینان کرنے کے لئے مزید تحقیق ”میرا خیال ہے کہ شہنشاہ صرف آپ پر اعتماد کرتے ہیں۔“ اسد الدین نے ا کرنے کے لیے کہا۔ ”صرف شہزادہ کلایڈ اور شہزادی جینالو کے جھگڑے کی وجہ سے دل میں کچھ میل آیا تھا، میں نے یہ کہہ کر انہیں مطمئن کر دیا تھا کہ شراب کی زبا شہزادے کے ہوش و حواس ختم کر دیے تھے ورنہ شہزادہ ایسا نہیں ہے کہ خواہ مخواہ پریشان کرتا پھرے۔“

تم نے بہت اچھا کیا اسد الدین۔ شاہ یروٹلم خوش ہو گیا۔ ”ہم نے کلایڈ کھول دیے ہیں کہ اگر اس نے جینالو کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا تو اس کا برا“

”شاہ نے بھی بہت اچھا کام کیا۔“ اسد الدین نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس اٹھتے ہوئے فتنے کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔“

”اسد الدین۔ تو کیا ہم سمجھیں کہ شہنشاہ کے کانوں تک جو افواہ پہنچی تھی شہنشاہ نے کوئی پروا نہ کی اور وہ پہلے ہی کی طرح ہم پر اعتماد کرتے ہیں؟“

اسد الدین نے لمحہ بھر توقف کیا پھر ہنس کے بولا۔ ”افواہوں کو تو کوئی شبہ سکتا۔ آپ کے حلقوں میں جو افواہ آج کل گشت کر رہی ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ میرے روٹکے تو اس کے تصور ہی سے کھڑے ہو جاتے ہیں اگر خدا نخواستہ“

”ہوئی تو ہم تباہ ہو کے رہ جائیں گے۔“

”کون سی افواہ؟“ شاہ یروٹلم کے کان کھڑے ہو گئے۔ ہمارے حلقوں میں تو کوئی ایسی افواہ نہیں۔“

”جتنے اچھا ہوا کہ آپ کو اس کی خبر نہیں۔ خدا کرے یہ بات غلط ہی ہو۔ اس میں ہم سب کا بھلا ہے۔“ اسد الدین نے لمبا سانس لے کر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔

شاہ یروٹلم کے دل میں کھد بدی پیدا ہو گئی تھی۔ ”ذرا وہ افواہ تو بتاؤ جس نے تمہیں بھی پریشان کر دیا ہے؟“

”چھوٹیے بھی اس قصے کو۔ افواہیں تو اڑا ہی کرتی ہیں کس کس پر کان دھرا جائے۔“ اسد الدین نے ٹالنے کا انداز اختیار کیا۔

شاہ یروٹلم کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ اسد الدین کو شہنشاہ کا خاص الخاص آدمی سمجھتا تھا۔ ”اسد الدین تم نے افواہ کا ذکر کر کے ہمیں بھی فکر مند کر دیا ہے۔ کچھ تو بتاؤ“

”شاہ معظم۔ فکر مند تو آپ اس وقت ہوتے جب افواہ میں کوئی حقیقت ہوتی۔“ اسد الدین نے بات ذرا اور الجھا کر اس کی بے چینی پر تازیانہ لگایا۔ ”بہر حال اگر آپ مطمئن ہیں تو مجھے بھی کوئی فکر نہیں۔“

”اسد الدین۔ تم ٹال کیوں رہے ہو؟ آخر بتانے میں کوئی حرج ہے؟“ شاہ نے زور دے کر پوچھا۔

”دیکھیے شاہ معظم۔“ اسد الدین نے سنجیدگی اختیار کی۔ ”جس افواہ کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ آپ کے حلقوں میں مشہور ہو رہی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو اس سر زمین سے محبت ہے اور نہیں چاہتے کہ اس کی ایک انچ پر بھی کسی غیر کا قبضہ ہو اور شاید اسی وجہ سے آپ نے انکار کیا ہے کہ آپ کسی افواہ سے واقف نہیں۔“

”نہیں اسد الدین۔ تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ شاہ نے اس کی بات کاٹی۔

”براہ کرم مجھے اپنی بات پوری کر لینے دیجئے۔“ اسد الدین نے درخواست کی۔ ”ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ آپ مجھے شہنشاہ کا جاسوس سمجھتے ہیں۔ میں اس سے انکار بھی نہیں کرتا کیونکہ شیر جاسوس ہی ہوا کرتا ہے لیکن آپ نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ میرا شہنشاہ کے دربار میں پناہ لیتا صرف عماد الدین زنگی کی دشمنی کی وجہ سے ہے لیکن میں اپنی سرزمین کا تو دشمن نہیں۔ مجھے بھی اس سرزمین سے اسی قدر محبت ہے جتنی آپ اور دوسرے لاطینی شاہوں کو ہے۔ میں اس سرزمین پر کسی غیر ملکی طاقت کی حکومت دل سے تو قبول نہیں کر سکتا کیا آپ اب بھی مجھے غدار سمجھتے ہیں؟“

کی سیاحی میں بدل گئے تھے پتہ نہیں اس تاریک رات میں کیا کیا ہوتا رہا تھا۔ جب نور کا زکا ہوا تو ایک حیر رفار سوار حیات میں امیر عماد الدین زنگی کے خیمے پر پہنچا۔ امیر نماز فجر کے لیے وضو کر رہا تھا۔ پسینے میں شرابور سوار گھوڑے سے اترا۔ امیر کو ادب سے سلام کیا درنود شائی۔

”امیر عالی مقام کو مبارک ہو۔ شہنشاہ قسطنطنیہ پورے نصرانی لشکر کے ساتھ قلعے کا باصرہ چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں کسی طرف نکل گیا ہے۔“

امیر نے سوار کو اس طرح دیکھ جیسے اسے سوار کی بات کا یقین نہ آرہا ہو

”تمہیں کون غدار کہتا ہے اسد الدین“۔ یروٹلم نے بڑے جوش سے کہا۔ تم دوست ہو۔ تم نے قدم قدم پر ہمارا ساتھ دیا ہے۔ ہم تمہارے جذبے کی قدر کرتے جہاں تک امیر زنگی کا تعلق ہے۔ اس سے ہم تمہارا بدلہ لے کر رہیں گے۔“

”مجھے آپ پھر غلط سمجھ رہے ہیں شاہ معظم“۔ اسد الدین کے لہجے سے غصہ لگا ”میں عماد الدین زنگی سے اپنی توہین کا انتقام لینا چاہتا ہوں لیکن اپنی سرزمین کو فروزہ کے نہیں۔ یہ تمام علاقے ہمارے اور آپ کے ہیں ان پر کسی غیر کا قبضہ نہیں چاہیے۔“

”بالکل نہیں اور کون قبضہ کر سکتا ہے یہاں؟“

”تو پھر کیا یہ افواہ غلط ہے کہ شہنشاہ قسطنطنیہ یہاں کے بڑے بڑے قلعوں پر ان کے ان میں اپنا لشکر بٹھانا چاہتے ہیں اور تمام مفتوحہ علاقوں کو سلطنت قسطنطنیہ میں کریں گے؟“

شاہ یروٹلم کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ ”کیا کہہ رہے ہو اسد الدین“

”یہ میں نہیں کہہ رہا ہوں شاہ معظم“۔ اسد الدین پر جوش لہجے میں بولا۔ ”یہ ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ آپ اس سے ضرور واقف ہوں گے اور مجھے اس لیے نہیں کہ میں شہنشاہ کا مشیر ہوں۔“

”یقین کرو یہ بات میں نے تم سے پہلی بار سنی ہے۔“ شاہ یروٹلم کے لہجے میں آگئی۔ ”کیا شہنشاہ نے تم سے اس کا ذکر کیا ہے؟“

”اے محترم شاہ۔ میں اس افواہ کی تصدیق یا تردید کر کے اپنے اوپر فریبی اور حرام کا داغ نہیں لگانا چاہتا آپ یہ نہ بھولیں کہ میں محب وطن ہونے کے ساتھ ساتھ شہنشاہ کا نمک خوار بھی ہوں۔“ اسد الدین نے بھی لہجہ نرم کر لیا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ شاہ یروٹلم نے لمبی سانس لی۔ ”تو یہ کچھ ہو رہا ہے اور ہمیں بات کی خبر نہیں۔“

”اچھا تو اب مجھے اجازت دیجئے۔“ اسد الدین نے واپسی کا ارادہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ شاہ یروٹلم خیالات میں گم ہے۔ اسد الدین نے چند لمحوں انتظار کیا پھر جیسے درخواہ کی۔ ”شاہ محترم۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ اسد الدین اپنے شہنشاہ کا وفادار اور نمک خوار ہے۔“

شاہ یروٹلم اور اسد الدین اپنے اپنے راستوں پر واپس ہو گئے۔ شام کے سائے رات



”یہی بات مت سوچا کرو سرم۔ اسد الدین نے اس کی پیٹھ تھپ تھپائی۔“ میں ان ہوں اور ان کے مقابلے میں مجھے تم سے ہمدردی ہونا ہی چاہیے۔ ہاں یہ بتاؤ تم پریشان تھے؟“

”آپ کے جانے کے بعد ایک عجیب بات ہوئی سردار۔“ سرم نے سنبھل کے کہا۔ ”میں الدین ہے نا۔ وہی انز“ ”ہاں ہاں کیا ہوا انز کا؟“ اسد الدین بے چین ہو گیا۔ ”آپ کے جاتے ہی اس کا غلام میرے خیمے میں آگیا اور چاروں طرف یوں دیکھنے لگا کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ میں نے پوچھا کسے دیکھ رہے ہو کسے لگا آپ کا خیمہ بہت اچھا مگر وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ انز میرا سخت مخالف ہے اس نے ضرور کسی مقصد سے غلام بچا ہوگا۔“

”مجھے پوچھا تھا اس نے“ اسد الدین نے سوال کیا۔ ”جی ہاں۔ چلتے وقت اس نے سرسری طور پر پوچھا تھا۔ مگر وہ آپ کو دیکھنے نہیں آیا“ ”سرم نے اس طرح کہا جیسے اسے پورا یقین تھا۔“

”تم نے ٹھیک اندازہ لگایا سرم۔ وہ شہزادی جینا کو دیکھنے آیا ہوگا۔“ اسد الدین نے اظہار کیا۔

”جینا“ یہی بات تھی سردار۔ ”سرم کو ایک دم طیش آگیا۔“ اس کینت نے سلطنت کا کوہنہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ہمارے شاہ تو بس نام کے بادشاہ ہیں۔ حکم تو انز ہی کا چلتا۔ دیکھئے نا۔ امیرزنگی کی بھلا دمشق سے کیا مخالفت ہے۔ امیر محترم نے تو کئی بار دوستی کا پھلایا مگر انز نہیں مانتا۔ اسے تو امیر سے خدا واسطے کا پیر ہے۔“

سرم بڑے جوش سے انز کی برائیاں کر رہا تھا اور ساتھ امیرزنگی کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ ایک دم اسے خیال آیا کہ امیرزنگی نے اسد الدین کو اپنے دربار سے نکالا ہے اور نے شہنشاہ قسطنطنیہ کے پاس پناہ حاصل کی ہے۔ ظاہر ہے کہ امیرزنگی کی تعریف اسد الدین کو ناگوار گزری ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ فوراً ”چپ ہو گیا اور شرمندہ ہو کر الدین کو دیکھنے لگا۔“

اسد الدین اس کی باتیں دلچسپی سے سن رہا تھا۔ سرم کو خاموش دیکھ کر مسکرایا۔ ”چپ نا ہو گئے سرم تم سوچ رہے ہو گے کہ امیرزنگی کی تعریف مجھے بری لگ رہی ہوگی۔“ ”یہی بات ہے نا؟“

”ہاں سردار۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ سرم کی نظریں جھک گئیں۔ ”سرم۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کا میں برا نہیں مانتا کرتا۔“ اسد الدین نے اسے مطمئن

## دمشق کا آسیب

قلعہ شیرز سے شہنشاہ کی اچانک پہائی بڑی حیرت انگیز تھی۔ شاہ یروٹلم سے گئے بعد اسد الدین بہت خوش خوش واپس آیا۔ اسے یقین تھا کہ اس نے جو باتیں شاہ سے کی ہیں وہ ضرور رنگ لائیں گی۔ اسد الدین خیمے میں واپس آیا تو سرم کو اپنا خط سرم بڑی پریشانی کے عالم میں خیمے میں منسلک رہا تھا۔ اسد الدین کو دیکھتے ہی وہ دوڑ کے پاس آیا۔

”شاہ سے ملاقات ہوئی سردار؟“ سرم نے گھبرا کر پوچھا۔ ”ہاں۔ ہوئی تھی مگر تم گھبرائے ہوئے کیوں؟“ اسد الدین اپنی متوقع کامیابی پر رہا تھا۔

”پہلے آپ بتائیے سردار۔ شاہ نے کیا کہا؟“ اسد الدین ایک لمحے بعد بولا۔ ”شاہ یروٹلم میرے سامنے اپنی صفائی پیش کر رہا تو کیسی صفائی“ اس کا آپ سے کیا بھگڑا؟“ سرم بے چین ہو گیا۔

”وہی کلائیڈ اور شہزادی جینالو کا معاملہ۔“ اسد الدین نے بات پلٹ دی۔ ”وہ آ تھا کہ اس نے کلائیڈ کی اچھی طرح سرزنش کی ہے اور اب شہزادی اس کا نام تک نہیں لائے گا۔“

سرم کو اطمینان ہو گیا۔ ”سردار آپ نے میرا بہت ساتھ دیا ہے۔ میں آپ کا نہیں اتار سکتا۔“

”سردار۔ وعدہ کیجئے کہ میری واپسی تک آپ یہیں رہیں گے۔“ سرم نے اسد الدین لتاس کیا۔

”چاؤ سرم۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ اسد الدین نے بڑی محبت سے کہا۔ سرم خادم کے ساتھ باہر آگیا۔ جس وقت وہ شاہ مجیر الدین کے خیمے کی طرف جا رہا تھا، لٹکریوں میں عجیب طرح کا اضطراب دیکھا۔ ہر فوجی ہتھیار لگا کر یوں تیار ہو رہا تھا کہ اسی وقت میدان جنگ میں جانا ہے۔ تمام خیمہ گاہیں اسی کیفیت میں مبتلا تھیں۔ ہر جگہ صف بندی ہو رہی تھی۔ سرم تیز قدم اٹھاتا ہوا شاہ دمشق کے خیمے میں ہوا۔

”اؤ سرم۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“ شاہ مجیر الدین نے بڑی خوش دلی سے

شاہ کے پاس وزیر اعظم معین الدین انز بھی بیٹھا تھا۔ سرم نے اسے سلام کیا پھر بے پرواہی سے بولا۔ ”عالی جاہ! باہر لشکر تیار ہو رہا ہے۔ کیا فوجوں کو تیاری کا حکم دیا گیا ہے؟“

”ہاں سرم۔“ شاہ کے کچھ کہنے سے پہلے انز بول پڑا۔ ”امیر زنگی بڑا زبردست شب رنے والا ہے۔ شہنشاہ نے فوجوں کو کیل کانٹے سے تیار رہنے کا حکم بھیجا ہے۔“

”مگر وزیر اعظم آپ کے خادم نے تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔ وہ شام کو میرے پاس آیا تھا“

نایب وزیر پر طعنے کیا۔

”میں نے تو کسی کو بھی تمہارے پاس نہیں بھیجا۔“ انز صاف انکار کر گیا۔ سرم نے شاہ دمشق کو سنانے کے لیے کہا۔ ”معلوم نہیں کہ آپ نے بھیجا تھا یا وہ خود نامکروہ میرے خیمے کو ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے میں نے کسی شاہی مجرم کو چھپا

”کیا نام تھا اس کا۔ میں دریافت کروں گا اس سے۔“ انز نے ذرا غصے سے کہا۔

”وزیر اعظم۔ میں آپ کے خادموں کے نام نہیں جانتا مگر صورت سے انہیں ضرور ہوں۔“ سرم کو بھی غصہ آنے لگا تھا۔ ”میرے خیمے میں بغیر اطلاع کے آنے والا یا تو ظلم کا خادم ہو سکتا ہے یا پھر آپ کا۔ کسی اور کے خادم کو یہ جرات ہرگز نہیں ہو سکتی۔“

”معین الدین آپ لشکر کا انتظام کیجئے۔“ شاہ نے بحث ختم کرانے کے لئے دخل دیا۔ ”اے شاہ! تو ہمارے لشکر کو مغربی سمت پر لگائیے تاکہ مسلمان، مسلمان سے نہ

کرنے کی کوشش کی۔“ امیر زنگی نے میری توہین کی، میں نے اس کا دوبارہ چہرہ ختم ہو گئی مگر جہاں تک امیر عماد الدین زنگی کے مجاہدانہ کارناموں کا تعلق ہے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ شہنشاہ قسطنطنیہ اور تمام لاطینی شاہوں کو ایک ساتھ معمولی بات نہیں اس معاملے میں وہ تمہارے بادشاہ مجیر الدین اور اس کے مفاد انز سے بدرجہا بہتر ہے۔ سرم ایک بات کا اور خیال رکھو۔ میں شہنشاہ کا ملازم ضرور ہوں لیکن قسطنطنیہ سے روانگی کے وقت میں نے شہنشاہ سے صاف صاف کہا کہ میں صرف امیر زنگی کا مخالف ہوں مگر کسی مسلم لشکر کے سامنے تلوار نہیں اٹھاؤں گا۔ ”آپ بہت عظیم ہیں سرکار۔“ سرم نے بڑی محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ میرے اور آپ کے خیالات کتنے ملتے جلتے ہیں میں بھی امیر زنگی کے نہیں اٹھانا چاہتا مگر کیا کروں شاہ مجیر الدین کا ملازم ہوں۔ وہ مجھ پر مہربان ہیں۔ بار بار ارادہ کیا کہ دمشق چھوڑ کے کسی اور طرف نکل جاؤں مگر شاہ کے احسانات میرے قدم روک لیتی ہے۔ شاہ ابھی کس اور نادان ہیں اگر میں نے انہیں چہ بالکل آزاد ہو جائے گا اور نہ معلوم کیا کر بیٹھے۔“

”خیر۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ اب سوچنا یہ ہے کہ انز چاہتا کیا ہے؟“ اسد الدین کے لیے اس کا جواب پڑا۔ ”میرا خیال ہے کہ۔۔۔۔۔“

”سردار۔ آپ کا تو محض خیال ہے لیکن میں نے تو یہ بات خود اس کی زبان سے کہی۔“ سرم آج بالکل ہی کھل گیا۔ اس نے کئی بار شاہ سے کہا ہے کہ کسی ”و“ کا اپنی خیمہ گاہ میں قیام کرنا کسی طرح مناسب نہیں لیکن شاہ نے اس کے جواب میں کہا۔ ”انہوں نے کہہ دیا ہے کہ وہ شہنشاہ قسطنطنیہ کی دل سے قدر کرتے ہیں مشیر کا دمشق کی خیمہ گاہ میں قیام ہمارے لیے فخر کا باعث ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ اب مجھے تمہارا خیمہ چھوڑ دینا چاہئے۔“ اسد الدین نے لہجے میں کہا۔

”نہیں سردار۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں آپ کو نہیں۔۔۔۔۔“

اسی وقت شاہ مجیر الدین والی دمشق کا خادم خیمے میں داخل ہوا۔

”خیریت تو ہے؟“ سرم نے گھبرا کے پوچھا۔

”شاہ دمشق نے آپ کو فوراً طلب کیا ہے۔“

”اچھا۔ تم چلو میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔“

”محافظ محترم۔“ خادم جلدی سے بولا۔ ”مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو ما

ہماری عمر عشق و عاشقی کی منزل سے بہت آگے نکل چکی ہے۔ تم کیا جانو کہ عشق و  
نکس چڑیا کا نام ہے۔ سرم نے اگر کسی سے محبت کی ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔  
ناشرادی سے عشق کرنے والا کوئی بہادر ہی ہو سکتا ہے۔ ہمیں سرم پر ناز کرنا چاہیے کہ  
نے اپنی نظر بلند رکھی اور اگر سرم شہزادی کو دمشق لانے میں کامیاب ہوا تو اس سے  
شہر کی توقیر بڑھ جائے گی۔“

”عالی جاہ۔“ سرم لشکر نظروں سے شاہ کو دیکھ کر رہ گیا۔

سرم بھاگتا ہوا اسد الدین کے پاس پہنچا۔ اسد الدین خیمے کے دروازے پر کھڑا اس کا  
ار کر رہا تھا۔

”سردار۔ امیر زنگی شیخوں مارنے والا ہے۔ تمام لشکر کو ہوشیار کر دیا گیا ہے۔“ سرم  
کا پتے ہوئے کہا۔

اسد الدین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی سے خلاؤں میں گھور رہا تھا۔  
”سردار۔ آپ کس فکر میں ہیں۔ ہم پر حملہ ہونے والا ہے۔“ سرم نے اسد الدین  
خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

”سرم میں سوچ رہا ہوں کہ یہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے ہو گیا۔“ اسد الدین کا چہرہ اور  
بہت سنجیدہ تھا۔

”بہی تو کچھ نہیں ہوا سردار مگر کچھ ہونے والا ضرور ہے۔“ سرم نے پریشانی سے کہا۔  
”بھولے سرم۔ شب خوں نہیں مارا جا رہا ہے بلکہ ہم شکست کھا گئے ہیں۔“ اسد  
نے سرم کو ڈرایا۔

”شکست۔ کیسی شکست۔ کس کی شکست؟“

”ہماری شکست سرم۔“ اسد الدین نے وضاحت کی۔ ”ہم قلعہ کا محاصرہ چھوڑ کر  
جا رہے ہیں۔“

”سردار۔ سردار۔ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“ سرم کی بوکھلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسد  
نے سرم کا ہاتھ پکڑا اور اسے لے کر ایک اونچی چٹان پر آگیا۔

”سرم۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔“

سرم نے نیچے خیمہ گاہوں کی طرف نظریں دوڑائیں تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔  
لاد تک شعیس جلتی دکھائی دے رہی تھیں اور ان شمعوں کی مدھم روشنی میں لشکری  
اکھاڑ اکھاڑ کر گاڑیوں پر لاد رہے تھے۔ بعض بڑے خیمے اسی طرح چھوڑ دیے گئے تھے  
ان کا ضروری سامان بار کیا جا رہا تھا مگر یہ تمام کام بڑی خاموشی سے ہو رہا تھا۔

فکرا سکیں۔“

معین الدین انز بھی سرم کی کھری کھری باتوں سے چڑ رہا تھا۔ وہ فوراً اٹھ  
گیا۔ ”شاہ عالی مقام۔ میں اپنی سے کوشش ضرور کروں گا لیکن اس وقت شہز  
فوجوں کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی ہے۔ ہماری فوج بھی ان کے حکم سے ک  
کی جائے گی۔“

انز کے جانے کے بعد سرم نے پوچھا۔ ”عالی جاہ۔ کیا پورے کے پور  
تیاری کا حکم دیا گیا ہے؟“

”ہاں سرم۔ شاہ کا یہی حکم ہے۔“ نو عمر شاہ نے کہا۔ ”سنا ہے کہ کیفا  
ایک بڑا لشکر لے کر امیر زنگی کی مدد کو آگیا ہے اور امیر زنگی آج کسی وقت زہ  
مارے گا۔“

”میرے لیے کیا حکم ہے عالی جاہ؟“

”تم میرے قریب رہو گے سرم۔“

”میں تو حضور کے قدموں ہی میں ہوں۔“

”ہمیں تمہاری وفاداری پر فخر ہے سرم۔“ شاہ نے بڑے خلوص سے کہا۔  
ہے کہ ہم مجبوراً معین الدین پر اعتماد کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہ قطعی قابل  
نہیں۔ یہ جنگ کا موقع ہے اور جنگ بھی رات کی ہے اس لیے تم پوری طر  
ہمارے خیمے میں آجاؤ۔ تمہیں اسی خیمے میں ہمارے ساتھ رہنا ہوگا۔“

”شاہ پر میری جان قربان۔ آپ تردد نہ فرمائیے۔ غلام مسلح ہو کر اب  
ہے۔“ سرم جانے لگا خیمے کے دروازے تک گیا، پھر ٹھہرا اور واپس آکر بولا

”کیجئے۔ وزیر اعظم کو دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔ آپ مجھے حکم دیجئے۔ میں  
دوں۔“

”نہیں سرم۔ اس قسم کا ارادہ ہرگز نہ کرنا۔“ شاہ نے تاکید کی۔ ”تم  
سے واقف نہیں۔ ہمارا پورا لشکر اس کے اشاروں پر چلتا ہے۔ تم اس پر ہرگز  
گے اور خوا خواہ جان گنوا دو گے۔ تمہارے خلاف تو وہ پہلے ہے آج کہہ رہا  
شہزادی کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہے اور اب یہ ایک محافظ کی ذمہ داریا  
قابل نہیں۔ جانتے ہو ہم نے اسے کیا جواب دیا۔“

سرم شرمندہ ہو گیا تھا پھر اس نے مجبکتی نظروں سے شاہ کو دیکھا۔

”ہم نے اس سے کہا۔“ شاہ نے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی

”سردار۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔“ سرم کی سمجھ میں واقعی آ رہا تھا۔

”تمہارے جانے کے بعد شہنشاہ نے بلوایا تھا۔ مجھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا۔ خاص بات ضرور ہے پھر مجھے شہنشاہ نے سب کچھ بتا دیا۔ نصرانی بادشاہوں کی عزت سے شہنشاہ بد دل ہو گیا ہے۔ اسے ان پر کوئی اعتبار نہیں رہا۔ اس نے حکم دیا۔ محاصرہ فوراً اٹھا کے شہر کا علاقہ چھوڑ دیا جائے۔ ورنہ ہمیں ایک شکست کا منہ دیکھنا پڑے گا۔“

”مگر سردار۔ میرے بادشاہ نے تو کہا ہے امیر زنگی شب خوں مارنے والا ہے۔ لشکر کو چوکنہ کیا گیا ہے۔“ سرم عجیب تذبذب میں گرفتار تھا۔ ایک طرف اس کے اطلاع دوسری طرف یہ اکھڑتے ہوئے تھے۔

”شہنشاہ ایک جماندیزہ سپہ سالار بھی ہے۔“ اسد الدین نے سرم کو سمجھایا۔ ”نہ سب خوں کی اطلاع دے کر لشکر کو تیار کر دیا فوراً ہی پسپائی کا حکم دیا۔“ کہ امیر زنگی کو خبر ہونے سے پہلے وہ یہاں سے کافی دور نکل جائے۔ ”تو کیا اب جنگ نہ ہوگی سردار؟“

”پسپا ہونے والا لشکر جنگ نہیں کیا کرتا سرم۔“ ”اس کا مطلب ہے کہ سب بادشاہ اپنے اپنے ملک واپس چلے جائیں گے؟“ ”ہاں سرم۔ شاہ انطاکیہ بھی واپس جائے گا اور تمہاری شہزادی جینالو کو بھی واپس جانا ہوگا۔“ اسد الدین نے جیسے سرم کے چنگی لی۔ ”نہیں سردار۔ میں شہزادی کو واپس نہیں جانے دوں گا۔ اس کے بغیر میں رہ سکتا۔“

”بزدل کو محبت کرنے کا حق نہیں ہوا کرتا سرم۔“ ”میں بزدل نہیں ہوں سردار۔“ سرم تڑپ اٹھا۔ ”تو جاؤ شہزادی کو راضی کرو۔ اگر وہ تیار ہو جائے تو پسپائی کے دوران اس کسی سمت نکل جائے۔ اس آپا دھاپی اور گزبڑ میں کسی کو خبر بھی نہ ہوگی۔“ سرم سوچنے لگا۔ ”مگر میں جاؤں گا کہاں؟“

”سرم نے اس طرح ہم کلاہ کی کہ اس کی آواز اسد الدین کے کانوں تک پہنچی۔ اسد الدین نے کہا۔“ میرا خیال ہے کہ اگر شہزادی آمادہ ہو جائے تو تم امیر زنگی کے پاس چلے جاؤ۔“

سرم نے حیرت سے اسد الدین کو دیکھا۔ ”سردار۔ آپ مجھے اپنے دشمن کے پاس بھیج رہے ہیں؟“

”میرے اچھے دوست۔ امیر میرے دشمن ہیں، تمہارے تو نہیں۔“ اسد الدین لے لیجے لی بڑی شفقت تھی۔ ”میرا اور امیر کا اختلاف ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس ناخوشیوں سے انکار کر دوں۔ وہ دل کے برے نہیں۔ تم ایک بہادر جوان ہو۔ وہ تمہاری رور قدر کریں گے۔“

”مگر سردار۔ یہ غور فرمائیے جب انہیں علم ہو گا کہ میں شاہ دمشق کا محافظ ہوں اور

ب نصرانی شہزادی کو بھگا کر لایا ہوں تو کیا وہ مجھے قتل نہیں کر دیں گے؟“ ”میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔“ اسد الدین نے ٹالنا چاہا۔ ”مگر یہ یقین آتا ہے کہ امیر تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ انہیں دمشق کے حالات کا علم ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ تمہارے وزیر اعظم انز نے شاہ دمشق کو ایک طرح سے قید کر رکھا ہے۔ وہ وزیر اعظم کا اثر ختم کر کے شاہ دمشق کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔“ ”کیا امیر واقعی شاہ دمشق کے ہمدرد ہیں؟“

”نہیں میری بات کا یقین نہیں؟“ ”توبہ توبہ۔ سردار مجھے تو اپنی بات پر اتنا اعتبار نہیں جتنا اعتبار میں آپ پر کرتا

ہوں۔“ ”تو پھر جاؤ۔ تیاری کرو مجھے بھی شہنشاہ کے پاس جانا ہے۔“ ”ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں اگر آپ اجازت دیں۔“ ”جلدی کو سرم۔ وقت کم ہے۔“ ”آپ کے خیال میں امیر زنگی بہت اچھے آدمی ہیں؟“ ”ہاں۔ اس میں کیا شک ہے۔“ ”ایک درخواست ہے سردار۔“

”یہ باتوں کا وقت نہیں سرم۔ کو کیا کہنا چاہتے ہو؟“ ”میں چاہتا ہوں سردار۔ میں چاہتا ہوں۔“ ”مگر انہیں سرم تم ایک اچھے دوست ہو۔ میں تمہاری بات کا برا نہیں مانوں گا۔“

”سردار میں چاہتا ہوں کہ آپ شہنشاہ کو چھوڑ کر امیر زنگی کے پاس واپس چلے

جائیں۔“ ”اسد الدین نے چونک کر سرم کو دیکھا۔ چند لمحوں بعد بولا۔ ”سرم تمہارے دل میں یہ

خیال کیسے پیدا ہوا؟

”سردار۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ امیر زنگی تمام نصرانیوں کے سامنے اکیلے بہ تو میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے ایسے مجاہد کو اکیلے نہیں ہونا چاہیے۔ آپ بہار صورت میں ان کے قریب ہونا چاہیے۔“

اسد الدین نے آگے بڑھ کر سرم کو گلے لگایا۔ ”سرم تم ایک سچے مسلمان آنے پر میں تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔“ اسد الدین نے ایک بار پھر اے اور اسے خدا حافظ کہہ کر اپنی خیمہ گاہ کی طرف چلا گیا۔



امیر عماد الدین زنگی فی الفور اسجدہ شکر بجالایا پھر تمام بڑے سرداروں کو اپنے طلب کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دو اور آدمیوں کو نصرانیوں کی طرف بھیجا کہ تفصیل حاصل کر کے حاضر ہوں۔ زنگی لشکر میں نصرانیوں کی پسپائی کی خبر جنگ کی طرح پھیل گئی تھی مگر ابھی انہیں نصرانی مورچوں میں جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔ وہ اپنی اپنی جگہ تیار تھے اور ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے۔

امیر زنگی نے میدان میں دربار لگایا تھا۔ تمام سردار اکٹھا ہو گئے تھے اور والے بھی واپس آگئے تھے۔ اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ شہنشاہ قسطنطنیہ دوسرے نصرانی والیان ریاست میدان چھوڑ بھاگے ہیں۔ ہر طرف مسرت پھیلی ہوئی سرداران لشکر امیر زنگی کو مبارک باد پیش کر رہے تھے۔ ذرا دن چڑھے امر زنگی اس کے جلو میں سب سردار تھے۔ یہ لوگ میدان پار کر کے پہاڑیوں میں داخل وہاں کا عجیب حال تھا۔ ہر طرف اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ خیمے جگہ جگہ مگر سب خالی۔ پہاڑیوں پر بھاری بھاری تختیاں چڑھی تھیں مگر انہیں چلانے موجود نہ تھا۔ بعض جگہ آگ جل رہی تھی اور کئی خیموں میں شمعیں اب بج تھیں۔

امیر زنگی کو خوشی کے ساتھ نصرانیوں کی اس پوشیدہ پسپائی پر بڑی حیرت ہو ایک رات میں ڈیڑھ دو لاکھ کے لشکر کا اس قدر خاموشی سے نکل جانا بڑا حیرت امیر نے حکم دیا کہ سب سے بڑی جینچق پر جو ایک بلند پہاڑی پر نصب تھی اسے لہرایا جائے تاکہ قلعے والوں کو معلوم ہو سکے کہ خدا نے نصرانیوں کو دفع کر دیا۔

لشکر اسلام قابض ہو چکا ہے۔ قلعے والے بھی صبح ہی سے اپنی اونچی فصیل پر مورچوں پر خیمہ لگا ہوں کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں خیمے تو نظر آرہے تھے لیکن ہر خیمہ گاہ کے قلعے کا عالم تھا۔ نہ بندہ نہ بندے ذات۔ ہر طرف قبرستان کا عالم تھا۔

پہاڑی پر امیر زنگی کا پرچم بلند ہوا تو قلعہ پر سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہوئی۔ امیر زنگی اس کے سرداروں نے اس مبارک نعرے کا جواب دیا، پھر تو ہر طرف اللہ اکبر کے گونجنے لگے اور دشت و جبل ان نعروں سے گونجنے لگے۔

قلعہ شیزار کے محل وقوع کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔ قلعہ تک جانے کا واحد راستہ پتلی سے پگھلندی تھی جو لکڑی کے ایک پل سے سے گزرتی تھی۔ یہ پل درائے عاصی بنایا تھا جو قلعہ کے قریب سے ایک قدرتی خندق کی طرح گزرتا تھا۔ قلعہ والوں نے اس کے پل کو اٹھا کر قلعہ کو بالکل محفوظ کر دیا تھا۔ امیر زنگی پگھلندی پر گھوڑا بھگاتا ہوا کے کنارے اس مقام پر پہنچ گیا جہاں پر لکڑی کا پل لگایا جاتا تھا۔ قلعہ والوں نے ان کو دیکھا تو فوراً ”قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور لکڑی کا تیار ہوا پل اپنے ساتھ لے کر پر آگئے۔ آگے آگے حاکم قلعہ ابو عساکر تھا۔ اس کے تعلق قبیلہ بنو منذر سے تھا اور یہ صدیوں سے اس قلعہ کا حاکم چلا آ رہا تھا۔

قلعہ پر پل ڈال دیا گیا تھا اور ابو عساکر اپنے سرداروں کے ساتھ پل سے گزر کر امیر کے پاس آگیا۔ امیر زنگی کا دوست ہونے کے باوجود ابو عساکر کا سر جذبہ احسان مندی بھکا جا رہا تھا۔ امیر گھوڑے سے اتر کے ابو عساکر سے بغل گیر ہوا۔ عساکر کی آنکھوں سے مسرت کے آنسو بہہ رہے تھے۔

”امیر محترم۔“ ابو عساکر گلوگیر آواز میں بولا۔ ”ہماری دعائیں قبول ہوئیں اور خدائے مال نے آپ کو فرشتہ رحمت بنا کر قلعہ کی حفاظت کو بھیج دیا ورنہ پتہ نہیں ہمارا کیا حشر“

”ابو عساکر دوستی کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ایک دوست دوسرے کے کام آئے۔“ امیر بڑی مسرت سے کہا۔

اگر تمہارا مقصد نہ بھی پہنچتا تو بھی ہم قلعہ کو بچانے کے لیے ضرور آتے۔ قلعہ شیزار علاقوں کا صدر دروازہ ہے۔ اسے دشمن کے ہاتھ میں دینا اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے حراف ہے۔“

”خدا آپ کی عمر میں برکت دے۔“ ابو عساکر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کن آدمی امیر کا شکر یہ ادا کرے۔ ”اتنے بڑے لشکر کا آپ کے خوف سے محاصرہ چھوڑ جانا

آپ کی عظمت کی نشانی ہے۔ خدا آپ کا سایہ مسلمانوں پر برقرار رکھے۔“

”ابو عساکر۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ خدا نے اس قلعہ کو دشمنوں سے محفوظ رکھا۔“ امیر نے گنہگار آواز میں جواب دیا۔ لیکن میں بزع اور کھ شہیدوں کی روح سے شرمندہ ہوں جس وقت مسلمانوں کی تباہی کا تصور کرتا ہوں خوف سے تھرا اٹھتا ہوں اگر داور حشر نے روز قیامت مجھ سے باز پرس کی تو میں دوں گا۔ کاش میں نصرانیوں سے صلح کا معاہدہ نہ کرتا۔ انہوں نے مجھے معاہدہ کا کر غافل کر دیا۔ کاش۔ کاش۔“ امیر کی آواز بھرا گئی۔

”امیر۔ ماضی پر افسوس نہ کیجئے۔ خدا معلوم اس میں کیا مصلحت تھی۔“ امیر کے غم کو کم کرنے کے لیے کہا۔ ”یہ کیا کم ہے کہ باقی مسلم علاقے نصرانیوں سے بچ گئے۔ میں نے سنا تھا کہ شہنشاہ جان کامنی نس یہ قسم کھا کر چلا ہے کہ وہ تمام مسلم علاقوں پر نصرانی پرچم نہ لہرائے گا اس وقت تک واپس نہیں جائے گا۔“ سب سے زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ ہمارا ایک مسلمان بادشاہ بھی نصرانیوں لشکر کا ساتھ دے رہا ہے۔“ امیر نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”ہم نے شاہ دمشق کی نہیں کی مگر وہ۔۔۔۔۔؟“

”امیر۔ اس میں شاہ دمشق کا کوئی قصور نہیں۔“ ابو عساکر نے قطع کلام کیا۔ اصل حاکم تو معین الدین انزہ ہے۔ شاہ یروثلم بالذون سے اس کے گھرے تعلقات ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ابو عساکر۔“ امیر نے جواب دیا۔ ”انزہ کچھ بھی کرتا، ہمیشہ دمشق کی سلامتی کی خواہش کریں گے۔“

”اب قلعے میں تشریف لے چلے امیر۔“ ابو عساکر نے درخواست کی۔ ”اپنے نجات دہندہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے چشم براہ ہیں۔“

امیر زنگی کچھ سوچنے لگا پھر اس نے پلٹ کر اس پہاڑی کی پگڑندی کو دیکھا گزر کر وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ ابو عساکر امیر کی خاموشی سے پریشان ہو گیا۔

”امیر محترم کس بات کا تردد ہے۔ کیا کسی کا انتظار ہے؟“ ابو عساکر نے میں کہا۔

”ہاں۔ نہیں۔“ امیر زنگی کے منہ سے دونوں لفظ ایک ساتھ ادا ہوئے؟ ”نبھلتے ہوئے بولا۔“ ابو عساکر مجھے قلعے میں چلنے سے انکار نہیں مگر پتہ نہیں طبع کیوں پریشان ہو گئی ہے مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کچھ بھول رہا ہوں کہ کہیں رکھ کر بھول گیا ہوں۔“

ابو عساکر اور زیادہ فکر مند ہوا۔ ”امیر۔ آپ کی پریشانی نے مجھے فکر میں مبتلا کر دیا طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے ہیں۔ خدا خواستہ کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کو ابو رکی دوتا؟ اعتماد نہیں رہا اور۔۔۔۔۔“

”ابو عساکر۔“ امیر زنگی نے اسے روک دیا۔ ”تم کس وہم میں پڑ گئے۔ عماد الدین کم لوگوں کو دوست بناتا ہے اور جب کسی کو دوست کہہ دیتا ہے تو پھر اس پر آخری ایک اعتماد کرتا ہے۔“

”یہ میری خوش قسمتی ہے امیر۔“ ”امیر زنگی کی چھٹی حس ایک دم پھڑکی۔ اس نے ہلت کر پھر پگڑندی پر نظریں جمادیں۔“ اگر میری نظریں دھوکا نہیں کھا رہی ہیں تو مجھے ایک سوار کے اوپر آتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔“

سب کی نظریں پگڑندی کی طرف اٹھ گئیں۔ ”امیر درست فرما رہے ہیں۔“ ابو عساکر نے تائید کی۔ ”یقیناً“ وہ ایک سوار ہے۔“ چند لمحوں بعد سوار کا ہیولا واضح ہو گیا۔ سوار پر بیچ پگڑندی پر تیزی سے گھوڑا بھگاتا رہا تھا۔

”یہ گرانڈل سوار۔“ امیر نے پگڑندی سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ ”شاید وہ۔ وہ۔“ ”یہ وہی ہو سکتا ہے۔ گرانڈل اور پھر تھلا۔“

”یہ کون ہو سکتا ہے امیر محترم؟“ ابو عساکر نے بے چینی سے پوچھا۔ ”میرا قیاس درست تھا۔“ امیر نے نظریں گھما کر ابو عساکر کو دیکھا۔ ”میری طبیعت اس کے لیے بے چین تھی۔ مجھے اسی کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید میں اسی کو مانگتا تھا۔“

سوار قریب آگیا تھا مگر ابو عساکر اسے پہچاننے سے قاصر تھا۔ وہ پہچانتا بھی کیسے۔ اس اس سوار کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”اسد الدین۔ سردار الدین۔“ امیر کے ساتھیوں میں سے کسی کی زبان سے ایک دم مانگا۔

”بے شک وہ اسد الدین ہے۔“ امیر کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ ”بہادر اسد الدین۔“ اسد الدین قریب بیچ کے تیزی سے گھوڑے سے اترا اور بڑے ادب سے ہاتھ باندھ رکھا۔ ”آقائے نعمت۔ غلام سلام پیش کرتا ہے۔“

”امیر عماد الدین زنگی مسکرا رہا تھا۔“ اسد الدین۔ ہمارے قریب آؤ۔“



امیر نے سرداروں کے عمدے بڑھا کر ان کی ہمت افزائی کی اور لشکر میں نقد رقم بھی اکرائی۔ قلعے والوں کے اصرار پر امیر رات کے کھانے پر ان کا مہمان ہوا۔ وہیں اسے معلوم کیا کہ لہرنائی لشکر جنوب کی سمت اس قدر تیزی سے پسا ہو رہا ہے گویا وہ میدان کربلا کا ہے۔ امیر زرگی کو اس طرف سے تو اطمینان ہو گیا لیکن دمشق کے معین الدین نے اس حملے میں جو کردار ادا کیا تھا اس سے امیر بہت منغض تھا اس وقت وہ دمشق پر آسمان سے حملہ کر سکتا تھا لیکن اسے دمشق کے شاہ مجیر الدین یا وہاں کے عوام سے شکایت نہیں تھی۔ اس کی اصل مخالفت معین الدین انز سے تھی اور وہ اس کی تائید میں دمشق کو تباہ و برباد کرنے کا حوالہ نہیں مند نہ تھا۔ پس اس نے دمشق کے خلاف

ابو عساكر اور دوسرے سردار بھی سوار ہو كر امير كے ساتھ ہو ليے۔ پہاڑی پہنچا

کوئی کارروائی کرنے کی بجائے موصل واپسی کو بہتر سمجھا تاکہ وہاں پہنچ کر وہ اور اکٹھا کر لے اور پھر نصرانی شاہوں پر ایک ایسا زبردست حملہ کرے کہ ان کی طاقت لیے ختم ہو جائے۔



شہنشاہ قسطنطنیہ جان کامنی نس کے صلیبی سواروں کی واپسی کا پس منظر بڑا شہنشاہ کا خیال تھا کہ جس طرح اس نے کفر تاب اور بزم (بزرگ) کے علاقوں کا کیا ہے اسی طرح وہ قلعہ شیزار کو بھی اپنی منجیقوں کے زور پر چار دن میں فتح کر اس کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ ایک ہفتے تک اس کو کوہ شکن جنگیں سنگ باری کرتی رہیں لیکن وہ قلعے والوں کا کچھ نہ بگاڑ سکیں پھر امیر زنگی اپنے ساتھ خم ٹھونک کر میدان میں آیا اور شہنشاہ کو دفاعی جنگ پر مجبور ہونا پڑا۔ اب طرح طرح اشتعال دلانے پر بھی ہو مقابلے پر نہ نکلا اور چوہوں کی طرح پہاڑوں بیٹھا رہا۔

اسی دوران اسے خبر ملی کہ والی کیفا داؤد ایک بڑا لشکر لے کر امیر زنگی کی ہے۔ اس خبر نے اسے اور زیادہ پریشان کر دیا۔ اس سے زیادہ پریشانی اسے شاہوں کی بے اعتدالیوں اور عشرت پسندیوں سے لاحق ہوئی۔ ان شاہوں کا رویہ ساتھ پہلے دن ہی سے کچھ اچھا نہ تھا شہنشاہ کے عظیم لشکر سے وہ خائف تھے اس بات کا خدشہ تھا کہ کہیں شہنشاہ مقبوضہ علاقوں کا مالک نہ بن بیٹھے۔ یہ بات کے لاشعور میں تھی لیکن جب انہیں اس قسم کی خبریں افواہوں کی صورت اور الدین کی زبانی معلوم ہوئی تو وہ ایک دم بھڑک اٹھے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ ساتھ چھوڑ کر اپنی ریاستوں کو واپس چلے جائیں۔

شہنشاہ جان کامنی نس کا جاسوسی کا محکمہ بڑا زبردست تھا۔ اسے شاہوں کی خبریں ہونے والی باتوں کی خبریں برابر مل رہی تھیں۔ شہنشاہ کو ان کی نیت پر پہلے اب تو اسے یقین ہو گیا کہ نصرانی شاہوں نے ضرور امیر زنگی سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ حالات میں اس کے لیے پسپائی کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہ گیا۔ شہنشاہ نے فوراً حکم دیا۔

”ہم گھیرے میں آگئے ہیں۔ فوراً پسپائی اختیار کی جائے۔“

شہنشاہ کے اس اعلان سے نصرانی شاہوں کے حواس اڑ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ جب شہنشاہ کو چھوڑ جائیں گے تو امیر زنگی ان کی خوب خبر لے گا لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ دشمن کے گھیرے میں ہیں تو وہ شہنشاہ کے ساتھ ہی سر پر پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے مگر اس بھگدڑ کے موقع پر بھی کلائیڈ اپنی خباثت دکھانے سے باز نہ آیا۔ کلائیڈ کو بے زیادہ غصہ سرم اور اسد الدین پر تھا۔ اگر اس رات یہ دونوں شہزادی کی مدد نہ کرتے تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔

لشکر کی واپسی شروع ہوئی تو کلائیڈ نے اپنے پندرہ خاص سواروں کا ایک دستہ لے کر لیا۔ شہنشاہ نے حکم دیا تھا کہ دمشق کا لشکر پہلے روانہ ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر امیر زنگی کے سوار راستہ روکے ہوئے ہیں تو ان کا مقابلہ پہلے دمشق لشکر کرے گا اور ان کی روانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نصرانی لشکر رپلا کرتا ہوا نکل جائے گا مگر دمشق کا لشکر بغیر کسی بھڑکے کے آگے چلا گیا۔ دراصل امیر زنگی نے مغرب اور جنوب کے راستے جان بوجھ کے تھکے رکھے تھے تاکہ اگر شہنشاہ پسپا ہونا چاہے تو اسے بغیر کسی مداخلت کے نکلنے کا موقع دیا جائے۔ چنانچہ دمشق کا پورا لشکر خیمہ گاہ چھوڑ کر نکل گیا۔ لیکن کچھ دور جا کر شاہ دمشق کا نائب سرم اپنا گھوڑا گھما کر اپنے لشکر سے جدا ہو گیا اور راستے سے ذرا دور ہٹ کر ایک بلہ گھوڑا روک کر کھڑا ہو گیا۔

سرم اور شہزادی جینالو میں یہ طے ہوا تھا کہ جب شہزادی اس جگہ پہنچے گی تو وہ بھی اس طرح اپنے لشکر سے الگ ہو کر سرم کے پاس پہنچ جائے گی اور پھر وہ دونوں حماۃ پہنچ کر امیر زنگی سے پناہ کی درخواست کریں گے۔ دوسری طرف کلائیڈ نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ اس کے پندرہ سوار شہزادی کے لشکر میں شامل ہو جائیں گے اور مناسب موقع دیکھ کر شور مچائیں گے کہ امیر زنگی کے لشکر نے حملہ کر دیا اس سے انخاکہ کے لشکر میں بھگدڑ مچ جائے گی اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کلائیڈ کے سوار شہزادی جینالو کو اپنے قبضے میں کر لیں گے۔ اس وقت نفسا نفسی کا عالم ہوگا۔ کسی کو علم بھی نہ ہوگا کہ شہزادی جینالو پر کیا گزری۔ شہزادی اور سرم نے اپنے خیال میں فرار کا بڑا اچھا منصوبہ بنایا تھا۔ کلائیڈ کو بھی اپنے منصوبے کی کامیابی کا علم تھا مگر انسان تو صرف منصوبے بناتا ہے اور ہوتا وہی کچھ ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے۔

سرم لشکر سے الگ ہو کر شہزادی جینالو کا انتظار کرنے لگا۔ شہزادی جب اس مقام پر پہنچی تو منصوبے کے مطابق وہ اپنی گاڑی چھوڑ کر ایک گھوڑے پر سوار ہو گئی جس کا اس نے پہلے ہی انتظام کر لیا تھا۔ کلائیڈ کے سوار اس کی گاڑی کے قریب ہی تھے اور ابھی وہ



”میں بھی تو یہی کہہ رہا تھا۔ کلائیڈ بڑی کمینہ ذہنیت کا انسان ہے۔“  
”مگر اب کیا کیا جائے۔ تم مجھے دمشق کے لشکر میں لے چلنے پر تیار ہو؟“ جینا الجھتے

بولے۔  
”اس بات پر غور کرنا ہوگا۔ میرا شاہ تو مجھ پر بہت مہربان ہے مگر اس کا وزیر کلائیڈ سے

ی زیادہ کمینہ اور بد طبیعت ہے۔“  
”مگر شاہ کے سامنے وزیر کی کیا حیثیت ہے اگر تمہارا شاہ واقعی تم پر مہربان ہے تو تم

رے لیے اس سے اجازت حاصل کر لو۔ جب ہماری شادی ہو جائے گی تو پھر وزیر کیا

رے گا۔؟“  
”جینا تم دمشق کے وزیر انز کو نہیں جانتیں۔ وہ شاہ سے کئی بار میری شکایت کر چکا

ہے۔“  
”جس طرف چلنا ہے فوراً فیصلہ کرو سرم۔“ شنزادی نے راستے پر نظریں ڈالتے

کہا۔  
”اس جگہ زیادہ دیر ٹھہرنا بھی خطرے سے خالی نہیں۔“

شنزادی جینا کا اندیشہ درست ہی تھا۔ جس وقت گاڑی چھوڑ کر گھوڑے پر سوار ہوئی

۔ اسی وقت سے کلائیڈ کے آدمیوں میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی

شنزادے کلائیڈ کے پاس بھیج دیا تھا لیکن وہ ڈر رہے تھے کہ اگر شنزادے نے ان سے

نچا کہ شنزادی جینا کا تعاقب کیوں نہیں کیا گیا تو وہ کیا جواب دیں گے۔ شنزادی کے لشکر کا

خاب سلطنت انطاکیہ کی طرف ہو گیا تھا۔ اس لیے وہ اور زیادہ گھبرائے آخر انہوں نے

کہا کہ انطاکیہ کی طرف جانا بے کار ہے کیونکہ اگر شنزادے کلائیڈ کو اطلاع پہنچ بھی گئی

وہ شنزادی کی تلاش میں ادھر آیا تو اسے انطاکیہ کے لشکر کے رخ بدلنے کا حال کیسے

دکھائی دے گا اور اس وقت تک شنزادی پتہ نہیں کہاں پہنچ چکی ہوگی۔ اس لیے بہتر یہی ہے

چکر لگا کر پھر حماہ کی طرف روانہ ہوا۔

شنزادی جینا کو اپنے لشکر سے نکل کر سیدھی سرم کے پاس پہنچی۔ سرم اگر

شنزادی کو اپنے لشکر میں لے جاسکتا تھا مگر اسے معین الدین انز سے خطرہ تھا۔ ایک

ہی اس کے خلاف تھا دوسرے جب وہ شنزادی کو سرم کے ساتھ دیکھتا تو اور زیادہ

جاتا اور ممکن تھا کہ وہ شاہ دمشق کو سرم کے خلاف بھڑکا کر شنزادی اور سرم کو کمر

دیتا۔ یہ باتیں سوچنے کے بعد اس نے اسد الدین کے کہنے پر عمل کیا اور اپنے گھوڑ

حماہ کی طرف موڑ دیا جو ان حالات میں سب سے زیادہ محفوظ جگہ معلوم ہوتی تھی۔

حماہ اور قلعہ شیزار پاس واقع تھے۔ سرم اور شنزادی اپنے گھوڑے راستے

کر ایک جگہ چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ سوار ان کے قریب سے گزرے تو سرم اور

دونوں ہی حیران رہ گئے۔  
”جینا۔ یہ کلائیڈ تمہارے پیچھے کیسے آگیا؟“ سرم نے بڑی حیرانی سے پوچھا۔

”سرم۔ یہ صرف حیرانی ہی نہیں بلکہ خطرے کی بھی بات ہے۔“ شنزادی نے

”اس کی آمد یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اس نے یا اس کے کسی آدمی نے مجھے لشکر

دیکھ لیا ہے۔“  
”اس کا مطلب یہ بھی تو ہے کہ کلائیڈ یا اس کے آدمی تمہارے لشکر میں

اور انہیں تمہارے فرار کا منصوبہ بھی معلوم ہو گیا تھا۔“ سرم نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”بات کچھ بھی ہو مگر اب ہمارا حماہ جانا ٹھیک نہیں۔ ہمیں یہیں سے واپس

چاہیے۔“ شنزادی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔  
”یعنی تم پھر اپنے لشکر میں واپس جانا چاہتی ہو؟“

”مجبوری ہے سرم۔“ شنزادی کا لہجہ غمگین ہو گیا۔ ”مگر تم یہ نہ سمجھنا کہ جینا

چھوڑنا چاہتی ہے۔ اگر تم کو تو میں تمہارے ساتھ تمہارے لشکر میں چل سکتی ہوں۔“

”دل چھوٹا نہ کرو جینا۔“ سرم نے پیار سے کہا۔ ”مجھے تمہاری محبت پر

ہے۔ مجھے تمہارے واپس جانے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن اگر یہ بات سچ ہے کہ کلائیڈ

آدمی تمہارے لشکر میں شامل ہو گئے ہیں تو ان کا کوئی مقصد بھی ہو گا۔ یہ بھی تو

ہے۔۔۔۔۔“

”ٹھہرو سرم۔“ شنزادی نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تمہاری بات سے اتفاق

کلائیڈ نے اپنے آدمی میری حفاظت کو تو نہیں بھیجے ہوں گے۔ وہ ضرور مجھے حاصل

ہو گا۔“

شہزادی اور سرم ایک طرف بے تحاشا بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ ان کا درمیانی فاصلہ لگ بھگ کم ہوتا جا رہا تھا۔ آخر وہ اس قدر قریب آ گئے کہ سرم نے ان کی گنتی بھی کر لی۔ ان کا تعداد دس تھی۔ سرم اور شہزادی گھبراہٹ کی وجہ سے راستے سے ہٹ گئے۔ انہیں رف اپنے بچاؤ کی فکر تھی۔

”جینا۔ تم اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرو۔“ سرم نے دلیری سے کہا۔ میں ان بچوں کا راستہ روکتا ہوں۔ تم اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی پہنچ سے دور نکل دو۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتی سرم۔“ شہزادی نے رفتار اور تیز کر دی۔ ”ہم نے ایک ساتھ بچنے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر میں تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتی ہوں۔“

”جینا۔ یہ وقت وفاداری دکھانے کا نہیں۔“ سرم نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ایک ساتھ بچنے سے ہم دونوں ہی مارے جائیں گے۔ الگ ہونے کی صورت میں تم بچ سکتی ہو اور رہنے بچ جانے کا امکان بھی ہے۔ اگر تقدیر میں ہے تو پھر کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔“

”اور کچھ نہ کو جینا۔“ سرم کی آواز بھی بھرا رہی تھی۔ ”سامنے کچھ درخت اور لڑیاں نظر آتی ہیں۔ تم درختوں کی طرف گھوم جانا۔ میں تعاقب کرنے والوں کو اپنے پیچھے

بدان کی طرف لے جاؤں گا۔ یہی چند لمحے تمہارے لیے قیمتی ہوں گے۔ جس طرف کو ہارے اور بلا جھجک چل پڑنا۔ خدا مرہبان ہو تو منزل مسافر کو خود اپنی طرف کھینچتی ہے۔“

میدان کے ایک طرف درخت اور پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ سرم کچھ دور تو

فخوں کے ساتھ ساتھ گھوڑا بھگاتا رہا پھر اس نے ایک دم اپنا گھوڑا کھلے میدان کی طرف

ڑیا۔ سرم کی یہ ترکیب کامیاب رہی۔ تعاقب کرنے والے اس کے پیچھے پیچھے میدان

ماگھوڑے بھگاتے رہے۔ شہزادی جینا نے فوراً ”وقت سے فائدہ اٹھایا اور درختوں کی آڑ

ملاوہری طرف نکل گئی۔ اس راستے یا اپنی منزل کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اس نے راسیں ڈھیلی

دیں اور گھوڑا اپنی مرضی کے مطابق ایک طرف بھاگ رہا تھا۔

سرم کے سامنے کھلا میدان تھا۔ شہزادی جینا کی فکر بھی اسے نہ رہ گئی تھی۔ اس لیے

مانے شہزادی کے جوہر دکھانا شروع کئے۔ کلائیڈ کے سواروں کو اس نے جھکائیاں دے

کر پریشان کر دیا۔ وہ چھلاوے کی طرح ایک گول دائرے میں اپنا گھوڑا بھگا رہا تھا مگر

آب کرنے والے اسے پکڑنے سے قاصر رہے۔ کچھ دیر انہیں تھکانے کے بعد اس نے

رجزب کا رخ کیا۔ اس کا خیال تھا کہ شہزادی اس وقت تک بہت دور نکل چکی ہوگی۔

بالآخر بہت دور نکل چکی تھی۔ وہ تمام رات بغیر رکے آگے ہی آگے بھاگتی رہی اور جب

لیا تھا کہ لشکر اس مقام سے بہت آگے پہنچ چکا ہو گا جہاں انہوں نے اسے چھوڑا تو لیے انہوں نے گھوڑوں کی رفتار بہت تیز کر دی مگر ایک گھنٹے تک برق رفتاری سے دوڑانے کے باوجود وہ کسی بھی لشکر تک نہ پہنچ سکے۔ اس سے ان کی پریشانی بڑھ گئی۔ ”ہمارا لشکر کدھر نکل گیا؟“ سرم نے گھوڑا روکتے ہوئے جیسے خود سے سوال کیا ”تمہارا کیا میرے لشکر کا بھی کہیں پتہ نہیں۔“ شہزادی نے بھی گھوڑے کی کھینچ لیں۔

”حیرت تو اس بات کی ہے کہ کسی لشکر کا بھی پتہ نہیں۔“ سرم نے کہا۔ ”قطعیہ کا لشکر تو اتنا بڑا تھا کہ وہ گنتی ہی تیز رفتاری سے چلا مگر اتنے عرصے میں یہاں نہیں پہنچ سکتا۔“

شہزادی بہت گھبرا رہی تھی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”سرم یہ کون سی جگہ۔ لوگ اس وقت کہاں ہیں۔؟“

”یہ سوال تو میں تم سے کرنے والا تھا جینا۔“ سرم بولا۔ ”تمہاری ریاست اہل یہاں سے بہت قریب ہے۔ یہاں کے راستوں سے تمہیں واقف ہونا چاہیے۔“

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔ گھوڑا آگے بڑھاؤ۔ کہیں کوئی مصیبت نہ اڑے۔“ شہزادی اپنے گھوڑے کو ایڑ دی۔

”میرا خیال ہے کہ ہمیں دمشق کا رخ کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ میرا لشکر ادا گیا ہو۔“ یہ کہتے ہوئے سرم نے بھی گھورا بڑھایا اور اپنا رخ جنوب کی طرف کر لیا۔

”سرم۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم بغیر کسی رہبر کے دمشق پہنچ جائیں گے۔؟“ کے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ اسے معلوم تھا کہ دمشق یہاں سے بہت دور۔

بغیر کسی مدد کے وہاں تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہے۔

”جینا۔ میرا اندازہ ہے کہ ہم جنوب کی طرف جا رہے ہیں۔“ سرم نے اسے تلو

”اگر ہماری سمت درست ہے تو ہم دمشق ضرور پہنچیں گے۔“ اسی وقت چند سوار سامنے سے آتے دکھائی دئے۔ سرم اور شہزادی جس جگہ

اس کے پلوں طرف کھلا ہوا میدان تھا اور دور دور تک کوئی چھپنے کی جگہ نظر نہ آتا

”پائیں جانب گھوڑا موڑ دو جینا۔“ اور اس کے ساتھ ہی سرم نے اپنا رخ بدل

آنے والے سوار کلائیڈ کے اس دستے سے تعلق رکھتے تھے جنہیں شہزادی

ہڑونگ چاکر گرفتار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ شہزادی کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک

جلدی کھانا کھایا اور تیار ہو کر ایک بار گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ وفادار جانور کو بھی کچھ آرام مل گیا تھا۔ ایڑ پاتے ہی وہ سوار کو لے کر ہوا کے سمندر میں تیرنے لگا۔ سرم نے منزل پر پہنچ کر منزل سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس نے کارواں سرائے کے مالک سے حماہ جانے کا راستہ پوچھ لیا تھا اور اس کا گھوڑا اس وقت حماہ کی سمت اڑا رہا تھا۔

نیک اسی وقت اسی شہر کی ایک دوسری کارواں سرائے میں شہزادی جینا مغموم آواز میں مالک سرائے سے اپنی کہانی بیان کر رہی تھی۔ ”میں ایک مسلم سردار کی نو مسلم بیوی ہوں۔ میں اور میرا شوہر حماہ کے قریب چاندنی رات کی سیر کر رہے تھے کہ نصرانیوں نے میں کو گھیر لیا۔ ہم دونوں جان بچا کر بھاگے۔ میں یہاں پہنچ گئی مگر پتہ نہیں میرے شوہر پر باگڑی۔ اگر اس کی جان بچ گئی ہوگی تو وہ شاید اپنے وطن دمشق گیا ہو گا کیونکہ وہ دمشق کے بادشاہ کے محافظ دستے کا ایک سردار ہے۔“

شہزادی نے یہ کہانی بہت سوچ سمجھ کے ترتیب دی تھی۔ وہ اپنے اور سرم کے بارے میں صرف اتنا ہی بتانا چاہتی تھی جتنا اس کے خیال میں ضروری تھا۔ اس نے یہ بھی اندازہ لیا تھا کہ مالک کارواں سرائے ایک سیدھا سادا سا انسان ہے۔ اس لیے اس نے قلعہ زار یا شہنشاہ قسطنطنیہ کے کسی لشکر کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ مالک سرائے تھا تو ان پڑھ اور بے علم سا آدمی لیکن دمشق کا نام پر وہ چونک اٹھا۔ اس نے یہ سن رکھا تھا کہ دمشق کا شاہ نصرانیوں سے ملا ہوا ہے اور مسلمانوں سے اس کی ان بن ہے۔ شہزادی نے جو کچھ سنا اس نے بڑی خاموشی سے سن لیا، پھر وہ خاموشی کے ساتھ سرائے سے باہر نکلا اور ب کے گورنر کی حویلی پر پہنچا۔ اس نے حویلی کے کارندوں کو اطلاع دی کہ اس کی سرائے میں ایک نو مسلم خاتون مقیم ہے جو حماہ سے آئی ہے اور خود کو شاہ دمشق کے کسی دار کی بیوی بتاتی ہے۔

اس وقت شہر کو تو بال حویلی پر آیا ہوا تھا۔ مالک سرائے کی رپورٹ سن کر اس کے کان زلزلے ہو گئے۔ وہ ملکی اور غیر ملکی حالات سے پوری طرح آگاہ تھا۔ اس نے مالک سرائے کو دیکھ کر حکم دیا اور گورنر کے پاس چلا گیا۔ گورنر اس اطلاع پر بہت حیران ہوا۔ امیر زنگی کا ماتحت تھا۔ امیر زنگی نے موصل سے شیراز کی طرف روانگی کے وقت اسے لایا تھا کہ حلب میں اسے جانے والوں پر کڑی نگاہ رکھے اور اگر نصرانی لشکر حلب کا رخ کرے تو وہ قلعہ بند ہو کے کمک کا انتظار کرے۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ شاہ دمشق نصرانیوں کے مالک کر حلب پہنچنا بڑا حیرت انگیز تھا۔

حلب کے گورنر نے شہر کو تو بال کو حکم دیا کہ وہ خود سرائے جائے اور نو مسلم خاتون

صبح ہوئی تو اس نے خود کو حلب کی حدود میں پایا۔ حلب مسلمانوں کا علاقہ تھا اور عماد الدین زنگی کی ماتحت تھا۔ جینا نے سکھ کا سانس لیا اور فیصلہ کیا کہ وہ حلب میں سرم کے آنے کا انتظار کرے گی۔

قسمت نے سرم کو بھی حلب پہنچا دیا۔ صبح ہوتے ہوئے سرم اور اس کا چچا والے حلب کے علاقے میں پہنچ گئے۔ اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس سرم کے جسم میں توانائی آگئی مگر اس کا تعاقب کرنے والوں کی جان پر بن گئی احساس ہوا کہ وہ کسی مسلم علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔ انہوں نے فوراً اپنے گھوڑے پھر گھوم کر سر پر پیر رکھ کے باگ کھڑے ہوئے۔ سرم پر یہ رات بہت بھاری گزری تھی اس رات کے دوران اتنے بہت سے واقعات بیک وقت رونما ہوئے تھے جنہیں انسانی ذہن پریشان ہو جاتا ہے اسی رات شہنشاہ قسطنطنیہ مع اپنے نصرانی حلیفوں کے قلعہ چھوڑ کر اس طرح غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ سرم کو تو صرف شہزادی کے حالات کا علم تھا اور یہی اس کے لئے بہت حیران کن تھا۔ اگر اسے دیتا کہ اسی رات کلائیڈ اور اسد الدین میں بھی ایک سخت مکالمہ ہوا ہے تو شاید سے پاگل ہو جاتا۔

اس سخت اور گھبر رات گزرنے کے بعد جب صبح کا سورج بلند ہوا تو شیراز نصرانیوں سے پاک ہو چکا تھا۔ قلعہ شیراز اور زنگی لشکر میں نصرت کے نعرے بلند تھے اور ایک مدت کے بعد اسد الدین اپنے آقا عماد الدین زنگی کی طرف واپس دراصل صرف اسد الدین ہی اپنی منزل تک پہنچا تھا۔ سرم اور شہزادی جینا اب پھر رہے تھے۔ سرم اپنی منزل پر پہنچ کے بھی منزل سے ہٹک گیا تھا۔ اس کی جان منزل شہزادی جینا کو تھی اور وہ اس وقت حلب ہی میں تھی جب سرم حلب کی ایک نماز کے بعد سجدہ شکر ادا کر رہا تھا۔

سرم مسجد سے باہر آیا تو اس کا دماغ سخت پریشان تھا۔ وہ مسلم علاقے نصرانیوں کے خوف سے بھی اسے چھکارا مل گیا تھا مگر شہزادی کی جدائی نے اس کو گھٹا دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ شہزادی کو کس جگہ تلاش کر جائے یا انتظار کیا۔ انہی دو جگہوں پر اس کے پہنچنے کی امید تھی۔ تیسری جگہ حماہ جہاں امیر زنگی کا لشکر خیمہ زن تھا۔ اسد الدین نے سرم کو امیر زنگی کے پاس جا دیا تھا۔ دوپہر تک سرم شہر کی ایک کارواں سرائے میں ٹھہرا۔ صبح سے اس کر رہا تھا۔ اس نے تر سے کر لگائی تو فوراً ”نیند آگئی۔ دوپہر کو وہ بیدار کے

میرا نام جینا لو کہے کہ حلب کا گورنر اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ اندھا کیا ہے۔  
آئیں۔ شہزادی جینا نے اپنی مختصر رام کہانی مالک سرائے کو اسی وجہ سے سنائی

اسے کسی طرح گورنر کے دربار میں رسائی حاصل ہو لیکن جب مالک سرائے اس  
سن کر چپ چاپ وہاں سے چلا گیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کے دل میں حلب والوں

لے بڑا غلط تاثر پیدا ہوا۔ اسے افسوس بھی ہوا کہ وہ ایک غلط جگہ پہنچ گئی ہے جہاں  
مشکلات کم ہونے کے بجائے اس میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ شہزادی نے فیصلہ کیا کہ

چار دن سے زیادہ حلب میں سرم کا انتظار نہیں کرے گی اور کسی اور شرکی فرزند  
جائے گی۔  
شر کو تو ال نے شہزادی کو گورنر کا پیغام سنایا۔ شہزادی کو خوشی سے باچیں کل

وہ فوراً چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ مسلم خواتین عام طور پر چہرے  
ذاتی ہیں اس لیے جب وہ گورنر کی حویلی پر پہنچی تو اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ گورنر

اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی اور کھڑے ہو کر اسے خوش آمدید کہا۔ شہزادی نے بڑے  
سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”خاتون۔ مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ تم حماۃ سے آ رہی ہو؟“ گورنر نے فرما  
پوچھا۔

”آپ کو صحیح خبر دی گئی ہے گورنر بہادر۔“ شہزادی جینا نے اطمینان سے جواب  
”مگر حماۃ اور قلعہ شیزار کا علاقہ تو جنگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا ہے؟“ گورنر

شہزادی کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔  
شہزادی چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ گورنر بہادر مجھے

رہے ہیں۔ آپ کا شبہ کرنا بھی درست ہے۔ حماۃ کا علاقہ واقعی جنگ کی لپیٹ میں  
اب وہاں کچھ نہیں ہے۔ میدان صاف ہو چکا ہے۔“

”خاتون۔ کیا کہہ رہی ہو تم۔ وہاں تو نصرانیوں اور مسلم لشکر نبرد آزما ہیں اور  
رہی ہو کہ میدان صاف ہے۔“ گورنر کا شبہ اور زیادہ بڑھ گیا۔ ”میں یہ نہیں

دروغ بیانی سے کام لے رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم جس جگہ سے آئی وہاں  
ہو رہی ہو؟“

شہزادی ایک بار پھر تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ  
تقاضا یہی ہے کہ تمام باتیں سچ بیان کر دی جائیں۔ شاید اس سے کوئی بہتر صورت

آخر شہزادی نے کہا۔ ”گورنر صاحب۔ اب میں آپ کے اختیار میں ہوں۔ آپ

سے درخواست کرے کہ حلب کا گورنر اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔ اندھا کیا ہے۔  
آئیں۔ شہزادی جینا نے اپنی مختصر رام کہانی مالک سرائے کو اسی وجہ سے سنائی

اسے کسی طرح گورنر کے دربار میں رسائی حاصل ہو لیکن جب مالک سرائے اس  
سن کر چپ چاپ وہاں سے چلا گیا تو اس کا دل ٹوٹ گیا۔ اس کے دل میں حلب والوں

لے بڑا غلط تاثر پیدا ہوا۔ اسے افسوس بھی ہوا کہ وہ ایک غلط جگہ پہنچ گئی ہے جہاں  
مشکلات کم ہونے کے بجائے اس میں مزید اضافہ ہو سکتا ہے۔ شہزادی نے فیصلہ کیا کہ

چار دن سے زیادہ حلب میں سرم کا انتظار نہیں کرے گی اور کسی اور شرکی فرزند  
جائے گی۔  
شر کو تو ال نے شہزادی کو گورنر کا پیغام سنایا۔ شہزادی کو خوشی سے باچیں کل

وہ فوراً چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ اسے معلوم تھا کہ مسلم خواتین عام طور پر چہرے  
ذاتی ہیں اس لیے جب وہ گورنر کی حویلی پر پہنچی تو اس کے چہرے پر نقاب تھا۔ گورنر

اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی اور کھڑے ہو کر اسے خوش آمدید کہا۔ شہزادی نے بڑے  
سے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”خاتون۔ مجھے اطلاع دی گئی ہے کہ تم حماۃ سے آ رہی ہو؟“ گورنر نے فرما  
پوچھا۔

”آپ کو صحیح خبر دی گئی ہے گورنر بہادر۔“ شہزادی جینا نے اطمینان سے جواب  
”مگر حماۃ اور قلعہ شیزار کا علاقہ تو جنگ کے شعلوں میں لپٹا ہوا ہے؟“ گورنر

شہزادی کو مشکوک نظروں سے دیکھا۔  
شہزادی چند لمحے کچھ سوچتی رہی پھر بولی۔ ”میرا خیال ہے کہ گورنر بہادر مجھے

رہے ہیں۔ آپ کا شبہ کرنا بھی درست ہے۔ حماۃ کا علاقہ واقعی جنگ کی لپیٹ میں  
اب وہاں کچھ نہیں ہے۔ میدان صاف ہو چکا ہے۔“

”خاتون۔ کیا کہہ رہی ہو تم۔ وہاں تو نصرانیوں اور مسلم لشکر نبرد آزما ہیں اور  
رہی ہو کہ میدان صاف ہے۔“ گورنر کا شبہ اور زیادہ بڑھ گیا۔ ”میں یہ نہیں

دروغ بیانی سے کام لے رہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم جس جگہ سے آئی وہاں  
ہو رہی ہو؟“

شہزادی ایک بار پھر تھوڑی دیر تک خاموش رہی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ  
تقاضا یہی ہے کہ تمام باتیں سچ بیان کر دی جائیں۔ شاید اس سے کوئی بہتر صورت

آخر شہزادی نے کہا۔ ”گورنر صاحب۔ اب میں آپ کے اختیار میں ہوں۔ آپ



امیر غلام الدین زنگی لشکر لے کر موصل واپس آگیا۔ اسے ملیوں کی پسائی کی جس  
شہنشاہی اس سے کہیں زیادہ اسے معین الدین انز پر غصہ تھا۔ انز کی موجودگی میں اس  
لشکر قبضہ ہونا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ امیر اس فکر میں تھا کہ دمشق پر لشکر کشی کے  
لئے بہت سے کام لیا جائے تو شاید زیادہ بہتر ہو۔ آج اس سلسلے میں اس نے  
امیر غلام الدین کی تفصیل گفتگو کی تھی اور ایک نئے منصوبے پر غور کیا گیا تھا۔ اس منصوبے  
میں انز کی ذمہ داری بھی امیر نے اسد الدین کے سپرد کی تھی۔ اسد الدین اپنے امیر کے  
لشکر سے خطرناک کام کرنے پر آمادہ رہتا تھا۔ لیکن موجودہ منصوبے میں اسے دربار  
چاہتا تھا۔ اسے وہاں جانے میں کوئی عذر نہ تھا لیکن شیزار کے محاصرے میں اس کا  
لدین انز سے سامنا ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ فکر مند تھا کہ کہیں انز اس کی مخالفت نہ  
اور بنا ہوا کام بگڑ جائے۔

اسد الدین انہی خیالات میں ڈوبا ہوا دربار زنگی سے باہر آیا۔ فکر و تردد کے آثار اس  
سے بے نمایاں تھے۔ وہ سر جھکائے ہوئے اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا اور چاہتا تھا کہ  
دربار امیر سے غائب ہو کر اس کے کانوں میں ایک شناسا آواز آئی۔

امیر اسد مجھ غریب کا سلام قبول فرمائیے۔“

اسد الدین نے چونک کے نظریں اٹھائیں اور اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ”ارے  
میں تاکا۔“

نہیں دیکھ کر جس قدر خوشی ہوئی ہے سرم، میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔“ اسد  
نے سرم کو الگ کر کے اس کے کندھے پر محبت سے ہاتھ رکھا۔

اس نے سرم سے کہا۔ ”میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ موصل میں ہیں۔“  
وہ اسے میرا وطن ہے۔ میرا گھر ہے۔ میں یہاں نہیں ہوں گا تو پھر کہاں جاؤں گا۔“  
اسد نے خیالی میں کتا چلا گیا۔ ”تم نے بڑا اچھا کیا کہ موصل آگئے۔ اب تمہیں کسی  
بڑائی نہیں ہوگی۔“

اسد نے تعجب سے اسد الدین کو دیکھ رہا تھا۔ ”سردار۔ آخر میری دعا قبول ہوئی  
کا امیر زنگی سے پھر میل ہو گیا۔ میں تو آپ کے کہنے کے مطابق امیر زنگی کے  
سے وابستہ ہونے آیا تھا مگر مجھے ابھی کچھ دیر پہلے معلوم ہوا کہ اب بھی موصل میں  
مالدار دربار گئے ہوئے ہیں۔ بس میں سیدھا دربار آگیا۔“

”خاتون۔ تم نے ایک بہت بڑی خوش خبری سنائی ہے گورنر نے سرم سے کہا۔“  
نہیں کہ تمہاری باتوں کا اعتبار نہ کیا جائے۔ بہر حال اب تم میری مہمان ہو اور  
چاہو یہاں ٹھہر سکتی ہو یا پھر جہاں جانا چاہو تمہیں بھجوا دیا جائے گا۔ میں تمہارے  
دمشق یا حماہ میں تلاش کرانے کی پوری کوشش کروں گا۔“

دوسرے ہی دن شہزادی جینالو کی باتوں کی تصدیق ہو گئی۔ حلب کے جاسوسوں  
کو اطلاع دی کہ نصرانی لشکر اس طرح واپس جا رہا ہے جیسے اس نے میدان جنگ میں  
کا منہ دیکھا ہو۔ گورنر نے فوراً فتح کا جشن منانے کا اعلان کر دیا پھر شہزادی کو  
کہا۔ ”خاتون۔ تمہاری باتوں کا ایک ایک لفظ سچ ثابت ہوا۔ مجھے تو یہ بھی بتایا گیا کہ  
قطنیہ اور یہاں کے نصرانی شاہوں میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہے اور شہنشاہ  
صلیبی جنگ ختم کر کے قطنیہ واپس جا رہا ہے۔ اب تم بتاؤ کیا چاہتی ہو۔ راستے  
چکے ہیں۔ جس ملک جانا چاہو میں تمہارے جانے کا انتظام کرا دوں۔“

”میں آپ کی عزت افزائی کی سکر گزار ہوں گورنر نثار۔“ شہزادی نے جواب  
”فی الحال میں کچھ دن آپ کے سامنے میں گزاروں گی۔ اگر کسی طرح ممکن ہو سکے  
دمشق۔ حماہ اور موصل میں یہ بات مشہور کرا دیں کہ انتظامیہ کی شہزادی جینالو  
مہمان ہے۔ اس سے مجھے یہ فائدہ ہوگا کہ اگر سرم کسی جگہ موجود ہے تو فوراً حلب  
کرے گا۔“

”گورنر حیرت بھری نظروں سے شہزادی کو دیکھ رہا تھا۔ ”آپ شہزادی ہیں۔  
کے شاہی خاندان سے آپ کا تعلق ہے؟“

”کیسی تھا گورنر بہادر۔“ شہزادی مسکرائی۔ ”اب تو میری کل کائنات سرم ہے۔  
جائے تو میری دنیا آباد ہو جائے۔“ یہ کہتے ہوئے شہزادی مغموم ہو گئی۔

”آپ فکر نہ کیجئے شہزادی۔“ گورنر نے اسے یقین دلایا۔ میرے جاسوس آج ہی  
جگہ روانہ ہو جائیں گے۔ ان کے سپرد یہ کام بھی ہوگا کہ وہ بذات خود سرم کو تلاش  
اور اگر وہ مل جائیں تو انہیں لے کر فوراً حلب کا رخ کریں۔“

گورنر نے شہزادی مہمان خانے میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ پھر شہر میں جشن کا مال  
نکل گیا۔ پورا حلب سرم میں ڈوبا ہوا تھا۔ گورنر نے ایک ہفتے تک جشن منانے کا  
تھا۔



”جھاکا۔ خیر اب اطمینان سے موصل میں رہو۔“ پھر کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”دمشق غارت جانے والی ہے اگر شہزادی وہاں پہنچ گئی ہے تو میں اسے ضرور تلاش کر لوں

”کیا آپ دمشق جا رہے ہیں سردار؟“ سرم بے چین ہو گیا۔

”ہاں سرم۔ اب تک تو میں جانے والا تھا لیکن شاید اب اس میں کچھ تبدیلی ہو

”میں سردار۔ آپ دمشق ضرور جاییں۔ آپ جائیں گے تو شہزادی کو ضرور تلاش کر

”اور اگر تم دمشق جاؤ تو؟“

”میں کیسے جا سکتا ہوں سردار۔“ انز نے شاہ دمشق کو خوب کان بھرے ہوں گے۔ وہ راز کرانے کی کوشش کرے گا۔“

”کچھ بھی نہیں ہوگا سرم۔“ اسد الدین مسکرایا۔ ”اچھا پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ میرزگی کے پاس کس طرح پہنچا۔“

”فرد۔“ فرد سردار۔ میں تو یہ سننے کے لئے بے چین ہوں مجھے اپنی کہانی ذرا تفصیل

”میری کہانی!“ اسد الدین مسکرایا۔ میری کہانی صرف ایک جملے میں ختم ہو جائے گی ایک جملہ یہ ہے کہ میں اپنے آقا امیرزگی سے ایک لمحے کے لیے بھی جدا نہیں

”سردار!“ سرم نے حیران ہو کر دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں۔ کیا فرما رہے ہیں آپ؟“

”مہم۔ یہ ایک راز تھا۔“ اسد نے عجیبی اختیار کی۔ اور راز صرف اس وقت تک

رہتا ہے جب تک انسان کے سینے میں دفن رہے مگر اب یہ راز راز نہیں رہا۔ دراصل

امیر کے ایک باغی سردار کا روپ دھار کر شہنشاہ قسطنطنیہ کے دربار میں گیا تھا۔ یہ ایک

فنی خدمت تھی جسے میں نے امیر کے حکم پر تکمیل کے آخری مرحلے تک پہنچایا اور

شہنشاہ اور تمام نصرانی بادشاہ میرے آقا کے خوف سے محاصرہ چھوڑ کے بھاگ کھڑے

”اسد الدین ایک دم پریشان ہو گیا۔ اس نے سرم کو یہ بتایا تھا کہ اس

چھوڑ دیا بن اور اب کمال خوشی میں اس بات کو بالکل ہی بھل گیا تھا۔ اس

آپ کو سنبھالا ”سرم تمہاری دعا تو اسی وقت قبول ہو گئی۔ تھی جس وقت

سامنے دعا کی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ خاص موقع پر تمہیں اصل حالات

گا۔ اب وہ وقت آگیا ہے۔ میرے ساتھ چلو۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنا

پریشان تھا مگر تمہارے آنے سے شاید میری پریشانی ختم ہو جائے گی۔“

”میں آپ کا خادم ہوں سردار۔“ سرم نے پورے خلوص سے کہا۔

”خادم نہیں۔ تم ایک اچھے اور قابل اعتماد دوست ہو سرم۔“

دونوں جب اسد الدین کی حویلی پر پہنچے تو گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہوا

دوپہر کے کھانے سے تک چلا رہے۔

”ہاں سرم۔ سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ تمہاری وہ شہزادی کہاں ہے۔ میں

کہ تم تنہا آئے ہو۔ اس بے چاری کو کہاں چھوڑ آئے؟“ اسد الدین نے

میں بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔

شہزادی کا نام سن کر سرم کا غم تازہ ہو گیا اور ایک سرد آہ اس کے سینے

رہ گئی۔ ”سردار۔ یہ داستان بہت طویل ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ شہزادی میر

مجھ سے دور ہو گئی۔ میں نے آپ کے کہنے کے مطابق شہزادی کو اس بات پر

تھا کہ پسائی کے دوران ہم دونوں اپنے اپنے لشکر سے الگ ہو کر امیرزگی کے

جائیں گے مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا۔ کلائیڈ کے آدمیوں نے ہمیں راتے

میں نے کسی نہ کسی طرح انہیں تھوڑی دیر کے لیے الجھا لیا اور شہزادی کو

موقع مل گیا لیکن میں بھی اس سے جدا ہو گیا۔ جب سے اب تک اکیلا بکرا

۔“

”مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے سرم۔“ اسد الدین غمگین لہجے میں بولا۔

میری بھی لمبھیز ہو گئی تھی لیکن شہزادی اس کے ساتھ نہ تھی۔ اس کا

شہزادی بچ کے کسی محفوظ مقام پر بچ گئی ہے کیا تم شہزادی کے وطن انطاکیہ

”نہیں سردار۔ ہم نے انطاکیہ کا تو رخ ہی نہیں کیا تھا۔“ سرم نے بتایا

واپس جا رہے تھے کہ ہمارا راستہ روک لیا گیا۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ دمشق پہنچ گئی ہو۔ وہاں سے معلوم کرنا تھا؟“

”میں نے دمشق جانا مناسب نہیں سمجھا سردار۔“

”سردار۔ یہ کیسی سفارت ہوگی۔ کچھ مجھے تو بتائیے؟“ سرم کا ایک بے  
فارغ ہوا تو دوسری حیرت میں الجھ گیا۔

”غور سے سنو سرم۔“ اسد الدین سنبھل کے بیٹھ گیا۔ ”تم اس بات  
گے کہ دمشق نے لھرائیوں کا ساتھ دے کر مسلمانوں کے کردار پر ایک م  
ہے۔“

”سردار۔ قطع کلاہ کی معافی چاہتا ہوں۔“ سرم نے کہا۔ ”اس میں ش  
قصور نہیں۔ دمشق کی حکومت پر معین الدین انز چھایا ہوا ہے۔ یہ سب ک  
ہے۔ شاہ عالی مقام اس سلسلے میں بالکل بے قصور ہیں۔ وہ مسلمانوں کے  
اس بات کی قسم کھا سکتا ہوں۔“

”میرے آقا کا بھی یہی خیال ہے سرم۔“ اسد الدین نے کہا۔ ”انہیں  
پر سخت غصہ ہے۔ دمشق کے معاملات سنبھالنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو  
بھرپور حملہ کر کے اس کی طاقت ہمیشہ کے لئے ختم کر دی جائے یا پھر معین  
اثر کو کسی سیاسی چال سے زائل کیا جائے۔ دمشق سے جنگ کی صورت میں  
دمشق کا ساتھ دے گا۔ اس طرح نہ صرف مسلمانوں کا مسلمانوں کے ہاتھوں  
بلکہ لھرائی مسلمانوں کی طاقت کی کمزوری سے فائدہ اٹھائیں گے ممکن ہے کہ  
ریاستیں بھی مسلمانوں کی اس خانہ جنگی میں شامل ہو جائیں اور ایک بار  
طاقت کو ملک شام کا رخ کرنے کا موقع مل جائے۔“

”سردار نے جو کچھ فرمایا اس میں ذرا برابر بھی شبہ نہیں بلکہ حالات اس  
ہو سکتے ہیں۔“ سرم نے بڑی پریشانی کے عالم میں کہا۔ ”سردار کیا کوئی دوسری  
ہو سکتی جس سے سانپ بھی مرجائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے؟“

”دوسری صورت موجود ہے سرم۔“ اسد الدین بولا۔ ”اسی کو میں نے  
نام دیا ہے۔“

”مجھے سمجھائیے سردار۔“ سرم نے جلدی سے کہا۔ ”دمشق کی تباہی۔  
میرے روٹنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

”تم نے شاہ دمشق کی والدہ محترمہ کو تو دیکھا ہوگا؟“

اسد الدین کے اس اچانک سوال سے سرم گھبرا گیا۔ ”سردار۔ آپ کا  
زمرہ خانم کی طرف ہے۔“

”ہاں۔ ہاں سرم۔ میں انہی کے متعلق پوچھ رہا ہوں۔“ اسد الدین نے ف

”ملکہ مادر بڑی نیک، منسا اور سمجھ دار خاتون ہیں۔“ سرم نے بتایا۔ ”ان کے بھی  
ام ضروری کام میرے ہی سپرد ہیں۔ ہفتے میں ایک دوبار مجھے ان کے محل میں حاضری دینا  
پڑتی ہے۔ ملکہ مادر پردے کی سخت پابند ہیں۔ معین الدین انز سے انہیں بڑی نفرت ہے مگر  
انز کا اثر زائل نہیں کر سکتیں۔“

”تم نے ملکہ مادر کی پوری تفصیل بیان کر دی سوائے ایک بات کے۔“ اسد الدین نے  
سرا کے کہا۔

”آپ اور کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں سردار؟“ سرم نے بے چینی سے پوچھا۔

”یہی کہ ان کی عمر کیا ہے اور شکل و صورت؟“

”نہایت دل آویز شخصیت کی حامل ہیں۔ عمر پچیس سال ہے مگر دیکھنے میں تیس سے کم  
علوم ہوتی ہیں۔“ سرم نے تجسس نظروں سے اسد الدین کو دیکھا۔ ”مگر آپ یہ سب کچھ  
کیوں معلوم کرنا چاہتے ہیں؟“

”ہمارے امیر زنگی اور ملکہ مادر زمرہ خانم کی جوڑی کیسی رہے گی؟“ اسد الدین نے  
سرم کی بات سنی ان سنی کر دی۔

”جی۔۔۔۔۔ سردار۔۔۔۔۔!“

”اس کی شادی ہو جائے تو کیسا رگے گا؟“

سرم چند لمحے سوچتا رہا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اب میں سمجھا سردار۔ خدا کی قسم  
اگر ایسا ہو جائے تو پھر پو بارہ ہیں۔ ایک پختہ دو کاج کی مثال پوری صادق آئے گی۔ کسی کی  
کعبہ بھی نہیں پھوٹے گئی اور معین الدین انز کا اثر و دبہ ختم ہو کر رہ جائے گا۔ مگر یہ  
نکل مڑے کیسے چڑھے گی۔“

”یہ کام تمہیں کرنا ہوگا سرم میں چاہتا ہوں کہ کامیابی کا سرا تمہارے گلے میں ڈالا  
جائے۔“

”مگر کیسے سردار۔ انز تو مجھے دیکھتے ہی نہ معلوم کیا کر بیٹھے۔“ سرم میں گھبراہٹ پیدا ہو  
گئی۔

”تمہیں فکر کی ضرورت نہیں سرم۔“ اسد الدین نے اسے حوصلہ دیا۔ ”اس سیاسی  
ٹھنڈی پر میرے اور امیر زنگی کے درمیان بہت گفتگو ہوئی ہے۔ دمشق کو خون خرابے سے  
بچانے کی یہی واحد ترکیب ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں براہ راست ملکہ مادر سے گفتگو کی  
کوشش کروں۔ لیکن ملکہ مادر کے لئے میں اجنبی ہوں مگر تم اسی دربار سے وابستہ ہو۔ ملکہ  
مادر کو قائل کرنے اور ان کی تائید حاصل کرنے میں جو کردار تم ادا کر سکتے ہو وہ میرے

لئے مشکل ہے۔“

”میں آپ کا تابعدار ہوں سردار۔“ سرم نے سر تسلیم خم کر دیا۔ ”آپ جو کہ وہ بجلاؤں گا۔“

”سرم تمہارے دمشق جانے میں فائدے کی ایک اور صورت بھی نظر آئی ہے الدین نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اگر شہزادی جینا وہاں موجود ہے تو تمہارا نام سننے ہی پاس آجائے گی۔“

سرم خوش ہو گیا۔ ”سردار۔ اگر ایسا ہوا تو میں سمجھوں گا کہ ایک پتہ دو بجائے ایک پتہ تین کاج ہو جائیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے سرم کا چہرہ دلی مسرت اٹھا۔

دوسرے دن اسد الدین، امیر زنگی کے پاس جانے کی تیار کر رہا تھا کہ امیر آگیا۔

”امیر عالی مقام نے آپ کو یاد فرمایا ہے سردار اسد الدین۔“ غلام نے اسد اطلاع دی۔

”خیر تو ہے؟“ اسد الدین گھبرا گیا۔ امیر زنگی اپنے سرداروں کے ساتھ بڑا سختی کی اس سختی کی وجہ سے ہر سردار امیر سے خائف رہتا تھا۔

”بظاہر خیریت معلوم ہوئی ہے سردار۔“ غلام نے رسمی سا جواب دیا۔ ”سوا کے کہ امیر عالی مقام رات بھر کچھ بے چین سے رہے۔ شاید پوری نیند بھی نہ سکے۔“

”چہرے پر خفگی کے آثار تو نہیں؟“ اسد الدین نے مزید اطمینان کے لئے پوچھا۔

”خفگی تو نہیں لیکن چہرے سے کسٹندی ظاہر ہوتی ہے۔“ اسد الدین نے سرم کو جلد تیار ہونے کا اشارہ کیا پھر وہ دونوں غلام کے ساتھ کے محل روانہ ہوئے۔

امیر زنگی حد درجہ بے چین تھا۔ وہ اپنے خاص کمرے میں ٹہل رہا تھا اور قبا فرش پر بھی اس کے بھاری قدموں سے دھکم پیدا ہو رہی تھی۔ اسد الدین داخل

امیر نے اسے سلام کا موقع نہ دیا اور قدم روک کر اسد الدین کو غور سے دیکھا۔

الدین تمہاری آنکھوں میں غماز موجود ہے۔ کیا رات بھر جاگتے رہے ہو؟“ اسد الدین کو امیر کے نرم لہجے سے حوصلہ پیدا ہوا۔ سنبھل کے بولا۔ ”کل کی اہمیت نے غلام کو رات بھر سونے نہیں دیا۔“ اس کے ساتھ ہی اسد الدین ذرا

بجلا لیا۔ سرم نے بھی اس کی تقلید میں امیر کو بڑے سلیقے سے سلام پیش کیا۔

امیر نے سرم کی طرف اشارہ کیا۔ ”تمہارے ساتھ یہ اجنبی کون ہے؟“ ”یہ میرا با اعتماد دوست ہے۔“ اسد الدین نے کہا۔ ”قلعہ شیزار کے محاصرے کے میں نے ان کے خیمے میں قیام کیا تھا۔“

”یہ وہ شخص ہے جس کو تم نے میرے پاس آنے کا مشورہ دیا تھا۔“ امیر کو یاد آگیا۔ اسد الدین نے امیر سے سرم کا غائبانہ تعارف کرا دیا تھا۔ سرم اور شہزادی کی محبت کے بارے میں بھی اس نے امیر کو بتا دیا تھا۔

”امیر عالی مقام کی یادداشت کی غلام تعریف نہیں کر سکتا۔“ اسد الدین نے عاجزی مانا۔ ”مجھے یاد ہی نہ رہا کہ میں امیر عالی مقام سے سرم کا غائبانہ تعارف کرا چکا ہوں۔“

”سرم۔“ امیر نے یہ نام دہرایا۔ ”یاد آیا۔ تم نے یہی نام بتایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھی کہا تھا کہ اس کا تعلق شاہ دمشق کا محافظ دستے سے ہے۔“

”بجا ارشاد فرمایا امیر محترم نے۔“ اسد الدین نے اثبات میں سرم کو بھی جنبش دی۔ خدمت کے علاوہ سرم کے سپرد ملکہ مادر کے تمام ضروری احکامات کی تعمیل بھی ہے

میں دو چار بار انہیں ملکہ مادر کے حضور میں ضرور پیش ہونا پڑتا ہے۔“ ”غوب۔ بہت خوب۔“ اور امیر زنگی کچھ سوچنے لگا۔ امیر کو فکر میں ڈوبا دیکھ کر اسد

ہاتھوڑی دیر خاموش رہا پھر ادب سے بولا۔ ”امیر محترم نے اس غلام کو جو عزت بخشی اس نے میرے حوصلے بلند کر دیے ہیں اور میں اکثر اپنی حد سے تجاوز بھی کر جاتا

۔“ امیر نے قدرے ناگواری سے اسد الدین کو دیکھا۔ ”کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہے تم

”جی ہاں امیر محترم۔“ اسد الدین نے مجرم کی طرح سر جھکا دیا۔ ”سرم دربار دمشق

حکات شہی کا راز دار اور محرم خاص ہے خادم نے بغیر امیر محترم کی اجازت حاصل کئے اسے اس مسئلے پر گفتگو کی ہے جس کی تکمیل کے لیے مجھے منتخب کیا گیا ہے امید ہے کہ

اس جہالت کو معاف فرمایا جائے گا۔“ ”اسد الدین۔ یہ تمہاری غلطی نہیں بلکہ صبح راستے کی تلاش ہے۔“ امیر کے چہرے

لکڑی آگئی۔ ”میرا خیال ہے کہ سرم نے تمہیں ضرور کوئی بہتر مشورہ دیا ہوگا۔“ ”امیر کی عقل رسا کی داد دینے کو دل چاہتا ہے۔“ اسد الدین نے سنبھل کے کہا۔

”سرم کو اسی وجہ سے آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ اسے ہمارے منصوبے سے نہ

”امیر والا تیار۔ آپ یہ بات اس ناچیز پر چھوڑ دیں۔“ سرم نے پورے یقین سے کہا۔  
 اگر امیر مجھے صرف ملکہ مادر کے حضور میں پیغام پیش کرنے کا حکم دیں تو میں انز کو سنبھال  
 لے جاؤں اور اس کی ایک نہ چلنے دوں گا۔ میں انز کی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ وہ مجھے مادر  
 کے پاس جانے سے نہ روک سکے گا۔“

امیر بہت دیر تک غور کرتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر بولا۔ ”سرم اس مہم کو میں ہر صورت  
 یاب رکھنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری یہی رائے ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر پیغام  
 دینے کے بجائے زبانی ہو گا۔“

”امیر محترم کے حکم کی تعمیل ہوگی۔“ سرم نے پر عزم لہجے میں کہا۔ میرے ساتھ  
 مل کے چند شرفا اور سردار ہوں گے جو وقت ضرورت میرے بیان کی دربار دمشق میں  
 رہتی کریں گے۔“

”نیک ہے اور کوئی بات کہنا چاہتے ہو۔؟“ امیر زنگی نے گفتگو مختصر کی۔

”میرے ساتھ جانے والوں میں موصل کا قاضی شہر بھی ہو گا۔“ سرم نے بے دھڑک  
 ا۔ ”قاضی شہر نکاح پڑھائے گا اور موصل کا ایک امیر آپ کی طرف سے ”ایجاب و قبول  
 کا فرض ادا کرے گا۔“

امیر نے چونک کے سرم کو دیکھا۔ ”سرم کیا تمہیں اپنی کامیابی کا اسی قدر یقین  
 ہے۔؟“

”عالی مقام امیر۔ میں انشاء اللہ ملکہ مادر کا ڈولا لے کر موصل واپس آؤں گا۔“

”آمین!“ اسد الدین کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

امیر زنگی بہت خوش ہوا۔ اس نے کہا۔ اس کا مطلب ہے کہ شادی کے تمام لوازمات  
 تمہارے ساتھ بھیجا ہوں گے۔“

سرم نے سر اٹھا کے امیر زنگی کو دیکھا۔ امیر کا چہرہ مسرت سے دک رہا تھا۔

صرف اتفاق ہے بلکہ اس اہم خدمت کے لئے سرم نے اپنی خدمت پیش کی ہیں  
 بہت خوب۔ میرا اندازہ صحیح نکلا۔“ امیر پھر ٹپکنے لگا پھر رک کر بولا۔  
 محسوس ہوا تھا کہ تم معین الدین کی وجہ سے دمشق جانے میں کچھ ہچکچاہٹ ہو  
 ہو۔ سرم کے جو حالات تم نے مجھے بتائے تھے اس کے پیش نظر اس کا دمشق  
 زیادہ مفید ثابت ہو گا۔ کیوں یہی ہے نا تمہارا خیال؟“

”بالکل یہی امیر محترم۔ میں یہی فیصلہ کر کے آپ کے پاس آیا ہوں۔“  
 ”ہوں۔“ کہہ کر امیر سرم سے مخاطب ہوا۔ ”تم کیوں خاموش ہو۔  
 سہی؟“

”امیر محترم تو دل کی تحریر پڑھ سکتے ہیں۔ مجھے بولنے کی کیا ضرورت ہے۔“  
 ادب سے کہا۔

”تم اچھی گفتگو کر سکتے ہو سرم مجھے خوشی ہوئی۔“ امیر نے اس کے طرز کا  
 دی۔

”عزت اور ذلت تو خدا کے اختیار میں ہے امیر عالی مقام۔“ سرم نے کہا۔  
 ملکہ مادر کو انشاء اللہ قائل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ملکہ عالیہ مجھ پر پورا  
 ہیں۔ صرف بد بخت معین الدین انز کی مخالفت کا خیال ہے۔ بہر حال میں اس سے  
 کی کوشش کروں گا۔“

”انز بڑا چالاک ہے۔ اسے کس طرح رام کرو گے جب کہ وہ تمہارے ہم  
 ہے۔؟“ امیر نے فکر مندی سے پوچھا۔

”امیر محترم۔ معین الدین انز کے شر سے بچنے کی صرف ایک ہی صورت  
 میں نے سردار اسد الدین سے بیان کر دی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے سرم نے اسد  
 طرف دیکھا۔ اسد الدین اپنی جگہ سنبھل گیا۔

”اسد الدین۔ بیان کرو سرم نے کیا تدبیر سوچی ہے۔؟“ امیر زنگی نے اسد  
 سوال کیا۔

”عالی مقام امیر۔“ اسد الدین نے کہنا شروع کیا۔ ”سرم کا خیال ہے کہ شادی  
 شاہ دمشق کے بجائے براہ راست ملکہ مادر کو بھیجا جائے اور سرم کو تاکید کی جائے  
 عرض دعا صرف ملکہ مادر کے سامنے کرے۔“

”مگر سفارت تو حکمران کی طرف سے حکمران کے پاس جاتی ہے۔ انز سفارت  
 و غایت معلوم کرنے پر بضد ہو گا۔“ امیر زنگی کو اس رائے سے الجھن محسوس ہوئی۔

یار بھرا تھا۔  
”میں کیوں کہوں اپنے منہ سے مگر لوگ ضرور کہتے ہیں۔“ لقا اب تک ہنس رہی تھی۔

ملکہ نے لقا کو گھورا۔ ”ٹھہر جا۔ وضو کر لوں پھر بتاتی ہوں تجھے۔“  
”مگر ملکہ حضور۔ اس طالب دیدار کو کیا جواب دیا جائے۔ وہ غریب کب تک انتظار کرے گا؟“

”لقا کی بیٹی۔“ ملکہ مادرِ جحج اٹھی۔ ”تجھے انز سے اتنی ہی ہمدردی ہے تو اس کے گھر بس جا۔ ہم آج اس سے تیری سفارش کریں گے اور واپسی پر تجھے اس کے ساتھ بھیج دیا جائے گا۔“

لقا گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے زمر خانم کے پیر پکڑ لیے۔ ”خدا کے لیے ایسا نہ کیجے گا ملکہ مادر۔ اس کھوسٹ کو دیکھ کر خوف آتا ہے۔ کیسا بھیاکنہ چہرہ ہے اس کا۔ حضور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کرا دیا تھا۔“

زمر خانم نے اسے کوئی جواب نہ دیا اور وضو کرنے میں مشغول ہو گئیں۔ لقا نے ان کے چہرے سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ واقعی سنجیدہ ہو گئی ہیں اور ممکن ہے کہ اسے انز کے حوالے کر دیں۔ لقا نے بھی پیر نہ چھوڑے اور برابر خوشامد کرتی رہی یہاں تک کہ زمر بیگم نے پیر دھونے کے لیے پیچھے کھینچے۔

”چھوڑ کم بخت۔ کیوں سر ہو گئی ہے۔“ زمر بیگم کا لہجہ نرم پڑ گیا تھا۔  
”نہیں چھوڑوں گی حضور۔ چاہے قتل کر دیجئے۔“

”اچھا کیا چاہتی ہے؟“

”پہلے وعدہ کیجئے کہ آپ مجھے اس شیطان کے حوالے نہیں کریں گی۔“ لقا گڑگڑانے لگی۔

زمر بیگم ہنس پڑی۔ ”پاگل ہو گئی ہے تو۔ ہم اپنی وفادار کنیز کو موت کے حوالے کس طرح کر سکتے ہیں۔ انز موت سے بھی زیادہ خطرناک ہے لقا۔ اس نے ہمارے گرد ایسا جال بچھا رکھا ہے کہ ہم اپنی موت مر بھی نہیں سکتے۔“ زمر بیگم کا ہنسا ہوا چہرہ غمگین ہوتا چلا گیا۔

”ملکہ مادر۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ احتیاط فرمائیے۔“ لقا نے سرگوشی کی۔  
زمر خانم فوراً سنبھل گئیں۔ بات بدل کے بولیں۔ ”ہم آج وزیر اعظم سے درخواست کریں گے کہ وہ ہم پر اعتماد کریں۔ ہمیں دوسروں سے ملنے جلنے دیں۔ سلطنت

## رشتہ

زمر خانم کا یہ معمول تھا کہ وہ صبح کو دیر سے اٹھتیں پھر ناشتہ کر کے دہر سوتی رہتیں۔ اس وقت بھی وہ سو کے اٹھی تھیں طلانی تسلسلہ آگے رکھا تھا اور وضو کے گنگا جمنی جگہوں میں بھرا ہوا پانی کنیزوں کے لیے کھڑی تھیں۔ زمر خانم نے ایک شان اعتنائی سے لائبریا سیاہ زلفیں کھینچیں اور وضو کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔ ایک کنیز ہاتھوں پر پانی ڈالنا شروع کیا۔ زمر خانم نے چہرے پر پہلا چھینٹا مارا تھا کہ ایک کنیز ہوئی ان کی خواب گاہ میں داخل ہوئی۔ زمر خانم کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے تھوڑیاں کھینچ گئیں۔

”کسے موت آئی ہے؟“ زمر بیگم نے بڑے ناگوار انداز سے کنیز کو دیکھا۔ ”کون آیا سویرے سویرے۔ ہم چین سے سو بھی نہیں سکتے؟“

”وزیر اعظم معین الدین انز آیا ہے۔“ کنیز نے بھی یوں کہا جیسے اس کے ذائقہ کڑوا ہو گیا ہو۔ ”فورا قدم بوسی کا خواہش مند ہے۔“

اسے رات بھر نیند نہیں آتی کیا۔ روز صبح صبح آدھمکتا ہے۔“ زمر خانم نے ہر شروع کر دیا۔ زمر خانم کی منہ چڑھی کنیز ”لقا“ قریب کھڑی تھی۔ وہ ہنس کے بولی۔  
مادر۔ اس غریب کی حالت پر رحم فرمائیے۔ وزیر اعظم انز اپنی بیوی کو تو کئی سال پہلے تو ہے رات بھر کروٹیں بدلتا ہے اور۔۔۔ اور۔۔۔“

”ہاں ہاں، کہہ نا، مردار تیری زبان بہت چل نکلی ہے۔“ ملکہ مادر کی ڈانٹ

دمشق ہمیں ان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اپنے ملک کے خلاف کسی سازش میں شریک ہو سکتے۔

”درست فرمایا ملکہ مادر نے۔“ چالاک لٹانے بات بتائی۔ ”ہمارے وزیر اعظم صورت کے کتنے ہی بھیانک ہوں مگر ان کا دل بہت خوب صورت ہے۔“  
”تو پھر آج تیری سفارش کی جائے؟“ ملکہ مادر نے سنجیدہ گفتگو کو پھر مذاق میں دیا۔ ”انز کے خوب صورت دل کی قدر تو تیرا ہی خوب صورت دل کر سکتا ہے۔“  
”مگر حضور۔ میرا دل تو ان زلفوں میں انک گیا ہے۔“ لٹا ملکہ کی زلفوں پر پھیرنے لگی۔

ملکہ نے وضو کے بعد قضا نماز پڑھی پھر وزیر اعظم انز کو اپنے حضور طلب کیا۔ ملاقات کے کمرے میں درمیان میں چلن ڈال دی جاتی تھی۔ ایک طرف ملکہ بیٹھ دوسری طرف ملاقاتی حسب حیثیت کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر ملکہ سے گفتگو کرتا تھا۔ ملاقات کرنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ حالانکہ ملکہ مادر زمرہ خانم سا دمشق کی سب سے اہم ہستی تھی۔ مجیر الدین آہن جس کی مسی ابھی بھیگنا شروع ہوئی وہ ملکہ زمرہ خانم کا بیٹا اور دمشق کا اصل حاکم اور امیر تھا مگر اس کی کمسنی کی وجہ کاروبار سلطنت ملکہ مادر کے ہاتھ میں تھا اور ہر اہم کام کا آخری حکم ملکہ مادر ہی صادر تھیں۔ زمرہ خانم بظاہر اختیار تھیں لیکن حقیقت میں اس کی حکمرانی صرف شاہی محلات محدود تھی دمشق کا عملی اور حقیقی حاکم وزیر اعظم انز تھا۔

معین الدین انز بڑا شاطر اور عیار وزیر تھا۔ دمشق کی فوج کے تمام بڑے سردار دم بھرتے تھے۔ اور سوائے چند دستوں کے پوری فوج انز کا حکم مانتی تھی۔ انز چاہتا تو د پر خود قابض ہو کر اپنی بادشاہت کا اعلان کر سکتا تھا لیکن اس نے ایسا کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ نو عمر آہن کو دین دنیا کا ہوش ہی نہ تھا۔ محل کی تمام نوخیز کنیزیں ہر اسے گھیرے رہتی تھیں اور آہن کرشن کنھیا بنا ان گویوں سے کھیلتا رہتا تھا۔ محلات تمام کنیزیں اور غلام انز کے مقرر کردہ تھے اور اس کے لیے جاسوسی کرتے تھے۔ معین الدین انز اس قدر طاقتور تھا کہ اس نے جس وقت موصل کے امیر عماد الدین زنگی کے خا عباسیوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو کسی کو مخالفت کرنے کی جرات نہ ہوئی اور ملکہ مادر بیٹے کے قائم مقام کی حیثیت سے دستخط کر دیے جس کی رو سے دمشق کی فوج کو عبا کے لشکر میں شامل ہو کر امیر زنگی کے خلاف جنگ کرنی تھی۔

ملاقات کے کمرے میں وزیر اعظم معین الدین انز پہلے سے موجود تھا۔ جس وقت

کمرے میں داخل ہوئی نقیب کنیر نے آواز لگائی۔ ”با ادب۔ ملکہ مادر۔ تاج دمشق زمرہ شریف لا رہی ہیں۔“

مردم شاہ دمشق نے زمرہ بیگم کے حسن و جمال کی وجہ سے اسے ”تاج دمشق“ کا پڑا تھا۔ شاہ کی زندگی میں زمرہ بیگم اسی لقب سے پکاری جاتی تھیں لیکن اس کے بکے بعد غلامی اور درباری اسے ملکہ مادر کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ اس نام کی بے لگوں کے دلوں میں اس کی عزت کم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی تھی۔

نقیب کی آواز پر انز جلدی سے اپنی نشست چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے ادب سے سلام پیش کیا۔ ملکہ مادر کے دل میں کچھ بھی ہو مگر اس کی گفتگو کا انداز بڑا دلکش ہوتا اس نے حترم آواز میں کہا۔ ”معین الدین۔ ہمیں امید ہے کہ تم ضرور کوئی اہم مسئلہ ہمارے پاس آئے ہو اور یہی تمہاری دیانت کی دلیل ہے۔“

”غلام ملکہ مادر کے درست اندازے کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ انز نے بڑی بات کہی۔ ”یہ حقیقت ہے کہ دمشق کا کاروبار سلطنت صرف ملکہ مادر کی فراست کے راجل رہا ہے ورنہ ایک زبردست دشمن کی موجودگی میں دمشق کے خواص عوام چین رہ نہ سکتے۔“

”معین الدین تمہاری وفاداری کا یہ تقاضا ہے کہ ہم تمہاری ان مبالغہ آمیز باتوں کو ارا کریں۔“ ملکہ مادر نے ہلکا سا طنز کیا۔ ”تم لوگوں کے مجبور کرنے پر ہی ہم نے آہن برستی اور اس کی بجائے حکومتی ذمہ داریاں اٹھانے کی رضا مندی ظاہر کی تھی مگر تم ہمیں زیادہ سمجھ دار ہو۔ زیادہ بہتر یہ ہے کہ تم بار بار ہمارے پاس آنے کی زحمت کی بجائے خود ہی فیصلے کر لیا کروں اور صرف اعلان اور فرمان ہمارے دستخطوں کے بولایا کرو۔“

معین الدین انز گھبرا گیا۔ ملکہ مادر کے لہجے کی تلخی ابھر کر سامنے آگئی تھی۔ ”ملکہ اس غلام کی آپ کے سامنے کیا حیثیت ہے۔ خادم کی ہر بات محض ایک مخلصانہ ہوئی ہے۔ ملکہ مادر ایسے تمام مشوروں کو رد کر سکتی ہیں جو ملکہ کے مزاج کے خلاف

”کچھ بھی سہی انز۔“ ملکہ اکتا رہی تھی۔ ”ہم اپنی طرف سے کوئی ایسا قدم اٹھانے کی باتیں کریں گے جس سے دمشق کے وفاداروں کو یہ شبہ ہو کہ ہمارے اور تمہارے ناکہ حق کا اختلاف ہے۔“

”ملکہ مادر۔ میں آپ کا تابع دار ہوں۔ آپ کی ذرا سی ناراضگی پر میرا دل رونے لگتا



ران کے جانے کے بعد ہم بالکل تنہا ہو گئے ہیں۔ عیسائی حکمران بھی اپنی اپنی سلطنتوں میں ہو چکے ہیں۔ ایسے میں اگر ہم پر کوئی مصیبت آئی تو ہم کس سے مدد مانگیں گے؟

”معین الدین“۔ ملکہ نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”خیال ہے کہ سلطنت دمشق اور خاص بارے اور یروشلیم کے شاہ بالڈون کے درمیان بڑے دوستانہ مراسم موجود ہیں۔ بالڈون ہمارا پہلے بھی ساتھ دیا ہے۔ خدا نخواستہ اگر ہم پر وقت آن پڑا تو بالڈون خاموش نہیں بنا رہے گا۔“

”ملکہ مادر نے میرے دل کی بات اپنی زبان مبارک سے ادا کر دی۔“ انز خوش ہو گیا۔ ان اور یروشلیم میں دوستی کے دیرینہ تعلقات ہیں اور ہم ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں مگر یہ تمام تعلقات زبانی کلامی ہیں۔ ہمارے درمیان نہ کوئی معاہدہ ہے اور نہ کوئی رشتہ اگر شاہ بالڈون کسی وقت ہماری مدد سے انکار کر دے تو اسے کون الزام دے گا۔“

”ہم تمہارا مطلب نہیں سمجھتے معین الدین۔“ ملکہ مادر الجھ گئی۔ ”کیا تم بالڈون سے ہم کا معاہدہ کرنا چاہتے ہو؟“

”جی ہاں ملکہ۔“ انز نے فوراً جواب دیا۔ ”دمشق اور یروشلیم کے گھرے اور پختہ دونوں حکومتوں کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔“

”تو پھر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔ جس طرح کا معاہدہ چاہو کر سکتے ہو۔“ ملکہ کی تائید کی۔

”اگر یروشلیم کے سے معاہدہ کے ساتھ رشتے کا بندھ بھی قائم ہو جائے تو پھر ہماری اس قدر مضبوط ہو جائے گی کہ کوئی دشمن بھی ہمارے مقابلے پر آنے کی جرات نہیں کرے گا۔“

ملکہ نے پریشان نظروں سے انز کو دیکھا۔ معاہدے کی بات تو اس کی سمجھ میں آئی تھی مگر رشتے کا بندھن کس طرح قائم کرنا چاہتا ہے۔ کہیں انز اور شاہ بالڈون مل کر دمشق کی طرف کوئی سازش تو نہیں کر رہے ہیں۔ ملکہ کی تیوریوں پر عمل پڑ گئے۔ اس نے غصے سے ”معین الدین“ کو تم دمشق کے شاہی وقار کو بالڈون کے قدموں میں ڈالنا چاہتے ہو خیال خام ہے۔ ہم اس سلسلے میں کوئی بات سننا نہیں چاہتے تمہیں ہمارے بارے میں ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود مختار ہیں اور آزاد ہیں اگر ہمیں کبھی اپنے مائے بارے میں سوچنے کا خیال پیدا ہوا تو ہم خود ہی فیصلہ کریں گے۔ تمہارے

ہے۔“ معین الدین انز ہر ملاقات پر ملکہ سے اپنے دل کا رونا روتا تھا مگر ملکہ ہونے بھی کسی سخت رد عمل کا اظہار نہ کرتی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ انز ہی کھل گیا۔

ایک لمحہ رک کر انز بولا۔ ”ملکہ مادر یقین فرمائیے کہ میں تمام زندگی کے لیے گزرنے کا خواہش مند ہوں۔“

”ہمیں تمہاری وفاداریوں کا احساس ہے اور ہم اس کی دل سے قدر بھی ملکہ مادر نے بھی انز کو الجھا کر رکھ دیا۔“ انز ہماری خدا سے دعا ہے کہ وہ دمشق کی خدمت کے لیے عمر خضر عطا فرمائے۔ ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ اور امیر آہن کی خدمت پر اس قدر کنیزیں غلام اور خواجہ سرا مقرر کیے ہیں بھی نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنی خدمت کے لیے اب کسی اور کنیز یا خدمت کا نہیں۔“

معین الدین انز نے بڑی حیرت سے چلن کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے باتوں باتوں میں زمرہ خانم کی خدمت میں اپنے آپ کو پیش کر چکا تھا مگر عارفانہ سے کام لے کر اس کی بات کو بڑی خوب صورتی سے کاٹ چکی تھی۔ زندگی کی طرف سے وہ پہلے ہی پریشان رہتی تھی۔ اب اگر وہ انز کی زوجیت میں وہ پوری طرح سے انز کے جال میں پھنس جاتی اور اس طرح اس کا رہا سادہ کر رہ جاتا اور انز کی پانچوں انگلیاں گھٹی میں اور سر کڑھائی میں ہونے کے ساتھ سلطنت دمشق پر بلا شرکت غیرے قبضہ ہو جاتا۔

انز کو خاموش دیکھ کر ملکہ کو خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں وہ اپنی بات کو پھر تم کہے۔ اس لیے اس نے فوراً پیش بندی کی۔ ”معین الدین کسی بات سے تم ہوتے ہو اور شاید یہی فکر تمہیں ہمارے پاس لائی ہے؟“

”جی ملکہ مادر۔“ آپ نے صحیح فرمایا۔“ انز ایک ٹھنڈی سانس لے کر دراصل اس لیے حاضر ہوا تھا کہ سلطنت دمشق کے لیے خطرات پہلے سے زیادہ اور اس کا تدارک بہت ضروری ہے۔“

”بے شک۔ ہمیں بھی اس کا احساس ہے۔ پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو اس لیے معین الدین انز سنبھل کے بیٹھ گیا۔“ ملکہ مادر۔ میں اس بات کو واضح کر رہی ہوں کہ جب تک شہنشاہ قسطنطنیہ جان کامنی نس اور ان کے تمام عیسائی حکمران موجود تھے تو ہماری پشت بہت مضبوط تھی اور کوئی دمشق کی طرف آنکھ اٹھا کر

شاہ کو اس میں کوئی دخل نہ ہو گا۔  
 ”ملکہ مادر“۔ معین الدین انز کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ  
 وفادار کو سمجھنے میں غلطی کی۔ اور کبھی۔“  
 ”معین الدین انز!“ ملکہ بھڑکیں۔ ”تمہیں ہماری غلطی پکڑنے کی جرات کیے  
 تم ہوتے کون ہو ہمارے ذاتی معاملات میں بولنے والے اگر آج شاہ مرحوم موجود  
 تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم جسے شاہ نے ایک ادنیٰ سردار سے وزیر اعظم  
 طرح ہمارے سرچڑھ کے بولو۔ سلطنت دمشق کی ملکہ مادر کی توہین کرو۔ یاد رکھو  
 الدین۔ تم ہمیں بے بس نہیں کر سکتے۔ حکومت کی ذمہ داریاں اس وقت بھی میری  
 ہیں اور میرے ہی بیٹے امیر مجیر الدین آہق کے نام کا سکہ ارض دمشق پر چلا ہے  
 چاہیں تو تمہیں اس عدے سے برخاست کر سکتے ہیں۔“

ملکہ مادر کے جلال کے سامنے انز کو دینا پڑا۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔ ”ملکہ  
 سے غلطی ہوئی ہے تو درگزر فرمائیے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ شاہ یروٹلم۔“  
 ”خاموش ہو جاؤ معین الدین۔“ ملکہ نے سختی سے اسے ڈانٹا۔ ”ہم یروٹلم  
 کے بارے میں ایک لفظ نہیں سنتا چاہتے۔“

”غلام کی اس غلطی کو بھی معاف فرمائیے ملکہ مادر۔“ انز کا بجز بڑھتا جا رہا تھا  
 شہزادی یروٹلم کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“  
 ملکہ زمرہ خانم نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ”شہزادی یروٹلم کے ذکر کا یہ  
 موقع ہے؟“

”میں یروٹلم کی شہزادی کا رشتہ اپنے شاہ مجیر الدین آہق والی دمشق کے  
 ہوں۔“

انز کی بات نے ملکہ کو چونکا دیا۔ ”کیا کہہ رہے ہو معین الدین کیا شاہ یروٹلم  
 اپنی بیٹی کو ہمارے آہق کی کنیزی میں دینا چاہتا ہے؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے ملکہ مادر۔“ انز نے دبے الفاظ میں کہا۔ ”مگر یہ  
 شہزادی اور امیر مجیر الدین آہق کا رشتہ ہو جائے تو آپ کا سر بلند ہو گا اور شاہ  
 آپ کے آگے بیٹھ کے لیے جھک جائے گا۔“

”معین الدین اگر یہ بات سچ ہے تو یہ معاملہ واقعی غور طلب ہے۔“ ملکہ نے  
 کے کہا اور جواب دینے کے بعد پھر گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔  
 انز ملکہ کو غور و فکر کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا شاہانہ آداب مجلس کا

شاہ کو اس میں کوئی دخل نہ ہو گا۔  
 ”ملکہ مادر“۔ معین الدین انز کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ آپ  
 وفادار کو سمجھنے میں غلطی کی۔ اور کبھی۔“

”معین الدین انز!“ ملکہ بھڑکیں۔ ”تمہیں ہماری غلطی پکڑنے کی جرات کیے  
 تم ہوتے کون ہو ہمارے ذاتی معاملات میں بولنے والے اگر آج شاہ مرحوم موجود  
 تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم جسے شاہ نے ایک ادنیٰ سردار سے وزیر اعظم  
 طرح ہمارے سرچڑھ کے بولو۔ سلطنت دمشق کی ملکہ مادر کی توہین کرو۔ یاد رکھو  
 الدین۔ تم ہمیں بے بس نہیں کر سکتے۔ حکومت کی ذمہ داریاں اس وقت بھی میری  
 ہیں اور میرے ہی بیٹے امیر مجیر الدین آہق کے نام کا سکہ ارض دمشق پر چلا ہے  
 چاہیں تو تمہیں اس عدے سے برخاست کر سکتے ہیں۔“

ملکہ مادر کے جلال کے سامنے انز کو دینا پڑا۔ اس نے نیچی آواز میں کہا۔ ”ملکہ  
 سے غلطی ہوئی ہے تو درگزر فرمائیے۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ شاہ یروٹلم۔“  
 ”خاموش ہو جاؤ معین الدین۔“ ملکہ نے سختی سے اسے ڈانٹا۔ ”ہم یروٹلم  
 کے بارے میں ایک لفظ نہیں سنتا چاہتے۔“

”غلام کی اس غلطی کو بھی معاف فرمائیے ملکہ مادر۔“ انز کا بجز بڑھتا جا رہا تھا  
 شہزادی یروٹلم کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔“  
 ملکہ زمرہ خانم نے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔ ”شہزادی یروٹلم کے ذکر کا یہ  
 موقع ہے؟“

”میں یروٹلم کی شہزادی کا رشتہ اپنے شاہ مجیر الدین آہق والی دمشق کے  
 ہوں۔“

انز کی بات نے ملکہ کو چونکا دیا۔ ”کیا کہہ رہے ہو معین الدین کیا شاہ یروٹلم  
 اپنی بیٹی کو ہمارے آہق کی کنیزی میں دینا چاہتا ہے؟“

”کچھ ایسی ہی بات ہے ملکہ مادر۔“ انز نے دبے الفاظ میں کہا۔ ”مگر یہ  
 شہزادی اور امیر مجیر الدین آہق کا رشتہ ہو جائے تو آپ کا سر بلند ہو گا اور شاہ  
 آپ کے آگے بیٹھ کے لیے جھک جائے گا۔“

”معین الدین اگر یہ بات سچ ہے تو یہ معاملہ واقعی غور طلب ہے۔“ ملکہ نے  
 کے کہا اور جواب دینے کے بعد پھر گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔  
 انز ملکہ کو غور و فکر کرنے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا شاہانہ آداب مجلس کا

سرم کے جانے میں صرف دو دن باقی تھے کہ دمشق سے آنے والے ایک قافلے نے امیر زنگی کی خبر سنا لی کہ سفر دھڑے کا دھڑا رہ گیا۔ دمشق سے آنے والے قافلہ سالار سرائے کے مالک کو وہ خبر سنا لی اور خبر ایسی اہم تھی کہ سرائے سے نکل کر پورے ہائیں پہنچ گئی اور اس کی بازگشت کی آواز نے امیر زنگی کے دربار کو ہلا کر رکھ دیا۔ امیر نے اسد الدین کو حکم دیا کہ کارواں سرائے کے ناظم اور قافلہ سالار کو فوراً دربار میں لایا جائے۔ دوسرے دن ناظم سرائے اور قافلہ سالار لرزاں ترساں دربار پہنچے انہیں لم نہ تھا کہ انہیں کس وجہ سے طلب کیا گیا ہے یا انہوں نے کون سا ایسا جرم کیا ہے لاپرواہی میں انہیں سرائے سے دربار تک سخت پرے میں لایا گیا ہے۔ دربار میں بھی نہ سرم اور اسد الدین کے اور کوئی دوسرا اس راز سے واقف نہ تھا۔ تمام دربار بڑی ہمتی سے امیر زنگی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا مگر ان کی بے چینی میں اس وقت اور اضافہ جب امیر زنگی نے دربار پر غاصت کرنے کا حکم بھیجا اور قافلہ سالار اور سرائے ناظم کو حضور محل میں طلب کیا۔ سرم اور اسد الدین کو بھی ان کے ساتھ آنے کا حکم دیا گیا

امیر زنگی کے حضور میں سرائے کا ناظم اور خبر کا راوی دمشق سے آنے والا تاجر پیش تو امیر کا اشارہ پا کر اسد الدین نے گفتگو کا آغاز کیا۔ اس نے دونوں کا سر سے پیر تک لیا اور پوچھا۔ ”تم میں سے تاجر کون ہے اور سرائے کا مالک کون ہے؟“ سرائے کا مالک امیر کو دیکھ کر ایسا گھبرایا کہ اس کا حلق خشک ہو گیا اور اس کا جسم لگا۔ اس وقت تاجر نے ہمت کی اور بڑے ادب سے سر جھکا کر بولا۔ ”سردار محترم! میں ہوں اور میرے ساتھ کھڑا ہوا یہ شخص سرائے کا ناظم ہے۔“

”اچھا تو اس خبر کے راوی تم ہو؟“ اسد الدین کا لہجہ ذرا سخت ہو گیا۔ سردار کا اشارہ کس خبر کی طرف ہے۔ میں نے کوئی غلط خبر نہیں بیان کی عالی جاہ۔“ لی گھبرا گیا۔ اسے کیا علم تھا کہ جو بات اس نے محض تفسن طبع کے لیے بیان کی تھی ادب سے اسے زنگی دربار میں پیش ہونا پڑا ہے۔

”میں نے یہ نہیں کہا کہ تم نے کوئی غلط بات کہی ہے۔“ اسد الدین نے نرمی اختیار کی۔ ”اچھا یہ بتاؤ کہ اس خبر میں کہاں تک حقیقت ہے کہ دمشق کے کس امیر مجیر الدین کا شاہ بالذون کی بیٹی سے ہونا ہے؟“

”سردار محترم! میں پھر عرض کروں گا کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کہی۔“ تاجر نے منہ کی پیش کی۔ ”جہاں تک امیر دمشق اور شہزادی یرد خلم کے رشتے کی بات ہے تو

”ٹھیک ہے معین الدین۔“ یہ کہتے ہوئے ملکہ جانے کے لیے کھڑی بہت جلد اس کا فیصلہ کریں گے۔“ اور ملکہ مادر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ ”غلام کا یہ بھی خیال ہے۔“

”وزیر اعظم کا جو بھی خیال ہے وہ اپنے پاس رکھیں۔“ یہ آواز ملکہ مادر تھی۔

وزیر اعظم معین الدین انز کو معلوم نہیں تھا کہ ملکہ چلن کے پاس دوسرے کمرے میں جا چکی ہے۔ اس نے اپنی رو میں کتنا شروع کر دیا تھا کھڑی تھی۔ اس نے انز کو ہواؤں سے باتیں کرتے دیکھا تو فوراً ٹوک کر خامو نے گھبرا کے چلن کی طرف دیکھا تھا وہاں کھڑی مسکرا رہی تھی۔

”کبجنت کیس کی۔“ انز چڑ گیا تھا۔ ”تو نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا کہ گئی ہیں۔ مجھے ان سے بہت ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

”اب اور کون سی ضروری بات رہ گئی ہے وزیر اعظم۔“ شوخ کنیز نے ”روز تو آپ صرف ایک شادی کی طرف اشارہ فرماتے تھے۔ آج آپ نے دو چھیڑ دیا۔ اب کیا کسی تیسری شادی کا تذکرہ کرنا ہے؟“

”ہاں تذکرہ کرنا ہے۔ تو کون ہوتی ہے پوچھنے والی؟“ معین الدین بڑبڑا۔ ”خدا مجھے برے وقت سے محفوظ رکھے۔“ لقا درمیان میں بڑی چلن سے وزیر اعظم کو مجھ پر اعتماد ہے تو مجھے بتا دیجیے کہ وہ تیسری کون بدبخت ہستی ہے سے آپ کو دلچسپی ہے؟“

”وہ .... وہ ذلیل ہستی تو ہے لقا۔ ملکہ مادر کی منہ چڑھی کنیز۔ میں چڑھا۔“ اور انز باہر چلا گیا۔

سرم کے یقین دلانے پر امیر زنگی نے دمشق کی ملکہ مادر زمرہ خانم انتہائی قیمتی سامان تیار کرایا تھا تاکہ دمشق والے اس کی دولت اور امارت جائیں۔ یہ تمام کام اس نے سرم اور اسد الدین کے مشورے سے کیا تھا۔ زیادہ خوش تھا کہ اسے دمشق میں شہزادی جینالو کے ملنے کی ایک مہم ہو تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی عدم موجودگی اور لشکر سے اچانک غائب مدارالہام اور وزیر اعظم معین الدین انز نے امیر دمشق اور ملکہ مادر کے خوف ہوں گے مگر اس نے خطرات کو قطعی نظر انداز کر دیا اور دمشق جانے کی تیاری شروع کر دی۔

”اسد الدین“۔ امیر زنگی نے آہستہ سے کہا۔ ”تاجر جس یقین کے ساتھ کہ  
اس کے پیش نظر اسے جھٹلانے کی وجہ نظر نہیں آتی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر

اسد الدین نے امیر کے حکم پر سر تسلیم خم کر دیا۔ وہ ابھی امیر کے پاس سے بچنے کے لئے سے ایک لفظ نہ ادا کر رہا تھا۔

سامنے آتے ہی جو بات کہی اس سے تاجر کی خبر کی تصدیق ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ ”امید الدین۔ تمہارے مہر کی داد دینے کو جی چاہتا ہے۔“ امیر نے بڑے خوشگوار لہجے

جاسوس یہ خبر دے کر پھر دمشق کی طرف روانہ ہو گیا مگر موصل کے شاہی اہل ہنر نے اس کی ہنر پر شک کیا اور اسے قتل کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد اسد اللہ نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف سفر کیا۔

اداسی طاری ہو گئی۔ امیر موصل عماد الدین زنگی بھی بہت فکر مند تھا۔ اس نے ۱۱۰۱ء کو تھے تو تم نے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا؟

کے دوسرے سردار کو امیر کے سامنے زبان ہونے کی جی جرات نہ کر سکے۔

دوسرا دن بھی اسی غور و فکر میں گزر گیا۔ عین الدین ان کے امیر کو دیکھ کر بھی شکست دے دی تھی۔ ان دونوں میں بڑی پرانی دشمنی تھی۔ ان کی جاگیروں

دمشق کو ہمیشہ کے لیے بھول جائیں گے لیکن ایسا نہیں ہو گا۔ مات ہمیں نہیں ملے گی۔  
 "آمین۔" اسد الدین کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"شم آمین۔" سرم نے بھی اپنے موجودگی کا احساس دلایا۔

"سرم۔ تمہاری سفارت دمشق جائے گی اور اس کی شان بھی پہلے سے دینی ہوگی۔"

یہ کہتے ہوئے امیر زنگی جھوم اٹھا تھا۔ "تم صرف ہمارا پیغام زمرہ خانم کے لیے نہیں لے رہے بلکہ ایک پیغام تمہیں اور بھی لے جانا ہو گا۔ جانتے ہو وہ پیغام کیا ہو گا؟"

سرم بوکھلا گیا۔ اسد الدین کی سمجھ میں بھی کچھ نہ آسکا۔ امیر زنگی برابر مسکراتے تھا۔

"تم نہیں جانتے۔ کوئی بھی نہیں جانتا۔ دمشق کے شاطر از کو بھی اس کی خبر نہیں ہے۔ اس کی چال الٹ دی ہے۔ یرو ظلم کی شہزادی دمشق نہیں آئے گی۔ اس کی ہم شاہ دمشق مجیر الدین آہن کو اپنی فرزندی میں آنے کی دعوت دیں گے۔"

اسد الدین کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "امیر محترم۔ آقائے عالی مقام سبحان اللہ بساط واقعی الٹ جائے گی۔ اس کے وقار کا جتنا زہ نکل جائے گا۔"

"انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا اسد الدین۔" امیر زنگی نے اطمینان سے کہا۔ "سرم تمہیں زمرہ خانم سے گفتگو کے انداز کو از سر نو ترتیب دینا ہو گا۔ تم پہلے ہماری شہزادی لیے شاہ دمشق کا رشتہ مانگو گے اس کے بعد ہمارے لیے زمرہ خانم کا سوال کرو گے بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ زمرہ خانم سے پہلے رشتے کی بات کے ساتھ ہی دوسرے گفتگو شروع کر دی جائے تاکہ ملکہ کو فیصلہ کرتے وقت دونوں رشتوں کو سامنے نہ لے سکیں۔"

"بالکل اسی طرح حکم کی تعمیل ہوگی امیر محترم۔" سرم نے سر جھکا دیا۔

"خدا آقا کا سایہ ہم پر قیامت تک قائم رکھے۔" اسد الدین نے بڑے غلام کہا۔ "انز نے جو چال چلی تھی اس سے میں سخت گھبرا گیا تھا لیکن آقا نے ایسا نوکرا کہ انز دنگ رہ جائے گا۔ اگر ملکہ نے مجیر الدین سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تو میں میں وہ بھی دربار موصل کو دربار یرو ظلم پر فوقیت دے گا۔ اس طرح دمشق اور تمام جھگڑے خود بخود ختم ہو جائیں گے اور انز کو گھٹنے ٹیکنے پڑیں گے۔"

"ایسا ہی ہو گا اسد الدین۔" امیر نے اطمینان کا سانس لیا۔ "تم جانتے ہو کہ بیٹے نور الدین اور سیف الدین بھی جوان ہو رہے ہیں۔ ہمیں ان کے لیے بھی

دشمن کی تلاش ہے لیکن شہزادی کی طرف سے ہم زیادہ فکر مند تھے۔ ہمارا یہ مسئلہ قدرت کی خودی حل کر دیا۔"

اور دمشق میں بھی اسی طرح کچھڑی پک رہی تھی۔ دمشق کے مود آہن نے بڑی سمجھ داری سے یہ منصوبہ تیار کیا تھا۔ معین الدین انز نے جس وقت زمرہ خانم سے یہ کہا تھا کہ وہ یرو ظلم نے مجیر الدین آہن کے ساتھ اپنی شہزادی کی شادی کی تحریک کی ہے تو اس کے نام میں کوئی حقیقت نہ تھی۔ اس نے تو ہوا میں ایک تیر چلایا تھا اور وہ ٹھیک نکلنے پر نہ گیا۔ ملکہ زمرہ خانم بھی اس کے فریب میں آگئیں۔ مجیر الدین آہن کو اتنی سوچہ بوجھ ہی تھی کہ وہ انز کی چال کو سمجھ سکتا۔ اس کے دن رات تو عمر کنیوں سے خوش فطیلاں لے کر گزرتے تھے۔ جب اسے بتایا گیا کہ شاہ یرو ظلم نے اپنی بیٹی کے لیے اس کا رشتہ

کا ہے تو وہ حیران سا رہ گیا۔ اس کی دنیا محل کی چار دیواری کے اندر تھی۔ شادی محل سے باہر جھانکنے کا اسے کبھی خیال ہی نہ آیا تھا۔ حیرانی کے ساتھ ساتھ شہزادی یرو ظلم کے غور سے اس کے دل میں گدگدی سی پیدا ہو گئی۔ ان نے لڑکیوں اور عورتوں کے درمیان ہوش نہ بھالا تھا۔ مگر وہ سب کی سب اس کی کنیزیں تھیں اور اس کی ہر بات کو بے چون و چرا تسلیم کرتی تھیں مگر کوئی شہزادی اس کے قریب سے بھی نہ گزری تھی۔

زمرہ خانم کا کہنا وہ کبھی نہ مانتا تھا۔ پھر یہ معاملہ تو اس کی شادی کا تھا اور شادی بھی ایک غیر قوم کی شہزادی کے ساتھ۔ مجیر الدین نے چند لمحوں میں اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ زمرہ خانم اس کی سعادت مندی سے بہت خوش ہوئیں اور اس کے سر پر ہاتھ بچھرنے لگیں۔ وہیں چلیں مگر مجیر الدین کو نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے دوڑ کر ملکہ کو پکڑ لیا۔

"مادر مہربان۔ ایک بات تو بتائیے۔" آہن نے بڑی معصومیت سے کہا۔

"جان مادر۔ آپ دریافت فرمائیے۔ میں آپ کو ہر طرح سے مطمئن کروں گی۔" ملکہ نے شادی آداب ملحوظ رکھتے ہوئے بڑے ادب سے کہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجیر الدین آہن کی بات تھی مگر دمشق کا بادشاہ مجیر الدین ہی تھا اور اس کا احترام کرنا ہر چھوٹے بڑے کا فرض تھا۔

مادر مہربان۔ یہ فرمائیے کہ شہزادی میں کیا خاص بات ہوتی ہے۔" یہ آہن کا دوسرا معصومانہ سوال تھا۔ "میرا مطلب ہے کہ کیا شہزادی ہمارے محل میں موجود عورتوں سے مختلف ہوتی ہے؟"

"ہاں شاہ آہن۔" ملکہ کو اس کی معصومیت پر افسوس ہونے لگا۔ "مخلات میں رہنے والی یہ عورتیں کنیز کسلاقی ہیں اور یہ آپ کے حکم کی پابندی کرتی ہیں لیکن شہزادی کسی

ہاں ہیں تخت سے محروم کر کے دمشق کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ آپ جس حال میں اس کا قاتل کیجئے۔ ان سے بگاڑ کرنے سے ہمیں فائدے کی بجائے نقصان اٹھانا پڑے

آپ بت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ”مادر مرہان۔ آپ نے اصل حالات سے آگاہ کر کے ہم مان کیا ہے مگر کیا ہماری اور آپ کی تمام عمران محلات کی چار دیواری میں گزرے ہمارا تو اب یہاں دم گھٹنے لگا ہے۔“

”اللہ بڑا کار ساز ہے شاہ بیٹے۔“ ملکہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔ وہ ظالم تو آپ کی ماں کی قہقہے میں کرنا چاہتا ہے۔ اس نے اشاروں اشاروں میں کئی بار مجھے شادی کا پیغام دیا۔ بیٹے اس دنیا میں آپ کے علاوہ میرا اور کوئی نہیں اگر میں نے کسی وقت محسوس کیا کہ شادی کرنے سے آپ کو اس کے بچے سے نجات مل سکتی ہے تو میں یہ زہر پینا بھی اکر لوں گی لیکن وہ اپنے ارادوں میں مخلص نہیں۔ وہ مجھ سے شادی صرف اس لیے چاہتا ہے تاکہ اقتدار پر اس کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو جائے اور آپ کے مفادات نافذ کرنے والا کوئی باقی نہ رہ جائے۔“

ماں کی حالت دیکھ کر آپ بھی جذباتی ہو گیا اور اس کے آنسوؤں کے آنسوؤں میں ہو گئے۔ آپ ماں کے گلے لگ کر خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ آنسو بہانے سے اے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا۔ ملکہ نے کمال شفقت سے آپ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ بیٹے۔ آپ کو بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ خبردار آپ کے رویے سے قطعی یہ نہ ہونا چاہیے کہ آپ شعور کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ انز اور محل کی کنیزوں کو ان کے لیے کہ آپ پہلے ہی کی طرح معصوم اور نا سمجھ ہیں۔ ہمیں اس وقت ایک بڑے کی ضرورت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ انز نے یروشلم کی شہزادی سے آپ کی شادی ایک اپنے مفاد میں کی ہے وہ اس شادی سے کوئی بہت بڑا سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے آپ کی اور اپنی مجبوریوں کی وجہ سے انکار نہ کر سکی اور آپ کو بھی اس پر رضامند لیکن میرا دل کہتا ہے کہ محل میں کسی نئی ہستی کے آنے سے کوئی نہ کوئی انقلاب برپا ہو گا اور ہو سکتا ہے کہ یہ تبدیلی ہمارے حق میں ہو۔“

”آپ مطمئن رہیں مادر مرہان۔“ آپ نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ہم اپنی روش میں کوئی انہ آئے دیں گے اور جب بھی کوئی نئی بات محسوس ہوگی آپ کو فوراً اطلاع دیں

محل نامہ و پیام میں بھی آپ کو احتیاط برتا ہوگی شاہ بیٹے۔“ ملکہ نے اسے تنبیہ

بادشاہ کی بیٹی ہوتی ہے۔ وہ آپ کی طرح باوقار اور حکم ماننے کی بجائے حکم چلائی۔ آپ اپنی ماں کے اس جواب سے بہت پریشان ہوا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد مرہان۔ اس کا مطلب ہے کہ یروشلم کی شہزادی شادی کے بعد ہم پر حکومت کر رہیں اس کا حکم ماننا ہو گا؟“

”نہیں شاہ بیٹے۔ ایسی بات نہیں ہے۔“ زمرہ خانم اسے سمجھانے لگی۔ ”شہزادہ کی ملکہ ہوگی اور آپ ہی کی طرح تمام لوگوں پر حکومت کرے گی۔ وہ آپ کی در بنے گی اور سب کو اس کا حکم ماننا پڑے گا۔“

”معین الدین انز بھی اس کا حکم مانے گا؟“ آپ کے اس سوال نے ملکہ کو چڑھا دیا۔ ”ہاں شاہ بیٹے۔ شاہ بیگم کا حکم سب کو ماننا پڑتا ہے مگر آپ اس کی فکر کیوں ہیں۔ آپ کے ساتھ میں جو موجود ہوں۔ دمشق کے تاجدار آپ ہیں۔ انز کی کیا ہے۔ وہ صرف ہمارا نوکر ہے۔“

”نہیں مادر۔ انز ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتا۔“ آپ کا باغیانہ جذبہ عود کر آیا۔ باہر جانا چاہیں تو کسی نہ کسی بہانے روک دیتا ہے۔ محل سے باہر کی دنیا سے واقف نہیں ہوں۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ جس امیر زنگی سے ہم جنگ کرنے گئے ہمارے مسلمان قوم کا فرد ہے پھر انز نے اس کے خلاف عیسائیوں کا ساتھ کیوں دیا۔ امیر زنگی سے دوستی رکھنی چاہیے؟“

”ملکہ مادر کو محسوس ہوا کہ وہ اس وقت جس مجاہدین سے بات کر رہی ہے معصوم شہزادہ نہیں بلکہ کوئی عقل مند فرد ہے جس کی ملکی سیاست پر بھی نظر ہے بیٹے۔ یہ باتیں ابھی آپ کے سوچنے کی نہیں۔ معین الدین انز کے بارے میں ہمارے حق میں برا ثابت ہو سکتا ہے۔“

”مگر کیوں مادر مرہان۔“ آپ کا لہجہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ ”آپ ہمیں یہی سمجھانے لگے ہم پر وہ کون سا احسان کیا ہے جس کی وجہ سے آپ اس کا ہر حکم ماننے لگتی ہیں؟“

”شاہ بیٹے اگر سمجھنا چاہتے ہو تو سنو مگر یہ خیال رہے کہ ہماری گفتگو کا ایک باہر نکل گیا تو ہمارا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ دمشق کی زمین ہمارے لیے تنگ ہو جائے گی ہمیں پناہ دینے پر بھی آمادہ نہ ہو گا۔ یہ کہتے ہوئے ملکہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔“

”آپ انز کی طاقت سے واقف نہیں۔ دمشق کا پورا لشکر اس کے قابو میں

کی۔ ”آپ کے محل کی کوئی کنیز خفیہ پیام رسانی کے لیے موزوں نہیں۔ یہ سب کی کی جاسوس ہیں۔ آپ کو میرے پاس کوئی پیغام بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنا ہاتھ لٹاؤ آپ کی مزاج پر سی کے بہانے بھیج دیا کروں گی۔ آپ اس پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ ”ٹھیک ہے مادر مہریان۔“ آہن نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ”ہاں ایک سے اور عرض کرنا ہے بشرطیکہ آپ ناراض نہ ہوں۔“

”شاہ بیٹے۔ آپ کیسی بات کہہ رہے ہیں۔“ زمرہ خانم کی زبان متا کے جذبات بوجھل ہو گئی۔ ”آپ دمشق کے بادشاہ ہیں میری ناراضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہو مجھے حکم دے سکتے ہیں۔“

”مادر مہریان۔“ آہن بھی جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ ”یقین کیجیے کہ جب آشاہ کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو ہمارا دل رو پڑتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے نہیں بلکہ کوئی غیر عورت ہیں ہمیں آپ کی محبت پر بھی شبہ ہونے لگتا ہے۔“

”آہن۔“ ملکہ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ ”میرے بیٹے۔“ ملکہ نے فرط محبت سے اپنے ہاتھ کھول دیے اور آہن بڑھ کر ماں کے سینے طرح چمٹ گیا جیسے دودھ پیتے بچے ماں کی چھاتیوں سے زندگی کا رس چوسنے کے جاتے ہیں۔

ماں بیٹے ایک بار پھر اپنی قسمت پر آنسو بہانے لگے مگر ان آنسوؤں کے ساتھ ذہن سے ایک بوجھ سا اترتا چلا گیا۔

”ماں۔ میری ماں مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ماں کی آغوش میں بچے کو کیا ہے۔“ آہن نے اس کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ”آج سے میں صرف اور تم میری ماں ہو۔ مجھے امید ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان شاہانہ القاب کا کوئی تکلف نہیں ہو گا۔“

پیارے بیٹے۔ کاش میں تمہیں انز کے ظالم بچوں سے نجات دلا سکتی۔ آنکھوں سے متا کے قطرے اب بھی آنسو بن کر ٹپک رہے تھے۔

”ماں، تم نے مجھے صبر کی تلقین کی ہے۔ میں بھی وقت کا انتظار کروں گا۔“ مجیر الدین آہن اس طرح اٹھ کر کھڑا ہوا جیسے وہ واقعی دمشق کا تاجدار ہو۔ اس کی میں اک عجیب طرح کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔

زمرہ خانم اور شاہ آہن کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد معین الدین انز کا سفر اختیار کیا۔ شہزادی یروٹلم اور شاہ آہن کی شادی کی تحریک یا سیاسی حکمت

کی دماغ کی اختراع تھی۔ اس سلسلے میں اس نے شاہ یروٹلم سے کوئی اجازت حاصل نہ کی لیکن اسے یہ امید تھی کہ جس طرح اس نے شاہ یروٹلم کا نام لے کر زمرہ خانم کو اپنی کر لیا تھا اسی طرح وہ شاہ یروٹلم کو بھی اس پر آمادہ کر لے گا۔ شہنشاہ قسطنطنیہ جان اپنی اہل کے واپس جانے پر انز تو پریشان تھا ہی لیکن اس علاقے کی تمام عیسائی ریاستیں کی گھبراہٹ تھی۔ ان عیسائی ریاستوں پر یہ عقدہ بعد میں کھلا کہ انہیں شہنشاہ سے بدظن رہنے کا کارنامہ امیر زنگی کے جاسوسوں اور ہمدردوں نے انجام دیا تھا۔

شہنشاہ کے جانے کے بعد عیسائی ریاستوں نے امیر زنگی کے خلاف ایک نیا معاہدہ کر لیا تاہم بھی وہ گھبرائے ہوئے تھے اور انہیں امیر زنگی کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا تھا۔ معین الدین انز نے ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے منصوبے کا پہلا قدم شہزادی یروٹلم اور شاہ دمشق کی شادی تھی۔ دمشق سے اس کا باہر واپس رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا اس لیے اس نے دمشق میں مشہور کرا دیا کہ صرف دو دن کے لیے ہعلبک جا رہا ہے ہعلبک اس کی جاگیر تھی اور دمشق سے اس کا ملکہ پینتیس چالیس میل کے قریب تھا۔ اگر وہ یروٹلم جانے کا اعلان کرتا تو امیر زنگی کوئی ام اسکا سکتا تھا، خود دمشق میں شاہ آہن کے ہمدرد فوجی دستے بھی ادھم مچا دیتے۔

معین الدین انز یہ طے کر کے چلا تھا کہ وہ شاہ یروٹلم کو بھی یہ تاثر دے گا کہ شادی انٹیک ملکہ زمرہ خانم کی طرف سے ہوئی ہے تاکہ اگر شاہ یروٹلم کسی وجہ سے انکار کر دے تو انز کا دامن بھی بچا رہے۔ یروٹلم میں انز کی شایان شان پذیرائی ہوئی۔ بالذون شاہ یروٹلم نے انز کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ تخت شاہی پر بٹھالیا اور اس کی خوب خاطر دیکھ کر انز جلد از جلد مطلب کی گفتگو کر کے دمشق جانا چاہتا تھا مگر ایسی اہم بات کے لیے کچھ تمہید بھی باندھنا تھی اور تمہید کے لیے وہ کسی موزوں موقع کا منتظر تھا۔

انز اس کی آؤ بھگت پر ایسا لگا ہوا تھا کہ وہ انز سے اس کے آنے کا سبب بھی نہ دریافت کر سکا۔

تین دن اسی شش و پنج میں گزر گئے۔ انز کے بالذون سے گھرے تعلقات تھے مگر رانی کے رشتے کی بات تھی۔ شاہ بالذون کی عسکری طاقت بھی دمشق سے زیادہ تھی مگر انز بالذون یروٹلم میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ آج رات کھانے کے بعد شاہ بالذون سے ضرور بات کرے گا مگر اسی شام یروٹلم کا ایک جاسوس جسے موصول کی ہوئی پر مقرر کیا گیا تھا وہ یروٹلم واپس پہنچا اور فوراً شاہ بالذون سے ملنے کی درخواست موصول کے امیر زنگی سے شاہ پہلے خائف تھا۔ اس نے جاسوس کو فوراً طلب کر لیا۔



جاسوس شاہ کی ڈانٹ سے سہم گیا تھا۔ اس نے چاہا کہ پوری تفصیل سے شاہ کو آگاہ کرے مگر بالڈون کا لہجہ اس قدر سخت تھا کہ اس نے خاموش رہنے ہی میں اپنی بہتری

میں غلط اور بالکل غلط۔ جاسوس کی بجائے انز نے جواب دیا۔ ”اس اطلاع میں کوئی بات نہیں۔ شاہ آپ تو جانتے ہیں کہ دمشق میں میری مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں مل سکتا۔ تمام حالات کے اندر باہر میرے آدمی موجود ہیں اگر دمشق اور موصل میں کوئی نامہ دہا ہوتا تو مجھے اس کی فوراً خبر مل جاتی۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو انز۔“ شاہ بالڈون نے انز کی بات کی تائید کی۔ پھر اس نے کہا۔ ”لو رک کر جاسوس کو پھر ڈانٹ پلائی۔“ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔ آئندہ ایسی فضول باتیں نہ کر آئے تو سولی پر چڑھا دیے جاؤ گے۔“

اور جاسوس دم سادھے ہوئے اٹھے پیروں واپس ہو گیا۔ ”ہاں انز۔ تم بتاؤ۔ یروٹلم کی کیسے تکلیف کی؟“ جاسوس کے جانے کے بعد بالڈون نے سنبھل کر کہا۔

”میں الدین انز اس اچانک جھٹکے سے پریشان ہو گیا تھا اس نے بڑی مشکل سے اپنے اس قابو میں کیے اور مسکرایا۔“ میں بھی اس کج بخت امیر زنگی کے بارے میں مشورے لے کر حاضر ہوا تھا۔ یہ خطرناک انسان کسی وقت بھی کوئی بڑا فتنہ کھڑا کر سکتا ہے۔ اگر اس وقت سیدھا دمشق سے نہ آیا ہوتا تو مجھے بھی آپ کے جاسوس کی اطلاع پر یقین نہ پڑتا۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ امیر زنگی سے کوئی بات بعید نہیں۔ مگر دمشق سے روانگی کے وقت یہ مشہور کیا تھا کہ میں پھلک جا رہا ہوں مقصد یہ تھا کہ شاہ اور ملکہ مجھے دمشق ہی میں موجود سمجھیں اور کسی قسم کا غلط قدم نہ اٹھاسکیں۔“

”انز تم اپنے حالات زیادہ بہتر سمجھتے ہو لیکن میرا خیال ہے کہ اپنے پیروں میں ان کا چبھے ہوئے۔ کانٹوں کو بھی نکال پھینکو تاکہ کوئی دھڑکا باقی نہ رہ جائے۔“ شاہ یروٹلم نے انز کو دوسرا ہی راستہ دکھایا۔

”میں شاہ محترم۔“ انز نے فوراً انکار کیا۔ ”شاہ آہن اور ملکہ مادر پیر کے کانٹے نہیں چوگان کے گیند اور سوار ہیں جو میرے اشاروں پر حرکت کرتے ہیں جب تک لشکر کی مدد میرے ہاتھ میں ہے امیر زنگی دمشق پر قبضہ نہیں کر سکتا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں بہت مضبوط ہوں۔ مجھے شاہ کے تعاون کی ہر وقت ضرورت ہے۔“

”ٹھیک ہے انز۔“ شاہ بالڈون نے فوراً اس کی حمایت کا اعلان کیا۔ ”یروٹلم کا لشکر ہر لمحہ تمہاری مدد کے لیے موجود ہے۔ اس وقت بھی تم جتنی فوج چاہو اپنے ساتھ لے جا

جاسوسی کا نظام اس وقت بھی اتنا ہی اہم تھا جیسا کہ آج کل ہے۔ اور بھی ایک دوسرے کے علاقے میں اپنے جاسوس مقرر کرتی تھیں۔ جاسوس تاجروں کے بھیجیں میں جگہ جگہ گھومتے پھرتے تھے۔ عیسائی جاسوس راہبوں کا رد مسلمان ریاستوں میں بے دھڑک آتے جاتے تھے۔ مسلم بادشاہ اپنی مذہبی رخصت نہ صرف ان کی عزت کرتے تھے بلکہ انہیں خاص مراعات بھی دیتے تھے۔ آنے والا جاسوس بھی ایک راہب ہی تھا۔ جس وقت وہ شاہ بالڈون کے سامنے اس وقت معین الدین انز بھی شاہ کے برابر تخت شاہی پر ابراجان تھا۔ جاسوس کی لکٹی ہوئی کچھڑی داڑھی تھی اور وہ زمین کو چھوتے ہوئے ایک سفید چوٹے میں اسے دیکھ کر کوئی شبہ بھی نہ کر سکتا تھا کہ اس بوڑھے کے پیٹ میں دانٹ و حیثیت سے جاسوس تنگلے میں گفتگو کرتے تھے مگر بالڈون نے انز پر اپنی دوستی کے لیے جاسوس کو اس کی موجودگی میں بلایا تھا۔

شاہوں کے سامنے لوگ سر جھکائے حاضر ہوتے تھے اور جب تک شاہ کا سر اٹھا کر بات نہ کر سکتے تھے۔ جاسوس راہب سر جھکائے ہوئے پیش ہوا اور ادب سے کھڑا ہو گیا۔

”فیلنوس کیا خبر لائے ہو؟“ شاہ بالڈون نے جاسوس کو مخاطب کیا۔ ”عالیجاہ۔ امیر موصل عماد الدین زنگی چند سرداروں پر مشتمل ایک وفد دربار بھیجنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ خیال ہے کہ۔“

”دمشق۔“ انز کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا اور جاسوس کی بات کٹ گئی۔ دمشق کا نام سن کر شاہ بالڈون کے کان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ منگوا سے انز کو دیکھنے لگا۔ انز اس قدر گھبرا گیا تھا کہ اسے شاہ بالڈون سے آنکھیں چا رہت نہ ہو رہی تھی۔

”تم اپنی بات پوری کرو فیلنوس۔“ شاہ کا لہجہ بڑا تلخ تھا تلخی کو انز نے بھی

”عالیجاہ۔ اس وفد کے ساتھ بڑا قیمتی سامان بھیجا جا رہا ہے۔“ جاسوس نے کہا۔ ”درجنوں جواہرات کے ہار۔ بیش قیمت کپڑے کے تھان۔ اعلیٰ درجے کے

”تو اس بند کرو۔“ بالڈون نے جاسوس کو ڈانٹا۔ ”تجھے میں زیورات نہیں بھیجے یہ تو کسی کی شادی کا سامان معلوم ہوتا ہے تمہیں غلط خبر ملی ہوگی؟“

کہتے ہو۔

”ہمت بہت شکر یہ شاہ محترم۔“ انز سرایا نیاز بن گیا۔ ”مجھے آپ سے کیا تھی۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔ آپ کے جاسوس کی اطلاع اگرچہ غلط ہے لیکن امیر کوئی چیز بھی بعید نہیں۔ میں فوراً دمشق پہنچنا چاہتا ہوں۔“

”میں تمہیں روکوں گا نہیں انز۔“ بالذون نے خوشدلی سے کہا۔ ”اس کا ضرر ہو گا کہ تمہاری کوئی خاطر نہ ہو سکی۔ تم سے تو بہت سی باتیں کرنے تھیں مگر ملاقات ہو گئی۔“

یہی وہ وقت تھا جب سرم بیٹن قیت سامان سے لدا پھندا اور دل میں ہزاروں لیے دمشق میں داخل ہوا اس کے ذمے بڑی اہم خدمت کی گئی تھی ایک طرف تو

ملکہ زمرہ خاتم کو امیر زنگی کے ساتھ عقد ثانی کے لیے تیار کرنا تھا دوسری طرف زنگی اور شاہ آہن کو شادی کے رشتے میں پیوست کر کے دمشق اور موصل کی دشمنی کو لیے ختم کرنا تھا۔ ان دونوں رشتوں کا بظاہر تو یہی مقصد تھا لیکن امیر زنگی اپنے پار معین الدین انز کے اقتدار کو ختم کر کے ملک شام میں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتا تھا تمام حکمت عملیوں کا اصل مقصد یہی تھا۔

سرم جس وقت دمشق میں داخل ہوا تھا اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا اس بات کا شدید خطرہ تھا کہ انز اس کی راہ میں روڑے اٹکائے گا اور اسے ملکہ راہ راست گھٹکو کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس مشکل کا حل اس نے یہ سوچا تھا کہ انکار کی صورت میں وہ کسی رات خفیہ طریقے سے ملکہ کے محل میں داخل ہو جائے

محل کا ہر شخص اس سے واقف تھا اور اگر ایک بار وہ محل میں داخل ہو گیا تو پھر ان پر کوئی زور نہ چل سکے گا مگر یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت معین الدین انز سے باہر گیا تھا۔ سرم کو اس اطلاع سے جس قدر خوشی ہوئی اسے بیان کرنا مشکل ہے۔ سرم مع ساز و سامان کے ملکہ کے محل پر پہنچا۔ انز نے سرم کی گمشدگی کی اطلاع

بیان کی تھی۔ ایک وجہ تو اس نے یہ بیان کی تھی کہ سرم اور انطاکیہ کے شہنشاہ کی ایک ٹوٹی کے درمیان محاشقہ چل رہا تھا۔ چنانچہ جس وقت شیراز کے محلہ واپس ہوئے تو سرم موقع پا کر انطاکیہ کی شہزادی کو لے بھاگا۔ اس کے ساتھ ہی سرم پر یہ الزام بھی لگایا تھا کہ اس نے امیر زنگی کے باغی سردار سے مل کر دمشق

خنداری کی ہے۔ اس کا اشارہ اسد الدین کی طرف تھا۔ انز نے خیال ظاہر کیا کہ سردار کے ساتھ موصل گیا ہو گا مگر ان دونوں باتوں کے لیے اس کے پاس کوئی

ملکہ اور شاہ نے مصلحت کے تحت اس کی باتوں کو تسلیم کر لیا تھا مگر خود ان کا یہ خیال تھا کہ انز نے سرم کو قتل کرا دیا ہے کیونکہ سرم کی شاہی خاندان سے وفاداری انز کی

خاندان کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ سرم کو ملکہ مادر کے محل سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بیٹے شاہ مجیر الدین کے پاس

رہنے لے گئی ہیں۔ اس نے ان لحات کو بھی ضائع نہ کیا اور فوراً شاہ کے محل پر پہنچ گیا۔

شاہ آہن اور ملکہ کے محافظ دستوں کا ناظم تھا۔ وہ لوگ اسے زندہ سلامت دیکھ کر بہت

ش ہوئے اور اسی وقت شاہ کو سرم کے آنے کی خبر پہنچائی گئی ملکہ مادر اور شاہ اس بات

پر حیران رہ گئے۔ وہ تو سرم کو مردہ سمجھ کر اس پر فاتحہ بھی پڑھ چکے تھے۔ شاہ نے سرم کو

راہب کر لیا۔ سرم نے دونوں کو ادب سے سلام کیا اور سر جھکا کر کھڑا ہو گیا شاہ اور ملکہ اسے

ت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور اسے اپنے سامنے زندہ دیکھ بڑے مسرور تھے۔

”سرم۔“ ملکہ نے خوشی پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”خدا کا شکر ہے کہ ہم تمہیں پھر زندہ

سلامت دیکھ رہے ہیں۔ تمہارے دشمنوں نے تمہارے بارے میں نہ جانے کیا کیا زہر

بائیں کی تھیں۔“ اسے ملکہ مہربان اور شاہ عالی وقار۔“ سرم بھی خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ ”مجھے

لی امید نہ تھی کہ میں آسانی سے آپ کی قدم بوسی کو حاضر ہو سکوں گا۔ اگر وزیر اعظم

ان الدین انز اس وقت دمشق میں موجود ہوتا تو میرا آپ کی خدمت میں حاضر ہونا قطعی نا

ن تھا آپ کو اطلاع بھی نہ ہوتی اور وہ مجھے تمہے بیچ کر دیتا۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو سرم۔“ ملکہ نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ”اس نے تم پر

لڑی کا الزام لگایا ہے اگر تم اس کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ شاید تمہیں اس سے بھی زیادہ

ن ملازمت بہر حال اب تم ہماری پناہ میں ہو۔ معین الدین میں کم از کم اتنی ہمت نہیں

ہے بغیر ہماری مرضی کے تمہیں اس محل سے لے جاسکے۔ ہمارا دل کہتا ہے کہ تم اب

ہمارے وفادار ہو؟“

”ملکہ مادر۔ اگر میرے دل میں ذرا بھی کھوٹ ہوتی تو میں دمشق کا رخ ہرگز نہ کرتا۔“

”میں سر پر کفن باندھ کر اس وجہ سے آیا ہوں کہ اس شخص

کا احسان کا بدلہ آتا ہوں جس نے مجھے انز کے بچوں سے چھڑا کر نئی زندگی دی ہے۔ اب

میں قتل بھی کر دیا جاؤ تو مجھے کوئی افسوس نہ ہو گا۔“

”تمہاری داستان بڑی دکھ بھری معلوم ہوتی ہے۔“ ملکہ کا لہجہ مغموم ہو گیا۔ ”کیا تم

شاہ اور اپنی ملکہ کو اپنے دھوئیں میں شریک نہیں کرو گے۔

”کیوں نہیں ملکہ مادر۔“ سرم تن کے بولا۔ ”میں آپ کو اصل حالات کرنے کے لیے ہی جان پر کھیل کے آیا ہوں۔ میں سب کچھ بتاؤں گا۔ آپ ان کی چال سے بھی آگاہ کروں گا جو وہ آپ کو اور میرے پیارے ملک دمشق کو غلام بنانے کے لیے چل رہا ہے۔“

”زیادہ انتظار نہ کرو! سرم۔“ ملکہ بے چین ہو گئیں۔ ”ہم تمہاری بات لیے گوش بر آواز ہیں۔“

سرم نے پہلے شاہ آہن پھر ملکہ کے قریب کھڑی ہوئی اس کی کنیر خاص دیکھا۔ ملکہ اس کا مطلب سمجھ گئی اس نے کنیر سے کہا۔ ”لہذا تم دوسرے کمرے ہم تمہیں بلا لیں گے۔“

لہذا سلام کر کے جانے لگی تو سرم نے اسے روکا۔ ”نہیں لہذا۔ تم میں سے بھی کسی بات کا پردہ نہیں رکھنا چاہتا۔ رہا شاہ عالی مقام کا سوال تو ان کا میر لیکن میں ملکہ مادر سے اس وقت کچھ ایسی باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں جو صرف اب جاسکتی ہیں۔“

”کوئی بات نہیں سرم۔“ شاہ آہن نے پہلی بار زبان کھولی ”تم مادر مرہان کرو۔ ہم دوسرے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔“

”شاہ یہیں تشریف رکھیں گے۔“ ملکہ نے دخل دیا۔ ہم سرم کو ساتھ لے کمرے میں جا رہے ہیں۔“ ملکہ اٹھ کر دوسرے کمرے کی طرف چل پڑی۔ پیچھے ہولیا۔

”سرم۔ تم نے ہمیں گھبرا دیا۔“ ملکہ نے دوسرے کمرے میں پہنچنے ہی کا کون سی ایسی بات ہے جسے تم شاہ بیٹے سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہو۔ تم جانے بیٹے سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔ جو بات بھی تم ہمیں اس وقت بتاؤ گے اگر ہم سے دریافت کیا تو ہمیں بتانا پڑے گی۔“

”ملکہ مادر۔ میں خود نہیں چاہتا کہ آپ کے اور شاہ کے درمیان کسی رہے۔“ سرم نے صفائی پیش کی۔ ”مگر میرے محسن کا حکم ہے کہ میں اس آپ سے گفتگو کروں۔“

”یہ تم کس محسن کا بار بار ذکر رہے ہو؟“ ملکہ نے سرم کی آنکھوں میں آہ ہوئے کہا۔ ”اگر کسی نے تم پر۔۔۔ احسان کیا ہے یا تمہاری جان بچائی ہے۔ تو

بھی احسان کیا ہے تم اس کا نام ظاہر کرو ہم اسے زور و جواہر سے مالا مال کر دیں گے۔“

”ملکہ مادر۔ ایک تو احسان کا بدلہ زور و جواہر نہیں ہو سکتے۔“ سرم بڑے استقلال سے لہ۔ ”پھر اسے آپ کے زور و جواہرات کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس کا خزانہ دمشق سے زیادہ بھرا ہوا ہے میرے محسن نے اپنے خزانے سے آپ کے لیے ایسی ایسی نادر چیزیں در زوہرات بھیجی ہیں جنہیں آپ ضرور پسند فرمائیں گی۔“

”خیر تمہارے لائے ہوئے تحائف کو ہم بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم ہمیں اس نیک انسان کا نام بتاؤ جس کی تعریف کرتے کرتے تمہاری زبان نہیں تھک رہی ہے۔“ ملکہ

ت زیادہ بے چین ہو گئی تھی۔

”موصول کے امیر زنگی کو آپ کیسا انسان سمجھتی ہیں؟“ سرم نے ملکہ کو چونکا دیا۔

”اچھا تو امیر زنگی نے تم پر احسان کیا ہے لیکن وہ تو۔۔۔۔۔۔“ ملکہ کہتے کہتے رک گئی۔

”شاید آپ بھی انہیں دمشق کا دشمن سمجھتی ہیں حالانکہ وہ موصل میں رہتے ہوئے دمشق کے حالات سے غافل نہیں۔“ سرم نے بڑے سلیقے سے امیر زنگی کی تعریف کی۔

”ان کی خواہش ہے کہ دمشق اور موصل کے درمیان میل محبت پیدا ہو۔ امیر زنگی یہ بھی اپنے ہیں کہ دونوں ملکوں میں کوئی رشتہ قائم ہو جائے تو ان کے لیے یہ خوشی کا باعث ہو

ا۔“

”رشتہ کیا رشتہ۔“ ملکہ اور زیادہ چونکی۔ ”سرم۔ کیا تم نہیں جانتے کہ امیر زنگی

مشق کا شدید ترین دشمن ہے؟“

”ملکہ مادر۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے۔ دمشق کی فضاؤں ہواؤں اور تخت و تاج سے مجھے اتنی ہی محبت ہے جتنی ایک بچے دمشق کو ہونا چاہیے۔“ سرم کا لہجہ بڑا جذباتی ہو گیا۔

”لیکن امیر زنگی کو نہ میں نے پہلے دمشق کا دشمن سمجھا اور نہ اب سمجھتا ہوں۔ تالی دلوں ہاتھوں سے بچتی ہے۔ کیا یہ غلط ہے کہ دمشق کی افواج امیر کے خلاف عیسائیوں کے ہاتھ مٹ آرا ہوئیں۔ کیا وزیر اعظم نے موصل کو ختم کرنے کی ہمیشہ کوشش نہیں کی مگر نہ اس پر مرہان ہے۔ عیسائیوں کی متحدہ قوت اور شہنشاہ قسطنطنیہ بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا

ان تمام باتوں کے باوجود بھی امیر زنگی آپ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہا ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ ملکہ اب بھی اسے اپنا دشمن تصور کرتی ہیں۔“

وزیر اعظم معین الدین انز نے ملکہ کو امیر زنگی کی طرف سے اس قدر بدظن کر دیا تھا کہ وہ زنگی کے متعلق اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ محسوس نہ کرتی تھی لیکن سرم کی باتوں نے اس کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

دیں۔“ سرم ہمیں ہمیشہ دوستوں کی تلاش رہی ہے۔“ ملکہ کا ذہن بالکل صاف ہو گیا تھا۔ سرم ذریعے سے اگر یہ کام ہو گیا تو یہ تخت دمشق کی بہت بڑی خدمت ہو گی۔ ہم مارے شکر گزار ہیں سرم۔“

”آپ نے مجھے بڑا حوصلہ دیا ہے ملکہ مادر۔“ سرم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ نے ایک گستاخی پر غور فرمانے کا وعدہ کیا ہے اس لیے مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس قسم ایک اور گستاخی آپ کی خدمت میں پیش کروں جس پر اگر آپ نے توجہ فرمائی تو تخت کی قسمت ہی پلٹ جائے گی۔“

”سرم۔ تم نے ہمارے دامن میں اتنی بڑی خوشی ڈالی ہے جو ہم سے سنبھالی نہیں جا رہا ہے۔ اب تم کوئی اور نوید دینا چاہتے ہو۔ ضرور کہو۔ تمہارا واپس آنا ہمارے لیے بہت رک ثابت ہوا۔“

سرم نے سر اٹھا کر ملکہ مادر کو دیکھا پھر نظریں جھکا کر کہا۔ ”امیر زنگی نہ صرف شاہ کو، فرزندگی میں قبول کرنے میں فخر محسوس کریں گے بلکہ امیر زنگی نے یہ بھی عرض کیا ہے دمشق کی ملکہ مادر اگر سلطنت موصل کی ملکہ کا تاج بھی اپنے سر پر سجانے کی رضامندی فرمائیں تو امیر زنگی آپ کے بہت شکر گزار ہوں گے۔“

سرم نے بڑی شائستگی سے امیر زنگی کی شادی کا پیغام ملکہ مادر کو دیا۔ ملکہ زمرہ خانم دم بھونچکا کر رہ گئی۔ وہ ایک زمانے سے بیوگی کے نامعلوم صدمات برداشت کر رہی تھیں۔ اس کے فطری جذبات مردہ ہوتے جا رہے تھے۔ شہزادہ آبق جوانی میں داخل ہو گیا تھا۔ اس کے باوجود ملکہ دوسری شادی کرنے پر آمادہ نہ تھیں۔ شادی کرتی بھی تو کس سے۔ براعظم معین الدین انز کی موجودگی میں اسے کون پیغام دے سکتا تھا۔ ملکہ کو پیغام دینا اپنی بات کو دعوت دینے کے برابر تھا۔ دمشق کا کوئی سردار معین الدین کی مخالفت کا تصور بھی کر سکتا تھا۔ رہا معین الدین انز تو اس نے ملکہ کو باتوں باتوں میں کئی بار اپنا پیغام دیا تھا۔ لیکن ملکہ کو اس کی صورت دیکھنا بھی گوارہ نہ تھا پھر وہ اس کھوسٹ کو اپنا شوہر کیسے بنائی؟

”سرم کیسے تم ہم سے مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟“ ملکہ نے اسے پر امید نظروں سے دیکھا۔

”توبہ توبہ ملکہ مادر۔ بھلا غلام ایسی ہمت کر سکتا ہے۔“ سرم کے چہرے پر بشارت آگئی تھی۔ ”میں تو امیر زنگی کا قاصد ہوں۔ انہوں نے جو پیغام مجھے دیا ہے وہ میں نے آپ کے حضور پیش کر دیا۔ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے اگر میں نے گستاخی کی ہے تو مجھے معاف فرما

”سرم۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم ایک سچے محب وطن ہو۔ ہم تم پر پہلے ہی طر کرتے ہیں۔“ ملکہ نرم ہو گئیں۔ ”تم کس قسم کے رشتے کی بات کر رہے تھے۔ امیر زنگی کس قسم کی دوستی چاہتا ہے۔ اس سے کون سا رشتہ قائم کیا جاسکتا ہے؟“

”غلام کو خوشی ہے کہ ملکہ نے میری باتوں پر توجہ فرمائی۔“ سرم خوش ہو گیا۔ میں بتاتا ہوں کہ امیر کیا چاہتا ہے اور وہ کس کی دوستی کا خواہش مند ہے۔ امیر کے ملکوں کے تعلقات کو ایک نیا رخ دینے کے لیے ملکہ مادر سے درخواست کی ہے کہ ان یعنی زنگی شہزادی کو آپ کی خدمت میں پیش کریں۔ وہ خلوص دل سے شاہ مجید الدین کو اپنی فرزندگی میں قبول کرنے پر تیار ہیں۔“

ملکہ کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ”سرم کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔ کیا زنگی واقعی اپنی شاہ آبق کی زوجیت میں دینا چاہتا ہے۔ ہمیں تمہاری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے۔ شاہ بھی اسے ایک ناممکن بات ہی سمجھیں گے اگر ایسا ہو جائے تو پھر تمام جھگڑے ہی جائیں گے اور شاید... شاید۔“

”ملکہ مادر اس رشتے سے بہت دور رس نتائج برآمد ہوں گے۔“ سرم نے ملکہ کا خود ہی بیان کر دیا۔ ”امیر زنگی کی عظیم طاقت معین الدین انز کے اثرات کو ختم کر دے اور شاہی محلات میں خوف و ہراس کی پھیلی ہوئی فضا صاف ہو جائے گی۔“

”ہاں ہاں سرم۔“ ملکہ خوشی سے کھلی جا رہی تھیں۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ کھنی گھٹی فضا میں سانس تک نہیں لے سکتے۔ بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ کاش ایسا ہو جائے۔ ”کاش نہ کیسے ملکہ مادر۔ آپ قبول فرمائیے تو یہ کام ابھی اور اسی وقت ہے۔“ سرم کا حوصلہ بڑھ گیا۔ ”امیر زنگی نے مجھے زنگی شہزادی کا وکیل بنا کر بھیجا۔ آپ غور فرمائیے اور شاہ سے مشورے کے بعد مجھے مطلع کیجیے۔ میں بری کا سامنا ساتھ لے کر آیا ہوں۔“

”سرم ہمیں اس قدر حیران نہ کروں کہ ہم خوشی سے پاگل ہو جائیں۔ ہمیں تو کچھ خواب سا معلوم ہو رہا ہے۔ امیر زنگی کی طاقت سے کون واقف نہیں۔ وہ ہمارے پر آگئے تو ہم ان کے اثر سے بھی آزاد ہو جائیں گے۔ اطمینان رکھو سرم۔ ہم شاہ کو راضی کر لیں گے۔“ ملکہ خوشی کی لہر میں سب کچھ کستی چلی جا رہی تھیں۔

سرم اسی موقعے کا خنجر تھا۔ اس نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”ملکہ مادر نے میری اور امیر زنگی کی درخواست پر غور فرمانے کا وعدہ کیا ہے۔ اس خوشی کو میں میں نہیں ڈھال سکتا۔ میرا خیال تھا کہ آپ ناراض ہو کر کیس میرے قتل کا حکم نہ

میدان جنگ میں مجھے ملی تھی۔ ہم نے اپنے مستقبل کے بارے میں بڑے بڑے خیالات کیے تھے مگر فلک کو یہ پسند نہ آیا اور وہ مجھ سے جدا ہو گئی۔ یہ بات نہیں کہ اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔ وہ مجھے اب بھی ڈھونڈ رہی ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے تلاش کرتی ہوئی دمشق آئی ہوگی لیکن تم اس کے بارے میں مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اب تک یہاں بھی نہیں پہنچی۔

”سرور اگر شہزادی یہاں آتی تو ہم اسے آپ کی امانت سمجھ کر اپنے سینے سے لگا کے رکھتے۔“ لٹاس کی کہانی سے افسردہ سی ہو گئی۔ ”خدا اسے جلد آپ سے ملائے۔ اس کے واپس ایک کنیز اور کبھی کیا سکتی ہے۔“

شہزادی جینالو کے ذکر سے سرم افسردہ ہو گیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”میرے دل میں یہ نہیں پوچھا کہ میں کہاں سے آیا ہوں اور کیوں آیا ہوں؟“

”کنیز اپنے مرتبے سے واقف ہے سرور۔“ لٹاس نے سلیقے سے جواب دیا۔ ”کنیزوں کی زبان اور آنکھیں بند رہتی ہیں۔ ان کا کام صرف سننا اور حکم کی تعمیل کرنا ہے۔“

”مگر تمہارا یہ مرتبہ نہیں ہے لٹاس۔“ سرم نے اسے چھیڑا۔ ”تم ملکہ مادر کی رازدار ہو تم سے کوئی بات نہیں چھپی رہ سکتی میں خود بتاتا ہوں۔ شہزادی جینالو سے جدا ہو کر میں امیر زنگی کے دربار میں پہنچ گیا تھا۔ انہوں نے میری بہت افزائی کی اور اب یہ انہی کا احسان ہی ہے کہ میں ان کا ایک خاص پیغام لے کر ملکہ مادر کے پاس آیا ہوں۔ میرے لئے ہوئے پیغام ہے تم چند لمحوں بعد واقف ہو جاؤ گی اور شاید تم خوش بھی ہو۔“

”مگر ملکہ خوش ہوں گی تو میرا خوش ہونا لازمی ہے۔ کنیزیں اپنے آقا سے جدا نہیں ہوا کرتیں۔“ شوخ مگر سمجھدار کنیز نے ایک ایسی بات کی تھی جسے سن کر سرم حیران رہ گیا۔

”لٹاس تمہاری جیسی سمجھدار اور وفادار کنیزوں کی ملکہ اور شاہ دونوں کو بہت ضرورت ہے۔ میں دربار زنگی سے منسلک ہو گیا ہوں۔ ان دونوں کی حفاظت اب تم جیسی کنیزوں ہی کو کرنا ہوگی۔“ سرم نے لٹاس کی بھرپور تعریف کی۔

”سرور! مجھے پوچھنا تو نہیں چاہیے مگر دل چاہتا تھا کہ یہ ضرور دریافت کروں کہ آپ نے دمشق کی بجائے موصل سے کیوں تعلق پیدا کیا جب کہ شاہ اور ملکہ کو آپ کی زیادہ ضرورت تھی۔ وہ آپ کے بغیر بہت تنہائی محسوس کرتے ہیں۔“

لٹاس کے چہرے پر سوالیہ سوال نے سرم کو پریشان کر دیا۔ اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور مگرالہ۔ ”یہ بھی ایک حادثہ تھا لٹاس لیکن امید ہے کہ میں پھر دمشق واپس آ جاؤں گا۔“

دیکھتے۔

”نوید گستاخی نہیں ہوا کرتی سرم۔“ ملکہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”اللہ تعالیٰ ہماری رات دن کی دعائیں سن لی ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم اتنی بہت سی خوشیاں ساتھ کس طرح سنبھالیں۔ ہمیں تمہاری باتوں اور اپنے کانوں پر اب بھی یقین نہیں ہے۔“

”میں دوبارہ عرض کیے دیتا ہوں ملکہ مادر۔“ سرم مسکرایا۔ ”امیر زنگی کی پہلی ہے کہ ان کی بیٹی کو آپ اپنی خدمت میں قبول فرمائیں۔ ان کی دوسری خواہش بلکہ ہے کہ ملکہ زمرہ خاتم۔ ملکہ موصل کا تاج اپنے سر پر سجانے کی رضا مندی ظاہر کر کے زنگی نے آپ کی شایان شان زیورات اور پارچہ جات میرے ساتھ بھیجے ہیں۔ مزید دہائی کے لیے موصل کے قاضی انصافہ کو میرے ہمراہ روانہ کیا ہے۔ جو عقد پڑھانے کا ادا کریں گے۔“

ملکہ واقعی خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شکریہ کس طرح ادا کرے۔ ملکہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”سرم تم ذرا انتظار کر شاہ سے گفتگو کر کے واپس آتے ہیں۔“

”میں انتظار کر رہا ہوں۔“ سرم بھی کھڑا ہو گیا۔ ”ملکہ مادر۔ اس بات کا ضرور رکھنے کے انز کی وقت بھی دمشق واپس آ سکتا ہے۔ اگر اس کی عدم موجودگی۔“

”تم اطمینان رکھو سرم۔“ اور ملکہ لپ جھپ کرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحوں کے بعد ملکہ کی کنیز خاص لٹاس کے پاس آئی۔ ”آؤ۔ آؤ لٹاس۔ تم صرذ نہیں بلکہ ماہ لٹاس۔“ سرم نے مسکراتے ہوئے اسے خوش آمدید کہا۔ ”تم سے تو بہت پوچھنا ہے۔“

”مجھ سے کیا پوچھنا ہے سرور؟“ شوخ لٹاس پھول کی طرح ہنسی۔ ”خبریں تو آپ سے ہیں مجھے۔ آپ اکیلے ہیں یا شہزادی بھی آپ کے ساتھ ہے؟“

”شہزادی۔ کون سی شہزادی؟“ سرم حیران رہ گیا۔ اسے شبہ ہوا کہ شاید ملکہ نے امیر زنگی شہزادی کے بارے میں بتا دیا ہے۔

”مجھ سے کیوں چھپاتے ہو سرور۔“ لٹاس نے شوخی دکھائی۔ ”دمشق کا بچہ بچہ جانتا۔ کہ آپ انصافہ کی شہزادی کو لے آئے ہیں۔ اب چھپانے کا کیا فائدہ؟“

”اچھا تو تم شہزادی جینالو کے بارے میں پوچھ رہی ہو۔“ سرم نے اطمینان کا سامان لیا۔ ”تم نے ٹھیک سنا ہے لٹاس۔ شہزادی جینالو اور میری ملاقات محض ایک حادثہ تھی۔“

حالات نے شاید اپنا رخ بدل لیا ہے۔

خدا کرے ایسا ہی ہو۔“ لقا نے اندازہ کر لیا کہ سرم کچھ اور بتانا نہیں چاہتا اس نے یہ موضوع چھوڑ کے دوسری باتیں شروع کر دیں وہ دیر تک گپ شپ لڑا پھر ملکہ زمرہ خانم ہنسی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے ہنستا دیکھ کر سرم کو اپنا یقین ہو گیا۔

”سرم۔ خوش ہو جاؤ کہ شاہ نے امیر زنگی کی پہلی درخواست قبول کر لی ہے خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔

”مبارک ہو ملکہ مادر۔ شاہ کے فیصلے سے مجھے بے پناہ خوشی حاصل ہوئی ہے بھی کھلا جا رہا تھا۔

”اب یہ بتاؤ کہ یہ کام کب اور کس طرح ہو گا؟“

”ملکہ مادر میرے خیال میں عقد کی تقریب فوراً ہو جانا چاہیے ممکن ہو سکے تو اگر انزوا پس آگیا تو کوئی نیا قتنہ کھڑا ہو سکتا ہے۔“ سرم نے متانت سے جواب دیا۔

”یہ ٹھیک ہے۔ اس کے آنے سے پہلے ہی سب کچھ ہو جانا چاہیے۔“ پھر پلٹ کر لقا کو دیکھا۔ ”لقا تم فوراً جا کر انتظام کرو۔ صرف چار پانچ سرداروں کو بلاؤ وقت زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں۔ شادی کا جشن ہم بعد میں منائیں گے۔“

لقا منہ کھولے بوکھلائی کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کس کی شادی کیا جشن منایا جا رہا ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ عقد کے نام پر اس کے کان ضرور ہو گئے تھے مگر شاہ نے امیر زنگی کی کیا درخواست قبول کر لی تھی۔ اس میں اس کا دار ہوا تھا۔

”ارے تم اب تک کھڑی ہو۔“ ملکہ نے لقا کو گھورا۔

”مگر ملکہ مادر۔ بس کیا انتظام کروں کس کا عقد ہو رہا ہے۔ کچھ فرمائیے تو سنا“ نے گھبراہٹ میں نہ جانے اور کیا کیا پوچھ ڈالا۔

ملکہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے لقا کو کچھ بھی تو نہیں بتایا تھا پھر وہ کیا کرتی۔ ”لقا۔“ ملکہ مسکرائی۔ ”وائی موصل امیر زنگی نے شاہ مجیر الدین آہن کو فرزندگی میں مانگا ہے۔ شاہ نے یہ رشتہ منظور کر لیا ہے۔ یہ عقد ابھی اور اسی وقت ہے۔“

لقا کے چہرے پر گلاب کی کلیوں جیسی سرخی پھیل گئی۔ اس نے بڑے انداز سے ہلکا سا جھکا دیا اور گنگنائی ہوئی باہر کی طرف چلی۔ اسی وقت سرم کی آواز سنائی دی ”سے کہہ رہا تھا۔

”ملکہ مادر۔ آپ نے امیر زنگی کی پہلی درخواست قبول کر لی مگر دوسری درخواست کے لیے کچھ نہ فرمایا؟“

”اس نے قدم سرم کی آواز پر رک گئے تھے۔ اس نے پلٹ کر ملکہ کی طرف دیکھا۔ ملکہ ہوش رنک ہو گیا اور وہ ایک مرمیس بت کی طرح ساکت ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔ اپنی امید بھری نظروں سے ملکہ کو دیکھ رہا تھا۔ آخر اس بت طراز کے لب ہلے۔ امیر زنگی کی دوسری درخواست بھی ہم نے قبول.....“

ملکہ زمرہ خانم آگے کچھ نہ کہہ سکی اور اس کا حیا آلود چہرہ جھک گیا۔ لقا نے کچھ نہ کچھ لگا لیا تھا مگر وہ اپنے اندازے کی تصدیق چاہتی تھی۔ آخر سرم نے اس کی تصدیق کر

”دمشق کا دیرینہ غلام سرم جو اب تک شاہ دمشق اور ملکہ مادر کی خدمت کرتا رہا۔ سرم بڑے ادب سے کہہ رہا تھا۔ ”وہی سرم اس وقت سب سے پہلے ملکہ مادر کو بدل ہونے کی مبارکباد پیش کرتا ہے۔“

لقا کی سمجھ میں سارا معاملہ آگیا۔ وہ فوراً چپکی۔ ”اور میں لقا ملکہ مادر کی خاص کنیز اس کی تصدیق کرتی اور گواہی دیتی ہے کہ سردار سرم نے دمشق کے چاند زمرہ خانم کو مائیک سلطنت کی نئی ملکہ ہونے کا سب سے پہلے اعلان کیا ہے۔“

”کم بخت لقا۔“ زمرہ خانم کے لب خوشی سے کپکپا کے رہ گئے۔ آئندہ دو گھنٹوں کے اندر قصر شاہی میں ایک مختصر مگر باوقار تقریب کا اہتمام ہوا۔ اس میں ملکہ مادر نے دمشق کے ان چار سرداروں کو شرکت کے لیے بلایا جن کے متعلق علم تھا کہ بظاہر معین الدین انز کے ہمنا ہیں مگر وہ دل سے شاہ اور ملکہ کے وفادار پانچواں سردار جو اس محفل میں مدعو کیا گیا وہ انز کا خاص آدمی اور اس کا نائب تھا۔

نے خاص طور پر اسے اس لیے بلایا تھا تاکہ وہ انز کے سامنے اس بات کی تصدیق کرے کہ شاہی محل میں اس طرح کی ایک تقریب واقعی منعقد ہوئی تھی۔ ان سرداروں کو محل میں داخل ہونے سے پہلے اس بات کا علم نہ تھا کہ شاہ دمشق مجیر الدین آہن نے ان کی طلب کیا ہے۔ جس وقت یہ سردار محل میں پہنچ گئے تو شاہی محل کو شاہ کے دستوں نے گھیر لیا تاکہ کوئی سردار باہر نہ نکل سکے اور نہ دمشق میں کسی قسم کی مزاحمت ہو۔

مگر جو سالان موصل سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ سب اس نے محل میں بھجوا دیا جسے اپنی عمرانی میں سونے چاندی کی کشتیوں میں سجا کر محل کے ایک بڑے کمرے میں رکھ دیا۔ اس کے ساتھ آنے والے قاضی صاحب نے پہلے شاہ مجیر الدین آہن اور زنگی

رنگہ پاشاہ آہن سے کسی قسم کی باز پرس کی تو وہ کہہ دیں گے کہ انہوں نے اسے بلانے کے لیے ہبلک قاصد بھیجا تھا مگر وہاں سے معلوم ہوا کہ انز وہاں نہیں ہے اس لیے ملکہ کو ایک کام اس کی عدم موجودگی میں کرنا پڑا۔

چنانچہ بالکل ایسا ہی ہوا۔ عقد کے تیسرے دن موصل کا وفد واپس چلا گیا۔ شاہ آہن ملکہ زمرہ خانم نے وفد کے ہر فرد کو شاہی خلعت کے علاوہ بے شمار انعام و اکرام سے نوازا۔ سرگرم کو ملکہ نے اپنے پاس روک لیا تھا۔ ملکہ نے امیر زنگی کو پیغام بھیج دیا تھا کہ زنگی شہزادی کو ایک محافظ دستے کے ساتھ بھیج دیں جہاں سرحد پر شاہ آہن پورے تزک و تہنہ کے ساتھ ملکہ دمشق کا استقبال کریں گے۔ ادھر وفد موصل واپس ہوا اور ادھر یعنی قلعہ میں معین الدین انز شاہ یروشلیم سے مل کر دمشق واپس پہنچا شہر میں اس وقت جشن اجا رہا تھا۔ ہر طرف خوشی کا دور دورہ تھا اور جگہ جگہ رقص و موسیقی کی محفلیں جی رہیں۔ معین الدین انز کا ماتھا اسی وقت ٹھنکا۔ ہو اپنے چاروں محافظوں کو وہیں چھوڑ کر واپس آگیا۔ اس کی حویلی میں اس کا نائب اور دوسرے سردار بڑی بات چیت کر رہے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ معین الدین انز کی گمشدگی میں امیر زنگی کا ہاتھ ہے کیونکہ انز کے دمشق سے جاتے ہی سرگرم زنگی کا پیغام لے کر آتا اور پھر چٹ مٹکتی اور پٹ بیاہ ہو جاتا یہ سب کسی زبردست لڑائی کا مختلف کڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔

مگر جب معین الدین انز نے اپنی حویلی کے دروازے پر آکر گھوڑا روکا تو اس کے رکاب کا رخ مڑ گیا۔ بعض سرداروں نے کھلے الفاظ میں اس شبہ کا اظہار بھی کیا تھا کہ معین الدین انز کو امیر زنگی نے اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے۔ ورنہ امیر زنگی کو شادی کا پیغام بھیجنے کی بات نہ ہو سکتی تھی لیکن وہ انز کو اپنے سامنے دیکھ کر نہ صرف حیرت زدہ بلکہ خوشی سے ہلکے ہو گئے۔ معین الدین انز کا نائب دوڑ کے اس سے پلٹ گیا۔ ”وزیر اعظم ہم تباہ ہو رہے ہیں۔“

معین الدین انز اندر سے ریز رہا تھا مگر اس نے بڑے ضبط کا ثبوت دیا۔ ”گھبرانے کی بات نہیں۔ مجھے دمشق میں داخل ہوتے ہی حالات کا اندازہ ہو گیا تھا۔ فکر کیوں کرتے ہو؟“

”ابھی مجھ پر ہے اور تمہارا معین الدین انز بھی زندہ ہے۔ حالات کتنے ہی کیوں نہ ہوں۔“

”سب آپ کے ساتھ ہیں وزیر اعظم۔“ سب نے بیک زبان اعلان کیا۔ ”لشکر بھی کامیاب ہے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ امیر زنگی نے تو بغیر جنگ کے دمشق پر قبضہ کیا۔“

”ملکہ مادر اور امیر زنگی کی شادی کے ترانے گائے جا رہے ہیں۔“

شہزادی کا عقد پڑھایا۔ شہزادی کی نیابت اور وکالت کا فرض سرگرم نے ادا کیا۔ نکاح تمام سرداروں نے دل سے یا بے دلی سے شاہ آہن پر جو کچھ پاس تھا نچھاور کیا۔ دوسرا نکاح موصل کے حکمران امیر عماد الدین زنگی اور ملکہ زمرہ خانم کا پڑھا۔ میں بھی سرگرم نے امیر زنگی کی وکالت اور نیابت کا فرض ادا کیا۔ ملکہ مادر نے یہ سہی کہ امیر زنگی سے عقد کے بعد بھی وہ دمشق میں مقیم رہیں گی۔ امیر زنگی اس کے لیے ہر وقت دمشق آسکتے ہیں۔ ملکہ زمرہ خانم موصل میں ہونے والی تمام شایعات میں نہ صرف شرکت کریں گے بلکہ اس میں بھرپور حصہ بھی لیں گی۔

شاہ اور ملکہ کی شادی کا جشن شاہی محلات میں اسی دن سے شروع ہو گیا تھا۔ تقریب معین الدین انز کی غیر موجودگی اور اس کی اجازت کے بغیر ہوئی تھی اس کے بڑے بڑے سردار بہت چراغ پا ہوئے مگر دونوں عقد ہو چکے تھے اور انہیں اس کے بس میں نہ تھا۔ معین الدین انز بھی موجود نہ تھا۔ اس لیے سب کو خاموشی پڑی۔ انہوں نے حسب روایت شاہ آہن کو نذرین پیش کیں اور اپنی طرف سے بات نہ ہونے دیا کہ وہ موصل اور دمشق کے اس گٹھ جوڑ کے خلاف ہیں۔ عوام کی طرف سے بھی ان شادیوں کو خوب سراہا گیا انہیں اس بات کی زیادہ خوشی تھی کہ موصل کے اس دہریے رشتے نے دو مسلم حکومتوں کی قدیم دشمنی کو دوستی اور محبت میں بدل دیا۔ پھر جب دربار کی طرف سے عوام کو جشن منانے کا اعلان ہوا تو انہوں نے بڑے سے شاہ اور ملکہ کی سرتوں میں اپنے سرت بھرے جذبات کا مظاہرہ کیا۔

معین الدین انز نے یروشلیم جاتے وقت اپنے نائب کو بھی اعتماد میں نہیں لیا اسے بھی یہی بتا کے گیا تھا کہ وہ اپنی جاکیر ہبلک جا رہا ہے اور ایک دو دن بعد آجائے گا۔ عقد کی رات کو ہی انز کے نائب نے ایک حیز رفتار سوار کو ہبلک بھیجا کہ وہ انز کو حالات سے آگاہ کر کے فوراً دمشق پہنچنے کی درخواست کرے مگر قاصد ناکام اور نامراد واپس آیا اس نے بتایا کہ معین الدین انز ہبلک میں موجود نہیں اس نے یہ انکشاف کر کے انز کے نائب کو پریشان کر دیا کہ انز اب تک ہبلک نہیں اور کسی کو پتہ بھی نہیں کہ وہ کہاں اور کیوں چھپا بیٹھا ہے۔

انز کے نائب نے وزیر اعظم کو واپس بلوانے کے سلسلے میں بڑی راز داری سے تھا مگر اس وقت شاہ اور انز کے درمیان اختلاف کے باعث لوگوں کی ہمدردیاں ان میں تقسیم ہو گئی تھیں۔ پس نائب کی راز داری کا بھانڈا کسی نے پھوڑ دیا اور ملکہ نے یہ سب سنا۔ معین الدین انز دمشق سے ہبلک جاتے ہوئے راستے سے کہیں نائب اس اطلاع سے ملکہ نے سکھ کا سانس لیا اور اسے یہ بہانہ بھی مل گیا کہ معین الدین



”ملکہ زمرہ خانم کا قیام دمشق میں رہے گا۔“ نائب نے بتایا۔ ”امیر زنگی سے ایک ہفتے کے تحت ملکہ ہمیشہ دمشق میں رہے گی اور صرف اہم سرکاری تقاریب میں شرکت کے لیے موصل جایا کریں گی۔“

معین الدین انز کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ”اس کا مطلب ہے کہ بازی اب بھی ہاتھ میں ہے۔ نہ دمشق سے کوئی موصل گیا ہے اور نہ موصل سے کوئی دمشق میں ہے۔ فکر کیوں کرتے ہوئے۔ ساتھیو۔ ابھی تو ہر چیز تمہارے پاس ہے۔ امیر زنگی نے انز کی دہشت زدہ دی ہے۔ حالات خراب ضرور ہوئے ہیں لیکن تم دیکھو گے کہ آخری مات زنگی کو ہو گی۔“

”وزیر محترم۔“ نائب نے سمجھتے ہوئے کہا۔ ”موصل کا ایک شخص شاہی محل میں آگیا ہے۔“

”مکن ہے وہ؟“ معین الدین انز ایک بار پھر پریشان ہو گیا۔

”سرم۔ غدار سرم۔ اس نے امیر زنگی کی ملازمت اختیار کر لی ہے ملکہ مادر نے اسے محل میں جگہ دی ہے اور اعلان کیا ہے کہ سرم اس کا مہمان ہے اگر کسی نے سرم کو ان پھانے کی کوشش کی تو محلات کے شاہی دستے اس کی حفاظت کریں گے۔“

”میں زنگی کو زکام ہوتا ہے تو وہ اسی طرح کرتی ہے۔“ معین الدین نے بڑی حقارت سے کہا۔ ”سرم۔ ملکہ کی حفاظت میں نہیں بلکہ ہماری قید میں رہے گا۔ وہ محل کی دیواروں کی باہر نہیں آسکے گا اور ایک قیدی پرندے کی طرح وہیں پھڑپھڑا کے مر جائے گا۔“

”نندہ وزیر اعظم۔“ نائب خوشی سے چیخ پڑا۔ ”آپ ہی ہمارے آقا اور بادشاہ ہیں۔“

”جو حکم دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔“

”تو بیویوں سمجھو کہ دمشق کا کچھ نہیں بچا۔“ معین الدین انز بڑے غرور سے بولا۔

”موصل کا اثر دمشق سے اس طرح زائل کر دیا جائے گا جیسے دودھ سے مکھی کو نکال نہیں۔ تم لوگوں کو سب سے پہلے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا ہو گا۔ ملکہ یا شاہ کو اس طرح نہ ہونا چاہیے کہ تمہارے دل میں کیا ہے۔ ان سے پہلے سے زیادہ وفاداری کا رکھو۔ اسی راستے سے ہم اپنی منزل تک پہنچیں گے۔“

معین الدین انز کے واپس آنے سے شاہی محلات میں کھلبلی مچ گئی تھی ملکہ اور شاہ باجرات مندانہ قدم اٹھایا تھا انہوں نے ایک طرح سے معین الدین کے اقتدار کو منہ نہ دیا۔ انز دمشق کا مرد آہن مشہور تھا۔ وہی وزیر اعظم، وہی مدار الہام اور وہی نائب

”ملکہ مادر کی شادی امیر زنگی سے؟“ انز کا انداز خود کلامی کا تھا مگر اسے زہریلوں کے نیچے سے سرکتی محسوس ہو رہی تھی۔ ”اس شادی کی تحریک کس نے؟“

”شادی ہو چکی ہے وزیر اعظم۔“ اس کا نائب جیسے رونے لگا۔ ”شاہ کا غدار ہے جسے ہم مردہ سمجھ بیٹھے تھے وہ امیر زنگی کی شادی کا پیغام لے کر آیا۔ اس نے ملاقات کی اور سرم کی وکالت میں امیر زنگی کا عقد ملکہ مادر کے ساتھ ہو گیا۔“

”تم لوگ کہاں مر گئے تھے؟“ انز غصے سے پیر پٹختے لگا۔ ”تم نے سرم کو زندہ نہیں کر دیا۔ ملکہ کو آزاد کیوں چھوڑ دیا۔ اسے گرفتار کیوں نہیں کیا گیا؟“

”ہمیں تو خبر ہی نہ ہو سکی۔“ نائب نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ ”ایک ہی سب کچھ ہو گیا۔ ملکہ مادر نے مجھے مشورے کے لیے شاہی محل میں طلب کیا تھا۔“

امیر زنگی نے کوئی پیغام بھیجا ہے اور آپ کی عدم موجودگی میں ملکہ مجھ سے مشورہ ہیں۔ میں محل میں چلا گیا مگر وہاں تو سب انتظامات مکمل تھے۔ سرم اپنے ساتھ قاضی القضاۃ کو لے آیا تھا۔ ملکہ نے محل کے گرد اپنے محافظوں کا پہرہ لگا دیا تھا۔“

آہن اور امیر موصل کی شہزادی بیٹی کا عقد پڑھا گیا پھر۔۔۔“

”کیا کہا تم نے؟“ معین الدین کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ ”آہن کی یہ اس نے زنگی کی بیٹی سے نکاح کر لیا اور مجھے خبر تک نہ ہوئے دی؟“ انز زخمی ہو کر

بل کھا رہا تھا۔

”سب کچھ ہو گیا وزیر اعظم۔“ نائب کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا تھا۔ ”آہن شہزادی کے عقد کے بعد فوراً ملکہ مادر اور امیر زنگی کا نکاح ہو گیا۔ ہم لٹ گئے“

خدا کے لیے کچھ کیجئے امیر زنگی ہمیں چن چن کے قتل کر دے گا۔“

معین الدین انز کا اپنا جسم ٹھنڈا پڑتا جا رہا تھا مگر اس نے اپنے وفادار حوصلہ دیا۔ ”فکر نہ کرو میرے ساتھیو۔ اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو میں ایک ایک ٹھیک کر دوں گا۔“ انز کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے سر اٹھا کے پوچھا۔ ”آہن کی

زنگی شہزادی سے ہوا ہے کیا سرم اسے ساتھ لے کر آیا تھا؟“

”نہیں وزیر اعظم۔“ نائب نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سرم نے زنگی شہزادی کی تھی۔ موصل کا وفد واپس جا چکا ہے۔ آہن کی ہونے والی ملکہ ہفتے عشرے میں

جائے گی۔“

اور ملکہ مادر کہاں ہیں۔ کیا وہ سرم کے ساتھ موصل چلی گئی ہیں؟“

سے انز کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔

بڑی مشکل سے اپنے کانوں پر یقین آیا۔ بلکہ زمرہ خانم نے بھی بڑے خلوص سے دین کے خیالات کی پذیرائی کی۔ ”وفادار وزیر اعظم انز“۔ ملکہ نے اسے مخاطب کیا۔ ”مہاراجا خیال تھا کہ شاید تم ہمارے اس قدم کو اچھی نظر سے نہ دیکھو گے مگر ہمارا یہ ارادہ غلط ثابت ہوا۔ اس تقریب کے وقت ہم نے تمہیں ہعلبک سے طلب کیا تھا مگر تم کسی ملکی ضرورت کے تحت کسی اور جگہ گئے ہوئے تھے اس لیے ہم نے یہی بہتر خیال کیا کہ امیر زنگی کے دوستی کے پیغام کو بغیر کسی تاخیر کے شرف قبولیت بخشا جائے۔ تم نے بات کی تصدیق کر دی ہے کہ ہم نے صحیح قدم اٹھایا ہے اور اس سے دمشق کو فائدہ پہنچا۔“

”صرف فائدہ ہی نہیں ملکہ مادر“۔ معین الدین نے بڑے جوش سے کہا۔ ”امیر زنگی ہم سے ہم ایک ایک کر کے تمام عیسائی ریاستوں کا خاتمہ کر دیں گے پھر مشرق مغرب رائل، جنوب ہر طرف اللہ اکبر کا نعرو بلند ہو گا اور اس علاقے کے مسلمان سکھ کا سانس نہیں گمے۔“

”تمہاری زبان مبارک ہو معین الدین“۔ شاہ آہن جو معین الدین کے خوف سے اب ایک بچائی کیفیت میں مبتلا تھا، بدلتے ہوئے حالات میں اس قدر خوش ہوا کہ اپنی زبان میں نہ رکھ سکا۔ اس کی ماں ملکہ مادر نے اسے سختی سے تائید کی تھی کہ معین الدین اس کی گفتگو کے دوران وہ قطعی خاموش رہے کیونکہ ملکہ کو خطرہ تھا کہ شاہ کوئی ایسی بات نہ کہہ بیٹھے جس سے حالات اور زیادہ خراب ہو جائیں۔

ملکہ نے ثم آئین کہہ کر شاہ کو اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کی گفتگو کو پسند نہیں کرتا۔ پچارہ شاہ ماں کا اشارہ پا کر فوراً دب گیا مگر معین الدین تو ماں بیٹے دونوں کو خوش کرنا کا تعاون یا آئینہ بادی لینے آیا تھا۔ اس نے شاہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ ”شاہ! میں نے آپ کے لیے بالڈون شاہ یروٹلم کی شہزادی کو پسند کیا تھا مگر آپ نے زنگی زنگی کو اپنی زوجیت میں لے کر مجھ سے زیادہ عقلمندی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ اس بات کی بات ہے کہ آپ اپنی فراست سے بہت جلد دمشق کے جملہ انتظامات سنبھالنے کے قابل ہو گئے۔ ملکہ مادر اور مجھے سکون کا سانس ملے گا۔“

شاہ اپنی تعریف پر پھول گیا۔ ملکہ نے بھی معین الدین کی بات کی تصدیق کر دی۔ ”میں شاہ بیٹے سے ایسی ہی امید ہے معین الدین“۔ رہی سہی کمی ملکہ نے پوری کر دی۔ ”آپ کی آنکھوں میں شاہانہ غرور کا شمار اٹھانے لگا۔“

”ملکہ مادر۔ میں اس دن کا بے چینی سے انتظار کر رہا ہوں جب زنگی شہزادی یعنی ملکہ

بڑا قدم اٹھا لیا تھا۔ امیر زنگی سے دوستی اور رشتہ قائم کر کے شاہ آہن نے ہمدردیاں حاصل کر لی تھیں۔ لوگ خوش ہو کر دمشق اور موصل کی دوستی کے رہے تھے مگر وہ سب عوام تھے۔ منیتے اور بے بس عوام۔ شاہی دور حکومت! اقتدار صرف لشکر کی طاقت پر قائم رہتا تھا اور طاقت کے اس سرچشمے پر اب الدین انز کا قبضہ تھا۔ تمام سردار اس کے حکم کے منتظر تھے ان حالات میں شاہ خوفزدہ ہونا درست تھا اگر معین الدین انز ان کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا تو ایسے طور پر ان کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔

مگر جب معین الدین انز شاہی محل میں شاہ اور ملکہ کے حضور میں حاضر ہوا تو اس کا انداز لوگوں کے تمام اندازوں اور قیاس آرائیوں سے مختلف الدین نے بڑے ادب سے دونوں کو سلام کیا۔ ملکہ زمرہ خانم اس اہم معاملہ شاہ آہن کے محل میں آگئی تھی۔

”اے دمشق کے تاجدار اور ملکہ دمشق و سلطنت موصل“۔ معین الدین سپاٹ لہجے میں دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کیا اور تنکھیوں سے انہیں دیکھا۔ کے سسے ہوئے چہرے سفید پڑ گئے تھے۔ انز نے ملکہ دمشق کو ملکہ موصل کے بھی مخاطب کیا۔ ملکہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ خطاب انز کا طعنے ہے یا اس مظہر۔ انز نے ان کے دلوں کا حال ایک نظر میں معلوم کر لیا تھا۔

”سلطنت و دمشق کا وفادار غلام معین الدین حضور شاہ میں خلوص دل سے کی مبارک باد پیش کرتا ہے۔“ معین الدین اتنا کہہ کر پھر رک گیا اور پہلے کی بچا کر انہیں دیکھنے لگا۔ ملکہ اور شاہ اب بھی مبہوت سے بیٹھے تھے۔ ان پر یقین کی کیفیت طاری تھی۔

”غلام کو افسوس ہے کہ وہ شاہی تقریب میں شریک نہ ہو سکا اور ان لمحات کی لذت سے محروم رہا جس کی اسے ہمیشہ سے خواہش تھی۔ شاہ معظم نے امیر زنگی سے رشتہ قائم کر کے اخوت اور دوستی کا وہ بیج بویا ہے جو دونوں کے لیے ایک پل کا کام دے گا۔ میں ایک عرصے سے اس کوشش میں تھا کہ امیر زنگی کو راست گفتگو کر کے دو مسلم حکومتوں کے اس درمیان بھگڑے کو ہمیشہ کے لیے بجائے مگر میں اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے انتہائی مسرت ہے کہ شاہ اور ملکہ نے دونوں سلطنتوں کو ایک ہی دھاگے میں پرو دیا ہے۔ عیسائی اس اتحاد کی خبر ہو گی تو ان کے ارادوں پر اوس پڑ جائے گی اور انہیں آئندہ موصل کی طرف آنکھ اٹھانے کی ہمت نہ ہو گی۔“

معین الدین کی تقریر سے شاہ اور ملکہ کے چہروں پر پھیلی سفیدی کے

دمشق اپنے ملک میں تشریف لائیں گی اور میں ان کے سر مبارک پر ملکہ و سجاؤں گا۔ انہوں نے ایسے پیار بھرے لہجے میں کہا کہ شاہ آبن جھوم اٹھا۔  
”ملکہ دمشق اگلے ہفتے... دمشق پہنچ رہی ہیں معین الدین۔“ ملکہ جس بار چاہتی تھی وہ اس نے برملا کہہ دی۔

”خوش آمدید ملکہ دمشق۔“ انہیں جیسے وفور جذبات سے بے چین ہو گیا۔ ملاحظہ فرمائیں گی کہ دمشق کے ادنیٰ اور اعلیٰ ملکہ دمشق کا کس شاندار انداز کرتے ہیں۔ وہ دن دمشق کی تاریخ میں ایک یادگار دن ہو گا۔ ملکہ دمشق کے ہم والی موصیٰ امیر زنگی کو بھی اس جوش و خروش سے خوش آمدید کہیں گے کہ جی خوش ہو جائے گا۔ امیر ملکہ مادر کے سر تاج ہیں تو ہمارے آقا ہوئے۔ میں اپنی تمام غلطیوں کی مرگزا کے معافی مانگوں گا۔ مجھے امید ہے کہ وہ ضرور معاف کرے۔“

”معین الدین اگر ایسا موقع آیا تو ہم امیر سے تمہاری پر جوش سفارش کر ملکہ نے کہا۔ ”فی الحال نہ ہم نے انہیں دمشق آنے کی دعوت دی ہے اور نہ ایسی کوئی خواہش کی ہے۔“

”ملکہ مادر۔ یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ کیا دمشق کے باسی اپنی نئے آقا کے محروم رہ جائیں گے؟“ معین الدین انہوں نے بڑے افسوس سے کہا۔ ”خیر کوئی بار آقا یہاں نہیں آئیں گے تو یہ غلام ان کی قدم بوسی کے لیے موصول ضرور جائے؟ ملکہ زمرہ خانم نے بڑی حیرت سے انہوں کو دیکھا۔

”ملکہ مادر۔ میں امیر زنگی سے تو معافی مانگ لوں۔ مجھے امید ہے کہ وہ آپ پر مجھے معاف بھی فرمادیں گے۔“ معین الدین نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ پہلے سرم سے معافی مانگتا ہے۔ اس وفادار سردار نے دو دشمن خاندانوں اور حکومت کرا کے جو کارنامہ انجام دیا ہے اس کے لیے میں اس کا شکر گزار ہوں۔ مجھے ہے کہ ایک غلط فہمی کی بناء پر اسے میرے ہاتھوں کچھ تکلیف پہنچی ہے۔ انہیں ملکہ مادر۔ اس کے احسان کے بوجھ سے میری گردن جھکی جا رہی ہے۔“

سرم بھی شاہ اور ملکہ کی طرح انہوں کے خوف کی وجہ سے ایک پردے کے پیچ باتیں سن رہا تھا۔ اس کا خوف اب دور ہو چکا تھا اور ان کی جذباتی باتوں نے اسے دیا تھا کہ انہوں نے جو کچھ بھی ہو مگر نئے حالات نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس میں ان کی وفاداری پر ذرا بھی شبہ کرنا بڑی ہٹ دھرمی تھی۔ سرم بے دھڑک

کے کل کر ان کے سامنے آگیا۔

”وزیر اعظم کو یہ خادم سلام پیش کرتا ہے۔“ سرم نے بڑی صاف دلی سے کہا۔  
”میں نہیں سرم۔“ انہوں نے اسے مسکرا کر دیکھا۔ ”میرے قریب آؤ اور گلے لگ لیں۔ تم نے دمشق اور موصیٰ کی عداوت ختم کر کے صرف دمشق ہی پر احسان نہیں کیا بلکہ اپنے اعلیٰ اور ارفع کردار سے مجھے اپنا غلام بنا لیا ہے۔“  
”آپ مجھے شرمندہ نہ کیجیے وزیر اعظم۔“ سرم سچے دل سے بولا پھر آگے بڑھ کر معین الدین کے گلے لگ گیا۔

سرم ان کے گلے لگا کھڑا تھا اور انہوں اس کی پیٹھ پر بڑی شفقت سے تھکیاں دے رہا تھا۔ ”سرم تم زور و جواہر میں تولنے کے قابل ہو۔ مجھے امید ہے کہ تم اپنے دل سے تمام دروغیں اور غلط فہمیاں دور کر کے مجھے سچے دل سے معاف کر دو گے۔ تمہارا یہ احسان عمر مجھ پر ایک قرض کی طرح سوار رہے گا۔“

”وزیر اعظم میں آپ کا خادم ہوں اور ایک آقا کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ خادم کے لیے اس انداز میں تعریف کرے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے حب الوطنی کی وجہ سے ہوا۔“  
معین الدین انہوں نے اپنی باتوں سے شاہ، ملکہ اور سرم کا دل جیت لیا تھا۔ ان کا نائب کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اس نے نائب کو کچھ اشارہ کیا اور نائب اگلے پیروں باہر چلا گیا۔  
دو روز بعد شاہ اور ملکہ کے نذرانے کا سامان آنا شروع ہوا۔ دس ہی کشتیوں میں دنیا کے اور ریشم کے کپڑے رکھے تھے۔ دس ہی کشتیوں میں ملکہ کے لیے زیورات۔ خوشبویات۔ زلف کشکھار اور آرائش کی دوسری چیزیں تھیں۔ دس اور کشتیاں جو نذر کے لیے پیش آئیں وہ سونے اور چاندی کی چھوٹی چھوٹی اینٹوں سے بھری تھیں۔ آخری دو کشتیوں کے بکشی پوش اٹھائے گئے تو دیکھنے والوں کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ایک کشتی میں بڑے سچے موتی بھرے تھے۔ دوسری کشتی مختلف قسم کے جواہرات سے جگمگا رہی تھی۔

نذرانے کا بڑا ہال کشتیوں اور خوانوں سے بھر گیا تھا شاہ اور ملکہ انگشت بدنداں تھے۔ معین الدین ان کی طرف سے پڑے ہوئے کدورت کے تمام دھبے ان کے دلوں سے فٹ ہو گئے تھے۔ ملکہ کے نذرانے کے بعد شاہ آبن کی ملکہ، زنگی شہزادی کے نذرانے کے بعد ان کا شروع ہوئے۔ زنگی شہزادی کے لیے پیش کیا جانے والا سامان ملکہ کے سامان سے زیادہ تھا اسے کشتیوں اور خوانوں میں بڑے سلیقے اور ترتیب سے سجایا گیا تھا۔ اگر کسی کی نظر اس پر پڑے تھے تو وہ پوری کشتی مختلف رنگ، تراش اور بناوٹ کے آویزوں سے لگائی ہوئی کشتی میں کنگن ہی کنگن تھے۔ غرضیکہ ایک سو سے زیادہ کشتیاں قیمتی

بکھلے رکھے جائیں گے۔ امیر اپنے ساتھ جس قدر چاہیں لشکر لا سکتے ہیں کیونکہ اب  
نہ اور موصل الگ نہیں بلکہ ایک جان دو قالب ہیں۔ ان کا یہ پیغام جب امیر زنگی کو  
دہ پڑا حیران ہوا۔ زنگی دربار کے تمام سرداروں نے معین الدین کے پر خلوص پیغام کی  
بک سوائے سردار اسد الدین کے۔ اسد الدین کو انز کے اس پیغام کو پر خلوص سمجھنے  
اہل قلعہ امیر زنگی کے دریافت کرنے پر بھی اسد الدین کوئی وجہ بیان نہ کر سکا اس کا  
ی طرح نہ مان رہا تھا پھر وہ زبان سے کیا کہتا۔

زنگی شہزادی کی رخصتی کا جلوس جس وقت موصل سے روانہ ہوا تو دیکھنے والے دانشوں  
اٹھائیں داب کے وہ گئے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے امیر زنگی نے موصل کی تمام دولت  
بٹی کے ساتھ کر دی ہے۔ شہزادی کے جیز کا سامان ایک سو اونٹ پر بار کیا گیا تھا۔  
مائی ناک میں پڑی ہوئی نکلیوں کی ڈوریاں سونے چاندی کے تاروں سے بنائی گئی تھیں  
ن کی کڑمی ہوئی جھولیں اونٹوں پر پڑی تھیں۔ آگے آگے پچاس سواروں کا ایک دستہ  
ہا تھا۔ ہر سوار کے پاس تین تلواریں تھیں۔ ایک اس کی اپنی تلوار اور باقی دو خالص  
ہاندی کی تھیں جن کے قبضوں پر جواہرات لگے تھے۔ اونٹوں پر کیا سامان لدا ہوا تھا  
کامرف اندازہ ہی کیا جا سکتا تھا۔ پارچہ جات، گنگا جہنی ظروف اور زیورات کی کوئی  
شم نہ تھی جو دمشق نہ بھیجی جا رہی ہو۔ اونٹوں کے پیچھے زنگی شہزادی کا ڈولا تھا۔  
بک لہنس خالص سونے کی بنائی گئی تھی۔ لہنس کے پیچھے ایک آرام دہ اور آراستہ  
گھوڑا گاڑی تھی تاکہ شہزادی جب چاہے لہنس سے اتر کر گھوڑا گاڑی میں سوار ہو  
سب سے پیچھے امیر زنگی اپنے چند سرداروں کے ہمراہ بٹی کو رخصت کرنے جا رہا تھا۔  
زنگی کے ساتھ صرف دو ہزار منتخب سواروں کا دستہ تھا۔ اس دستے کی کمان اسد الدین  
پر تھی۔

جلوس اسی شان سے کوچ کرتا اور اپنی بہاریں دکھاتا آہستہ آہستہ دمشق کی طرف بڑھ  
تا۔ وہ جس راستے سے گزرتا وہاں کے رہنے والے جلوس کا استقبال کرتے اور پھولوں  
ملاہ سونا ہاندی شہزادی کے ڈولے پر نچھاور کرتے۔ دمشق کی سرحد سے ایک منزل دور  
زنگی نے جلوس روک لیا۔ اس نے اپنے اعلان کے مطابق قیام کیا اور صرف ایک سو  
ملا کے ساتھ جو جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ شہزادی کا ڈولا مع تمام سامان کے  
ملاہ کر دیا۔ اسد الدین کو احتیاط کے طور پر شہزادی کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔

دمشق کی سرحد پر معین الدین انز نے ملکہ دمشق کا شایان شان استقبال کیا۔ شاہ آہن  
لہن اپنی والدہ ملکہ مادر زمرہ خاتم کے ساتھ اپنی دھن کی پیشوائی کے لیے آیا تھا۔ اس

سامان سے بھری ہوئی زنگی شہزادی کے لیے پیش گئیں۔ شاہ اور ملکہ پہلے ہی کیا م  
کہ اس سامان کو دیکھ کر وہ اور بوکھلا گئے تھے۔ ہال میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے  
برآمدے میں سجاد دی گئی تھیں اور معین الدین کی درخواست پر اس سامان کو شاہی  
بیگمات کی نمائش کے لیے کھول کے رکھ دیا گیا۔

معین الدین انز نے اپنی طرف سے الگ عوامی جشن کا اعلان کیا۔ اعلان ہوا  
ہفتے تک کسی گھر میں چوٹھا نہیں جلے گا۔ کسی گھر سے اگر دھواں اٹھا دکھائی دیا تو  
سخت سزا دی جائے گی۔ دمشق میں آنے والے مہمان خواہ وہ کارواں سرائے میں  
یا کسی عزیز کے گھر میں ان سب کی خاطر مہارت سرکاری طور پر ہو گی کرا  
اخراجات وزیر اعظم خود اپنی جیب خاص سے ادا کریں گے۔ دمشق میں برسوں کے  
جشن کا اعلان ہوا تھا۔ آئے دن کی جھڑپوں اور جنگوں سے عوام تنگ آئے ہو۔  
انہوں نے اس جشن میں بھرپور حصہ لیا۔ رقص اور موسیقی کھیل تماشے اور  
کباب کی محفلیں جن کی سرعام اجازت نہ تھی وہ بھی برپا ہو گئیں اور مسلسل  
تک قریہ قریہ اور گلی گلی میلہ سالگ رہا۔

پھر زنگی شہزادی کے دمشق آنے کا غلغلہ اٹھا۔ موصل سے اطلاع آئی تھی کہ  
بٹی کو رخصت کرنے کے لیے دمشق کی سرحد تک آئے گا۔ اس نے معین الدین  
مطمئن کرنے کے لیے یہ بھی کہلوا دیا تھا کہ وہ دمشق کی سرحد سے ایک منزل پہلے  
ڈالے گا اور زنگی شہزادی کا ڈولا موصل کے سرداروں کے جلو میں دمشق کی سرحد  
کا۔ امیر زنگی نے اپنی قاصد کے ہاتھ یہ پیغام بھی بھیجا تھا کہ معین الدین انز کو  
طرف سے کوئی بدگمانی ہو تو وہ شہزادی کے ساتھ دمشق تک آنے کا ارادہ ملتوی کر  
کیونکہ اب وہ دمشق کے ساتھ کسی قسم کا جھگڑا پسند نہیں کرتا۔ امیر زنگی کا خیال تھا  
کہ اس پیغام سے معین الدین انز کی نیت معلوم ہو جائے گی اور اگر انز نے اسے  
کی کوشش کی تو دمشق کے عوام اور خواص کے دل میں انز کی قدر و منزلت ضرور  
جائے گی۔

معین الدین انز شاید امیر زنگی سے زیادہ جانبدار تھا۔ اس نے امیر کے قاصد  
دیا کہ وزیر اعظم معین الدین انز کی طرف سے امیر موصل کے حضور میں عرض کیا جا  
امیر موصل صرف دمشق کی سرحد تک ہی تشریف نہ لائیں بلکہ وزیر اعظم ان کا دمشق  
شاہی محل پر استقبال کرنے کا خواہش مند ہے اگر امیر اس درخواست کو قبول فرمائیں  
کی کرم نوازی ہو گی۔ قلعہ دمشق کے دروازے امیر محترم کے لیے چشم انتظار کی

کے علاوہ دمشق کے تقریباً تمام عمائدین اور معززین، دمشق کی ملکہ کو خوش آمدید لیے موجود تھے۔ اسد الدین چونکہ جلوس کے آگے تھا اس لئے وزیر اعظم و دمشق کے انز سے سب سے پہلے اس کا سامنا ہوا۔ انز اسے دیکھ کر چونک پڑا۔ قلعہ شیراز۔ اس نے اسد الدین کو شہنشاہ قسطنطنیہ کے مشیر خاص کے طور پر دیکھا تھا شہنشاہ نے اسد الدین کو دمشق کی خیمہ گاہ میں بھیج دیا تھا تاکہ اسد الدین دمشق کی لشکر کے شہنشاہ کو پہنچاتا رہے مگر اس وقت اسد الدین موصل سے آنے والے جلوس کا معین الدین انز کو یہ بتایا گیا تھا کہ اسد الدین اپنے آقا امیر زنگی کے سخت رویے آکر قسطنطنیہ بھاگ گیا تھا اور اس نے شہنشاہ قسطنطنیہ کا منی نس کے دربار میں حاصل کر لی تھی لیکن اس وقت انز تو کچھ اور ہی نظر آ رہا تھا۔

”اسد الدین تم.... آپ....“ وزیر اعظم بوکھلا گیا۔ اس وقت سردار سرم نے مادر اور شاہ دمشق کے ساتھ آیا تھا اپنا گھوڑا آگے بڑھایا اور انز کے پاس پہنچا۔ ”محترم وزیر اعظم“۔ سرم نے پہلے مسکرا کے اسد الدین کو دیکھا پھر انز سے کہا زنگی نے جس طرح خطائیں معاف کر کے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا ہے اسی طرح ا مقام نے سردار اسد الدین کی غلطیاں بھی بخش دی ہیں اور سردار اسد الدین اس وقت کے حلقہ خاص میں داخل ہیں۔“

”اوہ سرم تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ اور معین الدین نے بڑی تیزی سے اتر کر اسد الدین کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔ ”معزز سردار۔ میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“ معین الدین نے تعظیم اپنے سر کو بھی ذرا سا جھکا دیا۔

معین الدین انز کے اس شانستہ طرز سے اسد الدین بوکھلا سا گیا۔ وہ جلد گھوڑے سے اتر پڑا۔ ”آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں۔ میں امیر موصل کا ایک خادم ہوں اور آپ سلطنت دمشق کے وزیر اعظم۔ آپ کی تعظیم مجھ پر فرض ہے۔“ ”نہیں سردار۔ امیر موصل کی نظر میں خواہ آپ ادنیٰ خادم ہوں لیکن میرے امیر کے قائم مقام ہیں۔“ معین الدین انز نے فوراً جواب دیا۔ ”میرے لیے آپ کی امیر موصل کی تعظیم کے مترادف ہے۔ یوں بھی آپ اب اس دربار سے منسلک دربار کا چھوٹے سے چھوٹا سردار بھی دمشق کے وزیر اعظم سے کہیں زیادہ مرتبہ مکیم مجھی پر فرض ہے۔ آقا کا نائب آقا ہی ہوتا ہے۔ نئے رشتوں کے تحت شاہ آ طرح امیر موصل بھی میرے آقا ہیں۔“

اسد الدین پانی پانی ہوا جا رہا تھا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ معین الدین انز خود ہی بولا۔ ”جلوس کی خبر لانے والے قاصد نے مجھے بتایا تھا کہ امیر سے ایک منزل دور قیام فرمائیں گے۔ اس کا مطلب ہے کہ امیر نے خادم کی ذات قبول نہیں فرمائی۔“

اسد الدین جو پہلے ہی زیادہ خجل تھا اور زیادہ شرمندہ ہو گیا افسردگی سے بولا۔ ”کیا کہا جا رہا ہے وزیر اعظم۔ ہمارے امیر اپنی مرضی کے مالک ہیں۔ وہ کسی کا کہنا نہیں سنتے۔ حالانکہ انے آپ کی بات کی تائید کی تھی۔“

اسد الدین نے یہ سفید جھوٹ بولا تھا۔ اس نے امیر سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا معین الدین انز خواہ آپ کے قدموں ہی میں سر کیوں نہ رکھ دے مگر اس پر اعتبار کیا جا سکتا۔

شاہ مجیر الدین آبتی کی نظریں بار بار اس ڈولے کی طرف اٹھ رہی تھیں جس میں اس جون ساتھی اور تمناؤں کی پہلی جائز ہستی اپنے چاند جیسے کھڑے کو گھونکھٹ میں اپنے بیٹی تھی۔ ملکہ مادر زمرہ خانم بھی انز کے بے موقع سوال و جواب سے الجھن سی دس کر رہی تھیں۔ آخر زمرہ خانم سے صبر نہ ہو سکا ”انز ہم محل میں پہنچ کے اطمینان سے گفتگو کریں گے۔ دمشق کی ملکہ کی بھی تو خبر لو۔ ان کا ڈولا پیڑ کے نیچے رکھا ہے۔“

انز گھبرا گیا۔ ”معاف کیجیے ملکہ مادر۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے انز نے اسد الدین کا ہاتھ پکڑا اور دلہن کے ڈولے کی طرف بڑھا۔

دوسرے تمام لوگ بھی اپنے اپنے گھوڑے چھوڑ کر ملکہ کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ ملکہ نے مسکرا کر شاہ مجیر الدین آبتی کو دیکھا۔ ”شاہ بیٹے۔ کیا آپ اپنی ملکہ کا استقبال نہ کریں گے۔“

شاہ آبتی اب تک گھوڑے پر سوار تھا ماں کی بات پر اس نے گھوڑے سے اترنا چاہا۔ اس وقت معین الدین پلٹ کر جلدی سے شاہ کے گھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے ڈولے کی لگام پکڑ لی۔ ”عالیجاہ۔ آپ گھوڑے سے اترنے کی زحمت نہ فرمائیں۔ مہمان دہ کی تعظیم ہم غلاموں پر فرض ہے۔“

ملکہ مادر کو معین الدین کی یہ مداخلت ناگوار گزری۔ ”اس میں کیا حرج ہے۔ کیا شاہ دمشق کو اس بات کی بھی اجازت نہیں کہ وہ اپنی ملکہ کی اپنی مرضی کے مطابق تعظیم کرے؟“

”توبہ ملکہ مادر۔“ انز نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ”شاہ دمشق کو کسی کی اجازت کی

موت دیں گے۔“  
 ہشتانی معاف فرمائی جائے۔“ انز بڑے ادب سے بولا۔ ”میاں بیوی ایک دوسرے  
 تھیں ہوں تو کسی قسم کا جھگڑا نہیں ہو سکتا۔ میری درخواست ہے کہ ملکہ مادر میرے  
 امیر مومل کے پاس تشریف لے چلیں۔ اس طرح اگر امیر مومل مجھ سے بدگمان بھی  
 ہے تو آپ کی سفارش سے میری جان بچ جائے گی۔ میں بہر حال ان سے ملاقات کیے  
 بغیر نہیں لوٹوں گا۔“

”آپ کوئی فکر نہ کیجیے وزیر اعظم۔“ اسد الدین خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔  
 نے محسوس کیا کہ گفتگو بلا وجہ طول کھینچی جا رہی ہے اس لیے اسے بولنا پڑا۔ ”جس  
 اور دوستی کا اظہار آپ نے کیا ہے اس کے پیش نظر امیر مومل کے دل میں کوئی بد  
 نہ رہ جانی چاہیے۔ میں آپ کے حسن سلوک کا یقینی شاہد ہوں اگر خدا نخواستہ کوئی  
 پڑا ہو تو میں آپ کی طرف سے گواہی دوں گا۔“

”مردار اسد الدین۔ کیا آپ زنگی شنزادی کا ڈولا دمشق نہیں پہنچائیں گے؟“ انز نے  
 ناظروں سے اسد الدین کو دیکھا۔ ”آپ شنزادی کے محافظوں کے قائد ہیں۔ شنزادی کو  
 نہ میں چھوڑ کے واپس جانا میرے خیال میں مناسب نہیں ہے۔“

”وزیر اعظم۔ میرے امیر کا حکم ہے کہ میں شاہ دمشق کی امانت سرحد پار آپ کے  
 ہاتھوں میں پہنچا دوں۔“ اسد الدین نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”دمشق جانے کی مجھے  
 ت نہیں دی گئی ہے اور میں امیر کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کا تصور بھی نہیں کر

”یہ ہماری بہت بڑی بد قسمتی ہے کہ ہم امیر مومل اور ان کے نمائندے کی مہمان  
 ناہمی نہیں کر سکتے۔“ معین الدین انز نے افسوس کا اظہار کیا۔ ”ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ  
 مل کے نمائندین کی بھرپور مہمان نوازی کرنے کا فخر حاصل کریں گے۔ میں خود بھی اپنے  
 آقا کی حکم عدولی کا تصور نہیں کر سکتا۔ پیلے میں آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔“

ملکہ مادر بڑے تذبذب میں تھی۔ اس نے معین الدین انز کی ہمدردیاں حاصل کرنے  
 لیے امیر مومل کو دمشق آنے سے روک دیا تھا لیکن اب اس کا دل بے چین ہو رہا تھا  
 نہیں جانتی تھی کہ اپنے نئے شوہر کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ اس سے ملاقات  
 نہ کرے۔ جب کہ معین الدین شاید خود بھی یہی چاہتا تھا کہ دونوں کی ملاقات ہو جائے۔ آخر  
 مل نے تمام مصلحتوں سے منہ موڑ کے اعلان کیا۔ ”معین الدین تم نے دیکھا کہ امیر  
 مل نے کس محبت کے ساتھ دمشق والوں کی امانت ان تک بھجوا دی۔ کیا دمشق والوں کا

کیا ضرورت ہے۔ میرے عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مومل کی زنگی شنزادی  
 جب تک ملکہ دمشق کا تاج نہیں سجایا جاتا اس وقت تک شاہ دمشق مجید الدین  
 پر ملکہ کی تعظیم فرض نہیں ہوتی۔“

ملکہ مادر مسکرا دی۔ ”انز تم نے ٹھیک کہا مگر شاہ آہن نے زنگی شنزادی کو آہن  
 کی ملکہ پہلے ہی تسلیم کر لیا ہے۔ اس لیے ان پر اقلیم دمشق کے کسی آداب کی  
 ضروری نہیں۔“

معین الدین فوراً مسکرانے لگا۔ ”ملکہ مادر نے میری اصلاح فرما دی۔ میں ان  
 گزار ہوں۔ دراصل مجھے محبت کی دنیا سے اب تک سابقہ نہیں پڑا اس لیے میں ہر  
 طور طریقوں سے واقف نہیں ہوں۔“

”ہم تمہیں بھی اس دنیا سے واقف کرا دیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے ملکہ نے اپنے  
 صورت کثیر ”لٹا“ کی طرف دیکھا مگر لٹا جل بھن گئی۔

”میں ملکہ کا غلام ہوں۔ آپ جس طرح حکم دیں گی میں اس پر عمل کروں گا  
 نے چور نظروں سے لٹا کو دیکھا پھر ایک لمحہ رک کے بولا۔ ”ملکہ مادر۔ آپ ملکہ  
 جلوس لے کر دمشق پہلے۔ میں بھی کل تک دمشق پہنچ جاؤں گا۔“

ملکہ نے حیران نظروں سے انز کو دیکھا۔ ”تمہیں کیا کام ہے انز۔ کہاں جانا  
 ہو؟“

”ملکہ مادر۔ غور فرمائیے۔ امیر مومل ہم لوگوں کی محبت میں دمشق تک پہنچ گئے  
 وہ ہمارے آقا اور معزز مہمان ہیں۔“ انز نے بڑی خوب صورتی سے ملکہ کے جذبات  
 چھیڑا۔ ”اگر ہم میں سے کوئی ان کی قدم بوسی کے لیے ان کے پاس نہیں گیا تو وہ کیا  
 گے۔ دمشق کی مہمان نوازی پر کالک لگ جائے گی۔ ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل  
 رہیں گے۔“

”پھر تم کیا کرنا چاہتے ہو؟“ ملکہ کے دل پر انز کی بات کا گہرا اثر ہوا تھا۔ ”ہم  
 ان کے پاس جا سکتے ہیں مگر امیر نے ہمیں یاد نہیں کیا۔“

”ملکہ مادر۔ اس میں امیر کا کوئی قصور نہیں۔ آپ نے بھی تو انہیں دمشق  
 دعوت نہیں دی۔“ انز نے ملکہ پر طنز کیا اور ملکہ بلبل اٹھی۔

”انز۔ ہم نے انہیں دمشق آنے سے اس لیے روکا تھا کہ کہیں کوئی ناخوشگوار  
 اجائے۔ رشتہ نیا ہے ابھی تعلقات میں پختگی بھی پیدا نہیں ہوئی۔ ہم نے سوچا  
 جب غلط فہمیاں دل کے اندر سے بالکل صاف ہو جائیں گی اس وقت ہم امیر کو دمشق

یہ فرض نہیں بننا کہ وہ بھی امیر موصل کی امانت ان تک پہنچائیں؟۔

انز اور اسد الدین نے چونک کر ملکہ کو دیکھا۔ ”ملکہ مادر۔ اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے۔ میں نے تو پہلے بھی یہی درخواست کی تھی۔ ہم شاہ اور دمشق بھیجے دیتے ہیں اور میں اور آپ اسد الدین کے ساتھ امیر موصل کی ما ہیں۔“

”ہرگز نہیں مادر مہربان۔“ شاہ مجیر الدین آبق نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ”دمشق نہیں چھوڑنے دیں گے۔ آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کا دمشق بقیام رہے گا۔“

”مگر شاہ معظم۔“ معین الدین انز نے کچھ کہنا چاہا کہ ملکہ نے اسے فوراً لڑا ”انز یہ ہمارا ذاتی معاملہ ہے۔ تم اس میں دخل نہ دو“ پھر ملکہ نے شاہ آبق ”شاہ دل میلا نہ کیجئے۔ ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گے۔ ہم ساتھ دمشق چلیں گے۔“

ملکہ مادر کے فیصلے کے سامنے سب نے سر جھکا دیے۔ شاہ آبق اپنی ماں اور لے کر دمشق لوٹ گیا اور دمشق کا مرد آہن معین الدین انز۔ موصل کے عماد الدین زنگی کے نمائندے اسد الدین کے ساتھ امیر کی قدم بوسی کو روانہ ہوا۔ اہالیان دمشق نے شاہی جلوس کا پر جوش استقبال کیا۔ زنگی شہزادی کے جانے والے اونٹوں کی قطاریں دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں ان محسوس ہوا جیسے امیر موصل نے اپنے شہر اور خزانے کی تمام نادر اشیاء شہزادی کے دی ہیں۔ جلوس میں شامل کینزوں کی تعداد پہلے ہی سینکڑوں تک پہنچی ہوئی تھی شاہی محل میں زنگی شہزادی کا ڈولا اتارا گیا تو کینزوں کی پوری فوج نے اسے گھیر لیا خیال تھا کہ وہ محل میں پہنچ کر شادی کی تمام رسمیں ادا کریں گی لیکن کینزوں کی نے تمام نظام درہم برہم کر دیا۔ شہزادی ابھی جملہ عروسی تک بھی نہ پہنچی تھی کہ اس کا گھونگٹ الٹ دیا۔ کسی نے ادھر سے کھینچا کسی نے ادھر سے۔ ملکہ اہائیں کرتی رہ گئی اور کینزوں نے جملہ عروسی میں پہنچتے پہنچتے شہزادی کو بے نقاب کر دیا شہزادی کی شکل دیکھی وہ حیران رہ گیا۔ کسی نے چاند۔ کسی نے خورشید اور غنچہ نا شکلفہ سے شہزادی کو تشبیہ دی۔ ملکہ تنگ آکر ایک طرف جا کھڑی ہو گئی کینزوں کی زبان سے ہمو کی تفریض سن سن کے نہال ہوئی جا رہی تھی۔

غرض دیر تک یہی اوجھ رہا پھر رسمیں شروع ہوئیں۔ پورا محل کھلتے کھلتے

کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ دوپہر سے شام پھر رات ہو گئی مگر قہقہے تھے کہ بند نہ ہوتے تھے۔ خوشیاں تھیں کہ سیل رواں کی طرف بہہ رہی تھیں نصف رات گزرنے کے بعد ملکہ کے حکم سے جملہ عروسی سے کینزوں کو گھسیٹ گھسیٹ کے باہر نکالا گیا اور شاہ الدین آبق ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں کے ساتھ عروس نو کی خوشبوؤں میں بے ہوش ہوئے اور پھولوں سے مہکتی سج کے پاس پہنچا۔

معین الدین انز اور اسد الدین ہنستے بولتے گھوڑے اڑاتے امیر موصل کی خیمہ گاہ کی چلے جا رہے تھے۔ انز نے اپنے نائب کو ضروری ہدایات دے کر شاہی جلوس کے دمشق بھیج دیا تھا اور اب بڑے اطمینان سے امیر موصل کی خدمت میں جا رہا تھا۔ الدین کے تمام دوسے اور اندیشے ختم ہو چکے تھے اسے انز کے اس طرح رام ہو جانے بہت خوشی ہوئی تھی۔ موصل اور دمشق کی دیرینہ دشمنی دوستی میں بدل گئی تھی اور دمشق کو طاقت کے زور سے فتح نہ کر سکا تھا وہی دمشق اور اس کا اصل حکمران معین انز اس وقت بھیگی ملی بنا اس کے گھوڑے سے گھوڑا ملائے امیر موصل کی قدم بوسی کو با تھا۔

”ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے وزیر اعظم۔“ اسد الدین نے بڑی مسرت سے معین الدین کو بکایا۔ ”ہمارے لشکر کے خیمے صاف نظر آرہے ہیں۔“ اسد الدین نے ایک طرف بکایا۔

”خدا کا شکر ہے۔“ معین الدین انز نے بڑے انکسار سے کہا اور اپنا گھوڑا روک لیا۔ ”آپ رک کیوں گئے وزیر اعظم؟“ اسد الدین نے گھوڑا روک کر انز کو قدرے حیرانگی دیکھا۔

”محترم سردار۔“ انز کا لہجہ جیسے درد میں ڈوب گیا۔ ”میرے آقا کا دربار قریب ہے۔ دربار میں حاضری کے لیے خود کو تیار بھی کرنا ہے۔“

”میں سمجھ نہیں سکا۔ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“ اسد الدین کے ذہن میں شبہ کی ایک کی دھمک پیدا ہوئی۔

”میں امیر موصل کا مجرم ہوں سردار۔“ انز کا لہجہ بالکل صاف تھا۔ ”شاہوں کے دربار جس طرح مجرم پیش ہوتے ہیں اسی طرح میں بھی اپنے بادشاہ کے حضور پیش ہوں

میں اب بھی نہیں سمجھا وزیر اعظم۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“ اسد الدین الجھنے لگا تھا۔ ”آزاد کرم آپ میرے دونوں ہاتھ میری پشت پر میری دستار سے باندھ دیجئے اور



تکوار میرے گلے میں لٹکا دیجئے۔ جتنی مجرم اسی انداز میں پیش کیے جا رہے ہیں۔  
اسد الدین کے ذہن میں سر اٹھانے والے شبہ نے دم توڑ دیا۔ اس کی فکر  
معین الدین انز کی عظمت دو چند ہو گئی۔ ”وزیر اعظم۔ میں یہ گستاخی نہیں کر رہا  
اپنے امیر کو کیا منہ دکھاؤں گا؟“

”میں نے آپ سے درخواست کی ہے۔ امیر آپ کو کوئی الزام نہیں دینے  
نے جیسے ضد کی۔ ”اگر آپ میرے ہاتھ نہیں باندھ سکتے تو دربار میں جا کر امیر  
کے کچے کہ ان کا مجرم معافی طلب کرنے کے لیے حاضر ہو رہا ہے۔ میں یہ کام فوراً  
کا۔“

”وزیر اعظم۔ آپ مجھ پر اعتماد کیجئے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ امیر آپ سے  
پرس نہ کریں گے۔ وہ آپ کو اپنے سامنے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ انہوں نے  
تو معاف کیا ہے۔ آپ کو وہ کیوں معاف نہ کریں گے۔“ اسد الدین نے انز کو سمجھا  
قاتل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔

”سردار آپ نہیں جانتے میں امیر کا کتنا بڑا مجرم ہوں۔“ انز نے دکھ بھری آ  
کہا۔ ”قططنیہ کے شہنشاہ جان کامنی نس نے جب مسلمان علاقوں کو پال کر شہر  
امیر انہیں سزا دینے کے لیے آگے بڑھے تو بجائے اس کے کہ میں مسلم علاقوں  
رکھنے کے لیے امیر موصل کا ساتھ دیتا۔ میں نے عیسائیوں کا ساتھ دیا اور اپنا لشکر  
ان کے مقابلے پر کھڑا ہوا۔“

اسد الدین مسکرایا۔ ”وزیر اعظم۔ میں ان تمام باتوں سے واقف ہوں مگر آپ  
موجودہ رویے سے ان تمام باتوں کا تدارک کر دیا۔“

معین الدین انز کی ضد سے مجبور ہو کر اسد الدین نے اس کے ہاتھ پٹ  
دیے اور تکوار گلے میں لٹکا دی۔ دونوں نے اپنے گھوڑے وہیں چھوڑ دیے اور پنا  
زنگی کے سامنے پیش ہوئے۔ امیر زنگی اپنے سرداروں کے ساتھ خیمے کے باہر بیٹھا  
نے بیٹی کو رخصت کر کے دمشق کی طرف بھیج دیا تھا مگر اس کا دل کسی طرح مطمئن  
رہا تھا۔ جس وقت اسد الدین نے دمشق کے وزیر اعظم کو پشت پر بندھے ہاتھوں اور  
لنگتی تکوار کے ساتھ امیر کے سامنے پیش کیا تو امیر زنگی گھبرا کر گھڑا ہو گیا۔

”اسد الدین تمہیں معین الدین کو گرفتار کرنے کی جرات کیسے ہوئی؟“ امیر زنگی  
اٹھا تھا۔ ”ہم نے اپنا اور اپنی پیاری بیٹی کا رشتہ کر کے دمشق کی طرف دوستی کا  
تھا لیکن تم نے اس ہاتھ کو کاٹ دیا۔ معین الدین ہمارا کتنا ہی بڑا دشمن سہی لیکن

تم کے بغیر اس کی یہ حالت کیوں بنائی؟“

اسد الدین کے بجائے معین الدین انز نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ ”اے موصل کے  
اور مجھ جیسے گناہ گار کے آقا۔ میری اس حالت سے سردار اسد الدین کا کوئی تعلق  
ہے۔ یہ تو مجھے بڑے عزت و احترام سے آپ کے دربار میں پیش کرنا چاہتے تھے لیکن  
پاک مجرم تھا اور مجرموں کو خواہ وہ کسی مرتبے کے کیوں نہ ہوں اسی ہیئت سے شاہی  
میں لایا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے سردار اسد الدین کی خوشامد کر کے اپنی یہ صورت

ابیر زنگی کے چہرے پر ابھرتی ہوئی لکیریں سمٹ کر غائب ہو گئیں۔ ”مگر ہم نے ایسی  
کبھی نہیں کی۔ ہم تو یہ بھی بھول چکے ہیں کہ ماضی میں تم نے موصل اور موصل  
کے ساتھ کیا سلوک ہے۔ نئے حالات میں ہم اس بات کی صرف خواہش کرتے ہیں  
مل اور حاکم موصل کی پرانی دشمنی ختم کر دو اس میں ہم لوگوں کا فائدہ ہے۔“ پھر  
ایک دم رک کر اسد الدین کو دیکھا۔ ”اسد الدین اب تو وزیر اعظم کے گلے سے  
طوق اتار دو۔ ہاتھ دشمن کے بھی نہیں باندھے جاسکتے۔ اگر سامنے والا بے دست و  
انسانی شجاعت رو پڑتی ہے۔ ان کے ہاتھ بھی فوراً کھول دو۔“

اسد الدین نے فوراً معین انز کو اس کی خود ساختہ قید اور حراست سے آزاد کر دیا۔  
”آقاے محترم۔“ معین الدین انز نے لجاجت اختیار کی۔ ”دشمن کی یہ کس قدر بد  
ہ کہ آپ دمشق سے اس قدر قریب ہوتے ہوئے بھی دمشق والوں کو اپنے دیدار  
دم رکھ رہے ہیں؟“

دمشق تو ہمارا دل ہے انز۔“ امیر نے بھرپور انداز میں کہا۔ ”مگر کیا کیا جائے۔ ملکہ  
نہیں دمشق میں دیکھنا پسند نہیں کرتیں ورنہ ہماری بھی یہی خواہش تھی کہ ہم خود  
کا جلوں محل سرائے شاہی تک پہنچاتے۔“

آقا ملکہ محترمہ نے جو کچھ کہا یہ ان کی دور اندیشی تھی۔“ معین الدین انز نے ملکہ  
کی حالت کی۔ ”حقہ کے موقع پر میں دمشق میں موجود نہ تھا۔ وہ بھی میری طرف  
راہ میں مبتلا تھیں اس لیے۔۔۔۔۔ آپ کا دمشق میں قدم رنجہ فرمانا انہیں مناسب نہ  
تھا لیکن حالات یکسر تبدیل ہو چکے ہیں۔ ملکہ عالیہ میرے ہمراہ آپ کے پاس آنے  
تیار تھیں انہوں نے اعلان بھی فرمایا تھا۔“ انز جان بوجھ کر رک گیا۔

امیر زنگی نے بڑے اشتیاق سے انز کو دیکھا۔ انز نے اس کے لطیف جذبے کو ابھارا  
اسے خوش ہو کر کہا۔ ”انز تم نے اچھا کیا کہ زمرہ خانم کو ساتھ لے آئے۔“ پھر

امیر زنگی کھڑا ہو گیا۔ ”اسد الدین تم نے بھی نہیں بتایا کہ ملکہ تمہارے ساتھ انہیں کس جگہ روک کے آئے ہو۔ ہم ان کا پر تپاک استقبال کریں گے۔“

اسد الدین نے جواب دینا چاہا مگر معین الدین انز نے امیر زنگی کو اپنی طرف لیا۔ ”آقائے عالی مقام۔ ملکہ محترمہ بالکل آمادہ تھیں لیکن شاہ مجید الدین آج رات محبت کا واسطہ دے کر ان کے قدم روک دیے۔“

امیر زنگی افسردہ سا ہو گیا۔ ”خیر کوئی بات نہیں انز۔ شاہ نے ضرور خدا و مرد خانم نے اپنی متا سے مجبور ہو کر اپنا فیصلہ بدل دیا ہو گا۔“

”بالکل ایسا ہی ہوا ہے آقا۔“ معین الدین نے اس کی تعریف کی۔ ”غلام انہیں آپ کے پاس لے کر ضرور آئے گا۔ آپ سے معافی طلب کرنے سے ملاقات کرنے کا مقصد یہ بھی تھا کہ آپ ملکہ کو آنے کی اجازت دیں۔“

آج جو انہیں بیٹے اور شوہر کی محبت میں ایک حد فاصل رکھنا چاہیے جذبے ایک دوسرے سے نہ ٹکرائیں۔“ پھر ایک لمحہ رک کے بولا۔

”آقائے محترم تو پھر کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے ملکہ کو یہاں آنے کی دی ہے؟“ معین الدین انز نے پہلی ہی ملاقات میں امیر زنگی کے دل میں بیٹے کی۔ اس نے انز نے یہ کہہ کر اپنا سر جھکا لیا تاکہ وہ امیر زنگی کے حضور گستاخانہ نہ ہو۔

امیر زنگی نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ انز کے متعلق اسے وہی باتیں ہی ملتی جن کا ذکر معین الدین انز نے خود اپنی زبان سے کیا تھا۔ امیر نے فوراً اسد الدین دیکھا جیسے وہ اس کا مشورہ طلب کر رہا ہو۔ اسد الدین نے بھی اسے اشاروں میں

امیر نے اپنے الفاظ تو لے اور کہا۔ ”انز تم جانتے ہو کہ ہماری سب سے یہی ہے کہ ملکہ زمرہ خانم ہمارے پاس آئیں ہمارے ساتھ قیام کریں اور فراست کی روشنی سے موصل کے شاہی محلات کو منور کریں مگر اس سلسلے میں جلدی بھی نہیں۔ تم آج یہاں پہنچے ہو۔ سفر کی تکان دور کرنے کے لیے بھی دن آرام کرنا۔“

”امیر محترم۔“ معین الدین انز نے بڑے اکنسار سے کہا۔ ”غلام ایک ہے۔ میں کام پر آرام کو ترجیح نہیں دیتا۔ یہ تو صرف ایک منزل کا سفر ہے اگر لیے مجھے سات منزلوں تک مسلسل سفر کرنا پڑے تو اس سفر کو میں عین

ہیں جس کے انتظام کے لیے انہیں کچھ وقت درکار ہو گا۔

دن کا یہ قیام معین الدین کے لئے ایک بار سائین گیا اس کی بے چینی ہر وقت بڑھتی ہی تھی۔ ادھر اسد الدین اور امیر زنگی اب تک اس بات پر متفق نہیں ہو سکے تھے کہ با شاطر۔ خطرناک بلکہ خوفناک دشمن اتنی آسانی سے ان کا دوست بن سکتا ہے۔ شاہی جاسوسوں اور جاسوسوں نے کوئی ایسی خبر نہیں دی تھی جس سے معین الدین کی بات سے غدار کی ذرا سی بھی بو آتی ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ دمشق کا وزیر اعظم ہر امیر زنگی اور اسد الدین کی محبت اور خلوص کے گن گاتا رہتا ہے اور زنگی شہزادی اور یو خانم کے کے عقد سے بہت خوش ہے۔

دن کے انتظام پر معین الدین انز نے کہا ”آقائے محترم اگر مجھے یہاں مزید ٹھہرنے ادا کیا تو میں سمجھوں گا کہ امیر موصل کو میری نیت پر شبہ ہے میں اس سلسلے میں نہ عرض کروں گا کہ اگر امیر کو میری نیت پر ذرہ برابر بھی شبہ ہے تو فوری ضرورت

کے تحت مجھے فوراً قتل کرا دیا جائے۔

امیر موصل اس کے اس اظہار سے شرمندہ سا ہو گیا۔ ”معین الدین انزلی ہمیں تم پر ذرہ برابر بھی شبہ نہیں۔ دراصل ہم ملکہ کا شاہانہ استقبال کرنے کے لئے لیکن وہ اس دوران جگہ پر ممکن نہیں۔ تم جس وقت چاہو دمشق واپس جاؤ حفاظت کے لئے تم جس قدر سوار چاہو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو۔“

”میں آپ کا شکر گزار ہوں امیر محترم“ معین الدین نے جھک کر سلام کیا۔ ہے کہ میرا یہ سفر دو سلطنتوں کے ملاپ کے سلسلے کی ایک بڑی اہم اور نیک کڑی رکھتا ہے اور جس کام کی بنیاد نیکی پر رکھی گئی ہو اس کام میں اللہ تعالیٰ مدد کرتا۔ قدر تیز رفتاری سے دمشق جانا چاہتا ہوں آپ کے سوار شاید اس میں میرا ساما سکیں۔ اس لئے میں تمنا سفر کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔“

امیر موصل اور اسد الدین نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ دوسری صبح معین الدین خوشی تیار ہو کر امیر موصل کی خدمت میں حاضر ہوا امیر موصل اور اسد الدین گلے لگا کر رخصت کیا۔ معین الدین انزلی کے لئے گھوڑا پہلے ہی سے تیار کر دیا گئے رخصتی سلام کیا اور پھر اس کا گھوڑا دمشق کی طرف اڑنے لگا۔

اسی شام جب معین الدین انزلی کو امیر موصل کی خیمہ گاہ سے رخصت ہوئے بھی نہ گزرے تھے کہ ایک تیز رفتار سوار امیر موصل کی خیمہ گاہ میں داخل ہو چھٹکن سے چور تھا اس کے ساتھ امیر کے لشکر کے چار محافظ بھی تھے جو اسے اسد الدین تک پہنچے تھے انہوں نے اسد الدین کو بتایا کہ سوار دمشق سے دن رات ہوا یہاں تک پہنچا ہے اور امیر موصل سے فوراً ملنا چاہتا ہے۔ ایک سوار نے سے یہ سرگوشی بھی کی۔

”سردار دمشق سے آنے والا یہ سوار مرد نہیں بلکہ ایک عورت ہے۔ اس کے وہ ملکہ زمرہ خانم کی خاص کنیز ہے اور ان کا ایک اہم پیغام امیر موصل کو پہنچا ہے۔“

## بہار اور خزاں

اس پر آشوب دور میں دمشق سے کسی قاصد کا آنا ہی کیا کم اہم ہو سکتا تھا کہ اس پر بات کہ قاصد مرد کی بجائے ایک عورت ہے جو مسلسل گھوڑا بھگاتی یہاں تک پہنچی اس سے معاملے کی یقینی دو چند ہو گئی تھی۔ اسد الدین نے لمحوں کے اندر قاصد کے میں سوچا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ آنے والی ملکہ مادر کی منہ چڑھی کنیز لقا کے سوا اور نہیں ہو سکتی۔ اس دوران میں وہ خیمے کے باہر پہنچ چکا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اس کے سامنے کھڑی تھی۔ لقا نے نقاب الٹ دیا تھا اور اس قدر مضطرب ہو رہی تھی کہ اس نے اسے ایک سپاہی کے کانڈھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ خدا خیر

اسد الدین کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔

”لقا! تم... خیریت؟“ اسد الدین نے بڑھ کر اسے سنبھالا۔

”سردار! مجھے امیر کے پاس لے چلو۔“ لقا نے جیسے غنودگی میں کہا۔

اسد الدین نے اس سے کوئی اور سوال نہیں کیا۔ سپاہی کی مدد سے وہ لقا کو امیر کے خیمے تک لے گیا۔ امیر موصل کو اس کے غلاموں نے اطلاع دے دی تھی کہ مدد دمشق سے آیا ہے اور سردار اسد الدین اسے لے کر ادھر ہی آ رہا ہے۔ یہ سنتے برا کر کھڑا ہو گیا اور بے چینی کے عالم میں خیمے کے اندر ٹہلنے لگا تھا۔ امیر موصل اور بہادر جس پر میدان جنگ میں بھی کبھی خوف طاری نہ ہوا تھا۔ وہ اس وقت علوم خوف سے پریشان ہو گیا تھا۔ معین الدین انزلی کو دمشق گئے ہوئے صرف بارہ

ہم ہے وعدہ لا شریک کی۔ میں قاتلوں کو چن چن کر ماروں گا۔ میری تلوار سے کوئی بچے گا۔ معین الدین تو نے مجھ سے غداری کی ہے۔ میرے اعتماد کو دھوکا دیا ہے میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔“

امیر کے سرداروں سے بھر گیا تھا۔ امیر دمشق کی طرف منہ کر کے یوں بول رہا تھا کہ ”میں الدین انزاس کے سامنے ہی کھڑا ہوں۔“ ”او منافق! میں نے تجھے معاف کر دیا ہے مگر تو نے غداری کی تو نے زمرہ خانم کو نہیں، موصل کی ملکہ کو قتل کیا ہے۔ تیری اپنی میرٹھانک ہو گی۔“

اسد الدین بھی سخت بدحواس تھا۔ لقا اگرچہ بے ہوشی کے عالم میں بولی تھی مگر اس نے اس میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ لقا نے اس منظر کو آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جب دشمنوں نے اس پر حملہ کیا۔ اس نے ملکہ کی جان کی آگے تھی لیکن یہ قتل معین الدین نے کرایا۔ یہ بات اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ دمشق سے اس خیمہ گاہ سے ایک منزل دور تھی پھر وہاں سے دمشق کا فاصلہ معین الدین کا ذرا جلد دمشق پہنچ کر ملکہ کو قتل کرانا... کچھ درست معلوم نہ ہوتا تھا۔

لقا کی آنکھیں کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئیں۔ اس کی آنکھیں بھی بند ہو چکی تھیں۔ حکیم نے پھر نبض دیکھی۔ ”خاتون پر دوبارہ بے ہوشی طاری ہو گئی ہے۔“

امیر موصل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اسد الدین نے آہستہ سے کہا۔ ”امیر محترم! یہ کام لیجئے۔ لقا نے بے ہوشی کے عالم میں ناتمام جملے کئے ہیں۔“

”تم بھولی تسلیاں دے کر ہمیں بھلانا چاہتے ہو؟“ امیر کو جلال آگیا۔ ”ہم دمشق کے صورت شہر کو تباہ نہیں کرنا چاہتے تھے مگر انزاس نے ہمارے منہ پر تھوکا ہے، ہمارے دل کا راز ہے، خدا کی قسم۔۔۔!“

اسی وقت لقا کے جسم کو حرکت ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ امیر موصل اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لقا نے آنکھیں جھپکا کر امیر کو دیکھا۔

”کیا میں امیر موصل کے سامنے ہوں؟“ لقا کی آواز بہت نحیف تھی۔

”ہاں! لقا! امیر تمہارے سامنے ہیں۔ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ اسد الدین اس پر

”مجھے اٹھائے سردار!“ لقا نے اٹھنے کی کوشش کی۔ ”میں امیر کو تعظیم پیش کر

نہم نے لقا کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”بیٹی! اپنے حواس درست کر لو۔ تعظیم کو بڑا

گھٹنے ہوئے تھے۔ وہ ابھی دمشق پہنچا بھی نہ ہو گا پھر یہ کون آیا ہے کیا اہم پیغام ہوا؟ کیا اس کی شنوائی... یا ملکہ زمرہ خانم... نہیں، نہیں، امیر موصل دوسو سال کے جبار رہا تھا کہ اسد الدین قاصد کو لئے خیمے میں داخل ہوا۔

”امیر محترم! یہ ملکہ زمرہ خانم کی کنیز خاص لقا ہے اور آپ کے لئے ملکہ کا پیغام ہے۔“

لقا نے نیم غشی کی حالت میں آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ امیر موصل کی طرف محسوس کرتے ہوئے اس نے اسد الدین اور سپاہی کے سارے سے خود کو آزاد کیا۔ کو سلام کرنے کے لئے ہاتھ اٹھایا مگر خود کو نہ سنبھال سکی اور چکرا کر فرش پر گر گئی۔

نے پریشان نظروں سے اسد الدین کو دیکھا۔

”اسد الدین جلدی کرو۔ کسی کو بلاؤ۔ اس کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔“

اسد الدین فوراً باہر کی طرف بھاگا۔ امیر موصل کو کچھ اور نہ سوجھا تو وہ لقا کے بیٹھ گیا اور بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اسد الدین صاحب کو لے کر آیا۔ دور شاہی میں حکیم، ندیم، شاعر اور منجم شاہی دربار کے رکن جاتے تھے۔ یہ لوگ سفر اور حضر میں بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے۔ امیر موصل اگرچہ بادشاہ نہ تھا لیکن سلجوق خاندان کی بربادی کے بعد مسلمانوں کی سب سے بڑی

موصل ہی سمجھی جاتی تھی۔ عیسائی دنیا اگر کسی سے گھبراتی تھی تو وہ امیر موصل کا رنگ ہی تھا۔

شاہی حکیم نے نبض دیکھنے کے بعد بتایا۔ ”فکر کی بات نہیں امیر محترم! کھڑے طویل سفر نے خاتون کے اعضاء مضطرب کر دیے ہیں۔ کچھ دیر بعد ہوش آجائے گا۔“

اسد الدین نے حکیم کو لقا کے سفر کے بارے میں بتا دیا تھا۔ وہ اپنے ماں شہرت لے کر آئے تھے۔ لقا کے دانت بچنے ہوئے تھے۔ دو چچے شہرت لقا کے بچے کر حلق میں ڈالا گیا۔ لقا نے جھرجھری لے کر آنکھیں کھول دیں اور گھبرا کر نظریں

پھر اس نے اک دم چیخ ماری۔

”نہیں، نہیں... ملکہ کو نہ مارو... مجھے مار ڈالو... خدا کے لئے رحم کرو۔“

ساتھ ہی وہ دہائیں مار کر رونے لگی اور اس کی آنکھیں پھر آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں۔ لقا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نشتر بن کر امیر موصل کے سینے میں اتر گئے۔

زمرہ خانم کو دشمنوں نے قتل کر دیا۔ غم اور غصے سے امیر پاگل ہو گیا۔ وہ فرش سے تلوار پر ہاتھ رکھ کر گر جا۔

وقت پڑا ہے۔

”میں ٹھیک ہوں۔ بس چکر آگیا تھا اور لقا، اسد الدین کے سارے سے اگنی۔

امیر زنگی نے اپنے بستر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسد الدین، لڑکی کو وہاں لقا اپنے حواسوں پر قابو پا چکی تھی۔ وہ اسد الدین کا سہارا لے کر کھڑی ہو نے بڑے ادب سے امیر زنگی کو تعظیم پیش کی۔ اس کے ساتھ اس کی آنکھیں! ”امیر محترم!“ لقا نے بھرائی آواز میں کہا۔ ”میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے“ منجوس پیغام آپ تک پہنچانے پر مجبور ہوں جو میری مہربان ملکہ زمرہ خانم نے کہ بھیجا ہے۔“

”زمرہ خانم نے!“ امیر نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے لقا کو دیکھا۔ ”کیا ملکہ زندہ خدا انہیں عمر خضر عطا کرے۔“ لقا نے بڑے خلوص سے کہا۔ ”میری ملکہ بتید حیات تھیں اور اس ذات پاک سے امید ہے کہ وہ اپنے غمزہ دل کے ہوں گی۔“

”لقا! تم نے کچھ دیر پہلے ملکہ زمرہ خانم پر قاتلانہ حملے کا ذکر کیا تھا۔“ ”سردار!“ لقا نے اسد الدین کی بات کاٹ دی۔ ”آپ کیا فرما رہے ہیں؟“ ہوش آیا ہے۔“

”تم بستر پر لیٹ کر بات کرو۔“ امیر موصل نے بڑی شفقت سے کہا۔ ”زمرہ زندہ بچ جانے کی خبر سے اس کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔“ لقا کو امیر کے اصرار پر قالین کے بستر پر لٹا دیا گیا اور سر کے نیچے سامان رکھ دیا۔

اسد الدین نے لقا کو پرسکون دیکھا تو کہا۔ ”ہاں لقا! اب اطمینان سے سناؤ۔ پیغام بھیجا ہے اور دمشق پر کیا گزری ہے یا گزرنے والی ہے؟“

لقا نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ امیر نے ان نظروں کا مطلب سمجھنے سے کہا۔ ”طیب اعظم! اگر ضرورت پڑی تو آپ کو پھر طلب کر لیا جائے گا۔“

امیر کا اشارہ دوسرے لوگوں کی سمجھ میں بھی آگیا اور حکیم کے پیچھے چلے گئے۔ اسد الدین جانے لگا تو لقا نے اسے روکا۔ ”آپ ٹھہر جائیے سردار۔“

”اے امیر محترم! اگر غم زیادہ ہو تو لوگ سمجھتے ہیں، کیلجے کے ٹکڑے ہوئے میں نے کیلجے کے ٹکڑے ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔“

نظریں جماتے ہوئے اس طرح کہنا شروع کیا، جیسے وہ خواب میں بول رہی ہو۔ ”اللہ اللہ! کس قدر خوش خوش ہم نے شای محل میں تین دن گزارے تھے۔ زنگی نے دنیا جہاں کی سرمتیں اپنے دامن میں بھر کر حرم سرائے شای میں داخل ہوئی تھیں۔ طرفہ قبوں اور مسکراہٹوں نے ڈیرے بجا رکھے تھے۔ شای خزانے کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ مدقات، خیرات سے مساکین اپنی... جھولیاں بھر رہے تھے اور دمشق کے شاہ اور لہ کو دھانیں دے رہے تھے۔ چوتھی صبح ہمارے لئے قیامت بن کر آئی۔“ اور اس کے بعد ہی لقا کی آنکھیں برسنے لگیں۔ وہ اس قدر روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

امیر موصل اور اسد الدین دم بخود بیٹھے تھے۔ اسد الدین نے کئی بار چاہا کہ لقا کو چپ رائے ٹکر ہر بار امیر موصل نے اسے اشارے سے روک دیا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ لقا کا باوجود آنسوؤں کے ذریعے بہہ جائے اور پھر وہ صحیح طور پر حالات بیان کر سکے۔ لقا کا جو رونے سے واقف ہوا ہو گیا۔ اس نے رونے کے بعد اپنی آنکھیں خشک کیں اور امیر کی طرف بڑی حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔

”امیر محترم!“ لقا کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی۔ ”میں آپ کو کیا بتاؤں اور کیسے بتاؤں! رات دیر تک ملکہ خانم کے ساتھ محل کے جشن میں شریک رہی تھی اور اس قدر تھک گئی تھی کہ جب واپس آ کر اپنے کمرے میں بستر پر لیٹی تو صبح تک کچھ ہوش نہ رہا پھر جب دوش آیا تو شای محل کا نقشہ بدل چکا تھا۔ میں اور ملکہ ان دنوں شاہ کے محل میں رہتے تھے۔ شہر کی آواز سن کر میں باہر آئی تو میں نے دیکھا کہ دمشق کا تاجدار خون میں لتھڑا لاش محل خانے کے باہر پڑا ہے۔ خالوں نے اسے غسل کے دوران ہی قتل کر دیا تھا اور لاش باہر کھینچ لائے تھے۔ اے امیر! آپ کی شنزادی کے ہاتھوں کی ہمدی نے ابھی تک بھی نہ بدلا تھا کہ ان کی قسمت بدل گئی۔ وہ شاہ کے سرہانے کھڑی بین کر رہی تھیں اور ملکہ مادر زمرہ خانم جوان بیٹے کا غم دل میں دبائے قاتلوں کے سامنے سینہ سپر تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ ٹکوار تھی اور وہ چیخ چیخ کر شاہ کے قاتل کو دعوت مبارزت دے رہی تھیں۔ سامنے کی طرف وزیر اعظم ان کا نائب اپنے درجنوں سپاہیوں کے ساتھ محل کے اندر کھڑا تھا، جس وقت شنزادی بین کرتی یا ملکہ غصے اور غم سے چچنچن تو وہ قہقہے لگاتا اور اس کے قہقہے میں دوسروں کے قہقہے شامل ہو کر ایک بے ہنگم شور پیدا کرتے تھے۔“

لقا، آہیں اور سسکیاں بھر رہی تھی۔ اسد الدین نمناک آنکھوں سے لقا کو دیکھ رہا تھا اور امیر تو یوں گم م کھڑا تھا، جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ شدت غم سے اس کی آنکھوں کے انگوٹھی خشک ہو گئے تھے۔ ایک طرف ہفتہ بھر کی بیای ہوئی بیٹی کی بیوگی کا غم دوسری

طرف ملکہ زمرہ خانم کے بے حرمتی اور بے بسی کا صدمہ۔ دونوں غموں کے درمیان بہت جا رہا تھا۔

”لہذا! اب کچھ پوچھنے کا یارا نہیں رہا۔ اسد الدین کا لہجہ کرناک ہو گیا۔“ پھر بھی تم قاتلوں کے بارے میں کچھ اور بتا سکو تو مرہانی ہو گی۔“

”سردار۔“ لہذا نے اپنا غم ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”کہنے کو تو بہت کچھ ہے مگر نہ وقت ہے اور نہ موقع۔ ملکہ نے امیر موصل سے درخواست کی ہے کہ وہ فوراً موصل طرف کوچ کریں کیونکہ شاہ یروٹلم اور شاہ انطاکیہ کے لشکر انہیں گھیرنے کے لئے ہر طرف روانہ ہو چکے ہیں۔ ملکہ نے اطمینان دلایا ہے کہ امیر زنگی، شہزادی اور خود ملکہ طرف سے فکر مند نہ ہوں۔۔۔۔۔ کیونکہ دمشق کے دو قبیلوں نے ان کی جان اور ناموس ذمے داری اٹھالی ہے۔ شاہ کو معین الدین انز کے نائب نے شاہی لشکر کی مدد سے قتل ہے۔ قتل کا اصل محرک وزیر اعظم معین الدین انز ہے جو اپنے آپ کو بدنامی سے بھر کے لئے آپ کے پاس آیا ہوا ہے۔“

یروٹلم اور انطاکیہ کے متحدہ لشکروں کی آمد کی اطلاع بڑی حیرت ناک بلکہ خوفناک تھی۔ امیر کے پاس صرف دو ہزار سوار تھے اور ان سے دو لشکروں کا مقابلہ کرنا سخت ناممکن اور بے وقوفی تھی۔ ملکہ نے شاید اسی وجہ سے امیر کو موصل جانے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے اسی وقت سواروں کو واپسی کا حکم دے دیا اور خیمے اکھڑنے لگے۔

”تمہارا کیا ارادہ ہے لہذا؟ تم کہاں رہنا پسند کرو گی؟“ اسد الدین نے پوچھا۔  
”میں دمشق واپس جاؤں گی سردار!“ لہذا نے جواب دیا۔ ”مجھے ملکہ مادر سے جرات محبت۔ اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں ان سے الگ نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے مجھے جلد سے جلد واپس آنے کا حکم دیا ہے۔“

”ٹھیک ہے لہذا۔۔۔ تمہارا واپس جانا ہی بہتر ہے۔“ اسد الدین نے تائید کی۔ ”ہاں! بات اور بتاؤ۔ سردار سرم بھی تو تمہارے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس غریب پر کیا قاتلوں کے ہاتھ سے بچا۔۔۔ یا خدا نخواستہ اسے بھی۔۔۔“

”سردار سرم کو خدا نے بچا لیا۔“ لہذا چچ میں ہی بول پڑی۔ ”ایک دن پہلے اطلاع ملی کہ حلب سے ایک خاتون اس کی تلاش میں دمشق پہنچی ہے اور اسے فریب کر انز کے نائب نے گرفتار کر لیا ہے۔ سردار سرم اس خبر سے اس قدر پریشان ہوئے کہ ہم لوگوں کے روکنے کے باوجود وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے پھر دوسری قیامت ٹوٹ پڑی۔ سب کا یہی خیال تھا کہ انہیں بھی قتل کر دیا گیا ہو گا لیکن قہر شاہی

ہمیں ان کی لاش موجود نہ تھی۔“

”خدا کا شکر ہے۔“ اسد الدین نے رقت سے کہا۔ ”حلب سے آنے والی خاتون انطاکیہ کی شہزادی جینالو کے اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ شہزادی کو اس رفتار پر کیا گیا ہو گا کہ اسے شاہ انطاکیہ کے حضور پیش کر کے دمشق والے شاہ کی بی حاصل کر سکیں۔“

”سردار سرم نے بھی شہزادی ہی کا نام لیا تھا۔“ لہذا غصہ کے باوجود واپس جانے کے ارادہ رہی تھی۔ ”اگر سردار سرم شہر میں پوشیدہ ہیں تو وہ ہم لوگوں سے ضرور رابطہ میں ہے۔“

”ہاں! جنہیں معلوم نہیں کہ معین الدین انز آج ہی دمشق واپس گیا ہے۔“ اسد نے لہذا کو یہاں کے حالات سے آگاہ کیا۔ ”انز جتنے دن یہاں رہا اس نے یہی کوشش تو زمرہ خانم کو امیر موصل کے پاس لایا جائے یا امیر موصل کے لطیف جذبات کو ہوا رائیں دمشق لے جایا جائے۔ انز اب دمشق پہنچنے والا ہو گا۔ وہاں پہنچتے ہی وہ سخت انتظامات کرے گا۔ محلات کے گرد بھی پہرہ سخت کر دے گا۔ اس صورت میں اگر ہم لوگوں سے ملنے کی کوشش کی تو اس کا زندہ بچنا مشکل ہو گا۔“

”ہم لوگ اس وقت شاہی محل میں نہیں ہیں سردار۔“ لہذا نے جو اب تیار ہو چکی جواب دیا۔ ”دمشق کے قبیلے زناطہ اور احدات نے ملکہ اور شہزادی کو قتل ہونے سے فائدہ اٹھانے کے نائب سے ہم لوگوں کو یہ کہہ کر حاصل کر لیا کہ ہم سب کو مہیج دیا جائے گا۔ دوسرے دن ان دوست قبائل کے سرداروں نے شہر میں یہ مشہور کیا کہ شہزادی اور ملکہ کو موصل روانہ کر دیا گیا ہے۔ سرداروں کا خیال تھا کہ معین انز کے واپس آتے ہی پھر جھگڑا کھڑا ہو سکتا ہے۔ اس لئے انہوں نے یہ تدبیر کی۔ ہم لوگ اس وقت دمشق کے ایک گاؤں میں انتہائی محفوظ جگہ پوشیدہ ہیں اور جب حالات درست نہیں ہوتے وہیں رہیں گے۔ آپ امیر موصل کو بھی اطمینان دلا دیجئے۔ لہذا شہزادی اور ملکہ زمرہ خانم بالکل محفوظ ہاتھوں میں ہیں اور وہ کسی وقت بھی موصل میں نہیں آئیں۔“

☆☆☆☆☆

امیر موصل بڑی افرا تفری کے عالم میں موصل واپس ہوا۔ اس نے اپنے دو ہزار لشکر و سواروں کی قیادت میں تقسیم کر کے مختلف راستوں سے موصل کی طرف روانہ کیا۔ امیر

ارک۔ اب اس نے یہ منصوبہ بنایا کہ کسی طرح اپنے مخالف تمام مہروں کو ایک جگہ اکٹھا کرے اور سب کا ایک ساتھ ہی صفایا کر دیا جائے لیکن انسان قدرت کے سامنے مایا جانے والا ہوا ہمیشہ درست ثابت نہیں ہوتا۔

اس کا سوچا ہوا ہمیشہ درست ثابت نہیں ہوتا۔ معین الدین انزلی نے پہلے ہی دن شاہ یروٹلم اور شاہ انطاکیہ کو دمشق کے حالات سے آگاہ کر دیا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے لشکروں کو لے کر فوراً "دمشق پہنچ کر رہیں"۔ اس بات کا امکان موجود تھا کہ امیر زنگی اپنی ملکہ یعنی زمرہ خانم کو رخصت کر دے اور دمشق آئے گا لیکن بیچ یہ پڑا کہ امیر زنگی دمشق آیا ضرور مگر سرحد سے ایک منزل فاصلہ پر روک دیا اور شہزادی کو رکن الدین کے ساتھ دمشق کی طرف روانہ کر دیا۔ معین الدین نے بھی اپنی حکمت عملی تبدیل کر دی۔ یروٹلم اور انطاکیہ کے لشکر دمشق کی طرف آئے تھے۔ معین الدین نے انہیں اطلاع دی کہ لشکر دمشق آنے کی بجائے دمشق کی طرف پہنچے جہاں امیر زنگی مقیم ہے۔ چونکہ امیر زنگی کے ساتھ صرف دو ہزار سوار تھے اس لیے اسے گھیر کر آسانی سے ختم کیا جاسکتا تھا۔

لیکن اللہ کو ابھی امیر زنگی سے کچھ اور کام لینے تھے۔ یروٹلم اور انطاکیہ کے لشکر امیر زنگی کے بجائے خائف ہو کر اپنی اپنی جگہ رک گئے اور دمشق سے مزید ملک کا دفاع کرنے لگے۔ اس طرح امیر زنگی بغیر اپنے سواروں کی جان کا نقصان کئے ہوئے خیریت سے واپس چلے گئے اور معین الدین ہاتھ ملتا رہ گیا۔ شاہی محل میں شاہ دمشق مجیر الدین کے قتل کا جو واقعہ پیش آیا۔ اس کا حکم معین الدین انزلی نے دیا تھا۔ اس نے امیر زنگی کے پاس جانے سے پہلے اپنے نائب کو حکم دیا تھا کہ اگر وہ (انزلی) چار دن کے اندر نہ پہنچ سکے تو یہ سمجھا جائے کہ امیر زنگی نے اسے گرفتار کر لیا ہے اس لیے ملکہ زمرہ خانم مجیر الدین اور زنگی شہزادی کو نہ بچ کر دیا جائے۔

معین الدین انزلی کے نائب نے پانچویں شب اپنے آقا معین الدین انزلی کے حکم پر عمل کیا۔ اس نے نہایت خاموشی سے ملکہ اور شاہ کے ذاتی محافظوں کو یا تو گرفتار کر لیا یا انہیں مار دیا اور رات ہی میں اس کے آدمی شاہی محل میں داخل ہو کر شاہی حمام تک پہنچ گئے۔ اس طرح شاہ مجیر الدین غسل کے دوران قتل ہو گیا۔ ملکہ اور زنگی شہزادی کو ان کے محافظوں نے بچا لیا ورنہ ان کا انجام بھی ایسا ہی درد ناک ہوتا۔ سرم اپنی محبوبہ کی شہادت پر ایک دن پہلے ہی شاہی محل چھوڑ چکا تھا۔ اس لیے وہ بھی اس خونی ڈرامے سے بے باق تھا۔

امیر علاء الدین زنگی اپنے مستقر موصل پہنچا تو شعلہ بے تاب بنا ہوا تھا۔ دمشق کی

کی اس حکمت عملی سے بڑا فائدہ پہنچا۔ انطاکیہ اور یروٹلم کے لشکر شمال اور جنوب گھیرا ڈالے ہوئے امیر موصل کی خیمہ گاہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان لشکروں کا مارا صرف سو سو کی دو کھڑیوں سے ہوا۔ جنگ کیا ہوتی صرف تلواریں بلند ہوئیں اور امیر سوار گھوڑے موڑ کر بھاگ نکلے۔ شمال اور جنوب سے آنے والے دونوں لشکر خائف ہو ٹھہر گئے۔ انہیں خطرہ پیدا ہوا۔ کہ امیر موصل کا لشکر کیسے قریب ہی موجود ہے۔ معین الدین انزلی کی طرف سے انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ امیر موصل کے پاس صرف دو ہزار سوار ہیں مگر شاہ بالڈون نے اس پر یقین نہ کیا وہ امیر موصل کی دور اندیشی سے واقف نہ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ اگر اس نے آگے بڑھ کر امیر موصل کا راستہ روکا اور امیر کے پاس زیادہ لشکر ہوا تو وہ خود کیسے گھیرے میں نہ آجائے۔

بالڈون شاہ یروٹلم جہاں تک پہنچا تھا وہیں رک گیا۔ یہ ایک ویران سی جگہ تھی بالڈون نے لشکر کے لئے ایک نسبتاً اونچی جگہ منتخب کی۔ تاکہ اگر امیر موصل اس مقابلے پر آئے تو وہ مدافعتی جنگ لڑ سکے۔ دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ چند سوار شمال طرف روانہ کئے تاکہ انطاکیہ سے آنے والے لشکر سے رابطہ قائم ہو سکے اور یہ بھی مانا ہو سکے کہ دمشق سے کس وقت اور کتنی کمک پہنچنے کی امید ہے؟

دمشق کے مرد آہن معین الدین انزلی نے بہت سوچ بچار کے بعد ایک زبردست منصوبہ بنایا تھا۔ ملکہ زمرہ خانم اور شاہ مجیر الدین کی شادی اس کی عدم موجودگی میں ہوئی تھی سیاسی محاذ پر یہ معین الدین کی زبردست شکست تھی۔ اس کا اقتدار بظاہر ختم ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں فوراً آ گیا تھا کہ امیر موصل علاء الدین زنگی نے ان دونوں شادیوں کی آڑ میں دمشق پر قبضہ کر لیا ہے جسے وہ طاقت کے زور پر اب تک فتح نہ کر سکا تھا۔ اگر دمشق میں موجود ہوتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ شادیاں اس قدر آسانی سے نہ سکتیں۔ بہر حال تیر کمان سے نکل چکا تھا اور انزلی کو اپنی سادھ بچانے کے لئے دوبارہ چلنا پڑا تھا۔

دمشق پہنچ کر جب وہ حالات سے آگاہ ہوا تو اس کا دماغ گھوم گیا۔ عوام ان شادیوں پر جشن منا رہے تھے۔ لشکر میں بھی شاہ مجیر الدین اور ملکہ مادر کے ہمدرد موجود تھے۔ فوجی زناطہ اور احداث کے سوار ہمیشہ سے شاہ پرست رہے تھے۔ ان حالات میں ان شادیوں کو توڑنا خطرناک نتائج پیدا کر سکتا تھا۔ اس لیے معین الدین انزلی نے اپنا چولا بدل لیا اور شاہ اور شاہ کو بیش قیمت تحائف پیش کر کے خود کو تخت و تاج و دمشق کا وفادار ثابت کرنے کا کامیاب ہو گیا۔ امیر موصل کو اپنا نیا آقا کہہ کر اس نے ملکہ زمرہ خانم کے دل میں بھی



کہ ہمارے دل سے بھی وہی صدا اٹھتی ہے جس کی دھمک سے میرا سینہ درد سے بھر گیا ہے۔ میں نے سنا اور جو تم نے کہا وہ میں نے تسلیم کیا۔ اس کو کچھ کا حکم دو۔ میں انز سے خوفناک انتقام لوں گا۔ ایسا انتقام جسے اس کی نسلیں یاد بھی کیں گی۔

اسد الدین کو معلوم تھا کہ یہ دھم اور انتقام کے لشکر ناکام ہو کر دمشق پہنچ چکے ہوں۔ معین الدین انز نے اپنی حفاظت کے لئے دمشق میں عیسائیوں کے بہت سے فوجی بٹے پہلے ہی رکھ چھوڑے تھے۔ اب دو لشکروں کی مزید کمک سے دمشق ایک ایسا سنگین مارن چکا ہو گا جس سے سر ٹکرانے سے کچھ حاصل نہ ہو گا مگر امیر زنگی کا جوش غضب انہماک پہنچ چکا تھا جسے واپس لانا ناممکن تھا۔ اس لئے اس نے اسی میں بہتری خیال کی۔ خاموش رہے اور امیر کے حکم کی تعمیل کرے۔ موصول والوں کو معین الدین انز کی تازہ پہ کاری کا علم ہو چکا تھا اور وہ بھی انز کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کی قسمیں کھا رہے تھے۔ انہوں نے جس خوشی سے زنگی شہزادی کو دمشق کے لئے رخصت کیا تھا اب وہ اس کے زیادہ دل گرفتہ اور مغموم تھے۔

اور تھا، امیر زنگی سے رخصت ہو کر پہلے ہی دمشق پہنچ چکی تھی۔ دن کے وقت دمشق کے اندر داخل ہونا مناسب نہ تھا۔ اس لئے لقا نے ایک دیرانے میں رات کا انتظار کیا۔ وہ دن اور پیاس سے نڈھال ہو رہی تھی۔ اس کی پناہ گاہ قلعہ دمشق سے چھ میل شمال میں تھی۔ رات کو جب لقا وہاں پہنچی تو ملکہ زمرہ خانم اور زنگی شہزادی کے مرجھائے ہوئے بال پر رونق آگئی۔ ملکہ نے لقا کو گلے لگا کر اسے فرط شفقت سے پیار کر لیا۔

”قادر لقا! تم نے میری خاطر جو پریشانی اٹھائی ہے۔ اسے میں عمر بھر نہیں بھول لوں گی۔“ ملکہ کے جذبات اس کے سینے سے نکلے پڑتے تھے۔

”ملکہ! کینہ کی زندگی کا مقصد اپنے آقا کے حکم پر قربان ہو جانا ہے۔“ لقا نے ابا خدا کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے جس مقصد کے لئے بھیجا تھا میں اس میں کامیاب رہا۔“

ملکہ اور زنگی شہزادی کے چہرے اور زیادہ چمک اٹھے۔ ”کیا ابا حضور خیریت سے ہیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کوئی پیغام دیا ہے انہوں نے مجھے؟“

زنگی شہزادی بہت کم گو تھی لیکن مصیبت نے اسے زبان دے دی تھی۔ اس نے ایک اہل میں سب کچھ پوچھ ڈالا۔ لقا کو نئی دہلی کی مصیبت پر بڑا پیار آیا۔ ”ملکہ! دمشق! بھلاں! مگر نہ کیجئے۔ امیر محترم! میرے سامنے موصول واپس ہو گئے تھے۔ دشمنوں کے

سرحد سے موصول تک اسے کوئی جنگ نہیں کرنی پڑی تھی۔ اس نے میدان جنگ نکلتے ہی نہ کھائی تھی۔ لیکن اس کا دل اس طرح دکھ رہا تھا۔ جیسے اس نے کسی کے ہاتھوں عبرتناک شکست اٹھائی ہے۔ وہ غصے میں اس طرح جل رہا تھا جیسے قریبی عزیز کو قتل کر دیا گیا ہو اور وہ انتقام لینے سے مجبور ہو۔ اسے زنگی شہزادی منکوحہ ملکہ زمرہ خانم کے بیچ جانے کی خبر بھی مل چکی تھی۔ وہ دمشق تک ضرور گیا اس کا ارادہ دمشق پر قبضہ کا نہ تھا مگر وہ اس طرح واپس آیا تھا جیسے معین الدین اسے ایک بار پھر شکست دے دی ہو۔ وہ کئی روز تک ماہی بے آب کی مانند تڑپا رہا اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ رات رات بھر ہنسل کر سو رہا کرتا تھا۔ کھانا چھوڑ دیا تھا اس کے سرداران فوج اس کی چڑھی ہوئی تیوریوں اور تمناؤں سے بے دیکھتے... مگر خاموش رہتے۔ انہیں امیر زنگی کے غم و غصے کا احساس تھا مگر کچھ کہتے تھے۔ وہ بڑے صبر و تحمل سے امیر زنگی کے اندر پکھنے والے لاوے کو دیکھ رہے۔ جانتے تھے کہ یہ لاوا ایک دن آتش فشاں بن کر پھٹے گا اور اسی دن موصول کی سیلاب کی طرح دمشق کی طرف بڑھیں گی... اور پھر معین الدین انز... اس کا انتہا کا یہ صرف خدا ہی جانتا تھا۔

اور پھر ایک دن یہ آتش فشاں پھٹ پڑا۔ ”اسد الدین جانتے ہو۔ میرے دل آواز اٹھ رہی ہے؟“ امیر زنگی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

”امیر محترم! مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا دل کیا کہہ رہا ہے مگر میرے دل سے بلند ہوئی ہے اسے اگر اجازت ہو تو بیان کروں؟“ اسد الدین نے سوال کا جواب سے دیا۔

”بیان کرو اسد الدین! میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے اور تمہارے دل کی تو کتنا فرق ہے؟“ اور امیر زنگی نے تنگی فرش پر اس زور سے ٹھوکر ماری جیسے اسے چاہتا ہو۔

”اے والئی موصول اور میرے محسن آقا!“ اسد الدین کا لہجہ بڑا پر جوش تھا۔ ”اسد الدین کے دل سے تو ہر وقت صرف ایک ہی آواز اٹھتی ہے اور وہ آواز ہے۔ انتقام... انتقام...“

امیر زنگی نے حیرت سے اسد الدین کو دیکھا۔ ”اے اسد الدین! اگر تم میرے منسلک نہ ہوتے اور میں تمہارے حالات سے واقف نہ ہوتا تو خدا کی قسم تمہارا جواب پر تمہیں ایک بڑا دلی سچہ کر تمہارے ہاتھ پر بیعت کر لیتا۔ یہ بھی کیا بجا

لیکھ کر اب تک ان کے پاس نہیں پہنچے ہیں۔“  
 ”میرے لئے اور شاہ کے لئے...“ کمن بیوہ کہتے کہتے آبدیدہ ہو گئی۔

لحقانے بڑی سمجھ داری سے جواب دیا۔ ”امیر محترم نے فرمایا تھا کہ شہزادی نے آج تک شاہی محل سے قدم نہیں نکالا مگر وہ بڑی باحوصلہ شہزادی ہے۔ انہوں نے ظاہر کی ہے کہ مصیبت کے یہ دن بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔“ پھر لقا نے زمرہ خانہ طرف دیکھا۔ ”امیر نے یہ بھی کہا ہے کہ ملکہ زمرہ خانم کو اپنی سگی ماں سے زیادہ کمرہ ان کے کہنے سے کسی وقت باہر نہ ہوتا۔ کیونکہ زمرہ خانم ہی تمہیں میرا پیار دے ہیں۔“

شہزادی نے ڈیڑھائی آنکھوں سے ملکہ کو دیکھا۔ ملکہ کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں لقا نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ملکہ مادر! آپ کے لئے امیر زنگی کا بیٹا۔ آپ ایک ملکہ کی طرح بہت اور حوصلے کا ثبوت دیجئے۔ انہوں نے شاہ کے غم میں جو بہائے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ آپ صبر سے کام لیجئے۔ امیر محترم بہت جلد دمشق آئیں اور غدار اور مکار معین الدین ان سے زبردست انتقام لیں گے۔“

”آمین۔“ شہزادی کی زبان سے ایک دم پھسل پڑا اور ملکہ کی آنکھیں بیٹے کے سامان بھاؤں بن گئیں۔

زناٹہ اور احوادث کے قبیلے کے سردار شاہی خواتین کا دل سے احترام کرتے تھے ہیں ان دونوں قبیلوں میں کسی زمانے میں سخت اختلاف تھا اور روز جھگڑے ہوا کرتے درجنوں قیمتی جانیں اس اختلاف کی بھیئت چڑھ گئی تھیں۔ ایک بار ملکہ مادر کے مرحوم شاہ دمشق کے سامنے ان قبائل کا جھگڑا پیش ہوا۔ دونوں قبائل اپنی شجاعت و لاوری کے لئے مشہور تھے لیکن آپس کے جھگڑوں سے ان کی قوت روز بروز کم ہو رہی تھی۔ شاہ نے مقدمہ سننے کے بعد تامل فرمایا پھر محل میں جا کر زمرہ خانم سے کیا۔ مشہور ہے کہ ملکہ زمرہ خانم اور شاہ دمشق نے ان قبائل کے درمیان اختلاف کا یہ کیا کہ دونوں قبیلے کے سرداروں کی ایک ایک جوان بہن کو شاہی محل میں بلوایا۔ دونوں کو دلہن بنا کر ملکہ کے محل میں بٹھایا گیا اور سرداران قبیلہ کو دلہنا بنا کر شاہ دمشق محل میں رکھا گیا پھر بڑی دھوم دھام سے شاہ کے محل سے دو باراتیں ملکہ کے محل کی چلیں۔ ملکہ کی کینڑوں اور غلاموں نے باراتیوں کا استقبال کیا پھر ایک قبیلے کے سردار سے دوسرے قبیلے کے سردار کی بہن سے عقد کیا گیا۔ اسی طرح دوسرے سردار کی بہن کا سردار سے نکاح ہوا اور یہ قبیلے ہمیشہ کے لئے شیرو شکر ہو گئے۔ یہی وجہ تھی کہ

کمن زنگی شہزادی بڑی خاموشی سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ ایسے لوگ فکر زیادہ نہیں مگر بولنے کم ہیں پھر جب بولتے ہیں تو ان کی باتیں نپٹی تلی ہوتی ہیں۔ شہزادی کرکلا صاف کر کے نرم آواز میں بولی۔ ”مادر مہربان! اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کیا۔“

ملکہ زمرہ خانم پہلے ہی حیران اور پریشان تھی۔ شہزادی کی بات پر وہ چونک پڑی۔ وہ کہہ نہیں سکتی تھی کہ یہ... بے زبان شہزادی ایک ایسے اہم مسئلے میں مشورہ بھی دے رہی ہے۔ شہزادی بیٹی! تم اپنوں میں ہو، جو کہنا چاہو بے خوف ہو کر کہو۔ میں جانتی ہوں کہ تم میرے غم سے کم نہیں ہے لیکن ہم کس قدر مجبور ہیں کہ ایک دوسرے کا غم سہل کر سکیں۔ میں تو تمہارے آنسو بھی نہیں پونچھ سکتی شہزادی! میری دنیا اندھیر ہوئی شہزادی دنیا بڑے کے رہ گئی ہے۔“

”مادر مہربان! خدا کی مصلحتوں میں کسی کو دخل نہیں ہے لیکن میرا یہ ایمان ہے کہ اس معاملہ میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے جسے نہ ہماری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں اور انہیں سمجھ سکتا ہے۔“ شہزادی نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔ ”لقا کا یہ کہنا بالکل درست

”جہاں چلو مان لیا کہ سرم زندہ ہے اور وہ موصل نہیں گیا تو پھر کہاں ہے؟“ ملکہ نے جھلانے کی کوشش کی۔

”میرا دل کہتا ہے کہ سردار سرم زندہ ہیں اور وہ اس وقت دمشق میں موجود ہیں۔“ لقا بات بھی بڑی حیران کن تھی۔

”تمہارے اس یقین کی کوئی وجہ بھی ہوگی۔ اسے معلوم ہوا ہو گا کہ ہمیں موصل بھیجنا ہے۔“ لقا کچھ نئے نئے انکشاف کر رہی تھی۔ ”وہ شہزادی سے بچھڑنے کا ذکر جس سے کرتے تھے۔ اس سے ان کی محبت بچتی تھی۔ سردار سرم اسی شہزادی کی تلاش میں لے نکلے تھے پھر بھلا وہ دمشق کیسے چھوڑ سکتے ہیں وہ شہزادی تک پہنچنے کی کوشش کر رہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اور شہزادی کے موصل بھیجے جانے کی خبر سے معین از مطمئن نہیں ہے۔ سردار سرم نے بھی اس خبر پر یقین نہیں کیا ہو گا۔ اس میں وہ موصل کیا منہ لے کر جاسکتے ہیں۔ اگر امیر موصل نے ان سے پوچھا کہ ملکہ شہزادی کو قید میں چھوڑ کر تم واپس کیوں آئے تو سردار سرم کیا جواب دیں گے؟“

”محل مند لقا! میں تم سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں مگر کیا تم سردار سرم کو تلاش کرنا؟“ شہزادی نے ملکہ مادر کو بوکھلایا ہوا دیکھا تو لقا کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ میں سردار سرم کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ بشرطیکہ وہ میں موجود ہوں۔“ لقا نے جواب دیا۔

”لقا! مجھے تمہارے وزیر اعظم سے خوف آتا ہے۔ اس کے جاسوسوں نے تمہیں دیکھ لیا۔“ شہزادی نے بڑی محبت سے کہا۔ ”خدا نخواستہ اگر تم بھی اچھوڑ گئیں تو پھر کیا ہو گا؟“

”امید پر دنیا قائم ہے شہزادی!“ لقا نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”پھر مجھے رونے والا بھی ہے اگر آپ اور ملکہ پر قربان ہو گئی تو میں سمجھوں گی کہ میری زندگی ٹھکانے لگ جائے گی۔“

”لقا! تم صرف اندازے لگاتی ہو۔“ ملکہ نے ناگوار انداز میں کہا۔ ”سرم“

”ہے تو وہ اپنی جان بچاتا پھر رہا ہو گا ممکن ہے کہ موصل چلا گیا ہو۔“

”ملکہ مادر! گستاخی معاف! سردار سرم اگر زندہ ہیں تو وہ ہرگز موصل سے نہیں آئے۔“ لقا نے اتنے یقین سے کہا کہ ملکہ اور شہزادی حیران رہ گئیں۔

”لیمانہ کو لقا! مادر مہربان تمہیں بہت چاہتی ہیں۔“

”لقا! تم کو بیمار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لقا ملکہ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔“

”لقا! تم عورت ذات سرم کو گلیوں گلیوں کیسے ڈھونڈو گی؟“ ملکہ نے بھی تشویش ظاہر کی۔

”لقا! تم کو بیمار بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ لقا ملکہ کے قدموں میں بیٹھ گئی۔“

”ہے کہ آنے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔“

”پھر بیٹی! تم ہی بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“ ملکہ اپنی خاموش طبیعت پر سے بڑی متاثر نظر آ رہی تھی۔ لقا بھی شہزادی کی باتوں پر حیران رہ گئی تھی۔

”مادر مہربان! ہم سب قیدی ہیں۔ وفادار سرداروں نے ہمیں ہر طرح کا آزار لیکن قیدی تو پھر قیدی ہے۔ خواہ اسے طوق و سلاسل میں پابند کیا جائے یا سونے میں رکھا جائے۔“ شہزادی بول رہی تھی۔ ملکہ اور لقا منہ کھولے ہوئے حیرت تک رہی تھیں۔

”مادر مہربان!“ شہزادی نے پھر بولنا شروع کیا۔ ”ہماری سوچیں اس جہاں دیواری میں سمٹ کر رہ گئی ہیں لیکن لقا اپنی کھست تسلیم کرتے ہوئے بھی پر اہم ہے۔ شاید وہ حویلی کے باہر دیکھ رہی ہے۔ اسے ہوا کے کسی تازہ... جھونکے کا

میں بھی نا امید نہیں ہوں۔ ہر رات کی ایک سحر ہے۔ اندھیرے کے بعد اجا ضروری ہے۔“

”شہزادی! میں آپ پر قربان۔ آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی ہے۔“

”میں نے یہ لمبی چوڑی تمہید اس واسطے باندھی تھی کہ ہمیں۔“

”کو تلاش کرنا چاہیے۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کل کیا ہونے والا ہے۔ اس کا نہیں لیکن ہمیں کل کے لئے تیار رہنا چاہیے۔“

”لقا! تمہارے خیال میں دمشق میں ہمارا اور کون سا تھ دے سکتا ہے؟“

”امید سے لقا کو دیکھا۔“ ”تم نے خود ہی کہا ہے کہ معین الدین انز کا مقابلہ کرنا کی بات نہیں ہے پھر ہماری مدد پر کوئی نیا آدمی کیسے کھڑا ہو سکتا ہے؟“

”ملکہ مادر! آپ سردار سرم کو بھول رہی ہیں۔“ لقا نے ملکہ کو چونکا دیا۔

”کی شہزادی کی تلاش میں محل سے نکلے تھے۔ اس ہنگامے میں ان کا کوئی پتہ نہیں ہے کہ وہ ضرور اب تک زندہ ہوں گے۔“

”لقا! تم صرف اندازے لگاتی ہو۔“ ملکہ نے ناگوار انداز میں کہا۔ ”سرم“

”ہے تو وہ اپنی جان بچاتا پھر رہا ہو گا ممکن ہے کہ موصل چلا گیا ہو۔“

”آپ فکر نہ کیجئے ملکہ!“ لقا پیر دباتے ہوئے بولی۔ ”سردار سرم کے اٹنے کا ہی ٹھکانہ ہو سکتا ہے۔ اور وہاں تک میں پہنچ سکتی ہوں۔“

”کیا... کیا تم سرم کا ٹھکانہ جانتی ہو؟ ملکہ نے حیرت سے پوچھا۔

”سردار سرم‘ شہزادی کی تلاش میں نکلے ہیں اور شہزادی قید خانے میں ہے کہ سردار قید خانے کے گرد چکر لگا رہے ہوں گے۔“ لقا نئی نئی باتوں سے دولہا تھیں۔

”اس کا کیا مطلب ہے؟“  
 ”اس کا مطلب آپ نہ سمجھ سکیں گی، ملکہ ماور!“ اور لقا ان کی طرف سے  
 کرشنراوی کو دیکھنے لگی۔

”مادر مہراں! میں آپ کو سمجھاتی ہوں۔“ شہزادی نے ملکہ کی حیرت دور کرنے کے لئے کہا۔ ”دیکھئے نا۔ اگر سرم کو واقعی شہزادی سے دلی لگاؤ ہے تو وہ قید خانے تک ہو گا اور اگر وہ شہزادی سے مل چکا ہے تو اس کا پتہ شہزادی سے معلوم کیا جاسکتا۔“

”آپ میری بات سمجھ گئیں شہزادی!“ لقا نے دنگی شہزادی کی عقل مندی کا اعتراف کیا۔

”لقا! ایک بات کان کھول کر سن لو۔“ ملکہ نے غصے اور شفقت کے ملے جلے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں امیر زرنگی کے پاس بھیجا۔ وہاں سے تم کامیاب لوٹنے میں نہیں چاہتی کہ کسی اور جھگڑے میں پڑو پھر تمہارے باہر آنے جانے سے بات سکتی ہے۔ اس صورت میں ہمارے محسنوں پر مصیبت آجائے گی۔ یہ تو بہت برا فراموشی ہو گی کہ ہم اپنے پناہ دینے والوں کو اپنی کسی غلطی سے تکلیف پہنچائیں۔“

”ملکہ مادر! آپ کسی بات کی فکر نہ کیجئے۔“ لقا اطمینان سے بولی۔ ”میں نے سنا ہے کہ خدا صرف ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں۔ اس وقت بھی سولی پر چڑھی ہوئی ہیں پھر ہم اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش

حویلی میں دن بھر الو بولتے تھے۔ چرواہے اپنے مویشی چراتے ہوئے بے دھڑک اس رات کو حویلی میں گھر آتے تھے لیکن شام ہوتے ہی حویلی میں رونق آ جاتی تھی۔ ملکہ اور لڑکی تمام دن حویلی کے زمین دوز تہ خانوں میں چھپی رہتی تھیں اور رات ہوتے ہی اوپر آ جاتی تھیں۔ اس وقت حویلی کے گرد دور دور تک پہرہ لگ جاتا تھا۔ ملکہ اور شنزادی کی اس حویلی کے محافظ بھی دن بھر کیس چھپے رہتے اور رات کو اپنے اپنے پہرے پر آ جاتے تھے۔ معین الدین ان کے زناطہ اور احداث کے سرداروں کے پیچھے اپنے جاسوس لگا رکھے تھے مگر سردار بھی بہت محتاط تھے۔ وہ دربار یا دربار سے باہر بھی کوئی اہم بات نہ کرتے اور کسی کی ضرورت پیش آتی تو چپکے سے اس حویلی میں آ جاتے۔ ملکہ سے ملاقات کے لئے

بھی وہ رات کے اندھیرے میں آتے تھے۔

معین الدین انز کو یہ شک ضرور تھا کہ ملکہ اور شہزادی کو اب تک موصل میں گیا ہے بلکہ انہیں ہمدرد سرداروں نے کسی محفوظ مقام پر بھیج دیا ہے۔ اس حویلی کی اس کا خیال بھی نہیں گیا تھا اور محض شبہ کی بنا پر وہ ان جنگجو قبائل کی مخالفت نہیں چاہتا تھا۔ ان کے جوانوں کی ایک کثیر تعداد دمشق کے لشکر میں موجود تھی جو کئی لڑائیوں اپنی شجاعت کا لوہا منوا چکی تھی۔

پھر ایک رات اس حویلی سے لٹا چرے پر نصف نقاب ڈالے نکلے۔ اس کا رخ طرف تھا۔ لٹا کی بہن کا گھر ایک چھوٹے سے محلے میں تھا۔ وہ سیدھی بہن کے گھر سے اسے لوگوں نے دیکھا بھی ہو گا مگر لٹا کو کوئی نہیں پہچانتا تھا۔ قصر شامی کی کنیزوں کو کچھ چند بڑے سرداروں کے اور کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ یوں بھی آج کل وزیر اعظم ان تمام بڑے بڑے سردار بہت زیادہ مصروف تھے۔ انطاکیہ اور یرموک کے لشکر امیرزگ تعاقب سے واپس آگئے تھے اور قلعے کے باہر خیمے لگائے پڑے تھے۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر اس کی بہن دروازے پر آئی۔ اس کا شوہر راز ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ بہن نے دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاط کے طور پر پوچھا۔ ”کون ہے“

”ارے تم لٹا!“ اور روفا نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے سے پلٹ گئیں۔ ان کی ملاقات دو سال بعد ہو رہی تھی۔ روفا نے افسردگی سے کہا ”ہماری بھی کیا تقدیر ہے۔ ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی دو سال تک نہیں مل سکتے۔“

بے چاری بہنیں ملتیں بھی کیسے روفا کا شوہر قید خانے کا ایک معمولی کاربند تھا اور قدرت نے ملکہ زمرہ خانم کی راز دار کنیز بلکہ سہیلی کا رتبہ عطا کیا تھا۔

”تقدیر کو کیوں کوستی ہو روفا؟“ لٹا نقاب الگ کر کے بستر پر بیٹھ گئی۔ ”تم نے میرے پاس آنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ شاہی محل میں تمہیں کون روک سکتا تھا؟“

”بائی! مجھے کیوں الزام دیتی ہو۔ تم آئیں تو یہاں تمہیں کون روکنے والا تھا؟“

”بھی شکوہ کیا۔“

”خیر! یہ باتیں چھوڑو۔ وہ تمہارے ہیں۔“

”وہ اپنے کام پر گئے ہیں۔ ان کی رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔“ روفا نے مسکرا کر کہا۔

لٹا کچھ فکر مند ہو گئی۔ روفا نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے بائی۔ آج انہیں کیوں پوچھا؟“

”ایک ضروری کام آ پڑا ہے۔ مجھے صبح تک ٹھہرنا پڑے گا۔“

”نہ نصیب“ روفا مسکرائی۔ ”چلو اسی بہانے تم سے ملاقات ہو گئی، ورنہ تم تو...“

روفا نے ایک دم بات پلٹ دی اور کہا۔ ”ارے ہاں، تمہارے بارے میں تو یہ کہا جا رہا ہے کہ تم ملکہ مادر کے ساتھ موصل چلی گئی ہو؟“

”یہ بات میرے لئے مفید ہے روفا۔“ لٹا بولی۔ ”میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ وزیر اعظم کے دربارے لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہیں کہ میں اور ملکہ مادر یہاں سے جا چکے ہیں۔“

”میں...“ لٹا کہتے کہتے رک گئی۔

”ہاؤ نا بائی! تم چپ کیوں ہو گئیں۔ میں کسی سے کہنے تھوڑی جا رہی ہوں؟“ روفا لٹا کی طرح ضد کرنے لگی۔

”روفا! حالات بڑے سنگین ہیں۔ کسی کو بھٹک پڑ گئی کہ میں دمشق میں موجود ہوں تو تم آجائے گی... پھر کسی وقت تفصیل سے بتاؤں گی۔“ لٹا نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

”یہ بھی نہیں بتاؤ گی کہ تم ان سے کیوں ملنا چاہتی ہو؟“ روفا نے بات گھما کر لٹا کو پکارتے ہوئے کہا۔

”مگر نہ کرو روفا! میں تیرے شوہر کو بھگا کر نہیں لے جاؤں گی۔“ اس نے بہن کو کالہ مارا۔

”بائی! تم مجھے ٹال رہی ہو۔ اچھا یہ تو بتا دو کہ شاہ کی نئی نویلی دلہن کا کیا بنا؟“

”تو میرے سر ہو گئی ہے۔“ لٹا ہنسنے لگی۔ ”بس یہ سمجھ لے کہ شاہ مجھے الدین کے ہاں سب خیریت سے ہیں۔ اب تجھے یہ بھی بتا دوں کہ میں تیرے شوہر نامدار سے کیوں ہاتھی ہوں۔ ملک انطاکیہ کی ایک شہزادی آئی ہوئی ہے۔ وہ ہمارے محافظ سردار سرم کی بہن ہے۔ وزیر اعظم نے اسے پکڑ کر قید کر دیا ہے۔ میں اسی کے بارے میں معلومات مل کر آ جا رہی ہوں۔“

”بائی! تم اس غم میں کیوں گھلی جا رہی ہو۔ شہزادی جس کی دوست ہے وہ خود اسے اٹھ کر لے گا۔ ایسے خطرناک کاموں میں نہیں ہاتھ ڈالنا چاہیے۔“ روفا ایک سیدھی سادی لٹا کی تھی۔ وہ نہ خود کسی جھگڑے میں پڑتی تھی اور نہ اپنی بہن کو کسی خطرناک کام میں لگنے دیتا تھا۔

”بائی! تو ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتی۔ اچھا اب تو سو جا۔ مجھے بھی سخت نیند آ رہی ہے۔“

ہے۔

روفا کے دو چھوٹے بچے تھے۔ انہیں لے کر وہ اپنے شوہر کے بستر پر لیٹ گئی۔ چارپائی لٹا کر دے دی۔ رات زیادہ ہو چکی تھی۔ اس لئے انہوں نے مزید کوئی حرکت نہ کی۔ اور دونوں خاموشی سے سو گئیں۔ لٹا کر فکر کی وجہ سے نہیں آ رہی تھی۔ اس نے دکھانے کے لئے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسی بے چینی سے کروٹیں بدلتے ہوئے سویرا کر دیا۔ صبح کی خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ اس نے لٹا کر غنودگی طاری کر دی۔ دروازے پر دستک ہوئی اور لٹا کر آنکھیں کھول دیں۔

روفا نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ اس کے شوہر نے مسکراتے ہوئے بازو پھیلا دئے وہ اپنی پیاری بیوی کو آغوشِ محبت میں لیتا چاہتا تھا۔ روفا جلدی سے پیچھے ہٹی اور ہونگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اپنے بستر کی طرف دیکھا جہاں لٹا سو رہی۔ ”یہ کون آیا ہے؟ شوہر نے سرگوشی کی۔

”یہ میں ہوں۔“ اور لٹا ہتھتے ہوئے بستر پر سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ارے آپ! باجی لٹا۔“ روفا کا شوہر بڑے ادب سے بولا اور لٹا کو سلام کیا۔

”روفا پر تمہیں رحم نہیں آتا؟“ لٹا نے چھوٹے ہنسنے کو چھیڑا۔

”باجی میں تو روفا کا غلام ہوں۔ ان سے پوچھئے۔ میں نے کبھی تکلیف دی ہے۔ پھول کی طرح رکھتا ہوں۔“

”جیسی رات رات بھر گھر سے غائب رہتے ہو۔ روفا کا نہیں تو ان معصوم بچہ خیال کرو۔ اپنی ڈیوٹی کیوں نہیں بدلو لیتے تم؟“ لٹا نے بزرگانہ نصیحتیں شروع کر دیں۔ ”ارے باجی! میری حیثیت ہی کیا ہے؟“ لٹا کا ہنسنی افسردہ ہو گیا۔ ”تین سال میں رات کی ڈیوٹی پر لگا ہوں مگر کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ ڈر کے مارے کچھ کتا بھی کہہ کہیں نکال نہ دیا جاؤں۔ اپنی سناؤ لٹا باجی! کیسی گزر رہی ہے۔ میرا خیال تھا موصل میں ہو گی اور....“

”ٹھیک ہے، تم مجھے موصل ہی میں سمجھتے رہو تو زیادہ اچھا ہے۔“ لٹا نے قہقہہ کی۔ ”اچھا سنو، میں تمہارے پاس ایک خاص کام سے آئی ہوں اور وہ کام تمہیں سنا ہے۔“

”میں حاضر ہوں لٹا باجی! آپ کام بتائیے۔“

”ابھی نہیں، پہلے نما دھو کر کچھ کھا پی لو پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی۔ رات بھر جاگتی رہی ہوں۔ ذرا دیر کروٹیں بدل لوں۔“ لٹا کو احساس ہوا کہ یہ غریب

ہوا ہے۔ اگر اسے کچھ آرام نہ ملا تو شاید اس کی بات پر توجہ نہ دے سکے۔

”میں باجی لٹا۔ پہلے آپ کا کام پھر آرام۔“ ہنسنی نے بڑی محبت سے کہا۔ ”مجھے کام کر کے بہت خوشی ہو گی۔ باجی روفا آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔“

لٹا نے اسے ہنسدیکھا تو کہا۔ ”اچھا سنو، کام“ یہ ہے کہ ابھی کچھ دنوں پہلے شاہ کے خاندان کی ایک شہزادی دمشق آئی تھی۔ اسے وزیر اعظم کے آدمیوں نے رکر کے قید کر دیا ہے، مجھے معلوم کرنا ہے کہ وہ کس جگہ قید ہے۔ اگر تمہارے قید میں ہے تو اس سے کس طرح ملا جا سکتا ہے۔ تمہیں بالکل گھبرانے کی ضرورت نہیں میں اس سے صرف باتیں کروں گی اور اس بات کا کسی کو علم نہ ہو سکے گا۔“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ لٹا باجی؟“ ہنسنی بڑے جوش سے بولا۔ ”آپ کے کام میں رہی جان بھی چلی جائے تو پروا نہیں۔ زندگی میں پہلی بار تو آپ نے ایک کام بتایا ہے۔ لٹا نے اظہارِ محبت کی شہزادی کا ذکر کیا ہے مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے میرے قید خانے ملاکہ شہزادی کیا، اس ملک کا کوئی معمولی سپاہی بھی قید نہیں ہے۔“

”تمہارا یہ کہنا کہ اظہارِ محبت کی شہزادی قید نہیں ہے، میں تسلیم نہیں کرتی۔“ لٹا نے سختی سے جواب دیا۔ ”شہزادی کو جن لوگوں نے گرفتار کیا ہے۔ ان میں سے ایک شخص نے مجھے بتائی ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور جگہ رکھی گئی ہو۔“

”میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ غلط کہہ رہی ہیں۔“ ہنسنی نے معذرت کی۔ ”لیکن دمشق میں صرف ایک ہی قید خانہ ہے اور اس قید خانے میں کوئی عورت موجود نہیں ہے۔ وزیر اعظم نے ضرور کہیں اور رکھا ہو گا۔“

”مگر کہاں؟“ لٹا نے جیسے خود سے کلام کیا پھر بولی۔ ”اچھا تم ایک کام کرو۔ ابھی فارغ قید خانے جاؤ اور اپنے دوستوں سے پتہ لگانے کی کوشش کرو کہ شہزادی کو اور کس جگہ رکھا جا سکتا ہے؟“

”میں ابھی جاتا ہوں باجی!“ روفا کا شوہر فوراً جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

”تم بھی جلدی کیا ہے۔ ذرا دیر آرام کر لو پھر چلے جانا۔“ لٹا اسے سمجھانے لگی۔

”ہرگز نہیں باجی! پہلے کام پھر آرام۔“

لٹا نہیں، نہیں کہتی رہ گئی مگر وہ منہ پر دو چلو مار کر گھر سے نکل گیا۔

”تم محبت والا ہے تمہارا شوہر روفا۔“ لٹا نے بڑے خلوص سے تعریف کی۔

”میں رہنے بھی دیں باجی! آپ کے خدمت کا کسے موقع ملتا ہے۔“ اور روفا بچوں کو لے کر لگ گئی۔

شب بیداری سے لٹکا کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر غسل کیا اور تمام راسخندی جسم سے اتار پھینکی پھر چوڑے کے پاس جا بیٹھی اور روتا کا ہاتھ مٹانے کی شہزادی انطاکیہ کی طرف لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وزیر اعظم نے کہاں چھپایا ہے۔ یہ خیال اسے اور پریشان کر رہا تھا کہ اگر انطاکیہ کی شہزادی کے اسے شاہ انطاکیہ سے کوئی سیاسی فائدہ اٹھانا تھا تو اسے اب تک کیوں چھپا رکھا ہے انطاکیہ اپنے لشکر کے ساتھ دمشق آیا ہوا تھا۔ لٹکا کا ذہن الجھتا جا رہا تھا اور الجھتا رہا غارت کرے اس شیطان کو۔ لٹکا نے انز کو کوسنا شروع کر دیا۔ یہ لٹکا کی کھلی شکست اور الدین انز کی فتح تھی۔ انطاکیہ کی شہزادی کو کہاں اور کس غرض سے چھپایا گیا ہے۔ لٹکا جیسی سمجھ دار... عورت کچھ بھی اندازہ نہ کر سکتی تھی۔

دوپہر سے کچھ دیر پہلے روتا کا شوہر واپس آ گیا۔ لٹکا کی نظریں دروازے ہی سے ا تعاقب کرنے لگیں۔ وہ بھی سیدھا لٹکے پاس پہنچا۔ لٹکا مجسم سوال بنی ہوئی تھی۔

”بابی لٹکا! آج تو میں کچھ پتہ نہ لگا سکا۔“ ہنوتی شرمندہ سا ہو گیا تھا۔ ”مگر مطلب یہ نہیں کہ میں ناکام ہو گیا ہوں۔ میں شہزادی کا پتہ لگا کے رہوں گا۔ اگر ٹھکانہ بتائی جائے جیسے ہی کچھ معلوم ہوا میں آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔“

لٹکا دل شکستہ ہو گئی۔ ”میں تمہارے وزیر اعظم کی معتب ہوں۔ میرے پاس تمہا مناسب نہیں ہے۔ خود ہی کسی دن آ جاؤں گی۔ تم کوشش جاری رکھنا۔“ لٹکا واپس کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے بڑا افسوس ہے لٹکا بابی!“ ہنوتی کی نظریں شرم کی وجہ سے اوپر نہیں اٹھ سکیں۔ ”ہاں! بابی ایک بات بڑی دلچسپ معلوم ہوئی ہے۔ میں تمہارے کان میں ڈال دوں۔ شاید کسی وقت تمہارے کام آئے۔“

”ضرور بتاؤ۔ لٹکا چلتے چلتے رک گئی۔ ”میں بہت دور رہتی ہوں۔ اس لئے یہاں کی خبریں میرے لئے بہت اہم ہیں۔ ملکہ مادر بھی یہاں کے حالات سے آگاہ رہنا چاہتی ہیں روتا کے میاں نے حیرانی سے لٹکا کو دیکھا۔ اس کا جی چاہا کہ ملکہ مادر کے بارے کچھ پوچھے مگر اس کی ہمت نہ پڑی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ شاید لٹکا نے روتا کو کچھ بتا ہو۔ اس لئے اتنی بے صبری اچھی نہیں ہے۔

”کس سوچ میں پڑ گئے؟“ لٹکا نے اسے چونکا دیا۔

”لٹکا بابی! مجھے معلوم ہوا ہے کہ یرودھم کے شاہ بالڈون کے خاندان کے شہزادوں شہزادیوں میں کچھ جھگڑا ہوا ہے۔ شہزادی کو وزیر اعظم کی پناہ میں بھیجا گیا ہے۔“ روتا

رہنے رک کر لٹکا کو دیکھا۔

”مگر مجھے تو یرودھم کی شہزادی کی بجائے انطاکیہ کی شہزادی کی تلاش ہے۔“ لٹکا نے لٹکا سے کہا۔ ”تم تلاش جاری رکھو۔ میں پھر آؤں گی۔“

”سنو تو بابی!“ روتا کے شوہر نے لٹکا کو روکا۔ ”مجھے تو... معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔“

لٹکا نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ ”کیسی گڑبڑ۔ ہمیں یرودھم کے معاملات سے کیا

”یہ بات نہیں ہے بابی۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ”اگر یرودھم کی شہزادی پناہ آئی ہے تو اسے محل میں رہنا چاہیے تھا۔ وزیر اعظم نے اسے قید خانے میں کیوں رکھا

”لٹکا اچھل پڑی۔ ”کیا وزیر اعظم نے اسے قیدی بنا دیا ہے؟“

”قیدی ہی سمجھنا چاہیے بابی۔“ روتا کے شوہر نے منہ بنایا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ اس کی

ت کے لئے نوکر چاکر، لونڈی غلام مقرر ہیں مگر قید خانے میں رہنے والی کو قیدی ہی کہا ہے۔ اگر وہ مہمان ہوتی تو ہمارے قید خانے میں کیوں بھیجی جاتی؟“

”تم نے دیکھا ہے اسے؟“ لٹکا کے دل میں کھلبلی مچ گئی۔ ”میرا مطلب ہے، صورت

یہی ہے۔ لوگوں سے کس طرح ملتی جلتی ہے۔ اس کی باتوں سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟“

”بابی! میں نے اسے صرف اس وقت دیکھا تھا جب وہ ہمارے قید خانے کے عورتوں

لے میں لائی گئی تھی۔“ روتا کے شوہر نے ذہن پر زور دے کر بتانا شروع کیا۔

”مال تک صورت شکل کا معاملہ ہے تو بس یہ سمجھئے کہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔

”میں نے آج تک اتنی خوب صورت...“ ”معا“ اس کی نظر روتا پر پڑی اور اس نے فوراً

”ٹاپل دی۔“ ”سوائے روتا کے دنیا کی کوئی اور لڑکی اس کے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

”ایک ہی بار دیکھا ہے۔“

”اور دوبارہ دیکھنے کی آرزو ہے۔“ روتا نے جل کر کہا۔

”روتا! یہ بات نہیں۔“ روتا کے شوہر نے گھبرا کر کہا۔ ”اسے دوبارہ نہ کسی نے دیکھا

”اور نہ دیکھ سکتا ہے۔ اسے سخت پہرے میں رکھا گیا ہے۔ نہ وہ باہر نکلتی ہے اور نہ کوئی

اسے ملے آتا ہے۔“

”وزیر اعظم تو آتا ہو گا ملنے؟“ لٹکا نے دلچسپی سے پوچھا۔

”بالکل نہیں، وزیر اعظم کیا اس کا نائب بھی کبھی ملنے نہیں آیا۔“ روتا کے شوہر نے



”اس کا مجھے پتہ نہیں۔ مجھے تو یہی معلوم ہے کہ رات کو وہ اپنے بھائی کے ساتھ گھر  
”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“ لقا نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ پھر زور سے بولی۔  
”جاری ہوں رونا! پھر کسی دن آؤں گی۔“  
”اپنی رات کو چلی جا۔ دن کے وقت کوئی پہچان نہ لے۔“ رونا نے محبت سے کہا۔  
”رونا! میرا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ میں وقت ضائع نہیں کر سکتی۔“ لقا چہرے پر  
بے ڈالتی ہوئی باہر نکلی۔ گلی میں سناٹا تھا۔ اس نے پھر بھی ادھر ادھر نظریں دوڑا کر  
دیکھا مگر کچھ نہ دیکھا۔

☆☆☆☆☆

تھامیں گئیں آبادی سے نکل جانا چاہتی تھی۔ اس کوشش میں اسے ایک طویل سفر لے کرنا پڑا پھر بھی ایک بڑی سڑک نے اس کا راستہ روک لیا۔ بغیر اسے پار کئے وہ ایک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ مجبوراً اسے سڑک پار کرنا پڑی۔ وہاں کافی روٹھ گئی۔ لٹا کو پار لٹا ہوا نقاب ٹھیک کرنا پڑتا تھا پھر اسے یوں محسوس ہوا، جیسے کوئی اس کا تعاقب رہا ہے۔ اس احساس کے ساتھ ہی اس کے قدم اور تیز ہو گئے۔ اس کے دل میں ایک عظیم غم سا بیٹھتا جا رہا تھا۔ رونا نے ٹھیک کہا تھا کہ دن میں اسے کوئی پہچان سکتا تھا۔ کوئی غلطی برافسوس ہو رہا تھا۔

وہ آبادی سے باہر نکلی تو اسے کچھ اطمینان ہوا اور اس نے ایک جگہ ٹھہر کر پیچھے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی لٹا کے پیر کاٹنے لگے۔ ایک فقیر نما شخص جس کے الجھے بال شانوں پر مار رہے تھے۔ بڑی تیزی سے لٹا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ خطرہ لٹا کے سر پر آ پہنچا تھا۔ اس نے اس سے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ پوری طاقت سے دوڑ رہی تھی اور اس کے بالوں سے ایک آواز بار بار ٹکرا رہی تھی۔ کوئی جیسے پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔

”رک جاؤ تھا! رک جاؤ۔“

ہر آواز کے ساتھ لہکا کے قدم اور تیزی سے بڑھنے لگتے تھے جیسے ان میں پہنے لگا دئے گئے ہوں یا پھر جیسے ہوا میں اڑ رہی ہو خوف و دہشت سے وہ اب تک کانپ رہی تھی مگر بس اسے اپنے اوپر شک ہونے لگا تھا۔ کیا واقعی کوئی اس کا تعاقب کر رہا ہے یا یہ اس کا ٹھکانہ ہے۔ کچھ دور اسے اور لوگ بھی چلتے پھرتے نظر آئے۔ ممکن ہے یہ بھی کوئی راہ گیر ہو۔ اس کے دل کے کسی کونے سے جیسے ایک آواز آئی۔ ہاں، وہ بھی کوئی راہ گیر ہے۔

زور دے کر کہا۔ ”اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ وہ مہمان نہیں بلکہ قیدی ہے۔ کڑا جاتا کہ وہ کیسے رہتی ہے کیا کرتی ہے۔ قید خانے کے داروغہ کو بھی اس حصے میں با اجازت نہیں ہے۔ وزیر اعظم نے اپنے اعتماد کے محافظ وہاں مقرر کئے ہیں۔ شہزاد خدمت پر جو غلام اور کینیز مقرر ہیں انہیں بھی وزیر اعظم نے شای محل سے بھیجا۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔ اس میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔“ لقا کا تجتس بھی بڑھ گیا۔

”مجھے کوئی بہت بڑی سازش معلوم ہوتی ہے۔“

”سازش... کس طرح کی سازش؟“ لقا نے اسے ٹٹولا۔

”سازش یہی کہ وزیر اعظم نے یروٹلم کی شہزادی کو دھوکے سے دمشق بلایا اور قید کر لیا ہے۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ واقعی یروٹلم کی شہزادی ہے؟“

”اس میں شبہ کیا بات ہے؟“ روفا کا شوہر اس کے اس عجیب سوال سے پرٹ ہو گیا۔ ”آپ میری بات کی تصدیق قید خانے کے کسی بھی شخص سے کر سکتے ہیں، وہ آپ کی سیلی تھی نا۔ کیا نام تھا اس کا۔ وہی جو پچھلی مرتبہ آپ کے ساتھ ہوا تھی۔“

”پچھلی مرتبہ... میرے ساتھ... ہاں یاد آیا۔ حنا میرے ساتھ آئی تھی یہاں۔“  
سوچ کر بتایا۔

”ہاں، ہاس، ویسی جتا۔“ روفاء کے شوہر نے خوش ہو کر کہا۔  
”مگر کیا ہوا جتا کو؟ تم نے اسے کہاں دیکھا؟“ طاہر گھبرانے لگی۔

”اے کچھ نہیں ہوا باقی! میں یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کی سہیلی حنا بھی شہزاد خدمت پر لگی ہوئی ہے۔ میرا اور اس کا روز سامنا ہوتا ہے۔ حنا نے مجھے پہلے ہی دانا لیا تھا۔ اس نے مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھا۔ اس وقت تک مجھے آپ کے بارے میں کوئی علم نہ تھا۔ میں نے اسے یہی بتایا تھا کہ شاید آپ ملکہ کے ساتھ موصول ہو جائیں گے۔“

”بس تو اب مسئلہ حل ہو گیا۔“ لقا سرت سے بولی۔ ”اچھا اب یہ بتاؤ کہ“  
وقت آتی ہے اور کب واپس جاتی ہے؟“

”حنا کی ڈیوٹی دن کے بارہ بجے سے رات بارہ بجے تک ہوتی ہے پھر وہ اپنے  
جاتی ہے۔“

”کیا حنا نے شاہی محل چھوڑ دیا ہے؟“ لقانے حیرانی سے پوچھا۔

لٹا نے دل کو تسلی دی۔ اس سے اسے کچھ سکون ملا۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک بھی گئی تھی۔ اس نے اپنی رفتار کم کر دی۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں کوئی دوسرا اسے بھاگتا ہوا دیکھ نہ کرے۔ آخر لٹا ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ جی کڑا کر کے اس نے گھوم کر دیکھا۔ کا وہ پیکر اب بھی اسے نظر آ رہا تھا مگر تعجب یہ تھا کہ ان کا درمیانی فاصلہ پہلے کے برابر زیادہ ہو گیا تھا۔ ہاں ہاں یہ میرا وہم ہے۔ لٹا نے سوچا۔ اگر وہ میرے پیچھے ہوتا تو وہ مجھے پکڑ سکتا تھا مگر اس کی رفتار تو پہلے جیسی ہے اور درمیانی فاصلہ ہر قدم زیادہ ہوتا ہے۔ لٹا نے سر ہلایا جیسے اس نے اپنے وہم کو جھٹک دیا ہو۔

لٹا نے دل کو تسلی دی۔ اس سے اسے کچھ سکون ملا۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک بھی گئی تھی۔ اس نے اپنی رفتار کم کر دی۔ اسے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں کوئی دوسرا اسے بھاگتا ہوا دیکھ نہ کرے۔ آخر لٹا ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ جی کڑا کر کے اس نے گھوم کر دیکھا۔ کا وہ پیکر اب بھی اسے نظر آ رہا تھا مگر تعجب یہ تھا کہ ان کا درمیانی فاصلہ پہلے کے برابر زیادہ ہو گیا تھا۔ ہاں ہاں یہ میرا وہم ہے۔ لٹا نے سوچا۔ اگر وہ میرے پیچھے ہوتا تو وہ مجھے پکڑ سکتا تھا مگر اس کی رفتار تو پہلے جیسی ہے اور درمیانی فاصلہ ہر قدم زیادہ ہوتا ہے۔ لٹا نے سر ہلایا جیسے اس نے اپنے وہم کو جھٹک دیا ہو۔

سامنے ایک چھوٹا سا کچا ٹیلہ تھا۔ راستہ اس پر ہو کے گزرتا تھا مگر باوجود مطمئن ہونے کے لٹا نے ٹیلے پر چڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اس منحوس شکل کو اپنے پیچھے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے اوپر جانے کی بجائے ٹیلے کے گرد کا راستہ اختیار کیا۔ اس طرح وہ دیر کے لئے پیچھے آنے والے فقیر کی نظروں سے چھپ گئی۔ لٹا کو اس سے بڑا سکون ملا۔ آہستہ آہستہ چکر لگا کر سیدھے راستے پر آ گئی۔ اس نے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھا۔ فقیر نظر نہ آیا۔ ٹیلہ ان کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔

لٹا مطمئن ہو کر آگے بڑھی مگر وہی قدم آگے بڑھی تھی کہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔ دہشت کی ایک تازہ لہر اسے اپنے وجود سے گزرتی محسوس ہوئی۔ وہ منحوس فقیر راستے کنارے ایک بیڑے کے نیچے بڑے اطمینان سے کھڑا تھا جیسے وہ اس کا انتظار کر رہا ہو۔ جائے رفتن نہ پائے نامدن۔ لٹا بت بنی کھڑی تھی اور فقیر کا چہرہ اس کی آنکھوں میں کما رہا تھا۔ واپس جاتی تو کہاں جاتی۔ روفا کا گھر بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی اور سامنے وہی منحوس شکل کھڑی اس کا شاید مذاق اڑا رہی تھی۔

سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور بیڑوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ اس سوچا کاش اس وقت رات ہوتی اور وہ اس فقیر کی نظروں سے بچ کر نکل جاتی۔ کڑے کھڑے اس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں مگر نہ فقیر اپنی جگہ سے ہلتا تھا اور نہ لٹا کے آگے بڑھتے تھے پھر لٹا کو ایک نئے خیال نے چونکا دیا۔ اگر رات ہو گئی تو... لٹا بیڑے کی کش میں جٹا تھی۔ آخر اس نے ہمت کی اور آگے بڑھنے لگی۔ وہ راستے کے دوسرے کنارے پر چلنے لگی۔ فقیر دوسری طرف تھا اور لٹا نظریں جھکائے ہوئے چل رہی تھی۔

”لٹا! مجھ سے تم خوف زدہ ہو؟“ یہ آواز لٹا کی سماعت سے ٹکرائی اور اس نے لرزے پیر تھم گئے۔

لٹا نے غور سے فقیر کی طرف دیکھا جو راستے کے دوسری طرف بالکل اس کے سامنے

سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور بیڑوں کے سائے لمبے ہو گئے تھے۔ اس سوچا کاش اس وقت رات ہوتی اور وہ اس فقیر کی نظروں سے بچ کر نکل جاتی۔ کڑے کھڑے اس کی ٹانگیں جواب دینے لگیں مگر نہ فقیر اپنی جگہ سے ہلتا تھا اور نہ لٹا کے آگے بڑھتے تھے پھر لٹا کو ایک نئے خیال نے چونکا دیا۔ اگر رات ہو گئی تو... لٹا بیڑے کی کش میں جٹا تھی۔ آخر اس نے ہمت کی اور آگے بڑھنے لگی۔ وہ راستے کے دوسرے کنارے پر چلنے لگی۔ فقیر دوسری طرف تھا اور لٹا نظریں جھکائے ہوئے چل رہی تھی۔

”مجھے ڈھونڈنے نکلی تھیں؟“ سرم نے جیسے خود سے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں میں  
 جھرمٹ تھی۔  
 ”ہاں سردار! عورت تنہا کچھ نہیں کر سکتی۔ اسے ایک مضبوط سہارے کی ضرورت  
 ہے۔“ لقا کہہ رہی تھی اور سرم پھٹی پھٹی سی نظروں سے اسے نکلے جا رہا تھا۔  
 ”اچھا سردار! میں چلی کل شام کو پھر ملاقات ہو گی۔“ لقا اسے حیرت زدہ چھوڑ کر  
 بڑھ گئی۔

”سنو تو لقا!“ سرم گھبرا کر اس کی طرف بڑھا۔ ”کہاں ملو گی کل؟“  
 ”سردار! یہاں زیادہ باتیں کرنا ٹھیک نہیں۔“ لقا نے تیز تیز چلتے جواب دیا۔ باقی باتیں  
 ہوں گی اسی جگہ۔“

سردار سرم نے بھی اسے روکنا مناسب نہ سمجھا اور لقا تھوڑی دور جا کر پیڑوں کے  
 جھڑ میں غائب ہو گئی۔

جب لقا نے ملکہ مادر کو بتایا کہ سرم زندہ ہے اور انہیں تلاش کر رہا ہے تو ملکہ کی  
 کوئی انتہا نہ رہی۔ وہ جوان بیٹے کے غم کو کچھ دیر کے لئے بالکل بھول گئی۔ اسے  
 لوس ہوا جیسے سرم کی شکل میں اس کا بیٹا پھر زندہ ہو گیا ہے۔ ملکہ نے شکایت بھرے  
 لہجے میں کہا: ”لقا! جب تمہیں سرم مل گیا تھا تو تم اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لائیں؟“

”ملکہ مادر! میں سرم کو آپ سے ملانے کے لئے خود بہت بے چین ہوں۔“ لقا نے  
 اسے کہا۔ ”لیکن میرے خیال میں یہ بہت بڑی احسان فراموشی ہو گی کہ ہم بغیر  
 مل کے بتائے ہوئے سرم کو یہاں لے آئیں۔ سرم کو یہاں لانے میں جو خطرات ہیں  
 آپ واقف ہیں۔ اس لئے پہلے ہمیں سرداروں کو اپنے اعتماد میں لینا ہو گا۔“

”یہ تو ٹھیک ہے لقا لیکن سرداروں کے یہاں آنے کا کوئی وقت نہیں ہے۔ تم دیکھ  
 وہب سے ہم یہاں آئے ہیں۔ وہ صرف ایک بار ہمارے پاس آئے ہیں۔ کیا پتہ وہ  
 دیکھنے نہ آئیں۔ اس وقت تک کیا ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے۔ سردار  
 فوراً موصول بھیجنا چاہتے ہیں۔ سرم سے بھی وہ واقف ہیں۔ انہیں ہماری ملاقات پر کوئی  
 لہ نہ ہو گا۔“ ملکہ کے لہجے میں اگرچہ جھنجھلاہٹ تھی مگر ان کی بات بڑی معقول تھی۔  
 لقا کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی۔ ”کل شام سرم سے میری پھر ملاقات ہو گی۔ میں اس  
 کی کولن کی پھر کوئی منصوبہ بنایا جائے گا۔“

زنگی شہزادی نے کچھ گول مول سا مشورہ دیا۔ ”ملکہ مہربان کا یہ کہنا ٹھیک ہے کہ  
 ملکہ کو سرم کی ملاقات پر کوئی اعتراض نہ ہو گا اور ان کا منصوبہ بھی ہمیں موصول بھیجے  
 اس سرم کی مدد سے یہ کام بڑے محفوظ طریقے سے ہو سکتا ہے۔ لقا اگر سرم سے

لقا کے چہرے پر اداسی کی ایک ہلکی سی لہر نمودار ہوئی اسے شاید کسی اور  
 امید تھی۔ اس نے جلدی سے اپنی اداسی پر قابو پایا اور پرجوش لہجے میں بولی۔ ”سرم  
 جس طرح ملکہ مادر کی کنیز ہوں اسی طرح آپ کی بھی کنیز ہوں۔ صرف مدد  
 کے لئے تو میں اپنی جان تک دے سکتی ہوں۔“  
 ”تمہارا بہت بہت شکریہ لقا! تمہارا احسان میں کبھی نہ بھولوں گا۔“ سرم نے  
 گزار نظروں سے دیکھا۔

”مجھے شرمندہ نہ کیجئے سردار! میں خود بھی آپ کو تلاش کر رہی تھی۔“  
 ”میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں لقا؟“ سرم نے افسردگی سے کہا۔ ”ایک نا  
 انسان ہوں۔ معین الدین انز کے خوف سے جان بچاتا پھرتا ہوں۔“

”ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔“ لقا نے سرم کو... دوسرے انداز  
 دی۔ ”انتظامیہ کی شہزادی کے لئے میرا دل بھی خون کے آنسو روتا ہے۔ میں نے ہم  
 ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر تنہا ہونے کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکی۔ اب آ  
 گئے ہیں۔ شاید کوئی بہتر صورت پیدا ہو۔“

”لقا! تم انسان نہیں فرشتہ ہو آسمانی حور ہو۔ تمہارا دل کتنا گداڑ ہے۔ میری  
 آج سے تمہارے سپرد ہیں۔“ سرم نے بڑے خلوص سے لقا کی ہمدردی کا اعتراف  
 ”اگر میں تمہارے کسی کام آسکوں تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی۔“

”خوش نصیبی تو میری ہو گی سردار! کاش میں آپ کی مدد سے انتظامیہ کی شہزاد  
 تلاش میں کامیاب ہو سکوں۔“ لقا نے جیسے دل تھام کر کہا۔ ”آپ دونوں نے ایک د  
 کے لئے کس قدر دکھ اٹھائے ہیں مگر پھر بھی آپ ایک نہ ہو سکے۔“

”لقا! یقین کرو شہزادی سے دوبارہ ملاقات اب ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔  
 نے لقا کو ایسی نظروں سے دیکھا جس میں حسرتیں ہی حسرتیں بھری تھیں۔

”اتنے مغموم نہ ہوئے میرے سردار!“ لقا کے منہ سے جیسے آپ ہی آپ لہجے  
 ”ابھی لقا زندہ ہے۔ میں آپ کو منزل تک پہنچا کے رہوں گی۔“

”مگر ابھی یہ تو پتہ نہیں کہ شہزادی زندہ ہے یا اس ظالم نے اسے بھی موت کے  
 تار دیا۔“ سرم بہت پشیمان ہو گیا تھا۔ اس کی ناامیدی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

”میرا دل کتنا ہے کہ وہ زندہ ہیں اور ایک نہ ایک دن آپ کو ضرور ملیں گی۔“  
 بڑے یقین سے کہا۔ ”ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ مجھے دیکھئے میں آ  
 ڈھونڈنے نکلی تھی اور آپ خود بخود مجھے مل گئے۔“

مشورہ کرنا چاہتی ہے تو یہ اور زیادہ اچھا ہے پھر آپ سرداروں سے کھل کر بات کریں۔“

ملکہ مادر نے بھی اس سے اتفاق کیا لیکن دوسرے دن جب لقا سرم سے وقت مقررہ پر وہاں موجود نہ تھا۔ کچھ دیر تک لقا بیڑوں کے جھنڈ میں کھڑی رہ کر رہی مگر جب رات ہو گئی اور سرم نہ آیا تو اسے طرح طرح کے دوسرے کہیں سرم گرفتار تو نہیں ہو گیا۔ یہ خیال آتے ہی لقا کانپنے لگی۔ لقا کا بظاہر سرم تعلق نہ تھا۔ سرم شادی محافظ تھا اور لقا محض ایک کنیز۔ ملکہ نے اگرچہ لقا کو اپنا سہیلی کا درجہ دے رکھا تھا مگر وہ اپنی اوقات کو جانتی تھی اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتی تھی جس سے اس کا بنا بنایا وقار ختم ہو جائے۔

سرم کے دل میں بھی سوائے شاسانی کے اور کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ لقا کا اس خیال رکھتا تھا کہ لقا، ملکہ کی کنیز خاص تھی اور دونوں کا ہر وقت سامنا رہتا تھا۔ ام شبہ نہیں کہ لقا بڑی خوب صورت اور شوخ کنیز تھی اور اس قابل تھی کہ اسے لیکن سرم کے ذہن میں کبھی کوئی ایسا خیال پیدا نہ ہوا تھا پھر جب سرم جنگ برآمد انطاکیہ کی شہزادی کے عشق میں گرفتار ہوا تو لقا کے محبت بھرے دل میں اٹھنے جذبے سرد پڑ گئے۔ وہ اندر ہی اندر سرم کی پرستش کرتی تھی لیکن اس نے محبت کا ذکر نہ کبھی ملکہ سے کیا تھا اور نہ سرم پر کچھ ظاہر ہونے دیا تھا۔

مگر جب لقا کا سرم سے سردار ہے اتفاق سے سامنا ہو گیا تو وہ اپنے جذبات رکھ سکی اور بے خیالی میں کچھ ایسی باتیں کہہ گئی کہ سرم نہ صرف حیران رہ گیا یہ عقدہ بھی کھلا کہ لقا اس سے لاحق توقعات وابستہ کئے بیٹھی ہے۔ سرم کو اس بات پر تھا کہ لقا کو اس کے دل کا حال پوری طرح معلوم تھا۔ اس کے باوجود اس سے اس بات کی خواہش مند تھی جو مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن تھی۔ اچھا ہوا کہ دن لقا اور سرم کی ملاقات نہ ہوئی۔ ورنہ ممکن تھا کہ اس کے منہ سے کوئی ایسا جاتی کہ شبہ اور غلط فہمی کا پردہ اٹھ جاتا۔ اور سرم کو لقا کے بے وقوفی پر انصاف لقا کو یہ معلوم تھا کہ سرم شہزادی کے عشق میں گرفتار ہے اور وہ سرم کو نہ کر سکے گی پھر بھی وہ سرم سے محبت کئے جا رہی تھی۔ شاید اسی لئے کہتے ہیں کسی کا زور نہیں۔ یہ چنگاری خود ہی سکتی ہے اور سکتے سکتے شعلہ بن کر بجھنے محبت کے شعلے کی تپش بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ کوئی تڑپ تڑپ کر جان دے کوئی اس کی لذت کے سارے پوری عمر کاٹ دیتا ہے۔ لقا نے شاید ایسے ہی درد کو سینے سے لگایا تھا اور سرم کے حصول سے بے پروا ہو کر اسے فائدہ

شش مل گئی ہوئی تھی۔

سرم کا شادی محل کے خونی ڈرائے سے بچ جانا ایک معجزے سے کم نہ تھا، جس رات معین الدین آہن اور اس کے لواحقین کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا گیا اسی شب سرم کو اپنی انطاکیہ کی شہزادی جینالو کی گرفتاری کی خبر ملی۔ امیر زنگی اور ملکہ زمرہ خانم کی شادی فریب کے محل کو بھی مل چکی تھی۔ شہزادی جینالو حلب میں اس لئے ٹھہری ہوئی تھی اسے کسی طرف سے سرم کی اطلاع ملے اور وہ حلب سے روانہ ہو۔ اسے علم تھا کہ شادی محافظ دسے کا سردار ہے۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ ملکہ اور شاہ مجیر الدین کی شادی میں وہ ضرور شریک ہو گا۔ اس خیال کے تحت اس نے حلب کے محل سے تامل کی اور دمشق روانہ ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

وزیر اعظم معین الدین انزلی نے یروٹلم سے واپس آتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شادی ان کا خاتمہ کر دے گا اور اس خاندان سے تعلق رکھنے والے تمام لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ادا کرے گا۔ سرم کے وہ پہلے ہی خلاف تھا اور اب تو وہ سرم کا جانی دشمن بن گیا۔ اس نے منافقت کا ایسا لباس پہن لیا تھا کہ کسی کو اس پر ذرہ برابر شک نہ ہوا۔ اس نے ایک طرف ملکہ اور شاہ کے حضور میں پیش قیمت تہائف پیش کر کے ان سے ان کو دینی کا رنگ دے دیا تھا دوسری طرف اس نے سرم کو اس انداز سے سینے سے لگا کر سرم نے اس کے پیچھے تمام کرتوتوں کو بھول کر اسے فرشتہ سمجھ لیا تھا۔

شہزادی جینالو اس وقت دمشق پہنچی۔ جب وزیر اعظم نے بڑی خاموشی سے شادی محل پہنچنے میں لے لیا تھا اور وزیر اعظم کی اطلاع کے بغیر ایک پرندہ تنک شادی محل داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ معین الدین انزلی کو شہزادی کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے شہزادی کا استقبال کیا اور اس قدر خلوص سے پیش آیا کہ شہزادی اسے اپنا اور سرم کا سردار کی خواہ سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ معین الدین انزلی کو شہزادی سے کوئی خاص پرکاش نہ تھا۔ لیکن اس نے محض سرم کو دک پہنچانے کے لئے شہزادی کو قید کر لیا۔ شہزادی پر اس نے ظاہر کیا کہ سرم موصل گیا ہوا ہے اور اس کے واپس آتے ہی دونوں کی ملاقات کرا جائے گی لیکن یہ اس کا محض فریب تھا۔ سرم اس وقت بھی شادی محل میں موجود تھا اور اسی محل کے ایک دوسرے کمرے میں وزیر اعظم معین الدین انزلی کو یہ لگایا تھا کہ سرم موصل گیا ہوا ہے۔

شہزادی کو قید خانے میں اس طرح رکھا گیا تھا کہ ہر وقت چار کنیزیں اس کے سامنے

واپس گی۔ تب وہ قلعے تک پہنچ سکے گا۔  
 میرے دوست! "سرم نے فلسفہ بگھارا۔ "شیر جنگل میں اکیلا ہی ہوتا ہے پھر بھی  
 جنگل پر راج کرتا ہے۔ امیر زنگی اکیلا ہی ان سب کا خاتمہ کر دے گا۔"  
 دھارے ایسا ہی ہو۔ "دوست نے اس سے آگے کچھ نہ کہا۔ شاید اسے بھی امیر  
 کا ہارنے کا رازناموں نے قائل کر دیا تھا۔  
 اور چپ رہنے کے بعد سرم نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ "میں امیر زنگی سے فوراً"  
 ہوں۔"

نہارا تو سر پھر گیا ہے سرم! "دوست نے اسے محبت سے سرزنش کی۔ "دشمن کے  
 لڑ چے چے پر عیسائی لشکر پھیلا ہوا ہے۔ وزیر اعظم نے یہاں بھی تمام انتظامات  
 ہیں۔ تم ہوا تو نہیں ہو کہ لشکروں کو چرتے ہوئے نکل جاؤ میں تمہیں اس حماقت  
 سے نہیں دے سکتا۔"

میں سپاہی زادہ ہوں دوست اور سپاہی کا کام ہی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا  
 سرم نے بڑی بے پروائی سے کہا۔ "دشمن میرا وطن ہے اور میں نہیں چاہتا کہ یہ  
 صورت شہر جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آئے۔ میں اسے بچانے کی پوری کوشش  
 ادا کرتا ہوں۔"

سرم! واقعی تمہارا دماغ ٹھیک نہیں ہے۔ "دوست نے غصے سے کہا۔ "ابھی تم نے  
 کہ جنگ ہی اس کا علاج ہے اور اب تم دشمن کو محفوظ رکھنا چاہتے ہو جنگ شروع  
 ہو گئی ہے باقی نہ رہ جائے گا سرم!"

"تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو دوست مگر مجھے کوشش تو کرنے دو۔ کیا عجیب کہ میں اپنی  
 مائیں کامیاب ہو جاؤں اور قلعہ کی فصیلیں بھی جوں کی توں باقی رہیں۔"  
 یہ سب دوائے کی بو ہے سرم! "اس کے دوست نے کہا اور جھلایا ہوا دوسرے  
 مائیں چلا گیا۔"

"میرے دن سرم کو لقا سے ملنا تھا مگر اس نے اس ملاقات کو نظر انداز کر دیا۔ اس  
 دن میں امیر زنگی تک اس کا پہنچنا زیادہ ضروری تھا۔ فجر کی نماز کے ساتھ ہی وہ اپنے  
 گھر سے نکل پڑا۔ سرم روز صبح کو اسی وقت دوست کے گھر سے نکلتا تھا اور  
 گھر کے اندر سے اس کا انتظار کرتا تھا۔ یہ طریقہ اس نے احتیاط کے طور پر اختیار کیا تھا اور  
 اس کا دھڑکتا دل اس پر یا اس کے دوست پر اب تک کوئی شبہ نہ ہوا تھا۔ ورنہ وزیر  
 اعظم کے لڑنے کے جاسوس گلی گلی پھرتے تھے۔ ان جاسوسوں میں سے بعض کو سرم  
 کا ہارنا تھا کیونکہ یہ جاسوس محل کے اندر باہر بھی جاسوسی کرتے رہتے تھے۔"

ہاتھ باندھی کھڑی رہتی تھیں۔ باہر کے کام پر بھی درجنوں غلام اس کے حکم کے خیر  
 تھے۔ اس لئے اگر شہزادی نے خود کو وزیر اعظم کا مہمان سمجھا تو کچھ غلط بھی نہ تھا  
 ہی دونوں بعد وزیر اعظم نے اسے حکم دیا کہ وہ اپنے آپ کو انتظامیہ کی شہزادی کی  
 یروٹلم کی شہزادی ظاہر کرے۔ یہ تو علم نہیں کہ وزیر اعظم نے ایسا حکم کیوں دیا  
 حکم کے ساتھ شہزادی کو بڑی سختی سے تنبیہ کی گئی کہ اگر اس نے کسی سے بوسہ  
 بھی یہ کہہ دیا کہ وہ انتظامیہ کی شہزادی ہے تو اسے فوراً قتل کر دیا جائے گا۔ ام  
 شہزادی کو پتہ چلا کہ وہ وزیر اعظم کی مہمان نہیں بلکہ اس کی قیدی ہے اور شاید اب  
 ملاقات سرم سے کبھی نہ ہو سکے۔

سرم، شہزادی کی گرفتاری کی خبر سنتے ہی محل سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ اسے وزیر  
 معین الدین انز پر سخت غصہ تھا۔ سرم کو یقین تھا کہ اس گرفتاری میں وزیر اعظم  
 ہے۔ اس نے وزیر اعظم سے ملنے کا بھی فیصلہ کیا تھا لیکن انز اس وقت دمشق کی  
 امیر زنگی سے ملنے گیا ہوا تھا۔ سرم، شہزادی کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ دوسرے  
 اسے شاہ مجید الدین آہن کے قتل اور ملکہ کی گرفتاری کی خبر ملی اور وہ روپوش ہو گیا۔  
 معلوم تھا کہ وزیر اعظم واپس آتے ہی اسے تلاش کرے گا۔ اس لئے وہ ایک دوسرے  
 گھر میں اس طرح گھس کر بیٹھا کہ کئی ہفتے تک اس نے باہر کی ہوا بھی نہ کھائی پھر  
 فقیر کا روپ دھار کر نکلا اور اس کی ملاقات لقا سے ہو گئی۔ لقا اور اس کی زیادہ دیر  
 ہو سکی پھر بھی اسے معلوم ہو گیا کہ ملکہ اور زنگی شہزادی خیریت سے ہیں۔ لقا نے  
 اشاروں میں یہ بھی بتایا تھا کہ انتظامیہ کی شہزادی بھی دمشق میں کسی جگہ موجود ہے  
 شہزادی کی تلاش میں اس کی مدد بھی کرے گی۔ لقا کی گفتگو سے اس نے کچھ اور بھی  
 لگایا تھا مگر یہ وقت ایسی باتوں پر غور کرنے کا نہ تھا۔ اس نے اس مسئلے کو کسی اور دن  
 لئے اٹھا رکھا۔

رات جب سرم نئی امیدوں کو سینے سے لگائے ہوئے اپنے دوست کے گھر  
 دوست نے اسے بڑی راز داری سے بتایا۔ "سرم! امیر زنگی کا لشکر دمشق کے قریب  
 ہے اور اب ایک خونریز جنگ ہو گی۔"

سرم نے اس خبر پر تعجب کا ذرا بھی اظہار نہ کیا۔ اس نے بڑے اطمینان سے  
 "جنگ ہی ان تمام جھگڑوں کا علاج ہے میرے دوست!"

"مگر سرم! تم نے یہ غور نہیں کیا کہ امیر زنگی تمہارے جگہ وزیر اعظم کو قتل  
 یروٹلم کے لشکروں کا تعاون حاصل ہے۔" اس کا دوست بڑا فکر مند تھا۔ "انتظامیہ  
 یروٹلم کے لشکر دمشق کے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ امیر زنگی کو ایک نہیں

سرم گھر سے امیر زنگی کے پاس جانے کے لئے نکلا تھا مگر باہر آتے ہی اس میں ایک اور خیال آیا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ کسی طرح قبیلہ زناطہ اور احداث سے ملاقات کر لے تو اس سے وزیر اعظم کی جنگی تیاریوں کی تازہ خبریں مل سکیں گی زنگی کے لئے یقیناً مفید ثابت ہوں گی۔ لہذا اس بات کی تصدیق کر دی تھی کہ قبیلوں کی ہمدردیاں اب تک ملکہ کے ساتھ ہیں۔ پس سرم نے امیر زنگی کی طرف سے پہلے ہمدرد قبائل سرداروں سے ملاقات ضروری سمجھی۔

قدرت کو منظور ہو تو مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے۔ سرم فقیر کی صورت سڑک پر کھڑا آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اسے احداث کا سردار آتا دکھا سردار اکیلا تھا اور شاہی محل کی طرف آ رہا تھا۔ شاید وزیر اعظم نے اسے صبح ہی رخصت کیا تھا۔ ممکن ہے اسے جنگی معاملات میں مشورے کے لئے طلب کیا ہو یا پھر دہ نئے بادشاہ کے انتخاب کے معاملے میں مشورہ کرنے بلایا ہو۔ مجید الدین آہق کے بعد دمشق کا تخت خالی ہو گیا تھا۔ ملکہ مادر بھی غائب تھیں۔ ملکہ کا کوئی دوسرا بیٹا بھی نہ تھا کہ اسے بادشاہ بنایا جاتا۔ شاہی خاندان کے مختلف شہزادوں کے نام زیر غور تھے۔ وزیر دراصل کسی ایسے کٹھ پتلی شہزادے کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا جسے وہ پوری طرح قابو رکھ سکے اور اس کے انتخاب پر لشکر کے تمام سردار بھی متفق ہوں۔

سرم جس جگہ پر کھڑا تھا وہاں لوگوں کی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ اس نے ادھر دیکھا۔ سامنے سڑک کا موڑ تھا۔ وہاں آمدورفت بھی کم تھی۔ سرم راستہ کاٹ کر پہنچ گیا۔ اس جگہ ایک نالے پر چھوٹی سی پلانی ہوئی تھی۔ سرم وہیں جم کر کھڑا احداث سردار بڑا فکر مند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے گھوڑے کی رفتار نہ ہونے لگی تھی۔ ذرا دیر میں سردار پلایا کے پاس پہنچ گیا۔

”قبیلہ احداث کا بامدار سردار زندہ و سلامت رہے۔“ سرم نے دو قدم آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

سردار نے چونک کر گھوڑا روک لیا پھر اس نے مشکوک نظروں سے فقیر کو دیکھا۔ سرم نے آگے پیچھے نظر دوڑائی پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا۔ ”سردار مجھ سے کبچے میں آپ ہی کا آدمی ہوں۔ امیر زنگی کے پاس جا رہا ہوں۔ کوئی پیغام ہو تو بلا دوں گا۔“

احداث سردار چونک پڑا۔ اس کا شک حیرت میں بدل گیا۔ ”سردار جلدی کبچے۔ وزیر اعظم کا جاسوس آپ کے پیچھے آ رہا ہے۔ مجھے خبرات اور پیغام بھی۔“ اور سرم نے ایک بھرپور نحو مستانہ لگایا۔ دمشق میں فقیر ہاتھ دھو کر گھر لگاتے تھے۔

احداث سردار نے سنبھل کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ ”امیر سے کہنا ہم اور زناطہ والے ہر وقت کے لئے تیار ہیں۔“ اور سردار نے ایک سکہ سرم کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”ملکہ مادر کے متعلق کوئی اطلاع؟“ سرم نے سکہ ہتھیلی میں دباتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ خیریت سے ہیں۔ وزیر اعظم کے جاسوسوں کی وجہ سے میں انہیں نہیں بھیج سکا۔ ہر کوئی انتظام کریں تو میں ملکہ اور شہزادی کو ساتھ بھیج دوں گا۔“ احداث سردار نے گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ دی اور آگے بڑھ گیا۔

سرم وہیں کھڑے ہو کر وزیر اعظم کے جاسوس کا انتظار کرتا رہا جو کچھ فاصلہ رکھ کر احداث سردار کا تعاقب کر رہا تھا۔ سرم نے جاسوس سے بھی صدا لگائی مگر وہ اپنی دھن میں تھا اور بغیر توجہ دے آگے نکل گیا۔

☆☆☆☆☆

قدیم جنگوں کے دور میں جب کسی ملک سے لشکر روانہ ہوتا تو اس کے ساتھ دکاندار بھی اپنا سامان لے کر چل پڑتے تھے، جہاں جہاں لشکر خیمے لگاتا وہاں دم کے دم میں بازار لگ جاتے اور لشکری ضروریات کا سامان خریدتے تھے۔ بعض روایتوں کے مطابق جنگ پر ہانے والے لشکروں کے اوپر خونخوار اور مراد گوشت کھانے والے گدھ بھی منڈلاتے رہتے۔ ان پرندوں کو اپنی کسی پوشیدہ حس کے ذریعے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ لشکر میدان جنگ کی طرف جا رہا ہے جہاں جنگ ہو گی اور وہ آسانی سے اپنی غذا حاصل کر سکیں گے۔ لشکر کے پڑاؤ کے پاس سے جب کوئی قافلہ گزرتا تو وہ اپنا سامان لے کر پڑاؤ میں آ جاتا اور کالے بچے پر سامان فروخت کرتا تھا۔ اس طرح لشکر کے ساتھ ایک پورا شہر رواں دواں رہتا تھا۔

سرم جب دمشق سے باہر نکلا تو دور دور تک خیموں کا ایک شہر پھیلا ہوا تھا۔ قلعے کے اندر تو لشکر تھا ہی لیکن قلعے کے باہر بھی فوجی دستے مورچے جمائے بیٹھے تھے۔ اس کے آگے لٹاکا، برہم اور دمشق کا ایک مشترکہ لشکر تھا، جس کی تعداد سرم کے اندازے کے مطابق پچاس ہزار سے بھی اوپر تھی۔ سرم فقیر بنا ہوا تھا۔ اس لئے اسے کسی نے نہ روکا اور وہ دست سوال بڑھاتا اور نعرے لگاتا ہوا دن بھر پیدل سفر کرتا رہا۔ شام کے وقت وہ دمشق کے سرحدی پہرے داروں کے پاس پہنچا اور کچھ کھا پی کر وہیں پڑا رہا۔ یہیں سے اسے دست معلوم ہو گئی جہاں امیر زنگی اپنے جیالوں کے خیمے لگائے ہوئے تھا۔ امیر زنگی کے لشکر میں اسد الدین ضرور ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت جب امیر موصل سے چلا تو اس نے

اسد الدین کے بڑے بھائی نجم الدین ایوب کو بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ نجم الدین ایوب وہ مبارک باپ تھا، جس کے گھر صلاح الدین ایوبی پیدا ہوا تھا۔ چونکہ نجم الدین ایوب ایک موقع پر امیر زنگی کو اپنے قلعے میں پناہ دی تھی۔ اس لئے امیر زنگی اپنے محسن بڑی جنگوں میں ساتھ نہ لے جاتا تھا۔ ایوب کی بجائے وہ اسد الدین کو ساتھ رکھتا جنکو یہ طبعیت، وفاداری اور دیو قاسمی نے امیر کے دل میں گھر کر لیا تھا۔

دوسرے دن سرم پھر روانہ ہوا اور شام کے وقت امیر زنگی کی خیمہ گاہ میں یہاں پہنچتے ہی اس نے اپنا چولا بدل لیا اور اب وہ سردار سرم تھا جو اسد الدین ایوب امیر زنگی کا بھی محبوب نظر تھا۔ امیر زنگی اور اسد الدین نے سرم کو دیکھ کر جس کا اظہار کیا اس کا بیان مشکل ہے۔ اسد الدین کو اپنے دوست کے زندہ بچ جانے کی خوشی تو امیر زنگی اس لئے مسرور تھا کہ سرم دمشق سے آ رہا تھا جہاں اس کی ملکہ اور بیٹی تھیں۔ امیر زنگی کا رابطہ دمشق سے بالکل کٹا ہوا تھا۔ اسے مسلمانوں اور عیسائیوں مشترکہ لشکروں کی تعداد کے بارے میں بھی صحیح اطلاعات نہ تھیں اور وہ دمشق کے پہنچنے کے باوجود جنگ شروع کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ امیر نے دیکھا کہ سرم بہت اہم ہے۔ اس لئے اس نے پہلے سرم کو آرام کرنے کا حکم دیا۔ اسد الدین نے بھی اسے چھوڑ دیا۔ حالانکہ وہ دمشق کے حالات معلوم کرنے کے لئے بہت بے قرار تھا۔

اس رات سرم پوری نیند سویا اور جب صبح کو اٹھا تو بڑا جاق و چوبند تھا۔ وہ جلدی تیار ہو کر سیدھا اسد الدین کے پاس پہنچا۔ اسد الدین نے اٹھ کر اسے گلے "سرم! تمہاری کمی بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ امیر تمہارے بارے میں سے روز پوچھتے ہیں۔ دراصل حالات کچھ اس منہ پر ہیں کہ امیر تذبذب میں پڑ گئے ہیں "امیر زنگی کا تذبذب بجا ہے سردار!" سرم نے متانت سے جواب دیا۔ "جس قدر اس وقت دمشق کے اندر اور باہر موجود ہے۔ اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ باتیں تو امیر کے سامنے ہوں گی۔ آپ کچھ اپنی سنائیے۔"

"میرے حالات بدستور ہیں۔ امیر کی شفقتیں مجھ پر روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں۔" اسد الدین نے مسکرا کر جواب دیا۔ "اس دفعہ امیر بڑے جلال میں ہیں۔ معین الدین ایوب فریب نے انہیں دکھاتا ہوا انگارہ بنا دیا ہے۔ دمشق کی خیر نظر نہیں آتی۔"

سرم کچھ سوچنے لگا۔ اسد الدین کو اس کی خاموشی سے الجھن ہونے لگی۔ "سرم چپ ہو گئے۔ کیا میری بات ناگوار گزری۔ میرا مطلب امیر کے معاملات میں دخل دینا نہیں پھر وہ کسی کا کہنا مانتے ہی کب ہیں؟"

"میں اس لئے خاموش نہیں ہوں سردار!" سرم نے فکر مند انداز میں کہا۔ "میں نے اسے عرض کیا تاکہ معین الدین انز نے اپنی مدافعت کے ایسے انتظامات کئے ہیں کہ ان کی فیل تک پہنچنا بہت مشکل ہو گا۔"

نجم الدین ایوب مشورہ ہے کہ تم اپنی بات کا اظہار اس انداز میں نہ کرنا جیسے مجھ سے کہہ رہے ہو۔ اسد الدین نے سرم کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "امیر کی تہ مزاجی سے شاید تم یہ نہیں ہو۔ وہ اپنی رائے کے خلاف ایک لفظ سننا پسند نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں کہ میں ہوتا ہے۔ خواہ انہیں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑے۔"

"سردار! آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے پہلے ہی آگاہ کر دیا ورنہ شاید میں کوئی غلطی کرتا۔" سرم نے اسد الدین کو شکر گزار نظروں سے دیکھا۔

وہاں کی گفتگو میں سنجیدگی اور خشکی پیدا ہو گئی تھی۔ اسد الدین نے اسے ختم کرتے ہوئے کہا۔ "سرم! کچھ اپنی شہزادی کے بارے میں بتاؤ۔ تمہاری کنیز لقا نے بتایا تھا کہ اسے براہ کرم کے آدمیوں نے گرفتار کر لیا ہے اور تم اس کی تلاش میں شاہی محل چھوڑ گئے۔"

"لقا نے سچ کہا تھا سردار!" سرم نے سرد آہ کے ساتھ جواب دیا۔ "شہزادی اب تک اسد الدین کے قبضے میں ہے مگر امید ہے کہ اسے بہت جلد آزاد کرا لیا جائے گا۔"

"کیا تم شہزادی سے مل چکے ہو؟" اسد الدین نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں سردار! میں اب تک اس کے دیدار سے محروم ہوں۔" سرم نے ایک اور سرد جواب دیا۔

"مجھے تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے سرم!" ... اور اسد الدین کو ہنسی آگئی۔

"سردار! آپ میرے محسن اور آقا ہیں۔ ہنسی اڑا لیجئے میری۔ خدا کرے کہ کسی پر ایسا عذاب وقت نہ پڑے۔"

"میں تم پر نہیں ہنس رہا ہوں سرم!" اسد الدین نے بات بتائی۔ "مجھے تو اس بات پر یقین تھا کہ تم شہزادی سے ملے بھی نہیں مگر تمہیں اس کی رہائی کا اس قدر یقین بھی ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟"

"یہ یقین مجھے لقا نے دلایا ہے سردار!" سرم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "لقا کبھی اسے نہیں بولتی اور پھر۔۔۔"

"تم کچھ کہنا چاہتے تھے سرم! شاید تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں رہا۔" اسد الدین نے اس کی خاموشی کو دیکھ کر کہا۔

"نہیں سرم! میں اب تک اس کے دیدار سے محروم ہوں۔" سرم نے ایک اور سرد جواب دیا۔

"مجھے تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے سرم!" ... اور اسد الدین کو ہنسی آگئی۔

"سردار! آپ میرے محسن اور آقا ہیں۔ ہنسی اڑا لیجئے میری۔ خدا کرے کہ کسی پر ایسا عذاب وقت نہ پڑے۔"

"میں تم پر نہیں ہنس رہا ہوں سرم!" اسد الدین نے بات بتائی۔ "مجھے تو اس بات پر یقین تھا کہ تم شہزادی سے ملے بھی نہیں مگر تمہیں اس کی رہائی کا اس قدر یقین بھی ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟"

"یہ یقین مجھے لقا نے دلایا ہے سردار!" سرم نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "لقا کبھی اسے نہیں بولتی اور پھر۔۔۔"

"تم کچھ کہنا چاہتے تھے سرم! شاید تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں رہا۔" اسد الدین نے اس کی خاموشی کو دیکھ کر کہا۔



”ایسا نہ کہئے سردار! خدا مجھے اس دن موت دے دے، جب میرا اعتبار کچھ اٹھ جائے۔“ سرم فوراً سنجیدہ ہو گیا۔ ”دراصل بات کچھ ایسی ہے جسے کہتے ہو محسوس ہوتی ہے۔ پتہ نہیں، آپ کیا سوچیں؟“

”مجھ سے شرم آتی ہے تو مت کہو۔ میں کوئی گلہ نہ کروں گا۔۔۔“ اسد الدین نے اس میں اب بھی تھنی تھنی۔

”اب تو ضرور کہوں گا سردار!“ سرم نے ارادہ بدل دیا۔ ”سردار! دراصل محسوس ہوتا ہے کہ لقا مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔ حالانکہ میں کوئی ایسا خوب جوان نہیں کہ ہر عورت مجھے دیکھتے ہی فریفتہ ہو جائے۔“

اسد الدین مسکرایا۔ ”لقا تم سے محبت کرنے لگی ہے۔ اس بارے میں تو میرے رائے محفوظ رکھتا ہوں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ تمہاری شکل و صورت ایسی ضرور تھیں چاہا جائے مگر یہ بات غور کرنے کے قابل ضرور ہے کہ لقا جب تم سے محبت کرے تو اس نے شہزادی کی رہائی کی خوش خبری کیوں سنائی۔ کیا اسے یہ نہیں معلوم کہ تم کی شہزادی جینالو کے پرستار ہو اور تمہارے کہنے کے مطابق شہزادی جینالو حسن و جمال لاثانی ہے؟“

”وہ سب کچھ جانتی ہے سردار مگر اس نے مجھے شہزادی سے ملانے کی امید دلائی۔“ خیر سرم! یہ تمہارا مسئلہ ہے اور اسے تم خود ہی منشاؤ گے مگر اس قول کو ضرور رکھنا کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں رہ سکتیں۔“ اسد الدین نے ایک بزرگانہ انداز میں کہا۔

”توبہ کیجئے سردار! میں ایسی غلطی نہیں کر سکتا۔ لقا کی میں عزت ضرور کرتا ہوں۔ کی خدمات کا بھی قائل ہوں مگر یقین کیجئے کہ مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ محبت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ سرم نے صاف صاف کہہ دیا۔

امیر زنگی بڑی بے چینی سے سرم کا انتظار کر رہا تھا۔ سرم اور اسد الدین اس کے میں داخل ہوئے تو ان کے گھٹتے ہی امیر زنگی نے سوال کیا۔ ”سرم! پہلے ہمیں اپنی شہزادی اور ملکہ زمرہ خانم کی خیریت سے آگاہ کرو۔“

”امیر عالی مقام! جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ شہزادی اور ملکہ زمرہ خانم اور احوال کی پناہ میں ہیں اور دونوں آپ کو پہنچنے کے لئے بے قرار ہیں۔“ سرم نے پورے یقین سے کہا۔

”شکر ہے خداوند!“ اور امیر زنگی نے اوپر کی طرف دیکھا۔ ”سرم! کیا تم نے

”امیر عالی!“ میں بد قسمتی سے اب تک ملکہ اور شہزادی کے حضور میں نہ پہنچ سکا۔“

”میں نے سنبھل کر کہا۔“ ہماری ایک کنیز لقا جو آپ کے پاس ملکہ کا پیغام لے کر حاضر ہوئی۔ ملکہ کی خدمت پر اب تک مامور ہے اور اسی نے مجھے یہ خبر دی ہے۔“

”میر زنگی فکر میں ڈوب گیا۔“

اسد الدین اور سرم سر جھکائے بیٹھے تھے۔ کسی میں بولنے کی ہمت نہ تھی۔ امیر زنگی خاموشی طویل کھینچتی جا رہی تھی۔ بڑے انتظار کے بعد امیر نے سر اٹھایا۔ ”سرم! میں نے جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ معین الدین کو اپنے لشکر کے علاوہ یروٹلم اور ان کے چالیس ہزار لشکر کا تعاون حاصل ہے۔ اس میں کس حد تک حقیقت ہے؟“

سرم کو اسی سوال کا ڈر تھا لیکن امیر زنگی نے یہ بات جاسوسوں کے حوالے سے پوچھی۔ اسد الدین نے بھی اسے سمجھا دیا تھا۔ اس لئے اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”امیر! یہ شہزادی اور دور اندیشی کے سامنے بڑے سے بڑے لشکر کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جاسوسوں نے وزیر اعظم کے لشکر کا جو اندازہ لگایا ہے۔ ان کی تعداد اسے بھی زیادہ ہے مگر فتح امیر کا مقدر ہے۔ امیر انشاء اللہ کامیاب اور کامران ہو کر لوٹ جائیں گے۔“

امیر کی پیشانی پر فکر و تردد کی لہریں کچھ اور گہری ہو گئیں۔ اس نے اسد الدین کی طرف دیکھا۔ سوائے سرم اور اسد الدین کے امیر زنگی کے خیمے میں اور کوئی موجود نہ تھا۔ اسد الدین! تم نے سنا کہ شہزادی اور ملکہ زمرہ خانم دمشق میں موجود ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ اس وقت محفوظ ہاتھوں میں ہیں لیکن کل کا کسی کو پتہ نہیں۔ ملکہ کے ہمدرد کی کیا وقت دھوکا دے سکتے ہیں اس صورت میں شہزادی اور ملکہ دونوں معین الدین کے ہاتھوں میں ہوں گی اور وہ ہم سے اپنی شرائط پر صلح کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”عالی مقام امیر!“ اسد الدین نے فوراً جواب دیا۔ ”معین الدین جیسے بدطنہت و کلمہ بات بید نہیں ہے۔ ملکہ عالیہ کے ہمدرد قبائل پر اعتماد کرنا بھی عقل مندی نہیں ہے۔ سخت دباؤ یا لالچ ان کے قدم ڈمگ سکتا ہے۔ یہ میرا اپنا ذاتی خیال ہے امیر! ورنہ میں اسے صرف حکم کے منتظر رہتا ہوں۔ مصلحتوں پر نظر رکھنا ہمارا کام نہیں۔“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اسد الدین!“ پھر امیر نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”ہمیں

سرم گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس خیال سے اس کے دل کو سخت صدمہ ہوا مگر وہ بہت عورت تھی۔ سرم سے ناامید ہو کر لقا اپنی سہیلی حنا کے پاس پہنچی۔ حنا اس کی سہیلی تھی جس سے لقا اپنے دل کا حال کہہ دیا کرتی تھی۔ حنا بھی لقا پر اتنا ہی اعتماد رکھتی تھی اور اس کی کوئی بات لقا سے چھپی نہ تھی۔ لقا رات کے وقت حنا کے پاس پہنچی۔ حنا نے لقا کو دیکھا تو بھونچکی رہ گئی۔

”اے! یہ تم ہو۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا۔“ حنا حیران نظروں سے لقا کو دیکھ رہی تھی۔

”اب تو تمہیں یقین آیا ہے کہ میں لقا ہوں۔“ لقا دودھ سے لپٹ گئی۔

”مگر تمہارے بارے میں تو مشہور ہے کہ تم ملکہ مادر کے ساتھ موصول پہنچ گئی ہو؟“ حنا کسی طرح کم نہ ہو رہی تھی۔

”اس کی تفصیل میں پھر کبھی بتاؤں گی۔“ لقا نے جلدی سے کہا۔ ”اس وقت میں بے پاس ایک خاص کام سے آئی ہوں اور تمہیں یہ میرا کام کرنا ہو گا۔“

”میری پیاری لقا! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ تمہارا کام... اور میں نہ کروں۔ حکم دو تو میں اس کے لئے وزیر اعظم معین الدین کو بھی قتل کر سکتی ہوں۔“ اور حنا ہنسنے لگی۔

”تمہاری تو محبت ہے جو مجھے تیرے پاس بے دھڑک کھینچ لائی ہے۔“ لقا نے محبت سے لے بیٹھا۔ ”تو جانتی ہے کہ وزیر اعظم اس وقت ملکہ اور دنگی شہزادی کے خون کا او رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ملکہ کے چند ہمدرد سرداروں نے انہیں ہلاک کر رکھا ہے۔ اگر اسے علم ہو جائے کہ لقا تمہارے پاس ہے تو وہ ہم دونوں کو پھانسی دے گا۔“

”اس ظالم کو تو خدا ہی عارت کرے گا۔“ حنا نے بڑے دکھ سے کہا۔ ”شاہ کا خون کرنا میری ذمہ داری ہے۔ خدا ہی اس سے سمجھے گا۔“

”خدا ظالم کو ڈھیل دیتا ہے لیکن اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہے۔ معین الدین ضرور ہلاک ہو جائے گا۔“ لقا نے بھی انز کو کوس کر اپنا دل ہلکا کیا۔

”ہاں! تم نے وہ کام تو بتایا ہی نہیں؟“ حنا نے خود ہی لقا کو یاد دلایا۔

”ہاں! تم آج کل قید خانے میں کام کر رہی ہو نا؟“

”ہاں! مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”قل سے دل کو راہ ہوتی ہے۔“ لقا مسکرائی۔ ”جس قیدی شہزادی کی خدمت پر تم کو کچھ اس کے بارے میں بتاؤ۔“

امیر شاید پہلی مرتبہ اس قدر فکر مند ہوا تھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد نے کہا۔ ”سرم! ہمارا خیال ہے کہ تمہارا دمشق میں رہنا ضروری ہے۔ ملکہ زہرا تمہاری کسی وقت... ضرورت پڑ سکتی ہے۔“

”جو ارشاد عالی ہو امیر!“ سرم نے سرخم کر دیا۔ ”میرا یہاں آنے کا مقصد مرزا کہ امیر کو دمشق کے حالات سے باخبر کروں۔ میں آج ہی واپس چلا جاؤں گا امیر!۔“

”ہمیں امید ہے کہ تم ملکہ اور شہزادی کا سارا بوجھ اور بہتر حالات ہوں تو اس جہنم سے نکالنے کی کوشش کرو گے۔ ہم نے دمشق کو نہ پہلے تباہ کرنے کی کوشش کی تھی اور نہ اب ہم حملہ کریں گے لیکن ہمارا لشکر دمشق کے قریب اس وقت تک خیر رہے گا جب تک ہم امید اور ناامیدی کی دلدل سے باہر نہیں نکلتے۔ ہم پھر اعلان ہیں کہ دمشق کی تباہی ہمارا مقصد نہیں ہے لیکن اگر معین الدین نے شہزادی یا ملکہ خانم کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو قسم ہے وعدہ لا شریک کی ہم دمشق کی فیصلہ ایک ایک اینٹ اکھاڑ کر پھینک دیں گے۔“ اس کے ساتھ ہی امیر دنگی نے تلوار باندھ نکال کر سر سے اوپر بلند کی۔ امیر دنگی یہ عمل اس وقت کرتا تھا جب وہ اہم فیصلہ کرتا تھا۔

اسد الدین سمجھ گیا کہ یہ امیر دنگی کا اعلان جنگ ہے اور اگر معین الدین نے دنگی اور ملکہ کو کسی قسم کی تکلیف دی تو پھر جنگ ناگزیر ہو جائے گی۔ خواہ اس میں وہ پورا لشکر تباہ ہو کر رہ جائے۔ اسد الدین نے بھی فوراً اپنی تلوار بلند کی۔ ان کی دیکھی سرم بھی تلوار بے نیام کر کے ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

امیر نے اسد الدین کو مخاطب کیا۔ ”اسد الدین! سرم کو اکیلے دمشق کا محاصرہ ہے۔ اسے رقم کی ضرورت ہوگی جس قدر مناسب سمجھو، رقم اس کے ساتھ کر دو۔“

مشکل کام کو آسان بنا دیتی ہے۔

سرم خوش خوشی امیر کے خیمے سے واپس آیا۔ اسد الدین نے اس کے لئے ایک تیار کرایا اور اس پر لاتعداد دینار سے بھری ہوئی تھیلیاں بار کر دیں پھر دونوں دوست دوسرے سے رخصت ہوئے۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

ادھر لقا سخت پریشان تھی۔ سرم دوسری شام بھی اس سے ملنے کیوں نہیں آئی دوسری اور تیسری شام کو بھی وہ سرم سے ملنے گئی مگر اسے ناامیدی ہوئی پھر اسے خیال

حاکم سے ملتا واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ ملکہ، نیرود خانم اور زنگی شہزادی کی ہائی کراؤ تھا کہ فطری اور اخلاقی فرض تھا مگر وہ انطاکیہ کی شہزادی اور سرم کو ملانے کے لیے بھی سرزد کو شش کر رہی تھی۔ اس کی وجہ خود اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ سرم اپنی شہزادی کو پا کر اسے بالکل بھول جائے گا۔ اس کے باوجود وہ شہزادی کو سے رہائی دلانے کے لئے در در بھاگ رہی تھی۔ وہ رات اس نے بڑی بے چینی سے سرم اسے بار بار یاد آ رہا تھا اور وہ سرم سے فوراً ملنا چاہتی تھی۔ حنا نے اسے رات دن بلایا تھا تاکہ وہ اسے اپنے ساتھ قید خانے لے چلے اور شہزادی کے راز سے اس کے گھر نہ ہونے اور شام ہوتے ہی اس جگہ پر پہنچ گئی جہاں اس نے اسے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ لٹاکم و بیش روز اس جگہ کا چکر لگاتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ایک دن ایک دن وہاں ضرور آئے گا۔

☆☆☆☆☆

سرم رات کے وقت دوست کے گھر پہنچا۔ وہ رات بھر امیر زنگی سے اپنی ملاقات کی بات بتاتا رہا۔ اس کا دوست بھی دلچسپی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ اس دن سرم بڑا بے فکر دن اسے آہستہ آہستہ سرکنا محسوس ہو رہا تھا۔ بڑی مشکل سے شام ہوئی اور وہ لٹاکم کے لئے نکل پڑا۔ وہ امید و بیم میں گرفتار تھا۔ خوف اس بات کا تھا کہ کیس لٹاکم کی طرف سے واپس نہ ہو گئی ہو مگر دل اسے سہارا دے رہا تھا۔ لٹاکم کی محبت بھری باتوں اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ لٹاکم اگر اس سے محبت کرتی ہے تو اس میں بڑا خلوص ہے۔ لٹاکم نے بغیر کسی لالچ کے سرم کو اپنی خدمات پیش کی تھیں۔

سرم حیران رہ گیا جب اس نے لٹاکم کو اپنا خنجر پایا۔ ”سرم تم کہاں چلے گئے تھے تمہارا رکتہ کرتے میری آنکھیں۔“

”میں تم سے شرمندہ ہوں لٹاکم!“ سرم نے عاجزی سے لٹاکم کی بات کاٹی۔ ”تمہیں یہ سن ڈنڈا ہو کہ امیر زنگی کا لشکر دمشق کے نواح میں پہنچ چکا ہے۔“

”کیا جگہ؟“ اور لٹاکم کا چہرہ گلاب رنگ ہو گیا۔

”میں خود امیر کی خدمت میں گیا تھا۔ اسی وجہ سے تم سے ملنے نہ آ سکا۔“ سرم خواہ مخواہ گرا رہا۔

”تو تم ہی اچھا ہوا۔ امیر کے کیا ارادے ہیں۔ کیا جنگ کے شعلے بلند ہوں گے؟“ لٹاکم اس سے پوچھا۔

”قیدی نہیں لٹاکم! وہ تو وزیر اعظم کی مہمان ہے۔ غریب مصیبت کی ماری معلوم ہے۔ یرو عظم میں کچھ شہزادے اس کے دشمن ہو گئے تھے اسلئے۔“

”یہ پرانی باتیں ہیں حنا!“ لٹاکم نے بات کاٹی۔ ”میرا خیال ہے کہ یرو عظم کی یہ انطاکیہ کی شہزادی ہے۔“

حنا دنگ رہ گئی۔ ”یہ تمہیں کس نے بتایا۔ کیا تم شہزادی سے مل چکی ہو؟“

”نہیں حنا! میں ملی نہیں ہوں مگر اب ملنا چاہتی ہوں۔“ لٹاکم نے سر اٹھا کر یرو عظم کو خیالوں میں ڈوبا پایا۔

”واہ ری تیری محبت۔“ لٹاکم نے اسے جھنجھوڑا۔ ”میں بات کر رہی ہوں اور جانے کس کے خیال میں کھوٹی ہوئی ہے۔“

”لٹاکم! تمہارا یہ کہنا کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔“ حنا اپنے خیالوں میں کم قمری نے لٹاکم کی پہلی بات سنی ہی نہیں تھی۔ ”شہزادی میری دوست بن گئی ہے۔ تم جانتی میری ماں یرو عظم کی رہنے والی تھی۔ ایک دن میں نے باتوں باتوں میں شہزادی سے کے بارے میں پوچھا تو وہ گھبرا گئی اور بات ٹالنے لگی۔ جب میں نے بہت زور دیا تو کہ اس کی پرورش شاہی محل میں ہوئی ہے۔ اس لئے وہ یرو عظم کے محلوں اور شاہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ بھلا بتاؤ لٹاکم! یہ کیا بات ہوئی۔ کیا شہزادیاں اپنے بڑے بڑے محلوں اور سرکوں کا نام۔۔۔ نہیں جانتیں۔“

”تو پھر یوں سمجھو حنا بہن کہ میرا کہنا سو فیصد ٹھیک ہے۔ پیاری بہن! مجھے سے ایک بار ملا دو۔“ لٹاکم نے خوشامد کی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ شاہی قید خانے میں بن کر رہنے والی انطاکیہ ہی کی شہزادی ہے۔

”اس میں کیا مشکل ہے لٹاکم؟ کل تم میرے ساتھ چلنا۔ میں تمہیں اپنی بہن ملاقات کرا دوں گی۔ صدر دروازے پر جتنے پہرے دار ہیں، وہ اپنے جاننے والے ہیں تمہیں جانتے ہوں گے۔“

لٹاکم چونک پڑی۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو حنا؟ اگر ان میں سے کسی نے مجھے پہچان اعظم کو اطلاع کر دی تو میرے ساتھ تم بھی کبھی کبھی پھرو گی۔“

”ایسا نہیں ہو گا لٹاکم!“ حنا نے ہنس کر کہا۔ ”وہاں جتنے بھی غلام اور کنیز ہیں کے سب وزیر اعظم کے خلاف ہیں اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں گی معین الدین ان دن انہی غلاموں کے ہاتھ سے مارا جائے گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو لٹاکم! میں ذمے دار ہوں۔“

سرم کی ہی امیر مومل سے مل کر آئے ہیں۔ امیر آپ کے بہت شکر گزار ہیں اور اس اہم ذمہ داری سے بکدوش کرنا چاہتے ہیں۔" ملکہ نے سرم کو ایک عرصے بعد نادار اس سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھیں لیکن اس کا موقع ہی نہ ملا۔

سرداروں نے سرم کی طرف دیکھا جیسے وہ اس کی رائے معلوم کرنا چاہتے ہوں۔ سرم ناشائستگیوں میں چپے ہوئے سوال کو سمجھ گیا۔ "سرداران عالی وقار! امیر محترم نے اپنی جان کو پیار و محبت کا پیام دیا ہے۔ امیر آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اپنی جان نہ کرتے ہوئے یہ اہم ذمہ داری قبول کی لیکن اب وہ چاہتے ہیں کہ ملکہ مادر اور رانی کو ان کے پاس بھیج دیا جائے۔"

تم خود مل سے یہی چاہتے ہیں سرم! زناطہ کے سردار نے کہا۔ "لیکن دمشق کے طرف لنگر پھیلا ہوا ہے۔ ملکہ مادر کو کس طرح بھیجا جاسکتا ہے؟"

امیر مومل نے یہ ذمہ داری میرے سپرد کی ہے سردار! سرم کا لہجہ بڑا پر جوش تھا۔ پشائی مہمانوں کو سادہ لباس میں کارواں سرائے تک پہنچائیں تو عین نوازش ہو لے سے ایک قافلہ شمال کی طرف جانے والا ہے۔ میں نے قافلہ سالار سے بات کر لی اور ذکی شترادی اس قافلے کے ساتھ دمشق سے نکل جائیں گی۔"

مجھے کوئی اعتراض نہیں سرم! سردار نے کہا۔ "مگر یہ خیال رہے کہ اگر مل کو کوئی نقصان پہنچا تو خدا ہم سب کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

سردار! زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آپ فکر نہ کیجئے۔" سرم نے مطمئن کر دیا۔

سرداروں نے ملکہ اور ذکی شترادی کو بڑی خاموشی سے سرائے میں پہنچا دیا۔ قافلہ سردار کو یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ دمشق میں جنگ شروع ہونے والی ہے وہ اپنی بیوی اور بہن کو دمشق سے باہر بھیج رہا ہے۔ سرم نے اس خدمت میں قافلہ سردار کو ایک معقول رقم بھی پیش کی تھی۔ قافلوں کی آمد رفت جنگ کے لیے بھی جاری رہتی تھی۔ جس لشکر کی حد سے قافلے گزرتے تھے۔ وہ لشکر ان اپنا سردار سے حفاظت کے ساتھ پار کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ قافلہ صبح کو روانہ ہوا اور قافلے انہیں آنسوؤں اور آہوں کے ساتھ رخصت کیا۔ سرم اور لقا شترادی کو چھڑانے کے لئے دمشق میں رک گئے تھے۔

اس دن لقا اپنی سہیلی حنا کے ساتھ قید خانے پہنچی۔ لقا نے حنا کو باہر چھوڑ دیا اور حنا کے کمرے میں داخل ہوئی۔ شترادی خیالوں میں کھوئی ہوئی دروازے کی طرف

"شاید نہیں!" سرم کی مسکراہٹ میں کوئی کمی نہ ہو رہی تھی۔ "امیر نے مجھے یہ ہے کہ زناطہ اور احوال کے سرداروں سے مل کر ذکی شترادی اور ملکہ مادر کو بھلا نکالنے کی کوشش کروں۔"

"اور اپنی انتظامیہ کی شترادی کو کیا یہیں قید رہنے دو گے؟" اب لقا کے مسکراتے باری تھی۔

"لقا! تم واقعی عظیم ہو۔ میرے دامن میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے دے کر تمہارے احسان کا بدلہ چکا سکوں۔" سرم بہت جذباتی ہو رہا تھا۔

"سردار! بعض کام ایسے ہوتے ہیں جن میں صلے کا تصور بھی گناہ ہوتا ہے۔" سرم نے بھی جذبات سے بھر گیا۔ "مجھے یقین ہے کہ میں شترادی کو آپ تک پہنچاؤں گا۔"

کامیاب ہو جاؤں گی۔۔۔ پھر جب شترادی کو دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں خوشی کے جھریں کھلیں گے وہی میری محنت کا صلہ ہو گا۔ اس کے سہارے میں اپنی زندگی گزار دوں گی۔"

سرم کو لقا کی باتیں بڑی حیرت انگیز معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کا جذبہ احسان مندی سے جھکا جا رہا تھا۔ "خدا تمہیں کامیاب کرے لقا!" سرم کی آنکھیں کسی نامعلوم جذبے سے چمک اٹھی تھیں۔ "میں سرداروں سے مل کر انہیں امیر کا پناہ پہنچاؤں گا۔ بشرطیکہ ان تک صحیح سلامت پہنچ گیا۔"

"تم فکر نہ کرو سرم! لقا اس سے باتیں کرتے وقت کبھی تم اور کبھی آپ سے غلط کرتی۔ جب محبت کا جذبہ جوش مارتا تو وہ سرم کو تم کہہ کر مخاطب کرتی مگر جب اس کے ایک معزز سردار ہونے کا احساس ہوتا تو فوراً اسے آپ کے الفاظ سے مخاطب کر لیتی۔" سرم! میں تمہاری ملاقات خود سرداروں سے کراؤں گی اور ممکن ہے کہ ملکہ کے سامنے ہو۔"

"لقا... کیا...؟" اور سرم شدت جذبات سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

دوسری شب لقا نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس نے ملکہ مادر سے کہہ کر زناطہ اور احوال کے قبیلے کے سرداروں کو حویلی میں بلوا لیا۔ تخت و تاج کے یہ دونوں وفادار ملکہ مادر کی طرف سے بہت فکر مند تھے۔ معین الدین انہیں قبر آلود نظروں سے دیکھتا تھا۔ چونکہ دمشق کے حالات خراب تھے اور امیر ذکی کا کسی وقت بھی حملہ ہو سکتا تھا۔

لے لئے معین الدین خاموش تھا۔ وزنہ اب تک اس نے ملکہ کو ڈھونڈ نکالا ہوتا۔ ملکہ خانم سرداروں سے گفتگو کر رہی تھی کہ لقا، سرم کو لے کر آگئی۔ سرم کو سردار پہنچاتے تھے۔

نے عمر آخری عشرے کا چاند کسی وقت بھی بادلوں کی اوٹ سے اپنا چہرہ دکھا سکتا تھا۔  
سوارِ انقلاب کے لشکر کے تھے جو اتفاقاً ادھر نکل آئے تھے۔ انہوں نے تین  
دول کو آتے دیکھا تو اپنے گھوڑے اس طرف بوڑ دئے اور پیڑوں کے جھنڈ کے پاس آ

دکھن ہے۔ باہر آ جاؤ، ورنہ ... ایک سوار نے حکم دیا۔

اس کے ساتھ ہی جھنڈ میں چپے ہوئے تینوں سوار گھوڑوں کو ایڑ دے کر دوسری سمت  
پلے۔ انقلاب کے سواروں نے بھی اپنے گھوڑے ان کے پیچھے ڈال دئے۔ گھوڑے  
پچھے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ چاند بادلوں سے نکلتا تو تھوڑی سی روشنی پھیل جاتی اور  
گہرے ہل چاند کو چھپا لیتے تو ہر طرف گہک اندیرا پھیل جاتا اور گھوڑوں کی دوڑ  
اندھے میں بھی جاری رہتی۔ نہ کسی کو وقت کا پتہ تھا اور نہ سمت کا اندازہ۔ بھاگنے  
بھاگ رہے تھے اور چھپا کرنے والے ان کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔  
ہام میں نقاب کرنے والوں نے اپنے ترکش سنبالے۔ تیر کمانوں میں جڑے اور کئی  
بک ساتھ ہوا کا سینہ چرتے ہوئے بھاگنے والوں کی طرف بڑھے۔ ان تیروں میں سے  
نیم پر تھا کا نام لکھا تھا اور آخر یہ خونی تیر بھاگتی ہوئی شہزادی جینالو کی پشت میں  
ت ہو گیا۔ شہزادی نے یقیناً "تیر کی ہلاکت خیزی کا اندازہ لگا لیا ہو گا مگر اس نے نہ کوئی  
لڑی اور نہ گھوڑے کو روکا۔ اس کا گھوڑا سرم اور لقا کے درمیان پہلے کی طرح بھاگ  
لا اور لقا، سرم کو یہ خبر بھی نہ ہو سکی کہ شہزادی پر کیا قیامت گزر گئی ہے۔

نقاب کرنے والوں آخر تک آ کر اپنے گھوڑے گھما کر جدھر سے آئے تھے ادھر  
ہو گئے۔ سرم نے بھی تھوڑی دیر بعد گھوڑے کی رفتار کم کر دی۔ شہزادی اور لقا کے  
سے بھی آہستہ آہستہ ہوتے ہوتے رک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس منہوس صبح کا  
آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ گھوڑا رکتے ہی سرم کی نظر شہزادی پر پڑی۔ شہزادی نے  
سے کی گردن پر اپنا سر رکھ دیا تھا اور پشت میں جھپا ہوا تیر صاف نظر آ رہا تھا۔  
ا کا بہتا ہوا خون کپڑوں کو گلگلوں کرتا ہوا رکاب تک پہنچ گیا تھا۔ سرم چیخ مار کر  
سے اترا۔ لقا نے بھی واقعہ کی سنگینی کا اندازہ کر لیا تھا۔ دونوں نے کوشش کر کے  
لا کر رکب سے آزاد کر کے فرش خاکی پر لٹا دیا۔

میں! یہ کیا ہو گیا؟" سرم بدحواسی کے عالم میں چلایا۔ لقا اس کے قریب کھڑی  
لائے رہی تھی۔

سرم! اپنا سر میرے قریب لاؤ۔" شہزادی نے کوشش کر کے آنکھیں کھولیں۔

پشت کئے بیٹھی تھی۔ اندھیری رات کافی بھگ چکی تھی لیکن شہزادی اب تک نہ سوئی  
"اے انقلاب کے شہزادی! کینز آپ کو سلام پیش کرتی ہے۔" لقا نے شہزادی کو  
دیا۔

شہزادی نے پلٹ کر لقا کو دیکھا۔ "تم ... تم کون ہو؟" شہزادی کے ہونٹ ٹوڑ  
حیرت سے لرزے لگے۔

"میں آپ کی دوست ہوں شہزادی جینالو۔" لقا نے اسے اور زیادہ حیران کر  
کوشش کی۔

"لیکن ... میں ... میں ... شہزادی کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔

"شہزادی آپ انکار نہ کیجئے۔ آپ کا سرم قید خانے کی دیوار سے لگا کھڑا ہے۔"  
کا انتظار کر رہا ہے۔"

"مگر تم میری ہمدردی کیوں کر رہی ہو؟" شہزادی کی آنکھوں میں شبہ کے سائے  
لگے۔

"میں آپ کے لئے نہیں بلکہ یہ سب کچھ سرم کے لئے کر رہی ہوں۔"

"سرم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" شہزادی مطمئن نہیں ہو رہی تھی۔

"یہ باتوں کا وقت نہیں ہے۔ اگر آپ شہزادی جینالو نہیں ہیں تو میں واپس  
ہوں۔" لقا نے شہزادی کی طرف پشت کر کے یہ ظاہر کیا جیسے وہ واقعی واپس جا رہی ہے۔

"ٹھہرو!" شہزادی نے اسے روکا۔ "اے نیک خاتون مجھے سچ بتا دو کہ کیسے ذرا  
مجھے قتل تو نہیں کرنا چاہتا؟"

"شہزادی مجھ پر اعتبار کیجئے۔ میں مسلمان ہوں اور خدا کی قسم کھاتی ہوں۔ آپ  
ساتھ کوئی دھوکا نہیں ہو رہا ہے۔"

شہزادی جینالو کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے کوئی اور سوال نہیں کیا اور لقا کے ساتھ  
لگی۔ قید خانے کی دیوار کے ساتھ ریٹم کی ایک ٹی ہوئی سیڑھی لٹک رہی تھی۔

اشارے پر پہلے شہزادی سیڑھی کے ذریعے دیوار کے اوپر پہنچی پھر لقا اوپر آ گئی۔  
ساتھ ہی تین گھوڑے آہستہ آہستہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ایک پر سرم

پر لقا اور تیسرے ... گھوڑے پر شہزادی جینالو سوار تھی۔ سرم نے انتہائی محفوظ راستہ  
کیا تھا۔ اس راستے کو اس نے دن میں کئی بار خوب دیکھا بھالا تھا۔ مگر جب یہ

راستے کے آخری سرے پر پہنچے تو نہ جانے کدھر سے چار پانچ سوار ادھر آ نکلے۔  
جلدی سے اپنا گھوڑا پیڑوں کی آڑ میں کر لیا۔ رات اندھیری تھی۔ آسمان پر ہل

”مرنے سے پہلے میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتی ہوں۔“  
 سرم اس کی پشت سے تیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا ہاتھ روک کر شہزادی  
 گیا۔ ”جینا! خود کو سنبھالو۔ میں تیر نکال لوں گا۔“ سرم نے بے بسی سے کہا۔  
 ”کوشش بیکار ہے سرم! میری بات سنو۔ لقا کہاں ہے؟“  
 لقا اور سرم نے اپنے سر شہزادی کے سینے سے لگا دئے۔  
 ”لقا! میری آنکھوں میں بھری محبت اپنی آنکھوں میں جذب کر لو۔“ شہزادی۔  
 ایک کر کہا۔

”شہزادی آپ اچھی ہو جائیں گی۔“ لقا کی آنکھیں برسنے لگی تھیں۔  
 ”وعدہ کرو لقا! سرم کو میری نظروں سے دیکھو گی۔“ شہزادی کی آنکھیں بند  
 رہی تھیں۔

”جینا!“ سرم نے بے چین ہو کر اپنے لرزتے لب شہزادی کی پیشانی پر رکھ د۔  
 شہزادی کے لب ذرا بھی حرکت نہ کر سکے۔ وہ تو قید زندگی سے آزاد ہو گئی  
 نے سرم کو دیکھا اور سرم نے لقا کو ... پھر وہ دونوں حج مار کر ایک دوسرے سے ہلا

## سنہرے بال

یہ قافلہ آج ہی دمشق سے ہعلبک پہنچا تھا۔ سفر کے دوران جعفر نے کئی بار کوشش کی  
 سنہرے بالوں والی اس لڑکی سے بات کرے جو ایک بوڑھے کے ساتھ سفر کر رہی  
 لڑکی کے پاس صرف ایک گھوڑا تھا جس پر اس نے بوڑھے کو سوار کیا تھا اور خود  
 سے ہعلبک تک پینتیس میل کا فاصلہ پیدل طے کیا تھا۔ بوڑھا شاید بیمار تھا۔ .....  
 کوڑے پر بیٹھا بھی نہ جا رہا تھا۔ بوڑھے کے بدن پر ایک سفید لانا چوہا تھا اور  
 لگاے میں ایک چھوٹی سی صلیب پڑی ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں  
 ہیں۔ جعفر اسی لئے اس سے گفتگو کرتے جھجک رہا تھا۔

سنہرے بالوں والی لڑکی نے ہعلبک کی کارواں سرائے میں پہنچتے ہی بوڑھے کو ایک  
 ہالٹا دیا اور خود اس کی تیمار داری میں لگ گئی۔ جعفر کے دل میں تجسس بھی تھا اور  
 لگاے توڑا سا پیار بھی پیدا ہو گیا تھا مگر اسی کے ساتھ شک و شبہ کی ایک لہر بھی  
 لہان کے پردوں سے نکلنے لگی تھی۔ یوں جب بھی جعفر کی نظر اس سے ٹکراتی  
 ہو کر ہوتا جاتا اور تبسم اس کے ہونٹوں پر کھل اٹھتا مگر یہ جعفر کا وہم بھی ہو سکتا  
 لگاے جعفر نے موقع ملنے کے باوجود راستے میں اس سے کوئی بات نہ کی۔

یہ وہ نہیں کہ یہ قافلہ کہاں سے شروع ہوا تھا اور اس کی آخری منزل کہاں تھی؟  
 اس قافلے میں دمشق اور ہعلبک کے سفر کے دوران شامل ہو ا تھا جب کہ یہ لڑکی  
 نے پہلے سے موجود تھی۔ جعفر نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ دمشق سے آرہی ہو

میں ہر بوڑھے پر جھکی سرگوشیاں کر رہی تھی۔

جعفر کے دل میں ایک بار پھر وسوسے پیدا ہوئے۔ ہعلبک کے راستے میں بھی کئی فقیر لڑکی کو لے تھے اور لڑکی نے اسی طرح بے تکلفی سے ان سے باتیں کی تھیں۔ جعفر یہ کہہ کر اپنے دل کو مطمئن کر لیا تھا کہ لڑکی غریب ہونے کے باوجود سخی طبیعت کی ہے اور کسی فقیر کو مایوس نہیں کرتی لیکن اس وقت وہ لڑکی اور فقیر کی گفتگو کے انداز پریشان ہو گیا تھا۔ جعفر اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک بار پھر اس کی نظر لڑکی کی طرف گئی۔ لڑکی اس کو دیکھ رہی تھی۔ جعفر کو یوں محسوس ہوا جیسے لڑکی مسکرا رہی ہے اور ہاتھوں میں انگلیاں پھیر کر دوسرے ہاتھ سے کچھ اشارہ کر رہی ہے۔ جعفر کے دل میں لدی سی پیدا ہوئی مگر وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ لڑکی کے اشارے کا مطلب کیا ہے۔ اس نے اس طرف نظریں دوڑائیں۔ ہر مسافر کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا تھا۔

جعفر نے اب تک سفر کا گرد آلود لباس بھی تبدیل نہ کیا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا وہ کپڑے بدل کر لڑکی کے پاس جائے گا اور اس بوڑھے کی مزاج پر سی کے ہانے لڑکی باتیں کرے گا۔ اس کا خیال تھا کہ بوڑھا یا تو لڑکی کا باپ ہے یا پھر دادا ہو سکتا ہے۔ جب کپڑے تبدیل کر کے سرائے کی کوٹھری کے باہر آیا تو سترے بالوں والی لڑکی اس کی چارپائی کے پاس موجود نہ تھی۔ جعفر نے گھبرا کر ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ وہ لڑکی کے دروازے پر کھڑی اس طرف دیکھ رہی تھی جہاں کچھ دیر پہلے جعفر بیٹھا ہوا تھا۔ لڑکی سے ایک آواز سی۔

”جعفر ہمت سے کام لے، وہ تجھے ہی ڈھونڈ رہی ہے۔“ دل کی اس آواز کے ساتھ اس کے قدم خود بخود سرائے کے گیٹ کی طرف اٹھنے لگے۔ لڑکی اس وقت گیٹ کے باہر جا رہی تھی۔ جعفر بڑی تیزی سے گیٹ پر پہنچ گیا۔ گیٹ کے باہر تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ چاند سے بالوں میں چھپ گیا تھا۔ ہعلبک اپنے محل وقوع۔ عبادت گاہوں اور آثار قدیمہ کی طرف مشہور ہے۔ یہ شروادی بکاع میں سطح سمندر سے چار ہزار فٹ بلندی پر واقع ہے۔ شام کا سرد ترین شہر ہے۔ جعفر کے لئے یہ شہر نیا نہ تھا۔ وہ ہعلبک کئی بار آچکا تھا اور اس وجہ سے موصول کے امیر زنگی نے اسے یہاں بھیجا تھا۔

ملا الدین زنگی صرف بہادر ہی نہ تھا بلکہ ایک اعلیٰ دماغ سیاست داں اور منجھا ہوا لڑکائی تھا۔ امراء سے لے کر اس کے خاص غلام تک اس سے ہر وقت خوفزدہ رہتے۔ دشمن کے معاملے میں معین الدین انزلی کے ساتھ جو شاطرانہ چال چلی تھی اسے اس کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ وہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ معین الدین انزلی کی چال

کی پھر جب۔ ہعلبک پہنچ کر لڑکی نے بوڑھے کا بستر سرائے میں لگا دیا تو جعفر کے دل دھچکا سا لگا۔ جعفر کو ہعلبک تک ہی آنا تھا اور ابھی اس نے اس لڑکی سے ایک بات کی تھی جس کی محبت اس کے دل میں آہستہ آہستہ گھر کرتی جا رہی تھی۔ آخر فیصلہ کیا کہ وہ بھی آج کی رات سرائے میں گزارے گا اور اگر لڑکی نے ذرا بھی اس سے ضرور گفتگو کرے گا۔

تاجر کسی بھی مذہب و ملت سے تعلق رکھتے ہوں مگر ان کا مفاد مشترک ہونا پہلے تاجر ہوتے ہیں بعد میں کچھ اور، وہ راستے میں اس قدر کھل مل کے گفتگو کر رہے تھے، جیسے ایک ملک ایک قوم اور ایک خاندان کے افراد ہوں لیکن سرائے ہی وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ قافلے میں مسلمان اور عیسائی تاجروں تقریباً برابر تھے۔ عیسائیوں نے اپنا سامان مشرقی حصے میں اتارا جب کہ مسلمان سرائے کا مغربی حصہ پسند کیا تھا مگر سرائے کے یہ دونوں حصے اتنے دور بھی نہ۔ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں اگر ایک حصے میں کوئی زور سے بولتا تو اس کی آواز حصے میں صاف سنائی دیتی تھی۔

سرائے میں رات کا کھانا تیار ہو رہا تھا مگر جعفر ہر طرف سے بے پردا ہو کر حصے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ سترے بالوں والی لڑکی بوڑھے پر جھکی ہوئی تھی اور سرگوشیوں میں اسے کچھ سمجھا رہی تھی۔ وقفے وقفے سے وہ گردن اٹھا کر اپنے ادا دیکھتی جاتی۔ اس دیکھ بھال میں ایک دفعہ اس کی نظریں جعفر سے چار ہو گئیں کب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ لڑکی کا دل زور سے دھڑکا اور چہرہ گلگلوں ہو گیا پھر شا نے کھانسی کر یا کھوت بدل کر لڑکی کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ لڑکی کے چہرے پر تاثر پیدا ہوا اور اس نے چارپائی پر پڑے بوڑھے کو اس طرح تھپکا جیسے ماں ہے مگر اس نے جعفر کی طرف سے اپنی نظریں ایک لمحے کے لئے بھی نہ پھیریں۔ پھر اسی وقت ایک فقیر لڑکی کے پاس نمودار ہوا۔ جعفر چونکہ مسلسل لڑکی رہا تھا اس لئے وہ اندازہ نہ کر سکا کہ فقیر کس طرف سے آیا ہے۔ فقیر کو دیکھتے جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اب اس کی پیٹھ جعفر کی طرف تھی۔ لڑکی نے فقیر کو کچھ نے بھی اپنی جھولی سے کچھ نکال کر لڑکی کو دیا۔ جعفر کو معلوم نہ ہو سکا کہ لڑکی اور فقیر سے کیا لیا۔ اس نے تو صرف یہ دیکھا کہ لڑکی فقیر سے مسلسل باتیں کر رہی تھی وہ جھک کر بوڑھے سے کچھ کہتی پھر سیدھی ہو کر فقیر سے باتیں کرنے منٹ کے بعد فقیر وہاں سے چلا گیا۔ جعفر نے پھر سترے بالوں والی لڑکی کو دیکھا



ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

جعفر نے یہ عبادت گاہ باہر سے دیکھی تھی۔ عبادت گاہ کے اطراف ایک باغ تھا جو کسی زمانے میں خوب صورت ہو گا مگر اب تو اس کی چاروں طرف ایک بیلٹ مٹی تھی۔ یہ جگہ تھی بڑی پرسکون۔ دو دلوں کے مل بیٹھنے کے لئے اس سے بہتر جگہ مشکل ہی سے مل سکتی تھی۔

الٹی ہو گئی اور امیر زنگی اپنی بیٹی اور بیوی زمرہ خانم کو ساتھ لے کر دمشق سے واپس آیا۔ امیر نے انطاکیہ کی شہزادی جینالو اور سرم کو زنگی شہزادی اور زمرہ خانم کے ہاتھوں سے بیاہر دیا تھا مگر خود واپس جانے کی سبب بجائے دمشق سے دو منزل دور شہر کا تو دمشق کے مرد آہن معین الدین انز نے جس عیسائی لشکر کو امیر زنگی پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا وہ امیر زنگی کو سرحد پر نہ پا کر واپس ہو گیا تھا۔ عیسائی لشکر میں اتنی جرات نہ تھی کہ وہ امیر زنگی کا تعاقب کرتا۔ ان کے لئے تو یہی غنیمت تھا کہ امیر زنگی موصل پہنچ گیا تھا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ امیر زنگی دمشق سے صرف دو منزل دور زخمی شیر کی طرف زخم چاٹ رہا ہے اور معین الدین انز پر ایک ایسا حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہے جس کا کسی کو گمان نہ ہو سکتا تھا۔

امیر زنگی نے موصل سے کمک منگائی تھی۔ اس نے موصل میں اپنے نائب امیر زنگی کو حکم دیا تھا کہ وہ اپنے بھتیجے جعفر کو فوراً امیر کے پاس بھیج دے۔ دراصل امیر کی نظریں اس وقت بعلبک پر لگی تھیں۔ بعلبک معین الدین انز کی جاگیر تھی اور امیر دمشق کا بدلہ بعلبک سے لینا چاہتا تھا لیکن بعلبک کا رخ کرنے سے پہلے وہ وہاں حالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس کام کے لئے امیر کے پاس اسد الدین موجود تھا لیکن زنگی اب اس سے جاسوسی کرانے کی بجائے اس کی جنگی صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ بعلبک میں جاسوسی کے لئے اس نے جعفر کو بلایا تھا۔ جعفر بلا کا شاطر اور ایک کامیاب جاسوس تھا بعلبک کا علاقہ بھی جعفر کا دیکھا بھلا تھا۔ اسی لئے امیر زنگی نے جعفر کو بھیجا تھا۔

جعفر اس علاقے سے اتنا واقف تھا کہ اگر اندھیری رات ہوتی تو بھی وہ صحیح سمت جاسکتا تھا۔ اس وقت چاند بادلوں کی اوٹ میں تھا اور تھوڑا بہت اجالا پھیلا ہوا تھا مگر جعفر یہ بھی یقین تھا کہ سہرے بالوں والی لڑکی نے اسے خود دعوت ملاقات دی ہے اگر وہاں پہنچنے کا بھی تو لڑکی اس کی مدد کو آجائے گی۔ خوش قسمتی سے اسی وقت چاند بادلوں سے آگیا اور دور دور تک روشنی پھیل گئی۔ جعفر نے سامنے نظریں دوڑائیں تو اسے دور ایک ہیولا سا حرکت کرتا معلوم ہوا۔ ”یہ وہی سہرے بالوں والی ہو سکتی ہے۔“ اور جعفر نے تیزی سے اس کی طرف اٹھنے لگے۔

شہر میں بے شمار عبادت گاہیں تھیں۔ لڑکی کا رخ ایک عبادت گاہ کی طرف تھا۔ انیتوئیس کی بنوائی ہوئی ایک عبادت گاہ تھی۔ یہ عظیم عبادت گاہ انیتوئیس کے زمانے میں شام کی سب سے بڑی اور بارونق عبادت گاہ ہوتی تھی مگر اب اس کی حالت خستہ تھی۔



ایک ٹھنڈی سانس لے کر چپ ہو گئی۔

”کیوں۔ کوئی خاص وجہ ہے اس کی؟“

”تم میرے پیپا کی حالت نہیں دیکھتے؟ وہ سفر کرنے کے قابل نہیں ہیں۔“ ترن نے افسردگی سے جواب دیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم تعلیم میں قیام کرو گی؟“

”ہاں۔ اس وقت تک جب تک کہ پیپا چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو جائے۔ کوڑی نے کچھ ایسی نظروں سے جعفر کو دیکھا کہ وہ بے چین ہو گیا۔

”میں بھی فی الحال آگے نہیں جاؤں گا۔“ جعفر نے مضبوط لہجے میں کہا۔  
”مگر کیوں۔ تمہارا قافلہ تو صبح روانہ ہو جائے گا۔“ ترن کوڑی کے سوال میں کم آہنی تھی۔

”قافلے آتے جاتے رہتے ہیں مگر لیا وقت اور ایسی دلفریب گھڑیاں زندگی میں آتی ہیں۔“ جعفر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”کوڑی تم نے مجھے حوصلہ دے کر اپنا زندگی کا احساس دلایا ہے۔ میں ان لمحات کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔“

”تم حطب نہ پہنچے تو تمہارے گھروالے ضرور پریشان ہوں گے۔“ اور ترن کوڑی اپنی نظریں جعفر کے چہرے پر گاڑ دیں۔

”مجھے اس کی زیادہ فکر نہیں۔ گھربانے اور گھربانے کے بارے میں آج سے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“

”جعفر۔ تمہاری صاف گوئی مجھے پسند آئی۔“ ترن کوڑی نے کھلے دل سے کہا۔  
مجھے پسند ہو جعفر۔ مگر میری زندگی ایک بگولے کی مانند ہے جو کسی ایک مقام پر نہیں ٹہ

پیپا کی بیماری کے علاوہ غربت نے مجھے کئی اور الجھنوں میں پھنسا دیا ہے۔ آج رات زندگی کی وہ رات ہے جسے میں تمہاری پر غلوص قربت میں گزارنا چاہتی تھی مگر میں تمہا قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتی۔“

”کوڑی۔ اگر تم مجھ پر اعتماد کرو تو میں تمہارا سارا بن سکتا ہوں۔“ جعفر نے اپنے کا حال اس کے سامنے کھول کے رکھ دیا۔

”جعفر۔۔۔“ ترن کوڑی نے قہر قہراتی آواز میں کہا۔ ”یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ ہم اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھ گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس میں غلطی میری۔

مجھے تم سے اتنا بے تکلف نہ ہونا چاہیے۔“  
”اس میں غلطی تمہاری ہے نہ میری ہے کوڑی۔“ جعفر جذبات کی رو میں بہہ رہا

مل دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ چند لمحے پہلے ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ مگر اب۔۔۔ ایک الگ مذہبوں سے تعلق رکھتے تھے مگر چند لمحوں میں ہم تمام بندھن توڑ کر قریب آ گئے ہیں کہ برسوں کے دوست اور شناسا معلوم ہوتے ہیں۔ پھر کیوں نہ اس رشتے کو ایک بڑے اور مضبوط رشتے میں پرو دیں تاکہ ہمیشہ کے لئے ایک جان دو ہو جائیں۔“

”جعفر۔ میں ایک کمزور لڑکی ہوں۔ ایک نازک شاخ ہوں۔ اسے اس طرح جھٹکانا کہ یہ درخت سے الگ ہو جائے۔ بے شک تمہاری باتوں میں محبت کی چاشنی اور غلوص مک ہے۔ تمہارے سینے میں ایک چاہنے والا دل موجود ہے اور تم اس قابل ہو کہ میں چلا جاؤں مگر جعفر۔ زندگی کی تلخیاں اور حقیقتیں محبت کے نرم گرم پانیوں میں نہیں ڈال کر نہیں۔ پھر میں پیپا کی بیماری کے دوران تو اس مسئلے پر غور کر ہی نہیں سکتی۔“

”میں نہیں مجبور نہیں کر رہا ہوں کوڑی۔ بے شک تم اپنے پیپا کو صحت مند ہو لینے میں اس وقت تک انتظار کر لوں گا۔ لوگ تو ایک موہوم امید پر پوری زندگی گزار دیتے

تاکہ جب کہ مجھے تو یہ احساس ہے کہ تمہارا دل میرے دل کے ساتھ دھڑکتا ہے۔“  
”میں تمہارے جذبے کی قدر کرتی ہوں جعفر۔“ ترن کوڑی نے جھجکے ہوئے کہا۔

بلکہ یہ کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ تم میرے لئے اپنا سفر کھوٹا کرو۔ پتہ نہیں پیپا کب تباہ ہوں۔ اس میں دو چار ماہ بھی لگ سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بہتر ہو گا کہ تم ال سے مل کر واپس آ جاؤ۔ ممکن ہے کہ اس وقت تک حالات درست ہو جائیں اور ہم

نہا کے لئے کوئی فیصلہ کر سکیں۔“ جعفر نے ہنسنے سے منع کرنے کے لئے کہا۔ ”یہ بتاؤ کہ اہلبک میں کہاں ٹھہرو گی؟“

”میں۔۔۔“ ترن کوڑی کچھ پریشان ہو گئی۔ ”میرا ٹھکانہ عبادت گاہ کے سوا اور کہاں ہو سکتا ہے؟“

”اہلبک میں بہت سی عبادت گاہیں ہیں۔ تمہارے پیپا کو کہاں زیادہ آرام مل سکتا ہے؟“ جعفر اس کا ٹھکانہ معلوم کرنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ ”سب سے بڑی عبادت

گاہ تو شاید یہی ہے جس کے باغ میں ہم بیٹھے ہیں۔ تم یہاں سے واقف بھی ہو۔“  
”جعفر۔ میں جانتی ہوں کہ تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟“ ترن کوڑی نے جواب دیا۔

”میں اس عبادت گاہ میں پناہ لوں لیکن میں یہ مناسب نہیں سمجھتی کہ تم مجھ سے

لے لو۔ پیپا شاید اس بات کو پسند نہ کریں۔ میں اپنی طرف سے انہیں کوئی دکھ نہیں دینا

چاہتی۔“

”میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں کوزی۔“ جعفر پر افسردگی چھا گئی۔ ”مگر کیا یہ ظاہر ہے کہ ہم ایک شہر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کو بھی ترس جائیں۔ ترن کوزی نے مسکرا کر جعفر کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ جعفر کے وجود میں سی دوڑنے لگیں۔ پھر اس پر ایک خواب کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ”ترن کوزی وقت میرے دل کی جو حالت ہے تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔“

”میں تمہاری بے چینی محسوس کر رہی ہوں جعفر۔“ ترن کوزی بھی جذباتی ہوئی۔ اس نے ہوش کا دامن نہ چھوڑا۔ لطیف لہجے میں بولی۔ ”میرے لئے بھی تم سے مشکل ہو گا۔ میں خود تم سے ملنے آؤں گی۔ تم مجھے اپنا پتہ بتاؤ۔ جب مجھے فرصت ملے گی تم مجھے اپنے قریب پاؤں گے۔“

جعفر کے لئے اب جرح کی گنجائش نہ رہ گئی تھی۔ اسے کہنا پڑا۔ ”میں ایک ہوں کوزی اور مسافروں کا ٹھکانہ سرائے ہی میں ہوتا ہے۔“

چاند اور بادلوں میں اکھیلیاں ہو رہی تھیں کبھی اندھیرا کبھی اجالا۔ سرد ہونے والے دنوں کو پکپکائے دے رہے تھے مگر ان کی باتیں ختم ہونے کو نہ آتی تھیں۔ موقع پر باتیں بے ربط بلکہ بے فکری ہوتی ہیں۔ وہ بھی ایسی ہی باتوں کے سہارے اُلتے بھڑکتے جذبات کو تسکین دے رہے تھے اور وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا۔

☆☆☆☆☆

جعفر صبح دیر سے سو کر اٹھا۔ جب وہ ترن کوزی کے پاس مسرت بھرے لمحات گزارا اٹھا تو سویرا ہونے والا تھا۔ وقت کے اس قدر تیزی سے گزر جانے کا اسے بے حد افسوس تھا۔ مگر وقت کب کسی کی پروا کرتا ہے یا کسی کے روکے سے رکتا ہے۔ رات کا خفا بھی اس کی آنکھوں میں موجود تھا اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اجڑے ہوئے کے ایک کونے میں وہ ترن کوزی کے پاس بیٹھا اس کی زلفوں سے کھیل رہا ہے۔ پھر کوزی نے اس سے کہا۔ ”جعفر صبح ہونے والی ہے اب تم واپس جاؤ۔“

اور جعفر نے جواب دیا تھا۔ ”کیا تم ساتھ نہ چلو گی؟“

ترن کوزی مسکرا دی تھی۔ ”عقل سے کام لو جعفر۔ ہم دونوں ایک ساتھ سرائے واپس گئے تو لوگ کیا کہیں گے۔ پاپا کو معلوم ہو گیا تو وہ آفت کھڑی کر دیں گے۔“

”پھر کب ملاقات ہو گی؟“ جعفر نے بڑی افسردگی سے پوچھا تھا۔

”جب قسمت ملائے۔“ ترن کوزی کے لبوں پر دل فریب تبسم کھیل رہا تھا۔ ”پریشان نہ ہو۔ میں دو تین دن بعد آؤں گی۔“

”میرا“

”میں ضرور آؤں گی۔“

جعفر نے اس کا آخری بار محبت سے ہاتھ دیا اور پھر تھکے تھکے قدموں سے سرائے سے اُٹھا۔ سرائے والے جاگ چکے تھے۔ قافلے کے ساتھ جانے والے مسافر اپنا سامان لے کر رہے تھے۔ جعفر نے آتے ہی سرائے کے ملازم سے کہہ دیا تھا کہ اسے آگے نہیں جانے دے۔ اس لئے اسے نہ جگایا جائے۔ پھر تو وہ گھوڑے بیچ کے سو گیا تھا اور اب جو آنکھ لگ رہی تھی اسے نہ جگایا جائے۔ جعفر شب گزشتہ کی ملاقات کا تصور لئے اپنی کونجری سے اُٹھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کا قافلہ روانہ ہو چکا تھا۔ مشرق اور مغرب کے درمیان گئے خالی ہو چکے تھے۔ جعفر کا خیال تھا کہ وہ صبح ترن کوزی کا ایک بار پھر دیدار کر لے گا کیونکہ اسے بھی بھلیک میں ٹھہرنا تھا اور اپنے پیپا کو ساتھ لے کر کسی عبادت گاہ میں لے جاتا تھا۔ اس کے لئے وقت درکار تھا مگر ترن کوزی اور اس کے پیپا بھی کہیں جا چکے تھے۔

کس ترن کوزی اسے دھوکا دے کر قافلے کے ساتھ ہی نہ چلی گئی ہو۔ جعفر کا دل بے جا کڑکھاتا تھا۔ قافلے کے ساتھ جانا تو صاف کہہ دیتی۔ نہ تو اسے روک سکتا تھا اور نہ جانے پر مجبور رہتا تھا۔ تیرا اس پر زور ہی کیا تھا۔ اس نے بڑی صاف دلی سے بتایا تھا کہ وہ پیپا کی دکان کی دج سے کچھ دن بھلیک میں ٹھہرے گی۔ پھر اس پر شک کیوں کرتا ہے۔ کیا تو نے اپنی آنکھوں میں اپنی محبت کی چمک نہ دیکھ تھی؟ یقیناً وہ تجھ سے زیادہ محتاط لڑکی ہے۔ اس نے تجھے پہلے سرائے بھیجا تھا۔

جعفر نے سر کو جھکا دے کر اپنے آپ کو خیالات سے آزاد کیا۔ اب اسے اپنے اصل خیال کی طرف توجہ دینی تھی۔ اسے امیر زنگی نے اسے بھلیک بھیجا تھا اور وہ یہاں آتے ہی ترن کوزی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا مگر اس میں اس بے چارے کا کیا قصور تھا۔ محبت کا دل نہیں لگ جاتا ہے بغیر کسی خیال اور بلا کسی ارادے کے۔ اس محبت کے ڈھنگ بھی ایسا ہوتا ہے۔ اس کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی نہ یہ کسی اصول اور قاعدے کی پابند ہے۔ محبت کبھی آنکھیں ملانے سے ہوتی ہے تو کبھی آنکھیں چرانے سے بھی دل کا غنچہ کھل جاتا ہے۔ یہ کالے گورے مذہب و ملت کو نہ خاطر میں لاتی ہے اور نہ موقع محل

دیکھتی ہے۔

یہ کیا تک تھی کہ جعفر نے ترن کوڑی کو دیکھا اور پھر دیکھتے ہی محبت ہوئی نہ پہچان۔ نہ باتیں نہ ملاقاتیں پھر ایک مسلمان دوسری عیسائی۔ وقت بھی کساک کا پاپا بستر مرگ پر اور جعفر امیر زنگی جیسے حاکم کے ایک اہم کام پر آیا ہوا تھا۔ دن اور ایک ہی ملاقات میں وہ محبت کی تمام منزلیں طے کر گئے۔ باغ کا گوشہ۔ کمن الزلزلہ۔ بے خوف و خطر سرائے سے نکل کر ویرانے میں آگئی اور جس کی سمجھداری پر امیر زنگی کو بھی ناز تھا۔ وہ ایک بالکل اجنبی لڑکی کے ایک سب کچھ بھول کر اس کے پیچھے دوڑا چلا گیا پھر ان پر محبت کا سحر ایسا سوار ہوا رات باتوں میں گزار دی پھر جب اٹھے تو محبت اور مستقبل کے بڑے بڑے باندھ چکے تھے۔

جعفر نے غسل کیا۔ کپڑے بدلے اور اپنے کام پر چل پڑا۔ اسے علم تھا کہ طرف سے ذرا بھی غفلت ہوئی تو امیر زنگی اسے معاف نہیں کرے گا۔ اسے کام شروع کر دینا تھا مگر درمیان میں محبت آگئی تھی۔ ترن کوڑی کے سہرے اسے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ اسے اپنی زلفوں میں تمام رات باندھے رکھا تھا۔ وقت امیر زنگی کے عتاب کا خیال نہ آیا تھا۔ آیا ہو گا تو اس نے پروا نہ کی ہو گی کا عتاب اپنی جگہ مگر محبت کی جنوں سامانیوں کا کوئی سامنا کر سکتا ہے۔ جعفر سارا تمام رات دربار حسن میں سر جھکائے دنیا کو بھولا رہا۔ عشق اور محبت کی کرشمہ اور کیا تھا۔

جعفر نے ترن کوڑی کے بارے میں صبح ذرا ہی دیر سوچا تھا پھر اس پر امیر طاری ہو گیا تھا اور اب وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ برازق بویہ کے محل کی طرف تھا۔ برازق بعلبک میں دمشق کے وزیر معین الدین انز کی طرف سے گورنر بنا تھا۔ معین الدین نے اپنی اس جاگیر کو برازق کے قبضے میں دے دیا تھا اور برازق سب کچھ تھا۔ یہ شخص بڑا ظالم اور معین الدین انز ہی کی طرح چالاک اور دمشق سے قریب ہونے کی وجہ سے بعلبک کی اور زیادہ اہمیت تھی۔ یہاں کا دمشق جیسا مضبوط نہ تھا تو اس سے کم بھی نہ تھا۔ معین الدین انز اس پر تھا۔ اس نے یہاں باقاعدہ فوجی دستے تعینات کر رکھے تھے۔ قلعے کی برجوں پر انداز پرہہ دیتے تھے۔ جہانگیرہ انز نے یہ سوچ رکھا تھا کہ اگر کبھی قسمت اس گئی اور اسے دمشق سے لٹکنا پڑا تو وہ بعلبک میں پناہ لے گا۔ اس قلعے میں

میں تک مدافعت کر سکتا تھا۔ جب سے شاہ دمشق قتل ہوا تھا بعلبک کی اہمیت

بہت کم تھی۔ قلعہ بعلبک کی مضبوطی کو جعفر نے اس سے پہلے بھی ایک بار جانچا تھا۔ اس وقت برزنجی نے بعلبک پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تھا اور اسی جعفر کو بعلبک کے اندرونی بنی حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔ قلعہ کی فصیلیں کافی بلند تھیں۔ سو سال دے کے باوجود ان کے استحکام میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ فصیلوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک عکہ قائم تھا جس کا کام ہی صرف یہ تھا کہ قلعہ کو مضبوط سے مضبوط تر بنائے۔ دہان طرف کے دروازوں پر ہر سال ایک نیا آہنی پتھر چڑھائے۔ اس طرح دروازوں پر بے چڑھنے ان پر ایک آہنی تہہ جم گئی تھی۔ فوج کی تعداد بھی قلعے میں کم نہ تھی۔ یہ بڑی بات یہ تھی کہ قلعے کے اندر سالان خورد و نوش کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ اگر ہو کہ کسی وقت قلعہ بند ہونا پڑتا تو کم از کم ایک سال تک اسے کسی قسم کی پریشانی

نہی تھی۔ افراد اور گھوڑا ہوا بعلبک کے بڑے بازار میں پہنچا۔ بازار میں چل پھل تھی۔ اسے اطمینان سے خرید و فروخت میں مصروف تھے۔ کسی کے چہرے سے کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ جعفر ایک قوہ خانے میں بیٹھ گیا۔ وہاں بھی ایسی ہی رونق تھی۔ قوہ خانے سے بھرا ہوا تھا۔ جعفر جس بڑی میز پر بیٹھا تھا اس کے گرد کئی کرسیاں پڑی۔ گاہک وہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ جعفر نے ان کی باتوں پر کان لگا دئے۔ گاہک بڑی لالچ سے دنیا جہاں کی باتیں کر رہے تھے۔ جعفر بہت دیر تک وہاں بیٹھا رہا مگر کوئی مفید لالچ کان میں نہیں پڑی۔ بیٹھے بیٹھے جعفر آگیا گیا۔ وہ اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ سامنے بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے ساتھی سے کہا۔

امیر زنگی کا کر نکل گیا ورنہ ہمارے امیر نے ایسا جال بچھایا تھا کہ اسے چھٹی کا دودھ

کیا جال بچھایا تھا امیر نے؟ اس کے ساتھی نے پوچھا۔

اسے تمہیں کچھ پتہ نہیں۔ ہمارے امیر نے یروٹلم سے عیسائی لشکر بلا لیا تھا۔ وہ تو ایک قسمت اچھی تھی ورنہ پورا گھیرے میں آگیا تھا۔ پہلے والے نے ڈیک ماری۔ گھیرنے دو یار۔ امیر زنگی لوہے کا چتا ہے۔ یروٹلم کیا اگر شام کی تمام عیسائی

لشکر لے جائیں تو اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

کر دیا۔ قوے سے فارغ ہو کر جعفر کاؤنٹر پر میجر کے پاس گیا اور اسے باتوں میں تمام معلومات حاصل کر لیں جن کی اسے ضرورت تھی۔ اس نے خود کو حلب کا برکاتہ میجر اس سے بڑے اخلاق سے پیش آیا اور اس سے قوے کے دام بھی لے لئے۔

خانے کے مقابل کوئال شہر کے محل کا وہ حصہ تھا جہاں اس کی رہائش تھی۔ کے نیچے کی طرف دائیں بائیں مسلح فوجی کھڑے اندر جانے والوں کو روک کر کچھ نہ توہ خانے سے محل کا یہ حصہ کافی فاصلے پر تھا مگر جعفر آنے جانے والوں کو دیکھ بیڑیوں کے قریب ایک بند گاڑی کھڑی تھی۔ اس گاڑی کو جعفر نے قوہ خانے ہونے وقت بھی دیکھا تھا اور اب جب کہ وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر قوہ خانے رہا قاتب بھی گاڑی اس جگہ کھڑی تھی۔ جعفر آہستہ آہستہ قاضی کی عدالت کی رہا تھا مگر اس کی نظریں بار بار بند گاڑی کی طرف اٹھ جاتیں۔ اسے تجسس ہوا کہ گاڑی میں کوئال سے لئے کون آیا ہے۔ یہ اہتمام کسی اہم شخصیت ہی کے لئے ہو جعفر نے اپنا تجسس دور کرنے کے لئے ادھر ادھر دیکھا تاکہ کسی گزرنے والے سے لے میں دریافت کرے مگر اس کے قریب کوئی نہ تھا۔ جعفر نے چند لمحے کھڑے ہو لئے والے کا انتظار بھی کیا مگر یہ اتفاق ہی تھا کہ ادھر سے کوئی نہ گزرا۔

غریب آکر آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ اسے بیڑیوں سے ایک خاتون تیزی سے مائی دی۔ خاتون کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا مگر اس کی تیزی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ان لڑکی ہے۔ جعفر ٹھک کر اسے دلچسپی سے دیکھنے لگا۔ اس وقت لڑکی کے بال ہوا تھے سہرے بال۔ جوان لڑکی سہرے بالوں والی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ لڑکی سے چند قدم ادھر بڑھا۔ لڑکی بیڑیاں اتر کر گاڑی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ دروازہ کسی نے کھول دیا اور سہرے بالوں والی لڑکی ایک بچہ کے ساتھ سوار ہو

ترن کوڑی! اور جعفر کا پورا وجود پسینے میں نہا گیا۔ گاڑی لمحوں میں اس کی نظروں تل ہو گئی۔

ی سہرے بال۔ وہی قدو قامت۔ شہادت بھی وہی۔ مگر ترن کوڑی یہاں کیسے پہنچی۔ اچانک مسلمان شہر کوئال سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ مگر۔ مگر۔ جعفر الجھ کر رہ گیا۔ تاکہ وہ ترن کوڑی تھی مگر دوسرے ہی لمحے وہی دل اس کی تردید کر دیتا۔ یہ وہم شکل شہر ہے۔ دنیا میں بہت سی صورتیں ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ سہرے بال تو عام بات

”تم جو چاہو کہہ لو۔ مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ امیر زنگی کو کوئی شکست سکتا۔ قسطنطنیہ کا عیسائی شہنشاہ بڑے زعم سے آیا تھا مگر جب امیر زنگی مقابلے پر کر بھاگ گیا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں نے بھی یہ سنا ہے۔“ یہ ایک تیسرے آدمی کی ”قسطنطنیہ کا شہنشاہ رات کو چھپ کر بھاگا تھا اور اپنی تمام بڑی بڑی منجلیں کے لئے چھوڑ گیا تھا۔“

”یہ سب بکواس ہے۔“ پہلے آدمی کو غصہ آ گیا۔ ”شہنشاہ تو ہمارے بادشاہ کو آیا تھا مگر شاہ نے اس سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ پھر وہ کیوں غصہ کیا۔“

دوسرے کو موقع مل گیا۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”تم شہنشاہ کی تعریف نہیں کر کون کرے گا۔ تمہیں بھی تو قسطنطنیہ کے دربار سے وظیفہ ملتا ہے۔“

اس بات پر ایک زور کا قہقہہ لگا اور بڑھ چڑھ کر باتیں کرنے والا شرمندہ کی گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ جعفر نے بھی اپنی توجہ ادھر سے ہٹالی اور کچھ در خانے سے نکل آیا۔

جعفر اب شہر کوئال برازق بویہ کے محل کی طرف جا رہا تھا۔ یہ محل کیا تھا اندر ایک اور قلعہ تھا۔ یہیں شہر کا قاضی بیٹھتا تھا۔ کوئال کے تمام دفاتر تھے بڑی بڑی بیرکیں بنی ہوئی تھیں۔ بعلبک کی تقریباً نصف فوج اسی محل میں رہتی تھی قاضی کی عدالت ہونے کی وجہ سے گیٹ پر کوئی پہرہ نہ تھا۔ دفتر کے لوگ اندر باہر آ جا رہے تھے۔ جعفر اطمینان سے محل میں داخل ہو گیا۔ ات کاروبار سے کوئی مطلب نہ تھا، سوائے فوجی بیرکوں کے۔ جعفر کو یہ تو معلوم ہو م کوئال نصف فوج اپنے محل میں رکھتا ہے مگر اس نصف فوج کی تعداد کیا تھی چاہتا تھا۔

فوجی بیرکوں کے آتماز میں ایک چھوٹا سا قوہ خانہ تھا۔ جعفر نے اس کے گزرتے ہوئے اندر نظر ڈالی۔ بہت سے آدمی اندر بیٹھے ہوئے تھے۔ جعفر کے مشکل تھا کہ صرف فوجی ہیں یا ان میں غیر فوجی بھی شامل ہیں۔ وہ ایک چکر لگا کے اندر چلا گیا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ ذرا دیر بعد گرم قوے اس کے سامنے رکھ دیا گیا حالانکہ جعفر نے کوئی فرمائش نہ کی تھی۔ جگ سے رہی تھی اور قوے کی خوشبو اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ جعفر نے

ہے۔ انہی خیالوں میں کھویا جعفر سرائے پہنچا۔ اس کے سر میں درد پیدا ہو گیا تو آرام مانگتا تھا۔ جعفر پڑ کے سو گیا پھر جب آنکھ کھلی تو سورج غروب ہو چکا تھا اور روپہلی کرنیں بکھیر رہا تھا۔

جعفر کو ٹھری سے نکل کر سرائے کے مالک کے پاس جا بیٹھا۔ ایسے لوگوں سے کام کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ سرائے کے مالک سے جعفر کو صرف یہ معلوم بعلبک میں یہ افواہ گرم ہے کہ موصل کا امیر زنگی دمشق پر حملہ کرنے آیا تھا مگر سے واپس چلا گیا۔ پتا نہیں کیوں۔ جعفر وہاں سے اٹھ کر سرائے کے اس گوشے ہوا جہاں کل شب اس کی جان تمنا ترن کوزی اپنے پیلا پر جنگی سرگوشیاں کر رہی تھی۔ جعفر ایک نامعلوم کیف سے ترن کوزی۔ سنہرے بالوں والی کوزی۔ جعفر ایک نامعلوم کیف سے ترن کوزی کا دل چاہا کہ وہ ترن کوزی سے ملنے کے لئے انیتوئیس کے عبادت خانے میں اپنے دل کی بے چینیاں اس کے سامنے رکھے۔ مگر کیا یہ ممکن ہی ہوگی۔ کل رات اس کی ترن کوزی سے طویل اور سحر انگیز ملاقات ہوئی تھی۔ پھر کیا پتہ کہ وہ اتر خانے میں ٹھہری ہے یا کسی اور جگہ بعلبک میں تو بے شمار عبادت گاہیں تھیں۔ ترن کوزی نے منع بھی کیا تھا کہ وہ خود اس سے ملنے آئے گی مگر وہ سنہرے بالوں والی وہ۔ کون تھی؟

جعفر تھکے قدموں سے واپس آیا اور کھانا کھا کر پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا طرح گھبرا رہا تھا۔ اسے امیر زنگی کے لئے بھی بہت سے کام کرنے تھے۔ آج رات مکمل کر کے وہ موصل خبر بھیج سکتا تھا لیکن اس سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ وہ تو کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند کیسے آتی۔ پری جمال ترن کوزی کی یاد اسے بار بار پریشان کر پھر کسی طرف سے امیر زنگی کا خوف اس کے دل میں در آیا۔ جعفر چارپائی پر پڑ ہی کانپنے لگا۔ اگلی صبح جب وہ سو کر اٹھا تو ترن کوزی کی جگہ داغ کے خالی خانوں زنگی کا خوف جمع ہو گیا تھا۔

جعفر نے صبح کا ناشتہ بھی نہیں کیا اور اپنے کام پر نکل کھڑا ہوا۔ تمام دن وہ اور ضروری معلومات حاصل کرتا رہا۔ اس نے برازق کے محل کے سنی چکر لگائے تصور میں ترن کوزی کو میزبانیوں سے اترتے دیکھا مگر اس کے قدم کسی جگہ نہ گئے وہ رات کو سرائے واپس آیا تو اس کی معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ جسے ایک ہفتے اکٹھا کرنا مشکل تھا مگر جعفر نے اپنی محنت سے تمام اعداد و شمار اور اطلاعات مزمل کے اندر اندر حاصل کر لی تھیں۔ اسی لئے تو امیر زنگی جعفر کو سب جاسوسوں پر

اہم کام کی ذمہ داری اسی کو سونپتا تھا۔

اہم کام کی ذمہ داری اسی کو سونپتا تھا۔ جب میں امیر کو تمام ضروری معلومات مہیا کر سکتا ہوں۔“ جعفر نے خود کلاہی کے نام کا اور رات کو کھانے کے بعد امیر کو خط لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے کوٹھری کا دروازہ بند کر کے اس کے سامنے ایک چادر بھی کھینچ دی تھی تاکہ روشنی باہر نہ جا سکے۔ اس نے مالک سرائے سے بھی کہہ دیا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اس لئے اس میں بیک نہ کیا جائے۔ امیر زنگی نے جعفر کو بعلبک سے معلومات اکٹھا کرنے ایک ہفتے کا وقت دیا تھا مگر اس نے اپنی ذہانت اور کوشش سے دو ہی دن کے اندر لوٹ حاصل کر لی تھیں۔ جعفر چاہتا تو پانچ دن آرام سے ٹانگیں پھیلا کر سو سکتا تھا مگر نہ جا سکتا تھا کیونکہ امیر زنگی کو ایک ہفتے بعد اپنے خاص قاصد کے ذریعے جعفر کی ہک رپورٹ منگانی تھی۔ جعفر کے لئے حکم تھا کہ وہ اپنی جمع کی ہوئی معلومات کو اہل لکھ کر قاصد کو دے دے اور خود بعلبک میں ٹھہرا رہے مگر جعفر پر جب کام کا اٹھا تو وہ ایک منٹ کو چین سے نہ بیٹھتا تھا۔ اس نے اپنا کام ختم کر لیا تھا اس لئے لکھنے بیٹھ گیا اور ایک ایک بات اس قدر تفصیل سے لکھی کہ صبح ہو گئی۔ اب وہ قاصد اگر ترن کوزی سے نہیں تو کم از کم تصور میں اس کے ہولے سے خوش رہتا تھا۔ اس کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا اور دل ہی دل میں بچے ہوئے پانچ کرنے کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ اس عرصے میں وہ دمشق بھی جا سکتا تھا نا کوزی بعلبک میں تھی اور کسی وقت بھی اس سے ملنے سرائے آ سکتی تھی۔

نئے دن امیر زنگی کا قاصد اسے ڈھونڈتا ہوا سرائے آ گیا۔ جعفر باہر جانے کے لئے باہر نکلا تھا کہ امیر کا قاصد اسے گیت پر مل گیا۔ یہ قاصد امیر زنگی کا خاص غلام یا نام کا خواجہ سرا تھا۔ یار کش امیر کا محافظ خاص تھا اور امیر کی خواب گاہ اور اس کے باہرنگی لتوار لئے رات بھر پہرہ دیتا تھا۔ امیر زنگی اپنے تمام اہم پیغامات اسی پر بھجوا دیتا تھا۔

ابو یار یار کش نے سرگوشیوں میں کہا۔ ”امیر محترم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ تم اس کے پاس جاؤ۔“

”کیسے؟“ جعفر نے گھبرا کر پوچھا۔

ابو یار نے جلدی سے جیب سے ایک پرچہ نکال کر جعفر کی طرف بڑھا دیا۔ ”تمام اہل پرچے میں درج ہیں۔“

پرچہ مٹی میں دبا کر جیب میں رکھ لیا۔ ”کوئی اور حکم ہے امیر کا؟“

سرا نے یار کش سے گھوڑا ملائے ہوئے اپنا لکھا ہوا کانڈ اس کے حوالے کر دیا۔ سرس فوراً "گھوڑے کو ایڑ دے کر ہوا ہو گیا۔ جعفر نے اپنا گھوڑا دوسری طرف دیا اور دوڑنے لگا۔ اوجھڑا گھوڑے کے بعد سرے واپس آ گیا۔ جعفر نے سوچا تھا کہ دو چار دن انتظار کے بعد وہ خود ترن کوڑی کو تلاش کرے گا۔ ترن کوڑی کا پتا ٹھکانا معلوم نہ تھا مگر اسے یہ معلوم تھا کہ ہعلیک میں پانچ بڑے بڑے بے ترن خانے ہیں۔ سب سے بڑا عبادت خانہ اینتو کیس کا تھا، جہاں ترن کوڑی کے ہونے کا امکان تھا۔ ترن کوڑی نے اعتراض کیا تو وہ صاف کہہ دے گا کہ وہ اس کے پیچھے ملنے کی طرف سے فکر مند تھا اور انہیں دیکھنے کے لئے آیا تھا مگر امیر زنگی کے حکم نے اسے ارادوں اور منصوبوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ امیر نے اسے فوراً دمشق جانے کا حکم دیا۔ امیر کو کسی ذریعے سے معلوم ہوا کہ یروظلم کا لشکر اب تک دمشق کے قریب خیمہ زن ہے۔ اس خبر کی تصدیق چاہتا تھا۔ آٹھ دن بعد یار کش کو اس کے پاس آنا تھا۔ جعفر نے اس حکم سے برا پریشان ہوا مگر وہ حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ امیر کی نظر میں اس کا کم از کم سزا موت تھی۔

رات کو جعفر نے سرے کے مالک سے ذکر کیا۔ "میں دو دن کے لئے دمشق جا رہا ہوں۔"

"دشمن نہیں جنت کو جعفر بھائی۔" سرے کے مالک نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہم لاکھ جنت تو دمشق ہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پہلے مسلمانوں کے خلیفہ دمشق میں رہتے تھے۔"

جعفر نے جواب دیا۔ "لوگ ٹھیک کہتے ہیں۔ پہلے دمشق ہی در الخلافہ تھا مگر یہ صدیوں کی بات ہے۔ جب تک خاندان بنو امیہ کے ہاتھوں میں خلافت رہی دمشق دیکھنے کے قابل نہ رہا۔ خاندان تباہ ہوا اور بنو عباس کا دور دورہ ہوا۔ انہوں نے بغداد آباد کیا۔ اب یہاں کی کشتی ڈنگا رہی ہے اور بغداد کی رونق بھی مٹی جا رہی ہے۔"

"جعفر بھائی۔ تم تو بڑے پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔" سرے کے مالک نے بڑی نکتہ چینی سے کہا۔ "میں کہتا ہوں کہ تم سارے کام چھوڑ کر دمشق میں آباد ہو جاؤ۔ کسی دن تو اس کے وزیر کو تمہاری قابلیت کا حال معلوم ہو گیا تو آنکھوں پر بٹھائے گا۔"

جعفر نے مسکرائے۔ "جعفر نے ٹالنے کے لئے کہا۔ "اگر کوئی مجھ سے ملے آگے کہ دنہ کے میں جلدی واپس آ جاؤں گا۔"

جعفر نے کہا۔ "تمہارا بھائی تو حلب میں ہے۔" سرے کے مالک نے تجسس ظاہر

"ہاں۔" خواجہ سرا نے جواب دیا۔ "امیر نے حکم دیا ہے کہ تم نے ہعلیک میں جو معلومات حاصل کی ہیں وہ زبانی یا تحریری طور پر میرے حوالے کر دو۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔ ہعلیک کے بعض لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔ اگر کیا تو میرے اور تمہارے لئے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"

"تمہیں یہاں ٹھہرنا نہیں پڑے گا۔ میں نے ہعلیک کے تمام حالات کھجور میں ابھی لائے دیتا ہوں۔" جعفر سرے کے داخل ہونے کے خیال سے ہنسنے لگا۔ "ٹھہرو جعفر۔ میرا یہاں کھڑے ہونا مناسب نہیں۔ میں سامنے کے پڑے طرح گھوڑے پر سوار کھڑا رہوں گا۔ تم لکھا ہوا کانڈ بے کر میرے پاس آ جاؤ۔ پہنچ کر تم پہلا کام یہ کرنا کہ امیر کی بھیجی ہوئی ہدایات کو پڑھ کر کانڈ ضائع کر دینا۔ تم فکر نہ کرو ایسا ہی ہو گا۔" جعفر پھر جانے کے لئے گھوما۔

"ایک بات اور۔" یار کش کی سرگوشی پھر سنائی دی۔ "گھوڑے پر بیٹھ کر کوئی خطرہ ہوا تو ہم دونوں فرار ہو جائیں گے۔"

جعفر سر ہلاتا سرے میں واپس ہو گیا۔ اپنی کوشری میں پہنچ کر پہلے اس ہدایات پڑھیں پھر کانڈ کے پڑے پڑے کر کے اس کی گولی سی بنا کر جیب میں اس نے اپنا لکھا ہوا خط نکال کر جیب میں رکھا۔ اس کا گھوڑا تھان پر بندھا تھا۔ اور ساز لے کر گھوڑے کی طرف چلا۔ درمیان میں سرے کے مالک بیٹھا تھا، اس کے سامنے آگ کا لاؤ روشن تھا۔ جعفر نے کانڈ کی گولی جیب سے نکال کر مٹی وہ لاؤ کے پاس ایک لمحے کے لئے رکا۔

"میں ایک دوست سے ملنے جا رہا ہوں۔ دو تین گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔"

سراے کا مالک حقہ چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "واہ جعفر بھائی۔ تم یہ بوجھ ہوئے ہو۔ لاؤ مجھے دو میں تمہارا گھوڑا تیار کئے دیتا ہوں۔ تم جب تک بیٹھ کر کش لگاؤ۔"

اوجھڑے کو ٹھیلنے کا سہارا۔ جعفر کی تو جیسے مراد بر آئی۔ اس نے ساز اس کے دیا اور خود بیٹھ کر حقہ پینے لگا۔ اس نے مٹی میں دبی ہوئی کانڈ کی گولی آگ کے دی اور اس وقت تک اس پر نظریں جمائے رہا جب تک کہ وہ جل کر خاکستر سرے کے مالک کے آواز دینے پر جعفر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ خواجہ یار کش کھڑا اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کا منہ زور گھوڑا زور زور سے



کیا۔ ”کیا بعلبک میں تمہارا کوئی دوست ہے؟“

”نہیں۔ ہاں۔“

سرائے کے مالک نے جعفر کو گھبرا کر دیکھا۔ ”میں سمجھا نہیں جعفر بھائی۔“  
”تمہارا نہ سمجھتا ہی اچھا ہے۔“ جعفر مسکرایا۔ ”میں نے کہا۔“ نہیں  
مطلب ہے کہ میرا کوئی دوست نہیں ہے اور ”ہاں“ اس لئے کہا ہے کہ میرا  
والا بعلبک میں ہے مگر میں نے اسے دوست کا درجہ نہیں دیا ہے۔“

سرائے کے مالک کو ہنسی آگئی۔ ”جعفر بھائی۔ اب میں تمہاری بات سمجھ  
جعفر نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ”تم میری بات سمجھ گئے ہو کیا مطلب؟“  
”یہی کہ بعلبک میں تمہیں جاننے والا صرف میں ہوں جسے تم دوست کا  
تیار نہیں۔“

جعفر کو اس کی سادہ لوحی مین بڑا خلوص نظر آیا۔ بولا۔ ”مگر میں جس ہستی  
ہوں وہ تم نہیں ہو۔ تمہیں تو میں اپنا دوست اور ہمدرد سمجھتا ہوں۔“

سرائے کا مالک خوش ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”جعفر بھائی تم نے سرکاش کو  
کر میری عزت بڑھائی ہے۔ میں تمہاری طرح پڑھا لکھا اور عقلمند نہیں لیکن  
دوست کہا ہے۔ اب میں ثابت کروں گا کہ سرائے والا سرکاش دوستی بھانا جانے  
سے تم واقعی میرے بھائی ہو اور ایک بھائی سے سرائے کا کرایہ وصول کرنا گناہ۔  
”بھائی سرکاش تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ جعفر اس کے اس جذبے سے اد  
ہوا۔ ”مگر میں غریب نہیں۔ میرے پاس سفر خرچ کے لئے بھی کافی رقم موجود  
تمہاری دوستی پر ہمیشہ فخر کروں گا۔“

”اچھا جعفر بھائی۔ ایک بات پوچھوں برا تو نہ مانو گے؟“ سرکاش نے سادگی  
جعفر نے جواب دیا۔ ”ضرور پوچھو۔ تمہیں پوچھنے کا حق ہے۔“  
سرکاش نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”یہ بتاؤ جعفر بھائی۔ بعلبک میں میرے  
ہے جسے تم جانتے ہو مگر اسے اپنا دوست نہیں مانتے ہو؟“

”یہ تم کیوں پوچھنا چاہتے ہو۔ اس سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟“ جعفر مسکرا  
سرکاش نے بڑے بزرگانہ انداز میں کہا۔ ”جعفر بھائی۔ تم پردیس میں  
ایک دوست تو سود دشمن ہوتے ہیں۔ میں تم سے عمر میں بڑا ہوں اور بعلبک کے  
جاننا ہوں۔ شاید میں کوئی مشورہ دے سکوں؟“

جعفر نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”سرکاش بھائی اگر میں کہوں کہ یہ ایک

”سرکاش کو فوری کوئی جواب نہیں سوجھا۔ بہت سوچنے کے بعد اس نے  
فیت سرکاش کو کہہ رہے ہو کہ تمہیں کوئی پوچھنے آئے گا۔ جب وہ تمہیں پوچھے گا تو  
فرمائی تم کہہ رہے ہو کہ میرا مطلب ہے اگر تم اس کے بارے میں مجھے کچھ بتا دو  
بات کرنے میں مجھے آسانی ہو۔ میں نے لوگوں سے سنا ہے کہ سچے دوست سے  
بہت کچھ پتا چلتا ہے۔“

اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ ”سرکاش بھائی۔ چاہے تم کچھ بھی نہ پڑھے ہو مگر  
میں محض اس سے کم نہیں۔ تم نے جو سنا وہ سچ سنا اور جو کہہ رہے ہو وہ بھی سچ  
میں خود بتاتا ہوں کہ وہ کون وہ ایک عیسائی لڑکی ہے جسے میں پسند کرتا ہوں۔  
لے نکلا رہا تھا کہ شاید تم ایک عیسائی لڑکی سے میری میل ملاقات پسند نہ کرو۔ پھر  
میں صرف ایک ملاقات ہوئی ہے۔ میری طرح وہ بھی مسافر ہے اور چند دن یہاں  
بہت سی طرف روانہ ہو جائے گی۔“

فرمائی۔ تم نے مجھے اپنے راز میں شریک کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔“  
ن خوش نظر آ رہا تھا۔ جہاں تک اس کے عیسائی ہونے کا تعلق ہے تو اس پر کون  
رہتا ہے انسان کو اپنے دل پر قابو نہیں ہوتا اور دل تو پھر دل ہے جس پر چاہے

اس کو مطمئن کرنے کے بعد جعفر اپنی تیاریوں میں لگ گیا۔ اسے خوشی تھی کہ  
مالک اس کا دوست بن گیا ہے اور اب وہ امیر کے قاصد سے کھل کر بات کر سکے  
ضرورت پڑی تو اسے دو ایک دن اپنے پاس ٹھہرا سکتا ہے۔ جعفر کو صبح ہونے  
سزا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دوپہر سے پہلے ہی وہ دمشق پہنچ جائے۔ اس نے سرکاش  
ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ سرکاش نے اسے آدھی رات گزرنے کے ایک دو  
دہکا دیا اور جعفر مختصر سامان کے ساتھ دمشق کی طرف چل پڑا۔

ناب پوری طرح معین الدین انز کے ہاتھوں میں تھا۔ مقتول شاہ ابق کے زمانے  
اہل بیت شاہ کو سمجھنا پڑتی تھی۔ شاہ کی والدہ ملکہ زمرہ خانم بھی ہر بات میں اپنی  
نہی۔ اکثر بات بڑھ جاتی تھی اور امیروں کو بیچ میں پڑ کر صلح صفائی کرانی پڑتی  
ہاں کی بات نہ تھی۔ ملکہ زمرہ خانم، امیر موصل عماد الدین زنگی کے پاس پہنچ چکی  
اہل بیت کے قتل کے بعد معین الدین انز اگر چاہتا تو خود تخت دمشق پر قابض ہو کر  
ات کا اعلان کر سکتا تھا مگر معین الدین بڑا دور اندیش انسان تھا۔ مگر اس کے

ایک اس کا نام بھی جعفر رکھ دیا تھا۔ چچا اسے ایک ماہر شمشیر زن اور گھڑ سوار  
مگر اسے اسلحہ اور سپہ گری سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ جعفر کے بچپن کا دور  
فلوچیوں کی طاقت ختم ہو رہی تھی اور موصل کے امیر زنگی کی طاقت روز  
باری تھی۔ خلیفہ بغداد اور سلجوقی سلطانوں میں اکثر زور آزمائی ہوا کرتی تھی۔  
مامن عباد الدین کی حیثیت ایک معمولی سردار سے زیادہ نہ تھی مگر اس میں  
ساتھ ساتھ وقت اور موقع و محل سے فائدہ اٹھانے کا بڑا ملکہ تھا۔ اس نے  
تاکہ بغداد کی طاقت تو ختم ہو چکی ہے اور اب سلجوقیوں کی خانہ جنگی نے  
اکر دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی نئی طاقت ابھر کر سامنے آئے جو  
عیسائیوں کے بڑھتے ہوئے ریلے کو روکے، دوسری طرف عراق اور شام کے  
بڑے حاکموں کو یکجا کر کے انہیں ایک جھنڈے کے نیچے اکٹھا کرے۔ موصل کا  
ن زنگی ایسے ہی جھنڈے کو بلند کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

لی کے گرد جو امیر اکٹھے تھے ان میں اسد الدین اور نجم الدین ایوب نامی دو  
تھے۔ اسد الدین نے تو اپنی شجاعت کے صلے میں ”شیر کوہ“ کا لقب بھی  
تھا۔ نجم الدین کو ابھی کوئی ایسا موقع نہ ملا تھا کہ وہ اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا۔  
یک جاں باز امیر نصیر الدین جعفر بھی تھا۔ امیر زنگی کو اس پر اس قدر اعتماد تھا  
موجودگی میں وہی کاروبار سلطنت چلاتا تھا۔

رین کا بھتیجا جعفر جوان ہوا تو وہ اسے لے کر امیر زنگی کے پاس گیا۔ نصیر الدین  
نظر کو امیر کے لشکر میں کوئی معقول جگہ دلا دے تاکہ وہ اپنی قابلیت سے کوئی  
لے سکے۔ اس دن امیر کسی اہم مسئلے میں الجھا ہوا تھا اور اسے حمص کے حاکم کو  
نام بھیجنا تھا۔ نصیر الدین نے جعفر کو اس کے سامنے پیش کیا۔ امیر نے اسے سر  
ایک تنقیدی نظر سے دیکھا۔ شاید جعفر کی قسمت کھلنے والی تھی۔ امیر زنگی نے  
جعفر کے ذریعے حمص بھجوا دیا۔ جعفر نے اپنی فطری ذہانت سے یہ کام اتنی خوبی  
میں فرما دیا کہ امیر نے جعفر کو اپنے جاسوسوں کے گروہ میں شامل کر لیا۔  
تاکہ امیر کا اعتماد حاصل کر لیا اور یوں نوجوان جعفر امیر کا نہایت با اعتماد اور  
اعتماد بن گیا۔

نے دمشق پہنچتے ہی اپنا کام شروع کر دیا۔ اس نے اپنے کام کے پیش نظر کسی  
اہل فطرت کے بجائے دمشق کی ایک سرائے میں قیام کیا۔ دوستوں کی نظروں  
اس نے اپنا حلیہ بھی کچھ تبدیل کر لیا تھا۔ دو دن کے اندر اس نے آدمی

مقابلے پر امیر زنگی جیسا عالی دماغ اور بہادر حکمران تھا جس کی نظریں ہمہ وقت رہتی  
تھیں۔ معین الدین نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائے جس سے  
امراء کو شکایت کا موقع ملے۔ سب ہی اس کے ہمنوا تھے اور جو مخالف تھے معین  
ان کا زور کسی نہ کسی طرح توڑ دیا تھا۔

معین الدین ان کی نہ کسی طور دمشق کو امیر زنگی سے بچاتا چلا آ رہا تھا  
اسے شاہ یروثلیم اور شاہ انطاکیہ کی عیسائی ریاستوں سے بھی مدد حاصل کرنا پڑی  
موصل عظمندی کا ثبوت نہ دیتا تو دمشق کے اطراف میں ایک ایسی ہولناک جنگ  
میں مسلمان، مسلمان کے سامنے ہوتا اور عیسائی ان کی کمزوری سے جلد یا بدیر  
امیر موصل کے واپس جانے کی اطلاع پاتے ہی معین الدین ان کے دمشق  
خاندان آل بویہ کے ایک شہزادے کو شاہ آہن کے نام سے تخت نشین کر دیا تھا  
کی پانچوں انگلیاں گھٹی میں اور سر کڑھائی میں تھا مگر وہ چلا نہ بیٹھا تھا۔ عیسائی  
ایک کثیر رقم ادا کر کے اس نے واپس کر دیا تھا مگر ان سے برابر رابطہ قائم کے  
اسے معلوم تھا کہ امیر زنگی اس کے جال سے بچ کر نکل گیا ہے اور اب وہ پہلے  
اس کا دشمن ہو گیا ہے۔

معین الدین ان کے خطرے کے پیش نظر پہلے سے زیادہ جنگی تیاریاں کر لی  
نے لشکر کی تعداد بھی بڑھا دی تھی اور قلعے کو کافی مضبوط کر لیا تھا۔ کسی وقت  
جاگیر کا بھی خیال آتا تھا۔ بعلبک اس کی جاگیر تھی۔ شمال میں صرف ۳۵ میل  
معین الدین روز شہر کو قوال برازن بویہ کو ہدایات بھیجتا رہتا تھا۔ اسے معلوم  
پورے ملک شام میں امیر موصل کے جاسوس پھیلے ہوئے ہیں اور وہ ایک ایک  
امیر کو پہنچا رہے ہیں۔ اس نے بھی اپنے جاسوس پورے دمشق میں چھوڑ رکھے۔  
حکم تھا کہ وہ شہر میں آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھیں اور مشکوک آدمیوں  
کسی قسم کی رعایت نہ کریں۔ یہی حکم اس نے اپنی جاگیر کے کو قوال برازن بویہ کو  
برازن بویہ نے بھی احتیاطی قدم اٹھانا شروع کر دئے تھے۔

☆☆☆☆☆

دمشق اور بغداد دونوں شہر جعفر کے لئے اجنبی نہ تھے۔ اس نے بغداد کا  
کھولی تھی۔ ماں باپ اسے بچپن ہی میں داغ مفارقت دے گئے تھے اور اس کی  
ذمہ داری اس کے چچا نصیر الدین جعفر پر آ پڑی تھی۔ نصیر الدین لا ولد تھا اور

سے زیادہ معلومات حاصل کر لیں۔ تیسرے دن جعفر اپنے کام کے سلسلے میں شاہ محل کے گرد منڈلا رہا تھا کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کے وجود کو ہلکا کر دیا۔ جعفر شاہی محل کے دروازے کے قریب چھپا کھڑا تھا کہ محل کے اندر سے ایک رفتار سوار نکلا۔ اس کے چہرے پر نصف نقاب پڑا تھا مگر اس کے بال ہوا میں تھے۔ سوار اس کے قریب سے ہوا کی طرح گزرا اور جعفر اس کی صرف ایک جھلک مگر اس ایک جھلک ہی نے اس کے جسم میں سنسنی پیدا کر دی۔ وہی قدم قاتلہ ہوئی آنکھیں اور لہراتے ہوئے سنہرے بالوں نے تو اس پر سکتے سا طاری کر دیا۔ جعفر کے دل نے فوراً کہا۔ ”ترن کوزی۔“

جعفر دیر تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ خیالات کے جھوم سے اس کا سر ہلکا تھا۔ وہ ترن کوزی تھی... مگر ترن کوزی دمشق کیسے پہنچی؟ وہ تو بعلبک میں تھی۔ باپ بیمار تھا۔ بیمار کو چھوڑ کے وہ دمشق کیسے آگئی پھر قصر شاہی میں اس کا کیا کام ہے؟ جعفر نے اسے بعلبک کے کوتوال شہر برازق بویہ کے محل میں دیکھا تھا۔ مگر اسے ایک واہمہ کہہ کر دل کو مطمئن کر لیا تھا لیکن یہ تو کھلی حقیقت تھی۔ اس نے چند گز کے فاصلے سے ترن کوزی کو دیکھا تھا۔ کیا یہ بھی اس کی آنکھوں کا قریب تھا نہیں۔ وہ دن میں خواب نہیں دیکھ سکتا اور نہ ترن کوزی کے عشق میں وہ اس قدر ہے کہ اسے ہر لڑکی پر ترن کوزی کا دھوکا ہو۔ وہ سو فیصد ترن کوزی تھی۔

جعفر کے سر میں درد ہونے لگا۔ وہ کام ادھورا چھوڑ کر سرائے واپس آگیا اور کھائے پئے بستر پر پڑ گیا۔ ترن کوزی چھلا وہ ہے۔ ہوا کا گھولا یا پھر کوئی مافوق الفطرت... کبھی بعلبک میں اور کبھی دمشق میں، پھر اس کے دل میں ایک نئے خیال نے اور وہ کانپ گیا۔ کیس ترن کوزی کو یہ تو نہیں معلوم ہو گیا کہ میں امیر زنگی کا جاسوس اور اب وہ میرا پیچھا کر رہی ہے۔ اس خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہوئے۔ داناتی اور چالاکی پر شبہ ہونے لگا۔ ایک لڑکی نے اسے شکست دے دی تھی۔ یہ اس کی بڑی ذلت تھی۔

مگر ان تمام ہتھیوں کے باوجود اس کا دل نہیں مان رہا تھا اور اس کھلی ہوئی قرب نظر کا نام دے رہا تھا۔ انسان کی نظر بڑے بڑے دھوکے کھاتی ہے۔ ممکن ہے کہ نظر کا دھوکا ہو لیکن نظر بار بار تو دھوکا نہیں کھاتی۔ اس نے ترن کوزی کو وہ محکوک حالات میں دیکھا تھا۔ وہ دمشق میں ہے۔ ابھی اس کے پاس سے گزری ہے۔ میں یہاں کیوں لیٹا ہوں اور جعفر بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میں اسے دھو بیٹھ لگاؤں گا۔“ جعفر نے خود کلائی کے انداز میں کہا اور تیزی سے ہاتھ کل گیا۔ جعفر پھر قصر شاہی پہنچ گیا اور صدر دروازے کے قریب چھپ کر کھڑا رہا۔ یقین تھا کہ اگر ترن کوزی دمشق میں موجود ہے اور اس کا شاہی محل سے کوئی تعلق ہے تو وہ دوبارہ آئے گی اور اگر وہ آگئی تو جعفر اسے سچ بازار پکڑے گا۔ جعفر کے دل میں یہ خیالات گھوم رہے تھے اور وہ صدر دروازے پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ شام ہو گئی پھر رات مگر جعفر نے اپنی جگہ نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ نصف گز پر جعفر ہارے ہوئے جواری کی طرح سرائے واپس آگیا۔

جعفر نے وہ رات بڑے کرب سے گزاری۔ کسی پہلو چین نہ پڑتا تھا۔ بار بار شاہی صدر دروازے کا تصور باندھتا اور اس تصور میں ترن کوزی کو گھوڑے پر سوار دیکھنے دیکھتا۔ اسے ترن کوزی کا پورا چہرہ تو نظر نہ آ رہا تھا مگر چمکتی شریقی بادشہ روشن۔ جمیل جیسی گہری اور وہ لہراتے ہوا میں اڑتے سنہرے بال۔ وہ بار بار ہاتھ مگر تصور پھر اسے محل کے دروازے پر لے جاتا۔

صبح ہوئے ہی جعفر نے جلدی جلدی کچھ پیٹ میں ڈالا۔ اور سیدھا شاہی محل پہنچ گیا۔ اس کا طریقہ تھا کہ وہ گھوم پھر کر ضروری معلومات حاصل کرتا اور کسی کسی وقت اس کے صدر دروازے کے پاس محفوظ جگہ کھڑے ہو کر آنے جانے والوں کو دیکھتا تھا۔ اسے ایک ہی جگہ جم کر کھڑا ہونا پڑ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے بھی میٹ کے سے نہ ہٹ رہا تھا کہ کیس ترن کوزی محل میں آکر واپس نہ چلی جائے۔ اس کا یہ باخبر تھا کہ کسی کی نظر بھی اس پر پڑ سکتی تھی۔ مگر وہ اپنی بد احتیاطی کو دل کے انجور ہو کر برداشت کر رہا تھا۔ شک و شبہ کا جو پودا اس کے دل میں اگ آیا تھا جعفر بڑے اکھاڑ پھینکا چاہتا تھا اور یہ صرف اسی وقت ممکن تھا جب اس کی ملاقات اس سے ہو جائے اور وہ محل میں آئے گا کوئی معقول جواز پیش کر سکے۔

امیر زنگی کے عتاب کا خوف بھی غالب ہوتا جا رہا تھا کیونکہ وہ فرض سے کھلی لافانی کر رہا تھا مگر اس نے ان تمام غدشوں کے باوجود شام تک اپنی جگہ نہ چھوڑی۔ مگر کاکھانا بھی نہیں کھاسکا اور اپنی جگہ پتھر کی صورت کی طرح جما کھڑا رہا پھر شام کے لے پے ہوتے چلے گئے اور رات ہو گئی مگر کسی کو نہ آتا تھا اور نہ آیا۔ جعفر نے بالکل آج بھی رات کے بارہ کے گھر تک انتظار کیا مگر اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس نے سراسر لافانہ انداز میں تین دن اور اسی عالم میں گزار دیئے۔ شاہی محل جانا اور اوقات کو داپس آنا۔ مجبور ہو کر اسے اپنے دل کو ایک بار پھر اس واقعے کو واہمہ کا نام

دے کر تسلی دینی پڑی۔ اس پر امیر زنگی کا خوف بھی پوری طرح غالب آ گیا تھا اور یہ بار بار پریشان کر رہا تھا کہ کہیں امیر کا قصد بعلبک میں اسے نہ پا کر واپس نہ چلا جائے۔ اگلے دن سے جعفر بڑی تندی سے اپنے کام میں لگ گیا۔ اس نے ترن کوڑی کے محل کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا۔

☆☆☆☆☆

ادھر بعلبک میں جعفر کی عدم موجودگی کے دوران نئے نئے گل کھل رہے تھے۔ دن سرائے کا مالک سرکاش الاؤ کے پاس حقہ بیٹھا بی رہا تھا کہ ایک مشکوک سا آدمی میں داخل ہوا۔ مشکوک اس لئے معلوم ہوا کہ وہ چوروں کی طرح اندر آیا تھا اور احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ وہ حقہ چھوڑ کر لپکتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ ”کس کی تلاش ہے تمہیں؟“ سرکاش نے بڑے رعب سے پوچھا۔

”میں۔ میں۔“ آنے والا گھبرا گیا۔

”تم چور معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہیں ابھی قاضی کے پاس لے جاؤں گا۔“

”جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”میں چور نہیں ہوں۔“ آنے والے نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

”چور کب کتا ہے کہ میں چور ہوں۔ آخر تم ہو کون اور کس لئے آئے ہو؟“

”میں اپنے ایک دوست سے ملنے آیا ہوں۔“

”دوست سے ملنے آئے ہو تو یہ چوروں کی طرح تاک جھانک کیوں کر رہے؟“

سرائے ہر ایک کے لئے کھلی ہے جو چاہے بے دھڑک آ سکتا ہے مگر تم۔“ سرکاش برابر گھورے جا رہا تھا۔

”میں ایک معزز آدمی ہوں۔ مجھ سے بد تمیزی کرو گے تو تمہیں افسوس ہو گا۔“

والمے نے کچھ ایسے رعب سے کہا کہ سرکاش کی شئی گم ہو گئی۔

سرکاش نے عاجزی سے کہا۔ ”جناب میں جانتا ہوں آپ شریف آدمی ہیں مگر دوست کا نام بتائیے۔ میں آپ کو اس سے ملوا دوں گا۔“

”زیادہ بیک بکن نہ کرو اور بتاؤ کہ اس سرائے کا مالک کون ہے؟“

”جناب والا۔“ سرکاش ادب سے بولا۔ ”آپ نے درست فرمایا۔ سرائے کا مالک واقعی بہت بیک بکن کرتا ہے اور اس کا نام سرکاش ہے۔“

”مگر وہ کہاں ہے؟“ آنے والا چڑ گیا۔

”حضور والا۔ سرائے کا مالک ہی آپ کے سامنے کھڑا بیک بکن کر رہا ہے۔“

”تم ہو مالک۔“

”مالک نہیں خادم ہوں جناب۔ مسافروں کی خدمت کرتا ہوں اور بال بچوں کا پیٹ

اؤں۔“ سرکاش نے اسے نرم پڑتے دیکھا تو بڑے خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

”میں معافی چاہتا ہوں سرکاش۔ مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔“ آنے والے کا

ہمت نرم ہو گیا تھا۔

”متم دیجئے جناب۔ میں تمہیل کے لئے حاضر ہوں۔“

آنے والے نے نہایت شرافت سے کہا۔ ”دراصل مجھے حکم ملا ہے کہ میں بعلبک کی

براؤں میں مقیم مسافروں کی فرست تیار کروں۔ تم اس کام میں میری بہتر مدد کر سکتے

سرکاش نے شوخ لہجے میں درخواست کی۔ ”جناب میں سرکاش یعنی اس سرائے کا

آپ سے التماس کرتا ہوں کہ آپ مجھے پہلے اپنا حدود اربعہ میرا مطلب ہے کہ اپنا

نہ کر لیئے پھر اس بات کی وضاحت فرمائیے کہ آپ کو مسافروں کی فرست تیار کرنے کا

کے حکم دیا ہے؟“

”میں شمر کے قاضی کا کارندہ ہوں اور انہوں نے یہ حکم دیا ہے۔“ کارندے نے الجھتے

مالک۔

سرکاش نے قاضی کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے دریافت کیا۔ ”اگر قاضی صاحب نے اس

نہ کی تیار کا حکم دیا ہے تو براہ کرم آپ اس بات کی وضاحت فرما دیجئے کہ قبلہ قاضی

بہاں فرست کا کیا کریں گے؟“

”آپ مجھے والے کون ہوتے ہو؟“ کارندے کو غصہ آ گیا۔

”معزز کارندے صاحب، میں آپ کے فائدے کی بات کہہ رہا ہوں اور آپ خواہ مخواہ

بہاں پر ناراض ہو رہے ہیں۔“ سرکاش نے بڑی دھمکی سے کہا۔ ”اگر آپ

نہاں تو دونوں کا بھلا ہو گا۔ میرا مطلب ہے کہ آپ اس زحمت سے بچ جائیں

جناب صاحب کو بھی یہ بیکار فرست پڑنے کی ضرورت نہ ہو گی۔“

”میں ناراض خراب ہو گیا ہے۔ آخر تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“ کارندہ چیخ پڑا۔

”میں نے سنا

”میں نے سنا

پہلے پڑ جاتی ہیں۔ حضور والا، میرے کہنے کا مطلب صاف ہے۔ آپ سرائے میں غیر کی فہرست تیار کرنا چاہتے ہیں اور یہ فہرست تیاری کے بعد آپ جناب قاضی صاحب حضور پیش کریں گے لیکن آپ اور قاضی صاحب یہ بھول رہے ہیں کہ یہ سرائے یہاں ایک آتا ہے اور دوسرا جاتا ہے۔ جن مسافروں کی فہرست آپ اس وقت تیار کئے، ان میں سے شام تک آدھے رخصت ہو چکے ہوں گے اور صبح تک باقی نصف بھی اپنی منزل کو روانہ ہو چکے ہوں گے لیکن میری سرائے آپ کی دعا سے کل بھی اسی بھری ہو گی کیوں کہ جانے والوں کی جگہ نئے آنے والوں نے لے لی ہو گی۔ یہ دنیا بھی طرح کی ایک سرائے ہے کہ ایک جاتا ہی اور ایک .... ”سرکاش کتے کتے رک گیا۔“ نظر اچانک کارندے پر پڑی تھی۔ کارندہ جس کا چہرہ چند لمحے پہلے غصے سے تھمیا ہوا اب اس چہرے پر غصے کے بجائے حیرت کے گہرے سائے لہرا رہے تھے اور کارندہ کھولے سرکاش کو دیکھ رہا تھا۔

”آپ مجھے کیا دیکھ رہے ہیں جناب۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“ سرکاش نے ذرا کے پھر اپنی بات شروع کر دی ”میرے باپ کو مرے ہوئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ وقت سے میں سرائے کو سنبھال رہا ہوں مگر مسافروں کی فہرست آج تک کسی نے نہیں کی .... اگر آپ یا قاضی صاحب مسافروں کی فہرست تیار کر کے کوئی نیا کام کرنا ہیں تو پھر آپ کی مرضی۔ میرے ساتھ چلیے۔ میں ان تمام مسافروں کے نام آپ کو دے دوں جو اس وقت یہاں موجود ہیں مگر اس بات کا خیال رکھئے گا کہ اگر فہرست شخص کو تلاش کرنے آپ کل تشریف لائے اور وہ یہاں سے چلا گیا تو اس کا ذمہ دار نہیں ہوں گا۔“

کارندہ ایک سرائے کے مالک سے جو عام طور پر ان پڑھ ہوتے تھے، ایسی چیز باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا اس نے کہا۔ ”تمہیں سرائے کے بجائے کسی تعلیمی میں ہونا چاہیے تھا۔ سرکاش تم نے ٹھیک کہا۔ مسافروں کی فہرست تیار کرنے سے کیا نہیں، وہ تو اڑتے پرندے ہیں۔ آج اس شاخ پر تو کل دوسری پر۔ بہر حال تم مل موجود مسافروں سے مجھے ملا دو۔ بس یہی میرے لئے کافی ہے۔“

سرکاش کارندے کو اپنے ساتھ لے کر چلے لگا۔ ”جناب ایک بات تو بتائیے آپ کو کسی خاص آدمی کی تلاش تو نہیں ہے؟“

کارندے نے رک کر اسے دیکھا۔ ”مگر میں کہوں کہ مجھے ایک خاص آدمی کی ہے تو تم کیا کرو گے؟“

”ہاں۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔“ کارندے نے گول مول جواب دیا۔ سرکاش نے مسکرا کے کہا۔ ”بس تو مسئلہ حل ہو گیا۔ آپ کو سرائے کی کوٹھریوں میں بے نی کی ضرورت نہ ہو گی اس کا حلیہ بتا دیجئے آپ مجھے، میں اسے لا کر آپ کے سامنے رکھ دوں گا۔“

”یہ بات نہیں سرکاش۔“ کارندے نے اپنا پہلو پچایا۔ دراصل میں نے صرف اسے پار دیکھا تھا اور اس کی ایک ہلکی سی تصویر میرے ذہن میں موجود ہے جسے میں الفاظ بیان نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر دیکھوں گا تو پہچان ضرور لوں گا۔“

”جناب والا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آپ کا دوست نہیں ہے کیوں کہ دوست کی رُو ہر وقت سامنے رہتی ہے۔“

”ہاں بھئی۔ وہ میرا دوست نہیں۔“ کارندے نے اکتا کر کہا۔ ”تو پھر اس کا مطلب ہے کہ وہ آپ کا دشمن ہے جس سے آپ کو یا قاضی صاحب کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔؟“

”بالکل ایسی بات ہے سرکاش۔“ کارندے نے فوراً تصدیق کی۔ ”تو پھر آپ اسے نہیں پکڑ سکتے۔“ سرکاش نے نفی میں زور سے سر ہلایا۔ ”کیوں نہیں پکڑ سکتے۔ کیا وہ مجھ سے زیادہ طاقتور ہے؟“ کارندے نے سرکاش سے بے ٹکا سوال کر دیا۔

”جناب، یہ تو آپ ہی جانتے ہوں گے کہ وہ آپ سے زیادہ طاقتور ہے یا آپ اس زیادہ طاقتور ہیں لیکن میں یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس طرح آپ اسے ڈھونڈ رہے ہیں اس طرح آپ کی نظروں سے بچ رہا ہو گا۔ اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ ایک کھلی سرائے آکرے اور آپ کے ہاتھوں پکڑا جائے۔“

”اچھا، اب زیادہ منطقی جھاڑنے کی ضرورت نہیں۔“ کارندے نے سخت لہجے میں بولے ”مجھے مسافروں کی کوٹھریاں دکھاؤ۔“

سرکاش اس کے سخت لہجے سے گھبرا گیا اور خاموشی سے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سرائے میں اس وقت صرف پانچ مسافر ٹھہرے ہوئے تھے۔ آخری قافلہ جس کے غرار و ترن کوڑی آئے تھے وہ آگے کی طرف کوچ کر چکا تھا اور اب تک کوئی نیا

”ہاپ میرے دوست سے مل کر بہت خوش ہوں گے جناب۔“ سرکاش نے اس کے چلے ہوئے کہا۔ ”وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ میں خود چاہتا ہوں کہ آپ اس سے ضرور اور میرے دوست کی عقل کی تعریف کریں۔ اگر آپ اپنا پتہ مجھے بتا دیں تو میں اسے رخصت کر دوں گا۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ تم جا کر اپنا کام کرو۔“ کارندہ بڑبڑاتا ہوا گیٹ کی طرف بڑھ

”یاد دماغ آدمی ہے۔“ سرکاش بھی خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا اور اپنی جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ سرکاش کو جعفر پر غصہ آ رہا تھا۔ اس نے آخر قاضی کے اس کارندے کو دیکھا کہ وہ گھر آیا۔ سرکاش کو کارندے سے مل کر خوشی کی بجائے کوفت ہوئی تھی اب یہ غرضی کہ کوئی معقول آدمی نظر آئے تو اس سے باتیں کر کے وہ اپنے ذہن کا بوجھ اٹھائے۔ اس انتظار میں دوپہر تک الاؤ کے پاس بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہا مگر آدمی تو آدمی کوئی نہیں آتا۔ وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھا اور منہل سا اپنی کوٹھری کی طرف چل

اس کی کوٹھری سرائے کے دوسرے حصے میں بالکل گیٹ کے مقابل تھی۔ یہ کوٹھری مکان کی ڈیوڑھی تھی۔ اس کے اندر کے حصے میں اس کے بال بچے رہتے تھے اور کوٹھری میں بیٹھا گیٹ سے آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا تھا۔ وہ کوٹھری میں جا کے ہاتھ سرائے میں ایک لڑکی داخل ہوئی۔ وہ چونکا ہو گیا۔ لڑکی کچھ گھبرائی ہوئی تھی نا اعتیاد سے ڈر ڈر کے قدم اٹھا رہی تھی۔ سرکاش بھی اسے حیران نظروں سے دیکھ سرائے میں قاتلوں کے ساتھ لڑکیاں اور عورتیں آتی تھیں مگر اس طرح تنہا کوئی لڑکی نہیں اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔

”اگاہت آہستہ مسافروں کی کوٹھریوں کی طرف بڑھ رہی تھی اور سرکاش اپنی جگہ

لڑکی سے کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے دبے پاؤں آ رہا تھا۔ لڑکی بڑھتے بڑھتے کوٹھری پر پہنچی۔ پھر شاید اس نے کوٹھری میں لگا قفل دیکھا اور مایوس ہو کر کھڑی ہو گئی۔ لڑکی کو ایک دم جعفر کی بات یاد آگئی۔ اس نے چلتے وقت ایک لڑکی کا ذکر کیا تھا۔ لڑکی کے سرائے آنے کی امید تھی۔ سرکاش کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ تیز قدم اٹھاتا ہوا پہنچ گیا۔ لڑکی سرکاش کو دیکھ کر گھبرا گئی مگر وہ مسکرا رہا تھا۔

قاتلہ نہیں آیا تھا۔ سرکاش نے کارندے کو تین مسافروں سے ملوا دیا۔ جو اپنی اپنی کوٹھری میں موجود تھے۔ دو کوٹھریاں بند تھیں اور ان میں تالے لگے ہوئے تھے۔ سرکاش نے بتایا۔

”جناب ایک کوٹھری میں رات ہی مسافر آیا ہے۔ کسی کام سے بازار گیا ہے۔ دوسری کوٹھری میں مقیم مسافر کو آئے ہوئے ایک ہفتے کے قریب ہوا ہے۔ آج کل وہ دمشق گیا ہے۔“

”دمشق!“ کارندے نے کان کھڑے کئے۔ ”وہ دمشق کب گیا ہے؟“

”جمعہ، ہفتہ، اتوار، پیر۔ چار دن ہو گئے اسے گئے ہوئے۔“ سرکاش نے انگلیوں پر گن کر بتائے۔

”کب واپس آئے گا؟“

”وہ چار دن کو کہہ گیا تھا مگر اب تک نہیں آیا۔“

”وہ دمشق کیوں گیا ہے؟“

”جناب آپ مجھ سے یوں پوچھ رہے ہیں جیسے میں اس کا باپ ہوں۔“ سرکاش منہ بنایا۔ ”ویسے میں یہ بتا دوں کہ وہ آپ کا دشمن نہیں ہو سکتا۔“

”یہ تم نے کیسے اندازہ کیا۔؟“

”اندازہ اس طرح لگایا کہ وہ میرا دوست ہے اور سرکاش کا دوست کسی کا دشمن ہو سکتا۔ کیونکہ سرکاش خود کسی کا دشمن نہیں۔“ سرکاش نے کچھ اس طرح کہا کہ کارندہ کو غصے کے باوجود ہنسی آگئی۔

”اچھا، تم اس کا حلیہ بیان کرو۔“ کارندے نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔

سرکاش نے ذہن پر زور دے کر جعفر کا حلیہ بیان کیا۔ کارندہ اس کے ایک ایک فقرے غور سے سنتا رہا۔ ”اب بھلا آپ ہی فرمائیے۔ ایسا خوب صورت اور مہذب جوان کیا کا دشمن ہو سکتا ہے۔؟“

”ہرگز نہیں سرکاش۔ تمہارا دوست واقعی شریف آدمی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے کارندہ

کا لہجہ طنزیہ ہو گیا تھا۔

”سینے جناب۔“ سرکاش نے فوراً اپنے دوست کی صفائی پیش کی۔ ”میں اپنے کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ حلب جانے والا ہے۔ وہاں اس کے بھائی کی بیٹی کا ہے۔ اس کی شرافت میں آپ کو کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے۔“

”میں اسے برا کہہ رہا ہوں۔“ کارندے نے چلتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا دوست تمہاری طرح دلچسپ ہو گا۔ میں اس سے ملنے ضرور آؤں گا۔“

سرکاش نے سلیقے سے کہا۔ ”میں نے کہا تھا کہ اگر چاہو تو میرے بھائی جعفر کے لئے پیغام بھجو سکتی ہو۔“

لڑکی کے ہونٹوں پر عجیب دل فریب مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”میرا یہ ہے کہ ان سے ملنے پھر آؤں گی۔“

”میں نے کچھ اور بھی کہا تھا نیک لڑکی۔“ سرکاش جیسے اسے زبردستی روکنے کی کوشش کرتا تھا۔

”اور کیا کہا تھا تم نے؟“ لڑکی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے کہا تھا کہ جعفر بھائی میرے دوست ہیں۔“

”ہاں کہا تھا۔ اس سے کیا مطلب تھا تمہارا؟“

”اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ بھی مجھے دوست سمجھتے ہیں اور میرے لئے بڑے فخر کی بات

”ہاں ہاں۔ یہ بھی کہا تھا تم نے، مگر مطلب کیا ہے تمہارا؟“

”نیک لڑکی۔“ سرکاش نے سر جھکا کے کہا۔ ”تم میرے دوست کی مہمان ہو اور میری ماں ہو۔ مجھے حکم دو کہ میں تمہارے کھانے پینے کے لئے کچھ حاضر کروں۔“

”نیک سرکاش۔ تمہارا شکریہ میں پھر آؤں تو خاطر کرنا۔ اس وقت میں جلدی میں لڑکی جواب کا انتظار کئے بغیر آگے بڑھنے لگی۔

اپنا نام تو بتاتی جاؤ نیک لڑکی۔“ سرکاش نے ایک بار پھر اسے روکنے کی کوشش کی۔

جعفر میرا نام جانتے ہیں۔ ان سے پوچھ لیتا۔“

لڑکیٹ سے باہر بھی نکل گئی تھی لیکن سرکاش اب بھی چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔

☆☆☆☆

کی رات جعفر دمشق سے واپس آ گیا۔ سرکاش اسے دیکھتے ہی پٹ گیا اور اتنا بھیچا لڑکوں کو ابھرنے لگی۔

جب چھوڑ بھی دو سرکاش۔“ جعفر زور کر کے اس کی گرفت سے نکلا۔

جعفر بھائی تم نے اتنے دن لگا دئے۔ میں تو تمہیں یاد کر کر کے رو پڑتا تھا۔ بھلا اسے بھی ایسی بے مروتی۔ نہ خط نہ پتر میں تو لوگوں سے جھوٹ بولتے بولتے تنگ آ

”اچھی لڑکی، شاید تمہیں بھائی جعفر کی تلاش ہے؟“ اس نے بڑی شفقت سے لڑکی نے نظر اٹھا کے سرکاش کو دیکھا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر لڑکی کو اطمینان ”کیا تم جعفر کو جانتے ہو؟“ لڑکی کو نہ جانے کیا ہوا کہ اس نے سوال کرنے کے بعد نظریں نیچی کر لیں جیسے اسے حیا آگئی ہو۔

سرکاش نے اس سے شفقت سے کہا۔ ”بھائی جعفر میرے دوست ہیں۔ میرا ہے کہ وہ مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں اور یہ بات میرے لئے بڑے فخر کی ہے۔“

”کہاں گئے ہیں جعفر؟“ لڑکی کی نظریں نیچی ہی رہیں۔

”وہ دمشق گئے ہیں۔“

دمشق کے نام پر لڑکی چونک پڑی پھر جیسے کسی فکر میں ڈوب گئی۔

سرکاش نے مزید بتایا۔ ”جعفر بھائی جاتے وقت مجھ سے کہہ گئے تھے کہ ایک دن

سے ملنے آئے گی۔ میرا خیال ہے کہ وہ تم ہی ہو؟“

”ہاں۔ مگر وہ کب آئیں گے۔“ لڑکی فکر مند ہو گئی تھی۔

”وہ دو چار دن میں آنے کو کہہ گئے تھے مگر پختے سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔“

چپ ہو کر جواب کا انتظار کرنے لگا مگر لڑکی خیالوں میں کھو گئی تھی۔

کچھ انتظار کے بعد سرکاش نے خود ہی کہا۔ ”نیک لڑکی اگر تم چاہو تو جعفر بھائی

لئے پیغام دے سکتی ہو۔ میں انہیں پہنچا دوں گا۔“

”تم سرائے میں کتنے دن رہو گے؟“

سرکاش مسکرایا۔ ”میں اس سرائے کا مالک ہوں اور میرا نام سرکاش ہے۔ میرا

ہے کہ تم بعلبک میں رہتی ہو اور جعفر بھائی کی دوست ہو۔“

”اچھا، تم سرائے کے مالک ہو!“ لڑکی نے اسے گھور کر دیکھا۔ ”جیسی میں سو

تھی کہ تمہاری صورت مجھے جانی پہچانی معلوم ہوتی ہے۔“

”اگر تم اس سرائے میں کبھی رہی ہو گی تو مجھے ضرور دیکھا ہو گا۔“ سرکاش نے

خود بات بڑھائی۔

”ہاں، میں چند دن یہاں رہ چکی ہوں۔“ پھر لڑکی واپس ہونے لگی۔ ”اچھا۔“

آؤں گی۔“

”نیک لڑکی۔ میں نے تم سے کچھ اور بھی کہا تھا۔“ سرکاش نے اس کے پیٹ

قدم روک دئے۔

لڑکی ٹھہر کر بولی۔ ”معاف کرنا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا تم نے اور کیا کہا تھا۔“

نے اسے تو کتنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ اس نے سرکاش کو تفصیل بیان کرنے کا اس  
 پر دیا کہ شاید کوئی مقصد کی بات معلوم ہو جائے مگر جب سرکاش ایک دم خاموش ہو  
 گیا تو پتا چلا کہ ”چپ کیوں ہو گئے سرکاش۔ اور کیا باتیں ہوئیں ترن کوڑی سے؟“  
 ترن کوڑی نے بہت دیر تک خاموشی میں گزر دی۔ اس لئے ہو گیا کہ شاید تم میری باتوں سے  
 دل بردہ ہو۔ میں نے سنا تھا کہ اگر کسی عاشق کے سامنے اس کے محبوب کا ذکر کیا  
 تو بہت خوش ہوتا ہے۔ مگر تم۔“

سرکاش نے خدا کے لئے بات کو طول نہ دو۔ ”جعفر اور پریشان ہو گیا۔“ جلد  
 سے ملے کون آیا تھا۔

”آیا بھی تھا اور آئی بھی تھی۔“ اور جعفر نے دانت نکال دئے۔  
 ”پھر وہی فضول باتیں۔ کون آیا تھا اور کون آئی تھی؟“  
 ”وہ آئی تھی جعفر بھائی جس کے بارے میں تم نے مجھے بتایا تھا۔“  
 ”کیا ترن کوڑی آئی تھی؟“ جعفر کا دل زور سے دھڑکا۔

”کیا نام بتایا۔ ترن کوڑی۔ واہ کیا پیارا نام ہے۔ اس کی صورت بھی اتنی ہی  
 ہے۔ بڑی بڑی چمکتی آنکھیں۔ ہوا میں لہراتے سنہرے بال۔ بڑی اچھی پسند ہے نہ  
 جعفر بھائی۔“ سرکاش نے رک کر جعفر کو دیکھا اور پھر بولا۔ ”جعفر بھائی میں نے نہ  
 ہے۔ وہ لڑکی تم سے ضرور محبت کرتی ہے۔“

”خیر۔ یہ چھوڑو اور بتاؤ کہ وہ کب آئی تھی۔ کیا کہہ رہی تھی؟“  
 ”آج ہی آئی تھی اور تمہیں بڑے چاؤ سے پوچھ رہی تھی۔ کیا نام تھا اس کا؟“  
 ”سرکاش۔ ہوش میں آؤ۔ اس کے نام میں کیا دھرا ہے۔ جو کچھ کہا تھا اس  
 مجھے بتاؤ۔“ جعفر کو اب معلوم ہوا کہ نادان کی دوستی کتنی مہنگی ہوتی ہے مگر یہ وہ  
 کے لئے ضروری تھی۔ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔

”جعفر بھائی۔ وہ چپکے سے سرائے میں داخل ہوئی۔“ سرکاش نے تفصیل  
 دی۔ ”میں الاؤ کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ دبے قدموں تمہاری کوشنری کے پاس گئی۔ کوئی  
 تھی۔ وہ بڑی مایوس ہو کر لوٹی۔ اسی وقت میں اس کے پاس پہنچ گیا اور میں نے اس  
 صاف کہہ دیا کہ جعفر بھائی میرے دوست ہیں اور وہ بھی مجھے اپنا دوست سمجھے ہیں  
 مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ میں نے اسے بتایا کہ تم دمشق گئے ہو اور وہ چار  
 آنے کو کہا تھا مگر اب تک نہیں آئے۔ بھاری بڑی مایوس ہوئی۔“

”اور کون آیا تھا۔ کوئی سوار تھا؟“ جعفر کا خیال فوراً ”امیر موصل  
 شہزادہ کی طرف گیا جس نے ایک ہفتے کے بعد آنے کو کہا تھا۔  
 ”سرکاش نے معصوم سامنے بتایا۔  
 ”سرکاش نے معصوم سامنے بتایا۔“

”سرکاش نے معصوم سامنے بتایا۔“

”سرکاش نے معصوم سامنے بتایا۔“



جعفر سر جھکائے کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ”خیر جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ مجھے تم سے نہیں سرکاش مگر اب میں اس سرائے میں نہیں رہ سکتا۔“

جعفر بھائی۔ کیوں نہیں رہ سکتے؟“

بل ہا تو ایک نہ ایک دن ضرور پکڑا جاؤں گا۔“

راش نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ”اطمینان سے رہو جعفر بھائی۔ کس میں ہمت اہلیک کی سب سے بڑی سرائے کے مالک سرکاش کے دوست پر ہاتھ ڈال سکے۔“

کے ہاتھ توڑ کے رکھ دوں گا۔“

راش نے لالمت سے کہا۔ ”مجھے تمہاری دوستی پر فخر ہے سرکاش لیکن اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔“

راش کی یہی تو پوچھ رہا ہوں جعفر بھائی۔؟“

پھر کسی وقت بتاؤں گا سرکاش، پہلے تم میرے رہنے کا انتظام کرو۔“

راش سمجھا نہیں جعفر بھائی۔ یہاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟“

فرجے بی سے بولا۔ ”بس میں نے کہہ دیا۔ میں نہیں رہ سکتا۔ میرے رہنے کا انتظام کرو۔ ورنہ میں پکڑا جاؤں گا اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے۔“

راش سم گیا۔ ذرا رک کے بولا۔ ”جعفر بھائی۔ تم ہلیک کی ہر سرائے میں رہ سکتے زخم میرے دوست ہو۔ ہر سرائے والا تمہیں سر آنکھوں پر بٹھائے گا۔ مگر میں تم رو جاؤں گا۔ یہ دکھ میں کیسے برداشت کروں گا جعفر بھائی۔؟“ سرکاش کی آواز گئی۔

فرجے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ ”دوستی سچی ہو تو فاصلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ پھر ہلیک میں ہی رہوں گا بلکہ یوں سمجھو کہ لوگوں کی نظروں سے چھپ کر رہوں گا۔“

راش کا کہنا کہ قاضی کے آدمی کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ میں کہاں ہوں۔ تم سے انکے دن کا ابھی دمشق سے واپس نہیں آیا۔“

جعفر کی نظر سرائے کے گیٹ پر پڑی اور وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ امیر موصل کا بار کس اندر جھانک رہا تھا۔

ایسا ہوا جعفر بھائی۔ پریشان کیوں ہو گئے؟“ سرکاش نے منہ اٹھا کر اسے حیرت سے

کہہ نہیں۔ ایک کام یاد آ گیا۔“ جعفر نے اسے ٹالا۔ اور ہاتھ کے اشارے سے لاوار کس کو گیٹ کے سامنے سے ہٹنے کو کہا۔

جعفر سناٹے میں آ گیا۔ خوف کی ایک لہر اس کے جسم سے گزر گئی۔ ”وہ کیل تھا۔ کیا پوچھ رہا تھا؟“ جعفر کو گھبراہٹ کی وجہ سے اس سردی میں بھی پسینہ آ گیا تھا۔

”بڑا عجیب آدمی ہے وہ۔“ سرکاش نے عادت سے مجبور ہو کے تفصیل شروع کر دی۔

”کہہ رہا تھا کہ اسے سرائے کے تمام مسافروں کی ایک فہرست بنانا ہے۔ تمہاری کاپی تھی اس لئے تمہارے بارے میں پوچھنے لگا۔“

”پھر تم نے کیا بتایا؟“ جعفر کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔

”میں نے کیا بتایا۔ کہہ دیا کہ تم دمشق گئے ہو اور دو چار دن میں واپس آ گے۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ وہ بھی کوئی تمہارا دوست معلوم ہوتا تھا۔ اس۔“

حلیہ بڑی تفصیل سے پوچھا اور میں نے اتنی ہی تفصیل سے تمہارا نقشہ کھینچ کر آخر تم میرے دوست ہو۔ تمہارا حلیہ تو پوری طرح بیان کر سکتا ہوں۔“

جعفر نے سر پکڑ لیا۔ ”اور کیا بتایا میرے دوست نے میرے بارے میں۔“

گیا۔

سرکاش نے بڑے جوش سے جواب دیا۔ ”میں نے اس سے کہہ دیا کہ میرے دوست ہیں اور جعفر بھائی بھی مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ میں نے تمہارے عقل کی بھی اس سے بہت تعریف کی۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اسے میرا نام بھی بتا دیا؟“

”ہاں جعفر بھائی۔ میں تمہارا اس سے زیادہ پکا دوست ہوں۔ وہ تمہارا نام جانتا تھا۔ ہے نا کتنی عجیب بات“ ایسے گھٹیا آدمی کو تم دوست نہ بنایا کرو جعفر بھائی

”اے میرے نادان دوست۔ تم نے میرا بڑا غرق کر دیا۔ اب میری خبر نہ اس کے ساتھ الاداء کے پاس بیٹھ گیا۔ اسے ایسی گھبراہٹ ہوئی کہ پھر کمرے ہو کر

”کیا ہوا جعفر بھائی۔ میں نے کیا کر دیا۔“ غریب سرکاش گھبرا گیا۔

”جعفر نے رک کے پوچھا۔“ میرا نام سن کر وہ ضرور چونکا ہو گا؟“

سرکاش سوچنے لگا۔ ”چونکا نہیں تھا مگر کانڈ پر تمہارا نام لکھ لیا تھا۔“

”کانڈ پر لکھا تھا۔“

”ہاں ہاں“ کانڈ پر لکھا تھا اور کاہے پر لکھا تھا۔ میں نے تمہارا جو حلیہ بتایا تھا

نے کانڈ پر لکھ لیا تھا۔“ سرکاش بے وقوفی کی حد تک نیک اور سیدھا تھا۔

”اب میرے بچنے کی کوئی امید نہیں رہ گئی۔“ جعفر ہاتھ ملتے لگا۔

سرکاش منہ کھولے اسے تنک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں جعفر کی باتیں

یار کش گھوڑا موڑ کر گیٹ کے سامنے سے ہٹ گیا۔ جعفر نے اطمینان کا  
 ”کیا کام یاد آگیا جعفر بھائی۔ کیا پھر کہیں جا رہے ہو؟“ سرکاش نے جہاز  
 ”تھوڑی دیر آرام کر لو پھر کہیں جانا۔ ابھی تو میری باتیں بھی نہیں ختم ہوئیں۔“  
 ”فکر نہ کرو دوست۔ آج رات میں تمہارے ہی پاس مگزاروں گا۔ بس ا  
 کے ابھی واپس آیا۔“ یہ کہتے ہوئے جعفر تیزی سے گیٹ کی طرف چل رہا۔  
 ”جلدی آنا جعفر بھائی۔ جب تک تم واپس نہیں آؤ گے میں بھی کھانا  
 گا۔“

جعفر گیٹ کے باہر نکل چکا تھا۔ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ مار  
 نیچے اسے گھڑ سوار کا سایہ نظر آیا۔ جعفر لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔  
 ”السلام علیکم یار کش۔ امیر کیسے ہیں؟“ جعفر نے اس کے قریب پہنچے کے  
 سوار گھوڑے سے اتر پڑا۔ ”امیر عالی مقام بالکل خیریت سے ہیں، جس کا  
 تمہیں دمشق بھیجا گیا تھا امید ہے کہ تم نے اسے مکمل کر لیا ہو گا۔“  
 ”بالکل مکمل کر لیا ہے۔ جعفر نے ایک بند لفافہ جیب سے نکال کر یار  
 حوالے کیا۔ ”اس میں پوری تفصیل درج ہے۔“

یار کش نے لفافہ احتیاط سے جیب میں رکھ لیا، پھر مسکرایا۔ ”امیر تمہارا  
 بہت خوش ہیں۔“  
 ”امیر ایک عظیم حکمران ہیں۔ وہ اپنے جاں نثروں کی پوری حوصلہ افزائی کر  
 ان کے حضور میرا سلام پیش کرنا۔“ جعفر نے بوئے خلوص سے کہا۔ ”میرے۔  
 ہے۔ تمہارے ساتھ واپس چلوں۔“

”نہیں جعفر۔ تم بعلبک ہی میں ٹھہرو گے۔ امیر سے یہیں ملاقات ہو گی۔“  
 جعفر خوش ہو گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ امیر خود بعلبک۔۔۔“

”شاید۔“ اور یار کش اچک کے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ”اچھا شب بخیر۔“  
 ”خدا حافظ یار کش۔ ایک بات کا خیال رکھنا۔ مجھے اس سرائے میں کچھ  
 ہو رہا ہے۔ کل میں یہ جگہ تبدیل کر دوں گا۔ سرائے کے مالک کا نام سرکاش ہے  
 مخلص اور بھولا بھالا بلکہ بے وقوف آدمی ہے۔ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔  
 دوبارہ آنا ہو تو سرکاش سے میرا نیا ٹھکانہ پوچھ لیتا۔ میں اسے اچھی طرح سے  
 جاؤں گا۔“

خواجہ سرا یار کش نے گھوڑے کو ایڑ دی اور شب کی پستانیوں میں ڈوب

ہٹے واپس ہوا سرائے کے گیٹ پر اسے سرکاش کھڑا ہوا ملا۔  
 ”جی جلدی واپس آگئے؟“ سرکاش نے بھولے پن سے پوچھا۔  
 ”اندر چلو کھانا کھائیں۔ مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔“ جعفر اس کا ہاتھ پکڑ  
 لگا۔  
 رات بت خاموش خاموش چل رہا تھا۔ جعفر کو اس کی خاموشی پر ہنسی آنے لگی۔  
 نام نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کہاں گیا تھا؟“

میں کیوں پوچھوں جعفر بھائی۔ تم مناسب سمجھو گے تو خود ہی بتا دو گے۔“  
 بات ہوئی میرے دوست۔“ جعفر نے محبت سے اس کا ہاتھ دبایا۔ ”میرا ایک  
 مجھ سے ملے آیا تھا۔ شاید وہ پھر آئے۔ میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں یہ جگہ صبح کو  
 اردوں گا۔ تم سے پوچھتے تو اسے میرے ٹھکانے پر پہنچا دیتا۔“  
 یا ٹھکانہ۔ مگر تمہارا نیا ٹھکانہ کون سا ہو گا؟“  
 جہاں تم صبح کو مجھے لے جاؤ گے۔“

ہاں ٹھیک۔۔۔ میں سمجھ گیا۔“ سرکاش کو پھر جیسے کوئی خیال آیا۔ اس نے بڑی راز  
 سے پوچھا۔ ”جعفر بھائی اگر وہ تمہاری ترن کوڑی آئے تو اسے کیا بتاؤں۔“  
 بات قابل غور ہے۔“ جعفر سوچنے لگا۔

اٹا باتیں کرتے ہوئے اندر پہنچے۔ سرکاش اسے چھوڑ کے کھانا لینے چلا گیا۔ جعفر کا  
 تاس چور ہو رہا تھا۔ اس نے چاہا کہ غسل کر کے ٹھکانہ دور کرے مگر بڑی سرد ہوا  
 ناگہم۔ دانت بجتے لگے تھے۔ جعفر نے کپڑے بدلنے پر اکتفا کیا۔ سرکاش کھانا لے

جعفر بھائی۔ تم نے بتایا نہیں۔ ترن کوڑی کو کیا جواب دیا جائے؟“ سرکاش نے  
 کے دوران کہا۔

”کھانا رک گیا۔“ میں اب تک کوئی فیصلہ نہیں کر سکا ہوں۔“  
 رات نے اسے پریشان کرنا مناسب نہ سمجھا اور بولا۔ ”کھانے کے بعد میں اپنے  
 کے پاس جاؤں گا۔ وہ بھی ایک سرائے کا مالک ہے۔ وہ اتنی بڑی سرائے تو نہیں  
 میں تکلیف نہ ہو گی۔ وہ تمہارا ہر حکم مانے گا اور آرام کا خیال رکھے گا۔ اس  
 کوئی فیصلہ نہ کر چھوڑنا کیوں کہ ترن کوڑی کسی وقت آ سکتی ہے۔ اسے کچھ تو جواب  
 دو۔“

سرکاش۔ میں ترن کوڑی کو اپنے تمام ٹھکانوں کا پتہ نہیں بتانا چاہتا۔ وہ آئے تو

جہاں کی مہم روشنی میں اس نے کواڑ لرزتے دیکھے تو گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اپنے والے سخت غصہ آ رہا تھا۔ آخر وہ سرائے کا مالک تھا اور اس کا سخت حکم تھا کہ اس وقت کسی مسافر کو نہ جگایا جائے۔ پھر یہ جعفر کی کوٹھری پر آنے کی کس نے سرکاش نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ ہی پانچ چھ مسلح آدمی لے کرکاش آئے۔ سرکاش ہکا بکا رہ گیا۔

پہلے بھی مل چکا تھا۔ وہ گھبرا کر آگے قاضی کا وہ آدمی تھا جو ایک بار سرکاش سے پہلے بھی مل چکا تھا۔ وہ گھبرا کر اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔ جعفر اب تک بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بے چارہ کر سوا ہے۔ قاضی کے کارندے نے جھٹ سے تلوار نکال کر جعفر کے سینے پر

چھو جا جعفر۔ اس نے بڑے رعب سے کہا۔

جعفر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ تلوار اس کے سینے پر رکھی تھی۔ وہ حرکت بھی کر سکا تھا۔ اس نے نظریں سمٹھا کر ادھر ادھر دیکھا جہاں تک اس کی نظر جاسکتی تھی۔ لڑکھاپ رہا تھا۔ اس وقت تک پورا کمرہ مسلح سپاہیوں سے بھر گیا تھا۔

”اتنا کیوں نہیں؟“ قاضی کے آدمی نے دوبارہ حکم دیا۔

”تم بھی عجیب آدمی ہو۔ تلوار سینے سے لگی ہے اور کہہ رہے کہ اٹھ جا۔“ جعفر نے المیہ سے کہا اور اپنا ہاتھ تلوار کی نوک پر رکھ کر اسے ذرا اونچا اٹھا دیا۔

قاضی کے آدمی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے جلدی سے تلوار جعفر کے سینے

پال۔

”ہماری کوشش نہ کرنا ورنہ مارے جاؤ گے۔“ اس نے تلوار میان میں کر لی۔

جعفر نے کہہ دیا۔ ”تم کون ہو اور مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“ جعفر نے برائی لی۔

”میرے کمرے ہو جاؤ۔“ قاضی کے آدمی نے پھر حکم دیا۔

جعفر کا ہائی سے اتر کر کھڑا ہو گیا۔ ”ہاں جی اب بتاؤ۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“

”کہہ نہیں۔“ قاضی کے آدمی نے بڑی رعوت سے کہا۔

”کہہ نہیں تو پھر یہ ہنگامہ کیسا؟“

”تاہوش رہو۔“

”تاہوش میں اس وقت ہوں گا جب تم اس بے ہودگی کا سبب بتاؤ گے۔“

”تمہاری گرفتاری کا حکم ہے۔“

”مسلح کا حکم ہے۔ کیا جرم ہے میرا؟“

کہہ دینا کہ میں ابھی تک دمشق میں ہوں۔“ جعفر نے اپنا فیصلہ اسی وقت سنا دیا۔

”لیکن جعفر بھائی۔ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔ اس سے تم کیوں نہیں ملنا چاہتا؟“

”ہیں۔ یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ سرکاش نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔

”جعفر ہنس کر آیا۔“ ”یہ سب محبت کی ادائیں ہیں سرکاش بھائی۔ ترن کوڑی۔“

”تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد سرکاش دوسری سرائے میں چلا گیا۔ اسے سرائے والے عزت کرتے تھے نہ صرف اس وجہ سے کہ سرکاش کی سرائے میں

سرائے تھی اور وہاں اکثر شاہی مہمان یا خاص خاص لوگ قیام کرتے تھے بلکہ اسے بھی کہ وہ زبان کا میٹھا اور دوستوں کا اچھا دوست تھا۔ سرکاش جس جگہ جعفر

انتظام کرنا چاہتا تھا وہ سرائے اس عبادت خانے کے جنوبی سرے پر واقع تھی کوڑی اور جعفر کی پہلی رومان انگیز ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے سرائے کے مالک

کہ وہ جس دوست کو اس کی سرائے میں رکھنا چاہتا ہے وہ ایک خلوت پسند علم ہے اور اسے اپنے کام کے لئے انتہائی پرسکون گوشہ چاہئے۔ اس لئے اسے بالکل

کیا جائے۔

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد وہ واپس آ گیا۔ جعفر اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ سرکاش نے حسب عادت جعفر کے لئے ٹھکانے کی دل بھر کے ترغیب

اسے بالکل مطمئن کر دیا کہ اس جگہ جعفر کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور اس کے طرف آنے کا کوئی تصور بھی نہ کرے گا۔ جعفر کو اس کی اس کارگزاری سے

ہوئی۔ جعفر کی اس سرائے میں چونکہ آخری رات تھی اس لئے سرکاش اس سے زیادہ باتیں کرنا چاہتا تھا جعفر گرم پانی سے نما دھو کر تازہ دم ہو گیا تھا اس نے

سرکاش کو نہ منع کیا اور نہ اسے جا کر سونے کے لئے کہا۔ یہ دونوں باقی رات بھر رہے اور جب سویرا ہونے کے قریب ہوا تو جعفر اور سرکاش ایک ہی بستر پر

گئے۔

لیکن وہ صبح ان کے لئے قیامت کا پیغام لے کے آئی ادھر مسجدوں میں نماز

رہی تھی اور ادھر جعفر کی کوٹھری کے کواڑ کو کوئی باہر سے پیٹ رہا تھا۔ پہلے سرکاش

”ہمیں بتانے کا حکم نہیں۔“

”پھر تم مجھے گرفتار نہیں کر سکتے۔“

”کیا تم مزاحمت کرو گے۔ ہم سے لڑو گے؟“

سرکاش جو اب تک گم سم کھڑا تھا۔ اس کے جسم میں جیسے بجلیاں بھر گئی کر قاضی کے آدمی کے پاس پہنچ گیا۔ ”بھائی جھگڑا کیوں کرتے ہو۔ تم قاضی کے کیوں نہیں دیتے کہ تمہیں قاضی نے حکم دیا ہے۔ اتنا کہنے سے تمہاری زبان گم جائے گی۔“ جعفر بھائی میرے دوست ہیں۔ میں قاضی کی عدالت میں ان کی گواہی جعفر بھائی۔ نیک مزاج اور نیک آدمی ہیں۔ ان پر کسی نے جھوٹا مقدمہ کیا ہو گا؟ ”یہ قاضی کا حکم نہیں ہے اور نہ میں قاضی کا آدمی ہوں۔“ اس نے انکار سرکاش حیران ہو کر اس کا منہ ٹکٹے لگا۔

”تم عجیب جھوٹے آدمی ہو۔ اس دن خود کو قاضی کا آدمی بنا رہے تھے۔ میری عدالت میں تم پر جھوٹ بولنے کا مقدمہ دائر کروں گا۔“ سرکاش کو اس کے مجبور غصہ آ رہا تھا۔

”کیا اس بند کرو۔ ورنہ تمہیں بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔“

”کیا خوب؟ کیوں پکڑ لیا جائے گا مجھے۔ کیا جرم کیا ہے میں نے۔ میں اب شہری ہوں۔ شر کے کو تو ال مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔“ سرکاش بھی اڑ گیا۔

”ہم شر کو تو ال ہی کے حکم سے جعفر کو گرفتار کر رہے ہیں۔“

”کس جرم میں؟“ جعفر ترخ کے بولا۔ ”میں مسافر آدمی ہوں۔ میں نے کیا کیا وہاں چل کر سب معلوم ہو جائے گا۔ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلو۔“

سرکاش نے شر کو تو ال کو نام لے کر قاضی کے آدمی کو مرعوب کرنے کی سعی لیکن جب اس نے بتایا کہ وہ شر کو تو ال کے حکم سے جعفر کو گرفتار کر رہا ہے

ساری شان دھری رہ گئی۔ اس نے شر کو تو ال کا نام بس یونہی لے لیا تھا ورنہ وہ بعلبیک کا شر کو تو ال برازق بویہ نہایت ظالم انسان ہے۔ وہ کسی کی رو رعایت برازق بویہ کو معین الدین انز نے اپنی جاگیر کا ناظم بنا کر شر کو تو ال کا خطاب دیا تھا

اپنے آپ کو بعلبیک کا گورنر سمجھتا تھا۔ سفارش تو وہ کسی کی مانتا ہی نہ تھا۔ ایک

الدین انز نے اسے ایک مجرم کو چھوڑنے کا حکم دیا تھا تو وہ اپنے آقا سے بھی آ

برازق کا تعلق دمشق کے شاہ بویہ کے خاندان سے تھا مگر اس کی اپنے خاندان والی بنتی تھی۔ اس لئے اس نے شاہی ملازمت چھوڑ کر معین الدین کی غلامی قبول کر

معین الدین اس کی بہت قدر کرتا تھا اور اپنی جاگیر کے معاملات میں بالکل دخل نہ دیتا تھا۔ دمشق میں جو حالات پیش آئے تھے اس سے معین الدین بہت محتاط ہو گیا تھا۔ اس نے امیر موصل کو میدان جنگ میں نہیں مگر سیاسی طور پر ضرور شکست دی تھی مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ امیر موصل چھللا بیٹھنے والا انسان نہیں۔ وہ موقع پاتے ہی پھر دمشق پر چڑھ دیتا ہے۔ معین الدین نے اسی لئے برازق یہ کو بھی محتاط کر دیا تھا۔ برازق خود بہت بااثر انسان تھا۔ اسے معین الدین نے محتاط کیا تھا کہ بعلبیک میں آنے جانے والوں اور بے گناہ ہونے والوں پر نظر رکھے کیونکہ دشمن کے جاسوسوں کا ہر وقت خطرہ تھا اور موصل کے جاسوس تو اس علاقے میں مشہور تھے۔ برازق کے آدمی بھی بدل کر بعلبیک کی تمام ادوار مراوں میں گھومتے رہتے تھے اور ہر آنے جانے والے قافلے کے بارے میں مکمل طہات رکھتے تھے۔

جب دمشق سے آنے والا قافلہ جس میں جعفر اور ترن کوزی شامل تھے چند روز قیام کے آگے بڑھ گیا تو برازق کے جاسوسوں نے سرکاش کی سرائے کو گھیر لیا۔ قافلے کی راہی کے بعد بھی سرائے میں چار پانچ آدمی مقیم تھے۔ یہی بات مشکوک تھی اور انہیں ان پے رہ جانے والوں کے حالات کی جستجو تھی۔ انہیں جعفر پر پہلے ہی کچھ شک تھا پھر جعفر باہم موجودگی میں سرکاش نے اپنی سادگی اور بے وقوفی کے تحت جعفر کے حالات خود ان سے ہی شان سے بیان کئے تو ان کا شک یقین میں بدل گیا۔ فوراً ”شر کو تو ال کو اطلاع دی کہ شر کو تو ال نے یہ معلوم کرنے کی زحمت نہیں کی کہ جعفر کون شخص ہے۔ اور اس کا لہجہ سے تعلق ہے اس کے لئے تو بس یہ کافی تھا کہ اس کے جاسوسوں کے مطابق ایک مشکوک شخص تھا اور کسی مشکوک شخص کا آزادی کے ساتھ بعلبیک میں رہنا ناممکن ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس نے جعفر کی گرفتاری کا فوراً حکم دے دیا اور جعفر دمشق واپس آئے ہی اپنے نادان دوست کی حماقت کی وجہ سے دھریا گیا۔

جعفر کا خیال تھا کہ اسے شر کو تو ال کے سامنے پیش کیا جائے گا اور وہ اپنی چرب زبانی اور ذہانت کے زور پر خود کو بے قصور ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا مگر شاہی عدالت میں حاکم وقت یا حاکم علاقہ کا حکم ہی قانون ہوتا تھا۔ شر کو تو ال نے حکم دیا تھا کہ شخص کو سرائے سے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا جائے۔ تعمیل کرنے والوں کے حکم کو کفایت تھی۔ انہوں نے جعفر کو سرکاش کی چیخ پکار اور رونے دھونے کے درمیان گرفتار کیا اور سیدھے قید خانے لے گئے۔ جعفر چیختا ہی رہ گیا کہ اسے کو تو ال کے سامنے لایا جائے تاکہ وہ اپنی بے گناہی کا ثبوت دے سکے مگر توبہ کیجئے ایسی باتیں کون سنتا ہے

”مجھے کیا پتہ کہاں ہیں۔ میں خود انہیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔“  
 ”ہاں کہہ رہے ہو سرکاش۔ کیا جعفر دمشق سے واپس نہیں آئے؟“  
 ”دمشق سے آئے تھے مگر دوسرے دن پھر چلے گئے۔“  
 ”کہاں چلے گئے۔ تمہیں کچھ بتایا تو ہو گا۔؟“  
 ”انہیں خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔“  
 ”تم ہوش میں نہیں معلوم ہوتے سرکاش۔ کیا بے سکی باتیں کر رہے ہو؟“

”اور کیسی باتیں کروں ترن کوزی۔“ وہ ایک دم آبدیدہ ہو گیا۔ ”جب سے جعفر بھائی  
 راز ہوئے ہیں۔ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ تم نہیں جانتیں، مجھے جعفر بھائی سے کتنی محبت  
 ہے۔“

”ترن کوزی، جعفر کی گرفتاری کی خبر سن کر سناٹے میں آگئی اسے یہ شبہ تو ضرور تھا کہ  
 نرکا تعلق ایسے گروہ سے ہے جو دمشق اور دمشق کی حوالے سے بعلبک کے خلاف  
 راولی میں مصروف ہے۔ جعفر کو اس نے اسی وجہ سے ایک رات طویل ملاقات کا موقع  
 دیا۔ وہ جعفر سے اس کی اصلیت معلوم کرنا چاہتی تھی کہ اس کو شش میں وہ جعفر کی  
 بہت سے مرعوب ہو گئی۔ دوسری طرف جعفر کو بھی ترن کوزی کی محتاط گفتگو نے ایک  
 طوم شبہ میں گرفتار کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی وہ ترن کوزی کو چاہنے بھی لگا تھا۔ پھر  
 باس نے ترن کوزی کو برازق بویہ کے محل سے نکلنے دیکھا تو اس کا شبہ یقین میں بدل  
 گیا۔ گرفتاری کے وقت بھی جعفر کے دل کے کسی گوشے سے آواز آئی تھی کہ اس کی  
 گرفتاری میں ترن کوزی کا ہاتھ ہے مگر دوسرے ہی لمحے اس کے دل نے اس خیال کی تردید  
 دلی تھی۔“

”یہ بہت برا ہوا سرکاش۔“ ترن کوزی نے جیسے خیالوں میں کہا۔ ”جعفر کی رہائی بہت  
 دیر ہے۔“

”میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں ترن کوزی۔“ سرکاش بے چین ہو گیا۔ ”جعفر بھائی  
 کی بہت چاہت تھی۔ دمشق سے واپس آئے تو سب سے پہلے انہوں نے ہمارے بارے  
 میں پوچھا تھا۔ وہ تمہیں تلاش بھی کرنا چاہتے تھے لیکن شاید تم نے انہیں منع کر دیا تھا۔“  
 ”ہاں سرکاش۔ اس میں میری ہی غلطی ہے۔“ ترن کوزی نے یوں کہا جیسے جعفر کی  
 گرفتاری میں اس کی غلطی کا دخل ہو۔ ”جعفر تمہاری طرح میرے بھی دوست ہیں۔ مجھے  
 پتا تھا کہ میں انہیں مطلع کر دیتی اور انہیں بعلبک سے چلے جانے کا مشورہ دیتی۔“  
 ”سركاش کی موٹی عقل ترن کوزی کے اشارے کو نہ سمجھ سکی۔“ پھر تم نے انہیں

اس کے دایرہ پر کسی نے رتی برابر توجہ نہ دی۔  
 جعفر کو ایک تنگ کمرے میں ڈال دیا گیا۔ یہ کمرہ دس فٹ چوڑا اور اتنا ہی لمبا  
 اونچائی بھی جعفر کے اندازے کے مطابق تقریباً ”بارہ فٹ تھی۔ تمام دیواریں پتھر کی خم  
 چھت کے قریب ایک مربع فٹ کا روشن دان تھا جس میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں  
 تھیں۔ صرف ایک چھوٹا دروازہ تھا جس سے سر جھکا کر جعفر اندر آیا تھا۔ جعفر نے پہلے  
 نظر میں یہ اندازہ لگا لیا کہ یہاں سے بھاگ نکلنے کا کوئی طریقہ استعمال نہیں کیا جا سکتا  
 جعفر زندگی میں پہلی بار اس طرح کی مصیبت میں پھنسا تھا۔ رہائی کی صرف یہی صورت  
 کہ اسے کسی حاکم مجاز کے سامنے پیش کیا جائے اور وہ اپنی صفائی میں کچھ کہہ سکے مگر  
 یہ موقع کب ملے گا اس کا اسے کوئی پتہ نہ تھا۔ کھانے کی طرف سے اسے کوئی پریشانی  
 تھی۔ اسے دونوں وقت اچھا کھانا ملتا اور کھانا اس قدر زیادہ ہوتا تھا کہ وہ اسے کھانم  
 سکتا تھا۔

ادھر جعفر قید تھائی میں مبتلا تھا ادھر سرائے میں غریب سرکاش کا اپنے دوست  
 میں برا حال تھا۔ اس نے کئی بار قاضی کی عدالت کے چکر لگائے تھے کہ شاید جعفر کا  
 پیش ہو مگر اسے ہر بار ناکامی ہوئی تھی۔ شہر کو تو ال برازق بویہ کے محل میں بھی وہ ایک  
 ہو آیا تھا مگر وہاں سے بھی اسے جعفر کا پتہ نشان نہ ملا تھا۔ وہ دراصل اس آوی کوڈو  
 تھا جو جعفر کو گرفتار کرنے آیا تھا مگر وہ اسے کہیں نظر نہ آیا۔ سرکاش اپنے دوست  
 گرفتاری سے اس قدر دل برداشتہ ہوا تھا کہ اس کا کسی کام میں جی نہ لگتا تھا۔ طبیعت  
 وقت چڑچڑاتی رہتی۔ لوگوں سے باتیں اس طرح کرتا جیسے ان سے لڑ رہا ہو۔

ایک دوپہر سرکاش، جعفر کے خیالوں میں الجھا بیٹھا تھا کہ ترن کوزی آگئی۔  
 خوش نظر آ رہی تھی۔ سرکاش کی طبیعت چڑی ہوئی تھی۔ اس نے جل کے کہا۔  
 خوش نظر آ رہی ہو ترن کوزی۔ کیا کوئی خزانہ مل گیا ہے؟“  
 ترن کوزی نے اسے حیران نظروں سے دیکھا۔ ”سرکاش تمہیں میرا نام کس

بتایا؟“

”تم نے نہیں بتایا تو کیا جعفر بھائی بھی نہ بتاتے۔ وہ میرے جگری دوست ہیں  
 سے کوئی بات نہیں چھپاتے۔ مجھے انہوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ ترن کوزی نے  
 سے سرکاش کا دماغ کچھ ٹھیک ہو گیا تھا اور اب وہ چمک چمک کر باتیں کرنے لگا تھا۔  
 ”اس کا مطلب ہے کہ جعفر آگئے ہیں کہاں ہیں وہ؟“ ترن کوزی کی خوشی

تھی۔

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوا ہو گا۔“ اسے اطمینان ہوا تو ترن کوزی کی جان

”سرکاش میں نے تم سے کہا ہے کہ تمہاری طرح جعفر بھی میرے دوست ہیں اس  
بہی ان کے لئے پریشان ہوں۔ میں کوشش کروں گی کہ تمہارے دوست کو چھڑا کر  
اپس بچا دوں۔“ ترن کوزی نے ایسے اطمینان سے کہا جیسے وہ کوئی حاکم وقت ہو۔  
”سرکاش نے اسے حیرت سے دیکھا۔“ تم... تم... تم جعفر بھائی کو چھڑا لاؤ گی۔“  
”میں کوشش کروں گی۔“ ترن کوزی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

ہفتہ بھر سے مارا مارا پھر رہا ہوں۔ جب میں کچھ نہ کر سکا تو تم عورت ہو کر کیا  
کرؤ گی؟“

”میری اور تمہاری کوشش میں فرق ہے سرکاش۔“ ترن کوزی نے مضبوط لہجے میں  
میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ایک ہفتے کے اندر تمہارے جعفر بھائی کو تمہارے  
بالوں گی۔“

”ن کوزی بغیر جواب کا انتظار کئے واپس ہو گئی۔ سرکاش کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا  
اس کے کہ ترن کوزی بڑی عجیب و غریب لڑکی ہے۔ اس کی باتیں بھی عجیب و غریب  
ہیں۔ اس کا یہ دعویٰ کہ وہ جعفر کو ایک ہفتے کے اندر چھڑا لائے گی۔ یہ بھی ایک  
غریب دعویٰ تھا۔“

دوسری رات جب جعفر قیدی کی کوٹھری میں موت اور زندگی کے فاصلے تاپ رہا  
کوٹھری کے مختصر روشندان کی لوہے کی سلاخوں پر چوٹ پڑی۔ جعفر نے چوکنا ہو کر

”ن۔ کیا تم ہو اس کمرے میں؟“  
”ترن کوزی کی باریک مگر کھپکھپاتی آواز تھی، جسے شناخت کرنے میں جعفر کو کوئی وقت  
اس کا جی چاہا کہ اچک کر سلاخوں سے لپٹ جائے گا مگر روشندان اس کی پہنچ سے

”ن۔ جلد بتاؤ۔ کیا تم ہو اس کے اندر؟“ آواز دوبارہ ابھری۔

”ترن کوزی۔ میں جعفر ہوں مگر تم...“  
”نا جعفر کو کوئی جواب نہ ملا۔ ترن کوزی کی آواز پھر نہ ابھری اور جعفر صبح تک  
ہاں اٹھیں بجائے گوش بر آواز رہا۔“

مشورہ کیوں نہیں دیا ترن کوزی۔“

”یہ ان کی اور میری دونوں کی بد قسمتی ہے۔ مجھے بتانا چاہیے تھا کہ ان کا ہلکا  
قیام خطرے سے خالی نہیں۔ اور وہ کسی وقت گرفتار ہو سکتے ہیں۔“ ترن کوزی ہلکا  
جذبے سے مجبور ہو کر ایک ایسا راز اگل بیٹھی جو اسے نہ بیان کرنا چاہیے تھا۔  
”سرکاش نے فوراً اس کی بات پکڑ لی۔“ ترن کوزی کیا تم جانتی تھیں کہ جو  
گرفتار کر لئے جائیں گے؟“

”ہاں شاید۔“ ترن کوزی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”مگر کیوں۔ انہوں نے  
تھا ترن کوزی؟“

”شہر کو توال کو بتایا گیا تھا کہ دشمن کے جاسوس دمشق اور ہلبک میں موجود  
ترن کوزی نے دل گرفتگی سے بتایا۔  
”کیا... کیا... جعفر بھائی دشمن کے جاسوس ہیں۔“ سرکاش کا جسم ٹھنڈا ہوا  
اور اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔“

”ترن کوزی کو اس وقت اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے بات بنانے کی  
کی۔“ ”ارے نہیں سرکاش تمہارے جعفر بھائی تو نہایت شریف آدمی ہیں۔ بھلا جاسو  
کہیں ایسی محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔“

”سرکاش کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔“ ”ترن کوزی تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ بھلا  
بھائی جاسوس کیسے ہو سکتے ہیں۔ جاسوسوں کی شکلیں ایسی تھوڑی ہوتی ہیں۔ نہ ان کا  
پیار ہوتا ہے۔“ وہ ایک لمحے کے لئے رکا، پھر بولا۔ ”مگر تمہیں کس نے بتایا کہ ہمارے  
میں دشمن کے جاسوس کس آئے ہیں؟“

”ترن کوزی کو اپنا بچاؤ مشکل ہو گیا۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔“ ”سرکاش تم سرا  
بیٹھے ہو۔ تمہیں شہر کا پتہ نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے تم جانتے ہو کہ میرا باپ بیمار ہے  
کے علاج کے لئے میں جگہ جگہ جاتی ہوں۔ کچھ دن پہلے میں دمشق گئی تھی۔ وہیں  
بات معلوم ہوئی تھی۔ دمشق سے واپس آ کر میں نے سوچا تھا کہ جعفر کو یہ بات بتاؤ  
مگر پاپا کی بیماری کی وجہ سے فرصت نہ مل سکی اور جعفر گرفتار ہو گئے۔“

”مگر جعفر بھائی کو کیوں گرفتار کیا گیا۔ ان پر کس نے شبہ کیا؟ وہ مطمئن نہیں ہوا  
”شبہ تو ہر ایک پر ہو سکتا ہے۔ مجھ پر بھی۔ تم پر بھی۔“ ترن کوزی نے اسے  
کی کوشش کی۔ ”دشمن کے جاسوس سرانے میں ٹھہرتے ہیں۔ جعفر بھی بہت دن سے  
ٹھہرے تھے۔ ممکن ہے کہ کسی نے شبہ میں انہیں پکڑ لیا ہو۔“

کرنا اور اس کا ہر مذمے قیدیوں کی حفاظت کرتے تھے۔ عیسائی پادریوں کو اس کام کے صلے میں حکومت کی طرف بہت سی مراعات حاصل ہوتی تھیں جن سے وہ جائز اور ناجائز فائدے اٹھاتے تھے۔ ان پادریوں کو صرف مسلم حاکموں ہی سے فائدہ نہ پہنچتا تھا بلکہ یہ ساحل کی تمام عیسائی ریاستوں کے لئے بھی جاسوسی کرتے تھے اور اس طرح انہیں مسلمانوں اور پہلی بادشاہوں سے دہرا فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے دمشق کے دربار میں پہلی پادریوں کی بڑی آؤ بھگت ہوتی تھی۔

ترن کو زنی عبادت گاہ میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے باپ پادری فلپ کو بڑی بے چینی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے دیکھا۔ یہ وہی بیمار اور بوڑھا فلپ تھا جو دمشق سے آنے والے قافلے کے ساتھ بعلبک پہنچا تھا۔ فلپ دراصل اس عبادت گاہ کا بڑا پادری تھا۔ اس نے مطلع ایک پادری کا روپ دھارا تھا تاکہ بعلبک کے مسلمانوں کو اس پر کوئی شک نہ ہو سکے۔

فلپ پریشان دکھائی دے رہا تھا مگر تھا بہت چاق و چوبند۔ سراسر کی سرائے میں اسی مل کا پیار فلپ اس وقت چالیس سال سے بھی کم عمر کا معلوم ہو رہا تھا۔ حقیقت میں اس کی اصل عمر بھی اتنی ہی تھی۔

”تم کہاں گئی تھیں ترن؟“ فلپ نے ترن کو زنی کو داخل ہوتے ہی بڑی بے چینی سے سوال کیا۔

”جعفر سے ملنے مسمی تھی پاپا۔“ ترن کو زنی نے بے تکلف کہہ دیا۔

”ترن تمہیں جعفر کی پڑی ہے اور ہماری جائیں داؤ پر لگ گئی ہیں۔“ فلپ کا لہجہ بہت گوارا تھا۔

”کیا قیامت آگئی پاپا۔ آپ اس قدر جلد گھبرا کیوں جاتے ہیں۔“ ترن کو زنی کا لہجہ بھی نف ہو گیا ”میں بعلبک سرکار کی چوہیں کھنے کی ملازم تو نہیں کہ اپنا کوئی ذاتی کام ہی نہ کر سکوں۔“

فلپ نرم پڑ گیا۔ ”ترن۔ تو باپ کی محبت کو نہیں جانتی۔ تو میرے پاس اپنی مرحوم ماں کی لمانت ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تیری ماں کی روح سے شرمندہ ہوں۔ فلپ کی آنکھوں میں واقعی آنسو آ گئے۔“

”پاپا۔ اور ترن کو زنی نے آگے بڑھ کے باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال دئے“ میں بچی نہیں ہوں پاپا۔ آپ میری فکر نہ کیا کیجئے۔ میں اپنی حفاظت آپ کر سکتی ہوں۔“

”یہ تو بعلبک ہے مگر میں اپنے دل کو کیا کروں۔ ابھی دمشق سے لارنس آیا ہے۔ وہ

## شب گزیدہ

ترن کو زنی بڑی تیزی سے انٹینس کی عبادت گاہ کی طرف جاری تھی۔ سراسر نے جعفر کی گرفتاری کے جو حالات بیان کئے تھے اس سے ترن کو زنی نے اندازہ لگایا کہ بعلبک کے کوتوال برازق بویہ کو جعفر کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے اور اب جعفر کا بیچ جانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ برازق بڑا تندخو حاکم تھا جاسوسوں کے معاملے میں تو وہ اس قدر ظالم اور وحشی تھا کہ ان کے گرفتار ہونے ہی ان کی گردن اڑا دیا کرتا تھا مگر جعفر کی یہ خوش بختی تھی کہ جس دن اسے گرفتار کیا گیا اس دن برازق بویہ کو معنی الدین انز نے صلاح مشورے کے لئے دمشق بلوا لیا تھا۔ جعفر کو گرفتار کرنے والے دستے میں قاضی شہر اور کوتوال دونوں کے سوار شامل تھے۔ چونکہ کوتوال نے اس موقع پر موجود نہ تھا اس وجہ سے جعفر کو قاضی کے حضور پیش کیا گیا مگر قاضی نے اس کا بیچ کرنے سے گریز کیا۔ اسے خوف تھا کہ اگر اس نے جعفر کو قتل کرا دیا تو کہیں شہر کو اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرے۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ شہر کو قوال کی واپسی سے جعفر کو قید میں رکھا جائے اور اسے کوتوال کے آنے پر اس کے دربار میں حاضر کیا جائے۔ بعلبک میں صرف ایک قید خانہ تھا جہاں ہر قسم کے مجرم رکھے جاتے تھے مگر ہر قسم کے خطرناک لوگوں کو یا تو فوراً قتل کر دیا جاتا تھا یا پھر انہیں عیسائی عبادت گاہ میں رکھا جاتا تھا۔ ان عبادت خانوں میں بظاہر عیسائی عبادت و ریاضت میں مصروف نظر آتے اندرون خانہ یہ عبادت گاہیں سرکاری جیل خانے تھے۔ عبادت گاہ کا پادری

تیار رہا تھا کہ امیر موصل عماد الدین زنگی کا لشکر ایک بار پھر دمشق کا رخ کر رہا ہے۔

”یہ کوئی اہم خبر نہیں پایا۔“ ترن کوڑی افسردہ ہو گئی۔ ”میں شہر کو تو ال کی غلامی کرتے تھک چکی ہوں۔ میں ایک عورت بھی تو ہوں پایا۔ آپ یہ کیوں بھولتے ہیں کہ عورت کے اپنے بھی جذبات ہوتے ہیں۔ اب مجھ سے جاسوسی کام نہیں ہوتا۔ میں اس پر سکون زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اپنا گھر بنانا اور حقیقت میں عورت بننا چاہتی ہوں۔“

”ترن۔ بیٹی تو آج یہ کیسی باتیں کر رہی ہے۔“ فلپ نے اسے سینے سے الگ کر ہوئے کہا۔ میں نے تجھے جعفر سے ملاقات کرنے سے منع تو نہیں کیا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک خطرناک راستے پر چل رہی ہے اور اس کا انجام کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں مرنا چاہتا ہوں کہ تو احتیاط سے کام لے اور کوئی ایسا قدم نہ اٹھا جس سے تیرے اور جعفر تعلقات لوگوں کی نظروں میں آئیں اور ہماری عیسائی دنیا کسی مصیبت میں پھنس جائے۔“

”مگر میں تو مصیبت میں پھنس گئی ہوں پایا۔“ ترن کوڑی کا لہجہ اک دم سپاٹ اور آہو گیا۔

”کیسی مصیبت۔ کیا ہوا تجھے مجھے جلد بتا بیٹی؟“ فلپ نے گھبراہٹ میں ایک ماٹھ سوال کر ڈالے۔

”پاپا۔ اس مصیبت سے صرف آپ ہی مجھے بچا سکتے ہیں؟“

”تو مجھے غیر کیوں سمجھتے ہے ترن۔ تیری مصیبت۔ میری مصیبت ہے۔ تیرے لئے میں اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔ یہ سب پاپا تو تیرے ہی لئے بیل رہا ہوں۔ ورنہ میں ا تک روم چلا گیا ہوتا۔“ فلپ نے اپنی کمال شفقت کا اظہار کیا۔

”تو آپ میری مصیبت دور کرنے پر تیار ہیں؟“ ترن کوڑی نے اٹھلا کے کہا۔

”پگلی۔ مصیبت دور نہیں کروں گا تو کیا خوشی سے ناچوں گا۔“

”تو پھر جعفر کو بچا لیجئے پاپا۔“

فلپ چونک پڑا۔ کیا ہوا جعفر کو۔ مجھے تو اس کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں؟

ترن کوڑی نے بڑی افسردگی سے جواب دیا۔ ”پاپا۔ جعفر کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔“

آپ کو شاید ترن کوڑی کی باتوں سے اطمینان نہ ہوا۔ ”ترن کوڑی۔ تمہاری گفتگو سے بات واضح نہیں ہوتی۔ قاضی شہر کا کام صرف مقدمات پنپانا ہے۔ وہ کسی کی گرفتاری کا نہیں دے سکتا اور اگر اس نے یہ حکم دیا ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔“

ترن کوڑی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”پاپا۔ شہر کو تو ال نے قاضی پر یہ ذمہ داری بھی ڈالی کہ وہ مشتبہ لوگوں پر نظر رکھے اور ان کی ایک فہرست شہر کو تو ال کو ہفتے کے ہفتے بھجوایا۔“

اس ذمہ داری کے تحت قاضی کسی بھی شخص کو گرفتار کر سکتا ہے۔“

”لیکن فی میں تمہارا ساتھ ہر صورت دوں گا۔“ فلپ نے بڑی شفقت سے کہا۔

”جیسے میرے کام لیتا ہوگا۔ سردار برازق کو دمشق سے واپس آنے دو۔ ان کے واپس آنے پر اصل حالات معلوم ہو سکیں گے پھر اس کے مطابق کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔“

ترن کوڑی بے چین ہو گئی۔ جس گھڑی سے اسے جعفر کی گرفتاری کی خبر ملی تھی اسے

انداز رہے تھے اور طرح طرح کے دوسووں نے اسے گھیر لیا تھا۔ ”پاپا۔ آپ شہر کو تو ال

فی مزالی سے واقف نہیں اگر اس نے واپس آتے ہی جعفر کے قتل کا حکم دے دیا تو

پاپا؟“

یہ بات واقعی قابل غور تھی۔ فلپ بھی پریشان ہو گیا۔ ”بیٹی۔ مجھ جیسا مجبور انسان اپنی

سے آگے تو نہیں جاسکتا۔ میں بعلبک کا حاکم نہیں کہ جعفر کو فوراً آزاد کر دوں۔ یہ تو

دمشق کی مہمانی ہے کہ وہ پادریوں کا اس قدر خیال رکھتے ہیں۔“

”میں آپ سے اتفاق نہیں کرتی پاپا۔“ ترن کوڑی نے دغل دیا۔ ”سلطنت

نام پر کوئی احسان نہیں کرتی۔ شاہ دمشق ہم پر محض اس لئے مہمان ہے کہ یروشلیم

پر اور الہا وغیرہ کی عیسائی ریاستیں امیر موصل کے خلاف دمشق کی مدد کو ہر وقت تیار

ہیں پھر شاہ دمشق اور وزیر اعظم معین الدین انز نے ہماری ہر عبادت گاہ کو اپنا قید

خانہ رکھا ہے۔ ہم سے دمشق کے دشمنوں کے خلاف جاسوسی کام لیا جاتا ہے۔ کیا ان

خفا کے صلے میں آپ ان سے کچھ طلب نہیں کر سکتے؟“

فلپ بیٹی کی جذباتی تقریر سے گھبرا گیا۔ ”ترن کوڑی۔ جذباتی نہ بنو۔ یہ بڑا اہم مسئلہ

ہے۔ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ جعفر کی اصلیت کیا ہے اور اسے کس بنا پر گرفتار کیا گیا

ہے۔ اس وقت تک میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے کچھ وقت تو دو۔“

ترن کوڑی کے جذبات اور بھڑک اٹھے۔ اس نے زور دے کے کہا۔ ”پاپا۔ فرض کیجئے

کہ اگر گرفتاری کا حکم قاضی نے دیا ہو۔ شہر کو تو ال اس وقت دمشق گیا ہوا ہے اس بات

امکان ہے کہ ہو گرفتاری کا حکم دیکر گیا ہو۔“ ترن کوڑی کی سمجھ میں جو کچھ آیا وہ جان



کی کوشش نہیں کریں گے؟“

”میں قبل از وقت کچھ نہ کہہ سکتا ترن۔“ فلپ نے اسے ٹھٹھا کر کے کہا۔ ”مگر یہ یقین رکھو کہ جعفر کو آزاد کرانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھوں گا۔“

”پاپا۔ آپ مجھ سے صاف الفاظ میں وعدہ کیجئے کہ آپ جعفر کو آزاد کرالیں۔“

اس کے لئے آپ کو کوئی بھی قربانی دینا پڑے۔“ ترن کو زنی ضد پکڑ گئی۔ جب تک کہ نہ کریں گے میں پانی تک نہ پیوں گی۔“

دنیا میں تین طرح کی ضدیں مشہور ہیں۔ جن کی وجہ سے بعض اوقات ار دھارے تک بدل گئے ہیں۔ ضد یا ہمت کی ایک قسم کو راج ہٹ کہتے ہیں۔ راجہ۔ بادشاہ یا حاکم وقت ضد پر آجائے تو ہزاروں بے گناہوں کا خون بہہ جاتا ہے۔ تک راجہ کی ضد پوری نہ ہوا اسے چین نہیں ملتا۔ دوسری ضد۔ تریا ہٹ کہلاتی۔ خواتین کی ضد ہے جسے مردوں کو جان پر کھیل کے پورا کرنا پڑتا ہے۔ تیسری اور ضد۔ بالک ہٹ کہلاتی ہے۔ یعنی اولاد کی ضد۔ اولاد کی ضد کو بھی والدین پورا کر مجبور ہوتے ہیں اور اگر یہ پوری نہ کی جائے تو اس کے اکثر خطرناک نتیجے برآمد ہوتے ترن کو زنی کی ضد۔ بالک ہٹ کے تحت آئی تھی۔ فلپ کے لئے یہ کسی طرح تھا کہ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کی بات اور بات بھی وہ جو ضد کی صورت اختیار کر چکا تھا جائے یا انکار کرے۔ فلپ کو بھی ہتھیار ڈالنا پڑے۔

”چل ترن کو زنی کھانا کھالے۔ جو تو چاہتی ہے وہی ہوگا۔ میں تیرے جعفر لاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔“

ترن کو زنی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ باپ کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئی۔ فلپ نے جعفر کو چھڑانے کا وعدہ تو کر لیا تھا مگر وہ سخت متشکر تھا۔ اسے اب نہ معلوم ہو سکا تھا کہ جعفر کو کس کے حکم سے اور کس جرم کے تحت گرفتار کیا اسے یہ تو اعتبار تھا کہ اگر وہ شر کو تو ال کے سامنے اپنی بات پر اڑ گیا تو اسے فلپ کا ماننا پڑے گا۔ فلپ کے نہ صرف برازق بویہ سے اچھے مراسم تھے بلکہ اس کی بیٹی وزیر اعظم معین الدین انز تک بھی تھی۔ انز نے فلپ سے بہت سے کام لئے تھے۔ یروٹلم کے درمیان خط و کتابت اور پیام و سلام فلپ کے ذریعے ہی ہوتے تھے فلپ طرف سے عیسائی جاسوسوں کا سربراہ بھی تھا۔ خود ترن کو زنی نے بھی انز کے بہت کام انجام دیئے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ترن کو زنی اب بھی پریشان تھی۔ اپنے ذرائع سے جعفر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی بہت کوشش کی

مہمانی نہ ہوتی تھی۔

فلپ کے دوران فلپ اور ترن کو زنی دونوں ہی خاموش رہے۔ وہ اپنے اپنے خیال میں ترن کو زنی کو اس بات کا احساس تھا کہ اس نے باپ سے ایک ایسی بات کی تھی جو کسی طرح مناسب نہ تھی لیکن وہ اپنے دل کو کیا کرتی۔ جعفر کی محبت ایک ہی بات میں اس کے دل میں کچھ اس طرح گھر کر گئی تھی کہ وہ اس کے لئے سب کچھ کر پڑا تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ جعفر کو آزاد کرانے کے بعد وہ اس سے گھر کی درخواست کرے گی اور اگر جعفر آمادہ ہو گیا تو اسے ساتھ لے کر کسی ایسے ملک جانے کی جہاں نہ ملکی سیاست کے جھیلے ہوں اور نہ اسے ریشہ دوانیوں سے حصہ لینا پڑے۔ سب باتیں بعد کی تھیں۔ سب سے اہم معاملہ تو جعفر کی رہائی کا تھا۔ کھانے پر فلپ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ترن کو زنی۔ جعفر کی رہائی میں تجھے میرا ساتھ دینا

میں نے کب انکار کیا ہے پاپا۔ جعفر کے لئے میں جان پر کھیل جاؤں گی۔ ترن نے بڑے جوش سے کہا۔

فلپ نے اسے سمجھایا۔ ”ترن کو زنی۔ ہر کام منصوبہ بنا کر کیا جاتا ہے۔ اس سے تو تو

ترن کو زنی جانے کیوں چڑ گئی۔ ”پاپا۔ آپ کو ملک فتح نہیں کرنا ہے صرف جعفر کو آزاد کرانے کے لئے کسی لمبی چوڑی منصوبہ بندی کی کیا ضرورت ہے۔ آپ شر کو تو ال کے لئے وہ جعفر کو آزاد کر دیں میرا خیال ہے کہ شر کو تو ال آپ کی بات نہ ٹال سکے

فلپ نے سوچ کے کہا۔ ”اگر برازق بویہ نے پوچھا کہ تمہارا ایک مسلمان سے کیا بات ہوئی تو اس کا جواب دوں گا۔ اسے یہ سوال کرنے کا حق ہے اور وہ یہ ضرور پوچھے

ترن کو زنی کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ وہ دیر تک ابھتی رہی پھر اک دم بولی۔ ”آپ کہہ اگر جعفر نے کسی وقت آپ پر احسان کیا تھا اور آپ اس احسان کا بدلہ چکانا چاہتے

مگر اگر برازق بویہ نے سوال کیا کہ تمہیں جعفر کی گرفتاری کی خبر کس نے دی تو میں یہ نہیں کہہ سکتی۔ تو یہ بھی معلوم کہ جعفر کو کس جگہ قید کیا گیا ہے؟“

ترن کو زنی جھلا اٹھی۔ ”پاپا شر کو تو ال کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ اس طرح کے فضول

سوالات کرتا پھرے۔ بہر حال میں یہ پتہ لگا لوں گی کہ جعفر کو کہاں رکھا گیا ہے؟  
”ہو سکے تو یہ بھی معلوم کرانا کہ اسے کیوں اور کس کے حکم سے گرفتار کیا  
”اس بات کی بھی کوشش کروں گی۔“

ترن کوزی کو جعفر کی گرفتاری نے اس قدر بدحواس کر دیا تھا کہ کھانا کھا  
نے باہر جانے کا قصد کیا۔ اس کا باپ اگرچہ ترن کوزی اور جعفر کے معاملات  
تھا لیکن عیسائی پھر پادری ہونے کی حیثیت سے وہ اس بات کو پسند نہ کرتا تھا کہ  
اپنے منگیتر لارنس کو بھول کے جعفر کی محبت میں دیوانی ہو جائے۔ ایک بات یہ  
تھی کہ ترن کوزی ایک یتیم بچی تھی اور فلپ نے اسے گود لے کے اپنی بیٹی  
تھا۔ یہ بات کس طرح ترن کوزی کے کانوں تک بھی پہنچی تھی اور اس سلسلے  
فلپ سے بڑی طویل گفتگو کی تھی اور فلپ نے بڑی جرأت سے اس افواہ کی تردید  
اور ترن کوزی کو پوری طرح یقین دلادیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی ہے اور یہ بد  
دشمنوں نے اڑائی ہے۔ دوسری طرف لارنس تھا جو فلپ کی سگی بہن کا بیٹا تھا۔  
لارنس کو بھی گود لے لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جوان ہونے پر وہ ترن کوزی کو  
شادی کر دے گا اور اپنی تمام خفیہ دولت ان کے حوالے کر کے تسکین قلب  
چلا جائے گا کیونکہ روم عیسائیوں کا سب سے معتبر مقام تھا اور وہاں لارنس پادری  
کا فائز کھاتا تھا۔

لارنس کے طور طریق بچپن ہی سے اچھے نہ تھے۔ اس کے ہوش سنبھالنے  
اس کے والدین اللہ کو پارے ہو گئے تھے۔ فلپ کے لاڈ پیار نے اسے اور  
اس کی حرکتیں کچھ اس قسم کی تھیں کہ ترن کوزی اس کی صورت دیکھنا بھی  
تھی پھر جب ترن کوزی نے جوانی میں قدم رکھا اور فلپ نے اپنا عندیہ اس پر  
ترن کوزی نے لارنس سے شادی کرنے سے قطعی انکار کر دیا اور صاف الفاظ میں  
اگر زیادہ مجبور کیا گیا تو وہ انیتونس کی عبادت گاہ کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے گی  
کا باپ تھا یا نہیں تھا۔ اس سے قطع نظر اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اسے ترن  
بے انتہا محبت تھی۔ ترن کوزی زبور حسن کے علاوہ عقل و خرد سے بھی بہرہ ور  
فلپ کو مذہبی معاملات کی ادائیگی کے علاوہ حکومت وقت کے لئے جاسوسی بھی کر  
اس لیے وہ ہر وقت پریشان رہتا تھا۔ فلپ کی اس پریشانی کو ترن کوزی نے  
تھا۔ اس نے فلپ کے جاسوسی کے کام کو اپنے ذمہ لے لیا تھا اور وہ اس کام  
ماہر ہو گئی تھی کہ دس دن میں ہونے والے کام کو وہ دو دن میں نمٹا دیتی تھی۔

ارن کو یہ زعم تھا کہ وہ انیتونس کی عبادت گاہ کے پادری ہونے کے علاوہ ترن کوزی  
بڑی ہے اس لئے ترن کوزی کو اس کا رعب ماننا چاہیے مگر ترن کوزی اس کی کسی  
بہن نہ دھرتی تھی بلکہ کھلے عام اس کا تمسخر اڑاتی تھی۔ لارنس اس کی ان باتوں  
بہن تھا مگر اسے صبر کرنا پڑتا۔ فلپ ہمیشہ ترن کوزی کی طرف داری کرتا۔ لارنس  
نے انیتونس کا گرجا چھوڑنے کا ارادہ کر لیا لیکن اس طرح وہ فلپ کی تمام خفیہ  
سے محروم ہو جاتا تھا اس لئے اس نے بڑے صبر سے کام لیا اور ترن کوزی کی تبلیغ و  
ایکادانت کرتا رہا۔

ہر ایک دن لارنس اور ترن کوزی میں کسی بات پر سخت جھگڑا ہوا۔ دونوں نے ایک  
سے پر غلط الزام لگائے۔ تو تو میں میں سے نوبت ہاتھ پائی تک پہنچ گئی۔ فلپ اس دن  
ہاتھ پائی سے ملنے گیا ہوا تھا۔ وہ واپس آیا تو دونوں اس وقت بھی دست و  
پائی تھے۔

ترن کوزی نے باپ کو دیکھتے ہی چیخ ماری تھی۔ ”پاپا اگر اس شیطان سے میری شادی  
ہو تو میں خود کشی کر لوں گی۔“ فلپ سنائے میں آگیا تھا۔ اس نے ترن کوزی کو  
ہاتھ کی بہت کوشش کی مگر ترن کوزی نے ایک نہ سنی اور صاف الفاظ میں اعلان کر دیا۔  
بات گاہ انیتونس میں لارنس اور ترن کوزی میں سے صرف ایک ہی ہستی رہ سکتی ہے۔  
اگر لارنس کو یہاں سے نہیں نکالتے تو میں خود کشی اور جگہ چلی جاؤں گی۔“

فلپ کی آخری امید بھی توڑ گئی۔ ترن کوزی اس کی بیٹی بھی تھی اور اس کا آدھا کام  
مالے ہوئی تھی اسے فلپ اپنے سے جدا نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے اپنے عزیز اور  
وہ بھانپے لارنس کو اسی وقت عبادت گاہ سے بیک بنی اور دو گوش ہمیشہ کے لئے نکال  
رکھا تھا۔ لارنس بد معاش ہونے کے ساتھ لالچی اور بے غیرت بھی تھا۔ اسے ترن کوزی  
انادہ فکر نہ تھی لیکن وہ فلپ کی دولت چھوڑنے پر تیار نہ تھا۔ اس نے فلپ کے حکم  
”افرا“ قیل کی اور عبادت گاہ چھوڑ کے چلا گیا مگر یہ سب اس کا فریب تھا۔ کچھ دنوں  
اس نے اس عبادت کا رخ نہ کیا مگر پھر کسی نہ کسی طرح آنے جانے لگا۔ وہ عام طور پر  
بے وقت گرجا پہنچتا جب ترن کوزی وہاں موجود نہ ہوتی۔ اس کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی  
تھا کہ ترن کوزی سے اس کا سامنا نہ ہو مگر پھر ایک بار ان دونوں کا سامنا ہو ہی گیا۔  
اس نے اس کی طرح سر جھکا کے دوسری طرف نکل گیا اور ترن کوزی صرف مسکرا کر رہ  
تھا۔ اس نے باپ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہ کی۔ وہ فلپ کا دل نہیں دکھانا چاہتی تھی  
مگر فلپ نے لارنس کو بھی بالکل اس طرح پالا تھا جیسے وہ ترن کوزی کی پرورش کر رہا تھا

اس طرح لارنس اور ترن کوزی میں ایک خاموش معاہدہ ہو گیا۔ ترن کوزی اس کے اعتراض نہ کرتی اور لارنس نہ اس سے گفتگو کرتا اور نہ اس کے کسی کام میں دخل دیتا۔



جعفر نے قید کی کوٹھری میں ترن کوزی کی آواز سنی تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس ترن کوزی کے سوال کے جواب دے کر قید خانے میں اپنی موجودگی کا یقین بھی دلا دیا مگر پھر ترن کوزی کی آواز جیسے باہر کی فضا میں تھلیل ہو گئی۔ جعفر نے کئی بار چیخ کر اسے پکارا مگر اس کی آواز صدا بصر ثابت ہوئی آخر وہ تھک کر ایک طرف پڑ رہا۔ اس غنودگی سے طاری ہو گئی تھی پھر جب اس کی آنکھ کھلی تو روشندان کی سلاخوں سے چم ہوئی روشنی کی لکیروں اس کی کوٹھری میں لہرا رہی تھیں۔ جعفر نے گزشتہ واقعات یاد کر کی کوشش کی تو اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس نے ایک خواب دیکھا تھا جسے وہ غلطی سے حقیقت سمجھ بیٹھا تھا۔

جعفر کی طبیعت اس قدر مضطرب ہوئی کہ وہ دوپہر کا کھانا بھی ٹھیک سے نہ کھا سکا۔ اپنے ذہنی انتشار پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا۔ قید کے دن کسی نہ کسی طرح وہ گزار رہا تھا رات کے خواب یا واقعات نے اسے جھنجھور کر رکھ دیا تھا۔ وہ سوچتا کہ کاش اس نے خواب نہ دیکھا ہوتا جس نے اس کے سکون کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر اسے کیا معلوم ترن کوزی واقعی اس کی محبت میں اپنی جان کو ہلکان کر رہی تھی اور پتہ نہیں اس کی رہائی کے لئے کہاں کہاں ماری پھر رہی تھی۔

فلپ نے ترن کوزی سے جعفر کی رہائی کا وعدہ کر لیا تھا مگر یہ شرط لگا دی تھی کہ ہعلیک کے شر کو تو ال برازق بویہ کے دمشق سے واپس آنے سے پہلے وہ یہ پتہ لگائے کہ جعفر کو کس جرم میں اور کس کے حکم سے گرفتار کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم کرے کہ جعفر کو کس جگہ قید کیا گیا ہے۔ جعفر کی گرفتاری اس قدر اچانک اور غیر معمولی حالات میں ہوئی تھی کہ ترن کوزی اپنی تمام کوششوں کے باوجود یہ نہ معلوم کر سکی کہ جعفر کو کیوں اور کس نے گرفتاری کا حکم دیا ہے۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد ترن کوزی نے اپنی تمام توجہ جعفر تک پہنچنے کی کوشش پر لگا دی۔

ہعلیک میں اینٹوئیس کی عبادت گاہ کے علاوہ چھوٹے بڑے اکیس اور گرجا گھر جنہیں شر کو تو ال اپنے خاص قیدیوں کے لئے استعمال کرتا تھا۔ یہ تمام عبادت گاہیں فلپ کے ماتحت یا زیر اثر تھیں۔ چونکہ ترن کوزی پادری فلپ کی بیٹی مشہور تھی اس لئے عبادت گاہ ترن کوزی کے لئے کھلی تھی اور وہ ہر جگہ بغیر کسی ریشائی کے جاسکتی تھی۔

فلپ کی کسی عبادت گاہ میں قید کیا گیا تھا تو اس کے بارے میں ترن کوزی ایک دو کے اندر معلومات حاصل کر سکتی تھی مگر جعفر چونکہ ایک مسلمان جوان اور مشتبہ شخص کے لئے ترن کوزی جعفر کے بار میں کھلے بندوں کچھ پوچھتے ہوئے گھبراتی تھی وہ نہیں اس سے کہ وہ ابھی سے بدنامی اور جگ ہنسائی مول لے۔ باپ سے تو اس نے سب کچھ سنا تھا کہ دیا تھا مگر یہ بات سب کے سامنے تو نہیں کہی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ اس میں بھی ان دنوں ہعلیک موجود تھا۔ ترن کوزی لارنس سے ڈرتی تو نہ تھی مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ لارنس جیسے ذلیل آدمی کو اس کے عشق کا حال معلوم ہو۔

لارنس نے بظاہر ترن کوزی کا پیچھا چھوڑ دیا تھا اور اسے صرف فلپ کی دولت کی تمنا رہی ترن کوزی کو دیکھ کے اکثر اس کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور یہ آرزو رہتی اپنے لگنے لگتی تھی کہ کاش ترن کوزی بھی اس کے ہاتھ آجائے تاکہ اسے کسی قسم کا راز دہ جائے۔ ترن کوزی کے سخت رویے سے وہ جلا بھی ہوا تھا۔ اور اس کے ذہن انعام کا ایک دبا ہوا جذبہ کبھی کبھی سر اٹھایا کرتا تھا مگر اس کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔ اس رات ترن کوزی سے بے تعلق ہونے کے باوجود اس سے اپنا ایک تعلق جوڑے ہوئے اور کی ایسے موقع کی تلاش میں تھا کہ ترن کوزی کو میٹھی مار مارے۔ وقت کے ساتھ ان کا اشتیاق جذبہ پرورش پاتا رہا اور پھر اسے ایک ایسا موقع ہاتھ آگیا جس کا وہ منتظر تھا۔

اور ترن کوزی اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ وہ بڑی احتیاط اور عقل مندی سے ایک ایک ایک عبادت خانے کے چکر لگا رہی تھی۔ ترن کوزی کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ جہاں جاتی اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا لیکن وہ بجائے کھل کے بات کرنے کے گھما پھرا کر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتی اور جب تک اسے یقین نہ نہ کہ جعفر اس عبادت گاہ میں نہیں ہے اس وقت تک وہ برابر وہاں جاتی رہتی۔ کتنے بار وہ اپنے بندہ یعنی اگر غلوں دل سے کسی چیز کی تلاش کی جائے تو وہ اسے مل جاتی ہے اس لئے کہ اسے تو انسان کو خدا مل جاتا ہے۔ آخر کرتے کرتے ترن کوزی اپنے محبوب کی طرف تک پہنچ گئی۔ پھر جب ترن کوزی نے جعفر کو آواز دے کر اس بات کی تصدیق کر لی کہ اس کوٹھری میں جعفر ہی قید ہے تو وہ اس قدر خوش ہوئی کہ جعفر کو تسلی دینے کے لئے فوراً وہاں سے واپس آگئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسی وقت باپ کو اپنی کامیابی کی خبر دے مگر جب وہ اینٹوئیس کی عبادت گاہ پہنچی تو نصف شب سے زیادہ گزر چکی تھی اور اسے اپنے کمرے میں بے خبر سو رہا تھا۔ مجبوراً ترن کوزی کو صبح کا انتظار کرنا پڑا۔

جب وہ ترن کوزی نے بات کے کمرے کا رخ کیا۔ فلپ ابھی سو کر اٹھا تھا کہ

ترن کوڑی ہنسی ہوئی داخل ہوئی اور دوڑ کے باپ سے لپٹ گئی۔

”کیا ہوا ترن کوڑی۔ بہت خوش نظر آ رہی ہے؟“ فلپ نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

”میں نے جعفر کا پتہ لگا لیا پایا۔“ ترن کوڑی مارے خوشی کے دیوانی ہوئی جاری کر دے۔

”چلو یہ اچھا ہوا۔“ فلپ نے اسے اپنے سے الگ کیا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

”ابھی اچھا کہاں ہوا۔ اچھا تو جب ہو گا جب آپ جعفر کو چھڑا کے لائیں گے۔“ ترن کوڑی کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔ ہنسی اس کی آنکھوں سے پھوٹی پڑتی تھی۔

”اچھا اچھا۔ وہ بھی ہو جائے گا۔ جا۔ منہ ہاتھ دھو ڈال۔ کچھ کھا پی کے اطمینان سے باتیں کریں گے۔“ فلپ اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔

”پاپا۔ ابھی باتیں کر لو۔ میرا کچھ اور کرنے کو جی نہیں چاہ رہا ہے۔“ ترن کوڑی انور کے بولی۔

”بگلی کیس کی۔ میں کہیں بھاگا تو نہیں جا رہا ہوں۔“

ترن کوڑی کو مجبور ہو کے اپنے کمرے میں جانا پڑا۔ فلپ نے غسل کیا۔ پھر صبح کچھ اور کام نمٹائے۔ اتنے میں دو ملاقاتی آگئے۔ انہوں نے کافی وقت لے لیا۔ ترن کوڑی تیار ہو کہ بیٹھی تھی اور بار بار باپ کے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی مگر فلپ اب تک فارغ نہ ہوا تھا۔ ترن کوڑی آنے والوں کو دل ہی دل میں کوس رہی تھی اور بڑبڑا رہی تھی۔ فلپ کافی دن چڑھے اپنے کاموں سے فارغ ہوا۔ ترن کوڑی اسے اکیلا دیکھ کر کمرے سے نکل کے بھاگی اور دوڑتی ہوئی فلپ کے کمرے میں پہنچ گئی۔

اب یہ ترن کوڑی کی بد قسمتی تھی کہ ٹھیک اس وقت جب وہ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے سے فلپ کے کمرے کی طرف جا رہی تھی ٹھیک اسی وقت لارنس عبادت گاہ میں داخل ہوا تھا۔ ترن کوڑی کو بھاگتا دیکھ کر لارنس کے قدم ایک دم رک گئے اور اس کی چھٹی ٹہری بڑی تیزی سے کام کرنے لگی۔ اس نے ترن کوڑی کو پہلی بار اس قدر بے تحاشہ بھاگتے دیکھا تھا۔ ترن کوڑی کی اس اضطرابی کیفیت نے اسے لارنس کی نظروں میں مشکوک بنادیا۔ وہ اپنی جگہ کھڑا تھا اور اس کا دماغ بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ترن کوڑی بھاگتی ہوئی کھلا گئی ہے۔ کیا اسے فلپ نے بلایا تھا۔ مگر ترن کوڑی کو بلائے کون گیا تھا۔ ترن کوڑی اپنے کمرے سے اکیلی نکلی تھی۔ یقیناً ”ترن کوڑی کو کوئی ایسی خبر ملی تھی جسے وہ ایک لمحہ صاف کر کے بغیر فلپ تک پہنچانا چاہتی تھی جہاں وہ بھاگ کے گئی ہے۔“

لارنس دیر تک وہیں کھڑا الجھتا رہا مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پھر اک دم اس سے ملے میں تجسس کا جذبہ پیدا ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ معلوم کرے کہ ترن کوڑی کوئی خبر لے

کے پاس آئی ہے۔ مگر وہ یہ کیسے معلوم کرے۔ لارنس کچھ ضروری باتیں کرنے آیا تھا لیکن ضروری تھیں کہ اگر وہ ترن کوڑی کی موجودگی میں بھی فلپ کے پاس چلا جائے تو ترن کوڑی کو آج صبح ملاقات کے لئے کہا تھا مگر اس کے جانے سے وہ ترن کوڑی کو نہیں معلوم کر سکتا تھا جو اس کے دل میں گدگدی پیدا کر رہی تھی۔

اس بات کو نہ سمجھ کر فلپ کے کمرے کی طرف دیکھا۔ فلپ کے کمرے کا ایک پٹ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ چکر لگا کر فلپ کے کمرے پر جائے تو اندر والوں سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

رہنے والے دل مضبوط۔ کیا وہ چند قدم پیچھے ہٹا پھر تھوڑا چکر لگا کر آہستہ آہستہ اندر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد لارنس کمرے کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اندر سے ترن کوڑی کے زور زور سے بولنے آواز آرہی تھی وہ لہک لہک کر اپنے کارگزاری بیان کر رہی تھی یوں تو وہ روز ہی اپنی دن بھر کی تک و دو سے گزار رہی تھی لیکن آج پہلے اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی اس کا لہجہ پرشمرہ اور بے ہوش تھی لیکن آج تو وہ کامیاب اور کامراں تھی۔ اس نے جعفر کا پتہ لگا لیا تھا۔ آواز کیوں نہ تیز ہوئی۔ ترن کوڑی ایک ایک عبادت گاہ کی تفصیل بیان کرتی کہ وہاں گئی اور کس سے کس سے ملی پھر اس نے کس انداز سے اپنا مقصد پوشیدہ کر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

کوڑی کی آواز باہر کھڑے ہوئے لارنس تک بالکل صاف پہنچ رہی تھی۔ جعفر کے چہرے پر جلد ہی اسے ترن کوڑی کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ جعفر کوئی مشتبہ شخص ہے۔ عجبک میں گرفتار کیا گیا ہے اور ترن کوڑی اسے رہا کرنا چاہتی ہے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ ترن کوڑی اور جعفر میں گہرے تعلقات ہیں اور ترن کوڑی اسے آزاد کرانے کے لئے جلد عجبک سے بھاگ دینا چاہتی ہے۔ جعفر کے بارے میں اسے کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکیں کیونکہ خود ترن کوڑی اس کے بارے میں تفصیل سے نہ جانتی تھیں۔ بات واضح ہو گئی کہ ترن کوڑی اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور اس کی رہائی کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہے۔

لارنس نے انور کے اندر اگرچہ سناٹا چھایا ہوا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ لارنس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے وہ کھڑکی کے پاس آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اس وقت فلپ سے گفتگو کرے یا واپس چلا جائے۔

لارنس نے دل مضبوط۔ کیا وہ چند قدم پیچھے ہٹا پھر تھوڑا چکر لگا کر آہستہ آہستہ اندر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد لارنس کمرے کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اندر سے ترن کوڑی کے زور زور سے بولنے آواز آرہی تھی وہ لہک لہک کر اپنے کارگزاری بیان کر رہی تھی یوں تو وہ روز ہی اپنی دن بھر کی تک و دو سے گزار رہی تھی لیکن آج پہلے اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی اس کا لہجہ پرشمرہ اور بے ہوش تھی لیکن آج تو وہ کامیاب اور کامراں تھی۔ اس نے جعفر کا پتہ لگا لیا تھا۔ آواز کیوں نہ تیز ہوئی۔ ترن کوڑی ایک ایک عبادت گاہ کی تفصیل بیان کرتی کہ وہاں گئی اور کس سے کس سے ملی پھر اس نے کس انداز سے اپنا مقصد پوشیدہ کر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

کوڑی کی آواز باہر کھڑے ہوئے لارنس تک بالکل صاف پہنچ رہی تھی۔ جعفر کے چہرے پر جلد ہی اسے ترن کوڑی کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ جعفر کوئی مشتبہ شخص ہے۔ عجبک میں گرفتار کیا گیا ہے اور ترن کوڑی اسے رہا کرنا چاہتی ہے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ ترن کوڑی اور جعفر میں گہرے تعلقات ہیں اور ترن کوڑی اسے آزاد کرانے کے لئے جلد عجبک سے بھاگ دینا چاہتی ہے۔ جعفر کے بارے میں اسے کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکیں کیونکہ خود ترن کوڑی اس کے بارے میں تفصیل سے نہ جانتی تھیں۔ بات واضح ہو گئی کہ ترن کوڑی اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور اس کی رہائی کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہے۔

لارنس نے انور کے اندر اگرچہ سناٹا چھایا ہوا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ لارنس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے وہ کھڑکی کے پاس آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اس وقت فلپ سے گفتگو کرے یا واپس چلا جائے۔

لارنس نے دل مضبوط۔ کیا وہ چند قدم پیچھے ہٹا پھر تھوڑا چکر لگا کر آہستہ آہستہ اندر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد لارنس کمرے کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اندر سے ترن کوڑی کے زور زور سے بولنے آواز آرہی تھی وہ لہک لہک کر اپنے کارگزاری بیان کر رہی تھی یوں تو وہ روز ہی اپنی دن بھر کی تک و دو سے گزار رہی تھی لیکن آج پہلے اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی اس کا لہجہ پرشمرہ اور بے ہوش تھی لیکن آج تو وہ کامیاب اور کامراں تھی۔ اس نے جعفر کا پتہ لگا لیا تھا۔ آواز کیوں نہ تیز ہوئی۔ ترن کوڑی ایک ایک عبادت گاہ کی تفصیل بیان کرتی کہ وہاں گئی اور کس سے کس سے ملی پھر اس نے کس انداز سے اپنا مقصد پوشیدہ کر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

کوڑی کی آواز باہر کھڑے ہوئے لارنس تک بالکل صاف پہنچ رہی تھی۔ جعفر کے چہرے پر جلد ہی اسے ترن کوڑی کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ جعفر کوئی مشتبہ شخص ہے۔ عجبک میں گرفتار کیا گیا ہے اور ترن کوڑی اسے رہا کرنا چاہتی ہے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ ترن کوڑی اور جعفر میں گہرے تعلقات ہیں اور ترن کوڑی اسے آزاد کرانے کے لئے جلد عجبک سے بھاگ دینا چاہتی ہے۔ جعفر کے بارے میں اسے کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکیں کیونکہ خود ترن کوڑی اس کے بارے میں تفصیل سے نہ جانتی تھیں۔ بات واضح ہو گئی کہ ترن کوڑی اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور اس کی رہائی کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہے۔

لارنس نے انور کے اندر اگرچہ سناٹا چھایا ہوا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ لارنس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے وہ کھڑکی کے پاس آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اس وقت فلپ سے گفتگو کرے یا واپس چلا جائے۔

لارنس نے دل مضبوط۔ کیا وہ چند قدم پیچھے ہٹا پھر تھوڑا چکر لگا کر آہستہ آہستہ اندر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد لارنس کمرے کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اندر سے ترن کوڑی کے زور زور سے بولنے آواز آرہی تھی وہ لہک لہک کر اپنے کارگزاری بیان کر رہی تھی یوں تو وہ روز ہی اپنی دن بھر کی تک و دو سے گزار رہی تھی لیکن آج پہلے اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی اس کا لہجہ پرشمرہ اور بے ہوش تھی لیکن آج تو وہ کامیاب اور کامراں تھی۔ اس نے جعفر کا پتہ لگا لیا تھا۔ آواز کیوں نہ تیز ہوئی۔ ترن کوڑی ایک ایک عبادت گاہ کی تفصیل بیان کرتی کہ وہاں گئی اور کس سے کس سے ملی پھر اس نے کس انداز سے اپنا مقصد پوشیدہ کر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

کوڑی کی آواز باہر کھڑے ہوئے لارنس تک بالکل صاف پہنچ رہی تھی۔ جعفر کے چہرے پر جلد ہی اسے ترن کوڑی کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ جعفر کوئی مشتبہ شخص ہے۔ عجبک میں گرفتار کیا گیا ہے اور ترن کوڑی اسے رہا کرنا چاہتی ہے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ ترن کوڑی اور جعفر میں گہرے تعلقات ہیں اور ترن کوڑی اسے آزاد کرانے کے لئے جلد عجبک سے بھاگ دینا چاہتی ہے۔ جعفر کے بارے میں اسے کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکیں کیونکہ خود ترن کوڑی اس کے بارے میں تفصیل سے نہ جانتی تھیں۔ بات واضح ہو گئی کہ ترن کوڑی اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور اس کی رہائی کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہے۔

لارنس نے انور کے اندر اگرچہ سناٹا چھایا ہوا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ لارنس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے وہ کھڑکی کے پاس آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اس وقت فلپ سے گفتگو کرے یا واپس چلا جائے۔

لارنس نے دل مضبوط۔ کیا وہ چند قدم پیچھے ہٹا پھر تھوڑا چکر لگا کر آہستہ آہستہ اندر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد لارنس کمرے کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اندر سے ترن کوڑی کے زور زور سے بولنے آواز آرہی تھی وہ لہک لہک کر اپنے کارگزاری بیان کر رہی تھی یوں تو وہ روز ہی اپنی دن بھر کی تک و دو سے گزار رہی تھی لیکن آج پہلے اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی اس کا لہجہ پرشمرہ اور بے ہوش تھی لیکن آج تو وہ کامیاب اور کامراں تھی۔ اس نے جعفر کا پتہ لگا لیا تھا۔ آواز کیوں نہ تیز ہوئی۔ ترن کوڑی ایک ایک عبادت گاہ کی تفصیل بیان کرتی کہ وہاں گئی اور کس سے کس سے ملی پھر اس نے کس انداز سے اپنا مقصد پوشیدہ کر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔

کوڑی کی آواز باہر کھڑے ہوئے لارنس تک بالکل صاف پہنچ رہی تھی۔ جعفر کے چہرے پر جلد ہی اسے ترن کوڑی کی باتوں سے معلوم ہو گیا کہ جعفر کوئی مشتبہ شخص ہے۔ عجبک میں گرفتار کیا گیا ہے اور ترن کوڑی اسے رہا کرنا چاہتی ہے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ ترن کوڑی اور جعفر میں گہرے تعلقات ہیں اور ترن کوڑی اسے آزاد کرانے کے لئے جلد عجبک سے بھاگ دینا چاہتی ہے۔ جعفر کے بارے میں اسے کچھ زیادہ معلوم نہ ہو سکیں کیونکہ خود ترن کوڑی اس کے بارے میں تفصیل سے نہ جانتی تھیں۔ بات واضح ہو گئی کہ ترن کوڑی اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور اس کی رہائی کے لئے سب کچھ کرنے پر تیار ہے۔

لارنس نے انور کے اندر اگرچہ سناٹا چھایا ہوا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی آدمی نظر آتا تھا۔ لارنس سے زیادہ معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی اس لئے وہ کھڑکی کے پاس آیا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اس وقت فلپ سے گفتگو کرے یا واپس چلا جائے۔

لارنس نے دل مضبوط۔ کیا وہ چند قدم پیچھے ہٹا پھر تھوڑا چکر لگا کر آہستہ آہستہ اندر کے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔ ذرا دیر بعد لارنس کمرے کی کھڑکی پر پہنچ گیا۔ اندر سے ترن کوڑی کے زور زور سے بولنے آواز آرہی تھی وہ لہک لہک کر اپنے کارگزاری بیان کر رہی تھی یوں تو وہ روز ہی اپنی دن بھر کی تک و دو سے گزار رہی تھی لیکن آج پہلے اسے کامیابی حاصل نہ ہوئی تھی اس کا لہجہ پرشمرہ اور بے ہوش تھی لیکن آج تو وہ کامیاب اور کامراں تھی۔ اس نے جعفر کا پتہ لگا لیا تھا۔ آواز کیوں نہ تیز ہوئی۔ ترن کوڑی ایک ایک عبادت گاہ کی تفصیل بیان کرتی کہ وہاں گئی اور کس سے کس سے ملی پھر اس نے کس انداز سے اپنا مقصد پوشیدہ کر کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔





مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ تمہیں جعفر بھائی سے مجھ سے زیادہ محبت بھی ہے۔

”یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟“ ترن کوڑی نے شوخی سے پوچھا۔

”دیکھو نا۔ تم جعفر کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان تک پہنچ گئیں اور یہ ایک میں ہوں اور روز قاضی اور شر کو تو ال کے دفتر کے چکر لگاتا ہوں۔ مگر اب تک جعفر بھائی کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم کر سکا۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ان سے زیادہ پیار ہے اور میرا کیا کم ہے۔ ادھر ہے۔“ اور سرائش نہ جانے کیا سوچ کے ہنسنے لگا۔

سرائش کو ہنستا دیکھ کے ترن کوڑی کو اور زیادہ خوشی ہوئی۔ ”سرائش۔ میں جیم یقین دلاتی ہوں کہ جس دن شر کو تو ال واپس آئے گا اس دن تمہارے جعفر بھائی تمہارے پاس ہوں گے۔“

ترن کوڑی جس اعتماد کے ساتھ گفتگو کر رہی تھی اس سے سرائش کو یہ تو یقین ہوا کہ سنہرے بالوں والی یہ خوبصورت لڑکی بلا کی ذہین اور شاطر ہے مگر اس کی سمجھ میں یہ آ رہا تھا کہ ترن کوڑی اتنا بڑا دعویٰ کس بنا پر کر رہی ہے۔ اس کے خیال میں ترن کوڑی ایک عام سے عیسائی گھریلو لڑکی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ شر کو تو ال کے واپس آئے ہی جعفر کو آزاد کرالے گی سرائش کو یہ دعویٰ کچھ عجیب سا لگتا تھا مگر اس نے اس سلسلے ترن کوڑی سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اس خیال سے بھی خاموش رہا کہ کہیں ترن کوڑی سے زیادہ باتیں کرنا بھائی جعفر کو ناگوار نہ گزرے اور وہ خواہ مخواہ اپنے ایک ادا دوست کے سامنے شرمندہ ہو۔

ترن کوڑی سرائے سے اٹھ کے شر کو تو ال کی طرف روانہ ہو گئی۔ وہ آج اس فہم خوش تھی کہ اس نے ایک جاسوس کی حیثیت سے تمام احتیاطی تدابیر بھی نظر انداز کر دی ہیں وہ بے خوف اور بے دھڑک شر کو تو ال کے محل میں پہنچی اور اس کے دفتر سے شر کو تو ال کی واپسی کے بارے میں معلومات حاصل کر کے پھر باپ کے پاس واپس آئی۔ وہ عاتق اینٹینس میں داخل ہو رہی تھی کہ اس نے لارنس کو وہاں سے نکلنے دیکھا۔ اس پر نظر نہ ہی ترن کوڑی کا داغ پھر گھوم گیا۔

”تم صبح سے اب تک یہاں کیا کر رہے تھے؟“ ترن کوڑی نے بڑی سختی سے پوچھا۔

لارنس نے بڑی لجاجت سے جواب دیا۔ ”معزز ترن کوڑی۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی فادر کے پاس آیا ہوں۔“

ترن کوڑی چڑ گئی۔ ”کیا بکواس کر رہے ہو لارنس۔ تم صبح کو مجھے عبات

ملے ہوئے ملے تھے اور اب بھی آرہے ہو۔ تمام دن یہاں کیا کرتے رہے؟“

آپ درست فرما رہی ہیں ترن کوڑی۔“ لارنس نے بڑے ادب سے کہا۔ ”صبح کو میں اپنا کھانا کھا کر آپ سے ملا تھا مگر فادر سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ مصروف تھے۔ میں واپس چلا گیا تھا۔ اس وقت ان سے ملاقات ہوئی اور اب واپس جا رہا ہوں۔ مجھ پر نہ ہو تو آپ فادر سے تصدیق فرما سکتی ہیں۔“

اس ضرور تصدیق کروں گی۔“ اور ترن کوڑی جھلائی۔ پھر پختی آگے بڑھ گئی۔ لارنس بھی مڑکے پیچھے چلنے لگا۔ ترن کوڑی کو آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے اک دم کے دیکھا لارنس ایک دس قدم پیچھے تھا۔ ”تم کیوں آرہے ہو میرے پیچھے؟“ ترن کوڑی نے پوچھا۔

لارنس نے سوکھا سامنہ بنا کر جواب دیا۔ قابل فخر ترن کوڑی۔ ”میرا ذہن مجروح ہو گیا۔ آپ نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری موجودگی میں فادر کی بات کی تصدیق کریں اور اگر میں مجرم پایا جاؤں تو مجھے سزا دیں۔ اس سے پہلے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔“

”حق کہیں کے۔ واپس جاؤ۔“ ترن کوڑی نے لارنس کو ڈانٹ دیا۔

”مگر تصدیق والی بات۔۔۔۔۔۔“

مجھے کسی بات کی تصدیق نہیں کرنا۔ تم دفعان جاؤ۔

ترن کوڑی نے لارنس کو احمق کہا اور اسے دفعان بھی کر دیا مگر لارنس نے احمق تھا اور فہم ہی ہوا۔ وہ صبح سے اس وقت تک ترن کوڑی کے ساتھ سائے کی طرح لگا ہوا سرائے میں ترن کوڑی اور سرائش کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کا ایک ایک لفظ اسے سنا تھا پھر جب ترن کوڑی شر کو تو ال کے محل پر پہنچی اس وقت بھی لارنس اس کے پیچھے تھا۔ وہیں لارنس نے ترن کوڑی کا چچھا چھوڑا تھا اور سیدھا قلب کے پاس گیا تھا۔ ترن کوڑی اسے احمق ہی سمجھتی رہی اور لارنس نے ترن کوڑی اور جعفر کے درمیان تفصیلی معلومات بھی حاصل کر لیں۔

لارنس کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ فادر قلب کی کوشش سے جعفر آزاد ہو جائے گا اور اس سے اس کا پورا وجود بل کے رہ گیا تھا۔ ترن کوڑی اس کے مقابلے میں ایک مسلمان کو ترجیح دے رہی تھی۔ لارنس کا غم و غصہ بڑھنے لگا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ جعفر کو بھلبک سے زندہ واپس نہ جانے دے گا۔ لارنس نے اب تک جعفر کو دیکھا تھا اسے یہ فکر ستا رہی تھی کہ وہ کسی طرح جعفر کو دیکھ لے تاکہ منصوبہ بندی

بہت مناسب نہ تھا۔

لارنس کو باہر کھڑے نصف گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ فلف اور ترن کوزی محل سے باہر  
نہ کوزی کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ دمک رہا تھا جو اس بات کا غماز تھا کہ اسے اپنے  
رہنما کامیابی ہوئی ہے۔ لارنس کا چہرہ پیکا پڑ گیا اور اس کے دل میں ٹیسس اٹھنے لگیں  
اے مہر کے وہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔ فلف اور ترن کوزی جس راستے سے آئے تھے  
راستے سے واپس جا رہے تھے اور لارنس اس طرح خاموشی سے ان کے تعقب میں  
شہر کو تال کے محل اور عبادت گاہ کے درمیانی راستے کا نصف کے قریب فاصلہ طے  
کے بعد ایک چوراہے پر ترن کوزی اور فلف رک گئے۔ فلف نے ٹھہرتے ہوئے  
سے ایک تہہ کیا ہوا کانڈ نکال کے ترن کوزی کے حوالے کیا اور جھک کے اس کی  
کاہل لیا۔ اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

لارنس کے لئے یہ لمحہ بڑا پریشان کن تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ فلف نے ترن کوزی کو  
بارہائی کا پروانہ دیا ہے اور وہ اسے لے کر اس مقام کی طرف جا رہی ہے جہاں جعفر  
اور فلف عبادت گاہ کو واپس جا رہا ہے۔ لارنس کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ ان حالات  
سے کیا قدم اٹھانا چاہئے۔ اس نے جعفر کو اپنے راستے سے ہٹانے کا مہم ارادہ کر لیا  
یہاں اس کے لئے ممکن تھا کہ جعفر کے آزاد ہونے کے بعد اس کا تن تمام مقابلہ کر  
سکتا ہو۔

لارنس کے بارے میں اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کس تن و توش کا مالک ہے اور آیا  
ایکے قابو پانا ممکن ہے کہ نہیں۔ پہلے تین دن اور تین راتیں اس نے ترن کوزی  
قب میں بیکار ضائع کر دی تھیں۔ اگر وہ علقندی سے کام لیتا تو اس دوران اپنے  
اسے رابطہ قائم کر کے کوئی مفید منصوبہ ترتیب دے سکتا تھا۔ لارنس ان خیالوں  
مغموں میں تھا۔ اور ترن کوزی اس سے لمحہ بہ لمحہ دور ہوئی جا رہی تھی۔ شام کا دھند لگا ہر  
جگہ رہا تھا اور اس بات کا خطرہ تھا کہ اگر لارنس نے دو چار منٹ اور اسی سوچ  
نہ گزار دئے تو ترن کوزی اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔

لارنس نے ایک جھرجھری کی اور سر کو جھٹک کر تیزی سے ترن کوزی کی طرف بڑھنے  
لگا۔ کوئی مختلف راستوں سے گزر کر ایک چھوٹی سے عبادت گاہ کے دروازے پر پہنچ  
لارنس اک دم چونک پڑا اس عبادت گاہ کا پادری تو اس کا بڑا گہرا دوست تھا۔ دو دن  
لارنس کی اس پادری سے سرسرا ملاقات ہوئی تھی۔ لارنس کو کیا معلوم تھا کہ اس کا  
اس ملک میں قید ہے ورنہ اس کی رہائی سے پہلے ہی اس کا خاتمہ کر دیتا مگر

کرتے وقت اس سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ جعفر کو دیکھنے کی یہی ایک صورت تھی  
ہمہ وقت ترن کوزی کے پیچھے لگا رہے اور جس وقت ترن کوزی اس سے ملے گا  
اس کا پتہ ٹھکانہ معلوم کر لے۔ لارنس کے لئے ہر وقت ترن کوزی کا پیچھا کرنا غم  
خالی نہ تھا مگر اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس لئے اس نے جان پر کھیل  
کوزی کے تعقب شروع کیا۔ لارنس دن کے علاوہ رات کے وقت بھی ترن کوزی کے  
ہی رہنے کی کوشش کرتا۔ اس کا خیال تھا کہ ترن کوزی اپنے محبوب سے ملنے کا  
وقت ضرور جاتی ہوگی۔ اس لئے اس نے عبادت گاہ کے ویران باغ میں ایک محو  
اپنا ڈیرہ جما لیا تھا جہاں سے وہ عبادت گاہ سے باہر جانے والے راستے پر نظر کو  
مکریہ لارنس کی بد قسمتی کہ ترن کوزی نے اس دوران جعفر سے ملنے کی قطعی کوشش  
اور لارنس کے تین دن اور تین راتیں بیکار ضائع ہو گئیں۔ اس عرصے میں وہ کوئی  
بھی نہ کر سکا۔ لارنس ہر وقت ترن کوزی کے ارد گرد منڈلاتا رہتا اور ایک لڑکے  
اسے آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیا یہاں تک کہ ایک شام ترن کوزی اور فلف  
ساتھ عبادت گاہ سے نکلے۔ اس دن صبح کو ترن کوزی کے ساتھ لارنس کو بھی علم  
کہ آج کس وقت برازق بویہ دمشق سے واپس آ رہا ہے۔ ترن کوزی جس مسرت  
سے باپ سے گفتگو کر رہی تھی اس سے لارنس کو فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ دونوں  
شہر کو تال سے ملنے جا رہے ہیں۔ اور شاید اس وقت اس کا رقیب جعفر قید خانے  
ہو جائے۔ اس خیال سے لارنس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ کیا وہ جعفر کو پہلے  
زندہ واپس جانے دے گا۔ اس کے دل میں سوال اٹھا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اس کا جواب  
اس کے دل نے خود ہی دے دیا اور لارنس احتیاط سے ان کے پیچھے چلنے لگا۔

شہر کو تال برازق بویہ کا محل عیسائی عبادت گاہ سے زیادہ دور نہ تھا۔ ترن کوزی  
فلف وہاں تک پہنچ آئے تھے۔ فلف ایک لائے سفید جعنے میں لبوس تھا۔ اس نے  
ایک چوگوشیہ اوپن ٹوپی تھی اور سینے پر چاندی سونے سے مرصع ایک چھوٹی سی  
آویزان تھی۔ فلف کی شخصیت اس قدر اہم معلوم ہوتی تھی کہ اسے دیکھنے والے  
محافظوں نے اسے ادب سے سلام کیا اور گیٹ کا چھوٹا دروازہ کھول کے باپ جی کو  
داخل کر لیا۔ محل کا یہ گیٹ دن کے وقت کھلا رہتا تھا مگر شام ہوتے ہی بند کر دیا  
سوائے خاص لوگوں کے کسی اور کو آنے جانے کی اجازت نہ تھی۔ لارنس نے اپنے  
جاننے دیکھا تو دل تمام کر باہر ہی ایک جگہ کھڑا ہو گیا محل کے محافظ لارنس کو بھی  
تھے اور اگر لارنس اندر جانے کی خواہش کرتا تو اسے روکا نہ جاتا مگر اس وقت اس



”خونک قل!“ پادری نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ ”اس کے تصور سے ہی لڑ پڑا ہو جاتا ہے۔ شاہ دمشق کی بے گور و کفن لاش دیکھ کے میرے آنسو نکل

اس طرح ترن کوڑی اور پادری باتیں کر رہے تھے دوسری طرف پادری کا خاص ملازم حکم پر اس کوٹھری سے پہنچا جس کے اندر جعفر قید تھا۔ پادری کے آدی نے کوٹھری سے آوازی۔ ”قیدی باہر آجاؤ۔ اب تم آزاد ہو۔“

آوازی کے نام پر جعفر کے جسم میں توانائی آگئی۔ وہ اندھیری کوٹھری میں ٹٹوتا ہوا ہے پر اہم۔ کوٹھری کے دروازے پر محافظ جمع لئے کھڑا تھا۔ جعفر نے محافظ پر ایک نظر ڈالا۔ یہ محافظ اکثر اسے کھانا دینے آیا کرتا تھا۔

”مجھے کس نے آزاد کرایا ہے محافظ؟“ جعفر نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی رہائی کی کوٹھری کا نتیجہ ہے محافظ سے اس کی تصدیق چاہی۔

”بھئی جوان۔ تمہیں شہر کوٹوال برانق بویہ کے حکم سے آزاد کیا جا رہا ہے۔“ محافظ نے لمحے میں جواب دیا۔ جعفر نے سوچتے ہوئے پھر سوال کیا۔ ”محافظ۔ شہر کوٹوال مجھے ہیں اور نہ میں ان سے واقف ہوں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میری رہائی کس شکل سے عمل میں آئی ہے۔“

”محافظ نے واپس ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے کوئی علم نہیں۔ تمہاری رہائی کا حکم دلی قلع کی معزز بیٹی ترن کوڑی لے کے آئی ہیں۔“

جعفر نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے خیال درست تھا۔ ”کیا لارڈ پادری کی معزز اہل بیت ہمارے موجود ہیں؟“

”ہاں۔ ہمارے پادری کے پاس بیٹھی تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“ محافظ نے اپنی طور بات کی۔

دلی ایک کمرے پر پہنچے۔ کمرے کے اندر بیچ شانہ شمعیں روشن تھیں اور پورا کمرہ جگمگ کر رہا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی جعفر کی نظر سب سے پہلے ترن کوڑی پر پڑے دیکھتے ہی اٹھ کے کھڑی ہو گئی تھی۔ عبادت گاہ کا پادری بھی ترن کوڑی کو اسے دیکھ کے خود بھی کھرا ہو گیا تھا۔

”ترن کوڑی نے دھڑکتے دل سے کہا۔ ”آزادی مبارک ہو جعفر۔“ اس کی آواز بری لارڈی تھی۔

”خونک قل!“ پادری نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ ”اس کے تصور سے ہی لڑ پڑا ہو جاتا ہے۔ شاہ دمشق کی بے گور و کفن لاش دیکھ کے میرے آنسو نکل

گیا وقت واپس نہیں آتا۔ لارنس اس وقت اپنے دشمن کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکا کوڑی کی موجودگی کی وجہ سے وہ عبادت گاہ میں نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے یہی مدد کیا کہ عبادت گاہ سے باہر ٹھہر کے ترن کوڑی اور اپنے دشمن جعفر کا انتظار کر دوران ممکن ہے کہ اس کے دماغ میں کوئی ایسے ترکیب آجائے جس پر عمل کر کے کا خاتمہ بھی کر سکے اور ترن کوڑی بھی اسے حاصل ہو جائے۔ لارنس کو اب با قلع کی دولت سے دلچسپی تھی لیکن جس وقت سے اس نے ترن کوڑی اور جعفر کی باتیں سنی تھیں اس گھڑی سے اس کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی اور اب دولت سے زیادہ ترن کوڑی کا حصول اس کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔

عبادت گاہ کے پادری نے لارڈ پادری قلع کی بیٹی ترن کوڑی بڑی عزت کرے میں بٹھایا پھر اس نے ترن کوڑی سے شکایت ”کہا۔ ”معزز ترن کوڑی۔ مجھے ہے کہ ایک مسلمان قیدی کی رہائی کے لئے تمہیں شہر کوٹوال کا احسان لینا پڑا۔ اس پروانے کے میرے پاس آئیں تو تمہارا حکم کو ہرگز نہ ٹالتا۔“

”یہ آپ کی مہربانی ہے فادر۔“ ترن کوڑی نے سر جھکا کے جواب دیا۔ ”درا ایک مسلمان قیدی کی نہیں بلکہ اصول کی تھی۔ پھر میں اس بد دماغ برانق بویہ سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہی کیا بلکہ تمام مسلمان حکمران ایک ہی جیسے ہوئے پر مہمان ہوں تو گھر تک مٹا دیتے ہیں اور اگر خلاف ہو جائیں تو زندگی بھر احساں لے لے میں بھول جاتے ہیں۔ مسلم قوم قطعی اعتبار کے قابل نہیں۔ اس لئے میں راستہ اختیار کیا تاکہ شہر کوٹوال کو کسی عیسائی پادری سے کوئی شکوہ نہ ہو۔“

یہ ٹھیک ہے ترن کوڑی لیکن مسلمانوں کو اپنی خانہ جنگی سے ہی فرصت کسی اور بات پر کیسے توجہ دیں۔ ”پادری نے بھی اپنے دل کا غبار نکالا۔ ”تم نہیں۔ دمشق اور دلی موصل آپس میں کیسے لڑ رہے ہیں۔ موصل کا کوئی آدی بعلبک میں آجائے تو جاسوسی کے شبہ میں فوراً پکرا لیا جاتا ہے۔ یہ کوئی انصاف نہیں۔“

”بے انصافی اور احسان فراموشی تو ان کی کھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔“ ترن دلی سے پادری کو خوش کرنے کے لئے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ ”دلی معین الدین انز کو دیکھو۔ شاہ دمشق اور ملکہ زمرہ خانم نے اس پر کتنے احسانات کیے تھیں کہ پور حکومت ہی اس کے حوالے کر دی تھی اس احسان فراموش نے شاہ کس عہد دلی سے قل کر لیا۔“

بات کا جواب دینا بھی بھول گیا۔ اس کی نظریں ترن کوڑی کے خوبصورت چہرے اور بالوں پر ٹک کر رہ گئیں۔

”جعفر تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو جا سکتے ہو۔“ ترن کوڑی نے جعفر سے آنکھیں پھر ذرا رک کے بولی۔ ”اگر تم پسند کرو تو میرے ساتھ چل کے لارڈ پادری کا شکر یہ سکتے ہو۔ تم انہیں کی کوششوں سے رہا ہوئے ہو۔“

جعفر نے خود کو مشکل سے سنبھالا۔ ”میں اپنے محسن کا شکریہ ادا کرنے ضرور گا۔“

ترن کوڑی نے پلٹ کے پادری کو دیکھا۔ ”میں نے آپ کو بہت تکلیف دی۔“ کوئی بات نہیں۔ آپ کی خدمت سے مجھے خوشی ہوئی۔“ پادری جواب دے کر کوڑی کے ساتھ ہو لیا جو باہر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

محافظ شمع پکڑے آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے عقب میں ترن کوڑی اور جعفر سب سے پیچھے تھا۔ باہر پہنچ کے ترن کوڑی ن بے پادری کا شکریہ ادا کیا قدموں سے چلنے لگی۔ جعفر کے قدم بھی تیز ہو گئے۔ اس کے دل میں سوالوں کا جھوم ترن کوڑی کی رفتار اتنی تیز تھی کہ جعفر کو سوال کرنے کا موقع نہ مل رہا تھا۔

کچھ دور چلنے کے بعد جعفر کی بے چینی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ اس نے تڑپ کے قدموں سے قدم ملاتے ہوئے مخاطب کیا۔ ”ترن کوڑی۔“

”یہ گفتگو کا موقع نہیں۔ ہمیں جلد سے جلا پاپا کے پاس پہنچا ہے۔“ ترن کوڑی بغیر قدم روکے جواب دیا اور اپنی رفتار پہلے سے زیادہ تیز کر دی۔

جعفر کو دوسرا سوال کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلا۔



لارڈ پادری فلپ پریشانی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹھیل رہا تھا۔ ترن کوڑی ہوئے اسے کافی دیر ہو چکی تھی۔ اس کے خیال کے مطابق ترن کوڑی کو بہت چلے آجائے چاہیے تھے۔ فلپ نے کمرے سے گردن نکال کے باہر دیکھا۔ اسے دور پر ملایا آیا۔

”ترن کوڑی۔ میرا خیال ہے کہ یہ تم ہی ہو۔“ فلپ کی آواز فرط محبت سے

”ہاں پاپا۔ میں آئی۔“ ترن کوڑی نے وہیں سے جواب دیا اور پھر بھاگی ہوئی کمرے کے اندر پہنچ گئی فلپ نے ہاتھ بڑھا کر اسے اندر کھینچ لیا اور بڑی چٹابی سے اسے بچے سے چٹا لیا۔ تمہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی ترن کوڑی۔“ فلپ کا پیار اڑا آ رہا

ترن کوڑی اس کے سینے سے الگ ہو گئی۔ ”کوئی پریشانی نہیں ہوئی پاپا۔ پادری نے شر لے کر ہونہ پڑھتے جعفر کو آزاد کر دیا۔“ پھر ترن کوڑی نے اک دم چونک کے باہر کی طرف دیکھا۔ ”ارے جعفر۔ تم باہر کیوں کھڑے ہو۔ اندر آؤنا۔ دیکھو یہ میرے پاپا ہیں لارڈ پاپ۔“

جعفر دروازہ پر رک کہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ترن کوڑی کی آواز پر وہ اندر آیا مگر جب اس لارڈ پادری پر پڑی تو وہ حیران رہ گیا۔ کیا یہ وہی ٹیف و نزار پادری تھا جسے اس نے میں بیماری کی حالت میں دیکھا تھا۔ وہاں تو اس سے اٹھا بھی نہ جاتا تھا مگر اس وقت زابو سدا کھڑا تھا اور اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کا جلال تھا۔ جعفر نے جلدی لے لی۔ ”میں آپ کے اس احسان کو زندگی بھر نہ بھول سکوں گا فادر۔“

فادر بھی جعفر کی شخصیت سے کچھ مرغوب ہو گیا تھا۔ وہ بڑی گہری نظروں سے جعفر کو دیکھا۔ اس نے بڑے بڑے خوبصورت جوان دیکھے تھے مگر جعفر کی مردانہ وجاہت کی نازی نازی تھی۔ جعفر کی بات پر اس نے چونک کے جواب دیا۔ ”میں نے تم پر کوئی ناہم کیا جعفر۔ یہ سب کچھ ترن کوڑی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ تم اس کا شکریہ ادا کر لو۔“

”میں آپ دونوں کا شکر گزار ہوں فادر۔“

”نئے ایک بات کی بہت خوشی ہوئی۔“

فلپ اتنے کہ کر خاموش ہو گیا۔ جعفر اور ترن کوڑی بڑی بے چینی سے فلپ کے جملے کرنے کے منتظر تھے مگر فلپ تو جیسے آدمی بات کہہ کر بھول گیا تھا۔ خاموشی زیادہ طول لگائی تو ترن کوڑی نے دخل دیا۔ ”پاپا۔ آپ کچھ کہہ رہے تھے۔“

ترن کوڑی نے اسے یاد دلایا۔ ”پاپا۔ آپ نے جعفر سے کہا تھا کہ آپ کو ایک بات

میں تھا۔

میرے بارے میں؟“ ترن کوزی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ”آپ نے جعفر کو نہیں کیا تھا پایا؟“

قلب مسکرا دیا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو ترن کوزی۔ میں نے مخاطب جعفر کو کیا تھا بات تمہارے ہی بارے میں تھی کیا تم اسے سننا پسند کرو گی۔؟“

”کیوں نہیں پایا۔ میں نے آپ کی بات سننے سے کبھی انکار نہیں کیا۔“ اور میں نے بھی تمہاری کوئی بات کبھی نہیں ٹالی۔“

”پاپا۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔ آپ نے مجھے ماں کا پیار بھی دیا ہے۔“

قلب سنجیدہ ہو گیا۔ ”ترن کوزی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ مجھے جعفر کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اس خوشی کی اصل وجہ یہ ہے کہ تم نے اپنے انتخاب میں کوئی غلطی نہیں کی۔ مجھے بھی پسند ہے بشرطیکہ وہ وفاداری کا دم بھرے۔“

ترن کوزی کے چہرے پر شہابی رنگ نکھر آیا مگر وہ انجان بن گئی۔ ”پاپا۔ میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکی؟“

قلب مسکرایا۔ ”میرے خیال میں تم اس قدر بے وقوف نہیں ہو کہ میری بات نہ سمجھ سکو۔ بہر حال میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ میں تمہارے راستے میں نہیں آنا چاہتا۔ تم اپنی زندگی کا خود فیصلہ کر سکتی ہو۔“

جعفر نے محسوس کیا کہ اس کا بولنا ضروری ہے۔ قلب نے اس کی وفاداری کا ذکر کیا ہے۔ اس کی خاموشی اسے کمزور ثابت کر سکتی ہے۔ اس نے الفاظ تولتے ہوئے کہا۔ ”میرے فادر۔ میں اس قائل تو نہیں کہ ترن کوزی کی خواہش کر سکوں پھر بھی اگر مجھے اپنے خیالوں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کا موقع دیا گیا تو میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔“

”جعفر۔ تمہارے بارے میں فیصلہ کرنا میرا کام نہیں۔“ قلب نے صاف الفاظ میں کہا۔ ”یہ تمہاری اور ترن کوزی کی جدائی مجھے یقیناً بہت تکلیف دے گی مگر میں اپنی چراغ سحری ہوں۔ اس شب کا سویرا تو ہونا ہی ہے اور یہ شمع اک دن بجھتا ہے پھر میں اپنی چند روزہ زندگی کی خوشیوں پر ترن کوزی کی آرزوؤں کو کیوں قربانی کروں مجھے مسلمانوں نے اس قدر نفرت بھی نہیں کہ ان کا سایہ برداشت نہ کر سکوں۔ میں تمہارے پہلے پہلے کے دعائیں کرتا رہوں گا۔“

قلب کی آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں۔ جعفر بڑا متاثر ہوا اور ترن کوزی بے چین ہو گئی۔ ”آپ کیوں اداس ہوتے ہیں۔ میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے مگر یہ بات کہ آپ بھی تنہا نہیں رہیں گے۔ ترن کوزی کو آپ پیشہ اپنے قریب پائیں گے۔“

قلب نے بڑی حتمی آواز میں کہا۔ ”ترن کوزی۔ میں تم سے کوئی غلط وعدہ نہیں کرے گی۔ باتوں کی امانت ہوتی ہے تم جہاں چاہو وہ سکتی ہو۔“

ترن کوزی کو کوئی جواب نہ بن پڑا۔ جعفر نے بھی کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ کمرے کا دروازہ کھولا۔ ہر شخص خاموش تھا۔ آخر فادر قلب نے خود اس سکوت کو توڑا۔

”ترن کوزی۔ جعفر کو کھانے کے لئے پوچھو۔ ان سے یہ بھی معلوم کرو کہ وہ کہاں جانا چاہتے ہیں۔“

ترن کوزی نے فوراً درخواست کی۔ ”پاپا۔ کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ میں کچھ دیر کھلی جگہ پر بیٹھ کر ان کی باتیں کروں پھر انہیں کمرے میں پہنچاؤں۔“

”تم جو چاہو کر سکتی ہو ترن کوزی۔“

ترن کوزی کو اجازت مل گئی۔ اس نے جعفر کی طرف دیکھا۔ جعفر نے کھڑے ہو کر فادر۔ میں آپ کے احسان کا شکریہ پورا کرتا ہوں۔ صبح کو شاید میں جلدی چلا کر آپ کو ناگوار تو نہ ہو گا؟“

قلب نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ”بالکل نہیں جعفر۔ اب تم میرے بیٹے ہو اور بیٹے کو ناگوار نہیں گزرا کرتیں۔“

ترن کوزی نے دونوں کے پیچھے عبادت گاہ تک پہنچ گیا تھا لیکن اندر جانے کی اسے جرات نہ تھی۔ وہ کھلتے کھلتے گاہ کا دروازہ رات کے وقت اکثر بند کر دیا جاتا تھا۔ اس شکستہ عبادت گاہ کے کھلنے کے اور بھی کئی راستے تھے۔ چار دیواری جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور اسے چاند کے آسانی سے اندر جا سکتا تھا مگر لارنس خطرہ مول لینے سے گھبرا رہا تھا۔

مگر تم نے تو اپنے منہ سے کچھ بھی نہیں کہا۔" ترن کوزی کی ہنسی کی نفرتی لہریں اور لارنس کا دل جل کر رہ گیا۔

پاپا نے پاپا کو جواب دیا تھا۔ کہ میں نے تم سے کوئی بات نہیں کی۔  
"چا تو اب بات کر لو۔"  
"کوئی بات۔"

"اللہ رے بے حسی۔ تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے سامنے اقرار کروں کہ مجھے تم سے دیکھا ہے۔"

"یہ تو بڑی عام سے بات ہے جعفر۔" ترن کوزی ذرا سنجیدہ ہوئی۔ "تمہارے ماحول کو میں جانتی لیکن ہمارے عیسائی معاشرے میں ہر جوان لڑکا ہر دوشیزہ سے یہی جملہ کہتا

"اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے بھی عام آدمیوں میں شمار کرتی ہو۔"

"یہ مطلب نہیں ہے جعفر۔ تم عام نہیں بلکہ خاص ہو۔ میرے لئے خاص۔"

"تاس ہوں تو پھر اور کیا کہوں یہ آواز میرے دل سے نکلی ہے۔"

"تم اس آواز کو کوئی اور رخ بھی تو دے سکتے ہو۔"

"مومنہ۔۔۔۔۔" جعفر نے ٹھنڈی سانس لی۔ "تم چاہتی ہو کہ میں اظہار محبت کا کوئی راستہ اختیار کروں۔"

"مثالیہ۔۔۔۔۔"

جعفر نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مگر اظہار پہلی سیڑھی ہے اور میرا قدم دوسری سیڑھی تک پہنچا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

جعفر نے جیسے گلا صاف کیا۔ پھر بولا۔ "ترن کوزی میں تمہیں اپنا چاہتا ہوں۔ بیشک۔"

میں بھی یہی چاہتی ہوں۔" ترن کوزی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "مگر اس میں کچھ خطرہ ہے۔ ان پر قابو پائے بغیر میں کوئی فیصلہ نہ کر سکیں گی۔"

جعفر نے پر اعتماد لہجے میں کہا "اگر مجھ پر اعتماد ہو تو اپنی مشکلیں بیان کرو شاید میں ان کا حل کر سکوں۔"

لارنس جعفر ہم ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمارا پہلا قدم بہت بڑا ہونا چاہئے۔" ترن کوزی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ "ہمارے راستے میں بڑے

اس کا دل تو بہت چاہا کہ اندر جا کر ان لوگوں کی گفتگو سنے۔ خاص کر یہ دیکھے کہ قلب پر نئے مہمان کے ساتھ کس انداز میں پیش آتا ہے مگر لارنس کو اپنا دل مارنا پڑا اور وہ اپنے بیٹھ کے جعفر کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ اسے اس وقت بھی موقع ملا تھا کہ جعفر ٹھکانے لگانے کے لئے اپنے دوستوں کی مدد حاصل کرنے جائے مگر اسے ڈر تھا کہ کسی کے جاتے ہی جعفر وہاں سے نکل کے کسی اور طرف چلا جائے اور وہ اپنی قسمت کو بھٹکا جائے۔ اس خیال نے اسے اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہ دیا۔

یہ تو محض اتفاق تھا کہ ترن کوزی اور جعفر کھلی فضا میں باتیں کرنے کے لئے گاہ سے نکل کے ٹھلکتے ہوئے اس باغ میں آگئے جہاں لارنس چھپا ہوا تھا۔ آہٹ پا کر لارنس چونکا ہو گیا مگر ترن کوزی کی آواز سن کے اسے اطمینان ہوا۔ اسے آنے والوں کے چہرے تو نظر نہ آ رہے تھے مگر ان کی آوازوں سے لارنس کو اندازہ ہو گیا کہ ترن کوزی اور جعفر آ رہے ہیں۔ اس نے اس سے یہی نتیجہ نکالا کہ جعفر فادر سے گفتگو کر کے اب اپنی منزل کی طرف جا رہا ہے اور ترن کوزی اسے رخصت کرنے آتی ہے۔ مگر اس کا یہ انداز اس وقت غلط ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ وہ باغ سے باہر جانے کی بجائے سیدھے اس آئے جہاں سنگ مرمر کی دو شکستہ بنچیں پڑی تھیں پھر ترن کوزی اور جعفر ان بنچوں پر طرح اطمینان سے بیٹھ گئے جیسے انہیں بقیہ رات اسی جگہ گزارنی ہے۔

لارنس جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سے بنچوں کا فاصلہ کافی دور تھا۔ اگر وہ کان لگا دے تو ان کی گفتگو سن سکتا تھا لیکن اگر وہ آہستہ باتیں کرتے تو اس کا سننا مشکل ہو جاتا۔ لارنس نے فوراً اپنی جگہ تبدیل کی اور ایک لمبا چکر کاٹ کر بنچوں کے قریب پہنچ گیا۔ وہ اس جگہ پوشیدہ رہ کر ان کی تمام باتیں بڑے اطمینان سے سن سکتا تھا۔ جعفر اور ترن کوزی ایک ہی بنچ پر بیٹھے تھے اور یوں محسوس ہوتا جیسے وہ منہ سے منہ ملا کر باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی آواز کبھی اونچی ہو جاتی اور کبھی اس قدر آہستہ کہ لارنس کو سننے میں دشواری محسوس ہوتی۔

جعفر کی ذرا تیز آواز اندھیرے میں ابھری۔ "ترن کوزی۔ مجھے تعجب ہے کہ تمہارے پاپا نے تمام باتیں صاف صاف کہہ دیں۔ میری موجودگی کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا۔" ترن کوزی نے جواب دیا۔ "وہ مجھ سے اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے میں ان کی دوست ہوں۔"

"پھر اب تم نے کیا فیصلہ کیا؟"

"کس بات کا فیصلہ؟" ترن کوزی کی آواز تھر تھرا رہی تھی۔  
مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ پاپا نے تو سب کچھ کہہ دیا ہے۔ اب باقی کیا رہا گیا ہے؟  
نے بھی تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

ہارلس — "جعفر ذہن پر زور دے کے سوچنے لگا۔"

حضرت نے قجب سے ترن کو زنی کو دیکھا۔ ”کیا تم سچ کہہ رہی ہو۔ ایک عبادت گاہ کے بارانی کے پاس اس قدر دولت کیسے تم مجھ پر رعب تو نہیں ڈال رہی ہو؟“

”ظرفِ ناک بھی اور کینہ بھی۔“ ترن کوڑی نے بڑی ناگوار انداز میں کہا۔ پہلے وہ ساٹھ سا ریتا تھا مگر میں نے اسے ذلیل کر کے نکال دیا ہے مگر وہ اس قدر بے

کونسل کرنے کی وجہ - جب میں تمہیں قبول کروں گا تو انہیں قبول کرتا ہی

جغفر نے اس کی دونوں مشکلات کا حل پیش کر دیا۔

”تم کیا کہنا چاہتی ہو ترن کوڑی؟“

جعفر جیسے جواب کے لئے تیار تھا۔ اس نے فوراً کہا۔ ”ترن کوڑی۔ جو اتر

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شادی کے بعد میں بعلبک میں ہمیشہ کے لئے آباد ہو گا۔“ جعفر بڑا رنجش تھا۔

”تم ہعلبک کے حالات سے مجھ سے زیادہ واقف ہو۔“ جعفر نے انکار کر اس وقت کوئی چیز ایسی نظر نہیں آئی جو میرے ہعلبک میں قیام کے لئے خطرناک ہو۔ ترن کوزی نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہو۔ کیا تمہیں یہاں کر کے قید نہیں کیا گیا؟“

”دیکھو ترن کوڑی۔“ جعفر نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”اگر میرے خلاف کوئی الزام یا مجھے خطرناک آدمی سمجھ کے گرفتار کیا گیا ہوتا تو معاف کرنا ترن کوڑی تمہارے

جعفر نے بات ایسی کہی تھی کہ ترن کوڑی کو قائل ہوتا ہوا پڑا لیکن اس کے علاوہ اور خطرات تھے جنہیں ترن کوڑی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے سوچے ہو۔

”شمر کو تو دل کا بڑا خطرہ تو خیر ٹل گیا لیکن بھلبک میں میرے دشمن موجود ہیں وہ مجھ سے شادی کر دیں گے اور ہم ایک نہ ایک دن مصیبت میں پھنس جائیں گے۔ تم سے شادی کر بعد بابا میری کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ یہاں کی تمام عداوت گاؤں میرے خلاف ہو جائے گی۔“

کہا تھا کہ وہ جعفر کی اصلیت سے آگاہ ہے لیکن وہ کچھ بیان کیوں نہیں کرتی۔ اس نے جعفر بھی اپنے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے الٹا ترن کوڑی سے سوال کر رہا تھا۔ اس قدر آہستہ آہستہ گزر رہے تھے کہ لارنس کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت ایک بار رگ کر رہ گیا ہے ترن کوڑی اور جعفر پر طویل خاموش طاری تھی جیسے وہ سو گئے ہوں۔ پھر طویل لمحات کے بعد ترن کوڑی جیسے خواب میں بولی۔ ”جعفر۔ میرے جعفر۔“

بارے میں مجھے یہ یقین ہے کہ تم ایک نیک مسلم جوان ہو۔ تم ایک ایسے وجہہ رہا ہو جسے کم و بیش ہر لڑکی اپنانے پر آمادہ ہو سکتی ہے تمہارے پہلو میں ایک محبت بھرا دل ہے۔ تمہاری گفتگو صاف اور واضح ہے۔ پایا کو تمہاری وفاداری پر شبہ ہو سکتا ہے لیکن یہ خیال میں تمہاری وفاداری شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ قسمت سے اگر ہم یکجا ہو گئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم ایک کامیاب زندگی گزار سکیں۔ سن رہے ہو نا جعفر۔ جو میں رہی ہوں۔“

ایک ایک لفظ سن رہا ہوں۔ بڑے غور سے سن رہا ہوں۔“ جعفر نے کان ادھر ہی مائل کیے۔

”میرے تمہیں یقین آگیا ہو گا کہ میں تمہارے بارے میں کتنی بہت سے باتیں جانتی ہوں۔“ ترن کوڑی کا ہاتھ جعفر کے شانے سے سرسرا ہوا واپس اپنی جگہ چلا گیا۔

”مگر ترن کوڑی۔ یہ باتیں تو۔۔۔۔۔۔“

ترن کوڑی نے بات کاٹ دی۔ ”جعفر۔ ایک لڑکی کو اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں صرف اتنی ہی باتیں معلوم ہونا چاہیں۔ باقی باتیں غیر ضروری ہوتی ہیں۔“

لارنس کا دل ڈوبنے لگا۔ ترن کوڑی نے جعفر کے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا تھا مگر اس کا دل بڑھ گیا تھا۔ اس نے ایک لمبا سانس لیا۔ ”ترن کوڑی۔ میں تمہارے اعتماد کا دوا کرتا ہوں۔“

ترن کوڑی نے پھر بات کاٹی۔ ”شکریہ کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کہ میرے بارے میں باتیں ہو؟“

ترن کوڑی کے گھبرانے کی باری تھی۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر جعفر کو یہ معلوم ہو گیا کہ ترن کوڑی شہر کو تال کے لئے جاسوسی کرتی ہے تو شاید وہ اس پر کوئی پابندی لگائے اس سے سوال کرنے کے بعد بے چینی سے جواب کا انتظار کرنے لگی مگر اسے زیادہ انتظار نہ ہوا۔

شاید مسکرایا پھر اس نے اطمینان سے کہا۔ ”ترن کوڑی۔ میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا۔ اس وقت تمہارے پایا بہت بیمار تھے۔ ہر پڑاؤ پر اسے کاغذ میں پہلی بار دیکھا۔ اس وقت تمہارے پایا بہت بیمار تھے۔ ہر پڑاؤ پر

”یہی کہ میں کون ہو۔ کیا کرتی ہوں۔ مجھ سے شادی کے بعد تمہارے کام کا۔ کوئی وقت تو نہ ہوگی۔؟“

جعفر نے فوراً ”جواب دیا۔“ میں تم سے بھی یہی سوال کر سکتا ہوں ترن کوڑی۔ میری اصلیت اور حقیقت سے واقف ہو؟“

ترن کوڑی گھبرا گئی۔ اس نے جعفر سے ایک مشکل سوال کیا تھا مگر جعفر نے اس پر الٹ دیا۔ ترن کوڑی سوچنے لگی۔ ادھر بھاڑیوں میں چھپا لارنس بیچ تاب کھارہا ترن کوڑی نے اسے بڑے ذلیل الفاظ میں یاد کیا تھا۔ اسے بہت غصہ آ رہا تھا۔ اسے یہ خدشہ پیدا ہو رہا تھا کہ اگر جعفر اور ترن کوڑی کی شادی ہو گئی تو کہیں قلب اپنی پادشاہی دولت ترن کوڑی کے حوالے نہ کر دے اور وہ منہ دیکھتا رہ جائے۔ اب تک وہ ترن کوڑی سے مایوس ہو کر قلب کی دولت پر اس لگائے بیٹھا تھا مگر اب ترن کوڑی اور دولت ہی اس کے ہاتھ سے نکلتی معلوم ہو رہی ہے مگر جب ترن کوڑی اور جعفر میں اصلیت کے بارے میں بحث چھڑی تو لارنس بہت خوش ہوا۔ اسے امید بندھی کہ جعفر اصل حقیقت بیان کرے گا جس کی روشنی میں وہ جعفر کے خلاف جلد یا بدیر کوئی قدم کر سکے گا۔

ترن کوڑی نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ ”جعفر۔ اگر میں کہوں کہ میں تمہاری اصلیت سے واقف ہوں تو تم کیا کہو گے؟“

جعفر سن پڑ گیا۔ اسے اپنے پیروں تلے سے زمیں نکلتی معلوم ہوئی۔ کیا ترن کوڑی معلوم ہے کہ میں امری موصل کا خاص جاسوس ہوں اور بعلبک میں جاسوسی کے لئے ہوا ہوں۔ اس خیال ہی سے جعفر کا سر چکرانے لگا۔ اس نے ایک ایک کے پوچھا۔

”کیا۔۔۔ کیا تم میرے بارے میں۔ سب کچھ جانتی ہو؟“

”ہاں۔ میں جانتی ہوں جعفر۔“ ترن کوڑی نے بغیر کسی توقف کے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی ترن کوڑی کا ایک ہاتھ جعفر کے شانے سے ٹکرایا۔ جعفر اس کے بلبلیاں سی دوڑنے لگیں۔ ترن کوڑی کے ہاتھ کے لمس سے جعفر کی آنکھیں بند ہو گئیں مگر اس عالم میں بھی اس پر یہ خوف غالب آ رہا تھا کہ اگر ترن کوڑی کو اس بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تو وہ اس نوازش کے بعد اسے دھکا بھی دے گی۔ جعفر نے کوشش کی کہ ترن کوڑی سے پوچھے کہ وہ کس حد تک اس سے واقف ہے۔

کے لب نہ کھل سکے۔

ترن کوڑی اور جعفر پر ایک نشہ سا طاری تھا مگر دوسری طرف لارنس کا کہنا تھا کہ وہ کدوا کر رہا تھا۔ اسے ترن کوڑی اور جعفر دونوں پر غصہ آ رہا تھا۔ ترن کوڑی کی

تمہارے پیانہ کی مزاج پرسی کے لئے عجیب عجیب لوگ آتے رہے۔

ترن کوڑی نے جلدی سے بات کاٹی۔ ”تم نے ان لوگوں میں کیا عجیب بات فرمائی؟“

”وہی بات۔ جس کی بنا پر مجھے سرائے سے گرفتار کیا گیا۔“ اور جعفر نے بے بس سے ترن کوڑی کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اس بات کے باوجود میں تمہاری طرف کھینچ چلا گیا۔ میں نے تمہیں دمشق کے شاہی محل میں آتے جاتے دیکھا۔“ جعفر نے رک کر ترن کوڑی کی طرف دیکھا مگر اندھیرے کی وجہ سے وہ اس کے چہرے کے تاثرات نہ محسوس کر سکا۔ ”ترن کوڑی نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔“ یہ دیکھنے کے بعد بھی تم میری طرف بدگمان نہیں ہوئے؟“

”بالکل نہیں۔“

”اس کی کوئی وجہ؟“ ترن کوڑی نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ترن کوڑی۔ دل میں بدگمانی اس وقت پیدا ہوئی ہے جب وہ صاف نہ ہو۔ میرے کے شفاف آئینے پر تمہاری تصویر اپنے عکس ڈال رہی تھی اس سے بدگمانی کا خیال ہی پیدا ہوا۔ میں نے صرف سوچا تھا کہ اگر میں کسی مصیبت میں پھنس گیا تو تم مجھے اگر نہ پہنچا سکیں تو نقصان بھی نہ پہنچاؤ گی۔ میرے لئے بس اتنا ہی کافی تھا۔“ جعفر نے اس بیباکی سے کہا تھا کہ ترن کوڑی کو اس کی محبت اور خلوص کا قائل ہونا پڑا۔

”تم بہت اچھے ہو بڑے پیارے ہو جعفر۔“ ترن کوڑی نے اقرار کیا۔ میرا خیال کہ ہماری باتیں ختم ہو گئی ہیں سوائے ایک بات کے۔“

”وہ کیا۔ اس پر سے بھی پردہ اٹھا دو۔“

”ترن کوڑی نے رک رک کے کہا۔“ جعفر۔ شاید تم اور میں دونوں اس وقت سے فضول محکموں میں الجھے ہوئے ہیں۔ ہمارے مستقبل اور پرسکون زندگی کے ضروری ہے کہ ہم اگلا قدم اٹھانے سے پہلے اپنے آپ کو ان بندشوں سے آزاد کر لیں خیال ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔“

”تم نے میرے دل کی بات کہہ دی ترن کوڑی۔“ جعفر نے بڑی مسرت سے دیا۔ ”میں خود تمام باتوں سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ تمہاری خواہش کے مطابق میں بعلبک چھوڑ دوں گا اور تمہاری یاد ساتھ لے ہوئے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا میں دن تم سے دور نہیں رہوں گا۔ مجھے تمام کام نٹانے کے لئے مہینہ ڈیڑھ دینا نہیں چاہئے۔ تم بھی اس عرصے میں اپنے آپ کو زیادہ مضبوط اور تیار کر سکو گی۔ کیا ہے تمہارا؟“

ترن کوڑی نے فوراً جواب دیا۔ ”میں تم سے پوری طرح اتفاق کرتی ہوں۔“

”میں طرح گزراؤں گی اس کے تصور سے ہی خوف آتا ہے مگر مجبوری ہے۔ میں کسی خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ اگر رات نہ ہوتی تو میں تمہیں اسی وقت رخصت کرتی۔“

”مگر نہ کو ترن کوڑی۔ تمہارا کتنا میرے لئے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔“ جعفر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں صبح ہوتے ہی رخصت ہو جاؤں گا صرف چند لمحوں کے لئے کارواں میں ضرور جاؤں گا۔“

”سراکش کے پاس جاؤ گے نا؟“ ترن کوڑی نے بڑے پیار سے پوچھا۔

”ہاں ترن کوڑی۔ سراکش ایک سیدھا سادہ سچا دوست ہے اگر میں اس سے بغیر ملے پاؤں تو برا دکھ ہو گا۔“

”ضرور جاؤ سراکش کے پاس۔“ ترن کوڑی بھی جعفر کے بازو کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں باتوں میں بھول ہی گئی۔“ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں تمہارے جعفر بھائی اور کرا کے تمہارے پاس لاؤں گی۔ میں بھی تمہارے ساتھ کارواں سرائے چلتی ہوں سراکش کی پیاری پیاری باتوں میں بڑا مزا آتا ہے لیکن اس وقت احتیاط ضروری ہے تمہارے ساتھ سرائے جانا مناسب نہیں ہے۔“

ترن کوڑی اور جعفر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باتیں کرتے ہوئے عبادت خانے واپس نہ لارہے تھے ان کے ساتھ ہی اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے دونوں کی باتیں بڑے غور سے سنی تھیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ جعفر صبح ہوتے ہی سراکش کی سرائے میں جائے گا۔ سرائے پورے بعلبک میں مشہور تھی۔ لارنس کے لئے یہی آخری موقع تھا کہ جعفر سرائے میں پہنچے تو اسے قابو میں کر لیا جائے مگر یہ کام وہ تمنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ دیکھنے میں بھی اس سے طاقتور معلوم ہوتا تھا۔ ابھی اتنا وقت تھا کہ وہ اپنے لارنس کے دوستوں کی مدد حاصل کر سکتا تھا لیکن خطرہ یہ تھا کہ اگر وہ دوستوں کو اکٹھا کر لے گا تو لارنس کی مدد سے اس کے آنے سے پہلے ہی جعفر عبادت خانہ چھوڑ چکا ہو تو پھر کیا اس کے ساتھ اس بات کا بھی امکان تھا کہ شاید جعفر سرائے کا خیال ہی ترک کر لے گا۔ لارنس کو اپنے دوست اکٹھا کرنے اور انہیں اس غیر قانونی کام انجام دینے کے لئے اس میں اسے زیادہ وقت لگ گیا تو بھی جعفر صاف بچ کر نکل سکتا تھا۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ جعفر کی عبادت گاہ سے روانگی تک یہیں ٹھہرے گا اور جب وہ ان کی طرف روانہ ہو گا اس وقت کوئی قدم اٹھائے گا۔ مگر اس کا قدم کیا ہو گا۔ اس میں اس کا دل الجھ گیا اور وہ دیر تک اسی الجھن میں گرفتار رہا۔ معام اس کے دماغ میں ایک لکڑی اور وہ مسکرا دیا۔ اسے اپنے کامیابی کی امید پیدا ہو گئی اور وہ بڑے اطمینان سے بڑھ گیا۔

”تو جعفر کے ساتھ جا سکتی ہو۔“

”نہیں پاپا۔“ ترن کوڑی نے سختی سے انکار کیا۔ ”میں نے اور جعفر نے جو طے کیا ہے ہم اس پر عمل کریں گے۔ میں جعفر کے ساتھ جاؤں گی مگر اس وقت نہیں۔ میں ان کی جدائی کے کب کو برداشت کروں گی اور حالات ٹھیک ہوتے ہی اپنی نئی دنیا آباد کروں گی۔“

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دور کسی مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوئی۔ جعفر فوراً ”موصل“ کے انتظام کے اختتام پر اس نے کہا۔ ”اب آرام کرنے کا وقت نہیں رہ گیا فادر۔ میں اب لوٹ کر کے چلا جاؤں گا۔“

جیسی تمہاری مرضی جعفر۔ میں تمہاری کسی بات میں دخل نہ دوں گا۔“

فلپ واپس ہونے لگا تو جعفر نے کہا۔ ”آپ میرا سلام قبول فرمائیے۔ شاید اب میں سے نہ مل سکوں۔“

فلپ نے پلٹ کر جعفر کو غور سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔ پھر وہ گھوما اور آہستہ آہستہ اٹھنا اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔

”میرے پاپا کتنے اچھے ہیں جعفر۔“ ترن کوڑی نے بھرپور پیار سے کہا۔ ”تم نے انہوں نے کتنی خوشی سے مجھے تمہارے ساتھ جانے کی اجازت دے دی حالانکہ وہ جدائی ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے۔“

پار کرنے والے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں ترن کوڑی۔ ”جعفر نے اسے سمجھایا۔“ ایسے اپنے لئے نہیں اپنے پیاروں کے لئے زندہ رہتے ہیں۔“

جعفر نے کمرے میں نظر دوڑائی تو ترن کوڑی نے پوچھا۔ کس چیز کی ضرورت ہے۔ کیا وہ ہے جو جعفر؟“

جعفر نے ملائیت سے جواب دیا۔ ”وضو کے لئے پانی چاہئے۔ مجھے نماز پڑھنا ہے۔“ ترن کوڑی جلدی سے ایک جگہ میں پانی بھر کے لے آئی۔ جعفر نے وضو کر کے کمرے کی طرف ہوتی جادو کھول کے بچائی اور نماز فجر ادا کی۔ ترن کوڑی دور بیٹھی اسے نماز پڑھتی رہی۔ اس نے جعفر کو ہاتھ اٹھا کے دعا مانگتے دیکھا تو آہستہ سے بولی۔ ”جعفر دعا مانگ بھی کچھ مانگ لیتا۔“

جعفر نے دعا مانگ کر منہ پر ہاتھ پھیرے اور پلٹ کر کہا۔ ”میں نے اپنے اللہ سے تمہارا دعا مانگ کر رکھ رکھا۔“ اور ترن کوڑی کا دل سینے میں زور زور سے اچھلنے لگا۔

ترن اور ترن کوڑی کی جدائی کا منظر بڑا رقت انگیز تھا۔ ان کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ آنکھیں بھری ہوئی تھیں اور ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔ ترن کوڑی کا دل بہت چاہتا تھا کہ ایک تو فطری حیا پھر مسلم تہذیب کا خیال اسے بے مبری سے روک رہا تھا۔ ان کے ہونٹ ہونٹ ایک دوسرے سے بس ایک لمحے کے لئے ملے پھر جدا ہو گئے۔ ترن

ترن کوڑی، جعفر کو لئے اس کمرے پر پہنچی جس میں اس کے پاپا نے جعفر کو رکھا تھا۔ جعفر نے کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ کمرہ بڑا آراستہ تھا۔ جعفر نے اس کا ”بڑا خوبصورت کمرہ ہے۔ ایسے آراستہ کمرے کا میں اس عبادت خانے میں تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔“

ترن کوڑی اٹھے ہوئے جذبات سے جعفر کو دیکھ رہی تھی اور نہ معلوم کس خیالوں میں ابھی ہوئی تھی۔ اس نے شاید جعفر کی بات سنی ہی نہیں۔ جعفر نے اچانک چوٹکایا۔ ”کیا سوچ رہی ہو ترن کوڑی۔ تم رات بھر جاگی ہو۔ جاؤ تھوڑی دیر آرام کرنا صبح کو پھر ملاقات ہوگی۔“

”میں جاؤں؟“ ترن کوڑی نے بڑی حسرتوں کے ساتھ کہا۔ اسے خیال تھا کہ جعفر اسے کمرے میں آنے کو کہے گا۔

”ہاں ہاں ضرور جاؤ۔ کچھ دیر آرام کرو گی تو تھکن دور ہو جائے گی۔“ ”کیا میں چلی جاؤں؟“ ترن کوڑی کے ہونٹوں سے جیسے الفاظ پھسل پڑے۔ ”نہیں جانا چاہتی ہو تو کوئی بات نہیں۔ ہم کھڑے کھڑے باتیں کرتے ہوئے ہیں گے۔“

اسی وقت کسی طرف سے فلپ کی آواز ابھری۔ ”ترن کوڑی۔ آگئیں بیٹی؟“ ترن کوڑی اور جعفر نے چونک کے آواز کی طرف رخ کیا۔ فلپ اپنے کمرے سے آ کر آہستہ آہستہ ادھر آ رہا تھا۔

”آپ اب تک جاگ رہے ہیں پاپا؟“ ترن کوڑی کے لمبے میں خوشی اور جرت تمہیں بلانے آیا تھا مگر تم باغ میں جعفر کے ساتھ باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے وہ مناسب نہیں سمجھا۔ جاؤ۔ تھوڑی دیر سو جاؤ۔ صبح ہونے والی ہے۔“

”یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں پاپا۔“ جعفر کو بولنے کا موقع مل گیا۔ ”پاپا۔ جعفر صبح کو چلے جائیں گے۔“ ترن کوڑی نے جیسے روتے میں کہا۔ ”کہاں۔ جعفر کہاں جا رہا ہے؟“ فلپ نے گھبرا کے کہا ”کیا تم نے اسے اجازت دے دی ہے۔“

ترن کوڑی نے مدھم آواز میں جواب دیا۔ ”ہاں پاپا۔ جعفر کا اس وقت طبیعت ٹھیک نہیں۔ انہیں اپنے کچھ ذاتی کام بھی نمٹانا ہیں۔ یہ بہت جلد واپس آ جائے گا۔“

”ترن کوڑی۔ خوب سوچ لو۔ میں نے تمہارے معاملات میں کوئی دخل نہیں ڈالا۔ الزام مت دینا۔“ فلپ نے اپنی صفائی پیش کرنے کے لئے وضاحت کی۔ ”میری طرف سے“



کوزی کی آنکھیں چمک پڑیں۔ جعفر نے جلدی سے منہ پھریا اور تیز قدموں سے پا لگا ترن کوزی نہ جانے کب تک وہاں کھڑی جعفر کو جاتا دیکھتی رہی۔

لارنس بوکھلایا جا رہا تھا۔ اسے جعفر کے تعقب میں جانا تھا مگر ترن کوزی راستے میں دیوار بنی کھڑی تھی۔ بڑی دیر بعد ترن کوزی عبادت خانے واپس گئی اور لارنس نے تعقب شروع کیا۔ جعفر بوجھل بوجھل قدموں سے سرائش کی سرائے کی طرف جا رہا تھا۔ جس راستے پر وہ چل رہا تھا وہ سیدھا سرائے کو جاتا تھا مگر لارنس کو اب بھی اطمینان تھا وہ یقین کرنا چاہتا تھا کہ جعفر واقعی سرائے میں پہنچ گیا ہے کیونکہ اس یقین کے بعد ہی اپنے سوچے ہوئے منصوبے پر عمل کر سکتا تھا۔ پھر جب سرائے کے گیٹ میں داخل ہو گیا لارنس نے اپنے قدم روکے اور پلٹ کے تیزی سے قاضی کی حویلی کی طرف چلے گیا۔ کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ وہ بھاگتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

لارنس کو یقین تھا کہ وہ قاضی شہر کو اپنی چرب زبانی سے قائل کر کے اسے جہز دوبارہ گرفتار کرنے پر آمادہ کرے گا مگر یہ اس وقت ممکن تھا کہ لارنس کو قاضی کے حوالے میں فوری باریابی نصیب ہوتی اور وہ اپنا مقصد بیان کر سکتا۔ ہعلیک کے شہر کو تو لارنس قاضی شہر کو معلوم تھا کہ ہعلیک کے عیسائی، حکومت کے وفادار ہیں اور وہ حکومت کے لئے جاسوسی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں تھا کہ قاضی شہر کی حویلی پر لارنس کو نہ پہچانتے ہوں۔ لارنس کو دیکھتے ہی قاضی کے حویلی کے پیردار نے ادب سلام کیا تھا اور اس سے مزاج پر سی کی تھی مگر جب لارنس نے اس سے یہ درخواست کی وہ ایک اہم معاملے میں قاضی سے اسی وقت گفتگو کرنا چاہتا ہے تو پیردار نے اس ساتھ تعاون کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

”لارنس۔ آپ میرے لئے قابل احترام ہیں مگر یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اس وقت آپ کی آمد کی اطلاع قاضی محترم تک لے جاؤں۔ قاضی صاحب نماز کے بعد نماز فرماتے ہیں پھر وظائف کا ورد کرتے ہیں۔ اس دوران نہ وہ کسی کی مداخلت برداشت کرتے ہیں اور نہ مجھ میں اتنی جرات ہے کہ آپ کا پیغام ان تک پہنچاؤں۔“

پیردار نے بڑے مذہب طریقے سے اپنی معذوری کا اظہار کیا تھا مگر لارنس کا ٹوٹ گیا۔ اسے ایک لمحہ پراڑ معلوم ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس نے معاملے کی اہمیت صاف طور پر تو نہیں مگر مختلف طریقوں سے پیردار پر واضح کرنے کی کوشش کی مگر پیردار انکار کسی صورت اقرار میں تبدیل نہ ہو سکا۔ اب اس کے لئے سوائے اس کے اور چارہ نہ رہ گیا تھا کہ وہ اس وقت تک انتظار کرے جب تک پیردار اس کی آمد کی خبر شہر تک نہیں لے جاتا۔ یہ لمحات لارنس پر بڑے گراں گزر رہے تھے وقت بڑی تیزی سے گزر رہا تھا اور اسے خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس دوران جعفر کہیں

میں ہی معلوم منزل کی طرف روانہ نہ ہو جائے۔ کچھ دن چڑھا۔ پیردار نے لارنس کی بے چینی دیکھتے ہوئے شاید اس پر رحم کر کے قاضی شہر کے آگے لارنس کی اطلاع دی۔ قاضی نے اسے اندر بلا لیا۔ لارنس نے قاضی کو جلدی تمہید باندھ کر قاضی کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ کچھ دن پہلے جس شخص کو سرائش کی کارواں سرائے سے گرفتار کر کے قید کیا گیا تھا وہ سینٹ پال کے بھگت سنگھ کا حکم دیا جائے۔

قاضی شہر لارنس کی طویل گفتگو سے آگیا تھا۔ اس نے لارنس کی باتوں کا الٹا ہی جواب دیا۔ ”لارنس کسی مشتبہ شخص کا قید سے نکل بھاگنا اس قدر اہمیت نہیں رکھتا جتنی اہم ہے کہ میں نے اسے سینٹ پال کے گرجے میں قید کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہ بات کا ایک اہم راز ہے۔ ہم قیدیوں کو گرجے میں ضرور رکھتے ہیں مگر گرجے کے پادری اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ اس بات کی تشہیر کرتا پھرے کہ اس کی قید میں کوئی شخص موجود ہے۔ گرجے کے پادری نے حکومت کا ایک اہم راز افشاء کیا ہے۔ ہم اس پر برسرِ کمر ہیں گے کہ اس نے تم پر یہ راز افشاء کیوں کیا۔“

لارنس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ الٹی آنتیں اس کے گلے میں آگئی تھیں۔ اس کے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اب اسے یہ فکر پڑ گئی کہ اگر سینٹ پال پادری سے سوال کیا گیا تو وہ جواب میں شہر کو تو لارنس کا حکم نامہ پیش کر دے گا۔ اس وقت اسے دروغ بیانی کے جرم میں پھنس جائے گا۔ جعفر کی گرفتاری کا معاملہ تو الگ رہا اس کو اپنی جان کے لئے پڑ گئے۔ اس نے قاضی کی خوشامد شروع کر دی اور خود اس کی کہ اس معاملے کو آگے نہ بڑھایا جائے کیونکہ اس سے گرجے کے پادری اور اس کی سخت بدنامی ہوتی تھی۔

لارنس قاضی اپنی جگہ پریشان تھا۔ اس کا قید کیا ہوا آدمی بھاگ نکلا تھا یہ خود اس کی فحاشی تھی مگر اسے اس لئے اطمینان تھا کہ جعفر کی گرفتاری شہر کو تو لارنس کے حکم سے عمل میں آئی تھی بلکہ اسے مشکوک آدمیوں کی گرفتاری کے عام حکم کے تحت پکڑا گیا تھا اور اس کے محتق کوئی علم نہ تھا۔ وہ خود یہ چاہتا تھا کہ قیدی کے بھاگ نکلنے کی خبر اسے نہ ہو اس لئے اس نے لارنس کی درخواست قبول کر لی اور اسے سخت تاکید کی قیدی کو آزاد کی خبر نہ اپنے منہ سے نہ نکالے ورنہ اس کے حق میں برا ہوگا۔

اور اس وقت جعفر اپنے دوست سرائش سے طویل گفتگو کے بعد بڑی تیزی سے گھوڑا سوار ہو کر قاضی شہر کی طرف رات دوں تھا۔



والی موصل عماد الدین زنگی صرف ہمار اور باتدیر حکمران نہ تھا بلکہ وہ ہماروں کی طرف سے قدر کرتا تھا۔ صلاح الدین کا باپ نجم الدین ایوب اور چچا اسد الدین موصل کے رہنے والے تھے۔ انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور نہ صرف نجم الدین سے کہ وہ اسان کا بدلہ اتارا بلکہ دونوں بھائیوں کو دربار کے امرا میں شامل کیا۔ پچھلے دو سال سے دونوں بھائی امیر کی خدمت کر رہے تھے۔ ہر معرکے میں یہ پیش پیش ہوتے اور اپنی شہادت کے جوہر دکھاتے۔ اس طرح انہوں نے امیر کی نظروں میں ایک اہم مقام حاصل کر لیا تھا۔ امیر بھی انہیں ہر موقع پر اہم اہم ذمہ داری سونپتا تھا مگر اب تک ان دونوں کو کل اپنی صلاحیت دکھانے کا موقع نہ ملا تھا اور وہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھے۔

امیر موصل نے دمشق کی ملکہ زمرہ خانم سے شادی کر کے ایک زبردست سیاسی چلی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح دمشق کے معاملات میں اس کے عمل دخل ہو جائے گا مگر اس کا دشمن دمشق کا وزیر اعظم معین الدین انز جو اصل میں دمشق کا حاکم بنا ہوا تھا امیر سے بھی زیادہ شاطر اور چالاک نکلا۔ امیر موصل نے دمشق کی بیوہ ملکہ زمرہ خانم سے شادی کرنے کے علاوہ اپنی ایک بیٹی کو شاہ دمشق مجیر الدین آبق کے ساتھ بیاہ دیا تھا۔ اس طرح امیر نے دوہری چال چل کے دہرا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی مگر دمشق کے آہن معین الدین نے امیر کی چالوں پر پانی پھیر دیا اس نے نہ صرف امیر کے جوں جوں اس کے شاہ دمشق کو قتل کرا کے اس کے ایک بھائی کو تخت دمشق پر بٹھا دیا بلکہ عیسائی حکومتوں کے مدد سے امیر موصل کو گھیر کے جھکست دینے کی کوشش کی تھی۔ امیر خوش قسمت تھا کہ اس نے پہلے ہی اپنے دوستوں کو دشمن سے بچا کر موصل واپس ہو گیا۔

عماد الدین کو اس طرح اپنے دشمن کے ہاتھوں ایک طرح کی جھکست اور ذلت پڑی تھی لیکن وہ دل برداشتہ نہیں ہوا۔ دمشق کو فتح کرنا اس کے لئے انتہائی ضروری تھا۔ امیر کا اصل مقابلہ عیسائی حکومتوں سے تھا مگر ان کو جھکست دینے سے پہلے اسے دمشق کے مسلمان سلطنت پر قبضہ کرنا ضروری تھا کیونکہ وہ ایک مضبوط دشمن کو اپنی پشت پر جوڑنے کی ضرورت ہو سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے موصل پہنچے ہی زبردست جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ امیر موصل اپنی لشکر کشی اور حملوں میں بڑی راز داری سے کام لیتا تھا۔ جب وہ لشکر لے کر نکلتا تو اس کے قریب ترین سردار کو بھی علم نہ ہوتا کہ وہ کس جگہ حملہ کرنے جا رہا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کسی مخالف ریاست کے بالکل قریب پہنچ جاتا اور اس کے سرداروں اور لشکر کو یقین ہو جاتا کہ اسی ریاست پر حملہ ہو گا مگر امیر آخری لمحہ تک اپنے دم اپنا راستہ بدل دیتا اور کسی دوسری ریاست پر اچانک جا پڑتا۔

امیر موصل بہت آہستہ آہستہ دمشق کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ایک ایک منزل پر وہ کئی گھنٹے قیام کرتا۔ لشکر کا معائنہ کرتا اور امرا اور سرداروں کو ضروری ہدایات جاری کرتا۔ دمشق میں تھلکہ مچا ہوا تھا۔ معین الدین کو برابر خبریں مل رہی تھیں کہ امیر موصل قریب قریب دمشق کے ساتھ دمشق کی طرف آ رہا ہے اس نے اپنے تمام حلیفوں کو مطلع کر دیا اور ان کی فوجیں دمشق کی حفاظت کے لئے پہنچ گئی تھیں۔ معین الدین دمشق کو مضبوط

اس کی باتیں سنتا رہا۔ جعفر نے یہ بھی بتایا کہ ایک عیسائی لڑکی کی مدد سے اسے رہائی مل ہوئی ہے مگر امیر نے اس بارے میں اس سے کچھ نہ پوچھا مگر جب جعفر کی گفتگو ختم ہوئی تو امیر نے ذرا غصہ سے کہا۔ اس کے مطلب ہے کہ دمشق اور ہبلک کی عیسائی عبادت میں پادری غیر جانبدار نہیں اور سلطنت دمشق کے بہت سے اہم کام انجام دیتے ہیں۔

جعفر امیر کا غصہ دیکھ کر کانپ اٹھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے امیر کو یہ کیوں کہ اسے بیٹ پال کی عبادت گاہ میں قید کیا گیا تھا مگر تیر تو کمان سے نکل چکا تھا۔ جعفر ابھی نہیں کر سکتا تھا اس لئے اسے مجبوراً اقرار کرنا پڑا۔ ”امیر محترم۔ دمشق کے ان تین یقین سے نہیں کہہ سکتا مگر ہبلک کی ہر عبادت گاہ مسلمان قیدیوں کی حقوت اپنی ہوئی ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ تمہارے جیسے مسلمان بھی قید ہوں؟“

”میں ممکن ہے امیر محترم۔ ہبلک کا قاضی اور شہر کو تال جاسو سوں اور مشتبہ لوگوں کی عبادت گاہ میں قید کرتے ہیں۔“ جعفر نے بے حجب کہہ دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے کوئی اور اس کے باپ کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے مگر اسے امیر کے سامنے جھوٹ لے کر ہمت نہ ہوئی۔

”اچھا جعفر۔ جب ہم ہبلک پہنچیں تو ہمیں عیسائی عبادت گاہ اور سرائش یا سرکاش کی رائے ضرورت یاد دلانا۔“ امیر موصل نے جعفر کو ایک بار پھر چونکا دیا کہ امیر موصل جا تو گیا تھا اور ذکر ہبلک کا کر رہا تھا۔

جعفر چند لمحے امیر کو دیکھتا رہا پھر کہا۔ ”خادم اپنے امیر کی باتیں سمجھنے سے قطعی قاصر تھے۔ میں معلوم کہ امیر کس طرف تشریف لے جا رہے ہیں اور نہ میری جرات ہے کہ اس بارے میں امیر سے کوئی سوال کر سکوں مگر امیر نے ابھی مجھے حکم دیا ہے کہ میں ہبلک میں انہیں دو باتیں یاد دلاؤں حالانکہ امیر محترم شاید۔“

جعفر کہتے کہتے اک دم رک گیا۔ اسے فوراً خیال آیا کہ امیر کے ارادوں کے متعلق اسے لگانا اور قیاس آرائی کرنا بھی جرم ہے۔

”رک کیوں گئے جعفر تم کچھ کہہ رہے تھے؟“ امیر نے نرمی سے پوچھا۔

”غلام سے ایک گستاخی ہو رہی تھی امیر۔ غلام کو معاف کیا جائے۔“

امیر نے ایک لمحہ رک کے پوچھا۔ ”اچھا بتاؤ جعفر۔ ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

”غلاموں کا یہ کام نہیں کہ آقا کے ارادوں کے بارے میں قیاس آرائی کریں۔“ جعفر

سے مضبوط تر بنانے میں رات دن مصروف تھا۔ دمشق آنے والے تمام راستوں پر اسے لشکر پھیلا دیا تھا۔ اس کے علاوہ دمشق کے قلعہ کو اس نے اس قدر مضبوط کر دیا تھا کہ محاصرے کی صورت میں وہ کئی ماہ تک امیر موصل سے مدافعتی جنگ لڑ سکتا تھا۔

امیر موصل نے دمشق کی طرف دو تین منزلیں طے کرنے کے بعد ایک بڑے دریا میں پڑاؤ ڈالا اور حکم دیا کہ لشکر کے خیمے چھ میل کی چوڑائی میں نصب کئے جائیں۔ غم قہیل ہوئی اور چھ میل تک خیمے ہی خیمے نظر آنے لگے۔ دور سے دیکھنے والوں کو یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک عظیم الشان لشکر میدان میں خیمہ زن ہے لیکن امیر نے کچھ اور ہی سو رکھ رکھا۔ اس نے سب سے پہلے جعفر کو اپنے خیمے میں طلب کیا۔ جعفر ہبلک سے روانہ ہو کر سیدھا موصل پہنچا تھا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ امیر لشکر کے ساتھ دمشق روانہ ہو چکے ہیں تو موصل میں ٹھہرنے کے بجائے سیدھا دمشق کے راستے پر روانہ ہو گیا۔ کچھ شب وہ امیر کے لشکر میں پہنچ گیا تھا مگر اسے امیر کے حضور باریابی کی اجازت نہ ملی تھی۔ امیر نے اسے اطلاع کرا دی تھی کہ وہ لشکر کے ساتھ ساتھ چلتا رہے اور جب ضرورت ہوگی اسے طلب کر لیا جائے گا۔

جعفر نے امیر کے خیمے میں پہنچ کے سلام کیا تو امیر اسے دیکھ کر مسکرایا۔ ”جعفر ہمیں معلوم ہو گیا تھا کہ تم ہبلک سے روانہ ہو چکے ہو۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ تم گرفتار کر لئے گئے تھے اور بڑی مشکل سے تمہیں رہائی حاصل ہوئی تھی۔“

جعفر نے تعجب سے امیر کو دیکھا۔ ”امیر عالی مقام کا ارشاد بالکل درست ہے مگر یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ یہ اطلاعات امیر تک کس ذریعے سے پہنچیں۔؟“

”جعفر۔ ہم اپنے اہم آدمیوں کے بارے میں ہر وقت باخبر رہنا چاہتے ہیں۔“ امیر نے کہا۔ ”ہم نے ہلو کشش کو تمہارے پاس بھیجا کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ موصل لے آئے کیونکہ اب ہبلک میں مقیم رہنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں لیکن سرائے کے مالک سرکاش۔۔۔۔۔۔ شاید یہی اس کا نام ہے۔ اس نے بتایا کہ جعفر اس دن صبح کو قید رہا ہوئے تھے اور موصل جا چکے ہیں۔“

”عالی مقام امیر۔۔۔۔۔۔ وفاداروں کو اس بات پر فخر ہے کہ امیر ان حالات

خیال رکھتے ہیں۔“ جعفر نے سر جھکا کر کہا ”سرائے کا مالک سرائش جسے لوگ سرکاش کہتے

ہیں۔ میرا گہرا دوست بن گیا تھا۔ اس کی وجہ سے مجھے ہبلک میں اپنا کام کرنے میں بڑی

آسانی ہوئی تھی۔“

پھر جعفر نے بڑی تفصیل سے ہبلک اور دمشق کے حالات بیان کئے اور امیر بڑی توجہ

نہال عوام کی بے چینی سے بہت پریشان تھا۔ اس کی فوج میں بھی بد دل پھیل

رات کے آخری حصے میں عماد الدین زندگی کا لشکر بڑی احتیاط اور خاموشی سے خیمہ سے نکلا اور راستہ کاٹ کر پہلیک کی طرف روانہ ہوا۔ اس زمانے میں جنگ کے دوران بھی تجارتی قافلے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہتے تھے۔ ان سے کوئی تعرض نہ کرنا بلکہ اکثر تاجر اپنے سامان کے ساتھ لشکر گاہ میں آکر سامان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ امیر موصل نے روانگی سے قبل خیمہ گاہ میں مقیم دستوں کو سخت تاکید کر دی تھی کہ تاجر یا غیر شخص کو خیمہ گاہ میں نہ آنے دیا جائے۔ یہ حکم اس نے اس لئے دیا تھا کہ

ہی تصدیق اس انداز سے چاہتے ہیں۔ تو ہم اس کے لئے بھی تیار ہیں۔ یوں ہم یقین دلاتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کا خون نہیں بہانا چاہتے۔ ہمیں قلعہ پر قبضہ چاہیے۔“

ہم نے بڑی مسرت سے کہا۔ ”امیر محترم ہم آپ کا دوبارہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ شر کی طرف سے پیش کی گئی شرطوں میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ قلعہ پر قبضے کے بعد سے پیش کی گئی شرطوں میں سے پہلی شرط یہ ہے کہ قلعہ پر قبضے کے بعد قلعہ میں تمام مذہب و ملت کے لوگوں کی جان و مال اور محترمی آبرو کا وعدہ کیا جائے اور میری یہ ہے کہ قلعہ پر قبضے سے پہلے شر کو قوال کو معذرت اس کے لشکر کے دمشق جانے کی امان دی جائے۔ اس کے علاوہ شہر کے لوگ جو شر کو قوال کے ساتھ جانا چاہیں انہیں بھی اجائے۔“

”ہم نے آپ کی دونوں شرطیں قبول کیں۔“ امیر نے بغیر کسی جھجک کے کہا۔ ”لیکن اگر ذرا ترمیم کر لی جائے وہ یہ کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ بعلبک کی عیسائی عبادت میں شر کو قوال نے بعض مسلمانوں کو قید کر رکھا ہے۔ اس لئے ہم اس بات کے مختار کے لئے عیسائی عبادت گاہوں کی تلاشی لے کر تمام بے گناہ مسلمانوں کو رہائی دلائیں۔ بعلبک کے علاوہ اس بات کا کوئی علم نہ تھا۔ ایک عالم نے کہا۔ ”امیر۔ ہمیں اس کا علم نہیں۔ اگر شر کو قوال نے ایسا کیا ہے تو یہ چیز ملکی قانون کے خلاف ہے۔ اس لئے شہر میں قید خانہ موجود ہے۔ عیسائیوں کی عبادت گاہ کو قید خانے کے طور پر رکھنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ ہم اعلان کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو قید سے رہا کے لئے آپ کو کسی بھی عبادت گاہ میں داخل ہونے کا پورا اختیار ہوگا۔“

امیر موصل عالم کی اس بات سے بہت خوش ہوا۔ ”محترم بزرگ۔ ہمارے تین آدمی ساتھ قلعہ میں جائیں گے۔ ان میں دو ہمارے معزز سردار ہوں گے اور تیسرا شخص ہوگا جو شر کو قوال کو اس بات پر قائل کرے گا کہ اس کے حکم سے کتنے ہی عیسائی عبادت گاہوں قید ہیں انہیں رہا کرنا ہے۔“

امیر موصل ہو گئی۔ بعلبک کے علاوہ واپس ہوئے۔ امیر موصل نے ان کے ساتھ اپنے دو محافظوں کے ساتھ کیا یہ دونوں کے بھائی تھے یعنی اسد الدین اور نجم الدین ایوب۔ ان کے ساتھ بھیجا گیا جو بعلبک کی ایک عبادت گاہ میں کئی دن تک قید رہ چکا تھا۔ بعلبک کے عوام اور خواص صلح کی سفارت کی واپسی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ تمام لوگ گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آگئے تھے۔ زیادہ مجمع قلعہ کے صدر

دری تھی۔ آخر اس نے شہر کے معززین اور علماء کرام کے زور دینے پر صلح کی بات آمادگی ظاہر کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ امیر موصل سے گفتگو کرنے کو کون جائے؟ اپنا پہلو بچا رہا تھا اور شر کو قوال قلعہ سے باہر نکلنے پر کسی طرح آمادہ نہ تھا۔ اس میں صرف علماء کرام ہی اس بات چیت کو احسن طریقے سے آگے بڑھا سکتے تھے۔ شر کو علم تھا کہ امیر موصل باجود انتہائی سخت مزاج ہونے کے علماء کی عزت کرتا ہے۔ اس نے شہر کے دو عالموں کو امیر سے گفتگو کے لئے بھیجا۔

امیر موصل نے دونوں عالموں کو بڑی عزت سے اپنے خیمے میں بلایا ان کا احترام کیا مگر جب علماء نے صلح کی گفتگو شروع کی تو امیر موصل نے بڑے ادب سے دیا۔ ”آپ لوگ دینی اور دنیاوی دونوں اعتبار سے ہمارے لئے قابل احترام ہیں لیکن بات چیت کے لئے آپ کے ساتھ شہر کو قوال یا اس کا کوئی معتد آنا چاہئے قلعہ شرائط کی تصدیق کرتا۔“

علماء کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا پھر ایک عالم نے کہا۔ ”امیر محترم مطالبہ درست ہے لیکن ہم صلح کی ایسی شرائط لے کے آئے ہیں کہ جب آپ آگے تو شاید آپ کو مزید کسی تصدیق کی ضرورت نہ ہوگی۔“

”محترم بزرگ۔“ امیر نے نرمی سے جواب دیا۔ ”آپ دونوں کا ہمارے لئے ہمارے لئے باعث عزت و شرف ہے اور ہم آپ سے صلح کی شرائط سننے سے پورا کی تمام شرطوں کو تسلیم کرتے ہیں لیکن ہمارا مطالبہ پھر بھی اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ امیر نے اپنے جواب سے علماء کو بالکل لاجواب کر دیا۔ وہ امیر کی گفتگو سے ہوتے تھے۔ انہوں نے امیر کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اس وقت اس کے ہاں نظر آ رہا تھا۔ صلح کی شرائط کو بغیر سنے تسلیم کر لیتا امیر کا ایک ایسا فیصلہ قلعہ تارخ میں بہت کم ملتی ہے۔ علماء بہت دیر تک آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے؟ نے کہا۔

امیر محترم۔ ہم آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری شرطیں بغیر سنے کر لیں۔ جہاں تک اس کی تصدیق کا مسئلہ ہے اس کی ایک صورت یہ بھی ہوگی۔ آپ ہماری شرائط سن لیں اور اپنے چند معتد ہمارے قلعہ میں بھیج دیں جو شر ملاقات کر کے اس کی تصدیق کرا لیں۔“

شاید امیر موصل ہر صورت میں صلح پر آمادہ تھا اس لئے اس نے فوراً ”محترم بزرگان دین۔ ہم آپ کی کوئی بات رد کر کے گناہ گار نہیں ہونا چاہتے

مرف جیس اور تمہارے لشکر کو قلعہ چھوڑنے کی اجازت دینے پر رضامند ہیں  
 ان لوگوں کو بھی قلعہ چھوڑنے کی اجازت ہوگی جو اپنی خوشی سے تمہارے ساتھ جانا  
 چاہیں۔

”سردار۔ یہاں بہت شور ہو رہا ہے۔ آپ ہمارے  
 قلعہ کے لیے چلے وہاں بیٹھ کے اطمینان سے گفتگو ہوگی۔“  
 ان لوگوں کو لے کے برج میں چلا گیا۔ عوام جوش و خروش سے نعرے لگا رہے  
 تھے کہ آوازیں اونچے اونچے تک پہنچ رہی تھیں۔ بنجم الدین ایوب نے جھانک کے  
 دیکھا۔ لوگ گردہ کی صورت میں جگہ جگہ اکٹھا تھے اور خوشی کے عالم میں رقص کر  
 رہے تھے۔ جعفر بھی نیچے جھانک رہا تھا اور اس کی نظریں کسی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ شاید  
 ان کو باہر سرائی کو مگر اس جم عہد میں اس کی نظریں ٹھکنے ہی رہیں اور اسے  
 اس نظر نہ آیا۔

”سردار، امیر موصل کی شرط سننے کے لئے بہت بے چین تھا۔ اس نے بیٹھے ہی بنجم  
 سے کہا۔ سردار فرمائیے۔ امیر موصل نے صلح کی کیا شرط رکھی ہے؟“  
 بنجم الدین نے بڑے رعب سے کہا۔ ”ہمارے امیر کو معلوم ہوا ہے کہ بعلبک کے شہر  
 اور دوسرے حاکموں نے بعض ایسے مسلمانوں کو گرفتار کیا ہے جن پر انہیں جاسوس  
 الزم ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مشکوک لوگوں کو گرفتار کرنا ہر حکومت کا فرض ہے مگر  
 اے حکام نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ گرفتار شدگان کو بجائے حکومت کے قید  
 خانے کے عیسائی پادریوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اس طرح بعلبک کا ہر عبادت  
 خانہ قید خانے کا بھی کام کرتا ہے جس میں بے گناہ مسلمان قیدی غیر مسلموں کے  
 طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرتے ہیں۔“

”اگر اس الزام کو سن کر پیلا پڑ گیا کیونکہ بعلبک میں یہ عام طریقہ تھا اور خود اسے  
 اس پر بھی حیرت تھی کہ یہ خبر امیر موصل تک کس طرح پہنچی۔ قاضی شہر اس کے  
 قریب تھا وہ یہ بات سن کر چونک پڑا۔ اسے فوراً لارنس کی بات یاد آگئی جس نے  
 اعلان پہلے اسے مطلع کیا تھا کہ ایک مشکوک مسلمان عیسائی عبادت خانہ سے بھاگ  
 کر اسے یقین ہو گیا کہ یہ راز کی بات امیر موصل کو اس قیدی نے بتائی ہوگی۔“

”کو تو ال نظریں سچی کئے ہوئے بیٹھا سوچ رہا تھا کہ امیر موصل کے سردار کو کیا  
 اسے انکار کرنے کی جرات نہ ہو رہی تھی۔ اس وقت ایک عالم نے بات کو  
 ”سردار کو تو ال سے مخاطب ہوا۔“ ”محترم کو تو ال شہر۔ امیر موصل نے اپنے سردار کے

دروازے کے قریب تھا۔ شہر کو تو ال فوجی سرداروں عمائدین معززین شہر کے ساتھ  
 بڑے برج میں بیٹھا سفارت کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ ہر شخص مسہما ہوا تھا۔  
 چہرے دھواں دھواں دکھائے دیتے تھے اور جانیں سولی پر لٹکی ہوئی تھیں۔ اسی وقت  
 بعلبک کے عالم چند دوسرے لوگوں کے ساتھ قلعہ کی طرف واپس آتے دکھائے  
 سب کی آنکھیں آنے والوں پر لگی تھیں۔ صدر دروازے پر پہنچ کے علمائے  
 اشارے سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ بڑے دروازے میں لگا ہوا چھوٹا دروازہ کھول دیا  
 آنے والوں کو اندر لے کر فوراً اسے احتیاط سے بند کر دیا گیا۔

شہر کو تو ال برازق یوبہ قاضی شہر کے ساتھ برج سے اتر کر دروازے کے پاس  
 تھا۔ اس نے علماء کرام کو امید و بیم کی نظروں سے دیکھا۔ ایک عالم نے سرگوشیوں  
 ”مبارک ہو امیر موصل صلح پر آمادہ ہو گئے ہیں۔ امیر کے تین سردار صلح کی  
 لئے ہمارے ساتھ ہیں۔“

شہر کو تو ال کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اس نے بڑھ کے اسد الدین۔ بنجم الدین  
 اور جعفر کا پر تپاک استقبال کیا ”اے امیر موصل کے معزز سرداران لشکر۔ کیا  
 صلح کا اعلان کر کے بعلبک کے عوام کو مطمئن کرنا گوارہ فرمائیں گے شہر کو تو ال  
 پریشانی چھپانے کی بہت کوشش کی تھی مگر اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

اسد الدین نے بڑے بھائی کی طرف دیکھا۔ بنجم الدین نے متانت سے جواب  
 ”اے برازق یوبہ۔ اگر علماء کرام کی جماعت ہمارے امیر کے پاس تمہاری طرف  
 پیغام لے کر گئی تھی تو میں اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ ہمارے امیر عالی مقام  
 کے تمام لوگوں کی جان بخشی کا حکم صادر کیا۔“

بنجم الدین ایوب نے اتنا ہی اعلان کیا تھا کہ ہر طرف سے امیر موصل  
 نعرے بلند ہونا شروع ہو گئے اور اس قدر شور ہوا کہ بنجم الدین اپنی بات بھی پو  
 سکا۔ اس نے چیخ کے شہر کو تو ال سے کہا۔ ”برازق یوبہ۔ ابھی صلح کا اعلان مکمل  
 ہے اور جب تک تم ہمارے امیر کی ایک شرط تسلیم نہیں کرتے اس وقت تک اس  
 پر عمل درآمد ہو سکے گا۔“

”کو تو ال کا رنگ پھر پھیکا پڑ گیا۔ اس نے گہرا کے کہا۔ ”سردار محترم۔ اگر  
 مجھے اور میرے لشکر کو قلعہ سے باعزت طریقے سے نکل جانے کی اجازت دینے  
 ہیں تو میں ان کی تمام دوسری شرطیں تسلیم کرنے پر آمادہ ہوں۔“  
 بنجم الدین ایوب نے اسے مطمئن کرنے کے لئے کہا۔ برازق یوبہ

شر کو تو ال اس شرط کو قبول فرمائیں گے کیونکہ انہیں اس غلطی کی کوئی سزا نہیں دی گئی۔ ان کا کام یہ ہو گا کہ وہ اور ان کے حکام مجاز تمام ایسے قیدیوں کی فرست ہمارے کریں جو مختلف عبادت خانوں میں قید ہیں۔ انہیں رہا کرانے کی ذمہ داری ہماری ہے۔ ان کی بازبانی کے لئے جو طریقہ بہتر خیال کریں گے وہ اختیار کیا جائے گا۔

نجم الدین ایوب کی بات نہایت معقول تھی۔ شر کو تو ال نے قاضی شہر کی طرف دیکھا۔

انے کہا۔ ”آپ کو تو ال شہر کی حیثیت سے ہعلبک کے حاکم مجاز ہیں۔ آپ امیر کی اس شرط کو تسلیم کرنے کا اعلان فرمائیے تاکہ صلح کے معاہدے کی تکمیل ہو جائے۔ امیر موصل کے حوالے کیا جاسکے۔“

شر کو تو ال برازق بویہ نے صاف الفاظ میں جواب دیا۔ میں امیر موصل کی شرط کو مانا ہوں۔ پھر اس نے نجم الدین ایوب سے کہا۔ آپ امیر موصل کے مطلع فرما دیں کہ ان کی شرط ہمیں منظور ہے۔ اب ہمیں قلعہ سے نکلنے کی اجازت دی جائے۔ تمام عبادت خانوں کی فرست میں ابھی آپ کو مہیا کئے دیتا ہوں۔ آپ جس طرح بہتر فرمائیں وہاں تلاشی لے سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میری درخواست ہے کہ اس عبادت خانے کے کسی پادری کو کوئی سزا نہ دی جائے انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ہم سے ہوا اور امیر موصل ہماری جانوں کی حفاظت کی ذمہ داری قبول فرما چکے

نجم الدین نے جواب دیا۔ ”شر کو تو ال کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ ہر کام صلح نامے کے ہو گا اور ہعلبک کی رعیت کو کوئی جانی یا مالی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔“

نامے کی تکمیل ہو چکی تھی۔ نجم الدین کو عبادت خانوں کی فرست مہیا کر دی گئی۔ شر کو تو ال سے رخصت ہو کر اسد الدین اور جعفر کے ساتھ برج سے اتر کر نیچے آیا۔ نیچے آتے ہی صلح کا اعلان کر دیا گیا اور لوگوں سے کہا گیا کہ جو لوگ ہعلبک کو لائیں وہ اپنا مختصر سامان لے کر قلعہ کے جنوبی دروازے پر پہنچ جائیں۔ نجم الدین نے کچھ پیچھے جعفر چل رہا تھا۔ اس کی نظریں ہعلبک کے عوام پر تھیں وہ خوشی سے کہہ رہے تھے۔ اس وقت جعفر کے کانوں میں ایک مانوس آواز پڑی اسے محسوس ہوا کہ قریب ہی اسے ”جعفر بھائی“ کہہ کے آواز دے رہا ہے۔ جعفر نے گھبرا کے طرف نظریں دوڑائیں اور یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی اس کا دوست ایک سرائش بھیڑ کو چرتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اگلے کو دیکھ کر جعفر ایسا بے قابو ہوا کہ اس نے وقت اور موقعہ کی بھی پروا نہ کی

ذریعے جو الزام آپ پر اور آپ کے حکام پر لگایا ہے۔ آپ اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ عالم نے جعفر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”امیر موصل نے ہمارے ساتھ اپنے معتد کو بھی بھیجا ہے جو اس بات کی تصدیق کرے گا کہ عیسائی عبادت خانوں میں مسلمان موجود ہیں کیونکہ امیر موصل کا یہ معتد خود ایک ایسے ہی قید خانہ میں قید و بند ہے۔“

اب تو شر کو تو ال بالکل ہی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اس کا منہ لٹک گیا۔ قاضی کے خیال کی بھی تصدیق ہو گئی۔ وہ جعفر کو پہچان تو نہ پایا مگر اسے یہ یقین ہو گیا کہ یہی وہ قیدی ہے جو عبادت خانے سے بھاگ نکلا تھا۔ قاضی نے یہ سوچتے ہوئے کہ کہیں شر کو تو ال اس راہبوت اور شہادت کے اس الزام کی تردید کرنے کی غلطی نہ کرے۔ اس نے خود ہی مناسب سمجھا۔ ”سردار محترم۔“ قاضی نے نجم الدین کو اپنی طرف مخاطب کر لیا۔ ”امیر موصل کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ وہ ہعلبک کے تمام لوگوں کی جان کی ضمانت دے رہے ہیں۔ اس کے بعد اس طرح کے الزام سے امیر موصل کے اعلان کی تردید ہوئی کیونکہ یہ الزام ثابت ہو گیا تو امیر موصل ذمہ دار آدمیوں کو سزا دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ امیر موصل جان کی حفاظت کے بعد کسی کو سزا دینا پسند نہ فرمائیں گے۔“

سردار نجم الدین ایوب نے گھور کے قاضی کو دیکھا۔ ”مجھے نہیں معلوم کہ مجھے چاہئے کرنے والا کون شخص ہے اور اسے اس اہم معاملے میں بولنے کی اجازت کس نے دی ہے؟“

شر کو تو ال نے جلدی سے کہا۔ ”سردار محترم۔ آپ کو مخاطب کرنے والے ہعلبک کے قاضی شہر ہیں اور وہ میری اجازت سے اس گفتگو میں بولنے کے مجاز ہیں پھر بھی قاضی صاحب کی گفتگو سے کسی سختی یا توہین کا اظہار ہوا ہے تو اس کی معافی کا خواہش ہوں۔“

”ایسی بات نہیں ہے برازق بویہ۔“ نجم الدین نے سنبھل کے کہا۔ ”قاضی شہر نے لئے بھی قابل احترام ہیں۔ مرا خیال یہی تھا کہ اس قسم کی منطقی گفتگو صرف ایک ہی آدمی ہی کر سکتا ہے۔“ پھر نجم الدین نے گھوم کر قاضی شہر کو جواب دیا۔ ”قاضی محترم آپ کا یہ خیال درست ہے کہ ہمارے امیر محترم سب کی جان بخشی کرنے کے بعد کسی کسی سابقہ جرم کی سزا نہ دیں گے۔ اس سلسلے میں سزا تو صرف ان پادریوں کو دی جائے جو اپنے عبادت خانوں میں مسلمان قیدیوں کو ہمارے حوالے کرنے سے انکار کریں گے۔ امیر موصل نے اپنا یہی حق محفوظ رکھا ہے اور یہی ان کی پہلی اور آخری شرط ہے۔“

ہی ہم کسی ایسے ہی اعزاز سے نوازیں گے فی الحال ہم اسد الدین کو ”شیر کوہ“ کا خطاب کرتے ہیں۔ تمام کاغذات اور مراسلات میں اسد الدین کے ساتھ شیر کوہ کا خطاب کیا جائے اور ہر امیر کا فرض ہے کہ وہ اسد الدین کو مخاطب کرتے وقت اس خطاب کا خیال رکھے۔“

اسد الدین نے فوراً ”جبک کے سلام کیا۔“ غلام اس معزز خطاب کا حق ادا کرنے کے لئے موقع پر اپنی جان کی بازی لگا دے گا۔“

امیر موصل نے نجم الدین کو دوبارہ مخاطب کیا۔ ”نجم الدین تم ایک سو سواروں کا دستہ لے کر قلعہ میں جاؤ اور قلعہ چھوڑنے والوں کی دیکھ بھال کرو۔ ہر شخص کو اجازت ہے کہ اس قدر سامان اپنے ساتھ لے جاسکتا ہے جس کا وزن وہ خود اٹھا سکے۔ سوائے اس کے کسی اور کو سواری ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قلعہ کی لٹکریاں سے سیدھا دمشق جایگا۔ اس لئے لشکر کو غیر مسلح کر کے قلعہ سے بھیجا جائے گا۔ وہ راستے کی بستیوں میں بد امنی نہ پھیلا سکے۔“

نجم الدین نے سر جھکا کر تعمیل حکم کا اظہار کیا اور سواروں کا دستہ لینے خیمہ گاہ میں چلا گیا۔ امیر موصل نے شہر کو قوتال کو مخاطب کیا تم واپس جاسکتے ہو ہم نے سب کی جان بخشی کی ہے اس اعلان پر قائم رہیں گے بشرطیکہ تمہاری طرف سے صلح نامے کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔

شہر کو قوتال نے اوب سے کہا۔ ہم لوگ امیر محترم کے بہت شکر گزار ہیں اور ان بات کرتے ہیں کہ ہمیں قلعہ کے دروازے پر امیر کا استقبال کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ امیر کے قلعہ میں داخل کے بعد ہم آخری سلام پیش کر کے جبک ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے؟“

”درخواست قبول کی جاتی ہے۔ لشکر کو تیاری کا حکم پہنچایا جائے۔“ یہ کہہ کے امیر نے اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔ شہر کو قوتال قلعہ واپس ہوا۔ قلعہ کا جنوبی دروازہ کھول دیا اور قلعہ چھوڑنے والے اپنا سامان بغل میں دبائے یا سروں پر رکھے باہر نکل رہے۔ قلعہ سے جانے والے عام طور پر عیسائی تھے۔ ان میں عیسائی پادری پیش پیش تھے۔ ان میں ہو گیا تھا عیسائی عبادت گاہوں کی تلاشی کی جائے گی اور ممکن ہے انہیں شریک کے طور پر سزا بھی دی جائے۔ امیر موصل نے انہیں پہلے ہی معاف کر دیا تھا لیکن شہر کو قوتال نے انہیں گھبرائے ہوئے تھے اور قلعہ چھوڑ کے بے تحاشہ الہا اڈیہ اٹھا کر اور دمشق کی طرف بھاگ رہے تھے۔ نجم الدین نے دیکھا کہ بعض بورے چلے پھرنے سے معذور

اور اپنے سرداروں کو چھوڑ کے تیزی سے سرائش کی طرف بڑھا اور اس سے چٹک لپک کے ملاپ کا منظر بڑا دلچسپ تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے اور فراموشی سے ان کی آواز تک نہ نکل رہی تھی۔ پھر ایک دم جعفر کو وقت کی نزاکت کا احساس ہوا وہ جلدی سے سرائش سے الگ ہوا۔ سرائش میں اس وقت امیر موصل کے ایک اہم پر مامور ہوں۔ تم میرا انتظار کرنا قلعہ کا دروازہ کھلنے والا ہے۔ میں امیر موصل کے لشکر ساتھ واپس آؤں گا۔“

سرائش نے ہنستے ہوئے کہا۔ جعفر بھائی۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم کوئی بڑے ہو۔ اب راز کھلا۔

”باتیں بعد میں ہوں گی سرائش۔“ جعفر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم ترن کو بیٹھوئے کے اس سے کہہ دینا کہ میں بعلبک ہمیشہ کے لئے آیا ہوں۔“

”اور پھر تم اس سے شادی کرو گے۔ کیوں نا جعفر بھائی۔ سرائش نے ہنستے ہوئے کہا۔“

پتہ نہیں کہ جعفر نے اس کی بات سنی کہ نہیں کیونکہ وہ بھاگتا ہوا سردار نجم الدین کی طرف جا رہا تھا۔ نجم الدین نے لشکر میں پہنچ کے امیر موصل کو قلعہ میں ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ امیر نے اس پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ اس وقت بعلبک کے صدر دروازہ کھل گیا اور کو قوتال شہر اپنے عمائدین کے ساتھ امیر موصل کو قلعہ کی جانب دینے کے لئے باہر آیا۔ شہر کو قوتال اور اس کے ساتھی گھوڑوں پر سوار تھے۔ خیمہ گاہ کے سب لوگ گھوڑوں سے اترے۔ امیر موصل اپنے سرداروں کے ساتھ خیمہ کے باہر تھا شہر کو قوتال نظریں نیچی کیے ہوئے امیر کے سامنے پہنچا۔ پہلے اس نے جبک کے امیر موصل کو سلام کیا پھر قلعہ کی تمام چابیاں امیر کے قدموں میں رکھ دیں۔

امیر موصل نے قریب کھڑے ہوئے نجم الدین اوب کو دیکھا۔ ”نجم الدین چاہا سبھاو۔ ہم نے چابیاں اور بعلبک کا قلعہ تمہاری تحویل میں دیا۔ آج سے تم بعلبک قلعہ دار اور ہماری طرف سے گورنر ہو۔“

نجم الدین اوب کے چہرے پر خوش کی لہر دوڑ گئی۔ دو سال کی مسلسل جان باری و فاداری کا آج اسے صلہ مل گیا تھا۔ اس نے جبک کے امیر کو سلام پیش کیا۔ ”ہمارا مقام نے غلام کو جو عظیم اعزاز عطا کیا ہے۔ غلام اس کا حق ادا کرنے کی پیشکش کر رہے گا۔“

”نجم الدین۔ شکریت کا واقعہ ہم نہیں بھول سکتے۔“ امیر موصل نے گہمیر آواز میں کہا۔ ”تم دونوں بھائی ہمیں بے حد عزیز ہو۔ اسد الدین نے بھی ہمارے بہت سے کام کیے ہیں۔“



ہیں میرا نام کس نے بتایا؟“ جعفر نے پھر اس کا گلہ پکڑ لیا۔  
 لارنس نے فادر قلب سے آپ کا نام سنا تھا۔“ لارنس گھکیا۔

اپ اور ترن کوڑی کہاں ہیں۔ جان کی خیر چاہتے ہو تو جج بتا دو؟“ جعفر نے ایک  
 چھوڑ دیا۔

”دلوں قلعہ چھوڑ کے“ لارہا چلے گئے ہیں۔“ لارنس نے لرزتی آواز میں جواب  
 دیا کہ اس کی بات کا یقین نہ آیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو بلا کر لارنس کو ان کے  
 باہر تہ خانے میں اتر کے اچھی طرح تلاشی لی مگر قلب اور ترن کوڑی کا کوئی پتہ  
 نہ ملا۔ لارنس بھی لارنس پر شبہ تھا۔ وہ لارنس کو ساتھ لے کر سراکش کی سرائے کی  
 اس نے سراکش کو تاکید کی تھی کہ ترن کوڑی کو اس کے بارے میں مطلع کر  
 لے کہ سراکش سرائے کے راستے میں مل گیا۔ سراکش نے حیرت سے جعفر کو دیکھا  
 کہ جعفر کو سراکش سرائے کے راستے میں مل گیا۔ سراکش نے حیرت سے جعفر کو  
 دیکھا کہ جعفر سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔

اور انہیں۔ رو کیوں رہے ہو سراکش۔؟“ جعفر نے اسے الگ کرتے ہوئے

فرمانی۔ میں نے اسے بہت روکا۔ بڑے واسطے دئے مگر اس نے میری بات نہیں  
 سنی۔ روئے ہوئے کہا۔

لارہا گیا۔ ”کس کو روکا۔ کون نہیں مانی۔؟“

ادنی ترن کوڑی۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ لارہا چلی گئی ہے۔  
 باجیسے سکتہ طاری ہو گیا۔“

ہیں اور اپنے عزیزوں کے ساتھ گھٹے ہوئے چل رہے ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ  
 ایسی خواتین جن کے ساتھ چھوٹے بچے ہیں وہ سواری استعمال کر سکتے ہیں۔ معذرت  
 خواتین نے اس حکم پر نجم الدین کو ہاتھ اٹھا کر دعائیں دیں۔

جعفر بھی امیر موصول کے ساتھ ہی قلعہ میں پہنچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سزا  
 کا انتظار کر رہا ہوگا مگر اس بھگدڑ اور دارو گیر میں سراکش معلوم نہیں کہاں گئی۔  
 جعفر نے اپنے ساتھ چند سوار لئے اور سیدھا انیتوئیس کی عبادت گاہ پہنچ گیا۔  
 چونکہ معافی دے دی گئی تھی اس لئے جعفر نے سوچا تھا کہ ترن کوڑی عبادت  
 موجود ہوگی مگر عبادت گاہ خالی پڑی تھی۔ جعفر کے ہوش اڑ گئے اس نے عبادت  
 ایک ایک کمرے کو چھان مارا مگر ترن کوڑی اور پادری قلب اسے کہیں نظر نہ  
 مایوس ہو کر ایک کمرے میں بیٹھا ترن کوڑی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے  
 درمیان میں بچھا ہوا چھوٹا قالین حرکت کرتا معلوم ہوا۔ جعفر نے جلدی سے اپنے  
 کو باہر بھیج دیا اور خود ایک پردے کے پیچھے چھپ کے کھڑا ہو گیا۔

قالین حرکت کرتا ہوا ایک طرف کو تھوڑا سا ہٹ گیا اور فرش پر سے ایک  
 چوکور تختہ اوپر کو بلند ہو گیا۔ یہ تختہ نیچے جانے والی میزبھیوں پر اس خوبصورتی سے  
 تھا کہ فرش کا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ پھر کسی نے میزبھیوں سے سر نکال کر چاروں  
 اور مطمئن ہونے کے بعد ایک صندوق پر لئے ہوئے اوپر آگیا۔ جعفر خاموشی سے  
 تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت نہ کی۔ صندوق پر لانے والے نے باہر  
 کے تختے کو پھر اس طرح ڈھک دیا اور قالین کو کھینچ کر برابر کر دیا۔

جعفر بجلی جیسی تیزی سے جھپٹا اور دوسرے ہی لمحے اس نے صندوق پر لئے  
 گلہ بوجھ لیا صندوق پر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے فرش پر گر گیا اور فرش پر گر  
 کھل گیا۔ جعفر کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں صندوق پر سے بیش قیمت جواہر  
 کمرے میں بکھر گئے تھے۔ اور ان کی جگہ گاہت سے پورا کمرہ دمک اٹھا تھا۔

”کون ہو تم اور یہ جواہرات کس کے ہیں؟“ جعفر غرایا  
 ”میں فادر قلب کا بھانجا لارنس ہوں۔ یہ جواہرات میرے ہیں۔“ لارنس کا  
 تھا اور اس کی آواز مشکل سے نکل رہی تھی۔

”اچھا۔ تم ہو لارنس۔“ جعفر نے اس کا گلہ چھوڑ دیا۔  
 لارنس نے گلا سلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”جی ہاں۔ لارنس ہوں اور آپ

اس نے فوراً خود کو سنبھالا اور بڑے ادب سے عرض کیا۔ ”امیر کے حکم سے  
بقادر کا شیوہ نہیں اور اگر خدا نخواستہ کوئی ایسا وقت آیا تو خادم اپنے امیر سے  
لے کے بجائے اپنی تلوار سے اپنا سر قلم کرے گا۔ خادم کا مدعا محض ایک  
نہیں کرنا تھا۔“  
درخواست کا یہ انداز نہیں ہوتا نجم الدین۔ ”امیر کے جلال میں کوئی کمی نہ ہوئی

## فتح الفتوح

نجم الدین نادانی پر شرمندہ ہے امیر محترم۔“  
وہ۔ تو کیا تمہیں میرا دیا ہوا اعزاز پسند نہیں۔“

امیر نے امیر عالی مقام۔ امیر ہمیشہ اپنے جاں نثاروں کو نوازتے رہے ہیں۔ رہے  
ہے بڑا یہی اعزاز ہے کہ میں امیر کے دربار سے وابستہ ہوں۔ میری یہ خوش  
حالی کہ میں امیر پر قربان ہو جاؤں۔ ”نجم الدین نے انکسار کا کچھ ایسا انداز اختیار کیا  
بہل متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

نجم الدین ایسا نہ کہو۔“ امیر نے چھت کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔ ”ہمیں  
دعا کے کنارے حکمران کا قلعہ اب تک یاد ہے جب ہم اپنے شکست خوردہ لشکر  
دہاں پہنچے تھے اور تم نے ہمیں کمال مہربانی سے اپنے قلعہ میں پناہ دی تھی۔ اگر  
افغانوں نے حاصل ہوتا تو شاید ہم موصل بھی نہ واپس آسکتے۔“

امیر اس وقت کے خادم کو شرمندہ کر رہے ہیں۔“  
امیر نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا جب وہ سلجوقی شہزادوں کی تخت و تاج  
لے کے اپنے خانہ جنگی کے دوران ایک محاذ پر شکست کھا کر پناہ ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔  
ایک اس وقت قلعہ حکمران کا حاکم تھا۔ اس نے امیر عماد الدین زنگی کو اپنے  
پادشہ تھی۔

تمہارے احسان مند ہیں نجم الدین۔“ امیر کا جلال ختم ہو گیا تھا۔ ”ہاں اب یہ  
اچھے ہو۔“

امیر نے ہمت کر کے کہا۔ ”اے امیر۔ میں چاہتا ہوں کہ بعلبک کی گورنری کا  
مہمان بن جائے میرے چھوٹے بھائی اسد الدین کو عطا کیا جائے۔“

امیر نے نجم الدین کو دیکھا۔ ”میں تمہارے برادرانہ جذبہ کی تعریف کرتا  
ہوں۔ مگر میرے ارادے جذبات سے خالی ہیں۔ تمہارے دل میں ایسا خیال پیدا  
ہوا۔“

نجم الدین ایوب کو بعلبک کا گورنر بنا دیا گیا۔ نصرت اور کامرانی جب قدم چڑھ  
لئے بڑھتی ہے تو لوگ اکثر ہلک جاتے ہیں۔ نجم الدین شاید اس عہدے پر خوش نہ  
اس نے دلی زبان سے کہا۔ ”خادم اس اعزاز کے لئے امیر محترم کا بہت شکر گزار ہے  
اس فرمان میں اگر ذرا سی تبدیلی ہو جائے تو خادم کی گردن عمر بھر احسان اور شکر  
سے نہ اٹھ سکے گی۔

امیر موصل عماد الدین زنگی کے قدم اک دم رک گئے۔ وہ اس وقت بعلبک  
کو توال کے محل کے ایک بڑے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اس نے نجم الدین ایوب کو  
کی گورنری کا حکم خلوت میں بلا کر دیا تھا۔ امیر موصل کیا امرا اور کیا غلام ہر ایک  
معاملے میں بڑا سخت واقع ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ اسے اپنی وفاداروں سے محبت نہیں  
ہر ایک کی ضرورت کا خیال رکھتا اور ان کے کارناموں کے اعتبار سے انہیں نوازتا تھا۔  
”تم میرے حکم میں ترمیم کرنا چاہتے ہو؟“ امیر موصل کا لہجہ اس قدر کثرت  
اس کی آواز سے پورا کمرہ گونج اٹھا۔ باہر پہرے پر کھڑے ہوئے غلام کے جسم میں  
ہو گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ آج نجم الدین کی خیر نہیں۔ اس نے ضرور امیر کے حضور  
ہے اور اب کوئی دم میں امیر اسے بلا کر نجم الدین کی گرفتاری کا حکم دے گا۔ نجم  
نے بھی شاید غلط وقت پر ایک صحیح درخواست کی تھی اس کا خیال تھا امیر موصل کی  
خوش ہے اس لئے اس کی درخواست پر ہمدردی سے غور کرے گا مگر یہاں معاملہ

ایک دن کا فاصلہ ہے۔ ہمیں ہعلبک کے لئے ایک ایسے شخص کی تلاشی تھی جو شمشیر  
نے کے علاوہ قلعہ کا معقول انتظام بھی کر سکے۔ معین الدین انزاس وقت بوکھلایا ہوا  
ہعلبک کا کسی وقت بھی رخ کر سکتا ہے۔ ہمارے خیال میں تم ہعلبک کا بہتر طور پر  
رکھو گے۔“

نجم الدین کے لئے بات کو طول دینا خطرناک ہو سکتا تھا۔ مجبوراً اس نے خاموشی  
کی۔ امیر نے قلعہ ہعلبک کی حفاظت کے لئے تھوڑی فوج وہاں چھوڑی اور پھر  
اپنی کاروارہ کیا۔ اسے دمشق تو حاصل نہ ہو سکا۔ مگر اب وہ دمشق کے دروازے پر  
بغداد لشکر میں جب یہ خبر پہنچی کہ نجم الدین ایوب کو ہعلبک کا قلعہ دار بنایا گیا ہے تو  
نے اس پر حیرت کا اظہار کیا۔ اسد الدین شیرکوہ نے بھائی کو مبارکباد دی۔ نجم  
ایوب ہعلبک میں مستقل طور پر رہنا تھا۔ اس نے موصل سے اپنے اہل خانہ کو بلوا  
یا میں اس کا بیٹا صلاح الدین بھی تھا جس کی عمر اس وقت چھ سال کے قریب تھی۔

امیر عماد الدین زنگی کی سیما صفت اسے نچلا نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ موصل پہنچتے ہی وہ  
رکاوٹ کی منصوبہ بندی میں لگ گیا۔ دمشق پر قبضہ اس کی سب سے بڑی خواہش تھی  
ان ایسے تھے کہ وہ دمشق کے خلاف کوئی فوری قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دمشق کی  
بست کے شمال اور جنوب میں کئی چھوٹی بڑی عیسائی ریاستیں تھیں۔ جن سے معین  
نے تعلقات برقرار رکھے تھے۔ یروہلم کا شاہ بالڈون اس کے سب سے بڑا حلیف۔  
کے شمال میں الرہا (اڈیسہ) کی مضبوط عیسائی ریاست تھی جو اس کے سر پر بیٹھی ہوئی  
لہا کا حکمران جو سیلین مسلمانوں کے لئے قہر الہی سے کم نہ تھا۔ وہ دیار بکر کی مسلم  
بازار میں پیدا کیا کرتا تھا۔ بے شمار آبادیاں تباہ اور مسلمان تہ تیغ ہو چکے تھے پھر کسی  
نابود دعا سے لگ گئی اور وہ مر گیا اس کی موت پر مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا

سیلین اول کا جانشین بھی مسلمانوں کا شدید مخالف تھا مگر وہ عشرت پرستی کا بھی  
ادارے شراب و شباب سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ مسلم علاقوں کو تاخت  
کرے۔ امیر عماد الدین کی ابھرتی ہوئی طاقت نے بھی اسے غلط کر دیا تھا۔ جارجانہ  
نے مدافعت طرز اختیار کر لیا تھا اور ہر وقت امیر زنگی کی طرف سے  
انڈیا زنگی کے راستوں کا وہ ایک بڑا پتھر تھا مگر خواہش کے باوجود بھی امیر زنگی الرہا  
پر حملہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ الرہا کے قریب بہت سے عیسائی ریاستیں تھیں جو  
انکے بھیج سکتی تھیں۔

”اسد الدین مجھے سے زیادہ اہل ہے امیر عالی مقام۔“

”کون اہل ہے اور کون نا اہل۔ اس کا فیصلہ کرنے کا تمہیں حق نہیں دیا جا سکتا  
امیر موصل کا مزاج پھر چڑھا ہو گیا۔ بغیر کوئی معقول وجہ کے یہ حکم واپس نہیں لیا  
سکتا۔“

”اس کی کچھ اور بھی وجوہات ہیں امیر۔“ نجم الدین نے گفتگو کا دوسرا انداز اختیار  
کیا۔

”وہی تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں نجم الدین“ امیر نے نرم ہوتے ہوئے کہا۔ ”پیارا  
کرو۔ اگر کوئی معقول وجہ ہوئی تو تمہاری درخواست پر ضرور غور کیا جائے گا۔“

”امیر محترم۔“ نجم الدین نے کہنا شروع کیا۔ ”اسد الدین آپ سے زیادہ قریب رہا ہے  
نے مجھ سے زیادہ آپ کی خدمت کی ہے۔“

”تمہاری بات میں کوئی وزن نہیں۔ اصل وجہ بیان کرو۔“ امیر نے بڑی بے پرواہی  
سے کہا۔

”امیر عالی مقام۔ اسد الدین میں جوانی کے ساتھ ساتھ شوریہ سری بھی ہے  
کے قیام کے دوران اس نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے بہت  
برپا ہوا اور آخر میں قلعہ ہمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑا۔ اگر اسے ہعلبک کا قلعہ دار بنایا گیا  
انتظامی معاملات میں الجھنے سے اس میں سنجیدگی پیدا ہو جائے گی اور شوریہ کی طرف  
موجیں کناروں سے باہر نہ نکلنے پائیں گی۔ اس منہ زور گھوڑے کو لگام دینا چاہتا ہوں  
امیر۔“

نجم الدین نے بڑی معقول بات کہی تھی۔ وہ اسد الدین کے لاابالی پن اور گرم طبعیت  
سے واقف تھا اس کی نادانی کی وجہ سے اسے شکریت کو خیر باد کہہ کر موصل کے دربار  
آنا پڑا تھا۔ دوسری طرف اس دربار میں کئی سال رہنے سے اسے امیر کی سخت گیری  
آتش مزاجی کا بھی تجربہ اور مشاہدہ ہو چکا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں یہ دونوں بھڑکتے ہوئے  
شعلے آپس میں ٹکرائیں جس کا انجام شکریت سے بھی زیادہ خوفناک ہوتا تھا۔

امیر کے چہرے پر نہ جانے کیوں مسکراہٹ آگئی۔ ”نجم الدین۔ مجھے اسد الدین کی  
شوریہ سری تو پسند ہے۔ یہ تو بہادروں کا تمنہ ہوتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ  
اس میں سنجیدگی کا فقدان ہے۔ میں نے اب تک اسے کئی سنجیدہ کام دیے ہیں اور اس میں  
وہ کامیاب رہا ہے پھر یہ کیا ضروری ہے۔ کہ ہر سنجیدہ آدمی انتظامی امور میں بھی ماہر ہو  
نے شکریت کے قلعہ میں تمہارے اعلیٰ انتظام کا مشاہدہ کیا ہے۔ دمشق اور ہعلبک

بہت سوچ بچار کے بعد امیر زنگی نے دیار بر پر فوج کشی کے فیصلہ کیا۔ دیار بکر میں کی مسلم سرداریاں تھیں اس لئے بغیر ان پر قبضہ کئے امیر کے پہلو مضبوط نہ ہوتے تھے۔ البتہ پر وہ تب ہی نظر ڈال سکتا تھا جب دیار بکر کی تمام سرداریاں اس کے زیر اثر ہوں۔ اسے یہ کڑوا گھونٹ ہر صورت حلق سے اتارنا تھا۔ امیر بڑی راز داری سے فیصلہ کرتا تھا۔ اس نے حقیقی ارادوں کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ وہ لشکر لے کر نکلتا تو بھی کسی سردار کو نہ معلوم ہوتا کہ امیر کس طرف کا رخ کرے گا۔ ادھر کچھ دنوں سے وہ الہا اور دیار بکر کے بارے میں بہت غور و فکر کر رہا تھا اور اس کی خبر اس کے سرداروں کو امیر کے خاص غلام خواجہ سراہلو کشش نے پہنچائی تھی۔

ایک دن ہلو کشش نے اسد الدین سے سرگوشی کی تھی۔ ”آقائے محترم آج کل رات کو ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر غور و فکر فرماتے ہیں۔“

اور اسد الدین چونک پڑا تھا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ کوئی نئی مہم شروع ہونے والی ہے۔“ اس نے بھی بڑی راز داری سے اپنا اندازہ بتایا تھا۔ ”امیر کا ایک پیر پر کھڑے ہو کر غور و فکر کرنا ان کے شدید اضطراب کی نشانی ہے۔“

”آپ نے درست فرمایا سردار۔“ ہلو کشش نے تائید کی۔ کسی مہم کے آغاز سے پہلے آقا کی یہی حالت ہوتی ہے ہلو کشش کی اطلاع ہلو کشش کی اطلاع پر لشکر نے تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ امیر زنگی نے تمام جاگیرداریاں ختم کر دی تھیں وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک حکومت اس کے ہاتھ میں ہے اس وقت تک امرا کو زمین اور املاک کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جب حکومت اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی تو زمین اور املاک کب باقی رہیں گی۔ جاگیردارانہ نظام میں حکمران کے پاس کوئی خاص فوج نہ ہوتی تھی۔ ضرورت پڑنے پر جاگیرداروں کو بلواتا تھا اور وہ اپنی اپنی فوج لے کر حکمران کے لشکر میں شامل ہو جاتے تھے مگر امیر زنگی کو تو ہر وقت ایک بڑے لشکر کی ضرورت رہتی تھی۔ وہ ہر وقت حالت جنگ میں رہتا تھا اس لئے اس نے جاگیردارانہ نظام ختم کر کے لشکر کو مستقل کر دیا تھا۔ تمام موصل میں رہتا تھا اور انہیں باقاعدہ ماہ بمابہ تنخواہ ملتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی امیران کی ضرورت کا خیال رکھتا تھا۔ اس طرح سپاہ اور سپہ سالار میں براہ راست رابطہ تھا اور اس پر جان دیتا تھا۔

امیر زنگی اسی ادھر بن میں غلطان تھا کہ خواجہ سراہلو کشش اندر آیا۔ آقائے محترم۔ جعفر باریابی کا خواہش مند ہے۔ غلام نے مطلع کیا۔

”کون۔ نصیر الدین جعفر۔؟“ امیر زنگی کا خیال فوراً اپنے نائب کی طرف گیا۔

”نصیر الدین۔“ نائب السلطنت نصیر الدین جعفر نہیں بلکہ وہ جعفر جو آپ کی اہم خدمت میں ہے۔“ خواجہ سراہلو کشش نے وضاحت کی۔

”چاہا اچھا۔“ امیر مسکرا دیا۔ ”عجیب اتفاق ہے کہ دونوں جعفر ہمارے خدمت گزار اور وہ آپس میں بھی عزیز دار ہیں۔ اسے حاضر کرو۔ اجازت ہے۔“

غلام آداب بجالا کر چلا گیا۔ نصیر الدین جعفر اور جعفر کے ناموں میں امیر کو اکثر مغالطہ تھا۔ ایک اس کا نائب السلطنت اور دوسرا جعفر اس کا خاص جاسوس تھا۔ یہ وہی جعفر تھا جس نے ہلیک اور دمشق میں امیر کے لئے جاسوسی کے فرائض انجام دئے تھے۔ امیر ان سے خود اسے طلب کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ اس کے اچانک اجانے سے امیر رنجش ہوئی۔

خواجہ سرا غلام جعفر کو لے کر حاضر ہوا۔ جعفر آداب بجالایا۔ خواجہ سرا نے امیر کو اطلاع دی۔ ”آقا۔ سردار اسد الدین شیر کوہ بھی قدم بوسی کے لئے حاضر ہیں۔“

شیر کوہ۔ امیر موصل نے زیر لب کہا اور تردد میں پڑ گیا وہ اس وقت جعفر سے کچھ ٹکڑا چاہتا تھا مگر شیر کوہ جیسے عظیم سردار کو بھی وہ انتظار کی زحمت نہیں دیتا چاہتا تھا بالیہ وقت میں جب اسد الدین نے یہ دیکھ لیا ہوگا کہ جعفر جو محض ایک جاسوس امیر کی خدمت میں حاضر ہے اور اسے انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔

شیر کوہ کو بھی آنے دو۔“

شیر کوہ جگمگائے تنگی کی اجازت کا منتظر تھا کہ شیر کوہ بھی آگیا۔ اس نے سلام کیا امیر نے شیر کوہ کے سلام کا جواب دیا۔ ”اسد الدین۔ ہمارا یہ وفادار جعفر اپنی کسی بات سے حاضر ہوا ہے۔ پہلے میں اس کی بات سننا چاہتا ہوں۔“ امیر نے بری نرمی سے

میں باہر انتظار کر لوں گا امیر۔“ امیر اسد الدین نے واپس جانے کا ارادہ کیا۔ ”یوں آگے سے پہلے آیا ہوا ہے۔ اس کا پہلا حق ہے۔“

”آمین ہوتے جا رہے ہو اسد الدین۔“ امیر بڑی خوشدلی سے بولا۔ ”چو بات میں اسے نہیں کہنا چاہتا تھا اسے تم نے خود محسوس کر لیا۔“ پھر جعفر کی طرف دیکھ کے ”میں نہیں جانتا کہ جعفر کیا کہنا چاہتا ہے۔ اگر اسے اعتراض نہ ہو تو تم ٹھہر سکتے ہو۔“

”خیر کو مجھے اذن کو بانی مل گیا۔“ آقائے عالی مقام۔ خادم ایک درخواست لے کر حاضر ہوا۔ سردار اسد الدین شیر کوہ کی شخصیت ایسی نہیں جن کے سامنے میں درخواست مانگنا چاہتا ہوں۔“

اسد الدین کے قدم رک گئے اور وہ مودب ہو کر کھڑا ہو گیا۔

”ہاں جعفر۔ تم کیا چاہتے ہو؟“ امیر نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”آقا۔ مجھے کچھ دنوں کے لئے رہا جانے کی اجازت دی جائے۔“

”رہا امیر عماد الدین زنگی اپنی جگہ اس زور سے اچھلا جیسے اسے بچھوئے ڈنگ ہو پھر اس نے اٹھ کر بڑی بے چینی سے کمرے میں ٹھٹھکا شروع کر دیا۔

جعفر اسد الدین بڑی حیرت سے امیر کو دیکھ رہے تھے۔ جعفر کا پورا بدن کانپنے لگا اس نے صرف رخصت کی درخواست پیش کی تھی۔ اور کوئی گستاخی تو ہوئی نہیں اس پھر امیر کو کس چیز نے بے چین اور اس قدر منغص کر دیا تھا۔ اسد الدین شیر کو اپنا پریشان تھا۔ اگر وہ گفتگو شروع ہونے کے بعد آیا ہوتا تو یہی سوچتا کہ جعفر نے کوئی ایسی ضرورت کی ہوگی جس نے امیر کی یہ حالت بنا دی ہے۔ کمرے کی فضا بوجھل ہو گئی اور دونوں اپنی اپنی جان کی خیر منا رہے تھے۔

”تم نے رہا کا نام لیا ہے نا؟“ امیر زنگی نے جعفر کو یوں گھورا جیسے اس نے اگلی دی ہو۔

”جی آقا۔ میں نے رہا جانے کی درخواست کی ہے۔“ جعفر انکار بھی نہ کر سکا تو امیر نے اسد الدین کو مخاطب کیا۔ ”اسد الدین۔ مجھے افسوس ہے۔ اس وقت سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ حکومت کا ایک اہم راز افشا ہو گیا ہے۔ میں اس کی تحقیقات چاہتا ہوں۔“

اسد الدین نے منہ سے بولنے کے بجائے ادب سے رخصتی سلام کیا اور باہر چلا گیا۔ آقا کا مزاج کدور ہو گیا ہے۔ اجازت دی جائے۔ میں پھر حاضر ہو جاؤں گا۔“ نے بھی اپنی جان بچانے کی کوشش کی۔ اس نے اسی میں بہتری سمجھی کہ جلد سے جلد کی نظروں سے دور جو جائے۔

”جعفر تم۔ تم کہاں جا سکتے ہو۔ گفتگو تو تم سے ہونا ہے۔“ امیر زنگی کی نظریں یوں جی ہوئی تھی جیسے جعفر نے کوئی برا جرم کیا ہو۔ جعفر کے دونوں ہیر ایک ساتھ اگر وہ فوراً خود کو نہ سنبھالتا تو امیر زنگی کی تیز نظریں اسے ضرور زمین پر گرا دیتیں۔ ”آقا کو اگر میری درخواست ناگوار گزر رہی ہے تو میں معذرت کے ساتھ اسے لیتا ہوں۔“ جعفر نے جان چھڑانے کے لئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”درخواست!“ امیر زنگی نے زہر خند کیا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ رہا کا نام تم نے کس

بفر کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ رہا میں ایسی کیا خاص بات ہے جس نے امیر کو بے چین کر دیا ہے۔ آقا نے مجھے جو خدمت عطا کی ہے اس کا ہر لمحہ میں دور و نزدیک کے تمام عیسائیوں کے بارے میں معلومات حاصل کروں جو ان وقت امیر کے لئے درد سر بن سکتے ہیں۔“

”یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے جعفر۔“ امیر غصے سے تھلا گیا۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ کیا بد بخت نے تمہیں رہا کا حوالہ دیا ہے؟“

جعفر پر بوکلا ہٹ طاری تھی۔ ”آقا نے محترم۔ مجھے کسی نے حوالہ نہیں دیا۔ رہا

ایک بھائی ریاست ہے۔ میں وہاں ایک ذاتی کام سے جانا چاہتا ہوں۔“

”جعفر۔ یہ نہ بھولو کہ تم اس وقت عماد الدین زنگی کے سامنے ہو جس کی شفقت ابر

ن اور جلال قراستانی ہے۔ سچ بتاؤ رہا کا نام تم نے ہمارے کسی امیر یا سردار کی زبان

”نہیں سنا؟“

”ہرگز نہیں آقا۔ جعفر نے فوراً تردید کی۔“ آپ کے جاسوس کی حیثیت سے مجھے

طرابلس۔ اعطاکہ۔ رہا اور ومنہا کی عیسائی ریاستوں کے بارے میں بہت سے

معلومات حاصل ہیں۔ میں ان ریاستوں کے حکمرانوں اور ان کے عادات و اطوار سے بھی

تعارف ہوں۔“

جعفر کے جواب سے امیر زنگی پوری طرح مطمئن نہ تھا اس نے زور دے کر پوچھا ”کیا

رہا کی اہمیت سے پوری طرح واقف ہو۔“

جعفر پریشان تھا کہ اس کا آقا آخر رہا میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے۔ پہلے وہ

ایک زبان سے رہا کا نام سن کر چونکا تھا طیش میں آ گیا تھا اور اب کرید کرید کے رہا

بارے میں سوال کر رہا ہے۔ ”میرے آقا۔ میرے امیر۔ میں نے رہا کو آنکھوں سے

دیکھا مگر یہ سنا ہے کہ وہ شہر بہت خوبصورت ہے اور اس کا حکمران ایک عیش پرست

ہے اور یہ کہ وہ اپنے باپ جو سیلین اول کی طرح دور اندیش نہیں۔“

جعفر۔ سچ بتاؤ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہیں کسی ذریعہ سے یہ معلوم ہو گیا ہے کہ

امیر بھی رہا میں دلچسپی رکھتا ہے اور تم وہاں اس لئے جا رہے ہو تاکہ قبل از وقت

اس بارے میں تمام معلومات حاصل کر لو؟“

امیر زنگی نے یہ سوال بھی رہا کے بارے میں کیا تھا۔ جعفر کو بہت غصہ آیا مگر اسے

اپنا ہار۔ ”محترم آقا۔ مجھے قطعی علم نہیں کہ آپ بھی رہا میں دلچسپی رکھتے ہیں اور میں

اس مسئلے میں کسی امیر سے نہ کچھ سنا ہے۔“

جعفر کو اپنی قسمت پر برا ناز ہو رہا تھا۔ اس کا ذاتی سفر سرکاری سفر بن گیا تھا۔ رہا  
مقام کی مدت بھی بڑھ گئی تھی اور سب سے بری بات یہ کہ وہ اخراجات کی زیر باری  
بھی بن گیا تھا۔

دوسرے دن جعفر ایک گرجا میں گیا۔ اس نے پادری کو یہ تاثر دیا کہ اسے نصرانی  
مذہب سے دلچسپی ہے اور وہ اس مذہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا  
چاہتا ہے۔ موصّل ایک مسلمان ریاست تھی۔ وہاں سوائے عیسائی عبادت گاہوں کے شہر میں  
ہماتوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور جو تھے وہ دبے دبے رہتے تھے پادری نے  
نصرانی مذہب میں جعفر کی دلچسپی دیکھ کر اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس نے جعفر کو پڑھنے کے  
لئے بہت سی کتابیں دیں اور اسے عبادت کے طریقے سکھائے۔ اتوار کی نماز میں بھی جعفر  
شرکت کی اور دو ہفتوں کے اندر اندر وہ نہ صرف پادریوں کے طور طریقوں سے واقف  
ہو گیا بلکہ اس نے پادریوں کی چال ڈھال۔ نشست و برخاست اور گفتگو کے انداز کا گہرا  
ملاحظہ کیا۔ جعفر کو انہی باتوں کے جاننے کی ضرورت تھی کیونکہ رہا کی عیسائی حکومت میں  
ایک مسلمان کی حیثیت سے اس کا داخلہ کچھ مناسب نہ تھا جبکہ امیر زنگی نے اسے تاحکم  
نہا رہا میں قیام کرنے کا حکم دیا تھا۔

ایک صبح جب دھند لگا چھایا ہوا تھا جعفر اپنے مکان سے نکلا اور آہستہ آہستہ موصّل  
کے بازار طے کرنے لگا۔ اس وقت اس کے جسم پر پادریوں کا وہ چونہ تھا جو اس نے ہعلبک  
کے پادریوں کو پہنے دیکھا تھا۔ اس نے سونے کے سلوں کی دو تھیلیاں خزانہ سے حاصل  
کے اپنے چونے کے اندر چھپائی تھیں۔ وہ بڑے اطمینان سے ایک بازار سے دوسرا بازار  
دوسرے سے تیسرا بازار پار کرتا ہوا شہر کی اس سرائے میں پہنچا جہاں باہر جانے والے  
لٹے ٹھرا کرتے تھے۔ اس نے پہلے ہی معلوم کر لیا کہ ایک تجارتی قافلہ آج موصّل سے  
نکل رہا ہے جو تل باشر ہوتا ہوا رہا جائے گا۔ جعفر نے ولیم پادری کے نام سے سالار  
قرے ملاقات کی تھی اور قافلہ کے ساتھ جانے والوں میں اپنا نام درج بھی کرا دیا تھا۔

اسلام میں دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے چنانچہ جب  
ولیم سرائے میں پہنچا تو سالار قافلہ نے اٹھ کے اس کی تعظیم کی۔ ولیم کے ایک ہاتھ  
میں تلخ تھی اور دوسرے ہاتھ سے وہ پشت پر لٹکے ہوئے تھیلے کو سنبھالے ہوئے تھا۔  
اس کی صلیب بڑی تھی اور صلیب کا نشان عین سینے پر چمک رہا تھا۔ سورج کی پہلی کرن  
سائیکو قافلے نے کوچ کیا۔ پادری ولیم نے بھی زیر لب بسم اللہ کہہ کر پہلا قدم اٹھایا۔  
ان وقت اس کا سینہ جذبات سے پر تھا۔ ہزاروں ارمانوں اور تمناؤں نے اسے گھیر رکھا

امیر زنگی نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ نہیں جانتے۔“  
”آقا۔ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا؟“ جعفر نے اسے حیران نظروں  
دیکھا۔

امیر کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔ ”اچھا بتاؤ کہ اس عیسائی ریاست میں کیا کام آن پڑا ہے  
تم وہاں جانے کے لئے اس قدر بے چین ہو۔؟“  
”مجھے ایک ذاتی کام ہے آقا۔ جعفر نے ذرا جرأت سے کہا۔ ”لیکن ایک غلام کی  
بات اور ہر کام کی وجہ اس کے آقا کے علم میں ہونا چاہیے میں اصل وجہ بیان کر رہا ہوں  
لیکن یہ چاہتا ہوں کہ اگر جذبات کی رو میں میری زبان سے کوئی کلمہ ایسا نکل جائے  
گستاخی کی حد میں آتا ہو تو اس کے لئے مجھے معاف فرمایا جائے۔“  
”بے فکر رہو جعفر۔ میں آقا ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے وفاداروں کا دوست  
ہوں۔“ امیر عباد الدین زنگی نے بری شفقت سے کہا۔

جعفر نے سر کو ذرا اور خم کر لیا۔ ”اے آقائے محترم۔ ہعلبک کے قیام کے دور  
میری ایک عیسائی لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی مگر ہعلبک پر قبضہ کے وقت وہ اپنے باپ  
ساتھ رہا چلی گئی تھی۔ میں اسی سے ملنے جانا چاہتا ہوں۔“  
امیر زنگی مسکرایا۔ ”کیا تمہیں امید ہے کہ وہ بھی تمہارے لئے اسی طرح ہے؟  
ہوگی؟“

”امیر محترم۔“ جعفر جذبات کے دھارے میں بہنے لگا۔ ”ہعلبک میں شہ کی بناؤ  
مقرر کر لیا گیا تھا مگر اس وفادار لڑکی اور اس کے باپ نے مجھے اس قید سے رہائی  
تھی۔ وہ بیش قیمت جواہرات جو میں نے سرکاری خزانے میں جمع کرائے تھے وہ انکی  
ملکیت تھی۔ آقا اس سے خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔“  
”ٹھیک ہے جعفر۔ تم رہا ضرور جاؤ گے مگر چند دن کے لئے نہیں۔“  
”جی آقا۔ میں سمجھ نہیں سکا؟“

امیر زنگی کا انداز بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ ”تم رہا ذاتی کام سے نہیں بلکہ  
فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں جاؤ گے۔ تمہیں وہاں اخراجات کی ضرورت پڑے گی  
لئے تم اپنے ساتھ خزانے سے ایک معقول رقم لے جا سکتے ہو۔ رہا میں تم جس سے  
مل سکتے ہو مگر اپنے فرض سے غافل نہ ہونا۔ تمہارا رابطہ موصّل سے رہے گا اور تم  
اور شاہ جو سیلین کے حالات سے ہمیں ہر ہفتے آگاہ کرو گے۔ تمہیں رہا میں اس وقت  
قیام کرنا ہو گا جب تک ہم تمہیں واپسی کی اجازت نہیں دیتے۔“

تھا۔ اسے ترن کوزی کی وفاداری پر کوئی شبہ نہ تھا مگر اب حالات بدل چکے تھے۔ ہعلیک صورت دمشق کی اسلامی ریاست کا ایک حصہ تھا جہاں عیسائیوں کی ثانوی حیثیت تھی۔ رہا تو عیسائیں کا گڑھ اور مرکز تھا۔ رہا کو عیسائیوں کی سب سے زیادہ مضبوط چوکی کہا جاتا تھا اور ترن کوزی اسی مضبوط چوکی میں تھی۔

جعفر کو اس کے دوست اور سرائے کے مالک سرائش نے بڑے افسردہ لہجے میں بتایا کہ اس نے ترن کوزی کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ رک سکی۔ ترن کوزی بھی جگہ مجبور تھی۔ جس وقت ہعلیک پر امیر زنگی نے قبضہ کیا تو وہاں کے تمام عیسائیوں ایک ساتھ فیصلہ کر لیا کہ وہ ہعلیک چھوڑ کے رہا چلے جائیں گے۔ ترن کوزی کے باوجود فادر فلپ نے اسے آزاد کر دیا تھا کہ وہ جو مناسب سمجھے وہ کر سکتی ہے۔ اس وقت فادر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی۔ ترن کوزی پھر بھی کوشش کر کے سرائے پہنچی تھی کہ شاید کی ملاقات جعفر سے ہو سکے اور اپنے وعدے کے مطابق وہ ہمیشہ کے لئے جعفر کی ہو جا۔ مگر جعفر وہاں وقت پر نہ پہنچ سکا تھا۔ اس وقت ترن کوزی کے لئے دو ہی راستے تھے۔ یا باپ کو چھوڑ دے اور جعفر کی امید موبوم پر سرائے میں مقیم ہو جائے۔ اگر وہ ایسی حالت کرتی تو اس کا یہ نتیجہ بھی نکل سکتا تھا کہ جعفر کے نہ آنے کی صورت میں وہ بالکل سارا ہو کر در بدر ہو جاتی دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ فادر فلپ کے ساتھ رہا چلی جائے وہاں جعفر کا انتظار کرے۔ اس نے سرائش کو بتایا تھا کہ وہ رہا جا رہی ہے اور جعفر انتظار کرے گی۔ ترن کوزی نے حالات کے تحت جو فیصلہ کیا تھا وہی مناسب تھا۔ وہ تو یہ کی بد قسمتی تھی کہ وہ وقت پر نہ پہنچ سکا اور اب اسے یہ خطرناک سفر اختیار کرنا پڑا تھا۔ جعفر بغیر کسی خاص واقعہ کے تجارتی قافلہ کے ساتھ سفر کرتا ہوا موصل سے تل با پہنچ گیا۔ راستے میں قافلے نے کئی چھوٹی چھوٹی جگہوں میں پڑاؤ کیا اور قافلے والوں کی تھکن بڑھتی رہی۔ بعض لوگوں کی منزل آگئی تھی اور انہوں نے قافلہ کا ساتھ چھوڑ دیا تو اسی طرح ہر پڑاؤ پر کچھ نئے آدمی قافلہ میں شامل ہو جاتے تھے۔ جعفر ہر منزل پر محتاط جاتا اور نئے شامل ہونے والوں کو بغور دیکھتا۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے کہ ترن کوزی بھی کسی پڑاؤ پر اس قافلہ میں اتفاقی طور پر شامل ہو جائے اور اس کی پریشانی میں کی جائے لیکن تل باشر تک اس طرح کا کوئی اتفاق نہ ہوا اور اسے اپنے خیالی پلاؤں سے محفوظ رہا۔

تل باشر کی کارواں سرائے کا مالک ایک عیسائی تھا کیونکہ یہ خوبصورت سرد مقام کی ریاست میں شامل تھا اور گرمیوں کے زمانے میں رہا کے حکمران اکثر اس شہر میں

مزارات تھے۔ لیکن جب سے عماد الدین زنگی کا عروج ہوا تھا۔ رہا کے حکمران نے تل باشر کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ سال کے تمام سرد و گرم دن رہا ہی میں مقیم رہتا تھا۔ شہر کے تل باشر سے قافلہ تل باشر میں تین دن ٹھہرا رہا۔ چوتھے دن صبح کے وقت جب روانہ ہونے لگا تو اس میں ایک ایسا شخص شامل ہوا جسے دیکھ کر جعفر چونک پڑا۔ اس شخص کی صورت بڑی حد تک لارنس سے ملتی تھی جس سے جعفر نے ہعلیک کے گرجا میں اہل چھپنے تھے۔ لارنس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جن کے متعلق جعفر کو شبہ تھا کہ ان دنوں کو اس گرجا میں دیکھا ہے جہاں اسے قید کیا گیا تھا۔

قافلہ تل باشر سے روانہ ہو چکا تھا اور جعفر ایک عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا۔ دو دنوں کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ لارنس کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لارنس قافلہ میں شامل ہو جانے سے جعفر کو پہچانے جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ ہر وقت رہا اور لارنس کی نظروں میں آنے سے خود کو بچاتا تھا لیکن اس خطرے کی ساتھ اس کے دل میں ایک امید بھی پیدا ہو گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ لارنس کو ترن کوزی فادر فلپ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو گا لارنس کا پہلا مقصد فادر فلپ کی دولت ہارنا تھا جس میں وہ ناکام ہو چکا تھا۔ مگر اس کے ساتھ وہ ترن کوزی کو حاصل کرنے کا ناقص منصوبہ تھا کیونکہ ترن کوزی سے شادی کرنے کے بعد ہی اسے کیس گرجا میں کوئی نام حاصل ہو سکتا تھا۔

لارنس اور جعفر ہم سفر تھے مگر دونوں ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ جعفر پہچانے کے خطرے کی وجہ سے اس سے دور دور رہتا تھا۔ ادھر جعفر یہ تصور بھی نہ کر سکتا کہ امیر زنگی کا ایک اہم ہرکارہ یا سردار عیسائی علاقے میں سفر کرنے کی جرات کر سکتا ہے۔ کارٹر جاری رہا۔ منزلیں آتی اور گزرتی رہیں۔ لارنس کا راستے میں کہیں قافلہ چھوڑ کا ارادہ نہ معلوم ہوتا تھا وہاں جعفر نے یہ ضرور فیصلہ کیا تھا کہ اگر لارنس کسی جگہ روکے گا تو اس کے ساتھ ہی قافلہ چھوڑ دے گا۔ اس کا خیال تھا کہ جعفر کے دل میں ترن کوزی کے حاصل کرنے کا اب تک خیال ہے یا وہ ترن کوزی کو حاصل کرنے میں ہو گیا ہے تو وہ اسی جگہ قیام کرے گا جہاں ترن کوزی مقیم ہوگی مگر قافلہ تل باشر پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی جعفر اور لارنس بھی شہر میں داخل ہو گئے۔ قافلہ کو تل باشر ٹھہرا تھا اس لئے اس نے ادھر کا رخ کیا اور لارنس کی منزل رہا تھی۔ وہ شہر میں ہوتے ہی قافلے سے جدا ہو گیا۔ جعفر کی نظریں دور تک اس کا تعقب کرتی رہا اس کے لئے بالکل نیا تھا اس لئے وہ نہ اندازہ کر سکا کہ لارنس کدھر جا رہا

ہے۔  
 الہا کی بڑی سرائے کے دروازے پر سائے کے عیسائی مالک نے جعفر کے قافلہ  
 جوش استقبال کیا۔ قافلے میں ہر ملک و ملت کے لوگ شامل تھے۔ مگر سرائے کا مالک  
 ایک سے بڑی خندہ پیشانی سے ملا اور انہیں اپنے پورے تعاون اور آرام کا یقین دلایا  
 سرائے کے مالک عام طور پر تجارتی ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ اپنے مفاد کی خاطر ہر  
 کی پزیرائی کرتے ہیں۔ پھر اس زمانے کے دستور کے مطابق ہر ملک کے حکمران کی طرف  
 سرائے کے مالکان کو تاکید ہوتی تھی کہ وہ تجارتی قافلوں کی پوری حفاظت کریں اور ان  
 آرام و آسائش کا انتظام کریں خواہ قافلہ کے تعلق کسی دشمن ملک سے کیوں نہ ہو۔  
 اس حکم سے خوش تھے۔ اگر انہیں حکمران کی طرف سے اپنے پرانے کی تیز کا حکم دیا جائے  
 اس سے ان کا مفاد متاثر ہوتا۔ اس لئے وہ ہر ایک کو خوش آمدید کہتے تھے اور جنگ  
 زمانے میں بھی ملکی اور غیر ملکی کی کوئی تمیز نہ برتی جاتی تھی۔

اسی رات جعفر نے سرائے کے مالک سے ملاقات کی۔ مالک اپنے سامنے ایک  
 صورت پادری کو دیکھ کے تعظیم کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ”تشریف رکھئے فادر۔“ مالک نے  
 ادب سے کہا۔  
 ”تم پر خداوند مسیح کی رحمت ہو اور کاروبار میں برکت۔“ جعفر یا فادر ولیم اس کے  
 پر ہاتھ پھیر کر بیٹھ گیا۔  
 ”آپ شاید قافلہ کے ساتھ تشریف لائے ہیں؟ مالک نے سر جھکا کے کہا۔  
 ”تم نے صبح اندازہ لگایا بیٹا۔“ فادر ولیم اپنے مطلب کی بات کرنے کے لئے  
 ڈھونڈ رہا تھا۔

”قافلہ کے ساتھ آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں۔“ پتہ نہیں مالک کے سوال  
 تجسس تھا یا اس نے محض بات کرنے کے لئے یہ سوال کیا تھا۔  
 ”ہمارا کیا پوچھتے ہو بیٹا۔ نہ پتہ نہ ٹھکانہ۔ جس شہر میں جی لگا کچھ دن ٹھہرے اور  
 اٹھا تو پھر چل پڑے۔“ ولیم بڑی روانی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ”شمال سے جنوب تک کوئی  
 عبادت گاہ نہیں جہاں اس ناچیز ولیم نے خداوند یسوع مسیح کا سجدہ نہ گزارا ہو مگر ایجنہ  
 عبادت گاہ کا پاک یروشلیم کے بعد سب سے بڑا مقام ہے۔ ہعلیک کی یہ عظیم عبادت  
 اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ ولیم نے وہاں پاک یروشلیم کی ہواؤں کے جھوٹے محسوس کئے  
 پاک مریم کی روح کے سائے دیکھے ہیں۔“

سرائے کے مالک کی عقیدت اور اشتیاق اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ مہربان  
 کے بولا۔ ”فادر ولیم آپ کا یروشلیم سے جی زور ہوا ہے؟“  
 ”ہاں بیٹا۔“ فادر ولیم نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”خداوند یسوع مسیح اور پاک  
 کا وہی تو کمر ہے۔ اس گھر میں ایک شب گزارنا ہزار سجدوں کے برابر ہیں۔ اس گناہ  
 نے وہاں دو ماہ رہ کے اپنی روح کو مصفا اور گناہوں کو دھونے کی کوشش کی ہے۔“  
 ”فادر ولیم۔“ یہ کہتے ہوئے مالک نے ولیم کے پیروں پر سر رکھ دیا ”آپ نے اس دیار  
 پر کی ہے جہاں کے نظارے جنت نشان اور فضائیں معطر رہتی ہیں۔“  
 سرائے کا مالک دیر تک ولیم کے پیروں سے اپنی آنکھیں ملتا رہا اور ولیم اس کی پشت  
 پر پھیرے ہوئے اپنی دعاؤں سے نوازتا رہا۔ اسے مالک کی صورت میں الہا میں پہلا  
 رال کیا تھا۔ دوسری طرف مالک یہ سمجھ رہا تھا کہ فادر ولیم کی ملاقات اور قدم بوسی سے  
 نے جنت کا پروانہ حاصل کر لیا ہے۔  
 ”فادر میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ آپ یہاں کب تک قیام فرمائیں گے؟  
 نے مالک نے ایک ساتھ دو سوال کئے۔  
 ”بیٹے۔ ہم جیسے جہاں گرد ایک مقام پر بہت عرصے نہیں ٹھہرتے حالانکہ یروشلیم سے  
 مقدس مقام دنیا میں کوئی نہیں۔ مگر جب علم میں پہنچی نہ آئی ہو اور تجربہ ارتقا کی  
 میں ہو تو پادری کو کسی جگہ جم نہ بیٹھنا چاہئے۔ اسے تکمیل کے لئے سفر کرنا پڑتا  
 ہے۔“ ولیم نے گول مول جواب دیا۔  
 ”بے شک فادر۔ آپ نے بالکل درست فرمایا۔“ مالک نے عقیدت کے بھرپور جذبہ  
 ”کہ یہ الہا کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کے قدموں نے اس سرزمین کو رونق بخشی۔  
 فادر فرماتے ہیں کہ آپ دن میں کم از کم ایک بار ضرور مجھے قدم بوسی کی اجازت  
 دے فرمائیں۔“

”تمہاری درخواست قبل از وقت ہے بیٹا۔“ ولیم نے فوراً ”مطلب کی راہ نکالی۔  
 میں یہ طے نہیں کر سکا ہوں کہ آیا میں الہا میں قیام کر سکوں گا یا کل ہی مجھے کسی  
 لگا جگہ جانا ہو گا۔“  
 ”بہر حال کل تک تو آپ یہاں رہیں گے۔ آپ کہاں ٹھہریں گے۔ میں کس جگہ آپ  
 فرست میں حاضر ہوں؟“  
 ”نکمو بیٹے۔“ ولیم نے سنہل کے کہا۔ ”میں یہاں اپنے ایک محسن اور بزرگ سے  
 ملاقات کروں گا۔“  
 ”میں ان سے ملاقات ہو گئی تو دو چار ہفتے ان کے پاس قیام کر کے واپس ہو جاؤں گا  
 ملاقات نہ ہونے کی صورت میں مجھے واپس جانا ہو گا یروشلیم مجھے پکار رہا ہے وہاں کے



در و دیوار ہر وقت میری آنکھوں میں پھرتے ہیں اور خواب میں بھی وہاں کے نظارے تعجب کرتے ہیں۔“

”فادر ولیم۔ آپ کس بزرگ سے ملنا چاہتے ہیں یہاں؟“ مالک نے بے چینی پوچھا۔

”ان کا نام فادر فلپ ہے۔ بڑی خوبیوں کے مالک ہیں یہ بزرگ۔ مہربان دست مشفق رہنما۔“ اور ولیم نے بری امید سے دیکھا۔ ”تم نے انہیں ضرور دیکھا ہوگا۔ میرا ہے کہ ان کا قیام الہا کے کسی بڑے عبادت خانہ میں ہوگا۔“

ولیم نے اپنے تمام اندازے اس پر ظاہر کر دیے۔ اسے امید پیدا ہو گئی تھی کہ مالک سے اسے کچھ نہ کچھ معلومات ضرور ہو جائیں گی۔ مالک کچھ دیر ذہن پر لڑا رہا۔ ”فادر فلپ!“ مالک بڑبڑایا۔ ”میں نے یہ نام پہلے نہیں سنا۔ یہاں کے تمام عبادت خانوں سے میں واقف ہوں فادر۔ روز کسی نہ کسی عبادت خانہ جاتا ہوں۔ میرا خیال۔ اس نام کے کوئی فادر الہا میں موجود نہیں۔“

فادر ولیم پریشان ہو گیا۔ سرائس نے تو اسے یہی بتایا تھا کہ ترن کوزی اور فلپ اسے رہے ہیں مگر اس سرائے کا مالک کتنے وثوق سے کہہ رہا تھا کہ اس نے فادر فلپ کا نام نہیں سنا۔ کیا ترن کوزی الہا نہیں آئی۔ ولیم کے دل میں طرح طرح کے دوسے ہونے لگے۔ اسے ایک خیال یہ بھی آیا کہ کہیں ترن کوزی نے ٹالنے کے لئے سرائس یہ نہ کہہ دیا ہو کہ وہ الہا جا رہی ہے اور بجائے الہا کے وہ دونوں کسی اور طرف نکل ہوں۔ اس زمانے میں ہبلک کے شمال اور جنوب میں عیسائی ریاستوں کی ایک زنجیر تھی۔ وہ کسی بھی عیسائی ریاست میں جا سکتے تھے۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ دمشق چلے ہوں۔ ہبلک چھوڑنے والے مسلمان عام طور سے دمشق کا رخ کر رہے تھے۔ انکی ساتھ یہ بھی چلے گئے ہوں۔

سرائے کا مالک سوالیہ نظروں سے ولیم کو دیکھ رہا تھا۔ اسے مطمئن کرنا ضروری ”تمہاری بات درست ہو سکتی ہے بیٹے۔ مجھے ہبلک میں بتایا گیا تھا کہ فادر فلپ اپنی کے ساتھ الہا جانے کا ارادہ کر رہے تھے۔ ہائے کیا تباہ ہوا ہے وہ شاندار شہر قتل و غارت گری ہوئی۔ ظالموں نے اینٹوں کی قدیم عبادت گاہ کو بھی لوٹ لیا۔ فلپ اسی عبادت گاہ کے لارڈ پادری تھے۔“

”فادر۔ کیا ہبلک کی تباہی کے وقت آپ وہاں موجود تھے؟“ مالک نے اپنی دلچسپی کی۔

چاہا کہ میں اس وقت وہاں موجود نہ تھا اب تو وہ شہر پہچانا ہی نہیں جاتا۔ ورنہ یہ دیکھی نہ جاتی۔“

لندی سانس لے کر تاسف کا اظہار کیا۔ مالک نے بھی افسوس کا اظہار کیا ”میں وہاں کا حال سنا ہے فادر۔ بہت سے لوگ وہاں سے آکے الہا میں آباد ہو گئے ہیں۔ ماہے کہ ہبلک کا کوئی پادری یہاں نہیں آیا ورنہ مجھے ضرور خبر ہو جاتی۔“

لندی یہاں آتا ہی بیکار ہوا۔ ”ولیم نے بڑے دکھ سے کہا۔ مگر میں فادر فلپ سے ملے لی تو نہیں سکتا۔ کیا پتہ کہ وہ کچھ دنوں کے بعد الہا آئیں اور جب انہیں معلوم ہو ان سے ملے بغیر واپس چلا گیا تو انہیں کتنا افسوس ہوگا۔“

لندی کچھ دن یہاں رہ کیوں نہیں جاتے۔“ مالک نے مودبانہ درخواست کی۔ ”اگر در فلپ نہ آئے تو بھی آپ کو یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ الہا والے بڑے مہمان تے ہیں خصوصاً آپ لوگوں کے بارے وہ لوگ بہت حساس ہیں۔“

لندی درخواست میں اور میرے ارادے میں بڑی مطابقت ہے بیٹے۔“ ولیم نے ہر کی۔ ”میں الہا پہلی بار آیا ہوں۔ مجھے پتہ نہیں الہام میں کتنی عبادت گاہیں ہیں کہاں ٹھہرنا چاہئے؟“

اور۔ آپ جس عبادت گاہ میں جائیں لوگ آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے مگر یہ کہ آپ کسی عبادت گاہ میں ٹھہریں؟“

لندی کا انداز استفساریہ تھا۔ در پردہ وہ فادر ولیم کو اپنی سرائے میں قیام کرنے کی سے رہا تھا۔ ولیم نے سب کچھ سمجھ لیا مگر انجام بتا رہا۔ ”بیٹے کسی نہ کسی جگہ تو ہوگا۔“

لندی نے فیصلہ سرائے کے مالک پر چھوڑ دیا تھا۔ مالک کو فادر ولیم کے الفاظ سے حوصلہ مائل دے لفظوں میں کہا۔ ”وہ جگہ یہ سرائے بھی تو ہو سکتی ہے فادر۔ یقین کیجئے کہ یہاں کوئی تکلیف نہ ہوگی ہمیں خدمت کا موقعہ دیتے فادر۔ ایسا موقعہ زندگی ہی بار ملتا ہے۔ میں آپ کو کسی اور جگہ ٹھہرنے نہ دوں گا فادر آپ الہا سے ملنا فادر فلپ کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ میں خود انہیں تلاش کروں گا وہ یہاں ہیں تو میں انہیں ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔“

بیٹے تم کس قدر نیک اور پر خلوس ہو۔ مجھے بولنے کا موقعہ ہی نہیں دیتے۔“ فادر لندی طور پر احتجاج کیا۔ حالانکہ اس نے یہ طویل گفتگو اسی مقصد کے لئے کی تھی۔ بولنے کی ضرورت نہیں ہے فادر۔ بس فیصلہ ہو گیا۔“

سرائے کے مالک نے فیصلہ کر دیا اور فادر نے اسے ”اچھا“ کہہ کے تسلیم کر لیا۔  
کچھ دیر دونوں طرف خاموشی رہی۔ سرائے کا مالک خوش تھا کہ ایک مذہبی پیڑا  
کے پاس قیام کرنے پر رضامند ہو گیا۔ فادر ولیم بھی کم خوش نہ تھا۔ وہ تو خود ہی عبادت  
میں قیام کے بجائے کسی اور جگہ ٹھہرنا چاہتا تھا مگر اب اسے یہ فکر تھی کہ بعلبک میں  
قلب نے اسے برداشت کر لیا تھا لیکن الہا خاص عیسائی ریاست تھی۔ اگر اس کا اور  
قلب کا آسنا سامنا ہوا اور اسے جعفر کا ایک پادری کا روپ دھارنا پسند نہ آیا تو وہ  
مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔ ترن کوزی کے بارے میں اسے کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس  
اس نے یہی بہتر خیال کیا کہ فادر قلب اور ترن کوزی کا سامنا کرنے کے بجائے وہ یہ  
سرائے کے مالک کے ذریعے کرے اور جب اصل حالات سے آگاہ ہو جائے تو پھر اگلا  
اٹھائے۔

فادر ولیم کو الہا میں رہتے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے مگر ترن کوزی کا کوئی پتہ نہ چلا  
الہا کا دوسرا بڑا شہر تل باشر تھا جہاں ترن کوزی کے قیام کا امکان ہو سکتا تھا مگر وہ  
فرائض منصبی کے تحت تل باشر کا سفر نہ کر سکتا تھا۔ امیر کی طرف سے بھی اسے کوئی  
نہ ملا تھا۔ اس لئے بھی اسے الہا سے باہر نکلنا خطرناک معلوم ہوتا تھا۔ سرائے کا مالک  
کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کے وہ ولیم کے کمرے میں آج  
فادر ولیم بھی اس پر اپنا اثر قائم رکھنے کے لئے دنیا جہان کے قصے سنایا کرتا۔ اس طرح  
پر ولیم کا اعتماد اور اثر روز بروز بڑھتا گیا۔ سرائے کے مالک نے ولیم کے لئے الہا کے  
عبادت خانوں کی خاک چانی تھی مگر فادر قلب کے بارے میں کچھ پتہ نہ لگا تھا۔ اس طرح  
ماہ اور گزر گئے۔ ولیم سرائے میں بیکار رہتے رہتے آگیا۔ اس کا کہہ سرائے کے  
میں تھا جہاں لوگوں کی بہت کم آمد رفت رہتی۔ مالک نے اسے یہ کہہ اسی وجہ سے  
تاکہ کوئی فادر ولیم کی عبادت میں خلل نہ ہو سکے مگر یہ تنہائی ولیم کے لئے مصیبت بنا  
تھی۔

فادر ولیم صرف اتوار کو نماز کے لئے گر جا جاتا تھا۔ کئی مہینے وہ بڑے گرجا گھر جا  
پھر دوسرے گرجوں میں جانا شروع کر دیا کہ شاید کہیں سے کچھ گمنام مل سکے مگر  
کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ایک بار اسے خیال ضرور آیا کہ وہ لارنس سے ملے۔ لارنس  
صرف ایسا آدمی تھا جس سے ترن کوزی کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا لیکن لارنس  
لانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اگر لارنس نے اسے پہچان لیا تو پھر اسے جان کے  
جائیں گے۔ اس نے بعلبک میں لارنس کا گلا دبایا تھا اور اس سے تمام جواہرات چھین

فادر ولیم بھیل بھاڑ سے فائدہ اٹھاتا ہوا فوراً اس کے قریب پہنچا۔ بھلوکش میں  
سے قریب ہوں۔ مجھے دیکھ کر کسی تعجب کا اظہار نہ کرنا۔“

بھلوکش چونکا مگر فوراً ”سنبھل گیا پھر اس نے ننکھیوں سے پہلو کی طرف دیکھا۔ ایک  
مالک کے ساتھ چل رہا تھا بھلوکش کو تعجب تو ہوا مگر وہ کچھ بولا نہیں۔

فادر ولیم نے سرگوشی کی۔ ”صبح۔ سورج نکلنے سے پہلے صدر دروازے کے باہر تمہارا  
رکول گا۔

بھلوکش نے سر ہلا کر اثبات میں جواب دیا۔ پھر وہ الگ ہو گئے۔

فادر ولیم نے رات کو شمع کی روشنی میں اپنے لکھے ہوئے خط پر نظر ڈالی۔ یہ دراصل  
کے بارے میں ایک تفصیلی رپورٹ تھی جو فادر ولیم یعنی جعفر نے پہلے ہی تیار کر لی  
ہاوسوں کے لئے دوسری جگہ خبریں بھیجنے کا یہی طریقہ تھا۔ وہ ضروری خبریں قلم بند کر  
تے اور جب کوئی خبر پہنچانے والا ملتا وہ خبروں کا کانڈ اس کے حوالے کر دیتے۔ موقع  
آتا ایک دوسرے سے ملاقات بھی کرتے مگر اس صورت میں بھی خبروں کا تبادلہ تحریری  
ہوتا۔ ولیم نے اس خط میں کچھ اضافے کئے اور پھر کانڈ پلیٹ کے جیب میں رکھ لیا۔  
بھلوکش کے آنے سے بڑی خوش ہوئی تھی۔ یہ خط امیر کو بھیج کے وہ کچھ دنوں کے

اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم تا حکم ثانی رہا میں مقیم رہو گے۔“  
 ایک ہے۔ تمہارا دوسرا چکر کب لگے گا؟“  
 پلٹ میرے اختیار میں نہیں۔“

میں شاید یہ جگہ چھوڑ دوں مگر میرا پتہ تم کو یہیں سے مل سکے گا۔ سرائے کا مالک  
 فادر ولیم کا بہت معتقد ہے۔ اس سے فادر ولیم کا نیا پتہ معلوم کر لیتا ”ولیم!“  
 مگر آیا۔ ”اچھا روپ بھرا ہے تم نے۔ میں بھی تمہیں پہچان نہ سکا تھا۔“

دوسرے دن ہلوکش نے اپنے قافلے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ امیر کو خط بھیجنے کے بعد  
 اگلے مہینے ہو گیا تھا۔ اب اس کے پاس کافی وقت تھا اور وہ ترن کوزی کی تلاش  
 اسے باہر بھی جاسکتا تھا مگر کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ ایک بار لارنس سے ملنے کا  
 لینا چاہتا تھا کیونکہ لارنس ہی ایک ایسا وسیلہ تھا جس کے ذریعے وہ ترن کوزی تک  
 پہنچ سکتا تھا۔ اتوار کے دن اس نے بڑے گرجا کا رخ کیا۔ ولیم نے اس سے پہلے  
 پہنچ سکتا تھا۔ اتوار کے دن اس نے بڑے گرجا کا رخ کیا۔ ولیم نے اس سے پہلے  
 اسی طرح خطرات کو دعوت دی تھی۔ ایک جاسوس کی زندگی تو خطرات ہی سے  
 ہوتی ہے پھر وہ کیوں گھبرائے۔ اس دن گرجا میں معمول سے کچھ زیادہ ہی بیڑ تھی۔

اگر دیواری کے اندر لوگوں کا جھوم تھا اور درجنوں پادری ادھر ادھر چلتے پھرتے نظر  
 آتے تو فادر ولیم بھی اس جھوم میں شامل ہو گیا اور لارنس کو ڈھونڈنے لگا۔  
 پھر ہے کہ ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ فادر ولیم بڑے گرجا میں اس خیال  
 فاکہ لارنس ایک عشرت پسند انسان ہے اس لئے اس کا بڑے گرجا میں آنا یا قیام  
 ناممکن تھا۔ ولیم کا یہ خیال درست نکلا۔ تھوڑی ہی دیر بعد لارنس اسے ایک طرف  
 ہوا دکھائی دیا۔ فادر ولیم نے خطرے کا خیال کو ایک جھٹکا دے کر ذہن سے نکال دیا  
 ہوا یاد کہ رک لارنس کی طرف بڑھا۔ گرجا کے چھوٹے چھوٹے میٹ پر دونوں کا  
 گیلہ فادر ولیم نے بڑے جرات سے لارنس کی طرف دیکھا۔ لارنس اس پر ایک سر  
 رڈال کر آگے بڑھا تھا کہ اسی وقت فادر ولیم نے اسے ٹوکا۔

”کے بیٹے میری مدد کرو۔“  
 اس کے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کے ولیم کو دیکھا پھر قدم اٹھاتا اس کے پاس  
 لپٹے فادر۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ ”لارنس نے اتنے ادب سے کہا  
 اچھا ہو گیا کہ اسے بالکل پہچان نہیں گیا۔“

لئے رہا سے باہر بھی جاسکتا تھا۔

صبح کو دھندلکے میں فادر ولیم اور ہلوکش ایک دوسرے سے ملے۔ ہلوکش نے  
 کے کہا۔ ”فادر کو سلام پیش کرتا ہوں۔“

”وقت ضائع نہ کرو ہلوکش آقاے محترم کے بارے میں کچھ بتاؤ۔“ جعفر نے  
 سے کہا۔

”آقا۔ بالکل خیریت سے ہیں اور دیار بکر میں قیامت برپا کئے ہوئے ہیں۔“ ہلوکش  
 بتایا۔ ”تمام امیر نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور ہمارے آقا امیر زندگی کے دامن میں پناہ  
 کی ہے۔“

”فتوحات مبارک ہوں ہلوکش۔“ جعفر نے جیب سے مرا تڑا خط نکال کے ہلوکش  
 کے حوالے کر دیا۔

”ایک اور بڑی دلچسپ خبر ہے۔ تم سن کے خوش ہو گے۔“ ہلوکش نے خط افرو  
 سے اندر کی جیب میں رکھ لیا۔

”ضرور سناؤ۔ میں گوش بر آواز ہوں۔“

”ہمارے امیر کے حرم میں آرمینہ ایک شہزادی کا اضافہ ہو گیا ہے۔“  
 خبر واقعی دلچسپ تھی۔ امیر عماد الدین زندگی کی عمر اس وقت ساٹھ سال تھی۔ اس  
 دو بیٹے جوانی میں قدم رکھ چکے تھے۔ ”واقعی بڑی دلچسپ خبر سنائی۔ مگر اس بڑھاپے میں  
 کو یہ کیا سوچیں۔“ جعفر نے دلچسپی کا اظہار کیا۔

”آقا کی باتیں آقا ہی جانیں۔“ ہلوکش نے تبصرہ کیا۔ ”ان کی جنگی چالوں کو  
 نہیں سمجھ سکتا۔ کسی کو تمہے بتاتے ہیں تو کسی کو پلو میں بٹھاتے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا  
 شادی ہے۔ والئی آرمینہ خود سری پر آمادہ تھا۔ امیر نے اسے تگوار سے زبردستی  
 بجائے اس کی شادی کا پیغام بھیج دیا اور والی آرمینہ ان کا حلقہ گوش ہو گیا۔“

”ٹھیک کہہ رہے ہو ہلوکش۔ امیر جتنے سخت ہیں اتنے ہی نرم بھی۔ میدان جنگ  
 بھی ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ ہمیں نے اکثر دیکھا ہے کہ امیر نے کسی کمزور حکمران  
 گلے لگایا اور کئی دوسروں کے گلے کاٹے ہیں۔ ایسے شہ زور عالی دماغ حکمران کم  
 ہوتے ہیں۔ خدا امیر کو سلامت رکھے۔“ جعفر نے جو کچھ کہا وہ ایک تاریخی حقیقت  
 جس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

”کوئی پیغام دیتا ہے امیر کو؟“ ہلوکش نے ابھرتی روشنی کو ذرا فکر سے دیکھا۔

”میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے۔ میرے لئے کوئی حکم ہے امیر کا؟“

”کوئی پیغام دیتا ہے امیر کو؟“ ہلوکش نے ابھرتی روشنی کو ذرا فکر سے دیکھا۔

”میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے۔ میرے لئے کوئی حکم ہے امیر کا؟“

”میں نے سب کچھ لکھ دیا ہے۔ میرے لئے کوئی حکم ہے امیر کا؟“

وں نے تم سے کہا تھا کہ وہ الہا آرہے ہیں؟“  
”صرف کہا ہی نہیں بلکہ میں نے ان سے عہد لیا تھا کہ وہ جلد از جلد الہا پہنچ

فادر ولیم چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا ”اب لارنس تمہارا کیا خیال ہے میں یہاں ٹھہر کے  
انتظار کروں یا پھر تل باشر چلا جاؤں۔ میں ادھر آیا ہوں تو ان سے مل ہی کے جاؤں

لارنس نے غمزہ لہجہ میں جواب دیا۔ ”فادر۔ میں تو یہی کہوں گا کہ آپ بھی میری  
ان کا انتظار کریں۔ میں خود ان کے لئے بہت بے چین ہوں فادر۔“

”کیا کوئی خاص بات ہے لارنس؟“ پھر ولیم نے خود ہی بات پلٹ دی۔ ”مگر یہ تمہارا  
حالہ ہوگا اور میں کسی کے ذاتی معاملات میں دخل نہیں دیا کرتا۔“

”مگر فادر۔ اب تو آپ کو میرے معاملے میں ضرور دخل دینا ہوگا۔“ لارنس نے بڑی  
مزاحمت سے کہا۔

فادر ولیم نے لارنس کے سنجیدہ اور پریشان چہرہ کو دیکھا۔ ”لارنس۔ ذاتی معاملات پر  
اے گفتگو نہیں کرنا چاہئے۔“

”معاف کیجئے فادر۔ مجھے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔“ لارنس نے معذرت کی۔ ”مجھے فادر  
کے حوالے سے اس عبادت خانہ میں ایک کمرہ مل گیا ہے۔ چلے وہیں بیٹھ کر گفتگو

دونوں خاموشی سے آگے پیچھے چلے گئے۔ مشرقی جانب ایک قطار میں بہت سے کمرے  
لارنس اپنے مہمان فادر ولیم کو اپنے کمرے میں لے گیا۔

”فادر۔ میں نے ابھی کہا تھا کہ آپ کو میرے معاملات میں دخل دینا ہوگا۔ لارنس نے  
کا آواز کیا۔

”ہاں۔ کہا تھا تم نے۔ مگر یہ ایک مبہم بات ہے۔ تمہیں وضاحت کرنا پڑے گی۔“ فادر  
نے وضاحت طلب کر لی۔

”میں سب کچھ بتا دوں گا فادر۔ مگر پہلے آپ کو مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا؟“  
”وعدہ۔ کیا وعدہ۔ ایک غریب پادری کیا وعدہ کر سکتا ہے۔ سوائے دعاؤں کے اس

ل اور کچھ ہوتا ہی کیا ہے؟“  
”مجھے یہی دعاؤں چاہئیں فادر۔“

لارنس جس عقیدت سے تم مجھے یہاں لائے ہو اس نے مجھے متاثر کیا ہے۔“ جعفر

”بیٹے۔ کیا تمہارا تعلق اس عبادت گاہ سے ہے؟“ فادر ولیم نے آواز بنا کر پوچھا۔  
شفقت سے پوچھا۔

”جی فادر۔ یہی سمجھ لیجئے۔ آپ اس شہر میں اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔“ لارنس نے  
گفتگو مختصر کرنے کے لئے جواب بھی دیا اور تجسس دور کرنے کے لئے سوال بھی کر دیا۔

”تم نے ٹھیک کہا نیک بیٹے۔ دراصل مجھے ہعلبک کے فادر فلپ کی تلاش ہے۔“ فادر  
ولیم نے رک کے لارنس کو دیکھا۔ ہعلبک کے نام پر لارنس کے کان کھڑے ہو گئے تھے

فادر ولیم نے سلسلہ جاری رکھا۔ ”فادر فلپ سے ملنے میں دمشق سے ہعلبک پہنچا تھا مگر وہاں  
کے تمام عبادت خانے برباد ہو گئے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ فادر فلپ ہعلبک جھوڑے

الہا میں آباد ہوئے ہیں۔ میں ایک ہفتے سے ان کی تلاش میں سرگرداں ہوں مگر کسی  
عبادت خانہ سے بھی ان کا پتہ نہ معلوم ہو سکا۔

”لارنس شاید تذبذب میں گرفتار تھا۔ اس نے مشکوک نظروں سے ولیم کو دیکھا۔  
”فادر۔ کیا فادر فلپ سے آپ کی عزیز داری ہے؟“

”بیٹے۔ مذہبی تعلق، رشتے داری سے بلند ہوتا ہے“ فادر ولیم نے بڑی بے پروائی سے  
جواب دیا حالانکہ اسے محسوس ہو گیا تھا کہ لارنس اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھ رہا ہے۔

”فادر فلپ۔ اس ناچیز کے بزرگ اور رہنما ہیں۔ میں جب بھی شمال کا سفر کرتا ہوں تو  
ہعلبک سے گزرتے وقت انیٹینس کی عبادت گاہ کو نہیں بھولتا۔ فادر فلپ کا مشفقانہ سلوک

اور احسانات میں کبھی نہیں بھول سکتا۔“  
لارنس کو شاید اطمینان ہو گیا تھا۔ اس نے بتایا۔ ”فادر۔ آپ فادر فلپ سے ملنا چاہتے

ہیں مگر وہ ابھی تک یہاں نہیں پہنچے۔“  
”یہ تو میں جانتا ہوں بیٹے۔“ فادر ولیم نے سنجیدگی سے کہا۔ ”سوال یہ ہے کہ وہ کہاں

کہاں۔ ہعلبک کی تباہی کو سال ہونے والا ہے پھر وہ راستے میں کہاں رہ گئے؟“  
”تل باشر میں!“ ولیم پریشان ہو گیا۔ ”مگر تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ تل باشر

میں ہیں؟“  
”میرا نام لارنس ہے اور میں ان کا قریبی عزیز ہوں فادر۔“

”اچھا تو تم فادر فلپ کے عزیز ہو۔“ فادر ولیم نے لارنس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔  
”خداوند یسوع مسیح کی تم پر برکت ہو۔ تمہاری صورت بھی کچھ کچھ فادر فلپ سے ملتی

ہے۔“ فادر ولیم نے یہ بات ٹھنڈے انداز سے کہی تھی۔ ”اس کا مطلب ہے کہ تمہارا ان  
سے رابطہ قائم ہے اس وجہ سے تمہیں ان کے تل باشر میں ہونے کا اندازہ یقین ہے۔“

نے آنکھیں بند کیں پھر کھولیں۔ ”تم ایک اچھے جوان ہو۔ میری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔“

”قادر۔ آپ میری ایک مشکل آسان کر سکتے ہیں۔“ لارنس نے التجائی انداز اختیار کیا  
 ”مشکل آسان کرنے والا خداوند ہے لارنس۔ میرے اختیار میں جو ہوگا اس میں ہر  
 چیز نہ کروں گا۔“ ولیم نے اسے یقین دلایا۔

”فادر۔“ لارنس جذبات میں ڈوب گیا۔ ”مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے خداوند پر مسیح نے آپ کو میری مشکل آسان کرنے کے لئے بھیجا ہے۔“

”یہ تمہارا حلوں اور عقیدت ہے لارنس۔ اپنا مطلب بیان کرو؟“

”آپ نے فرمایا تھا کہ فادر فلپ آپ کے رہتا ہیں۔ یعنی آپ ان کے شاگرد ہیں“

”ہاں ہاں۔ اس میں شک ہی کیا ہے۔“ ویم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”فادر فلپ آپ کی بات بھی مانتے ہوں گے؟“

”لارنس۔“ ولیم کی سمجھ میں کچھ کچھ آنے لگا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ”میں نے“

تک فادر فلپ سے اپنے لئے کوئی سوال نہیں کیا۔ ہاں دوسروں کے لئے دعائیں ا  
سفرائیں کرائی ہیں۔ انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔“

ولیم اس کے دل کا حال معلوم کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے لارنس کو موقع فراہم

کہ وہ اپنا سوال پیش کرے۔ لارنس خود اس موقعہ کی تلاش میں تھا۔ اس نے فوراً کہا: ”آپ نے دوسروں کے لئے سفارشیوں کی ہیں ایک سفارش میری بھی کر دیجئے۔“

”لارنس۔ اس قدر انکسار سے کیوں کام لے رہے ہو۔ تم تو میرے ہو۔ تمہارے“

کے لئے میں سفارش ہی نہیں بلکہ کوشش بھی کروں گا۔ بتاؤ تمہیں کیا کام ہے فارغ  
سے؟“ ولیم گھر کے اسے مطلب ر لے آیا۔

”فادر۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے ایک جوان لڑکی ہے۔“ لارنس نے کھٹکڑا

—U

”لو کہ!“ لیجئے، میں نے اس بات پر کہا جس پر وہ زور دے رہا وہ۔ ”پانچ سال!“

میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت تو ان کے ساتھ میں نے کسی جوان لڑکی

”میں نے ایک بار اس کے گھر میں اس کا نام لیا تو اس نے کہا کہ یہ میرا“

وہی پتی اب جوان ہوئی ہے قادر۔ اس کا نام مرزا موری ہے۔

نہ کہ گھبر کے رکھا۔ ”یہ مجھ اب جہان ہو گئی ہے اور ہمارا بیٹا لارنس اس۔“

میں نے اس کے لئے دعا کی کہ وہ اپنی زندگی میں اس کی ساری باتیں یاد رکھے اور اس کی باتیں کو اپنے دل میں لپیٹ لے۔

اس سوالیہ نظروں سے لارنس کو دیکھا۔ لارنس نے خاموشی اختیار کئے رکھی۔

شاید وہ ولیم پر یہ راز ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔  
 ”کوئی بات نہیں لارنس۔“ ولیم نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”وہ مجھ سے انکار نہ کرے گی۔ میں عورت کی کمزوریوں سے واقف ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم بے فکر رہو۔“  
 ”آپ کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں فادر۔“ لارنس ہچکچا رہا تھا۔  
 ”شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ولیم کو اس سے پیچھا چھڑانا تھا۔ اس نے لارنس کو دیکھا۔  
 ”لارنس۔ تم کیسے جا رہے تھے۔ میری وجہ سے تمہیں رکنا پڑا۔“  
 ”کوئی بات نہیں فادر۔ آپ کی ملاقات سے اہم کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ لارنس نے



چالپوسی کی۔  
 ”نہیں نہیں۔ تم اپنے کام پر جاؤ۔ میں بھی ذرا گھوم پھر لوں۔“ ولیم نے اسے ہانک کر دوبارہ کوشش کی۔  
 ”پھر کب ملاقات ہوگی فادر۔؟“ لارنس نے ایک دم سوال کیا۔  
 ”ملاقات!“ ولیم سوچ میں پڑ گیا۔

”میرا مطلب ہے۔ میں خود آپ سے ملاقات کرنے آؤں گا۔ آپ کس جگہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ اس سوال نے ولیم کو بالکل ہی بوکھلا دیا۔ کیا بتانا کہ کہاں ٹھہرا ہے سرائے کا نام لیتا تو اس کا سکون برباد ہو جاتا۔ لارنس چوبیس گھنٹے وہاں پڑاؤ ڈالے رکھا اس طرح اس کے تمام منصوبے خاک میں مل سکتے تھے۔ اس نے کہا۔ ”بیٹے۔ ہمارا ٹھکانہ کیا پوچھتے ہو۔ ہم تو بے ٹھکانہ لوگ ہیں لارنس۔ جہاں شام ہوئی وہیں پڑ رہے۔ الہا عبادت خانوں کی کمی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں لوگ عزت سے ملتے ہیں۔“  
 ”فادر۔ اگر کوئی حرج نہ ہو تو آپ میرے پاس آجائیں۔“ لارنس نے پیشکش کی۔

”میرے پاس بہت بڑا کمرہ ہے اور نہایت آرام دہ۔“  
 ولیم کے لئے یہ پیشکش خطرے سے خالی نہ تھی۔ اس لئے بڑے پیار سے کہا۔ ”لارنس اڑتے پرندے کو سونے کے پنجرے میں قید کرنا چاہتے ہو۔ ناہیئے۔ ناہیئے۔“  
 ”نہیں کر سکتا۔“

”مگر فادر۔ ابھی تو یہ پتہ نہیں کہ ترن کوزی۔ میرا مطلب ہے فادر قلب الہا پنہیں گے۔“ لارنس نے ولیم کو رام کرنا چاہا۔ ”میں آپ کو زیادہ آرام ملے گا فادر۔“  
 ”تمہارے پاس بھی رہوں گا لارنس۔ مگر کبھی کبھی۔“ فادر ولیم جانے کے لئے ہوا۔

”آپ کہاں جائیں گے فادر؟“ لارنس نے پوچھا۔  
 ”مجھے خود نہیں معلوم کہاں جاؤں گا۔“ ولیم چلتے ہوئے بولا۔ ”تم اپنے کام پر

میں نے تمہارا بہت وقت لیا۔“  
 ”آپ کا شکریہ گزار ہوں فادر۔“ لارنس نے سانس لے کے کہا۔ ”آپ سے ملنے میرے دل میں امید کا چراغ پھر جل اٹھا ہے۔“  
 ”ترن کوزی سے بہت محبت معلوم ہوتی ہے۔“ فادر ولیم نے دروازے کے پاس کے کما پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔

امیر الدین زنگی کا اصل مقصد دمشق پر قبضہ کرنا تھا تاکہ وہ شام کے علاقہ زیر تسلط کرنے کے بعد مسلمانوں کے اصل دشمن یعنی عیسائیوں سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ اس میں اس قدر مضبوط تھا کہ امیر زنگی کو وہاں بار بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ دمشق کا علم جو دمشق کا حقیقی حکمران تھا، ہر بار اپنی چالاکی اور دور اندیشی سے دمشق کو صاف ہاتھ سے امیر زنگی کو دمشق میں ناکامی ہوئی تو اس نے ہعلبک پر اچانک حملہ کر کے اس کو لایا اور نجم الدین ایوب جیسے عالی دماغ سردار کو وہاں کا گورنر مقرر کر دیا۔ نجم ایوب نے چند ہی دنوں میں ہعلبک کو اس قدر مضبوط کر دیا کہ وزیر اعظم دمشق امیر الدین ازک کو اپنی اس جاگیر کی طرف نظر اٹھانے کی ہمت نہ ہوئی تھی۔

امیر الدین ازک کو اپنی جاگیر نکل جانے کا صدمہ تو تھا ہی مگر اسے یہ خیال زیادہ پریشان تھا کہ ہعلبک کے بعد امیر زنگی کا دوسرا نشانہ دمشق ہی ہوگا۔ چنانچہ اس نے دمشق کے لوگوں کو کوششوں میں پہلے سے زیادہ اضافہ کیا۔ ازک اپنے دشمن امیر زنگی سے اس لئے تیار ہوا تھا کہ اسے یہ بتایا گیا تھا کہ امیر زنگی نے ہعلبک پر قبضہ کے وقت عوام کو ”عیسائی پادریوں پر بڑا ظلم کیا تھا۔ یہ الزام قطعی غلط تھا یہ دراصل عیسائیوں کا ناقص۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ امیر زنگی اور معین الدین ازک کے درمیان دشمنی کی ایسی راہ بن جائے جو کوشش کے باوجود بھی نہ پائی جاسکے۔

امیر الدین ازک کے اس پروپیگنڈے کا ازک پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور امیر زنگی اور معین الدین کے اختلافات اس قدر بڑھ گئے کہ بعض امیروں کی کوشش کے باوجود دونوں میں کوئی صلح نہ ہو سکی۔ معین الدین ازک نے امیر زنگی کو نچا دکھانے کے لئے بالذون شاہ یرو ظلم سے مطالبہ کیا۔ یہ معاہدہ زبانی تھا جس میں معین الدین ازک نے شاہ یرو ظلم کو پیشکش کی کہ وہ امیر زنگی کو شام کی حدود سے نکال دے تو معین الدین اسے بیس ہزار سالانہ

الہا میں زیادہ دن گھبرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر اب فادر فلپ کا انتظار کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نے سوچا اس وقت سے فائدہ اٹھایا جائے اور خوب جی بھر کے یہاں کے عبادت گاہ کی سیر کر لی جائے۔ بس اسی میں سارا وقت کٹ جاتا ہے۔“

”فادر۔ ایک بات عرض کروں۔؟“

لارنس نے کچھ اس انداز سے کہا کہ ولیم کا دل دھڑکنے لگا۔

”ہاں ہاں کہو۔ تمہیں ہر طرح کی بات کرنے کی اجازت ہے۔ تم تو میرے بیٹے ہو۔“ ولیم نے بھی لارنس کو بھلا وہ دینے کی کوشش کی۔

”فادر۔ میں ایک بار پھر تل باشر جانا چاہتا ہوں۔“ لارنس کا چہرہ بڑا مسکین ہو گیا تھا۔

”زن کوڑی کی یاد بے چین کر رہی ہوگی۔ ضرور جاؤ۔ میں کہتا ہوں آج ہی چلے جاؤ۔“ میرا اکیلے جانا بیکار ہے فادر۔“

ولیم کی چھٹی حس حرکت میں آگئی۔ وہ سمجھ گیا کہ لارنس اسے اپنے ساتھ تل باشر لے جاتا ہے۔ ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ”لارنس اگر تم اپنی سفارش کے لئے مجھے لے جانا چاہتے ہو تو تمہیں اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”نہاں۔ کس طرح فادر؟“ لارنس گھبرا گیا۔

”میرے اطمینان سے جواب دیا۔“ تم فادر فلپ کے عزیز دار ہو مگر ان کی طبیعت کو اسے زیادہ جانتا ہوں۔ اگر تمہارے سامنے میں نے تمہاری سفارش کی تو فادر فلپ بڑبڑائیں گے اور شاید مجھ سے بھی انکار کر دیں۔“

”تو مجھ میں کیا کروں فادر۔ وہ لوگ تو یہاں آ ہی نہیں سکتے۔“ لارنس بہت بے چین ہوا تھا۔

”تمہاں فادر۔ آپ سے کیا پردہ۔ جب سے آپ نے سہارا دیا ہے۔ دل اور بے دیا ہے۔“

”لارنس۔ تمہاری پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“

”میرے بھائی۔ ضرور کیجئے۔ میری زندگی بالکل ویران ہو گئی ہے۔ صرف ایک ہی حل نظر آتا ہے۔“ ولیم نے فکر مند انداز میں کہا۔

”میرا مقصد یہ ہے کہ فادر؟ مجھے بھی بتائیے۔“ ”صورت یہ ہے کہ فادر فلپ“

”میرا مقصد یہ ہے کہ فادر۔ آج ہی ہم دونوں چلتے ہیں وہاں۔“ لارنس کے دل

ادا کرے گا اور بنیاس کا علاقہ بھی اس کے سپرد کر دے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ معین الدین ازدمشق کو بچانے اور امیر زنگی کو شکست دینے کے لئے یروٹلم کا باغیہا پر بھی آمادہ ہو گیا۔ امیر زنگی کو جس وقت ان کی اس ذلیل پیش کش کی اطلاع ملی تو فوراً ”شام سے اپنی فوجیں ہٹالیں تاکہ اس معاہدے کی تکمیل نہ ہو سکے۔ اس طرح زنگی نے اپنے دشمن کو ایک ذلیل معاہدے کی بدنامی سے محفوظ کر دیا۔“

کچھ ہی دنوں کے بعد امیر زنگی نے جعفر کو الہا کی طرف روانہ کیا اور خود ایک جہاز لے کر دیار بکر کے مسلم سرداروں کی سرکوبی کے لئے ادھر چلا۔ یہ مسلم سردار دوسرے سے لڑتے اور اپنا ہی خون بہایا کرتے تھے۔ ان کی خانہ جنگی نے امیر زنگی کو کمزور کر رکھا تھا اور ان پر قابو حاصل کئے بغیر وہ کوئی بڑا محرکہ سر نہ کر سکتا تھا۔

امیر نے دیار بکر کے سرداروں کو ایک ایک کر کے اپنا مطیع بنا لیا اور مقابلہ والوں کو ہمیشہ کے لئے رستے سے ہٹا دیا۔ اس نے کئی شہر فتح کئے اور ان کے نئے نام پر رکھے۔ اپنا یہ پہلو مضبوط کرنے کے بعد اس نے لشکر کو عید کی طرف کوچ کر حکم دیا۔ امیر کے لشکر کی نقل و حرکت اور لڑائیوں کی خبر الہا کے شاہ جوہیلین دم رہی تھیں اور وہ مسلمانوں کی اس خانہ جنگی پر خوب بغلیں بجا رہا تھا۔

دوسری طرف الہا میں جعفر کو اپنی محبوبہ کی تل باشر میں موجودگی کی اطلاع تھی اور وہ تل باشر جانے کے لئے پر تزلزل رہا تھا کہ ایک دن اتفاقاً اس کی لارنس سے رازے مڈبھیز ہو گئی۔ جعفر نے نظریں بچا کے نکل جانے کی کوشش کی مگر لارنس گھبر گیا۔

”فادر ولیم۔ آپ خیریت سے تو ہیں؟“ لارنس نے ولیم کے سر پر پہنچ کے کہا۔ نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی اس لئے ولیم نے پلٹ کر بوے خندہ پیشانی سے اسے آمید کہا۔ ”کو لارنس کیا حال ہے۔ تمہاری ترن کوڑی کب آ رہی ہے؟“

”ترن کوڑی کے نام پر لارنس کھل اٹھا۔“ فادر۔ ترن کوڑی تو آپ کی سفارش مجھے ملے گی۔“

”مگر وہ ہے کہاں؟“ ولیم نے انجان بننے ہوئے کہا۔ ”کیا اب تک نہیں آئی؟“

”نہیں فادر۔ مجھے اس کی کوئی خبر نہیں ملی۔“ لارنس افسردہ سا ہو گیا۔

اس دن کے بعد سے مجھے اپنا دیدار ہی نہیں کرایا۔ میں ہر اتوار کو آپ کا اٹنا ہوں۔“

”لارنس۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہاری طرف نہیں آسکا۔“ ولیم نے فوراً اپنے

میں لڈو پھونٹے گئے۔

”پھر وہی بچپنا لارنس - میں کہہ چکا ہوں کہ تمہیں دیکھتے ہی فادر فلپ بھڑک اگے اور سارا کام بگڑ جائے گا۔“

ولیم نے اتنے سخت لہجے میں کہا کہ لارنس سسم گیا۔

”پھر کیا ہو گا فادر - کون ملے گا فادر سے؟“ لارنس پر پھر گھبرٹ طاری ہو گئی۔

”میں نے تمہیں بیٹا کہا ہے لارنس - مجھ پر اعتماد رکھو۔“ ولیم نرم ہو گیا۔

”آپ پر تو مجھے اعتماد ہے فادر لیکن لارنس کہتے کہتے رک گیا۔“

”لیکن پھر کون فادر فلپ سے ملے گا۔ یہی کہنا چاہتے ہو؟“

”ہاں فادر۔۔۔۔۔“ اور لارنس خالی خالی نظروں سے ولیم کو دیکھنے لگا۔

”میں فادر فلپ سے ملوں گا۔ ولیم تمہارے لئے تل باشر جائے گا۔“ ولیم نے ہاتھ

یقین سے کہا۔

”آپ - فادر آپ - آپ میرے لئے تل باشر کا سفر کریں گے؟“ لارنس کو یقین

آ رہا تھا۔

”دیکھو لارنس - میں منہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکالتا جسے پورا نہ کر سکوں۔“

نے اعتماد سے کہا۔ ”میں خود تل باشر جاؤں گا۔ فادر فلپ سے تمہارے لئے ترن کوڑا

رشتہ مانگوں گا اور ان کی رضامندی حاصل کر کے الہا واپس آؤں گا۔“

”فادر - کیا آپ کو یقین ہے کہ فادر فلپ آپ کی بات مان جائیں گے۔“ لارنس

دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”لارنس - اس بے ثبات دنیا میں کوئی بات یقینی نہیں ہوتی۔“ ولیم نے کسی

پادری کا جملہ دہرایا۔ ”دیکھ بچو۔ اس جہاں فانی میں صرف وہی بات یقینی ہے جس کا ہم

وند یسوع مسیح کی طرف دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہر بات جھوٹی ہے۔ تم جھوٹے ہو۔“

جھوٹا ہوں - ساری دنیا جھوٹی ہے۔“

”بے شک فادر - آپ صحیح فرما رہے ہیں۔“ لارنس نے عقیدت سے سر جھکا دیا۔

آپ کب تک تشریف لئے جا رہے ہیں تل باشر؟“ لارنس کے تودل سے نکلی ہوئی تھی۔

”میں آج۔۔۔۔۔ آج نہیں تو کل ضرور روانہ ہو جاؤں گا۔ مگر لارنس

ایک بات کا خیال رکھنا ہو گا۔“

”فادر فلپ کو یہ نہ معلوم ہوتا چاہئے کہ تم مجھ سے مل چکے ہو۔“ ولیم نے تاکید

لارنس نے حیرت سے ولیم کو دیکھا۔ ”فادر جب آپ فادر فلپ کو یہ نہیں بتائیں

میں لڈو پھونٹے گئے۔

”پھر وہی بچپنا لارنس - میں کہہ چکا ہوں کہ تمہیں دیکھتے ہی فادر فلپ بھڑک اگے اور سارا کام بگڑ جائے گا۔“

ولیم نے اتنے سخت لہجے میں کہا کہ لارنس سسم گیا۔

”پھر کیا ہو گا فادر - کون ملے گا فادر سے؟“ لارنس پر پھر گھبرٹ طاری ہو گئی۔

”میں نے تمہیں بیٹا کہا ہے لارنس - مجھ پر اعتماد رکھو۔“ ولیم نرم ہو گیا۔

”آپ پر تو مجھے اعتماد ہے فادر لیکن لارنس کہتے کہتے رک گیا۔“

”لیکن پھر کون فادر فلپ سے ملے گا۔ یہی کہنا چاہتے ہو؟“

”ہاں فادر۔۔۔۔۔“ اور لارنس خالی خالی نظروں سے ولیم کو دیکھنے لگا۔

”میں فادر فلپ سے ملوں گا۔ ولیم تمہارے لئے تل باشر جائے گا۔“ ولیم نے ہاتھ

یقین سے کہا۔

”آپ - فادر آپ - آپ میرے لئے تل باشر کا سفر کریں گے؟“ لارنس کو یقین

آ رہا تھا۔

”دیکھو لارنس - میں منہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکالتا جسے پورا نہ کر سکوں۔“

نے اعتماد سے کہا۔ ”میں خود تل باشر جاؤں گا۔ فادر فلپ سے تمہارے لئے ترن کوڑا

رشتہ مانگوں گا اور ان کی رضامندی حاصل کر کے الہا واپس آؤں گا۔“

”فادر - کیا آپ کو یقین ہے کہ فادر فلپ آپ کی بات مان جائیں گے۔“ لارنس

دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”لارنس - اس بے ثبات دنیا میں کوئی بات یقینی نہیں ہوتی۔“ ولیم نے کسی

پادری کا جملہ دہرایا۔ ”دیکھ بچو۔ اس جہاں فانی میں صرف وہی بات یقینی ہے جس کا ہم

وند یسوع مسیح کی طرف دیا جائے۔ اس کے علاوہ ہر بات جھوٹی ہے۔ تم جھوٹے ہو۔“

جھوٹا ہوں - ساری دنیا جھوٹی ہے۔“

”بے شک فادر - آپ صحیح فرما رہے ہیں۔“ لارنس نے عقیدت سے سر جھکا دیا۔

آپ کب تک تشریف لئے جا رہے ہیں تل باشر؟“ لارنس کے تودل سے نکلی ہوئی تھی۔

”میں آج۔۔۔۔۔ آج نہیں تو کل ضرور روانہ ہو جاؤں گا۔ مگر لارنس

ایک بات کا خیال رکھنا ہو گا۔“

”فادر فلپ کو یہ نہ معلوم ہوتا چاہئے کہ تم مجھ سے مل چکے ہو۔“ ولیم نے تاکید

لارنس نے حیرت سے ولیم کو دیکھا۔ ”فادر جب آپ فادر فلپ کو یہ نہیں بتائیں

میں لڈو پھونٹے گئے۔



باتوں سے سرشار اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ ولیم انیس روز پر پھر چل رہا تھا جن سے گزر کر وہ الہا پہنچا تھا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ جب اس لارنس کو پہلی بار قافلے کے ساتھ سفر کرتے دیکھا تھا تو اسی وقت اس سے کیوں نہ ملے لیکن ہر بات انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی اور جب انسان حالات سے مجبور ہو جاتا اس وقت خدائے واحد پر اس کا ایمان اور پختہ ہو جاتا ہے۔ گردش کے جتنے دن اس تقدیر میں لکھے تھے وہ پورے ہی ہوتا تھے۔

قافلہ تل باشر میں داخل ہوا تو ولیم نے تقدیر کا ایک اور تماشا دیکھا۔ ترن کوزی کے سامنے اس طرح آگئی جیسے اسے ولیم کے آنے کی خبر پہلے ہی مل گئی ہو۔ ترن کوزی سڑک پر چل رہی تھی جس پر ولیم کا قافلہ رواں تھا۔ ان کے درمیان پانچ گز سے فاصلہ نہ تھا۔ ولیم کا دل سینے میں اچھلنے لگا۔ وہ واقعی ترن کوزی ہی تھی۔ وہی رفتار۔ وہی سنجیدگی اور پہلے جیسی من موہنی صورت اتنے دنوں میں ترن کوزی میں کوئی فرق پڑا تھا۔ ترن کوزی اپنی دھن میں آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ محبوب اس کے اس قدر قریب ہے۔ ولیم بے قابو ہوا جا رہا تھا مگر قافلہ چھوڑی کر سے سڑک پر گفتگو کرنا ہزاروں شے پیدا کر سکتا تھا۔ اس لئے وہ صبر کئے رہا۔

قافلہ شہر کے درمیان آچکا تھا۔ دنوں طرف اونچی اونچی خوبصورت عمارتیں تھیں ولیم اس وقت کسی اور ہی عالم میں تھا اس کی نظر ترن کوزی پر نہ نہ ہتی تھی کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر قافلہ ایک بڑے کلیہ (گرجا) کے سامنے پہنچا۔ ”اس عبادت گاہ کا کیا نام ہے؟“ ولیم نے ساتھ چلنے والے ایک ساتھ سے پوچھا۔ ”اس عبادت گاہ کا کیا نام ہے؟“ ولیم نے ساتھ چلنے والے ایک ساتھ سے پوچھا۔ ”اس عبادت گاہ کا کیا نام ہے؟“ ولیم نے ساتھ چلنے والے ایک ساتھ سے پوچھا۔ ”اس عبادت گاہ کا کیا نام ہے؟“ ولیم نے ساتھ چلنے والے ایک ساتھ سے پوچھا۔

”اجنبی ہے۔“ اور پھر جب اس کے ساتھی نے کلیہ کا نام بتایا تو فادر ولیم کے قدم اک د گئے۔ اس کے ساتھ چلنے والا بھی وہیں رک گیا۔ ”کیا ہوا فادر۔ آپ شہر کیوں آئے؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”مجھے اسی کلیہ میں جانا ہے بیٹا۔“ ولیم نے جلدی سے کہا۔ ”الہا میں مجھے بتایا گیا تھا۔“

اسی وقت ولیم نے دیکھا کہ ترن کوزی سڑک چھوڑ کر اس پگڈنڈی پر ہو گئی۔ کلیہ کی طرف جاتی ہے۔ فادر ولیم نے پلٹ کے اپنے ساتھی سے کہا۔ ”پہنچا۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

”خداوند کی تم پر برکتیں ہوں۔“

جاؤ گی۔“

”مجھے اس کی پروا نہیں۔“ پھر سنبھل کے بولی۔ ”فادر ولیم یہ جگہ زیادہ باتیں کرنا“

نہیں۔ میں تمہیں اپنی ایک سیلی کے پاس لئے چلتی ہوں وہاں بیٹھ کے بات کر رہے ہوں۔

ترین کوڑی نے اپنا رخ موڑ لیا۔ اب وہ کلیسہ کے بجائے شہر کی سڑک کی طرف راہ

آری بھی اور فادر ولیم اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

ترن لوزی۔ ”ویم لے پتے ہوئے اسے محاط کیا۔“

چلتے ہوئے کہا۔

جعفر کے دل میں جذبات کا طوفان اٹھ رہا تھا مگر اسے خاموش ہونا پڑا۔ اس کے

تل باشر کا خوبصورت شہر بکھرا ہوا تھا۔ عالیشان عمارتیں۔ جگہ جگہ پھولوں اور پھلوں۔

لہے ہوئے باغات خنک ہوا کے جھونکے اس کے دل و دماغ میں بالیدگی پیدا کر رہے تھے۔

مر: سرگدشت کے اس سن سے کوئی حد نہ اٹھاسکا۔ اسے پچھ اس سال کا نوران اور  
کا قیمت کا۔ تران کو زی اس کے ساتھ ساتھ چلا رہا تھا اور جعفر کو ایک عجب قسم

کیف محسوس ہو رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کتنی دیر چلتا رہا کہ ترن کوزی کے قدم ایک مکان۔

سامنے رک گئے۔

جعفر اس کا منہ دیکھنے لگا۔

”یہ میری بیٹی کا ہر ہے اور تم یہاں قادر ویم اور صرف قادر ویم بن گئے۔“

”اچھا نیک بیٹی۔ تم جیسا کہ رہی ہو ویسا ہی ہوگا۔“ اور جعفر مسکراتے لگا۔

”مذاق کا وقت نہیں ہے جعفر“ ترن کوڑی نے اسے پیار سے جھڑکا۔ ”میں نہیں بیا

کے حالات کا علم نہیں۔ اگر کسی کو شبہ ہو گیا کہ تم مسلمان ہو تو تمہارے ہم کے

”ہو جائیں گے۔“

کتابت ہو کر اس کی تصدیق فرمائی۔

”خاموش۔“ ترن کوزی نے اسے پھر ڈانٹا۔

دوسرے ہی لمحے ترن کوزی نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ

خوبصورت سی دوشیزہ نے باہر جھانکا۔

ترن لوزی کے بعد جب اس کی بھرپور ویم پر پڑی تو وہ سووب ہوئی



”انہوں نے انکار کر دیا تو۔۔۔۔۔؟“

”وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ میں ان کی بیٹی ہوں۔ پایا میرا دل نہ توڑیں گے۔“

”ٹھیک ہے تم بات کر کے دیکھ لو۔ میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔“

”تم رہو گے کہاں۔ کس جگہ ٹھہرے ہو؟“

”میں قافلہ چھوڑ کے تمہارے پیچھے آگیا ہوں کسی بھی عبادت گاہ میں رہ جاؤں گا۔“

”تم اس جگہ کیوں نہیں رہ جاتے۔“ ترن کوڑی نے مشورہ دیا۔

”کس جگہ؟“ جعفر نے حیرانی سے پوچھا۔

”اس گھر میں۔ ششی کے ساتھ۔ تم اس کی خوبصورتی کے قائل بھی ہو۔“

کوڑی مسکرا دی۔

اسی وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ ترن کوڑی بولی۔ ”لو وہ آگئی۔ اس سے پوچھو۔“

ہوں۔“

جعفر گھبرا گیا۔ ”میرے سامنے؟“

”ہاں۔ ششی میری راز دار ہے اور قابل اعتماد بھی۔“

ششی آگے آگے اور اس کے پیچھے بوڑھی ملازمہ شیشے کی صراحی اور دو گلاس لے کر آئی۔

فادر۔ تل باشر کے انگور دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ میں تازہ رس نکال لائی ہوں۔ پیو۔

تو ایمان تازہ ہو جائے گا۔“ ششی کا انداز بڑا شوخ تھا۔

”فادر کا ایمان تم پہلے ہی تازہ کر چکی ہو ششی۔“ ترن کوڑی نے ہنسنے ہوئے طنز کیا

ششی اسے گھور کر رہ گئی۔ ترن کوڑی نے اسی وقت ششی کو کچھ اشارہ کیا اور

نے ملازمہ کو فوراً رخصت کر دیا۔ ”کیا کوئی خاص بات ہے؟“ ششی نے راز داری۔

پوچھا۔

”بہت بڑی خاص بات۔ بیٹھ جاؤ تسلی سے۔“

”ششی تمہیں لارنس کا جھگڑا یاد ہے۔؟“ ترن کوڑی نے بات شروع کی

”ہاں یاد ہے۔ بڑا ہی ذلیل انسان ہے وہ۔“ ششی نے منہ ہٹا کے جواب دیا۔

”اس نے مجھ پر کیا الزام لگایا تھا۔؟“

”الزام! ششی نے حیرت سے ترن کوڑی کو دیکھا پھر اس کی نظریں فادر ولیم کی طرف

اٹھ گئی۔

”تم فادر ولیم کی فکر نہ کرو۔ میں نے انہیں تمام حالات سے آگاہ کر دیا ہے۔“

ششی کو حوصلہ دیا۔

فادر ولیم نے کیا مشورہ دیا تمہیں۔؟“ ششی کی آنکھیں پھر شوخی سے چمک

نہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم میری بات کا جواب دو؟“

اور ولیم کے سامنے صاف صاف کہہ دو؟“ ششی کی ہنسی چھوٹی پڑتی تھی۔

ہاں کہہ دو۔ ڈرتی کیوں ہو؟“

س نے بھری محفل میں کہا تھا کہ تم یعنی ترن کوڑی ایک جوان سے محبت کرتی

لینے ہوئے ششی شرما گئی۔

بات میری ہو رہی ہے اور شرم تجھے آرہی ہے۔ لارنس نے اس کا نام کیا بتایا

سوچنے لگی۔ ”ہاں یاد آیا۔ جعفر۔ کوئی مسلمان جوان ہے۔“

میں نے جعفر کے بارے میں تم سے کیا کہا تھا؟“

بوکھلا گئی۔ ”ترن کوڑی شرم کرو۔ میری بات کا جواب دو۔“

نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ”تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تم جعفر کی ہو اور ہمیشہ اسی

آئی ہو جعفر کا کیا ہوا؟“

را۔؟“ ششی گھبرا گئی۔ ”اسے کچھ ہو گیا کیا؟“

پاگل ہو گیا ہے۔“

اے ارے کب کیسے۔؟“ اور ششی نے جلدی جلدی انگلیوں سے سننے پر میلیب

لینے آیا ہے۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے؟

یک کتنی ہو ترن کوڑی۔ اگر پاگل نہ ہوتا تو ایک عیسائی ریاست میں تمہیں لینے

کی لئے تو عشق کو جنون اور پاگل پن کہتے ہیں۔“ ششی نے ایک ٹھنڈی سانس

لئی بھولی بھری بات یاد آگئی ہو۔

تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں؟“

یک لہر سوچ کے بولی۔ پاگل کے ساتھ پاگل بن جاؤ۔ خوب گزرے گی۔“

لب ہے تمہارے؟“

”صاف ہے۔ اگر تمہارے دل میں جعفر کے لئے پہلی جیسی محبت ہے تو اس

نفاقت اور فتوحات نے اسے الہا میں قید کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ امیر زنگی کی شاطرانہ سازش سے ہر وقت خائف رہتا تھا۔ یوں بھی الہا شالی علاقوں میں عیسائیوں کی مضبوط ترین قلعہ بنی اس لئے وہ کئی موسم گرما الہا سے باہر نہ نکل سکا تھا۔ اسے جس وقت معلوم ہوا کہ امیر زنگی اپنے لشکر کے ساتھ موصل سے دیار بکر گیا ہے اور اب عید کے قلعہ کا محاصرہ کر رہا ہے تو اس کی طبیعت تل باشر جانے کے لئے بے چین ہو گئی۔

شاہ جو سیلین نے امیر زنگی کی مصروفیت سے فائدہ اٹھایا۔ الہا اس نے کالدی اور ہاجوں کے حوالے کیا اور اپنا خاص لشکر لے کر تل باشر کی طرف چلا۔ اس نے اپنی فوج کو چھٹی دے دی۔ یہ عارضی فوج دراصل بیگار میں پکڑی جاتی تھی۔ جسے سال بھر تک سوائے روٹی کپڑے کے کوئی مستقل تنخواہ نہ ملتی تھی۔ اس نے بھی بادشاہ کی اس حکمت کا سانس لیا اور اپنے گھروں کو روانہ ہو گئی۔ شاہ نے تل باشر کے گورنر کو اپنی اطلاع دے دی تھی اور تل باشر میں اس کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئی۔ تل باشر والے اپنے شاہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے بے چین تھے کیونکہ شاہ کے تل آنے سے شہر کی رونق میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ دکانداروں کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جشن کا سماں محسوس ہوتا تھا۔

شہنشاہ نے واپس آکر ترن کوزی کو بڑی مسرت سے بتایا۔ ”کچھ سنا تم نے ترن کوزی؟“ ”نہیں۔ کیا خبر ہے۔ تمہارا چہرہ تو خوشی سے دمک رہا ہے۔“ ترن کوزی نے اسے تعجب سے دیکھا۔

”تل خوشی ہی کی ہے۔“ شہنشاہ نے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ”اپنے شاہ ہیں نا۔ شاہ معظم بادشاہ۔ وہ تل باشر تشریف لارہے ہیں۔“

”اچھا۔ واقعی!“ ترن کوزی بھی جھوم اٹھی۔ ”اب تو تل باشر میں روز جشن ہوا ہے۔“

”اچھے می بتانے آئی تھیں۔ آج کا دن کتنا اچھا ہے۔ تمہارے دل کی مراد بھی پوری ہو رہی ہے اور تل باشر والوں کے بھی مزے ہو گئے۔“

”اچھا۔ میں چلی۔“ ترن کوزی کھڑی ہو گئی۔ ”میں پایا سے بات کرنے جا رہی ہوں۔“

”خفا رکھنا۔“

”ترن کوزی نے اس ادا سے فادر ولیم کی طرف دیکھا کہ شہنشاہ حیران رہ گئی۔

”کون کا خیال؟“ شہنشاہ پچھی پچھی نظروں سے ترن کوزی کو دیکھ رہی تھی۔

”خفا رکھنا شہنشاہ۔ میں تمہارے سپرد کر کے جا رہی ہوں انہیں۔“ پھر ترن

موقعہ سے فائدہ اٹھاؤ اور چپکے سے اس کے ساتھ نکل جاؤ۔“ شہنشاہ نے بڑے غلوں سے مشورہ دیا۔

”یعنی پایا کو بغیر بتائے چلی جاؤں!“

”فادر قلب کو بتانے میں کیا حرج ہے۔ انہوں نے تو تمہیں پہلے ہی اجازت دے دی تھی۔“ شہنشاہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”تمہاری رائے ہے کہ جعفر کے ساتھ چلی جاؤں؟“

”بالکل۔ اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔“ شہنشاہ نے زور دے کے کہا۔ ”جعفر جان پر کھیل کے تمہارے پاس آسکتا ہے تو پھر تمہارے لئے اس سے بہتر موقعہ نہیں مل سکتا۔“

”کو تو فادر ولیم سے مشورہ کر لیا جائے؟“ ترن کوزی نے مسکرا کے فادر ولیم کی طرف دیکھا۔

جعفر نہایت خاموشی سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے چونک کے ترن کوزی کی طرف دیکھا۔ شہنشاہ کو ترن کوزی کی بات پر بڑی حیرت ہوئی۔ فادر ولیم کی شخصیت اس کے پاس اسرار بنتی جا رہی تھی۔

شہنشاہ کچھ کہنے والی تھی کہ فادر ولیم نے ہنس کے کہا۔ ”دو دلوں کو ملانا بڑا بکا ہے۔ میں شہنشاہ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔“

شہنشاہ نے اس میں ایک اور ٹکڑا لگایا۔ ”ترن کوزی۔ اب تمہیں کوئی اعتراض چاہئے۔ فادر ولیم نے بھی میری تائید کر دی ہے۔ اگر کو تو میں بھی تمہارے ساتھ فادر قلب میرا بڑا لحاظ کرتے ہیں اگر انہوں نے انکار کی کوشش کی تو میں انہیں خدا رضا مند کر لوں گی۔“

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ سب خاموش ہو گئے۔ شہنشاہ نے آہ دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی باہر اس کی ماں کھڑی تھی۔

”شہنشاہ مبارک ہو۔ ہمارے شاہ جو سیلین دوم۔ تل باشر تشریف لارہے ہیں۔“

شہنشاہ کی ماں نے نویہ مسرت سنائی۔ شہنشاہ بھی اس خبر سے خوش ہو گئی۔

تل باشر ریاست الہا کا گرمیوں کا صدر مقام تھا۔ یہاں کے دلفریب اور نظر زار اور خوشگوار آب و ہوا شاہ جو سیلین کو اکثر یہاں کھینچ لاتی تھی۔ شاہ جو سیلین ہونے کے باوجود عشرت پسند واقع ہوا تھا اور الہا کی سخت اور پہاڑی زندگی سے

بیشہ کسی گوش عافیت و عشرت کی تلاش میں رہتا تھا لیکن موصل کے امیر عماد اللہ

کوزی نے فادر ولیم کی طرف دیکھا۔ ”فادر ولیم یعنی جعفر۔ تم میری سیلی پر پورا اٹھو سکتے ہو۔ جب تک میں واپس نہ آؤں تم کہیں جانے کی کوشش نہ کرنا۔“

ترن کوزی تو یہ انکشاف کر کے کمرے سے نکل گئی اور ششی کی نظریں فادر ولیم چہرے سے نہ ہٹتی تھیں۔ فادر ولیم جو کچھ دیر پہلے چمک چمک کے باتیں کر رہا تھا اس وقت بہت خاموش اور فکر مند سا نظر آ رہا تھا۔ ششی کو خیال ہوا کہ جعفر اپنا راز کھل جائے وجہ سے کچھ پریشان ہو گیا ہے۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا جعفر واقعی بڑے کمال آدمی ہو مجھے کیا پتا تھا کہ پادری کے اس بزرگ چہرے کے پیچھے ایک اور بھی چہرہ ہے اب فکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم میرے اور میرے گھر والوں کے لئے فادر ولیم بن گے۔ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے مگر میں اپنی سیلی کا راز نہ کھلے دوں گی۔ ”مجھے تم پر اعتماد ہے ششی۔“ جعفر مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو گیا۔

”میں ابھی تمہارے لئے ناشتے وغیرہ کا انتظام کرتی ہوں۔“ اور ششی اٹھ کر باہر گئی۔

ادھر جعفر کے دل میں پتکے لگے ہوئے تھے۔ اسے کسی پہلو چین نہ آ رہا تھا۔ جو سیلین کے آنے کی خبر اس پر بجلی بن کر گری تھی۔ وہ الہا سے چند روز کے لئے آیا کہ ترن کوزی کا پتہ لگائے اور ملاقات ہو تو اس سے تجدید عشق کرے مگر اب اس کا عشق رفقہ ہو گیا تھا۔ جعفر کو یوں محسوس ہوا جیسے امیر زندگی اس کے سامنے کھڑا ہے کہ اوٹنک حرام تھے الہا اس لئے بھیجا گیا تھا کہ تو وہاں کے حالات سے برابر مطلع رہے مگر تو ایک لڑکی کے عشق میں اپنا فرض بھی بھول گیا۔ الہا کی مضبوط چوکی! حکمران سے خالی ہو رہی ہے اور تو اپنی محبوبہ سے شادی رچانے کی فکر میں ہے۔ تجھے ار اندازہ نہیں کہ جو سیلین کی الہا سے غیر موجودگی کی خبر تیرے امیر کے لئے کس قدر آسند ہو سکتی ہے۔ اپنے کو دیکھ اور فرض کو پہچان۔ ترن کوزی چھوٹ کے پھر مل سکتی مگر الہا دوبارہ خالی نہیں رہ سکتا۔ فوراً امیر کے پاس جا اور کہہ کہ اے امیر وہ وقت جس کا مسلمان پورے ایک سو سال سے انتظار کر رہے تھے۔ سو سال پہلے عیسائیوں الہا کی مسلم ریاست پر قبضہ کر کے مسلمانوں کا جس بیدردی سے خون بہایا تھا۔ اس انتقام کا وقت آگیا۔ آج الہہ امیں کوئی مسجد نہیں۔ کوئی اسلامی مدرسہ نہیں کوئی خانہ نہیں۔ کہیں سے اللہ اکبر کی صدا بلند نہیں ہوتی۔ الہا کی مٹی میں دبی ہوئی مسلمانوں بڑیاں تیرے امیر کو آواز دے رہی ہیں۔

جعفر کو جذبات اور خیالات کا طوفان گھیرے ہوئے تھا۔ ایک طرف ترن کوزی

اس کے چہروں سے لپٹی جا رہی تھی تو دوسری طرف فرض کی پکار اس کے دل و دماغ رہے چلا رہی تھی۔ جعفر نے سر کو زور سے جھٹکا دیا اور ترن کوزی کی محبت کو کھینچا کر اہوا۔ اس نے سوچا کہ دنیا اور دنیا والوں کی محبت تو آئی جانی چیز ہے۔ اس سے اہارت پر دیوار بنانے کے مترادف ہے۔ وقت لوٹ کر نہیں آیا کرتا اور نہ کسی کا رتا ہے۔ اس نے یہ موقعہ گنوا دیا تو عمر بھر پچھتائے گا۔ اس کا ضمیر ہمیشہ ملامت کرتا اس کی آنکھ اپنے امیر کے سامنے کبھی نہ اٹھ سکے گی۔

بظاہر پادریوں والا چونچہ سنبھالتا دروازے کے پاس گیا دروازہ ذرا کھول کر باہر جھانکا اس کا ناشتہ لئے آ رہی تھی اب ناشتہ کئے بغیر اس کا باہر نکلتا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ مگر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ ششی نے اندر آکر ناشتہ اس کے سامنے رکھ دیا اور جعفر رہا کرنے لگا۔

جعفر۔ ”ششی نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ”ترن کوزی بڑی خوش ہے۔ اس نے ہمیں اک بار کھو کر پھر لیا ہے عشق کے خارزار میں ایسی مثالیں ملتی ہیں۔“

لیک کہہ رہی ہو ششی۔ ”جعفر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”عشق کی دنیا خار ہے اور گل و گلزار بھی۔ مگر اس دنیا میں کسی چیز کو قرار نہیں۔ دو دل ملتے ہیں پھر نہیں ملتے اور پھر مل جاتے ہیں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اپنی پہنچتے ہیں۔“

فکر تو اپنی منزل کو پہنچ گئے ہو جعفر۔ اب فکر کی کیا ضرورت ہے؟۔

ششی منزل اکثر دھوکہ بھی دے جاتی ہے کیا پتہ جسے ہم منزل سمجھ رہے ہیں وہ بھی اب ہو اور وقت ہمیں ایک بار پھر جدا کر دے۔ یہ جعفر کے دل سے اٹھنے والی بات تھی۔

پشیمان نہ ہو جعفر۔ فادر قلب اپنی پیاری بیٹی کا دل نہ توڑیں گے وہ ہمیں ضرور ملے گی نے اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

ترن نے ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کھڑا ہو گیا ششی گھبرا گئی۔ ”کیا کہیں جانے کا ہے؟“

دل سے اپنے اختیار میں نہیں ہوتے ششی۔ ”جعفر کا دل آنسو بہا رہا تھا۔ میں ذرا ٹک جا رہا ہوں۔ میرے ساتھی میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں مطمئن کر کے لے آؤں گا۔“

”زیادہ انتظار نہ دکھانا۔ ترن کوڑی کا دل کمزور ہے۔“

”تم اس کے دل مضبوط رکھنا ششی۔ اس کی محبت میرے دل سے کسی حالت میں نہ نکل سکے گی۔“ اور جعفر دروازے سے نکل گیا۔

جعفر سیدھا سرائے پہنچا۔ وہاں شاہ جو سیلین کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا اور ہر طرف استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جعفر کو معلوم ہوا کہ شاہ جو سیلین آج شام یا کل تک باشر پہنچ جائے گا۔ اس کے لئے ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل چاہتا تھا۔ سرائے کے مالک سے معلومات حاصل کرنے جعفر گیا تو اسے بتایا گیا کہ ایک قافلہ اسی قوت الہا روانہ ہو رہا ہے۔ جعفر الہا سے آج ہی واپس آیا تھا۔ وہ الہا واپس جانا چاہتا تھا مگر یہاں سے نکلنے کا صرف یہی راستہ تھا کہ وہ اس قافلے میں شامل ہو جائے۔ جعفر نے لمحوں میں فیصلہ کیا اور اب وہ پھر قافلے کے ساتھ الہا واپس جا رہا تھا الہا والے اس قافلے کو پہلی منزل سے پہلے ہی رکنا پڑا۔ پورے راستے پر شاہ جو سیلین کے دل دستے پھیلے ہوتے تھے۔ شاہ کا جلوس ان کے پیچھے تھا۔ قافلے کو راستہ چھوڑ کے اس طرف قیام کرنا پڑا۔ شام کے وقت شاہی جلوس نمودار ہوا۔ ذرق برق لباس میں شاہی با

گارد شاہی پرچم اٹھائے چل رہے تھے۔ اس کے عقب میں چار گھوڑوں والا شاہی رتھ سونے کے پتر چڑھے تھے اور گھوڑوں کے ساز پر سونے چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔ شاہ جو رتھ میں بیٹھا تھا۔ دونوں طرف ہندوان پر اس کے مشہور جنرل تلواریں بلند کئے کھڑے تھے۔ پورے رتھ پر ایک بڑا چتر سائیہ کئے ہوئے تھے۔ شاہی بیگمات کی سواریاں اس پیچھے تھیں اور پھر چاق و چوبند وہ گھوڑ سوار فوج تھی جس پر شاہ جو سیلین کو بڑا ناز تھا۔ جعفر یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ شاہ گرمیاں گزار

تل باشر آ رہا ہے۔ مگر اس وقت اس کے ساتھ الہا میں موجود تمام بہترین فوج تھی اور معلوم ہوا تھا کہ شاہ تفریح کرنے کے بجائے کوئی قلعہ سر کرنے جا رہا ہے۔ جعفر کے ساتھ الہا کے بہت سے قدیم باشندے تھے جن کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ شاہ جو سیلین ایک ہفتے کے لئے بھی الہا سے باہر جاتا ہے تو اپنے ساتھ تمام بہترین فوج کو بھی لے

تھا تاہم نہیں اس کی دور اندیشی تھی یا حماقت یا پھر اسے اپنی فوج پر اعتقاد نہ تھا بہر حال اس کے لئے یہ معلومات اور زیادہ مفید ثابت ہوئیں پھر جب جلوس گزرنے کے بعد الہا قافلے کو روانگی کی اجازت ملی تو جعفر اس قافلے کو چھوڑ چکا تھا۔ اس کا رخ قلعہ

طرف تھا جہاں اس کا امیر محاصرہ کئے پڑا تھا۔ جعفر رات دن سفر کرتا ہوا بڑی تیزی سے عید کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جعفر نے اپنے دل سے یہ سوچا کہ شاہ جو سیلین کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا اور ہر طرف استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جعفر کو معلوم ہوا کہ شاہ جو سیلین آج شام یا کل تک باشر پہنچ جائے گا۔ اس کے لئے ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل چاہتا تھا۔ سرائے کے مالک سے معلومات حاصل کرنے جعفر گیا تو اسے بتایا گیا کہ ایک قافلہ اسی قوت الہا روانہ ہو رہا ہے۔ جعفر الہا سے آج ہی واپس آیا تھا۔ وہ الہا واپس جانا چاہتا تھا مگر یہاں سے نکلنے کا صرف یہی راستہ تھا کہ وہ اس قافلے میں شامل ہو جائے۔ جعفر نے لمحوں میں فیصلہ کیا اور اب وہ پھر قافلے کے ساتھ الہا واپس جا رہا تھا الہا والے اس قافلے کو پہلی منزل سے پہلے ہی رکنا پڑا۔ پورے راستے پر شاہ جو سیلین کے دل دستے پھیلے ہوتے تھے۔ شاہ کا جلوس ان کے پیچھے تھا۔ قافلے کو راستہ چھوڑ کے اس طرف قیام کرنا پڑا۔ شام کے وقت شاہی جلوس نمودار ہوا۔ ذرق برق لباس میں شاہی با

گارد شاہی پرچم اٹھائے چل رہے تھے۔ اس کے عقب میں چار گھوڑوں والا شاہی رتھ سونے کے پتر چڑھے تھے اور گھوڑوں کے ساز پر سونے چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔ شاہ جو رتھ میں بیٹھا تھا۔ دونوں طرف ہندوان پر اس کے مشہور جنرل تلواریں بلند کئے کھڑے تھے۔ پورے رتھ پر ایک بڑا چتر سائیہ کئے ہوئے تھے۔ شاہی بیگمات کی سواریاں اس پیچھے تھیں اور پھر چاق و چوبند وہ گھوڑ سوار فوج تھی جس پر شاہ جو سیلین کو بڑا ناز تھا۔ جعفر یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ شاہ گرمیاں گزار

تل باشر آ رہا ہے۔ مگر اس وقت اس کے ساتھ الہا میں موجود تمام بہترین فوج تھی اور معلوم ہوا تھا کہ شاہ تفریح کرنے کے بجائے کوئی قلعہ سر کرنے جا رہا ہے۔ جعفر کے ساتھ الہا کے بہت سے قدیم باشندے تھے جن کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ شاہ جو سیلین ایک ہفتے کے لئے بھی الہا سے باہر جاتا ہے تو اپنے ساتھ تمام بہترین فوج کو بھی لے

تھا تاہم نہیں اس کی دور اندیشی تھی یا حماقت یا پھر اسے اپنی فوج پر اعتقاد نہ تھا بہر حال اس کے لئے یہ معلومات اور زیادہ مفید ثابت ہوئیں پھر جب جلوس گزرنے کے بعد الہا قافلے کو روانگی کی اجازت ملی تو جعفر اس قافلے کو چھوڑ چکا تھا۔ اس کا رخ قلعہ

طرف تھا جہاں اس کا امیر محاصرہ کئے پڑا تھا۔ جعفر رات دن سفر کرتا ہوا بڑی تیزی سے عید کی طرف بڑھ رہا تھا۔

جعفر نے اپنے دل سے یہ سوچا کہ شاہ جو سیلین کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا اور ہر طرف استقبال کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جعفر کو معلوم ہوا کہ شاہ جو سیلین آج شام یا کل تک باشر پہنچ جائے گا۔ اس کے لئے ایک لمحہ پہاڑ ہو رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل چاہتا تھا۔ سرائے کے مالک سے معلومات حاصل کرنے جعفر گیا تو اسے بتایا گیا کہ ایک قافلہ اسی قوت الہا روانہ ہو رہا ہے۔ جعفر الہا سے آج ہی واپس آیا تھا۔ وہ الہا واپس جانا چاہتا تھا مگر یہاں سے نکلنے کا صرف یہی راستہ تھا کہ وہ اس قافلے میں شامل ہو جائے۔ جعفر نے لمحوں میں فیصلہ کیا اور اب وہ پھر قافلے کے ساتھ الہا واپس جا رہا تھا الہا والے اس قافلے کو پہلی منزل سے پہلے ہی رکنا پڑا۔ پورے راستے پر شاہ جو سیلین کے دل دستے پھیلے ہوتے تھے۔ شاہ کا جلوس ان کے پیچھے تھا۔ قافلے کو راستہ چھوڑ کے اس طرف قیام کرنا پڑا۔ شام کے وقت شاہی جلوس نمودار ہوا۔ ذرق برق لباس میں شاہی با

گارد شاہی پرچم اٹھائے چل رہے تھے۔ اس کے عقب میں چار گھوڑوں والا شاہی رتھ سونے کے پتر چڑھے تھے اور گھوڑوں کے ساز پر سونے چاندی کا کام کیا ہوا تھا۔ شاہ جو رتھ میں بیٹھا تھا۔ دونوں طرف ہندوان پر اس کے مشہور جنرل تلواریں بلند کئے کھڑے تھے۔ پورے رتھ پر ایک بڑا چتر سائیہ کئے ہوئے تھے۔ شاہی بیگمات کی سواریاں اس پیچھے تھیں اور پھر چاق و چوبند وہ گھوڑ سوار فوج تھی جس پر شاہ جو سیلین کو بڑا ناز تھا۔ جعفر یہ منظر بڑی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اسے معلوم ہوا تھا کہ شاہ گرمیاں گزار

امیر زنگی تلواز نیک کے یوں کھڑا ہوا جیسے اسی وقت الہا پر حملہ کر دے گا اور ہوا بھی ایسا ہی۔ امیر زنگی نے اسد الدین شیر کوہ کو خیمے میں طلب کیا اور مسکراتے ہوئے کہا۔  
کہ وقت آگیا ہے کہ حق و باطل کا ایک اور میدان گرم ہوا اور ہم ثابت کریں کہ  
اسلام کچھ دنوں کے لئے زندگ آلود تو ہو سکتی ہے لیکن میٹھس ہوتے ہی اس کی پرانی  
دوباب واپس آ جاتی ہے۔

امیر عماد الدین زنگی جذبات کے طوفان میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ شیر کوہ ہکا بکا کبھی امیر کو  
اور کبھی جعفر کے پر سکون چہرے پر نظریں ڈالتا کچھ دیر پہلے امیر زنگی کی نظروں میں قہر  
ب اگڑایاں لے رہا تھا اور جعفر اس کے سامنے لرزہ بر اندام تھا لیکن اب امیر کی  
دل میں ان دیکھے سنہرے خواب لہرا رہے تھے اور جعفر سکوت کے عالم میں نظریں  
کھڑا تھا۔

ایک مورخ نے لکھا ہے کہ قلعہ عمید کا محاصرہ دراصل امیر زنگی کی ایک فوجی چال  
بظاہر وہ عمید سے عشق کی پیشکشیں بڑھا رہا تھا مگر اس کی نظروں کا اصل مرکز الہا تھا  
اغواب ایک عرصے سے امیر دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ اس موقع سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔  
فری لائی ہوئی اس خبر سے اس قدر خوش ہوا کہ رات کے کھانے پر اس نے جعفر کو  
دستروان پر جگہ دی۔ امیر نے شیر کوہ کو بھی اس راز سے آگاہ کر دیا تھا اور شیر کوہ  
کی انتظامات میں لگ گیا تھا۔

رات کا کھانا معمول کے مطابق ختم ہوا مگر کھانا ختم ہوتے ہی لشکر اسلام میں حرکت  
دگی۔ شمعوں کی مدد سے روشنی میں بڑی تیزی سے خیمہ گاہ کا سارا سامان سمیٹا گیا اور  
شب کے بعد امیر زنگی کا لشکر اپنے خیموں کو قلعہ عمید کے گرد اسی طرح اہستہ  
لہا لہا کی طرف روانہ ہو گیا اس نے الہا جانے کے لئے ایک سخت دشوار گزار راستہ  
کیا اور ان جنگلوں اور بیابانوں میں سفر اختیار کیا جدھر سے شاید انسان کا پہلے گزر بھی  
افلا اس کا لشکر آبادیوں سے بچ کے نکلا تھا اس لئے اس کی نقل و حرکت کی بہت کم  
اہم کی اور جس وقت لوگوں کو علم ہوا تو امیر زنگی کا لشکر الہا کے قلعہ کی فصیلوں  
بہ پہنچ چکا تھا۔

الہا واقعی عیسائیوں کی مضبوط ترین چوکی تھی۔ قلعہ کی فصیلیں اس قدر مضبوط اور بلند  
کہ انہیں توڑنا ناممکن نظر آتا تھا۔ خود امیر زنگی اس خوبصورت شہر کو تباہ نہ کرنا چاہتا  
لے شہر والوں کو پیغام بھیجا کہ قلعہ اس کے حوالہ کر دیا جائے تو کسی کو نہ قتل کیا  
گا اور نہ کسی غارت کو نقصان پہنچے گا مگر ارمنی تاجروں کو قلعہ کی فصیلوں پر پورا

اہم بات ہے جس نے تجھے جیسے حقیر انسان کو امیر کی حکم عدولی پر مجبور کیا۔  
”سردار محترم۔“ جعفر نے سنبھل کے کہا۔ ”میں وہی بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔  
امیر سے اجازت دلائی جائے۔“  
امیر زور سے چیخا۔ ”تیری زبان کس نے پکڑ رکھی ہے کجغت۔ کہ تجھے  
ہے؟“

”مجھے تحلیلہ چاہئے۔ آقاے محترم۔“ جعفر نے نئی درخواست پیش کر دی۔  
اس نئی درخواست پر اسد الدین شیر کوہ چونک پڑا۔ اس نے سرگوشی کی۔ ”جعفر  
کئی اہم خبر لے کے آیا ہے؟“  
”جی ہاں سردار۔ اہم نہیں بلکہ بہت اہم۔“ جعفر نے بھی سرگوشیوں میں جواب  
اسد الدین سر بلاتا ہوا امیر زنگی کے پاس گیا۔ آہستہ آہستہ کچھ گفتگو کی۔ امیر کا  
بھی کم ہو گیا۔ وہ اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اسد الدین جعفر کو ساتھ  
کر امیر کے پاس گیا۔

”اب بتا جعفر۔ تو کیا خبر لایا ہے؟“ امیر نے بے دلی سے کہا۔  
جعفر نے اسد الدین شیر کوہ کی طرف دیکھا۔ امیر زنگی چند لمحے کچھ سوچتا رہا  
کوہ کو اشارہ کیا۔ شیر کوہ خیمے سے باہر چلا گیا۔  
”ہاں جعفر؟“ امیر نے سے تیز نظروں سے دیکھا۔

”اے آقاے محترم۔ الہا اس وقت بالکل خالی ہے۔“ جعفر نے اکتشاف کیا۔  
امیر زنگی اچھل پڑا۔ ”کیا کہا تو نے؟“  
”میں سچ کہہ رہا ہوں امیر۔“ جعفر کو ذرا حوصلہ ہوا۔ ”شاہ جو سیلین اپنے بہترین  
کے ساتھ الہا چھوڑ کر تل باشر کے سبزہ زاروں میں گرمیاں گزارنے گیا ہے۔“  
”جعفر۔ سوچ لے تو کیا کہہ رہا ہے؟“ امیر زنگی بڑی حیرانی سے جعفر کو دیکھ رہا تھا۔  
”میرے آقا۔ میں شاہ کو تل باشر پہنچا کے آپ کے پاس آیا ہوں۔“ جعفر نے  
دھوکے سے کہا۔

”الہا میں کتنی فوج ہے؟“ امیر نے بیتابی سے پوچھا۔  
”صرف عارضی فوج وہاں ہے الہا کا انتظام شاہ نے ارمنی اور کالیدی تاجروں  
حوالے کر دیا ہے۔“

”الہا۔ میرے خوابوں کی تعبیر۔ میری زندگی کا نصب العین۔ الہا اے  
سرزمین۔ میں آ رہا ہوں۔ مجھے اپنا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا محسوس ہو رہا ہے۔“



رح رہا بھیج دیا گیا ہے۔ رہا میں ترن کوزی کا دشمن لارنس بھی موجود تھا۔ ترن  
 جعفری گرفتاری میں لارنس کا ضرور ہاتھ ہے مگر رہا بھیج کے وہ نہ تو  
 اس کے لٹکے رہے بلکہ اس سے بدلہ لے سکی۔ اس کے رہا پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد  
 الدین زنگی کے لشکر نے قلعہ کے محاصرہ کر لیا۔ اس طرح ایک ماہ قلعہ میں محصور  
 لکڑیوں کے ہاتھوں گرفتاری کے بعد رہائی پانے کے بعد بھی وہ بے گھر اور بے در  
 نے مگر یہ در بدر کی ٹھوکریں دراصل انہیں اپنی منزل کی طرح کشاں کشاں لئے جا

اور قلب ایک صبح ترن کوزی کے ساتھ رہا میں مستقل قیام کے سلسلے میں منتقل  
 ایک عبادت گاہ میں داخل ہو رہا تھا۔ کہ اس کا سامنا اچانک جعفر سے اس طرح ہو  
 ہا ششدر رہ گئے۔ جعفر حیران نظروں سے قادر قلب اور ترن کوزی کو دیکھ رہا تھا  
 دونوں جلدی جلدی آنکھیں مل رہے تھے۔ جیسے انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا  
 بہت اور استغاب کے یہ لمحے ختم ہوئے۔ پھڑپھڑے ہوئے ایک دوسرے سے ہمیشہ  
 ال گئے۔ جعفر اور ترن کوزی کا اسلامی طریقے سے بڑی دھوم دھام سے عقد ہوا۔  
 تمام اخراجات شاہی خزانے سے پورے کئے گئے۔ امیر عماد الدین زنگی نے خود ان  
 میں شرکت کی اور جعفر کی خدمات کے صلے میں اسے رہا میں ایک چھوٹی سی جاگیر

مال کے انتظام پر قادر قلب نے ایک نیا انکشاف کیا۔ اس نے بتایا کہ ترن کوزی  
 ایک مسلمان خاندان کی چشم و چراغ ہے اور اس کی مظلوم ماں قادر قلب کی قیام  
 گاہ کو جنم دینے کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ صرف  
 لاکھ اس کے شوہر کو ایک نھرائی سردار نے قتل کر دیا وہ اسے بھی قتل کرنا چاہتا  
 مالک کے قادر کی عبادت گاہ میں پہنچ گئی تھی۔ جعفر کی سفارش پر قادر قلب کو رہا  
 سے بڑی عبادت گاہ کا لارڈ پادری بنا دیا گیا۔

بمروہ تھا وہ ان فیصلوں کو ناقابل تسخیر سمجھتے تھے قلعہ میں غیر مستقل فوج کی بھی کافی  
 موجود تھی جنہیں تاجروں نے سال بھر کی تنخواہ یک مشت ادا کر کے مقابلے پر آمادہ  
 تھا۔ اس لئے محاصرہ طویل کھینچنے لگا۔ امیر زنگی ایک طرف تو فوجی دستوں سے حملہ کرتا  
 دوسری طرف شہر کو بچانے کے لئے برابر صلح کے پیغام بھیجتا رہا مگر ہر گزرنے والے دن  
 ساتھ قلعہ والوں کی استقامت میں اضافہ ہو رہا تھا اور انہیں امید پیدا ہو رہی تھی  
 جو سیلین محاصرہ کی خبر پاتے ہی ان کی مدد کو پہنچ جائے گا۔

ادھر جو سیلین دہم کو رہا کے محاصرہ کی خبر پہنچ چکی تھی لیکن وہ اپنے میں مقابلے  
 سکت نہ پاتا تھا قی باشر سے باہر نکلنے پر نہ وہ خود آمادہ ہوا اور نہ اس کے جاں بازوں  
 اسے اس کا مشورہ دیا۔ اس طرح وہ تقدیر پر قانع ہو کر قتل باشر میں قلعہ بند ہو کے  
 گیا۔ امیر زنگی نے شہر کو بچانے کی بہت کوشش کی مگر قلعہ والوں کی طرف سے مسلسل  
 نے اسے مجبور کر دیا اس نے حکم دیا کہ قلعہ کی فیصل کو سرنگوں میں آگ بھڑک کر  
 جائے۔ اس کے حکم کی دیر تھی۔ تمام آلات اور مشق انجینیر اس کے ساتھ تھے م  
 کھدے کلیں۔ پھر ان میں لکڑیاں بھڑک کر آگ دکھائی گئی اور پھر ایک زبردست دھماکے  
 ساتھ فیصل کا ایک حصہ روٹی کے گالوں کی طرح اڑ گیا۔

ایسے موقع پر بھی ہوئی فاتح فوج بے قابو ہو جاتی ہے۔ جو سیلین اول اور دو  
 حکمرانوں نے اپنے دور اقتدار میں مسلمانوں پر جو ظلم توڑے تھے ان کے انتقام کا وقت  
 تھا۔ زنگی لشکر نے دل بھر کے انتقام لیا۔ پورا لشکر قتل کر دیا گیا۔ کئی خوبصورت عا  
 مٹی کا ڈھیر بن گئیں۔ عیسائی جوانوں اور لڑکیوں کو غلام و کنیز بنانے کے لئے گرفتار کیا  
 عیسائی عبادت گاہوں پر بھی مصیبت آئی۔ پادریوں کو بھی گرفتار کیا گیا مگر جب امیر  
 فاتحانہ شہر میں داخل ہوا تو شرکی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے حکم دیا کہ  
 و عادت کری فوراً بند کی جائے۔ گرفتار مردوں اور عورتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اور  
 ہوا سامان اس کے مالکوں کو واپس کیا جائے۔ بے شک رہا میں کافی نقصان ہوا لیکن  
 زنگی نے رہا کی تعمیر نو اور اس کی رونق واپس لانے میں بھرپور کوشش کی۔ اس کا  
 خود مغربی مورخوں نے بھی کیا ہے۔

ترن کوزی اور قادر قلب بھی بد قسمتی سے قتل باشر چھوڑ کر رہا آ گئے تھے۔ وہ  
 بھی زنگی لشکر کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ پھر انہیں امیر کے حکم سے رہا کر دیا گیا  
 پچھارے خاندان برباد رہا کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ تری کوزی اپنے باپ قادر قلب  
 رہا بس لئے لائی تھی کہ اس کے خیال میں جعفر کو کسی نے شناخت کر لیا ہے اور

میں تھے۔ ہر شخص اداس۔ ہر چہرہ پژمردہ۔ عزت کی محفلیں سونی پڑ گئی تھیں۔  
 تخت و تاج لرز اٹھے تھے۔ ہفتوں تک انہیں اس خبر کی صداقت پر یقین نہ آیا  
 خود کو فریب دیتے رہے مگر جب عیسائی جاسوسوں نے سوکھے منہ سے اس خبر کو  
 زار دیا تو عیسائیوں کا کھانا پینا حرام ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ موصل کی  
 ملٹی سی ریاست کا امیر۔ الہا کی عظیم طاقت کو ایک ہی وار میں پارہ پارہ کر سکتا ہے۔  
 یقین کرنا پڑا کہ الہا سے صلیبی پرچم ہمیشہ کے لئے اتر گیا ہے اور عیسائیوں کا یہ  
 قلعہ اور فوجی چھاؤنی امیر زنگی کے گھوڑوں سے پامال ہو چکی ہے۔  
 عیسائی ملٹی کھما نوچے کی مثل مشہور ہے۔ عیسائی ریاستوں نے اس شکست کی غلط  
 شروع کر دیں۔ شاہ جو سلین الہا میں موجود نہ تھا۔ اس وجہ سے شکست ہوئی۔  
 الہا کی بہترین فوجیں تل باشر چلی گئی تھیں۔

## معصوم نظریں

الہا کے عیسائی تاجروں نے غداری کی۔  
 اور سب سے بڑی بات یہ کہ امیر زنگی نے الہا میں عام شہریوں کا قتل عام کیا۔  
 بچے اور عورتیں تک بے رحم کر دی گئیں۔ عبادت خانوں کو نذر آتش کیا گیا اور  
 ڈرڈی گئیں۔

الہا کے شہر کرنے والے یہ بھول گئے کہ صرف پچاس ساٹھ سال پہلے جب انہوں نے  
 مسلم علاقہ پر قبضہ کیا تھا تو انہوں نے ظلم و بربریت کا کیا بھیاںک مظاہرہ کیا تھا۔  
 یورپوں نے تو مسلمانوں کو گاجر مولیٰ کی طرح کاٹ کے رکھ دیا تھا۔ ان کی کوئی مسجد  
 رہی تھی۔ جو مسلمان بچ رہے تھے ان کے ساتھ غلاموں سے زیادہ بدتر سلوک کیا  
 گیا۔ کسی مسلمان کو زرق برق اور نئے کپڑے پہننے کی اجازت نہ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ  
 لہجے کے وقت زنگی لشکر سے کچھ زیادتیاں ضرور ہوئیں مگر اس کی بھی ایک وجہ تھی۔  
 لہجے نے الہا کے قلعہ کا محاصرہ کرنے کے بعد قلعہ والوں کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ اگر  
 غیر مزاحمت کے حوالہ کر دیا جائے تو عیسائیوں کے جان و مال اور عزت و آبرو پر کوئی  
 ڈالے گا۔

لہجہ والوں نے امیر زنگی کے اس مخلصانہ پیغام پر کان نہ دھرے۔ ان کا خیال تھا  
 کہ ایک معمولی امیر چند دن کے محاصرہ کرنے کے بعد بے نیل و مرام واپس چلا  
 جائے گا اس وقت تک تل باشر سے شاہ جو سلین واپس آجائے گا۔ جسے اس محاصرے  
 نے بھیجی جا چکی تھی۔ قلعہ میں اس وقت کھانے پینے کا سامان اور اس قدر کثیر فوج  
 تھی کہ وہ ایک سال تک محاصرے کی سختیاں برداشت کر سکتے تھے۔ پھر وہ امیر زنگی کی

”الہا فتح وہ گیا۔“

عیسائیوں کا تسلط ختم کر دیا گیا۔

ایک صدی کے پچلے ہوئے مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔  
 باطل گیا۔ حق آیا۔

امیر زنگی عماد الدین۔ محافظ دین متین زندہ باد۔

نصرانی جھنڈا سرنگوں اور پرچم اسلام سر بلند ہوا۔“

یہ وہ نعرے اور آوازیں تھیں جو شام و عراق اور عرب دنیا کے در و دیوار  
 رہی تھیں۔ مگر گہری چرچا تھا اور گلی گلی میں پکار تھی۔ جو سنتا ششدر رہ جاتا۔ لوگ  
 دوسرے کو تعجب سے دیکھتے اور پوچھتے۔ کیا یہ خبر افواہ تو نہیں۔ کیا الہا کے ظالم  
 کے پنجے سے مسلمان نجات پا سکتے ہیں۔ کہیں دشمنوں نے یہ خبر تو نہیں اڑائی ہے۔  
 افواہ نہ تھی جبکہ ایک ایسی حقیقت تھی جس کی تصدیق الہا سے آنے والے تجارت  
 کر رہے تھے۔ الہا کا کوئی قافلہ کسی مسلم علاقے میں پہنچتا تو لوگ سرائے پر ٹوٹ  
 قافلے والے مسکرا مسکرا کے اس عظیم فتح کی تفصیل بیان کرتے آپس میں ملے  
 مبارک باد دیتے۔ شکرانے ادا کرتے۔ مٹھائیاں تقسیم ہوتیں۔ مساکین کی جھولیا  
 جاتیں۔ آبادیوں میں چراغاں ہوتا اور۔۔۔۔۔

مگر عیسائی دنیا میں کرامت مچا ہوا تھا۔ اٹھاکہ، طرابلس الشام اور یرموک کے

کرنے کے قابل ہوتے ہیں سسلی کے مسلمانوں نے خدا اور رسول کو بھلا دیا اس لئے  
اس وقت ہمارے پیغمبر الہا میں مجاہد اسلام امیر عماد الدین زنگی کی مدد فرما رہے تھے جو  
اس وقت لڑ رہا تھا۔

مسلمان کے اس تلخ جواب پر شاہ راجہ کے درباری ہنس پڑے مگر راجہ کے  
دستہ ساتاری ہو گیا اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے اپنے درباریوں کو ڈانٹا۔ ”کم  
اس بوڑھے کا مذاق نہ اڑاؤ۔ اس کی باتوں سے مجھے صداقت کی بو آتی ہے۔“

تھے ہیں کہ اسی وقت یروشلم سے ایک تیز رفتار سوار پالیرمو پہنچا اور اس نے شاہ  
کو بتایا کہ عیسائیوں کی سب سے اہم چوکی الہا پر موصل کے امیر زنگی نے قبضہ کر لیا  
یہ سن کر راجہ کا منہ لٹک گیا۔

امیر زنگی نے الہا پر قبضے کے بعد وہاں کا انتظام و انصرام کیا اور قرب و جوار میں فوجی  
پیچھے ماکہ شاہ جو سسلیں کے اثرات ختم کیا جائے۔ عیسائی علاقوں پر امیر زنگی کا ایسا  
ٹاری ہو گیا تھا کہ اس کے فوجی دستے جہاں پہنچتے عیسائی امیر اور سردار ان کے سامنے  
ناچتے اور خوشی خوشی طوق غلامی پہن لیتے۔

الہا کے قریب عیسائیوں کا ایک اور قلعہ سروج تھا۔ یہ قلعہ شاہ جو سسلیں کی بیوہ بہن  
نارسلہ کی جاکیر تھی۔ بیوہ شہزادی اپنی کسن بیٹی کیٹ کے ساتھ اس قلعہ میں ایک  
شادی منگوا رہی تھی۔ امیر زنگی نے اس قلعہ پر قبضہ کے لئے ایک فوجی دستہ اپنے  
بڑا غلام ہلوکش کی سرکردگی میں روانہ کیا اور اسے سخت تاکید کر دی کہ اگر شہزادی  
قلعہ حوالے کرنے پر آمادہ ہو جائے تو اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہ کی جائے۔

امیر کے نہایت قابل اعتماد غلاموں میں سے ایک تھا۔ یوں تو امیر کے بہت سے  
ترکی اور رومی غلام بھی تھے جن پر امیر نہ صرف اعتماد کرتا تھا بلکہ اس کے آرام کا  
پر خیال رکھتا تھا۔ خواجہ سرا ہلوکش تمام غلاموں کا سردار تھا۔ جب ہلوکش کو  
مہم کی سرداری عطا ہوتی تو فوجی دستوں کے علاوہ درجنوں غلاموں کی بھی ایک  
فوج بھی اس کے ساتھ جاتی تھی۔ یہ سب غلام ہلوکش کی طرح خواجہ سرا نہ تھے  
مسل شادی شدہ اور بیوی بچوں والے بھی تھے۔

خواجہ سرا دراصل خسرے ہوتے تھے۔ ان میں مردانہ قوت نہ ہوتی تھی اس وجہ سے  
حکومت اور محل سراؤں میں ان کا بے دھڑک آنا جانا رہتا تھا۔ خروں کا آغاز کس  
ہوا اس سلسلے میں بہت ہی دلچسپ روایتیں مشہور ہیں۔ ایک روایت ہے کہ پانچ ہزار

پیش کش کیوں قبول کرتے۔

قلعہ والے اس حقیقت کو بھی بھول گئے تھے کہ چند ہی سال پہلے امیر زنگی  
عیسائیوں کے متحدہ لشکر جس میں شہنشاہ قسطنطنیہ کا لشکر بھی شامل تھا۔ خیمے لگائے تھے  
پوری طرح مقابلے پر ڈٹ گیا تھا اور شہنشاہ کامنی نس امیر زنگی کی اس جرات سے اس  
خائف ہوا تھا کہ رات کے وقت اپنا بھاری سامان حرب میدان میں چھوڑ کر چپکے سے واپس  
ہو گیا تھا۔ یہ امیر زنگی کی بیدار مغزی اور زبردست جنگی چال تھی جس نے اسے الہا  
شاہ جو سسلیں کے مقابلے میں کامیابی دلائی۔ امیر زنگی اپنا لشکر لے کر موصل سے دور چلا  
اور قلعہ عمید پر اس نے اپنی لشکر گاہ قائم کی۔ بظاہر وہ قلعہ عمید کا محاصرہ کئے تھا مگر اس  
نظریں الہا پر لگی تھیں پھر جیسے ہی اسے معلوم ہوا کہ شاہ جو سسلیں رنگ رلیاں منانے  
باشر چلا گیا ہے۔ امیر زنگی نے فوراً الہا کا رخ کیا اور قلعہ کی فصیل میں سرنگ کا کر  
اڑا دیا۔

الہا اور تل باشر کا درمیانی فاصلہ اتنا زیادہ نہیں کہ شاہ جو سسلیں کو الہا کے محاصرہ  
کی خبر نہ ہوئی ہو۔ تاریخ بتاتی ہے کہ الہا کا محاصرہ ایک ماہ تک رہا مگر جب جو سسلیں کو  
ملی کہ امیر زنگی نے الہا کا محاصرہ کر لیا ہے تو اسے اور اس کے سرداروں کو بہت نہ ہو  
کہ وہ تل باشر چھوڑ کے الہا کو بچانے کے لئے نکلیں پھر بھی انگریز مورخ یہی کہتے ہیں  
جو سسلیں الہا میں موجود نہ تھا۔

اس طرح الہا میں اسلام کے مجاہد نے عیسائیوں پر ایک ایسی فتح پائی تھی جو تاریخ  
فتوح الفتح کے نام سے مشہور ہے مگر انہی دنوں بحرہ روم کے جزیرہ سسلی میں مسلمانوں  
افتاد پڑی تھی۔ شمالی افریقہ کے مسلمانوں نے سسلی پر بڑے طمطراق سے قبضہ کیا تھا مگر  
کی آپس کی چپقلش اور مفاد پرستی نے انہیں تباہ کیا اور اب نارمن شاہ راجہ نے انہیں  
ایک شرمناک شکست سے دوچار کیا تھا۔ شاہ راجہ اپنی فتح پر پھولے نہ سانا تھا۔ اس کے  
سامنے ایک بزرگ مسلمان قیدی پیش کیا گیا۔ راجہ نے اسے بڑی حقارت سے دیکھا اور  
کہا۔ ”او مسلمان بوڑھے۔ تم لوگ تو کہتے ہو کہ مسلمانوں کی فوج کے ساتھ فرشتے لڑتے  
ہیں مگر جب پالیرمو کے میدان میں تمہیں شکست ہوئی تو تمہارے پیغمبر تمہاری مدد کو کیوں  
نہیں آئے؟“

بزرگ مسلمان پیغمبر اسلام کی اس توہین پر تڑپ اٹھے۔ انہیں شاید جلال آگیا۔ انہوں  
نے راجہ کو گھوڑے کے دیکھا اور الفاظ پر زور دے کے کہا۔ ”اے نصرانی بادشاہ۔ ہمارا خدا اور  
ہمارا پیغمبر مسلمانوں سے کبھی غافل نہیں ہوتا مگر وہ صرف ان کی مدد کرتے ہیں جو اپنی مدد

سال قبل مسیح میں اس عجیب و غریب صنف کا آغاز ہمارے پڑوسی ملک چین میں دوسری روایت ان کا آغاز سلطنت روم میں بتاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے روم اپنے ملک سے دور کسی مہم پر گیا تھا۔ اس مہم میں اسے ایک سال سے زیادہ عرصہ گریا۔ شہنشاہ کی کچھ محبوب بیگمات تو اس کی ہم سفر تھیں لیکن زیادہ تعداد روم میں رہی تھی۔ بیگمات کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی چنانچہ جب شہنشاہ کو دار السلطنت سے ماہ گزر گئے اور اس کے بارے میں صحیح خبریں آنا بھی بند ہو گئیں تو شاہی محلات کی باہر اور محلات کے محافظ غلام کھل کھیلے۔ ہر ملکہ نے ایک غلام کو اپنے محل میں جگہ دی اس طرح شاہی محلات عشرت کدوں میں تبدیل ہو گئے۔ بیگمات کی سرفرازی اور پذیرا وجہ سے یہ غلام اس قدر بے باک اور خود سر ہو گئے کہ انہوں نے روم میں سرداروں اور عمال حکومت کا کہنا ماننا چھوڑ دیا۔ وہ رات دن لو لعب میں مشغول رہتے۔

سال بھر بعد شہنشاہ روم اچانک روم واپس آگیا۔ اس کے آتے ہی وفادار سردار نے بیگمات اور غلاموں کے تعلقات اور عیاشیوں کا پورا کچھا چھٹا شہنشاہ کے سامنے بیان دیا۔ بعض بیگمات اور غلاموں نے اپنی سیاہ کاریوں کا اقبال بھی کر لیا۔ شہنشاہ روم کو قدر پیش آیا کہ اس نے تمام اقبالی بیگمات اور غلاموں کو فوراً قتل کرا دیا اور وہ غلام جن جرم ثابت نہ ہو سکا انہیں قوت مردی سے محروم کر کے خسرو بنا دیا گیا۔ چونکہ یہ خبر بیگمات کے لئے بے ضرر ہو گئے تھے اس لئے شہنشاہ نے اپنے ایک وزیر کے مشورہ۔ انہیں اپنی بیگمات کے ساتھ سلام و پیام کی خدمت پر مامور کر دیا۔ پھر عرصہ بعد انہیں خواجہ سرا کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اس صنف نے شاہی محلات میں ایسی ایسی خدمات انجام دیں کہ ایک طرف تو انہوں نے شاہوں اور شہنشاہوں کا اعتماد حاصل کر لیا اور دوسری طرح وہ بیگمات شاہی کے راز دار بن گئے۔

ہلو کشش بڑی شان سے گھوڑا چکاتا معہ اپنے ساتھیوں اور فوجی دستوں کے قلعہ مرد کے سامنے نمودار ہوا۔ شہزادی ارسلہ کو الہا پر مسلمانوں کے قبضے کی اطلاع مل چکی تھی وہ چاہتی تو سروج کو چھوڑ کے کسی عیسائی ریاست میں پناہ لے سکتی تھی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ امیر موصل عماد الدین زنگی نے الہا پر قبضہ کرنے کے بعد اس شہر میں جگہ کے دوران جو تباہی پھیلی تھی اس کے نشان تک مٹا دئے ہیں اور عوام کا تمام لوٹا ہوا مال انہیں واپس کر دیا گیا ہے تو شہزادی نے فیصلہ کیا کہ کسی جگہ پناہ حاصل کرنے کے بجائے امیر موصل کے زیر سایہ اپنی جاگیر میں مقیم رہے گی کیونکہ اسے امید تھی امیر اسے

واپس کر دے گا۔ شہزادی ارسلہ۔ الہا کے شاہ جو سیلین کی بہن تھی لیکن اس نے کبھی محلات میں حصہ نہ لیا تھا اس لئے اسے پوری امید تھی کہ امیر اس کے ساتھ ضرور یہ سلوک کرے گا۔

سروج کا قلعہ بس نام ہی کا قلعہ تھا اس لئے کہ اس کی تفصیل کچی تھی اور قلعہ کے دائیں شہری انتظامی سپاہیوں کے کوئی باقاعدہ فوج موجود نہ تھی جس وقت امیر زنگی کے قلعہ کے سامنے پہنچے تو قلعہ کے محافظوں نے دروازہ بند کر لیا اور اس کی خبر فوراً ارسلہ کو پہنچائی گئی۔

شہزادی عالیہ۔ مسلمان لشکر قلعہ کے دروازے تک پہنچ گیا ہے۔ ایک محافظ نے آواز میں اطلاع دی۔

بہت خوب۔ شہزادی مسکرائی۔ ”ہم اس وقت کا انتظار کر رہے تھے۔ سروج کی ہا کا ایک حصہ ہے اور الہا پر قبضہ کے بعد سروج پر بھی انہیں حق حاصل ہو گیا اور جو سیلین کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب مسلمان ہمارے آقا ہیں۔ چلو ہم خوش دلی کا استقبال کریں۔“

راہی ارسلہ اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ اس کی بیٹی شہزادی کیٹ نے سوالیہ نظروں سے لہا۔ ”گھبراؤ نہیں کیٹ“ شہزادی ارسلہ نے اسے تسلی دی۔ ”امیر زنگی نے الہا میں ہا کا اعلان کیا ہے۔ ان کا لشکر یہاں بھی کوئی زیادتی نہ کرے گا۔ میں امیر سے خود مل گئی۔ تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ کہیں مسلمان قلعہ پر حملہ نہ کر دیں۔“

راہی نے جلدی سے لباس تبدیل کیا اور بیش قیمت جواہرات زیب تن کئے۔ شہزادی ہل کی تمام کنزیر اور غلام بھی ان کے ساتھ ہوئے اور دم کے دم میں سروج شہزادی ارسلہ بڑی شان و شوکت سے نو واردوں کے استقبال کے لئے قلعہ کے پہنچ گئی۔ شہزادی ارسلہ کے اشارے پر قلعہ کا صدر دروازہ کھول دیا گیا اور ہلو کشش قلعہ کے باہر آگیا۔

دروازے سے کچھ فاصلے پر ہلو کشش لشکریوں کی صفیں باندھے کھڑا تھا۔ دائیں کے تمام دوست تھے۔ شہزادی ارسلہ اور شہزادی کیٹ گھوڑوں پر سوار تھیں۔ باقی ان کے عقب میں چل رہے تھے۔ شہزادی ارسلہ اور کیٹ کے جواہر نگار بزرگ برنگی شعاعیں نکل کر ہلو کشش اور اس کے حواریوں کے آنکھیں خیرہ کر ان لوگوں نے اب تک جواہر ریزیوں کے زیورات دیکھے ہی نہ تھے۔

لام نے ہلو کشش سے سرگوشی کی۔ ”خواجہ آقا۔ ان دونوں نے تو جواہرات سے

اپنے کو ڈھانپ رکھا ہے۔“ ہلوکش کے منہ میں پہلے ہی پانی بھر آیا تھا۔ اس سرگوشیوں میں جواب دیا۔ گھبراؤں نہیں۔ یہ سب اپنا ہی ہے شام ہونے سے پہلے ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔“

شنزادی ارسلان نے اپنا گھوڑا خواجہ سرا ہلوکش کے سامنے پہنچ کے روکا اور یہ ادب سے بولی۔ ”میں شاہ جوہیلین کی بہن شنزادی ارسلان۔ فاتح امیر موصل عبداللہ کے سامنے سر اطاعت خم کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے شنزادی ارسلان نے گھوڑے پر بیٹھے اپنے سر کو ذرا سا خم کیا پھر گھوڑے سے اتر پڑی۔ اس کی تقلید میں شنزادی کیٹ بھی گھوڑا چھوڑ دیا اور تمام لوگ ہلوکش کے سامنے سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔ شہر ارسلان کے اشارے سے اس کے آگے چلنے والے الہا کے پرچم بردار نے اپنے پرچم کو نگوں کر دیا جو اس زمانے میں اطاعت کے اظہار کا دستور تھا۔

ہلوکش کی نظریں شنزادی ارسلان اور شنزادی کیٹ کے چروں کے بجائے ان زرنکار زیورات پر جمی ہوئی تھیں اور وہ دل ہی دل میں اس عظیم دولت کو دیکھ کر خوش رہا تھا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا آیا کہ اس نے اپنے چہرے پر غصہ طاری کیا بڑی رعوت سے بولا۔ ”سروج کی شنزادی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ آقائے محترم امیرم اس وقت الہا کے انتظام میں مصروف ہیں اور اس وقت ان کا ایک غلام فوجی دستور ساتھ سروج پر قبضہ کرنے آیا ہے۔“

شنزادی ارسلان نے متانت سے جواب دیا۔ ”شنزادی ارسلان۔ امیر کے نمائندے کو آمدید کہتی ہے۔ میرا یہاں آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ سروج نے امیر عالی مقام اطاعت قبول کر لی ہے۔ آپ قلعہ کے اندر تشریف لے چلے میں اپنی جاگیر سے دستہ ہو کر امیر کی پناہ میں آتی ہوں۔“

”قلعہ کی کتبیاں کہاں ہیں؟“ ہلوکش کا لہجہ اور زیادہ تلخ ہو گیا۔ ”سالار محترم۔“ شنزادی ارسلان نے ادب ملحوظ رکھتے ہوئے کہا۔ ”سروج ایک جاگیر یہاں نہ تو کوئی فوج ہے اور نہ شاہی خزانہ۔ میرے محل میں جو کچھ ہے وہ سب سالار حوالے ہے۔ اگر آپ مجھے یہاں قیام کی اجازت دیتے ہیں تو میں اپنے محل میں باغ اور جگہ مقیم ہو جاؤں گی اور اگر مجھے یہاں رہنے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر کسی طرز جاؤں گی۔“

”یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔“ ہلوکش گرجا۔ ”یہ کس طرح ممکن ہے؟ جو سیلین کی بہن کے پاس خزانہ نہ ہو۔ مجھے بلا عذر چاہیاں پیش کی جائیں ورنہ سختی۔“

باجائے گا۔“

”یہ سالار۔“

”میں بے کار باتیں سننے کا عادی نہیں۔“ ہلوکش نے شنزادی ارسلان کو ڈانٹ دیا۔ سروج کی ہر قیمتی چیز جتنی امیر موصل ضبط کی جاتی ہے۔“

”میں یہ پیش کش پہلے ہی کر چکی ہوں سالار محترم۔“ شنزادی ارسلان نے بڑا استقلال کیا۔ ”میری جاگیر سے دستبرداری کا اعلان اس بات کا ثبوت ہے۔ سروج آپ کا ہے یہاں کی ہر چیز آپ کی ملکیت ہے۔ قلعہ میں تشریف لے چلے۔ کوئی چیز آپ سے ہٹا نہ رکھی جائے گی۔“

”شنزادی کو محل کا تمام سامان اور تمام زیورات بھی ہمارے حوالے کرنا ہوں گے۔“ کٹھن نے حکم دیا۔

”سالار کے حکم کی تعمیل ہو گی۔“ شنزادی ارسلان نے تحمل سے کہا۔ ”لیکن اس سلسلے میں امیر موصل کے اس اعلان کا ضرور حوالہ دوں گی جس کے ذریعے انہوں نے الہا تمام لوگوں کی جاں بخشی کے علاوہ وہ تمام مال و سامان واپس کرنے کا حکم دیا تھا جو ان لشکر نے الہا پر قبضہ کے دوران وہاں کے لوگوں سے زبردستی حاصل کیا تھا۔“

”امیر کا حکم الہا کے لئے تھا۔ سروج اور الہا دو الگ الگ مقام ہیں۔ الہا کے فرمان سروج کے علاقے سے کوئی علاقہ نہیں۔“ ہلوکش نے جرح کا انداز اختیار کیا۔

”سالار درست فرما رہے ہیں۔“ شنزادی نے فوراً جواب دیا۔ ”الہا اور سروج دو الگ مقام ہیں اور ان کے حالات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ الہا نے امیر موصل بلکہ کیا تھا اور امیر نے اس پر بزرگ شمشیر قبضہ کیا تھا۔ اس کے باوجود امیر محترم نے لوگوں کو معاف کر دیا اور ان کا مال و اسباب بھی واپس کرا دیا جب کہ سروج نے بغیر بلکہ امیر کی اطاعت قبول کر لی ہے۔ اس لئے سروج والوں کو الہا سے زیادہ مراعات ملیں۔ میرے محل کا سامان اور میرے زیورات خالص میری ملکیت ہیں اس لئے سالار انہوں پر قبضہ نہ کرنا چاہئے۔“

”یہ سب فضول باتیں ہیں۔ میں نے جو حکم دیا اس پر عمل کیا جائے۔“

ہلوکش نے اپنا گھوڑا قلعہ کی طرف بڑھا دیا۔ فوجی دستے اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ سالار خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی مگر شنزادی کیٹ کے آنسو جھلک آئے۔ اس کا دامن پکڑ لیا۔ ”اما۔ تم ان لوگوں کی تعریف کر رہی تھیں۔ اس ظالم کو تو آپ کی بھی رحم نہیں آیا۔ میں نے ٹھیک ہی سنا تھا کہ مسلمان ظالم اور جنگلی ہوتے ہیں۔“

اگر ہم سروج چھوڑ کے اٹھا کیے چلے جاتے تو کم از کم ہمارے کروڑوں کے زیورات تو ان کے ہاتھوں سے بچ جاتے۔ ماما آپ نے بہت بڑی غلطی کی۔“

شہزادی ارسلہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بیٹی کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ ”چپ ہو جاؤں کیٹ۔ جان اور عزت سب سے زیادہ قیمتی چیزیں ہیں اگر یہ ظالم یہ چریں طلب کرتا تو ہم کیا کر سکتے تھے۔“

شہزادی ارسلہ نے محل واپس آکے اپنے تمام زیورات قیمتی اشیاء ہلوکشس کے حوالے کر دیں ہلوکشس نے اس پر ہی بس نہ کیا بلکہ شہزادہ شہزادہ کی اطلاع دیا کہ اگر سروج والے اپنی جان کی خیر چاہتے ہیں تو اپنی دولت اور قیمتی سامان شہزادی کے محل میں لا کر جمع کرادیں ورنہ گھر گھر تلاشی ہوگی اور مجرموں کو سخت سزا دی جائے گی۔ پورے شہر میں افرا تفری پھیل گئی مسلمانوں کو تو عیسائیوں کے ظلم و ستم سے نجات مل گئی تھی مگر ہلوکشس کی سخت روش کی وجہ سے ہر عیسائی پریشان تھا ہلوکشس اس حکم کا اطلاق عبادت گاہوں پر بھی ہوتا تھا اس لئے عوام کے علاوہ پادریوں نے سونے چاندی کی سیلیس اور سونے کا دیگر سامان بھی محل میں لا کے ڈھیر لگا دیا۔ ہلوکشس کے تمام دوست کو دیکھ کر بغلیں بجارہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔

شہزادی ارسلہ اپنی بیٹی اور ملازمین کے ساتھ محل چھوڑ کے ایک حویلی میں اٹھ آئی تھی اس کے محل پر ہلوکشس نے قبضہ کر لیا تھا اور محفل عیش برپا کی تھی۔ شراب کے در چل رہے تھے اور رقص و سرود کا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ کس میں مجال تھی کہ اسے ٹوٹا اعتراض کرتا۔ چند سمجھ دار فوجیوں نے ہلوکشس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ خود اس کے احکامات اسی کے فرمان کے خلاف ہیں مگر ہلوکشس نے یہ کہہ کر ان کی زبانیں بند کر دیں کہ جنگ میں ہر چیز جواز ہے اور یہ اس سلوک کا انتقام ہے جو عیسائیوں نے ایک زمانے تک مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا۔ سروج کے مسلمان بھی پہلی بار سننے اور ذوق و ہمت لباس پہن کر بازاروں میں نکلے۔ بے شک انہیں نئے لباس پہننے کا حق تھا مگر وہ جس انداز سے بازار میں گھوم رہے تھے۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ خدا کا شکر ادا کرنے کے بجائے عیسائیوں کے سامنے اپنے غرور اور تکبر کا اظہار کر رہے تھے۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ شرک کے بعد خدا کو جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ اس کے بندے کا غرور ہے۔ مسلمانوں نے حملہ آور لشکر کا یہ حال دیکھا تو وہ خود بھی جاے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے عیسائی محلوں کو لوٹ لیا اور جس کے جو ہاتھ لگا وہ لے بھاگا۔ پورے شہر میں لوٹ کھسوٹ بازار گرم تھا۔ عیسائی سر جھکائے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ کس کے پاس فریاد لے

جاتے۔ فریاد سننے والوں نے خود بھی شہزادی کے محل پر قبضہ جمالیا تھا اور محل کی تمام قیمتی اشیاء ضبط کر لی تھیں۔ ہلوکشس نے یہ تمام احکامات امیر ذکی کے نام سے جاری کئے تھے۔ امیر عبدالعزیز نے زندگی بھر اس میں جو نرم سلوک کر کے عیسائیوں کے دل جیتے تھے۔ ہلوکشس نے اس کے کئے کرائے پر ایک سرے سے پانی پھیر دیا تھا۔

ہلوکشس اور اس کے دوستوں نے رات بھر داد عیش دی اور صبح کو دیر تک سوتے رہے۔ شہزادی ارسلہ کے پاس رات ہی میں ہزاروں شکایتیں پہنچ چکی تھیں۔ اس نے سب کو سمجھا بھاگے واپس کر دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی امیر کے سالار سے اس سلسلے میں گفتگو کرے گی لیکن جب وہ صبح کو ہلوکشس سے ملنے پہنچی تو اسے بتایا گیا کہ سالار ابھی آرام فرما رہے ہیں۔ شہزادی کو کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ پھر دن چڑھے اسے محل میں طلب کیا گیا۔

”محترم سالار۔“ شہزادی ارسلہ غصے سے کانپ رہی تھی۔ ”آپ نے میرے محل پر قبضہ کر لیا۔ میرے اور میری بیٹی کے تمام زیورات چھین لئے مگر میں نے اف تک نہیں کی لیکن سروج کی رعایا نے آپ کا کیا بگاڑا تھا۔ ان کی دولت آپ نے کس قانون سے چھین لی؟“

ہلوکشس نے مخمور نظروں سے شہزادی ارسلہ کو دیکھا۔ ”تم ہم سے جواب طلب کرنے آئی ہو؟“

شہزادی فوراً سنبھل گئی۔ ”نہیں سالار۔ میں رعایا کی درخواست لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ آپ ان سے چھینا ہوا مال و دولت انہیں واپس دلا دیجئے۔“

”تم جنگی قانون سے واقف نہیں شہزادی۔“ ہلوکشس نے حقارت سے کہا۔ ”کیا ہم نے تم پر یہ رحم نہیں کیا تمہیں اور تمہاری بیٹی کو اپنے پھرے ہوئے لشکریوں سے محفوظ رکھا۔ واپس چلی جاؤ شہزادی ورنہ تمہاری بیٹی اس محل میں ہمارے سامنے ناچتی دکھائی دے گی۔“

شہزادی ارسلہ کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک عداوتی کے پاس رحم کی بھیک مانگنے آئی ہے ارسلہ نے فوراً بات پلٹی۔ ”سپہ سالار۔ میں آپ کی بہت امتحان مند ہوں آپ نے واقعی ہماری عزت بچائی ہے مگر سالار۔ آپ کے لشکری مجھے برابر پریشان کر رہے ہیں۔ وہ کسی وقت بھی میری بیٹی کو مجھ سے چھین سکتے ہیں۔“

”تم ہم سے کیا چاہتی ہو؟“ ہلوکشس جھلا گیا۔

ہاتھ کوئی مسلح سوار نہیں ہو گا۔

”میں جنگ کرنے نہیں۔ امن کی تلاش میں جا رہی ہوں۔ آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گی۔“

شنزادی نے اپنی بیٹی کیٹ اور شمر کے پانچ معززین کو ساتھ لیا اور دوسری صبح سروج نے انطاکیہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس کی روانگی کے وقت ہلوکش کے کئی ساتھی موقعہ موجود تھے۔ انہوں نے جانے والے سواروں کی خورجیوں تک کی تلاشی لی جس میں کھانے پینے کا سامان بھرا تھا۔ پھر جب وہ پوری طرح مطمئن ہو گئے تو انہوں نے ان خانماں بالوں کو کوچ کی اجازت دی۔

شنزادی ارسلان دن بھر انطاکیہ کی طرف سفر کرتی رہی۔ انطاکیہ رہا سے قریب ترین باغی ریاست تھی۔ ہلوکش کو شنزادی ارسلان کے انطاکیہ جانے سے کوئی خطرہ نہیں تھا اس نے اس کی اجازت دے دی تھی۔ دراصل وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ سروج میں ارسلان کی روٹی سے اس کی عیش و عشرت میں خلل پڑ رہا تھا۔ ہلوکش کے ساتھیوں نے اس سے رونا تھا کہ اگر شنزادی ارسلان اسی طرح روز گزیر کرتی رہی تو وہ اسے قتل کر دیں گے مگر ہلوکش نے انہیں روک دیا تھا اسے کسی وقت امیر زنگی کے غصہ کا خیال آ جاتا تھا اس نے انہیں چاہتا تھا کہ سروج میں کوئی ایسا فتنہ کھڑا ہو جس کے بارے میں امیر اس سے پوچھ کرے۔ اس کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ شنزادی کو سروج سے کسی طرف چلتا کر دیا جائے تاکہ اس کا دھڑکا ہی ختم ہو جائے۔ پس جب شنزادی ارسلان نے خود ہی انطاکیہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے کوئی اعتراض نہ کیا اور خوشی خوشی اسے اجازت دے دی۔

شنزادی ارسلان اگرچہ شاہ جو سیلین کی بہن تھی مگر سلطنت کے معاملات سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ ان سے ہمیشہ دور رہتی تھی پھر جب اس کے شوہر کا انتقال ہوا تو وہ بالکل گوشہ نشین ہو گئی۔ وہ اپنی جاکیر سے بہت کم نکلتی تھی۔ وہ کئی سال سے نہ تو شاہ جو سیلین کی ناکھوتی تھی اور نہ کسی شاہی تقریب میں شرکت کی تھی تمام توجہ اپنی اکلوتی بیٹی شنزادی کے پرورش پر تھی۔ کیٹ نے اسی سال عمر کی تیہ ہماریں دیکھ کے چودہویں سال میں رکا تھا۔ یہ اس کی جوانی کا پہلا سال تھا اور اس کا کلاں چہرہ چودہویں کے چاند کی روشنی میں تھا۔ قدرت نے کم عمر شنزادی کو حسن کے تمام لوازمات سے پوری طرح آراستہ نہ شامی رخسار اور نرم گئی آنکھیں۔ کیٹ جب بھاری پلکیں جھپکاتی تو دیکھنے والوں کو رازدہ ہو کر رہ جاتی۔ مگر اسے اب تک کوئی دیدہ ور نہ ملا تھا۔ اسے دیکھنے والے یا تو اس کا عظام تھے یا پھر اس کی والدہ کے ملنے جلنے والے سروج کے معززین تھے مگر یہ آنے

”ہماری حفاظت کی جائے سپہ سالار۔“

”تم چاہتی ہو کہ تمہارے گھر پر فوجی پہرہ لگایا جائے؟“

”جیسا آپ بہتر خیال فرمائیں سپہ سالار محترم۔“ شنزادی بے دلی سے بولی۔

”بے وقوف شنزادی۔ تمہیں شکایت ہے کہ میرے لشکری تمہیں پریشان کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی چاہتی ہو کہ جو لشکری تمہیں پریشان کر رہے ہیں انہیں کاہلو تمہارے گھر پر لگایا جائے۔“

”تو پھر مجھے خود اپنی حفاظت کی اجازت دی جائے سپہ سالار۔“ شنزادی نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔

”تم اپنی حفاظت کس طرح کرو گی؟“

شنزادی ارسلان نے مایوس لہجے میں کہا۔ ”سپہ سالار۔ میں سروج میں اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہوں اور آپ کو میرا بار بار شکایت کرنا ناگوار گزرتا ہے اس لئے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آپ میری ذمہ داری سے ہاتھ اٹھالیں۔“

”پہیلیاں بچانے کی ضرورت نہیں ارسلان۔“ ہلوکش چڑ گیا۔ ”جو کتا ہے صاف صاف مار دو۔“

”تم کیا کرنا چاہتی ہو؟“

”مجھے کسی اور طرف نکل جانے کی اجازت دی جائے سپہ سالار۔“ شنزادی نے با دھڑک کہہ دیا۔

”کہاں جاؤ گی تم؟“

”میں انطاکیہ چلی جاؤں گی سالار۔“

ہلوکش چند لمحے سوچتا رہا پھر ہنس کے بولا۔۔۔۔۔ ”تم نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ میں سروج میں تمہاری موجودگی پسند نہیں کرتا مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر کل ہم انطاکیہ پر قبضہ کر لیا تو پھر تم کہاں جاؤ گی؟“

”پھر جہاں تقدیر لے جائے گی وہاں چلی جاؤں گی مگر آپ سے شکوہ نہ کروں گی۔“

”ٹھیک ہے۔ تم جاسکتی ہو مگر تمہیں سروج سے کوئی قیمتی چیز لے جانے کی اجازت ہو گی۔“

”میں سب کچھ آپ کے حوالے کر چکی ہوں سالار۔“ شنزادی نے جواب دیا۔ ”میرا سواری کے لئے چند گھوڑوں کی ضرورت ہو گی۔ میرا خیال ہے آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

”بالکل نہیں۔ تم جتنے گھوڑے ساتھ لے جانا چاہتی ہو، لے جاسکتی ہو مگر تمہارا

والے جوانی کی حدود سے بہت آگے نکل چکے تھے اور شہزادی کیٹ کو ایک باپ کی شفقت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔

شہزادی کیٹ کو خود بھی اپنے حسن و جوانی کا احساس نہ ہوا تھا۔ اسے اب تک نے جوان نظروں سے دیکھا ہی نہ تھا۔ حسن کی جب تک احساس نہ دلایا جائے اس حتمیت نہیں آتی۔ غنچے کو جب تک باد نسیم کے جھونکے لوریاں نہ دیں اس کی خوشبو پھیلتی۔ غلام شہزادی کو دیکھتے ضرور تھے مگر ان کی نظریں فوراً جھک جاتی تھیں اور تو کے جذبات اندر ہی اندر گھٹ کے رہ جاتے تھے۔ شہزادی بھی ممکن ہے کہ کسی شہزاد خواب دیکھتی ہو مگر اس نے اپنے غلاموں کے علاوہ کوئی شہزادہ دیکھا ہی نہ تھا۔ اس نے کا خواب ادھورا اور تصور اب تک ناتمام تھا۔

شہزادی ارسلان کے کیا ارادے تھے اور اس نے ہلو کشش سے انٹاکہ جانے کی اجازت حاصل کی تھی۔ اس کا حال سوائے خود اس کے اور کوئی نہ جانتا تھا۔ اس کے ساتھیوں کو یہی معلوم تھا کہ وہ سب انٹاکہ پناہ حاصل کرنے جا رہے ہیں شہزادی کیٹ بھی یہی خیال تھا کہ وہ اپنی جائے پیدائش اور باپ دادا کا وطن چھوڑ کے ہمیشہ کے لئے ایسے ملک میں پناہ حاصل کرنے جا رہی ہے جہاں کی آب و ہوا اور وہاں کے لوگوں مزاج کے متعلق اسے کچھ بھی علم نہ تھا۔ اسی وجہ سے شہزادی کیٹ کو سروج چھو بہت افسوس اس کا پھول سا چہرہ کھلا گیا تھا اس ماں شہزادی ارسلان بیٹی کا افسردہ چہرہ اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتی۔ وہ اس وقت کس قدر بے بس اور بے اختیار تھی۔ خیال سے اس کی بھی آنکھیں بھر آتی تھیں۔

غروب آفتاب پر ان لوگوں نے ایک منزل پر پڑاؤ ڈالا۔ یہاں سرائے نام کی کوئی تھی۔ نہ گھوڑے بدلنے اور نہ کھانے پینے کا کوئی انتظام تھا۔ صرف چند جھونپڑیاں تھیں جن میں چراغ ٹٹا رہے تھے۔ پھر بھی شہزادی ارسلان نے اس منزل پر پہنچنے کے اہم کام لیا اور اس کے اترے ہوئے چہرے پر پھر سے تازگی آگئی۔ شہزادی کیٹ نے کو خوش دیکھا تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔

”اما۔ آپ بہت خوش نظر آرہی ہیں حالانکہ یہاں چند جھونپڑیوں کے سوا اور کچھ نہیں؟“

”تیری دونوں باتیں ٹھیک ہیں کیٹ۔“ ارسلان نے پرسکون لہجے میں کہا۔ ”ہمیں اور میری خوشی میں اس وجہ سے اور اضافہ ہو گیا ہے کہ اس منزل پر کوئی پتہ نہیں ہے۔“

”یہ نے ماں کو حیران نظروں سے دیکھا۔“ اما۔ آپ ہی بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ ان جھونپڑیوں میں کیا آرام مل سکتا ہے؟“

”جان اما۔“ شہزادی ارسلان نے کیٹ کو پیار سے سمجھایا۔ ”ہم لوگوں کو اس وقت آرام سے زیادہ ذہنی سکون کی ضرورت ہے۔ اگر یہ بڑی سرائے ہوتی تو لوگ ہم سے ولایت کر کے جان کھا لیتے۔ ہم کس کس کا جواب دیتے اور کیا جواب دیتے۔ سروج یہاں سے صرف ایک منزل پر ہے ممکن ہے کہ ہم میں سے کسی کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل آج جو ہمارے حق میں مضرت ثابت ہوتی۔ امیر زندگی کا سالار ہم لوگوں کا دشمن ہو رہا ہے۔ رہا ہے منہ سے کوئی کلمہ نکلے اور اس کی خبر امیر زندگی کے سالار کو پہنچے تو یقین ہے کہ وہ ارا تاقب کر کے ہمیں گرفتار کر لے گا۔“

”اما میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ مسلم سالار نے اس سروج سے نکال دیا ہے اور اب ہم انٹاکہ جا رہے ہیں۔ اس کے سوا مجھے اور کچھ لینے کی بھی ضرورت نہیں۔“ شہزادی کیٹ کو ماں کی باتوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ بے نیچے میں جانے کے لئے کھری ہو گئی۔

”کہاں جا رہی ہو تم؟“ ارسلان نے شہزادی کو متعجب نظروں سے دیکھا۔ ”انگل فیرو کے پاس جا رہی ہوں۔ آپ کی باتوں سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ وہاں منہ بنانے لگی۔“

”ابھی تو کھانا بھی نہیں کھایا ہے تم نے۔“ ارسلان نے اسے روکنے کے لئے کہا۔ ”یہ سروج کا محل نہیں ہمارے سفر کا ایک پڑاؤ ہے۔ یہاں تم میرے ہی نیچے رہو گی۔ انگل فیرو اور دوسرے لوگ بھی یہیں آئے والے ہیں۔ مجھے سب سے کچھ دینی باتیں کرنا ہیں۔“

”آپ کوئی سنجیدہ گفتگو کرنا چاہتی ہیں کیا؟“ کیٹ نے سوال کیا۔ ”سنجیدہ اور بہت اہم گفتگو۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔“

”مگر اس سنجیدہ گفتگو میں آپ انگل فیرو کو کیوں شریک کر رہی ہیں۔ وہ آپ کی سنجیدہ کو اپنے چٹکوں میں اڑا دیں گے۔“ کیٹ نے اعتراض کے انداز میں کہا۔

”میں جانتی ہوں کیٹ۔ انگل فیرو غیر سنجیدہ آدمی ہیں لیکن وہ پاگل تو نہیں۔ وہ باتوں میں بڑے پتے کی بات کہہ جاتے ہیں۔ میں اسی لئے انہیں اس محفل میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔“

ارسلان کی بات کیٹ کی سمجھ میں آگئی اور وہ ماں کے قریب بیٹھ گئی۔ ”ٹھیک ہے میں



ہرکت تھے کیٹ بھی ماں سے زیادہ انکل فیرو سے مانوس تھی۔ وہ ہر وقت اپنی دلچسپ باتوں کیٹ کو ہنساتے رہتے اور ہنسی ہنسی میں شہزادی کو دنیا کی اونچ نیچ سے بھی آگاہ کرتے رہتے۔

شہزادی ارسلہ کے ساتھ آدمی ہی کتنے تھے۔ یہاں پر پہنچ کے انہوں نے جلدی جلدی نیچے لگا اور کھانا پکانے میں لگ گئے۔ ان جھوپڑیوں میں رہنے والے ان کی کیا مدد کرتے ان غریبوں کے پاس اپنے رہنے کے لئے بھی مشکل ہی سے جگہ تھی۔ شہزادی ارسلہ کے بارہ چوں نے اپنے لوگوں کے علاوہ سرائے کے پانچ آدمیوں کے لئے بھی کھانا پکا لیا اور انہیں کھانا تیار ہوتے ہی بھیج دیا گیا۔ ان لوگوں نے قافلے والوں کو ہزاروں دعائیں دیں انہیں پتہ بھی نہ لگا کہ ان کی جھوپڑیوں کے باہر شاہ الرہا جو سلیں کی بہن شہزادی ارسلہ کا باؤ لگا ہوا اور شہزادی چاہتی بھی یہی تھی کہ اس کے سفر کا چرچا کم سے کم ہو۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تمام لوگ شہزادی ارسلہ کے خیمے میں جمع ہو گئے۔ شہزادی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جاگیر کا خاتمہ۔ تمام قیمتی سامان اور زبورات کا چھینا جانا اور یہ تکلیف دہ سفر۔ اس کی طرح اس کے ساتھی بھی پریشان تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ دوسرے ملک والے ان کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ اخلاقیہ میں ایک عیسائی ریاست تھی مگر غیر جگہ تو غیر ہی ہوتی ہے۔ سب کے چروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں مگر انکل فیروں اس سنجیدہ اور گھمبیر ماحول میں بھی ارسلہ کے برابر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ شہزادی ارسلہ ان کی بہت عزت کرتی تھی۔ وہ ملنے آتے تو شہزادی ان کے استقبال کو کھڑی ہو جاتی اور ہمیشہ اپنے برابر اپنے سے اونچی جگہ بٹھاتی تھی۔ انکل فیرو کسی بھی محفل میں خاموش نہیں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھی وہ کیٹ سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے۔

”دیکھو کیٹ۔ اخلاقیہ پہنچ کے مجھے بھول نہ جانا ورنہ میں تم سے خفا ہو جاؤں گا۔“

”مگر انکل۔ آپ بھی تو میرے ساتھ انطاکہ جا رہے ہیں۔“ شہزادی کیٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اچھا تو کیا ہم اخلاقیہ جا رہے ہیں؟“ انکل فیرو سوال کرنے کے بعد شہزادی ارسلہ کو گورنے لگے۔

”انکل۔ کیا آپ کو شبہ ہے۔ یہ سڑک سیدھی اخلاقیہ جاتی ہے۔“ کیٹ نے مصومت سے انہیں سمجھا۔

”سڑک واقعی اخلاقیہ جانے والی ہے۔“ انکل فیرو قدر سنجیدگی سے بولے۔ ”مگر یہ ضروری نہیں کہ ہم اخلاقیہ پہنچیں۔“

یہیں بیٹھی ہوں اور دیکھتی ہوں آپ کیا سنجیدہ گفتگو کرتی ہیں اور انکل فیرو اسے کس طرح ہنسی مذاق میں اڑاتے ہیں۔“

”ابھی تم بیٹھو نہیں۔“ ارسلہ نے اسے دوسرا حکم دیا۔ ”تم انکل فیرو کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ کھانا کھانے کے بعد وہ میرے خیمے میں آجائیں۔“

”اور یہ بھی کہہ دوں کہ مانا ان سے بڑی سنجیدہ گفتگو کرنے والی ہیں؟“ کیٹ نے شہزادی دکھائی۔

”کیٹ۔“ ارسلہ نے ذرا غصے سے کہا۔ ”ہر بات ہنسی میں نہ اڑایا کرو۔ ہم اس وقت کس عالم میں ہیں۔ تمہیں اس کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔“

شہزادی نے اپنے مسکراتے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔ ”ٹھیک ہے مانا۔ انکل اطلاع دے کے ابھی آتی ہوں۔ کیا دوسرے لوگوں کو بھی آپ کا حکم سمجھوا دوں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے کیٹ۔ انہیں پہلے ہی مطلع کر دیا گیا ہے۔ صرف تمہارے انکل فیرو رہ گئے تھے جنہیں اطلاع دینے تم جا رہی ہو۔“

شہزادی کیٹ کے اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔ ”مام۔ آپ کہہ رہی ہیں میرے انکل فیرو کیا انکل صرف میرے انکل ہیں۔ آپ بھی تو انہیں انکل فیرو ہی کہتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سروج کے سب چھوٹے بڑے انہیں انکل فیرو ہی کے نام سے پکارتے تھے۔“

”ٹھیک ہے کیٹ۔“ ارسلہ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”مجھے اور تمہارے پاپا کو انہوں نے اپنی گود میں کھلایا ہے۔ تمہیں معلوم نہیں جب تمہارے پاپا کا انتقال ہوا تھا اس وقت انکل فیروں کس قدر پھوٹ کے روتے تھے انہیں کسی نے کبھی روتے نہیں دیکھا۔ ان کی موت کے دن بھی وہ محفل میں اپنے چنگلو سے کھلا رہے تھے۔ ان کا دل اندر سے کس قدر زخمی تھا۔ اس کا حال صرف مجھے معلوم ہے۔ ایک رات اچانک میں ان کے کمرے کے سامنے سے گزری۔ مجھے کسی کی ہچکیوں کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ انکل سامنے اپنے بستر پر دو زانوں بیٹھے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تمہارے پاپا کی تصویر تھی۔“

تصویر کو بار بار چوم رہے تھے اور زار زار رو رہے تھے۔ صرف اسی رات نہیں۔ میں نے انہیں ایک سال تک اسی طرح ہر رات روتے اور آنسو بہاتے دیکھا مگر صبح کو وہ اسی طرح ہشاش بشاش نظر آتے۔ لوگ انہیں دیوانہ سمجھتے ہیں مگر وہ اس دیوانگی میں بھی بوئے فرائد ہیں۔“

شہزادی کیٹ بڑی توجہ سے ماں کی باتیں سن رہی تھی۔ انکل فیرو کے بارے میں ان کی ماں نے جو کچھ کہا تھا اس کا شہزادی کو بھی تجربہ ہو چکا تھا۔ شہزادی کیٹ نے

کیٹ کی ماں شہزادی ارسلہ کی کان پہلے ہی کھڑے ہو گئے تھے۔ اس نے انکل فیرو کی جرح سنی تو اپنی پوری توجہ ان دونوں کی گفتگو کی طرف لگا دی۔ لوگ فیرو کو خواہ کتنا ہی مجذوب اور پاگل سمجھتے ہوں مگر شاید ارسلہ کو یہ یقین تھا کہ انکل فیرو کو قدرت نے یقیناً کوئی ایسی طاقت دی ہے کہ ان کی مجذوبانہ بڑ میں کوئی ایسی بات ضرور منہ سے نکل جاتی ہے جو مستقبل کی ایک صحیح پیشین گوئی ہوتی ہے۔

شہزادی کیٹ اور انکل فیرو خاموش ہو چکے تھے۔ شہزادی ارسلہ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا۔ ”میرے جاں نثارو۔ آپ جانتے ہیں کہ سروج میں ہماری زندگی کس قدر غلاب بنا دی گئی تھی۔ مسلم سالار کو ہمارا مال و اسباب ضبط کر لینے کے بعد بھی ہمارے اوپر رحم نہیں آیا۔ ہماری عزت و آبرو بھی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ فی الحال سروج سے کہیں دور چلی جاؤں۔“

”شہزادی آپ نے بڑی عقل مندی کا ثبوت دیا۔“ ایک ساتھی نے کہا۔ ”بزرگوں کا قول ہے کہ اگر آپنے ملک کی زمین تک ہو جائے تو ہمیں سزا کرنا چاہئے۔“

انٹاکہ۔ ہمارے ہم مذہبوں کی ریاست ہے وہاں ہمیں ضرور پناہ ملے گی۔ کم از کم ہماری عزت و آبرو تو محفوظ رہے گی۔“ ایک دوسرے ساتھی نے اس طرح اپنے خیال کا اظہار کیا۔

شہزادی ارسلہ اک دم پلٹ کے انکل فیرو سے مخاطب ہوئی۔ انکل فیرو آپ کی کیا رائے ہے؟“

انکل فیرو نے ایک ہلکا سا تھک لگایا۔ ”شہزادی رائے تو صرف وہ شخص دے سکتا ہے جس کے ہاتھ میں کچھ اختیار ہو۔ باقی ہم لوگ تو محض بکواس کرتے ہیں۔“

حاضرین میں سے ایک نے دوسرے سے کہا۔ ”انکل فیرو اتنی اہم بات کو بھی ہنسی میں اڑا رہے ہیں۔ پتہ نہیں ان کا دماغ کب صحیح ہو گا۔ ہر وقت پاگل پن کی باتیں۔“

”شہزادی نے خواہ مخواہ اس جنونی کو سرچڑھا رکھا ہے۔ اسے تو سروج ہی میں چھوڑ دینا چاہئے تھا۔“ دوسرے نے اپنے ساتھی کو سرگوشیوں میں جواب دیا۔

اسی وقت شہزادی ارسلہ کی تیز آواز ابھری اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ شہزادی ارسلہ انکل فیرو سے پوچھ رہی تھیں۔ ”انکل فیرو۔ یہ سڑک کس طرف جاتی ہے؟“

انکل فیرو نے بڑے بے ڈھنگے پن سے اوپر کی طرف دیکھا۔ ”میرلی بیٹی ارسلہ۔ راستے چلنے والوں کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ رستے چلنے والوں کے نقش قدم سے بنے ہیں۔ ہم ان پر چل کر جس طرف جانا چاہیں جاسکتے ہیں۔“

انکل فیرو کے اس جواب سے حاضرین کے چہروں پر ناگواری کے آثار پیدا ہو گئے مگر شہزادی نے اس کا بالکل برا نہ مانا اور بولی۔ ”مگر انکل فیرو آپ یہ تو جانتے ہیں کہ یہ راستہ بدھا انٹاکہ کو جاتا ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ یہ راستہ ضرور انٹاکہ کو جاتا ہو گا مگر اس پر سفر کرنے والے کسی اور شہر کا بھی رخ کر سکتے ہیں۔“ انکل فیرو کی اس بات پر لوگ مسکرائے بغیر نہیں رہ سکے اور ایک دوسرے کو اشارے کرنے لگے۔

شہزادی ارسلہ جیسے بچے جھاڑ کے انکل فیرو کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اس نے پھر سوال کیا۔ ”ہم اس راستے سے اور کس مقام کو جاسکتے ہیں۔“

”یہ راستہ ہماری جنت یعنی دارالسلطنت الہا کو بھی جاتا ہے۔“ اور انکل فیرو نے تالیاں بجا کے ہنسا شروع کر دیا۔

محفل بہت غیر سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ہر ایک انکل فیرو کو اس طرح گھور رہا تھا جیسے موقع ملے ہی انہیں پھاڑ کھائے گا شہزادی ارسلہ پوری محفل سے غیر متعلق ہو کے صرف انکل فیرو کے پیچھے لگی تھی۔ ”انکل فیرو کیا آپ کو معلوم نہیں کہ الہا کی عیسائی بادشاہت ختم ہو چکی ہے اور وہاں امیر موصل عماد الدین زنگی نے قبضہ کر رکھا ہے۔ آپ کو شاید یہ بھی علم نہیں کہ اس امیر زنگی کے ایک ادنیٰ غلام ہلوکش نے ہمیں سروج سے نکلنے پر مجبور کیا ہے؟“

”بہت خوب۔ بہت خوب۔ تم نے بڑے وقت پر یاد دلایا۔“ انکل فیرو اب بھی آہستہ آہستہ تالیاں بجا رہے تھے۔ ”ادنیٰ غلام اور ایک اعلیٰ اور ارفع آقا۔ روشنی کے قریب ہی تمہیں اندھیرا ہوتا ہے شہزادی ارسلہ۔ تم آقا اور غلام کے فرق کو نہیں سمجھتیں کیا یاد رکھو خطرے کے جتنے قریب رہو گی۔ خطرہ تم سے اتنی ہی دور بھاگے گا۔“

شہزادی سناٹے میں آگئی۔ اس نے انکل انکل کے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آپ کے خیال میں ہمیں انٹاکہ کے بجائے الہا جانا چاہئے؟“

”ہا ہا ہا ہا۔۔۔۔۔!“ انکل فیرو زور سے ہنسنے لگا۔ ”میرا خیال۔ یہ تو اس کا خیال ہے۔ تمہارا خیال ہے ہم سب کا خیال ہے۔ الہا کے سوا ہم اور کہاں جاسکتے ہیں؟“

انکل فیرو اٹھ کے کھڑے ہوئے اور ٹھمکیاں بھرتے اور ناپتے ہوئے شہزادی کیٹ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لئے ہوئے خیمے سے باہر چلے گئے۔

شہزادی ارسلہ نے حاضرین پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ ہر ایک کی تیوریاں چڑھی تھیں اور چہرے پر خفگی اور ناراضگی کے آثار نمودار تھے۔ شہزادی ارسلہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔

نہ تھا۔ امیر نے اس کے حسن میں اور زیادہ اضافہ کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے مفتوحہ علاقے میں نہ صرف امن و امان کا دور دورہ ہو بلکہ نصرانی رعایا اسے دل سے اپنا امیر تسلیم کر لے اور ان کے دلوں سے شاہ جو سیلین کا خیال بالکل نکل جائے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ امیر زندگی اپنے دشمن کی طرف سے غافل ہو گیا تھا۔ امیر کی پہلی جنگوں سے یہی انداز ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تک میدان جنگ میں نہیں اترتا جب تک پوری طرح تیار نہ ہو جائے اور دشمن کی صحیح طاقت کی اسے خبر نہ مل جائے۔ الہا میں جو سیلین موجود نہ تھا اس وجہ سے ایک انگریز مورخ کے مطابق الہا پر قبضہ کرنے میں امیر کو پورا ایک ماہ لگ گیا۔ واضح رہے کہ ہمارے مشرقی اور مسلمان مورخوں نے اس سلسلے میں کوئی تحقیق نہیں کی اور وہ انگریزی تاریخ پر مصاد کرتے نظر آتے ہیں۔ امیر کو یہ علم ہو یا تھا کہ شاہ جو سیلین تل باشر یا اس کا مضافات میں موجود ہے اور فوجی تیاریاں کر رہا ہے۔ تل باشر میں جو سیلین نے عجب طلسمی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ تل باشر کوئی فوجی قلعہ نہ تھا بلکہ شاہوں کی تفریح کا ایک پر فضا مقام تھا لیکن الہا پر قبضے کی خبر پھیلنے ہی شاہ جو سیلین نے چند ہی دنوں میں اس خوبصورت شہر کو ایک مضبوط قلعہ میں تبدیل کر دیا۔ تل باشر کے درجہ کی فہمیل پہلے ہی تھی۔ جو سیلین نے اس فہمیل کے اندر کی طرف ایک گہری نہر کھدوا رکھی فہمیل تعمیر کرا دی۔ جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق تل باشر اور اس کے گرد فوجی دہان بھی زوروں پر تھیں مگر ایک افواہ یہ پھیلی ہوئی تھی کہ شاہ جو سیلین تل باشر چھوڑ دیا گیا ہے۔ امیر زندگی جیسے جہاننیدہ آدمی کے لئے یہ اطلاع خوش آئند ہونے سے انکار انگیز تھی۔ اگر جو سیلین تل باشر سے بھاگ گیا تھا تو پھر یہ فوجی تیاریاں کون کر رہا ہے۔

امیر زندگی نے اس افواہ کا کوئی اثر نہ لیا اور اپنے انتظامات میں مصروف رہا۔ تل باشر پر ڈالنے کے لئے اس نے قرب و جوار کے علاقوں پر اپنے فوجی دستے بھیج دیئے تھے تاکہ وہ ان کا تعاون حاصل ہو جائے اور جب زندگی لشکر تل باشر کی طرف پیش قدمی کرے تو اس کی پشت مضبوط ہو اور دائیں باتیں کے پہلو بالکل محفوظ ہوں سروج کے علاقہ پر امیر باقاعدہ لشکر کشی کرائی تھی اور ایک مختصر مگر مضبوط فوج کے ساتھ اپنے خاص غلام کشش کو بھیجا تھا۔ سروج پر قبضہ اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ اس کے بعض جاسوسوں مقامی لوگوں نے بتایا تھا کہ سروج کا علاقہ شاہ جو سیلین کے عزیزوں کے قبضہ میں ہے وہاں ایک سخت مقابلہ ہو سکتا ہے۔ مگر سروج پہنچ کے ہلو کشش نے وہاں کے لوگوں کے راجو سلوک کیا اس کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔

”دوستو! انکل فیرو کو دنیا پاگل سمجھتی رہے عمر میری نظر میں وہ ایک ایسے بزرگ ہیں جن قہقہوں میں مستقبل کی باتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ میں نے سروج سے چلتے وقت سب سے کہا تھا کہ ہم سروج چھوڑ کے اٹھائیکہ میں پناہ لینے جا رہے ہیں مگر میں نے یہ بات اس سے کہی تھی کہ ایک طرف تو آپ لوگوں میں پریشانی پیدا نہ ہو دوسری طرف مسلم سالار ہمارا پیچھا کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ اب میں آپ کو صاف صاف بتاتی ہوں کہ سروج میں نے اٹھائیکہ کے راستے پر ایک منزل تک اس لئے سفر کیا تھا کہ اپنے دشمن کو فہم دے کر میں بے خوف و خطر اپنی منزل کی طرف جا سکوں۔ ساتھیو میری منزل اٹھائیکہ نہیں بلکہ دارالسلطنت الہا ہے۔ اٹھائیکہ جا کر اپنے بھائیوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے یہ زنا بہتر ہے کہ میں اپنے دشمن سے اپنا حق طلب کروں۔ ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ سے لڑا ہے۔ ایک کو فتح اور دوسرے کو شکست کھا کر تخت خالی کر دینا پڑتا ہے مگر شاہی بیگمات عزت و حرمت میں بہت کم فرق آتا ہے۔ فاتح اپنے مفتوح کے خاندان کی بیگمات کو اس ملک میں رکھنا نہیں چاہتے تو انہیں عزت کے ساتھ ان کے وارثوں کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ میں آخر ایک شہزادی ہوں۔ میرا بھائی جو سیلین الہا نکل جانے کے باوجود اس وقت بھی ایک بڑے علاقے کا مالک ہے۔ مسلم سالار نے مجھے سروج سے خالی ہاتھ نکالا ہے میں الہا پہنچ کے امیر موصل سے اس ظلم کی فریاد کروں گی۔ اگر امیر موصل نے مجھے سروج نہ دلایا تو کم از کم ہمارے زیورات اور قیمتی سامان ہمیں واپس مل جائیں گے اور ہم اس بے سروسامانی کے بجائے امیر موصل کے دستوں کی حفاظت میں جہاں جانا چاہیں گے وہاں پہنچا دیئے جائیں گے۔ میں یہی منصوبہ بنا کے سروج سے نکلی تھی۔ میرے اس منصوبہ کا تائید غیب کی طرف سے ہو گئی۔ ہمارے مجذوب انکل فیرو نے ہنسی ہنسی میں کہہ دیا کہ الہا جانا ہی ہمارے لئے بہتر ہے۔ اس لئے جو لوگ میرے ساتھ الہا جانا نہیں چاہتے وہ رات کی تاریکی میں میرے قافلے سے الگ ہو سکتے ہیں۔ مجھے ان سے کوئی شکوہ نہ ہو گا۔“

امیر عماد الدین زندگی نے الہا پر قبضہ کے بعد تل باشر کی طرف قدم نہیں بڑھائے حالانکہ اس کے بعض سرداروں کی درخواست تھی کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور تل باشر پر فوراً حملہ کر کے اس نصرانی حکومت کی طاقت کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ امیر زندگی نے سنی سب کی مگر تل باشر سے قدم نہ نکالا۔ الہا کو محاصرہ اور قبضہ کے دوران کچھ نقصان پہنچا تھا اور امیر اس کا تذکر کرنا چاہتا تھا۔ امیر نے تمام لوٹا ہوا سامان ان کے مالکوں کو واپس کرا دیا عمارتوں کی مرمت کرائی اور رعیت کو اس قدر مراعات دیں کہ الہا چھوڑ کے جانے والے پھر اپنے اپنے گھروں میں واپس آ گئے۔ الہا پہلے ہی ایک خوبصورت

نہا ہے مگر اس کے اس خیال کی تردید اس بات سے ہو جاتی تھی کہ امیر کے غلام اس حد درجہ خوفزدہ رہتے تھے خود ہلوکشش اس قدر قریب ہونے کے باوجود امیر کے غصے سے ہر وقت پریشان رہتا تھا۔ امیر کا ان غلاموں پر اس قدر خوف غالب تھا کہ ایک بار امیر نے کسی موقع پر ایک قلعہ اپنے غلام کو دیا اور اس سے کہا کہ قلعے کو اپنے پاس رکھے۔ غلام نے اس قلعہ کو رومال میں لپیٹ کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ایک دن گزرا۔ دو روز ہو گئے۔ پھر مہینے گزرے اور ایک سال ہو گیا مگر امیر نے اس سے قلعہ طلب نہ کیا۔ مگر ظاہر تھا کہ امیر قلعہ بھول چکا ہے۔ اگر غلام قلعہ ضائع کر دیتا تو وہ اپنے فعل میں حق باہر تھا مگر کہتے ہیں ایک سال اور کچھ ماہ گزرنے کے بعد جب کہ اس کا وہی غلام اس کے ہرکب تھا۔ امیر زنگی نے اچانک غلام سے اپنا دیا ہوا قلعہ طلب کیا۔ اب یہ اس غلام کی مزاج دانی یا امیر کا خوف تھا کہ اس نے وہ رومال نکال کے امیر زنگی کے ہاتھ میں پکڑا یا جس میں اس نے قلعے کو بڑی حفاظت سے باندھا تھا قلعہ اتنا عرصہ گزر جانے پر سوکھ کے پراچورا ہو گیا مگر امیر زنگی کے غلاموں کی مزاج دانی جسے امیر زنگی اپنا خوف کہتا تھا، اس نے خوش ہوا کہ اسے غلام کے فرائض سے بلند کر کے ایک دستے کا سردار بنا دیا۔

شیر کوہ کا مشاہدہ اور تجربہ مجبور کر رہا تھا کہ وہ امیر سے صاف صاف کہہ دے کہ ہلوکشش سے اسے وفا کی امید نہیں اور اسے دربار میں طلب کر کے اس تباہی کی راہی جائے مگر اس نے تحمل سے کام لیا اور خاموشی اختیار کر لی اس وقت قدرت نے اس کی مدد کی اور وہ بات خود ہی سامنے آگئی جس کے اظہار کے لئے وہ بے چین ہو رہا تھا۔

”کہہ اپنی ادھر بن میں تھا کہ ایک دربان حاضر ہوا۔“

”آقائے محترم۔ سروج کے علاقے سے کچھ لوگ آئے ہیں اور قدم بوسی کے خواہش ہیں۔“

دربان کی اس اطلاع پر امیر زنگی چونک پڑا۔

”کیا ہلوکشش ان کے ساتھ نہیں آیا؟“ امیر زنگی کے لہجے میں تلخی تھی۔

”جی نہیں امیر عالی مقام۔“ دربان نے نفی میں جواب دیا۔ ”آنے والوں میں بعض لوگ کا تعلق رہا کے سابق شاہ جو سیلین کے خاندان سے ہے۔“

امیر زنگی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”کیا شاہ جو سیلین کی ملکہ تشریف لائی

”ملکہ کے بارے میں مجھے علم نہیں امیر۔“ دربان نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

ایک خاتون خود کو شاہ جو سیلین کی بیوہ بہن شہزادی ارسلان بتاتی ہیں۔ ان کی بیٹی شہزادی

سروج پر بھیجی ہوئی مہم کو تقریباً ایک ماہ کا عرصہ ہو گیا تھا مگر وہاں سے امیر زنگی کو صرف ایک اطلاع موصول ہوئی تھی۔ ہلوکشش نے ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعے امیر کو صرف سروج پر قبضے کی خبر بھیجی تھی۔ سروج سے آنے والا قاصد سوائے اس مختصر خبر کے سروج کے بارے میں کوئی تفصیل نہ بتا سکا تھا۔ امیر نے سوچا تھا کہ شاید ہلوکشش سروج کے قبضے کے بعد وہاں کے انتظام میں مصروف ہے اس وجہ سے تفصیل سے آگاہ نہیں کر سکا مگر اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود بھی سروج سے جب کوئی دوسری اطلاع نہ آئی تو امیر زنگی کا فکر مند ہونا قدرتی بات تھی۔ آج بھی امیر زنگی اور اس کے قابل اعتماد سردار اسد الدین شیر کوہ میں اسے سلسلے میں گفتگو ہو رہی تھی۔

”اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد سروج سے کوئی دوسری خبر نہ آنا کیا فکر کی بات نہیں ہے شیر کوہ؟“ امیر زنگی رہا کے شاہی محل کے ایک کمرے میں بے چینی کے عالم میں مل رہا تھا۔

”یقیناً یہ فکر کی بات ہے۔“ شیر کوہ نے مختصراً جواب دیا۔ ”مگر امیر کا حکم ہو تو میں خود وہاں چلا جاؤں یا پھر کسی دوسرے کو وہاں بھیج کے اصل حالات کا پتہ لگایا جائے۔“

”نہیں شیر کوہ۔ سروج اور کوئی سردار نہیں جائے گا۔“ امیر نے رک کے کہا۔ ”مگر دو روز تک سروج سے کوئی خبر نہ آئی تو ہم ہلوکشش کو رہا طلب کر کے اس سے پوچھ گئے کہ اس نے ہمیں اتنے روز تک فکر و تردد میں گرفتار رکھنے کی جرات کیسے کی۔ کیا اس کے دل سے ہمارا خوف زائل ہو گیا تھا پھر ہمارے درباری دیکھیں گے کہ امیر زنگی کی نظروں سے گرنے والے غلام کا کیا حشر ہوتا ہے۔“

خواجہ سرا ہلوکشش کے بڑھے ہوئے اقتدار سے شیر کوہ نے انداز لگا لیا تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ کم ظرف غلام کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلائے گا لیکن وہ ہلوکشش سے خود انہما

نہیں چاہتا تھا۔ امیر زنگی نے ہلوکشش کو کئی ذمہ داریاں سپرد کر رکھی تھیں۔ امیر اگرچہ غلاموں اور خصوصاً ارمنی، یونانی اور ترکی غلاموں کے معاملے میں بڑی تند مزاجی سے کام لیتا تھا مگر دوسری طرف غلاموں کے اس گروہ کا ایک دستہ امیر زنگی کی ذاتی حفاظت پر مشتمل تھا۔ ہلوکشش اس دستے کا سردار تھا اور امیر کا یہ محافظ دستہ اس قدر سرکش ہو گیا تھا کہ بڑے بڑے سرداروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا مگر اس کو کہا جائے کہ امیر زنگی انی غلاموں پر سب سے زیادہ اعتبار کرتا تھا۔

ہلوکشش کی اس طویل خاموشی سے شیر کوہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ شاید اس خود سروج نے سروج پر قبضہ کرنے کے بعد شاہ جو سیلین سے کوئی معاملہ کر لیا ہے اور اب بجائے

کیٹ ان کے ساتھ ہے۔“

”شیر کوہ۔“ امیر نے اسد الدین شیر کوہ کو مخاطب کیا۔ ”جاؤ اور دیکھو اگر وہ شاہان کی بیگمات ہیں تو انہیں عزت سے مہمان خانے میں اتارو اور معلوم کرو کہ وہ غرض سے رہا آئی ہیں۔ دربان کہہ رہا ہے کہ وہ سروج سے آئی ہیں۔ ان سے بلوئہ کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرو۔ ہم کل ان سے گفتگو کریں گے۔“

شیر کوہ قبیل حکم کے لئے باہر چلا گیا۔ باہر پچیس تیس مردوں اور عورتوں کا ایک موجود تھا۔ شیر کوہ نے ان پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ”آپ میں شاہ جو سیلین کی ہمشیرہ فرار سلا کون ہیں؟“

شیر کوہ نے ایک قدم آگے بڑھا کر جواب دیا۔ ”قبل اس کے کہ ہم یہ جانیں کہ ہم سب کون کون ہیں میں اپنے مخاطب سے بڑے ادب سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ خود کون ہیں اور اس دربار سے ان کا کیا تعلق ہے۔ کیا آپ فاتح امیر عماد الدین زما نہیں ہیں؟“

”نہیں معزز خاتون میں امیر محترم کا ایک معمولی سردار اسد الدین شیر کوہ ہوں۔“ شہزادی نے نرمی سے جواب دیا۔ امیر نے حکم دیا کہ شہزادی ار سلا اور ان کے ساتھ آنے والا شاہی مہمان خانے میں عزت و احترام سے پہنچایا جائے۔ امیر ان سے کل گفتگو فرما گئے۔“

”سردار۔ میں اور میرے ساتھی امیر کے مہمان بننے نہیں آئے ہیں۔ ہم فریادی اور فریادی کو اس وقت تک چھین نہیں ملتا جب تک حاکم وقت اس کی فریاد سن کر ظلم کی سزا نہ دے۔“ ار سلا نے افسردہ مگر مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ امیر زما مطلع کر دیجئے کہ جس سروج پر آپ کے حکم سے قبضہ کیا گیا ہے وہاں کی جاگیر دار شہزادہ اور رعیت کے چند لوگ اس کے پاس فریاد لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ ہمیں طلب کر کے رسی کی جائے۔“

اسد الدین شیر کوہ کے بولنے کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ اسے مجبوراً امیر زنگی کے واپس جانا پڑا۔ امیر زنگی نے شیر کوہ کو واپس آتے دیکھا تو اس کا ہاتھ ٹھنکا۔

”خیر تو ہے شیر کوہ۔ تم واپس کیوں آئے؟“ امیر زنگی فکر مند ہو گیا تھا۔

”امیر محترم۔ اصل حقیقت تو آنے والے ہی بتا سکیں گے مگر حالات کچھ سنگین ہوتے ہیں۔“ شیر کوہ نے پھر بھی ہلو کشش کا نام نہیں لیا۔ ”سروج سے آنے والوں شاہی مہمان خانے میں قیام کرنے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ہم فریادی ہیں۔“

یہ ہماری فریاد نہیں سنی جائے گی۔ ہمیں چھین نہ ملے گا۔ آپ کے سامنے فوراً پیش ہونا ہے۔“

”کیا شاہ کی بہن کی بھی یہی خواہش ہے؟“ امیر نے بے چینی سے پوچھا۔ ”شہزادی نے ابھی تک اپنی شخصیت ظاہر نہیں کی۔ مجھ سے صرف ایک عورت نے بیٹھ کی ہے مگر اس کے تیوروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر وہ شہزادی نہیں تو شاہی خاندان کے اس کا ضرور تعلق ہے۔“

نیک ہے شیر کوہ۔ فریادی کو ایک لمحہ بھی انتظار میں نہ رکھنا چاہئے۔“ امیر زنگی نے کہا۔ ”شہزادی اور ان کے ساتھیوں کو عزت سے ہمارے پاس لاؤ۔ ہاں یہ تو بتاؤ راج سے آنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟“

”ہمیں تیس کے درمیان ہوگی امیر محترم۔“ امیر زنگی نے ایک لمحہ توقف کے بعد کہا۔ ”شہزادی سے کہو کہ وہ چار پانچ آدمیوں کو ہمارے ساتھ لے کر ہمارے پاس آئیں تاکہ اطمینان سے گفتگو ہو سکے۔“

”بہتر ہے امیر۔“ شیر کوہ باہر گیا اور چند ہی لمحے بعد شہزادی ار سلا کو ساتھ لے کر امیر کے سامنے آگیا۔ ان کے ساتھ اس کی بیٹی شہزادی کیٹ اور انکل فیرو کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ امیر اس وقت شاہ جو سیلین کے تخت شاہی پر بیٹھ گیا تھا اور اس کے دائیں بائیں سردار بکڑے تھے۔

”میرا نام ار سلا ہے۔ میں شاہ جو سیلین کی بیوہ بہن ہوں۔ میں فاتح امیر عماد الدین زنگی موصول کو سلام پیش کرتی ہوں۔“ شہزادی ار سلا نے تخت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ زنگی کو اپنے بھائی کے تخت پر بیٹھا ہوا دیکھ کر ار سلا کے دل کا کیا حال ہوا ہو گا۔ اس نے اندازہ ہی کیا جا سکتا ہے مگر امیر زنگی کی پر رعب شخصیت کو دیکھ کر ار سلا بہت ہلکی اور چند ہی لمحوں بعد اس کی نظریں جھک گئیں۔

”شاہ جو سیلین کی بہن کو امیر زنگی رہا میں خوش آمدید کہتا ہے۔“ امیر کا لہجہ بہت نرم

”کاش میری آمد مبارک ہوتی اور میں امیر کو سروج پر قبضہ کی مبارک باد پیش کر شہزادی کی آواز غم یا غصہ کی وجہ سے کانپ رہی تھی۔“

”شہزادی ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم ایک فریادی کی حیثیت سے ہمارے پاس آئی ہو۔ تم ہمارا طعنہ اس وقت تک جواب نہیں دے سکتے جب تک تمہاری فریاد نہ سن

ہی انکل فیرو اپنی الٹی سدھی باتوں سے بنتی ہوئی بات کو بگاڑ نہ دیں۔  
 شہزادی ارسلانے فوراً دخل دیا۔ ”امیر محترم انکل فیرو میرے بزرگ ہیں۔ مجھے انہوں  
 کی باتیں کھلایا ہے۔ براہ کرم آپ ان کی بات کا برا نہ منائیں۔ میں پہلے سے معافی  
 مانگ رہی ہوں۔“

”مگر کی ضرورت نہیں شہزادی۔“ امیر نے اطمینان سے کہا۔ ”بزرگ سب کے لئے  
 ہوتے ہیں تمہارے انکل نے بات شروع کر دی ہے۔ وہ جو کہتا چاہتے ہیں انہیں  
 ہمیں ان کی کوئی بات ناگوار نہیں ہوگی۔“

”اے شاہ الرہا۔“ انکل فیرو نے بات اچک لی۔ ”یہی بات مجھ سے فرشتوں نے کہی  
 جس وقت ہم لوگ سروج سے چلے تھے تو ہمارا رخ ریاست اٹھاکہ کی طرف تھا مگر  
 پہلی منزل پر ارسلان کو بتایا کہ یہاں سے ایک راستہ الرہا کو بھی جاتا ہے اور پھر ہم  
 جانے کے بجائے الرہا آگئے۔“

”بزرگ انکل۔“ امیر نے شہزادی کے بجائے انکل میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ”کیا  
 یہ باتیں گئے کہ آپ نے سروج کیوں چھوڑا اور اٹھاکہ کیوں جانا چاہتے تھے۔“

”اے شاہ۔“ اور انکل بڑے بے تکلفی سے ہی ہی کر کے کہنے۔ شہزادی ارسلان کا  
 دل گیا۔ پھر انکل فیرو خود ہی سنجیدہ ہو کے بولے۔ ”بھلا جہنم میں بھی کوئی رہتا پسند  
 ہے۔ آپ کے سالار نے سروج کو جہنم سے بھی بدتر بنا دیا ہے تمام لوگوں کی جمع پونجی  
 ہمارے محل پر قبضہ کر کے تمام زیورات اور نقدی لے لی۔ پھر ہمیں محل سے  
 باہر نکال دیا۔ سروج میں رہتے تو جان اور عزت کی بھی قربانی دینا پڑتی۔“

”میری تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ اس نے نرمی سے پوچھا۔ ”انکل سروج کے لشکر نے  
 رات کا کتنے روز تک مقابلہ کیا تھا۔“

”اس وقت تک انکل فیرو کا رخ امیر زنگی کی طرف سے گھوم گیا تھا اور وہ امیر کے  
 ہاتھ سے لگی ہوئی تلواروں کو بغور دیکھ رہے تھے۔ شہزادی ارسلان نے انکل کو  
 کہ وہ امیر کی بات کا جواب دیں۔ انکل نے چونک کے ارسلان کو دیکھا پھر مسکرا کے  
 بولے۔ ”اے الرہا کے فاتح۔ مجھے آپ کے سردار کی کمر میں تلواریں دیکھ کے  
 بادشاہ کا قول یاد آ رہا ہے۔ آپ سنا پسند کریں تو عرض کروں۔“

”امیر کے سوال کا جواب نہ تھا۔ شہزادی ارسلان بھی گھبرا گئی مگر امیر مسکرا دئے۔  
 ”بھارت ہے انکل۔ جو کہتا چاہیں آپ کہہ سکتے ہیں۔“

”اس سے ثابت ہوا کہ آپ بھی ایک بڑے بادشاہ ہیں۔“ انکل فیرو اپنی دھن میں

لیں۔“ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے امیر زنگی کو شہزادی کے تلخ لہجے سے تکلیف پہنچی تھی اور  
 اپنے غصہ کو دبا رہا تھا۔

”امیر محترم۔ اگر انسان کی جان پر بنی ہو تو اس کی زبان سے تلخ باتیں ہی نکلتی ہیں  
 شہزادی نے بات سنبھالتے ہوئے کہا۔

”مختصر الفاظ میں بتایا جائے کہ شہزادی پر کس نے ظلم کیا ہے؟“

”ظلم کی داستان بیان کرنے سے پہلے گستاخی کی معافی چاہتے ہوئے امیر نے  
 سوالات کرنا چاہتی ہوں۔“ شہزادی ارسلان نے بڑے حوصلے سے کہا۔ ”اگر امیر  
 سوالات کا جواب نہیں دیتا چاہتے اور اسے اپنی سبکی سمجھتے ہیں تو میں فریاد پیش کئے بغیر  
 اور طرف کو نکل جاؤں گی۔“

”شہزادی اگرچہ ہم تمہارے سوالات کے جواب دینے پر مجبور نہیں لیکن فریاد  
 کسی بات کو ہم اپنی اتنا کا مسئلہ نہیں بنائیں گے۔ تم ایک نہیں ایک سو سوال کر سکتی ہو  
 ”امیر محترم۔ مجھے بتایا جائے کہ کیا الرہا کے قلعہ بند لشکر نے آپ کا مقابلہ نہیں  
 کیا تھا؟“

”انہوں نے کوشش کی تھی مگر شکست اٹھائی۔“

”کیا آپ نے الرہا پر قبضہ کے بعد عام معافی کا اعلان نہیں کیا تھا؟“

”ہاں ہم نے فوجیوں اور غیر فوجیوں دونوں کو معاف کر دیا تھا۔“ امیر نے وضاحت  
 ”قبضہ کے دوران شہر کی عمارتوں کو کچھ نقصان پہنچا تھا۔ ہم نے ان کی از سر نو تعمیر  
 ہمارے لشکریوں نے رعایا کا سامان لوٹ لیا تھا۔ وہ سب انہیں واپس کیا گیا۔ ہم نے  
 مسلمانوں سے درخواست کی وہ الرہا میں پہلے کی طرح امن و امان سے رہیں۔ ان  
 جو سیلین کا لگایا تھیں ہم نے نصف کر دیا۔ اس کے علاوہ الرہا کی خوبصورتی میں چار  
 دیئے۔“

انکل فیرو اب تک ادھر ادھر نظریں گھما کر دربار کی شان و شوکت دیکھ رہے تھے  
 شاہ جو سیلین کے وقت میں بھی الرہا کی بار آچکے تھے مگر آج اس کی شان دیکھ کر  
 آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ شہزادی ارسلان اور امیر زنگی کی باتیں وہ خاموشی سے سننے  
 تھے مگر اب وہ شاید ضبط نہ کر سکے اور جیسے امیر خاموش ہوئے انکل فیرو کی آواز سے  
 گونج اٹھا۔

”اے فاتح امیر۔ میں انکل فیرو آپ کو الرہا کی فتح پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔“  
 فیرو کی آواز پر تمام دربار اسے دیکھنے لگا مگر شہزادی ارسلان کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ فریاد

کو میں یہ حکم ماننے سے انکار کر دوں گا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں امیر کے

امیر موصل نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے بیان سے سخت صدمہ ہوا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ اس نے سے کام لیا اور ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ”شہزادی تمہارے بیان پر یقین نہ کرنے کی نظر نہیں آتی مگر ابھی یہ بیان یک طرفہ ہے۔ انصاف کا تقاضہ ہے کہ مجرم کو بھی موقع دیا جائے۔“ پھر امیر نے شیر کوہ سے کہا۔ ”اسد الدین اسی وقت فوج کا ایک کر سروج جاؤں اور ہلو کشش کو گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کرو۔ اگر وہ سر

ان دستوں کا سالار ہوں جنہیں سروج پر قبضہ کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

”سروج پر قبضہ کے لئے بھیجا گیا تھا یا شراب اور عشرت کی محفلیں سجانے؟“ میرے  
کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”سردار شیر کوہ۔ میں اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہوں۔ آپ کو میرے معاملات میں دخل  
دینے کا حق حاصل نہیں۔ امیر کو میں خود جواب دے لوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے  
ہلوکش نے ہاتھ قبضہ شمشیر پر پہنچ گیا۔

یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ہلوکش خواجہ سرا ہونے کے باوجود  
ماہر شمشیرزن اور شہسوار تھا۔ میدان جنگ میں وہ نگلی تلوار لے کر امیر زنگی کے غیبت کے  
گرو رات بھر پہرہ دیتا تھا۔ امیر زنگی کے دل میں اس لئے اس کی اتنی قدر تھی۔ امیر زنگی  
کے مصاحبین اور دوسرے سردار خود کو ہلوکش کے سامنے بے بس محسوس کرتے تھے۔  
شیر کوہ کا ہاتھ بھی شمشیر پر پہنچ گیا مگر اس نے رفع شر کے لئے کہا۔ ”ہلوکش۔  
جواب تو تمہیں امیر ہی کو دینا ہوگا اور اسی لئے آقا نے تمہیں رہا طلب کیا ہے۔

امیر اور آقا کا نام سن کر ہلوکش کو پینہ آگیا۔ اس نے جلدی سے قبضہ شمشیر  
ہاتھ ہٹا لیا۔ آقا نے طلب کیا ہے تو مجھے کیا انکار ہو سکتا ہے۔ رات آدھے سے زیادہ گز  
چکی ہے۔ صبح ہوتے ہی ہم رہا روانہ ہو جائیں گے۔“  
”میں صبح ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا۔ تمہیں اس وقت چلنا ہوگا۔ شیر کوہ نے غم  
صادر کر دیا۔

”اور اگر میں انکار کر دوں۔“ غلام نمک حرامی پر اتر آیا۔  
”میں حکم سے مجبور ہوں ہلوکش تم سرکشی کرو گے تو تمہارا سر اتار کے امیر کے  
پاس لے جاؤں گا میرے لئے یہی حکم ہے۔“ پھر اس نے ساتھ آنے والے سپاہیوں کو حکم  
دیا۔ ”ہلوکش کو گرفتار کر لو۔“

شیر کوہ کی زبان سے الفاظ نکلے ہی سپاہیوں نے تلوار سونٹیں اور اور ہلوکش کے گرد  
حلق بنا لیا۔ ہلوکش کے حواس جاتے رہے۔ اس کے دوستوں نے اٹھ کے بھاگنا چاہے مگر  
شیر کوہ نے انہیں ڈپٹ دیا۔  
”کسی کو اپنی جگہ سے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ محل کو میرے سواروں نے گھیر رکھا  
ہے۔ جو باہر نکلے گا قتل ہو جائے گا۔“

ہلوکش اور اس کے دوستوں کی رہی سہی امید کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ انہوں نے اٹا  
میں بہتری سمجھی کہ خود کو چپ چاپ شیر کوہ کے حوالے کر دیں۔  
ہلوکش گڑ گڑایا۔ ”سردار محترم۔ میں جانے سے انکار تو نہیں کیا۔ آپ مجھے گولہ

بجھنے میں امیر کا ایک عزت دار خادم ہوں۔“

میں امیر کے حکم سے تم لوگوں کو گرفتار کر رہا ہوں۔“

”مگر میرا کوئی قصور؟“

”مجھے صرف تمہیں گرفتار کر کے لانے کا حکم دیا گیا ہے۔“

شیر کوہ کے سپاہیوں نے ہلوکش اور اس کے ساتھیوں کی مشکلیں کس لیں۔ تاؤ نوش  
نظر اڑ گئی ساقی لڑکیاں اور رقاصائیں بھاگ کر ادھر ادھر چھپ گئی تھیں۔ شیر کوہ ان  
کو گرفتار کر کے باہر آیا اس وقت تک ہلوکش کے ساتھ آنے والے دستوں کے  
دار عمل کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ شیر کوہ نے ان میں سے ایک کو سروج کی ذمہ داری  
دار گرفتار شدہ لوگوں کو گھوڑوں پر سوار کرا کر ایک ایک آدمی ان کے پیچھے بٹھا دیا پھر  
ان کے آخری پھر شیر کوہ اپنا فرض ادا کر کے رہا کی طرف واپس جا رہا تھا۔

رہا میں خواجہ سرا ہلوکش اور اس کے ساتھی غلاموں کو امیر زنگی کے سامنے پیش  
لیا۔ دربار عام کچا کچھ بھرا ہوا تھا شہزادی ارسلہ۔ شہزادی کیٹ اور انکل فیرو بھی موجود  
شرع کے تقاضے پورے کرنے کے لئے امیر زنگی ہر مہم پر اپنے ساتھ ایک قاضی رکھا  
تھا۔ جس قاضی کو رہا کا قاضی شہر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ اس وقت امیر زنگی کے دائیں  
ایک چھوٹے تخت پر بیٹھا تھا۔ معززین شہر کے علاوہ دربار میں امیر زنگی کے دو بیٹے  
نور الدین اور شہزادہ قطب الدین مودود بھی حاضری تھے۔ شہزادہ قطب الدین بھائیوں میں  
سے چھوٹا تھا اور ابھی اس کی سس بھیک رہی تھیں۔ مگر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ  
اصحاب دل اور حسن پرست واقع ہوا ہے۔ امیر زنگی کا مزاج بہت برہم تھا مگر شہزادہ  
نالم میں بھی لوگوں کی نظریں بچا کر کسن شہزادی کیٹ کو کئی بار دیکھ چکا تھا مگر دیدار  
اسے اس کا جی نہ بھر رہا تھا۔

شہزادی کیٹ ابھی حسن و عشق کے بکھیڑوں سے واقف نہ تھی مگر جب ایک بار اس کی  
شہزادی قطب الدین سے اتفاقہ مل گئی تو اس کے دل میں ہلکی گدگدی پیدا ہوئی۔  
جی چاہا کہ وہ شہزادے کو پھر دیکھے۔ شہزادہ نور الدین اور شہزادہ قطب الدین امیر کے  
کے بالکل پاس کھڑے تھے اس سے شہزادی کیٹ نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ اگر شہزادے  
ہوں تو ان کا تعلق امیر زنگی کے خاندان سے ضرور ہے۔ شہزادہ قطب الدین اور  
کیٹ کی پریشان نظری اور نگاہوں کا ٹکراؤ جاری تھا کہ امیر زنگی کی آواز یوں گونجی  
اور میں شیر دھاڑتا ہے۔

لوہ بخت۔ نظریں اٹھا کے ان معصوم ہستیوں کو دیکھ جن پر تو نے ظلم توڑے ہیں۔“  
لہجہ دار آواز سے دربار کے در و دیوار لرز اٹھے۔



ہلوکش اور اس کے ساتھی پابہ زنجیر امیر کے سامنے پیش کئے گئے تھے۔ ان کی نظر زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ پورے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ امیر زندگی کی آواز پر انہوں سر اٹھانا چاہا مگر ندامت اور خوف نے انہیں نظریں بلند کرنے سے باز رکھا۔  
 ”والقلمنا جل۔“ امیر زندگی کو طیش آگیا۔ ”تو اب تک خاموش ہے۔ اپنے جرم اقبال بھی نہیں کیا۔“

ہلوکش نے اپنے آقا کی گونجتی آواز کے درمیان میں ایک جھرجھری لی اور کوکڑوں زنجیروں کے ساتھ زمین پر گر کر ترپنے لگا۔ ”میرے آقا۔ میرے مالک مجھے معاف دیجئے۔ میں آپ کا مجرم ہوں۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے زندگی کی بھیک عطا کر دیجئے۔ پر رحم کیجئے آقا۔ صرف ایک موقعہ اور دیجئے۔“

”اے کم ظرف خانہ زاد۔ میں تجھ پر رحم کروں۔ معاف کر دوں تجھے۔“ امیر خواجہ سرا کو نفرت سے دیکھا۔ ”میں نے تجھے حکم دیا تھا کہ اگر سروج والے بغیر مقابلہ ہتھیار ڈال دیں تو عام معافی کا اعلان کیا جائے اور ہر ایک کی جان و مال اور عزت و آبرو حفاظت کی جائے لیکن تو نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔ کیا تیرا یہی ایک جرم۔ موت کی سزا دینے کے لئے کافی نہیں؟۔“

”میں مجرم ہوں آقا۔ مجھے معاف کر دیجئے۔“ ہلوکش زمین پر پڑا۔ بچاؤں کا تھا۔

”قاضی شر توجہ فرمائیے۔ ملزم اقرار جرم کر رہا ہے۔“ امیر زندگی نے قاضی کی لڑا دیکھا قاضی شر نے اثبات میں سر ہلایا۔

امیر زندگی نے ہلوکش سے سوال کیا۔ ”کیا تو نے شہزادی کے قیمتی زیورات اور ہلا پر قبضہ نہیں کیا۔“ مجھے سے غلطی ہو گئی آقا۔“

”تو نے سروج کی رعایا سے بھی زیورات اور قیمتی اشیاء نہیں چھینیں؟“

”جھپنی تھیں آقا۔ خدا کے لئے رحم کیجئے۔“

”میں نے تجھے اپنا نائب بنا کے سروج بھیجا تھا مگر کیا تو نے شاہی محل میں رخصت سرور کی محفل آراستہ نہیں کی؟۔“

”میں بسک گیا تھا۔ میری آنکھیں پر پردہ پڑ گیا تھا آقا۔“

”یہ جانتے ہوئے کہ شہزادی ارسلہ۔ شاہ جو سیلین کی بیوہ بہن ہے پھر بھی تو نے سے گستاخی کی اور ان کے ساتھ عام لوگوں سے زیادہ بدتر سلوک کیا؟۔“

”میں خطا کار ہوں امیر۔ میری پچھلی خدمات کے عوض میری جان بخش دیجئے۔“

”تو بھول رہا ہے ہلوکش میں اپنے جاں نثروں کی خدمات کا صلہ اپنے اپنے

نہیں رکھتا۔ تو نے بے شک ہماری خدمت کی۔ ہم سوتے تھے اور تو اپنی نیند حرام کر کے ہمارے خیے کے باہر سپردہ دتا تھا لیکن کیا ہم نے تجھے اس خدمت کا صلہ نہیں دیا۔ کیا تیری پچھلی خدمات کا یہ صلہ کچھ کم تھا کہ ہم نے تجھے سروج کی مہم کے لئے اپنے لشکریوں کا سالار مقرر کیا۔“

”آقا درست فرما رہے ہیں۔ اقتدار نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ میرے دل سے خدا اور امیر کا خوف نکل گیا تھا۔ مگر آقا خدا تین بار معاف کرتا ہے۔ آپ ایک بار معاف کر دیجئے۔ ہلوکش زار و قطار رو رہا تھا اور دیکھنے والوں پر بھی رقت طاری ہو گئی تھی۔

یار کش نے دیکھا کہ امیر اسے کسی طرح معاف کرنے پر آمادہ نہیں تو اس نے ہاتھوں پڑی ہوئی زنجیروں کو اپنی پیشانی پر بے تحاشہ مارنا شروع کر دیا۔ اس کے چہرہ اور پیشانی زخمی ہو گئی اور خون کے فوارے چھوٹ پڑے۔ لوگوں کے جسم خوف سے کانپنے لگے۔

امیر زندگی نے چیخ کر کہا۔ ”اس نابکار کو روکا جائے۔ سزا اسے ہم دیں گے۔“ ایک غلام نے آگے بڑھ کے یار کش کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور اسے قابو میں کر لیا۔

شہزادی ارسلہ کی معصوم بیٹی کیٹ دہشت کھا کر ماں سے لپٹ گئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”اما۔ آپ اسے معاف کر دیجئے۔“

دوسری طرف چھوٹا شہزادہ قطب الدین مودود جو تخت شاہی کے قریب کھڑا تھا وہ بے چین ہو کر امیر زندگی کی طرف جھک کر گڑ گرایا۔

امیر بھائی خدا کے لئے یار کش کو معاف کر دیجئے۔“

امیر زندگی نے اسے سختی سے جھڑک دیا۔ ”تم چپ رہو مودود۔ ہم انتظامی معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ خبردار کوئی سردار سفارش کی جرات نہ کرے۔“

پورا دربار سہم کر رہ گیا۔ اس وقت شہزادی ارسلہ کی آواز ابھری۔ ”اے انصاف بلند فلاح امیر میں اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کرتی ہوں۔“

تمام درباریوں کی نظریں اک دم شہزادی ارسلہ کی طرف اٹھ گئیں۔ ہر نظر میں شہزادی کے لئے تحسین و آفرین کا پیغام تھا۔ اور سب ہی اس کی شرافت کے قائل ہو گئے تھے۔

”شہزادی۔“ امیر زندگی کی گرجدار آواز سنائی دی۔ ”ہم تمہاری نیک نفسی اور جذبہ رحم کی تعریف کرتے ہیں مگر تم نے اپنا مقدمہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اب انصاف کرنا ہمارا کام ہے۔ تمہارے معاف کر دینے سے اس کے جرم میں کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔“

شہزادی ارسلہ نے حیران نظروں سے امیر زندگی کو دیکھ کر گردن جھکا لی۔ شہزادی کیٹ کی

آنکھوں سے رحم کے پھول جھڑنے لگے۔

اس وقت قاضی شہر کی تسبیح پر گھومتی ہوئی انگلی رکی اور اس نے گردن بلند کر کے امیر زنگی کو دیکھا۔ ”اسے امیر موصول۔ اگر مظلوم بغیر کسی جبر کے ظالم کو معاف کر دے تو اس وقت حاکم وقت کے لئے انصاف کے دو راستے کھل جاتے ہیں۔ وہ مجرم کو سزا بھی دے سکتا ہے اور معاف بھی کر سکتا ہے لیکن حاکم اگر سزا دینے کے بجائے مجرم کو معاف کر دے تو اس کا یہ فعل خدا کی نظر میں زیادہ مستحسن ہوگا اور خدا اس کو اس کا اجر دے گا۔ یہی حکم بدلہ لینے کے لئے بھی ہے اگر تم پر کسی نے ظلم کیا ہے تو تمہیں اس سے بدلہ لینے کی اجازت ہے لیکن اگر تم اسے معاف کر دو تو تمہارا یہ فعل خدا کی نظر میں زیادہ پسندیدہ ہوگا کیونکہ خدا کو عفو اور درگزر زیادہ پسند ہے۔“

”قابل احترام قاضی شہر۔“ شہزادی ارسلانے ہمت کر کے کہا۔ ”میں اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئی ہوں۔ آپ سے سفارش کر کے اسے معاف کرا دیجئے؟“

”نیک خاتون۔“ قاضی نے جواب دیا۔ ”میں نے شہر نکتہ امیر کے سامنے بیان کر دیا ہے۔ اس پر عمل کرنا یا نہ کرنا امیر کے اختیار میں ہے۔ شرعی معاملات میں کسی کی سفارش نہیں چلتی۔“

شہزادی نے مایوس ہو کر پھر گردن جھکا لی۔

امیر زنگی تذبذب میں گرفتار تھا۔ اسے یار کشت پر سخت غصہ تھا مگر قاضی شہر نے جو نکتہ بیان کیا تھا وہ بھی اس کے پیش نظر تھا وہ کوئی کٹر قسم کا مذہبی آدمی نہ تھا مگر اس کے مجاہدانہ کارناموں کا یہ تقاضہ تھا کہ وہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھائے کہ عام مسلمانوں کو اس کے خلاف حرف گیری کا موقع ملے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ”اس کم بخت غلام نے میرے وقار کا بھی کچھ خیال نہ کیا۔ الہا پر قبضہ کے دوران ہونے والے نقصانات کا میں نے تدارک کر کے نصرانیوں کو مطمئن کر دیا تھا لیکن اس بدنہاد نے سرورج کے عبادت خانوں کی طلائی ملیسوں کو ضبط کر کے میرے منہ پر ایسا طمانچہ مارا ہے جس کا داغ عرصے تک نہ مٹ سکے گا مگر میں قاضی شہر کے شرعی نکتے کی وضاحت سے بھی انکار نہیں کر سکتا۔“ پھر امیر نے زمین پر ایڑیاں رگڑتے یار کشت کی طرف دیکھا۔ جاے نامراد میں نے اپنے خدا کی خوشنودی کے لئے تیری جاں بخشی کی۔“

درباریوں میں پھر تحسین و آفریں کا غلغلہ اٹھا۔ ہلو کشت کی ذلیل حرکتوں کے باوجود اس کی موجودہ حالت کو دیکھ کر لوگوں کو اس سے ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ امیر کے فیصلے کو سب نے پسند کیا۔ قاضی شہر نے بھی پسندیدہ نظروں سے امیر کو دیکھا۔ شہزادی ارسلان کو اس قدر خوشی ہوئی وہ اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ دوسری طرف شہزادی کیٹ نے بوے معصومانہ

انداز میں تالیاں بجانا شروع کر دیں۔ انکل فیرو نے ارسلان کا ہاتھ پکڑ کے اسے بٹھالیا اور سرگوشی کی۔ ”ارسلان۔ امیر موصول نے اگرچہ اپنے غلام کو معاف کر کے درباریوں کے دل بیت لئے ہیں مگر ظالم کو سزا ضرور ملنی چاہئے تھی۔ یہ ظالم زہریلا سانپ ہے جو کسی وقت بھی کسی کو ڈس سکتا ہے۔“

”آپ دخل نہ دیجئے انکل۔“ شہزادی نے آہستہ سے کہا۔ ”غلام کی حالت آپ دیکھ رہے ہیں۔ اس پر قیامت گزر رہی ہے اور آپ کو ذرا رحم نہیں آتا۔“

”دشمن کو قطعی معاف نہیں کرنا چاہئے۔ یہ غلام کھلا ہوا دشمن ہے۔“ انکل فیرو نے برا سامنہ بتایا۔

”کس کا دشمن ہے وہ۔ امیر نے اسے معاف کر دیا اگر غیر مند ہے تو کبھی میرے منہ نہیں آئے گا۔“

”تم نہیں جانتیں شہزادی۔ اس خصلت کے لوگ احسان فراموش ہوتے ہیں۔ امیر نے اسے چھوڑ کے غلطی کی۔“

”پتہ نہیں آپ کس دنیا کی باتیں کر رہے ہیں۔“ یہ کہہ کر شہزادی ارسلانے انکل فیرو کی طرف سے منہ جھمالیا۔

انکل فیرو ہی ہی کر کے خاموش ہو گئے۔

یار کشت کو طوق و سلاسل سے آزاد کر دیا گیا۔ اس نے لائے کرتے کے دامن سے اپنا چہرہ صاف کیا اور سر جھکا کے کھڑا ہو گیا اس کے شریک کار غلاموں کو بھی چھوڑ دیا گیا۔ امیر موصول نے دوسرا حکم صادر کیا۔ ”سردار شیر کوہ کہ سرورج کا فوجی گورنر مقرر کا جانا ہے۔ یہ اس وقت تک سرورج میں مقیم رہیں گے جب تک وہاں کے حالات معمول پر نہیں آجاتے۔ ان کی ذمہ داری ہوگی کہ سرورج چھوڑ کے جانے والوں کو امن و امان کا یقین دلا کر واپس لائیں اور ان کے تمام نقصانات کا ازالہ کریں۔ سرورج کی جاگیر بدستور شہزادی ارسلان کے پاس رہے گی۔ وہاں کی آمدنی کا حساب شیر کوہ کے پاس ہوگا اور امن و امان ہو جانے کے بعد جب شہزادی اپنی جاگیر میں واپس جانا پسند کریں گی انہیں معہ متعلقین کے عزت کے ساتھ وہاں پہنچایا جائے گا۔“

”اے بادشاہ۔ اے امیر۔“ انکل فیرو نے بڑبڑے ڈھنگ پن سے امیر کی بات کاٹ دی

مگر امیر بجائے ناراض ہونے کے مسکرا دیا۔

”انکل کیا کہنا چاہتے ہیں؟“ امیر کی مسکراہٹ قائم تھی۔

”میں سرورج واپس نہیں جاؤں گا امیر۔“ انکل نے بڑی بے باکی سے کہا۔

”کیوں۔ کیا شہزادی تمہیں آرام سے نہیں رکھتیں؟“ امیر نے دلچسپی سے پوچھا۔

ہٹ سے کہہ دیا کہ تو اسی باغ کی کلی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے آپ کا کیا مطلب تھا۔  
 ”میں نے ٹھیک کہا تھا ارسلان! اکل فیرو کو جلال آگیا۔۔۔۔۔“ دیکھو۔ دیکھو۔ کیٹ کی  
 رات دیکھو۔ کیا تمہیں اس کے سر پر شاہی تاج نظر نہیں آ رہا ہے؟“  
 ”تاج!“ ارسلان نے حیرانی سے بولی۔ ”کیسا تاج کہاں کا تاج۔ کیا کہہ رہے ہیں

”اگل“  
 ل فیرو اس وقت شہزادی کیٹ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ ارسلان کو جواب دینے کے بجائے  
 دل نے کیٹ سے بڑے پیار بھرے لہجے میں کہا ”کیٹ بیٹی۔ آج ہمارے گھر ایک مہمان  
 آ رہے تم اس کی خوب خاطر کرنا؟“

شہزادی ارسلان نے سر پکڑ لیا۔ ”اکل بچی سے آپ کیا فضول باتیں کر رہے ہیں گھر بار  
 مارا اڑ چکا ہے۔ ہم خود دوسروں کے مہمان ہیں۔ ہمارے پاس کون مہمان آئے گا؟“  
 مگر اکل فیرو کبھی کبھی اور ہی کرتے باہر چلے گئے۔ ارسلان نے شہزادی کو سمجھایا۔  
 ”تو ان کی باتوں کا اعتبار نہ کیجیو۔ نہ معلوم کہاں کی دون تین ہانکنے لگتے ہیں۔“

شہزادی کیٹ بچاری کی سمجھ میں کیا آتا۔ اس نے اکل فیرو کی کسی بات پر سنجیدگی سے  
 ہی نہیں کیا تھا۔ جس طرح اکل فیرو اسے ایک کھلونا سمجھ کر ہر وقت ادھر ادھر کھینچتے  
 نہ تھے بالکل اسی طرح کیٹ بھی انہیں بھولی سمجھتی اور ان کے ساتھ کھیلتی رہتی تھی۔  
 اکل ارسلان ضرور اکل فیرو کی بات پر کچھ کھٹک گئی تھی۔

امیر عماد الدین زنگی کے کئی اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا سیف الدین غازی عام طور سے  
 ل میں رہتا تھا دو سرا بیٹا نور الدین زنگی اپنے باپ کے رنگ پر تھا۔ وہ ہر محاذ پر باپ کے  
 ف رہتا تھا۔ جنگوں میں بھرپور حصہ لیتا مگر اس نے اب تک کوئی ایسا کارنامہ انجام نہ دیا  
 ۔ امیر کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی آیا ہو۔ امیر کا تیسرا بیٹا قطب الدین مودود اپنے  
 ، بھائیوں سے شجاعت اور اہلیت میں کسی طرح کم نہ تھا مگر جنگ و جدل کے بجائے اس  
 زیادہ توجہ سیر و شکار اور فنون لطیفہ کی طرف تھی۔ امیر زنگی اکثر اسے اپنے ساتھ جنگ پر  
 جاتا مگر وہ باپ سے شکار کا بہانہ کے کے ادھر ادھر نکل جاتا اور سیر و شکار اور مناظر  
 ت سے دل بہلایا کرتا۔ قطب الدین مودود کی عمر سترہ برس ہو چکی تھی مگر اس کی  
 لیا بالکل بچوں جیسی تھیں۔ وہ ایک اچھا شکاری تھا مگر دل میں رحم کا جذبہ ایسا موجزن  
 ۔ اکثر شکار اس کے قریب سے نکل جاتا اور اس کا دل ترکش سے تیر نکالنے کو نہ چاہتا  
 لکی وجہ تھی کہ جس وقت یار کشش نے خود کو زنجیروں سے زخمی کر لیا تو اس نے امیر  
 اس کی سفارش کی تھی۔

بادشاہت یا امارت موروثی نہیں ہوتی۔ ادھر تخت خالی ہوا ادھر شہزادوں میں زور

”آرام سے میں خود نہیں رہتا چاہتا امیر۔ میں اپنی باقی زندگی میدان جنگ میں گزاروں  
 گا۔“ پھر فوراً ”شہزادی کی طرف پلٹ کے بولے۔“ ارسلان تم کچھ غم نہ کرنا۔ میں امیر کے  
 لشکر میں فوجی خدمات انجام دوں گا پھر جب تمہیں میرے شہید ہونے کی خبر ملے تو میری  
 لاش لینے آجانا۔“

سب لوگ اکل فیرو کی بے تکلیف مگر دلچسپ باتوں سے خوش ہو رہے تھے۔  
 امیر زنگی نے اکل کی بات مان لی۔ ”اکل کی خواہش پوری ہو جائے گی۔“  
 اس وقت شہزادی کیٹ دوڑ کے اکل فیرو سے پلٹ گئی۔ ”اکل آپ مجھے چھوڑ رہے  
 ہیں رات کو میری دیکھ بھال کون کرے گا؟“

شہزادی کیٹ بچپن ہی سے اکل فیرو کے کمرے میں ان کی مسمری سے مسمری ملا کے  
 سونے کی عادی تھی کیٹ کو بہت خواب آتے تھے اور وہ اکثر ڈر جایا کرتی تھی۔ شہزادی  
 ارسلان کے شوہر کا جس وقت انتقال ہوا تھا اسی وقت اکل فیرو نے کیٹ کو سنبھال لیا تھا۔  
 اکل نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کے آہستہ سے کہا۔ ”پریشان نہ ہو بیٹی۔ مجھے تو کچھ ایسا  
 محسوس ہو رہا ہے جیسے تو اسی باغ کی ایک کلی ہے۔“

”اکل۔۔۔۔۔“ شہزادی ارسلان جھلا گئی۔ ”یہ امیر زنگی کا دربار ہے۔ آپ بچی سے  
 ایسی باتیں کر رہے ہیں؟“

اکل فیرو نے سنی ان سنی کر دی مگر ان کی نظریں پورے دربار کا جائزہ لیتی ہوئی  
 چھوٹے شہزادے قطب الدین مودود پر آکر رک گئی تھیں۔ ہلو کشش اور اس کے ساتھیوں  
 کی صرف جاں بخشی ہوئی تھی۔ ان کے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا۔ دربار  
 کے ایک محافظ نے ہلو کشش وغیرہ کو باہر پہنچا دیا۔ امیر زنگی نے شہزادی ارسلان کے لئے ایک  
 محل خالی کرنے کا حکم دیا جہاں شہزادی کو اس وقت تک مقیم رہنا تھا جب تک سروج کے  
 حالات درست نہیں ہو جاتے۔

دربار سے اٹھ کے جب شہزادی اور اکل فیرو مہمان خانے میں واپس آئے تو شہزادی  
 ارسلان نے ذرا ناگوار انداز میں کہا۔ ”اکل آپ وقت اور موقعہ نہیں دیکھتے بس بولنا شروع  
 کر دیتے ہیں وہ تو اچھا ہوا کہ امیر کو آپ کی بات ناگوار نہیں گزری ورنہ لینے کے دینے  
 پڑ جاتے۔“

اکل فیرو بے ڈھنگے پن سے ہی ہی کر کے ہنسے پھر بولے۔ ”ارسلان۔ وقت اور موقعہ“  
 لوگ دیکھتے ہیں جن کے دل کالے ہوتے ہیں۔ انہیں بات کرتے خوف آتا ہے۔ امیر زنگی  
 میری باتوں میں دلچسپی لے رہا تھا۔ تم کیوں گھبرا گئیں۔“

”اکل غضب کرتے ہیں آپ“ ارسلان کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ”بھرے دربار میں آپ نے

آزمائی شروع ہو گئی۔ خوب خوب خانہ جنگی ہوتی اور آخر جس میں زیادہ طاقت ہوئی وہ فتح و تاج پر قبضہ کر لیتا۔ کسی بادشاہ کے کئی اولادیں ہوتیں تو یہ رسم کسی بہت پہلے شروع ہو جاتی تھی۔ امیر زنگی کے یہی تین بیٹے زیادہ نمایاں تھے امیر کی عمر ساٹھ سال کے قریب ہو چکی تھی اس لئے امیر کے سرداروں نے درپردہ تینوں شہزادوں کی ہمدردیاں اپنے اپنے خیال کے مطابق حاصل کرنا شروع کر دی تھیں۔ شہزادے یوسف الدین غازی اور نور الدین زنگی کا نام زیادہ نمایاں تھا اس لئے بیشتر سردار ان کے گرد چکر لگاتے تھے شہزادہ قطب الدین خاموش طبیعت اور مناظر قدرت کا شیدائی تھا۔ اس لئے امراء اور سردار اس کی طرف کم ہی توجہ دیتے تھے مگر امرا کے جواں عمر بیٹے شہزادہ مودود کو زیادہ پسند کرتے تھے اور شہزادہ ان کی صحبت میں کھل کے بات کیا کرتا تھا۔

شہزادی ارسلان کو اپنے متعلقین کے ساتھ امیر زنگی کے دیئے ہوئے محل میں آئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ وہ امیر کے مشفقانہ رویے سے پوری طرح مطمئن تھی۔ انکل فیرو اور شہزادی کیٹ کا الرہا ایسا جی لگا تھا کہ وہ سرج کو بالکل ہی بھول گئے تھے انکل فیرو نے شہزادی ارسلان سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اگر ارسلان سرج جانے کا فیصلہ کیا تو وہ شہزادی کیٹ کے ساتھ الرہا میں رہے گا یا پھر موصل چلا جائے گا۔ شہزادی ارسلان۔ انکل فیرو کی باتوں کو محض مذاق سمجھ کر ہنسی اڑا دیتی تھی۔ اسی دوران اس کے محل کے دربان نے ایک صبح کو اندر آکر اطلاع دی کہ ایک خوبرو مسلم جوان شہزادی ارسلان سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ شہزادی ارسلان کے الرہا میں کسی سے تعلقات نہ تھے۔ بعض عیسائی گھرانوں سے وہ واقف تھی۔ لیکن اس نے ان سے ملنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اب ایک مسلمان کے اس طرح ملاقات کے لئے آنے سے وہ پریشان ہو گئی۔

انکل فیرو دوسرے کمرے میں تھے شہزادی ابھی اسی ادھیڑ بن میں تھی کہ انکل فیرو آگئے۔ شہزادی کو پریشان دیکھ کے وہ چونکے۔ مسکرا کے بولے۔ ”انکل تم پر قربان ارسلان۔ یہ منہ سکھائے کیوں بیٹھی ہو؟“

”شہزادی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر پہلے انکل فیرو کو دیکھا پھر اس کے نظریں دربان پر آکر رک گئیں جو شہزادی کے جواب کے لئے اب تک سر جھکائے کھڑا تھا۔ انکل فیرو نے بھی سر گھما کر دربان کو دیکھا۔ ”ہوں۔ تمہاری افسردگی کی وجہ یہ دربان ہے؟“ شہزادی نے زبان سے بولنے کے بجائے انکل کو اس طرح دیکھا جس سے انکل کے خیال کی تصدیق ہوتی تھی۔

”خیر تم نے روزہ رکھا ہے تو مت بولو۔“ یہ کہتے ہوئے انکل فیرو نے بڑھ کے دربان کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ذرا بتاؤ تو تم نے ہماری شہزادی کو کیوں افسردہ کیا؟“

”انکل۔ ایک جوان شہزادی ارسلان سے ملاقات کے لئے آیا ہے۔“ دربان نے اپنی بات دہرائی۔

”جوان!“ انکل نے کان کھڑے کئے ”جوان۔ شاہی خاندان۔ سے اس کا تعلق ہے۔“

”میں نہیں جانتا انکل میں نے اس کا نام بھی نہیں پوچھا دربان نے معصومیت سے کہا

”ٹھیک ہے تم اسے نہیں جانتے۔ مگر یہ وہی ہے وہی شہزادہ۔ اس کا تو میں کئی دن انتظار کر رہا ہوں“ یہ کہتے ہوئے انکل فیرو قدموں سے دروازے کی طرف بڑھے۔

”کیا غضب کر رہے ہیں آپ؟“ ارسلان دوڑ کے ان کے سامنے آگئی۔ ”انکل۔ ہم

ن وقت امیر زنگی کے مہمان ہیں اور ان کے رحم و کرم پر ہیں۔ اس صورت میں کسی لم جوان سے ہماری ملاقات خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ امیر زنگی کی جاسوسی کا محکمہ بہت بڑا ہے۔“

انکل فیرو نے شہزادی کو آہستہ سے اپنے آگے سے ہٹایا۔ ”پریشان کیوں ہوتی ہو۔ یہ بات ہے کہ ہم مہمان ہیں مگر گھر پر آئے مہمان کو ٹالا تو نہیں جاسکتا۔“

”انکل۔ سوچ لیجئے۔ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائیں ہم؟“

”آئے والا ہمارے لئے رحمت کا پیغام لایا ہے۔“

”مگر وہ ہے کون۔ آپ جانتے ہیں اسے؟“ شہزادی ارسلان اب تک گھبرا رہی تھی۔

میں نے اسے ایک بار دربار میں دیکھا ہے۔ شاید وہی ہے۔“ اور انکل فیرو دروازے

نکل گئے۔ دربان بھی ان کے ساتھ ساتھ باہر چلا گیا۔

انکل فیرو ایک اجنبی جوان کو کھڑے دیکھ کر ٹھک گئے۔ انہوں نے جس ہستی کا تصور رکھا تھا یہ جوان اس سے بالکل مختلف تھا۔

”میرا نام انکل فیرو ہے۔“ انکل نے خود اپنا تعارف کرایا۔

”انکل فیرو!“ آنے والے نے تعجب سے دیکھ۔ ”میں نے آپ کو دیکھا تو نہیں مگر

ن ضرور سنی ہے“ اس نے بڑے منذب انداز میں جواب دیا۔

انکل فیرو کا اندازہ غلط ہو گیا تھا اس لئے وہ چڑے ہوئے تھے۔ اکھڑے لہجے میں

”میری تعریف کے بجائے اپنے آنے کا مقصد بیان کرو جوان؟“

”میں شہزادی ارسلان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”دیکھو جوان۔ غیر ضروری باتیں سننا پسند نہیں کرتا۔“ انکل کا لہجہ اور زیادہ کھردرا ہو

”تم اپنی بات کی وضاحت کرو۔ کون ہو۔ کیا نام ہے۔ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہو۔ پہلے

انکھ نے زردار بیگ کے اشارے پر ادھر غور سے دیکھا اور ان کا چہرہ مسرت سے  
 "ارے انہیں وہاں کیوں کھڑا کر رکھا ہے تم نے۔ چلو انہیں ساتھ لے آئیں۔"  
 زردار بیگ بھی خوش ہو گیا۔ "کیا شہزادی ارسلان سے ملنا پسند کریں گی؟" زردار  
 بیگ نے پوچھا۔ "میں پہلے اجازت لینے حاضر ہوا ہوں۔"

انہیں نہیں ملیں گی۔ ضرور ملیں گی۔" انکھ کے قدم تیزی سے پیڑ کی طرف اٹھنے  
 لڑے نے انکھ اور زردار بیگ کو آتے دیکھ لیا تھا اور وہ سنبھل کے کھڑا ہو گیا  
 لہذا تیزی اور وحشت کے ساتھ شہزادے کے پاس پہنچے کہ شہزادہ پریشان ہو گیا۔  
 شہزادے کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اس سے شہزادہ کو پینہ آگیا۔

انکھ۔ بالکل۔ تم وہی ہو۔ یقیناً تم وہی ہو" اور انکھ حسب معمول ہی ہی کرنے

آپ۔۔۔۔۔ آپ۔۔۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔ آپ مجھے جانتے ہیں کیا؟" شہزادہ

لہ۔ میں نے تمہیں دیکھا ہے۔ ایک بار امیر کے دربار میں پھر کئی بار خواب میں۔  
 موت بار بار دکھائی گئی تھی۔" انکھ ایک محبت کے عالم میں شہزادے کو دیکھ  
 اور ربط اور بے ربط جملے ان کے منہ سے نکل رہے تھے۔ "میں تمہارا کئی دن  
 ر کر رہا ہوں۔ تم اب تک کیوں نہیں آئے۔ تمہیں ضرور آنا چاہئے تھا آخر تم

ارہ اور زردار بیگ حیران نظروں سے انکھ فیرو کو دیکھ رہے تھے؟۔  
 اندر چلو۔ شہزادی ارسلان اور شہزادی کیٹ تمہیں دیکھ کے ضرور خوش ہوں  
 مانے منہ گھما کر محل کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

انکھ نے کیٹ کا لفظ کئی بار زیر لب دہرایا پھر سوالیہ نظروں سے زردار  
 بیگ دیکھا۔ زردار بیگ نے اشارے سے شہزادے کو گفتگو سے روکا۔ محل میں پہنچ  
 محل کے مہمان خانے کے سامنے رک گئے۔ "بس چند لمحے انتظار کرو پھر تم  
 لاکے سامنے ہو گئے؟۔"

جواب کا انتظار نہ کیا اور تیزی سے اندر کی طرف چلے گئے۔ شہزادی ارسلان  
 دروازے پر گھبرائی کھڑی تھی وہ بڑھ کے انکھ کے پاس آگئی۔

ارسلان۔ شہزادہ آخر یہاں تک پہنچ ہی گیا۔" انکھ خوشی سے سرشار ہو

شہزادہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ انکھ کسی وقت تو ہوش کی باتیں کیا کیجئے۔"

کبھی ملے ہو اس سے کب سے جانتے ہو اسے؟"

جوان اتنے سوال سن کر گھبرا گیا۔ "محترم انکھ۔ میرا نام زردار بیگ ہے۔ میرے والد  
 نصیر الدین جعفر اس وقت دارالسلطنت موصول میں امیر عماد الدین زنگی کے نائب کی حیثیت  
 سے فائز ہیں۔"

"ہم تم سے یا تمہارے والد صاحب سے بالکل واقف نہیں۔" انکھ اور زیادہ اگڑ  
 گئے۔ "جب ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں تو پھر ملاقات کا مقصد کیا ہے۔ کیا تمہیں  
 علم نہیں کہ ہم امیر زنگی کی پناہ میں ہیں اور ان کی اجازت کے بغیر کسی غیر شخص سے میر  
 مل سکتے؟"

"انکھ یہ ملاقات پوشیدہ بھی تو رکھی جاسکتی ہے" زردار بیگ نے سنجیدگی سے کہا۔  
 "ہرگز نہیں جوان۔ انکھ تقریباً" چیخ پڑے۔ "ہم احسان فراموش نہیں۔ اپنے ہمراز  
 میزبان کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔"

"آپ ناراض ہو رہے ہیں انکھ" زردار بیگ نے بے دلی سے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ  
 شہزادے سے مل کے آپ لوگ ضرور خوش ہوں گے مگر آپ ملاقات کرنے پر آمادہ نظر  
 نہیں آتے۔"

"شہزادہ۔ کون شہزادہ۔ تم نے ابھی اپنے والد کا کچھ اور نام بتایا تھا۔" انکھ نے اے  
 حیرانی سے دیکھا۔

"آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں میں خود شہزادہ نہیں ہوں۔ انکھ میں ان کا دوست ہوں  
 قاصد ہوں۔ وہی شہزادہ ارسلان سے ملاقات کے خواہش مند ہیں۔" زردار بیگ نے باز  
 صاف کر دی۔

"کس شہزادے نے تمہیں بھیجا ہے اور کیا پیغام دیا ہے۔" انکھ ذرا سنبھل  
 بولے۔

"انکھ۔ ہمارے آقا امیر عماد الدین زنگی کے دو بیٹے اس وقت ان کے ساتھ الہ آباد  
 موجود ہیں" زردار بیگ نے تفصیل بتانا شروع کی۔ "میں چھوٹے شہزادہ قطب الدین مودود  
 دوست ہوں۔ شہزادے یہاں خود تشریف لائے ہیں اور شہزادی ارسلان سے ملنا چاہتے ہیں۔"  
 "انکھ نے گردن گھما کے ادھر ادھر دیکھا۔ "یہاں تو کوئی نظر نہیں آتا کیا تم انکھ  
 بیوقوف بنا رہے ہو؟"

"نہی انکھ۔ میں آپ کے ساتھ ایسی گستاخی نہیں کر سکتا۔" زردار بیگ نے انکار  
 "وہ دیکھئے۔ پیڑ کے نیچے دو آدمی کھڑے ہیں ان میں ایک شہزادہ قطب الدین مودود  
 دوسرا ان کا علام ہے۔"



”تم بڑی اچھی باتیں کرتے ہو شزاوے۔ میں۔۔۔۔۔“ شزاوی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آگے کیا کہے۔

ہاں ہاں۔ کوئی۔ تم کیا کہہ رہی تھیں؟“

”کیا تم روز آیا کرو گے میرے پاس؟“ شزاوی نے نہ معلوم کس خیال سے کہا۔

”اگر تم چاہو تو میں ہمیشہ تمہارے سامنے رہ سکتا ہوں۔“ شزاوے نے دبی زبان میں ردایا کیا۔

”میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ ماما نہیں پسند کریں گی۔“

”میں تمہاری ماما کو منالوں گا۔“

”کیا امیر تمہیں یہاں آنے کی روز اجازت دے دیں گے؟“ کیٹ نے دھڑکتے دل سے

”میں انہیں منانے کی کوشش کروں گا۔“

”مگر ہم پھر الگ ہو جائیں گے۔ کچھ دن بعد سروج واپس چلی جاؤں گی۔“

”میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ شزاوی نے چونک کے دیکھا۔ ”کیا تم مجھے گرفتار کر لو

لیا۔“

”نہیں کیٹ۔ میں تمہیں مانگ لوں گا۔“

”کس سے مانگو گے مجھے؟“

”تمہاری ماما شزاوی ارسلان ہے۔“

”وہ کیسے دے سکتی ہیں مجھے۔ میں ان کی اکیلی اولاد ہوں۔ مجھے ان سے بہت محبت ہے

مجھے کی کوشش کرو کیٹ۔“ شزاوہ پریشان تھا کہ کیٹ اس کی بات کیوں نہیں سمجھ رہی

۔ ”میں تمہیں ماما سے جدا نہیں کروں گا۔ وہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔“

”مگر ہم تو سروج چلے جائیں گے پھر تم کیسے ملو گے۔“

”شزاوی! شزاوہ مودود نے تنک آگے کہا۔ ”میں۔۔۔ میں تم سے شادی کروں گا۔

ادلس بناؤں گا۔ تمہاری ماما بھی میرے ساتھ رہیں گی۔“

شادی کے نام پر شزاوی کیٹ کے چہرے پر شہابی رنگ دوڑ گیا۔

”شزاوے!۔“ کیٹ گہرائے لہجے میں بولی۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔ ایک عیسائی لڑکی

مان شزاوے سے کیسے شادی کر سکتی ہے۔ میری ماما اور امیر اس کی اجازت نہیں دیں

ہیں۔“

”پہلے تم بتاؤ۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی۔؟“ شزاوے نے دو ٹوک سوال کیا۔

”مگر تم یہاں کیسے میرا مطلب ہے یہاں کیوں آئے ہو؟“

”میں تمہیں دیکھنے آیا ہوں کیٹ۔“

شزاوے نے بڑی معصومیت سے کہا اور شزاوی کیٹ حیا سے دہری ہو گئی۔ پھر

سے سنبھل کے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ شزاوہ کا غلام مہمان خانے کے اندر سے

رہا تھا۔ مہمان خانہ کے دو چوکیدار بھی تھوڑی دور کھڑے تھے۔

”چلو اندر بیٹھ کے باتیں کریں۔“ شزاوی نے مہمان خانے کی طرف اشارہ کر

”میں وہیں بیٹھا تھا۔ تمہیں دیکھ کے باہر آ گیا تھا۔“

اور دونوں مسکراتے ہوئے مہمان خانہ کے اندر چلے گئے۔

”اب بتاؤ۔ کیوں آئے ہو تم؟“ شزاوی کیٹ نے بیٹھے ہوئے کہا۔

”تمہیں دیکھنے آیا ہوں کیا تم شزاوی ارسلان کی بیٹی شزاوی کیٹ نہیں۔۔۔۔۔

مودود بے تکلفی سے بولا۔

”ہوں تو میں کیٹ۔ مگر تم مجھے کیوں دیکھنا چاہتے تھے؟“

”اس لئے کہ تم بہت خوبصورت ہو۔“

”میں۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔“ کیٹ نے شرما کے بکھری زلفیں

چیرا چھی ہے مجھ میں؟“

”تم سر سے پیر تک اچھی ہو کیٹ۔“ شزاوے پر بے خودی سے طاری ہو

”مگر تم تو شزاوے ہو۔“ ”کیا تم شزاوی نہیں؟“

کیٹ نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”شزاوی تھی۔ مگر اب تمہاری پناہ میں ہوں۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ پھول جنگل میں کھلے تب بھی اچھا لگتا ہے۔“

شزاوی نے پریشان نظروں سے دیکھا۔ ”اگر امیر کو تمہارے آنے کی خبر

ہوگا؟“

”کچھ نہیں ہوگا۔ تم کیوں گھبراتی ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ شزاوہ

دی۔

”مگر۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔ کیا چاہتے ہو مجھ سے؟“ شزاوی نے

شروع کر دیں۔

”اگر تم پسند کرو تو۔۔۔۔۔“ شزاوے مودود نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

شزاوی خوابناک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟“ شزاوی بڑی معصومیت

”کیا میں تمہیں اچھا نہیں لگتا؟“ شزاوہ نے اک دم سوال کر دیا۔

شہزادہ مودود اور کیٹ نے انہیں آتے دیکھ لیا تھا۔ شہزادی کا خون خشک ہوا جا رہا تھا مگر شہزادہ مطمئن تھا۔ جب ارسلہ مہمان خانہ میں داخل ہوئی تو شہزادہ مودود اور کیٹ ہجڑوں کی طرح سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان کی نظریں زمین پر لگی تھیں۔ ارسلہ نے دونوں کو برابر برابر کھڑے دیکھ کے ٹھٹھکی گئی مگر ارسلہ نے جلدی سے خود پر قابو پایا اور مسکرا کے دلی میں زندگی شہزادے کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ آپ شاید امیر موصل عماد الدین زنگی کے ”شہزادی کتے کتے رک گئی۔“

”ارسلہ۔ تمہارا اندازہ درست ہے۔“ انکل فیرو نے جو ارسلہ کے پیچھے مہمان خانہ میں داخل ہو چکے تھے۔ بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ شہزادہ مودود ہیں۔ امیر زنگی کے نیرے ہونمار بیٹے۔“

”آپ نے کیسے زحمت فرمائی شہزادے؟“ ارسلہ نے بڑے حیل سے کہا انکل فیرو نے پھر دخل دیا۔ ”ارسلہ۔ کیا مہمان کو بیٹھنے کو نہ کوگی۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تشریف رکھئے۔“ پھر ارسلہ نے فوراً بات پٹی۔ ”کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم مہمان خانہ کے بجائے اندر چل کے بیٹھیں۔“

شہزادے مودود یا انکل نے کوئی جواب نہ دیا۔

ارسلہ نے گھور کے کیٹ کو دیکھا۔ ”کیٹ۔ تم یہاں کیسے آگئیں؟“ ارسلہ کے لہجے کی تکی سب ہی نے محسوس کی۔ شہزادی کیٹ تھرا اٹھی۔

”میں۔ ماما میں۔ ادھر سے گزر رہی تھی۔“ کیٹ کی آواز حلق میں پھنس گئی۔

”یہ غلطی میری ہے شہزادی عالیہ۔“ شہزادہ نے فوراً اپنے پر الزام لے لیا۔ حالانکہ یہ بات سچ بھی تھی۔ ”کیٹ ادھر سے گزر رہی تھیں۔ میں نے آواز دے کر انہیں بلا لیا۔“

”خیر۔ کوئی بات نہیں۔“ شہزادی ارسلہ نے جیسے خون کا گھونٹ پی لیا مگر اسے فوراً نا احساس ہوا کہ وہ امیر زنگی کے بیٹے سے باتیں کر رہی ہے جو کل کو امیر موصل بھی ہو لگا ہے۔ وہ فوراً مسکرا دی۔ ”کیٹ نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا۔ یہ بہت شوخ لڑکی ہے۔ انکل فیرو کو دن بھر تنگ کرتی رہتی ہے۔“

انکل فیرو بات کرنے کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔ ”اپنا نام سنتے ہی بولے۔“ ارسلہ۔ شریف لوگ کھڑے ہو کے گفتگو نہیں کیا کرتے۔ خود بیٹھو۔ شہزادے کو بٹھاؤ پھر گفتگو کرو۔“

”شہزادے آپ تشریف رکھئے“ ارسلہ نے فوراً کہا۔

شہزادہ مودود اس کے سامنے اس طرح ادب سے بیٹھ گیا جیسے شاگرد استاد کے سامنے بیٹھا ہے شہزادی ارسلہ انکل فیرو نے بھی نشست سنبھالی۔۔۔ کیٹ اب تک کھڑی تھی۔

”میری بات کون سنے گا شہزادے؟“

”تم آمادہ تو ہو شادی پر؟“

”ہاں۔“ اور شہزادی نے گردن جھکا لی۔

”بس مسئلہ حل ہو گیا۔“ شہزادہ خوش ہو گیا۔ ”سنو کیٹ۔ اگر دو دل ملنے پر آمادہ ہو جائیں تو انہیں کوئی نہیں روک سکتا۔ میں امیر بابا سے اجازت حاصل کر لوں گا۔“

”ہائے۔ کیا تم ان سے کہو گے کہ تم مجھ سے۔۔۔“

”میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گا۔ میرے سردار ان سے بات کریں گے۔“

”اور اگر امیر نے انکار کر دیا تو۔۔۔۔۔“

”ایسی بات منہ سے نہ نکالو کیٹ۔ یقین رکھو۔ ایسا وقت نہیں آئے گا۔“

اس وقت شہزادے مودود کے نظر مہمان خانے کی کھڑکی سے سامنے کی راہداری میں پڑی۔ شہزادی ارسلہ اور انکل فیرو آہستہ آہستہ راہداری میں آرہے تھے۔

”بس اب چپ ہو جاؤ کیٹ۔ وہ لوگ آرہے ہیں“ شہزادے نے اسے خبردار کیا۔

”کون آرہے ہیں؟“ شہزادی نے گھبرا کے دروازے کی طرف دیکھا۔

”تمہاری ماما اور انکل۔۔۔۔۔“

”ہائے یہ کیا ہوا۔ ماما مجھے تمہارے پاس دیکھیں گی تو کیا سوچیں گی۔ میں جا رہی ہوں۔ ان کا سامنا نہیں کر سکتی بڑبڑاتی ہوئی اٹھ کھڑی ہو گئی۔“

”تمہارا بانا بیکار ہے کیٹ۔ وہ ادھر ہی آرہے ہیں۔ اپنا دل مضبوط رکھو۔“

دوسری طرف انکل فیرو اور شہزادی ارسلہ جب راہداری سے اتر کر مہمان خانے کی طرف چلے تو انکل فیرو کی نظر کھڑکی سے ہوئی ہوئی شہزادی کیٹ پر پڑی۔ اس نے جلدی سے شہزادی ارسلہ کا ہاتھ پکڑ کے روک لیا۔

”آگے جانے کی ضرورت نہیں؟“ انکل فیرو نے گیسر آواز میں کہا۔

”کیوں؟“ ارسلہ نے حیرت سے انکل کو دیکھا۔

”شہزادہ جس سے ملنے آیا تھا اس سے ملاقات ہو گئی۔“ انکل کی لہجے میں اب بھی سادگی تھی۔

”انکل فیرو۔“ ارسلہ ابجھتے ہوئے بولی۔ ”آپ کسی وقت ایسی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتے ہیں کہ دل ابجھنے لگتا ہے۔“

”ارسلہ۔ میں کہہ چکا ہوں کہ کیٹ کی قسمت الہا اور موصل سے وابستہ ہو چکی ہے پھر بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا۔“

انکل فیرو کی گرفت ارسلہ کی کلائی پر اور مضبوط ہو گئی۔ ”زنگی شہزادہ کیٹ سے باتیں کر رہا ہے۔ ہمیں دخل نہ دینا چاہئے۔“

”کیا کہا۔ شہزادہ۔ کیٹ؟“ ارسلہ نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا اور بھنائی ہوئی مہمان خانے کی طرف چلی۔



”کیا کرتا شنزادی۔ اس کی حالت ہی ایسی ہو گئی تھی کہ میرا دل پہنچ گیا۔“ شنزادی نے اس کا اعتراف بھی کیا ”مجھ میں نہیں آتا کہ ہلوکش کو کس نے ہکا دیا۔ اس بقاری کا تو یہ عالم تھا کہ رات بھر وہ اپنے امیر بابا کے خیمے کے گرد چکر لگاتا تھا۔“

”شنزادی۔ خدا آپ کی عمر دراز کرے اور آپ تجربہ حاصل کریں۔“ انکل فیرو نے دل دیا ”مجھے میرے موکلوں نے مجھے خواب میں دکھایا ہے کہ کم طرف سے دور رہو۔ یہ آئین کا سانپ ہوتے ہیں۔ ذرا تکلیف ہو۔ فوراً ڈس لیتے ہیں۔ امیر نے آپ کے مذہبی بیوا کی بات مان لی۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو غلام کو قتل کرا دیتا۔ اس کی معافی سے دوسرے امروں کو شہ مل سکتی ہے اور وہ اس سے بھی زیادہ خطرناک قدم اٹھا سکتے ہیں۔“

شنزادی کو ڈر ہوا کہ شنزادی کیسے انکل کی بے نیکی باتوں سے ناراض نہ ہو جائے۔ اس نے بات بتائی

”شنزادی یہ ہمارے انکل کے دماغ کی بات ہے۔ آپ برا نہ مانے گا۔“

”مگر شنزادی انکل نے جو کچھ کہا ہے اس میں بڑا وزن ہے۔“ شنزادی نے انکل فیرو کی بات کا برا ماننے کے بجائے اس کی تائید کر دی۔

پھر شنزادی قطب الدین نے کھڑے ہوتے کہا۔ ”شنزادی۔ آپ لوگوں سے مل کے مجھے بت خوشی ہوئی۔ اگر ناگوار نہ ہو تو کبھی کبھی میں ادھر آجایا کروں؟“

”یہ میرے خوش قسمتی ہوگی شنزادی۔ شنزادی ارسلانے سنبھل کے کہا۔ امیر محترم کے راج سے آپ مجھ سے زیادہ واقف ہیں۔ انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو زیادہ بہتر ہے۔“

”آپ فکر نہ کیجئے۔“ شنزادی کا دل چاہا کہ شنزادی کیٹ سے ایک بار پھر ملاقات کرے مگر یہ کچھ مناسب نہ معلوم ہوا۔ اس نے سوچا کہ شنزادی نے اسے آنے جانے کی تقریباً اجازت دے دی ہے۔ پھر اس قدر بے صبری کی کیا ضرورت دو دن بعد آؤں گا پھر لی بھر کے ملاقات ہوگی۔

مگر تقدیر کا انداز کچھ مختلف تھا۔ شنزادی واپس محل پہنچا تو معلوم ہوا کہ امیر زنگی اسی وقت موصل واپس جارہے ہیں۔ امیر زنگی کا نائب السلطنت نصیر الدین جعفر جو امیر کی عدم موجودگی میں موصل کا انتظام کرتا تھا اسے چند مفسدہ پردازوں نے قتل کر دیا تھا۔ امیر کو اپنے نائب کے قتل کا بہت افسوس تھا۔ وہ نہ صرف موصل روانہ ہوا بلکہ اپنے ساتھ دونوں بیٹوں نور الدین اور قطب الدین مودود کو بھی لیتا گیا۔ اس طرح شنزادی کیٹ اور شنزادی مودود کے دل میں محبت کی اٹھتی ہوئی چنگاریاں کچھ دنوں کے لئے بجھ کے رہ گئیں۔

”کھڑی کیوں ہو کیٹ۔ تم اندر جاؤ۔“ شنزادی ارسلانے سپاٹ لہجے میں حکم دیا۔

شنزادی بھاری قدموں سے باہر چلی۔ شنزادی دل کے میں ایک بغیر سی اٹھی

”شنزادی۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ اس غریب خانہ پر تشریف لائے۔“

غریب خانہ بھی آپ ہی کا دیا ہوا ہے۔ اگر امیر کرم نہ کرتے تو پتہ نہیں۔ مجھے کہاں کہاں کی خاک چھاننا پڑتی۔ ”شنزادی ارسلانہ جذباتی ہو گئی اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”ہمارے غلام نے آپ پر بڑا ظلم کیا ہے شنزادی۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اس کی معذرت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ یقین کیجئے کہ سروج میں جو کچھ ہوا اس کا نہ تو امیر بابا حکم دیا تھا اور نہ یہاں کسی کو خبر تھی۔“ شنزادی نے بھی معذرت کے تمام طریقے ایک ساتھ آزمائے۔

”مجھے معلوم ہے شنزادی۔“ شنزادی کی آواز کھٹی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ الہا میں عام معافی کا کوئی اعلان کرنے والا فاتح۔ سروج جیسے چھوٹے سے علاقہ میں ایسے ظلم کا کیسے حکم دے سکتا ہے۔ اور یہی یقین مجھے کسی اور طرف جانے کے بجائے کشاں کشاں الہا لے آیا۔ میں امیر محترم کے انصاف کی قائل ہو گئی۔ کتنی سخت سزا دی تھی انہوں نے غلام کو۔“

”مگر آپ نے تو اس کی سفارش کی تھی۔ معاف کر دیا تھا اسے۔“ شنزادی ذرا ماسکرایا۔

ارسلانہ کے اڑتے ہوئے جذبات شنزادی کے مسکراتے چہرے کو دیکھ کے بھم گئے۔ سانس لے کے بولی۔ ”شنزادی اگر ظالم کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ اپنے فعل پر شرمندہ ہو تو اسے معاف کر دینا چاہئے۔ ہمارے مذہب میں تو یہاں تک حکم ہے کہ اگر تمہارے رخسار پر کوئی ایک طمانچہ مارے تو تم اپنا در سرا رخسار بھی اس کے سامنے کر دو۔“

”مگر یہ تو بزدلی ہے شنزادی۔ ہمیں ظالم سے بدلہ لینا چاہئے۔“ شنزادی کی رگ شجاعت بھڑک اٹھی۔

”شنزادی۔ آپ بھول رہے ہیں۔“ ارسلانہ بھی مسکرا دی۔ ”کیا آپ کے قاضی نے امیر کو مشورہ نہیں دیا تھا کہ توبہ کرنے والے مجرم کو سزا دینے کے بجائے اگر معاف کر دیا جائے تو خدا کی نظریں میں معاف کرنا زیادہ پسندیدہ ہے۔ اس بنا پر امیر نے غلام کی جان بخشی کی تھی۔“

شنزادی قائل ہو گیا۔ آپ نے ٹھیک فرمایا۔ معاف کرنا ہی زیادہ بہتر ہے۔

”پھر میری طرح آپ نے بھی تو سفارش کی تھی اس کی؟“ شنزادی نے جیسے اسے اور قائل کیا۔

”ابھی تک کچھ نہیں معلوم ہو سکا۔ بڑے شہزادے سیف الدین غازی اس وقت موصل میں موجود ہیں۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ عماد الدین زنگی نے سختی سے سوال کیا تھا۔

اطلاع دینے والا گھبرا گیا یا خوف کھا گیا۔ ”عالی جاہ۔ میرا کوئی مطلب نہیں۔ شہزادے ہاں موجود ہیں تحقیقات کر رہے ہیں۔ شاید کچھ پتہ چل گیا ہو۔“

”سمجھ کے بات کیا کرو۔“ امیر نے اسے گھور کے دیکھا اور باہر جانے کا اشارہ کر دیا۔

## شہزادہ

اس کے جانے پر عماد الدین زنگی بہت دیر تک اس کی باتوں پر غور کرتا رہا مگر کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ اسے بہتر یہی معلوم ہوا کہ فوری طور پر موصل پہنچ کے اس قتل کی واردات کا فیصلہ خود کرے۔ الہا کی فتح کی خوشی کے بعد یہ پہلا واقعہ تھا جس نے عماد الدین زنگی کو مغموم کر دیا۔ موصل پہنچ کے اس نے بعض غیر جانبدار امیروں سے بات چیت کی اور اپنا شبہ بھی ظاہر کیا لیکن کسی امیر نے سیف الدین غازی کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ آخر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ فعل کسی ایسے غلام کا ہے جسے نصیر الدین جعفر کے ہاتھ سے نقصان پہنچا ہوگا۔ اس نے اپنے آپ اس نقطہ نظر کا ثبوت تلاش کیا مگر اس کے ہاتھ کچھ نہ آ سکا سوائے اس کے کہ چند دن پہلے چار پانچ غلاموں کو کسی معاملہ پر نصیر الدین جعفر نے بہت ڈانٹا جھٹکارا تھا اور سزا دینے کا معاملہ امیر زنگی کی اسیر پائے پر اٹھا رکھا تھا۔

کا نام سرفرست تھا۔ ہلوکش وہی خواجہ سرا غلام تھا جس پر الہا میں امیر زنگی نے عذاب نازل کیا تھا مگر سروج کی شہزادی ارسلہ اوز قاضی شہر کی شرعی عکتہ سخی کی وجہ سے اس کی جان بچ گئی تھی۔

امیر زنگی نے ہلوکش کو اپنے حضور طلب کر لیا۔

”ہلوکش“ امیر نے پر رعب لہجے میں کہا۔ ”تیرا پہلا جرم اس قدر خوفناک تھا کہ

اس کے بعد کسی دوسرے جرم میں محض شبہ کی بنا پر تجھے قتل کیا جاسکتا ہے۔“

اتنا کہہ کر عماد الدین خاموش ہو گیا اس کی بات نامکمل تھی اور یارکش کے لئے یہ

ملکی نہ تھا کہ وہ بغیر پوری بات سننے کوئی جواب دے یا رکش اسی سبب خاموشی اختیار کئے

رہا۔

”تو جواب نہیں دتا۔ کیا تجھے اپنے جرم کا اقبال ہے؟ امیر عماد الدین زنگی کا جلال ایک

دم اکیل پڑا جیسے اس کے نائب کی لاش اس کے سامنے پڑی ہو۔

نصیر الدین جعفر کی موت بڑی خوفناک اور عبرت انگیز تھی۔ عماد الدین زنگی کو اپنے نائب نصیر الدین جعفر پر اس قدر اعتماد تھا کہ وہ اپنے بڑے بیٹے سیف الدین غازی پر بھی اتنا بھروسہ نہ کرتا تھا۔ سیف الدین غازی عام طور پر موصل ہی میں رہتا تھا۔ وہ کافی سمجھدار تھا اور امور سلطنت بھی اچھی طرح سمجھتا تھا مگر عماد الدین زنگی جب بھی موصل سے لکھا حکومت کی باگ دوڑ پیش نصیر الدین جعفر ہی کے سپرد کرتا تھا ممکن ہے کہ سیف الدین دل میں اس بات پر کڑھتا ہو مگر بظاہر وہ نصیر الدین جعفر کا بڑا احترام کرتا اور ہمیشہ اسے بزرگ جعفر کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

نصیر الدین جعفر کی قتل کی خبر پر عماد الدین زنگی اس قدر تیزی سے الہا سے روانہ ہوا کہ وہ اس نئے اور اہم مقبوضہ علاقہ کا صحیح طور پر انتظام بھی نہ کر سکا۔ اس نے ایک مضبوط فوجی دستہ وہاں چھوڑا اور رات دن منزلیں طے کر کے موصل پہنچ گیا۔ اپنے نائب کے قتل پر اسے جو غم اور غصہ تھا وہ تو ایک الگ جذبہ تھا مگر اسے یہ شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ موصل سے خبر لانے والے نے جس انداز اور جن الفاظ میں یہ اطلاع پہنچائی تھی وہ انداز بھی مشکوک اور مبہم تھا۔

”امیر محترم۔ ناظم اعلیٰ نصیر الدین جعفر کو بڑی بیدردی سے قتل کیا گیا ہے۔“ موصل

سے آنے والے نے بتایا تھا۔

”کون کون امیر اس سازش میں شریک ہیں۔؟“ عماد الدین زنگی غصہ سے کانپ اٹھا

دیکھا تھا۔ گرفتار ہونے والوں نے اپنی جن محبوباؤں کے نام بتائے تھے۔ اس نام کی نصیر الدین جعفر کی حویلی میں موجود تھیں مگر جب ان سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ بیان دیا کہ وہ گرفتار ہونے والوں کو قطعی نہیں جانتیں اور انہیں خواہ مخواہ لیا جا رہا ہے۔

گرفتار ہونے والے تمام غلام بڑے سرکش اور خود سر تھے۔ ان کی خود سری کی وجہ تھی کہ وہ امیر زنگی کے خاص دستے میں تھے۔ یہ لوگ شہزادوں کی بے عزتی کرنے کی درپیش نہ کرتے تھے۔ پہلے ہلوکشش ان کا سردار تھا سروج میں عیسائیوں پر ظلم و رنے کے سلسلے میں امیر نے اسے معزول کر دیا تھا مگر مزید کوئی سزا نہ دی تھی۔ بنی رہا سے موصل واپس آیا تھا۔ اس کی سرداری ختم ہو گئی تھی لیکن اٹھنا بیٹھنا غلاموں کے ساتھ تھا۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ قتل کی شب ہلوکشش موصل سے دور لیا ہوا تھا۔ یا اس نے حلب میں اپنی موجودگی ثابت کر دی تھی۔ امیر اس بار بھی اسے سزا نہ دے سکا مگر گرفتار ہونے والے چاروں غلاموں کو قتل کرا دیا۔ اس سے باقی کے کان ہو گئے اور ان پر بیکی طرح امیر کا رعب طاری ہو گیا۔

نصیر الدین زنگی کچھ دن موصل میں ٹھہر کے یہاں کے انتظامات کرنا چاہتا تھا۔ نائب نصیر الدین جعفر کے قتل کے بعد اب اسے ایک قابل آدمی کو اپنا نائب مقرر کرنے تھی۔ اس کی نظر اس اب تک دمشق کی طرف لگی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ موصل میں وہ دن نہیں ٹھہر سکتا اس لئے کسی نائب کا انتخاب بہت ضروری تھا۔ اس کے قابل ترین دن میں نجم الدین ایوب سر فرست تھے مگر امیر زنگی نے ہعلبک فتح کرنے کے بعد نجم کو وہاں کا گورنر مقرر کیا تھا۔ ہعلبک دراصل دمشق کے وزیر اعظم معین الدین انزکی تھی اور یہ علاقہ دمشق سے صفر پینتیس چالیس میل کے فاصلے پر تھا اس لئے اس کے اور حفاظت کے لئے امیر زنگی نے اپنے ذہین ترین سردار کو مقرر کیا تھا۔ دوسرا بھائی مدین شیر کوہ امیر زنگی کے ساتھ تھا۔ نائب سلطنت کے طور پر اس کے انتخاب میں وقت نہیں تھا مگر وہ اسد الدین شیر کوہ کو اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا بازو نجم الدین ایوب تو بایاں اسد الدین شیر کوہ تھا۔ نجم الدین کو ہعلبک بھیجنے کے بعد کوہ کو موصل میں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ شیر کوہ کو وہ اپنی اصل طاقت سمجھتا تھا۔

آخر شیر کوہ کے مشورے سے اس کی نظر انتخاب زین الدین علی کو چمک پر ٹھہری۔ سیف الدین غازی کی طرف سے امیر کا دل صاف ہو گیا تھا اس لئے نائب کے میں اس کا مشورہ بھی شامل کیا گیا۔ دوسرے بیٹے ورازیں کو بھی وہ اتنا سنجیدہ نہ

”آقا نامدار۔ اگر مجھے گناہ اور جرم کے پیش نظر اس جرم میں بھی ملوث کیا گیا ہے تو آقا مالک ہیں۔ انصاف ان کے حکم کا پابند ہے جو چاہیں سزا دے سکتے ہیں حالانکہ اس گناہ نے قتل کے سلسلے میں اب تک جتنی تحقیقات ہوئی ہے۔ اس میں میرا نام کہیں بھی موجود نہیں اس لئے کہ قتل کی رات میں موصل کے بجائے حلب میں موجود تھا اور قاضی حلب اپنے شہر میں میری موجودگی کی شہادت دے چکے ہیں“ ہلوکشش نے اپنے دفاع میں ایسی باتیں کہی تھیں جو امیر پہلے بھی سن چکا تھا۔ پھر ہلوکشش کا چہرہ بھی اس قدر سپاٹ تھا کہ اس پر شبہ کرنے کا جی نہیں چاہتا تھا۔

”ہلوکشش۔ تو بہت چالاک ہے۔“ امیر نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس کی باتوں سے بالکل متاثر نہیں۔ ”اگر تو واردات کے وقت موصل میں موجود نہیں تھا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس قتل میں شریک نہیں۔ تیرے تمام ساتھی غلام جن کا تو سرغنہ بیان کیا جاتا ہے تجھ سے کم درجہ اور عقل و شعور میں بھی تجھ سے کم ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو انہیں مشورہ دے کر موقع سے ہٹ گیا ہو۔ شبہ میں گرفتار ہونے والے غلاموں کا یہ عذر قطعی قابل قبول نہیں کہ وہ اس رات اپنی محبوب کنیوں سے ملنے نصیر الدین جعفر کی حویلی پر گئے تھے۔ ان کا یہ سراسر بہانہ معلوم ہوتا ہے۔“

نصیر الدین جعفر کو نصف شب کے بعد اس کی خوابگاہ میں بستر پر سوتے میں قتل کیا گیا تھا جبکہ حویلی کے اندر اور باہر مسلح سپاہیوں کا پہرہ تھا۔ قحب کی بات یہ تھی کہ اس قتل کی خبر صبح کو بھی کسی کو نہ ہوئی۔ جب دن چڑھا اور نصیر الدین جعفر بیدار ہو کر باہر نہیں آیا تو کنیوں اور غلاموں کو فکر ہوئی۔ کنیز کو خواب گاہ کے اندر بھیجا گیا۔ خواب گاہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا جبکہ نصیر الدین ہمیشہ دروازہ بند کر کے سوتا تھا۔ اس کے علاوہ نصیر الدین جعفر سوتے وقت اپنی تلوار اپنے پہلو میں رکھتا تھا۔ قتل کی صبح کو اس کی تلوار بھی غائب تھی۔ ان باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ نصیر الدین جعفر کا قتل ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا ہے لہذا اس کا قاتل یا تو محل کے اندر کا تھا یا پھر باہر سے آنے والے کے ساتھ حویلی کے لوگوں نے تعاون کیا کہ وہ قتل کرنے کے بعد خیریت سے واپس ہو گیا اور باہر کے پیردار بھی اسے نہیں دیکھ سکے۔

شہزادہ سیف الدین غازی نے قتل کی صبح ہی کو تحقیقات کا آغاز کر دیا تھا۔ نصیر الدین جعفر نائب تھا اور اس کا کوئی نائب نہ تھا اس لئے شہزادہ سیف الدین غازی نے اپنا فرض سمجھا کہ انتظام سلطنت فوراً ”سنجھالے اور قتل کی تحقیقات کرے۔ جن غلاموں کو گرفتار کیا گیا تھا ان پر یہ شبہ تھا کہ قریب کے بعض دکانداروں نے انہیں شام کے وقت حویلی کے

ارسلان نے گھبرا کے کیٹ کو دیکھا۔ ”نہیں شہزادی میں تمہیں منع نہیں کرتی لیکن ہمیں مسلمانوں کا ابھی کوئی تجربہ نہیں۔ شہزادہ مودود یوں بھی ابھی بہت کم عمر ہے۔ ہمیں بہت غلط رہنا ہوگا۔“

شہزادی کیٹ بہت اداس ہو گئی تھی۔ ”آپ فکر نہ کیجئے مئی۔ میں شہزادے کو زیادہ بے تکلف ہونے کا موقع نہیں دوں گی۔ انہیں آنے دیجئے۔ آپ دیکھیں گی کہ میں کس قدر غیاط سے گفتگو کرتی ہوں۔“

”کیا شہزادہ آج آئے گا۔ تم سے کچھ کہا تھا اس نے؟“ ارسلان پریشان ہو گئی۔ اس نے وہ شہزادہ کی کوئی خاطر نہ کر سکی تھی۔ اگر آج شہزادہ آگیا تو وہ اس کی کیا خاطر کرنے لگا۔

”مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا انہوں نے۔“

”پھر تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ وہ آج آئے گا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آج نہ آئے۔“

”ہو سکتا نہیں بلکہ ایسا ہوا ہے ارسلان۔“ یہ آواز انکل فیرو کی تھی۔ وہ دروازے میں ٹپ ہوئے تو ان کے کانوں میں ارسلان کے آخری الفاظ پڑے تھے

کیٹ اور ارسلان انہیں حیران نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ ”کیا ہوا انکل۔ کیا کہنا ہے ہیں آپ؟“

”میں کہہ رہا ہوں۔ بلکہ ستارے یہ کہتے ہیں۔“ اور انکل فیرو چارپائی (مسری) پر بیٹھ سٹارے لگے جیسے بہت دور سے آرہے ہوں۔

کیٹ کی جان حلق میں آگئی۔ انکل جب ستاروں کا نام لیتے تھے تو ہمیشہ بری خبر سناتے۔ پھر میں ان کے اوٹ پٹانگ جملے بڑے معنی خیز ہوتے تھے۔ ”انکل۔ آپ کچھ کہہ رہے تھے؟“ کیٹ سے برداشت نہ ہوا اور وہ پوچھ ہی بیٹھی۔

”میں کب کہتا ہوں۔ یہ سب تو ستارے کہتے ہیں۔“ انکل سانس سنبھال کے بولے۔

”ستارے کیا کہتے ہیں یہی تو پوچھ رہی ہوں؟“

”ستارے کہتے ہیں کہ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔“

شہزادی کیٹ کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا ہوا شہزادے کو؟ ”کیٹ جذبات میں بہہ گئی لانے تعجب سے اسے دیکھا۔ اسے غصہ آیا مگر ضبط کر گئی۔

”ہوا یہ کہ امیر عماد الدین زنگی اپنے دارالسلطنت موصل واپس چلا گیا۔“ انکل فیرو زرے لے کر کہنا شروع کیا۔ وہ اکیلے جاتا تو ہمارے گھر کو کوئی فرق نہ پڑتا لیکن وہ

سمجھتا تھا کہ اس سے ملکی معاملات میں مشورہ لیا جائے۔ تیسرا بیٹا قطب الدین مودود تھا، بچہ ہی تصور کیا جاتا تھا۔ امیر زنگی سے قدرت نے ایک وفادار اور لائق سردار چھین لیا اور اس بے وقت قتل نے شہزادہ قطب الدین مودود کے دل کی دنیا اجاڑ کے رکھ دی تھی اسے صرف ایک دن کی خوشی میسر ہوئی تھی۔ ایک دن بھی کہاں صرف دن کی چند گزراں رہا میں کیٹ سے اس کی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ اگر امیر زنگی اک دم موصل واپس نہ آتے تو شہزادہ مودود کی محبت بھی پروان چڑھتی مگر شہزادہ کے معاملہ میں تو جیسے سرسبز ہی اولے پڑ گئے تھے۔

دوسرے دن شہزادی کیٹ آپ ہی آپ سناگر کر کے شہزادہ مودود کا انتظار کرنے لگی۔ ارسلان کی اس پر نظر پڑی تو حیران رہ گئی۔

”کیس جارہی ہو کیٹ۔؟“ ارسلان نے ذرا تیز لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔ نہیں۔“ کیٹ گھبرا گئی۔

”میں کچھ پوچھ رہی ہوں کیٹ۔؟“ ارسلان کا لہجہ تیز ہو گیا۔

”نہیں مئی۔ میں کیس نہیں جا رہی۔“ کیٹ کے پاس انکار کے سوا اور کوئی چارہ تھا۔

”پھر اس بھر کیلے لباس اور زیورات سے آراستہ ہونے کی کیا ضرورت تھی۔؟“ ارسلان کا غصہ بڑھتا جا رہا تھا اور آواز میں اسی اعتبار سے تبدیلی اور تلخی پیدا ہو رہی تھی۔

”مئی۔ میرے کپڑے تو بالکل عام ہیں۔ رہا زیورات کا مسئلہ تو میرے پاس ایک نیلک کے سوا اور بچاہی کیا ہے۔ اسی کو کبھی پہن لیتی ہوں۔“ کیٹ کو ماں کا لہجہ ناگوار گزر لگتا تھا۔ ”مگر آپ اس قدر جرج کیوں کر رہی ہیں۔ اچھے کپڑے پہننا کوئی جرم تو نہیں مئی۔؟“

”کیٹ۔ تم ابھی بچی ہو زمانے کے نشیب و فراز سے واقف نہیں۔“ کیٹ کا مو خراب ہوتے دیکھ کر ارسلان نے فوراً اپنا لہجہ بدل دیا۔ ”میں تمہیں کسی بات سے منع نہیں کرتی لیکن تمہیں سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا چاہئے۔ ہمارے حالات بگڑتے ہوئے ہیں۔ حکومت ہماری نہیں مسلمانوں کی ہے۔ اور حاکم وقت ہو یا اس کے عزیز و اقارب۔ ان کی آنکھیں بدلنے دیر نہیں لگتی۔ یوں بھی حاکم کی آنکھیں ماتھے پر ہوتی ہیں“

ارسلان نے نرم لہجے میں سمجھایا تو کیٹ کی سمجھ میں آگیا۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔ ”مئی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہمیں کسی سے غلط توقع وابستہ نہیں کرنا چاہئے۔“ اس کے ساتھ ہی کیٹ کے منہ سے ایک آہ نکل گئی۔

شہزادے مودود کو بھی ساتھ لے گیا ہے۔ اب کیا ہوگا۔ شہزادی کیٹ کا کیا ہے گا؟“  
 ”بے گاہ کیا وہ موصول میں نہیں رہے گا اور شہزادی الہا میں ارسال نے غصے میں کہا جب  
 شہزادہ موصول جاتے وقت ہم سے مل کے نہیں گیا تو پھر ہم اس کی کیوں پرواہ کریں۔ ہمیں  
 اس کی پرواہ کرنی بھی نہیں چاہئے۔ ہم خداوند یسوع مسیح کے پیروکار اور وہ دوسرے مذہب  
 کا ماننے والا۔ کیوں کیٹ تمہارا کیا خیال ہے؟“ ارسال نے کیٹ سے تصدیق چاہی۔  
 کیٹ شاید اپنے خیالوں میں گم تھی یا پھر اس نے جان بوجھ کے سنی ان سنی کردی مگر  
 انکل فیرو خاموش نہ رہ سکے انہوں نے ارسال کو بہت سخت جواب دیا۔۔۔۔۔ ”اس غریب  
 سے کیا پوچھتی ہو اس کا تو چن اجڑ گیا ارسال۔ تم ماں ہو کر بھی اس کے جذبات نہیں سمجھ  
 سکتیں۔ شہزادہ مودود ہم سے مل کے نہیں گیا لیکن ہم سب کے لئے الگ الگ پیغام چھوڑ  
 گیا ہے اور ان تمام پیغاموں کا ایک ہی مفہوم ہے وہ یہ کہ شہزادہ اس ملاقات کو کبھی نہ  
 بھولے گا جس میں شہزادی کیٹ۔ شہزادی ارسال فیرو شریک تھے وہ بہت جلد دوبارہ ملاقات  
 کرنے کے لئے آئے گا“

”یہ پیغام کوئی آسانی صحیفہ نہیں کہ سینہ سے لگا کر رکھا جائے۔“ ارسال کو اچھا خاصا غصہ  
 آگیا تھا۔  
 ”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں سروج واپس چلا جانا چاہئے۔ کیوں انکل آپ کا کیا خیال  
 ہے؟“  
 ”ہوں۔ میرا خیال پوچھتی ہو۔“ انکل فیرو نے بھی منہ بنا لیا۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ  
 خیال آیا کیسے؟“  
 ”آج نہیں تو کل ہمیں یہ سوچنا ہی تھا۔“ شہزادی ارسال بردبادین کے بولی۔ ”یہ کل  
 اور یہ سب لوازمات ہمیں امیر زنگی کی طرف سے ملے تھے۔ وہ موصول واپس جا چکے ہیں  
 اب یہ یہاں کے گورنر کی مرضی ہے کہ ہمیں یہاں رہنے دیتا ہے یا نکال باہر کرتا ہے۔  
 ہمارا اس پر کوئی زور تو نہیں ہے۔ آپ کہیں گے کہ اگر گورنر ہم سے محل چھینے تو ہم امیر  
 زنگی سے شکایت کر سکتے ہیں۔“  
 ”پاکلی ٹھیک۔ یہاں کا گورنر ایسی جرات کر ہی نہیں سکتا“ انکل فیرو نے زور دے کر  
 کہا۔ ”اگر اس نے یہ حماقت کی تو ہم اپنا مقدمہ موصول کے دربار میں پیش کر کے گورنر  
 الہا کی مٹی پلید کرادیں گے۔“

”بس رہنے دیجئے انکل۔“ ارسال نے ناگوار انداز میں کہا۔ ”سروج میں ہماری جو مٹی  
 پلید ہوئی تھی وہ آپ بھل گئے۔ جب تک کوئی موصول جائے گا۔ مقدمہ پیش کرے گا اور  
 الہا کی مٹی پلید کرادیں گے۔“

شہزادے مودود سے ملاقات کرتیں۔ بے وقوف لڑکی۔“ ارسال نے شہزادی کیٹ کو  
 ”انکل فیرو آپ دیکھتے ہیں یہ احمق لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟“  
 ”میرا جی تو نہیں چاہتا مگر میرے موکل کہہ رہے ہیں کہ میں تمہاری بات کی

”ہزار بار سمجھایا کہ بیٹوں کی باتوں میں ٹانگ نہیں لگایا کرتے۔“ انکل فیرو نے لقمہ  
 ”ستارے کہتے ہیں۔۔۔۔۔“ انکل فیرو نے بات بچ ہی میں اچک لی مگر ارسال نے  
 ”انکل۔ کسی وقت تو سنجیدہ ہو جایا کیجئے۔ اپنے ستاروں کو تھوڑی دیر باندھ کے نہیں  
 کیٹے؟“

”خیر چھوڑو ستاروں کو۔ ستاروں سے زیادہ سچے میرے موکل ہیں جو سوتے اور جاگتے  
 مجھے خبریں پہنچایا کرتے ہیں۔“ انکل نے مسکرا کے شہزادی کیٹ کو دیکھا جو ارسال کی  
 لڑائیوں سے افسردہ ہو گئی تھی۔ ”میرے موکل نے مجھے بتایا ہے کہ۔“  
 ”انکل۔ اپنے پر نہ سہی۔ مجھ پر تو رحم کیجئے۔“ ارسال بے بسی سے بولی۔ ”ہمیں کوئی  
 کتا ہے۔ آگے کے بارے میں کچھ سوچنا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں نے موکل کا گلا دبا دیا ہے لیکن تم پہلے کیٹ کی بات سن لو۔ کبھی کبھی  
 اللہ سے اچھی باتی سوچتے ہیں۔“  
 ”ابھائی کیٹ تم کیا کہنا چاہتی ہو!“ ارسال نے ہتھیار ڈال دئے۔  
 ”میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں انکل کے ساتھ موصول چلی جاتی۔“ کیٹ نے ڈرتے  
 لہ۔

”اباں جا کے کیا کرتیں؟“ ارسال کا مزاج پھر بگڑ گیا۔  
 ”میں امیر کے سامنے آپ کا مقدمہ پیش کرتی۔ سروج کی جاگیر آپ کے نام کراتی

شہزادے مودود سے ملاقات کرتیں۔ بے وقوف لڑکی۔“ ارسال نے شہزادی کیٹ کو  
 ”انکل فیرو آپ دیکھتے ہیں یہ احمق لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟“  
 ”میرا جی تو نہیں چاہتا مگر میرے موکل کہہ رہے ہیں کہ میں تمہاری بات کی

ہوتی ہے لیکن وقت پڑنے پر تم دیکھو گی یہ کسی شیرینی سے کم نہیں۔“ انکل فیروز نے مسکرا کر کیٹ کو دیکھا۔ ”میرا ارادہ کیٹ کو ساتھ لے جانے کا تھا۔ مگر وہاں کے صحیح حالات کا نہیں اس لئے میں اپنے موکلوں کے ساتھ وہاں جا رہا ہوں۔“

”آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں انکل؟“ کیٹ نے ہنس کے پوچھا۔

”ستارے بھی وہی کہتے ہیں جو سب کی زبان پر ہے۔“

لوگوں کی زبان پر کبھی کوئی صحیح بات نہیں ہوتی۔ موصل سے خبر آئی تھی۔ اس کا علم امیر موصل عماد الدین زنگی کو تھا یا اس کا وفادار سردار اسد الدین شیر کوہ جانتا تھا مگر امیر نے اس سے موصل واپس جانے کا فیصلہ کیا اور پھر اس پر عمل کیا گیا۔ اس نے افواہوں کو اڑایا تھا

نائب سلطنت کا قتل بھی کوئی معمولی بات نہ تھی۔ نائب سلطنت عام طور پر ولی عہد ہوا کرتا تھا۔ مگر امیر موصل عماد الدین نے جس کی عمر ساٹھ سال کے لگ بھگ تھی۔ تاکہ اپنا ولی عہد مقرر نہ کیا تھا۔ بڑے شہزادے سیف الدین غازی میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک فرمانروا کے لئے ضروری ہوتی ہیں مگر نہ معلوم امیر موصل اس معاملہ کیوں دیر کر رہا تھا۔ ممکن ہے کہ اسے ابھی دس بیس سال اور اپنے زندہ رہنے کی امید خدا کی ذات سے یہ بات کوئی بعید نہیں ہے مگر خود انسان کو ہر وقت مرگ ناگمان کے تار رہنا چاہئے۔ انسان جوان ہو یا بوڑھا اس کی موت خدا کے ہاتھ ہوتی ہے خدا کی ت کیا ہوتی ہے اس کا کسی کو علم نہیں۔

امیر کی موصل روانگی کے فوراً بعد یہ افواہ گرم ہو گئی تھی کہ موصل میں بغاوت ہو اور شہزادہ سیف الدین غازی اس بغاوت کا سرغنہ ہے حالانکہ اس میں ایک فیصد بھی نہ تھی۔

نصیر الدین جعفر کے قتل کے بڑے دور رس نتائج ظاہر ہوئے۔ موصل میں کچھ غلام دے۔ نیا نائب سلطنت مقرر ہوا اور سیف الدین غازی کی ولی عہد کا اعلان کچھ اور کے بڑھ گیا حالانکہ شہزادے کا دامن اس قتل سے بالکل پاک تھا۔ امیر عماد الدین زنگی بڑے بیٹے سیف الدین غازی سے کچھ خوش بھی نہ تھا بٹھلے بیٹے نور الدین کی طرف ہکا بھکا تھا لیکن وہ اسے ظاہر نہ کرتا تھا اور کسی ایسے وقت کی تلاش میں تھا جس میں وہ نصیر الدین پر نور الدین کو فوقیت دے سکے۔ نصیر الدین جعفر کا قتل اس کام کے لئے بڑا موقع تھا مگر امیر عماد الدین کو سیف الدین غازی کے خلاف رتی بھر ثبوت بھی نہ مل سکا یہاں تک ہوا کہ موصل میں موجود امرا و ذرا اور دیگر عمائدین نے دہلے الفاظ

تائید کروں کیٹ کا اس وقت موصل جانا بہت بڑی غلطی ہوگی۔  
”آپ کے موکل کتنے اچھے ہیں انکل۔“ ارسلہ خوش ہو گئی۔ ”اب تو وہ میری بات بھی تائید کرنے لگے ہیں۔“

شہزادی کیٹ بڑی حسرت سے کبھی انکل فیروز اور کبھی اپنی ماں ارسلہ کا منہ بکتی رہی ”گھبراؤ نہیں کیٹ۔“ انکل فیروز نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ہم تم موصل چلے گئے مگر اس وقت نہیں۔ ایک بات کا خیال رہے۔ میں نے تمہارے موصل جانے مخالفت اس لئے نہیں کی ہے کہ یہ تمہاری ماں ارسلہ چاہتی ہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے۔“

”اور کیا وجہ ہے؟“ ارسلہ تک کے بولی  
کیٹ نے بھی انکل فیروز کو اس طرح دیکھا جیسے اس کی نظروں میں بھی یہی سوال ہے انکل فیروز نے ادھر ادھر دیکھا پھر راز داری سے بولے۔ ”موصل میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔“

”بغاوت؟“ ارسلہ نے حیرانی سے انکل کو دیکھا۔ ”کس کے خلاف بغاوت ہوئی ہے؟“  
”ارسلہ۔ تمہارا تعلق شاہی خاندان سے ہے مگر تم بغاوت کے معنی نہیں سمجھتیں انکل فیروز بگڑ گئے۔“ بغاوت ہمیشہ بادشاہ وقت کے خلاف ہوتی ہے میرے موکلوں نے اظہار دی ہے کہ نائب سلطنت نصیر الدین کا قتل اس بغاوت کا ایک حصہ ہے۔ عماد الدین جس عجلت سے موصل روانہ ہوا ہے اس سے اس معاملے کی سنگینی کا احساس ہوتا۔ میرے موکل کہتے ہیں کہ اگر امیر زنگی اس وقت موصل میں ہوتا تو اس کا زندہ بچنا مشکل تھا۔“

یہ تو بہت بری خبر ہے۔ آپ نے اس کی تصدیق کی ہے انکل؟“ ارسلہ ان کی بات کو کم ہی اعتماد کرتی تھی اسی لئے اس نے یہ سوال کیا تھا۔  
انکل فیروز کچھ گھبرا گئے۔ ”دیکھو ارسلہ۔ خبر پھر خبر ہوتی ہے۔ اس میں کچھ کمی بیشی ہی سکتی ہے۔ میرے موکل نے تو اس کی تصدیق کی ہے مگر میں خود اس کی تصدیق کرنا ہوں۔“

”آپ! آپ کیسے تصدیق کریں گے۔“  
”میں موصل جا رہا ہوں“ انکل فیروز نے ایک دم انکشاف کیا تو ارسلہ حیران رہ گئی۔ ”مگر انکل۔ آپ کیسے جا سکتے ہیں ہمارے پاس کون ہوگا۔“ ارسلہ کو اپنی فکر پڑ گئی۔ ”تم اکیلی نہیں رہو گی۔ تمہارے ساتھ کیٹ ہوگی۔ یہ دلی پٹی لڑکی تمہیں کھڑی

یعنی دلایا۔

سب سے زیادہ پریشانی سروج کے شاہی خاندان کے تین افراد کو تھی جو اپنا سب کچھ سروج ہی چھوڑ آئے تھے۔ اس گھرانے کے تینوں افراد یعنی ارسلان شہزادی کیٹ اور انکل فیرو اگرچہ ایک ہی گھر میں رہتے تھے وہ بالکل مختلف قسم کے دل و دماغ کے مالک تھے انکل فیرو رفن مولا تھا وہ کسی کام کے نہ تھے پھر بھی منجم اور ریاضی دان اور موکل ان کے قبضہ میں تھے اور علم طب میں کسی کو اپنے برابر نہ سمجھتے تھے۔ ان کے طبیب ہونے کی تفصیل یہ ہے کہ ان کے حلقہ احباب میں کوئی شخص ایسا بیمار ہوا کہ تمام حکیموں اور میوں نے جواب دیا انکل فیرو کچھ ہی دن پہلے دوستوں میں اپنے حکیم ہونے کا دعویٰ کر چکے تھے۔ پس انکل فیرو کو حکمت کی کوئی کتاب مل گئی جس میں متعدد امراض کے تیر ہر ف نسخے آج تھے۔ آپ نے کتاب بند کر کے صفحات کے درمیان انگلی ڈالی پھر ایک جگہ سے کتاب ہلادی اور اس صفحہ پر جو پہلا نسخہ درج تھا وہ نقل کر کے بیمار کے عزیزوں کو دیدیا۔ خدا کا ایسا ہوا کہ اس دوا کے استعمال سے بیمار اٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ پھر تو انکل فیرو کے تمام ب کو ان پر ایمان لانا پڑا اور وہ پورے حلقے میں حکیم ڈاکٹر اور جانے کیا کیا مشہور ہو گئے۔

یہ ٹھیک ہے کہ انکل فیرو باتیں زیادہ بتاتے اور کام بہت کم کرتے تھے لیکن انہوں نے محبت بھرا دل پایا تھا جو ہر ایک کی مصیبت پر رتب اٹھتا تھا۔ انہیں اندازہ تھا کہ اس جانے سے شہزادی کیٹ کو شہزادے ہوود سے پہلی ہی ملاقات میں کس قدر محبت ہو گئی اور شہزادے کے اس طرح جانے سے شہزادی کیٹ کتنی اداس ہو گئی تھی۔ چنانچہ شہزادہ چار دن تک ان کے گھر نہیں آیا تو انکل فیرو اس کا پتہ لگانے شاہی خیمہ گاہ میں گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ امیر زنگی اپنے بیٹوں کے ساتھ موصل واپس جا چکے ہیں کیونکہ نائب کو قتل کر دیا گیا ہے اور اس قتل میں ان کے بیٹے سیف الدین کا ہاتھ ہے۔

سیف الدین جعفر کا قتل شہزادہ سیف الدین غازی کی بغاوت کا شہساز بن گیا۔ شہزادی ارسلان کے محل میں ہر وقت اداسی طاری رہتی۔ ارسلان تہذیب کے عالم میں سے معلوم ہو گیا تھا کہ شاہ جو سلین کے جاسوس رہا میں گھومتے پھر رہے ہیں اور امیر زنگی کے خلاف بھڑکا رہے ہیں۔ رہا میں مسلمان بہت کم تھے۔ امیر نے واپسی کے وہاں ایک مضبوط دست چھوڑا تھا۔ ان کے علاوہ رہا میں پہلے سے رہنے والے لہان بھی تھے مگر گزشتہ ایک سو سالہ غلامی نے انہیں پس کے رکھ دیا تھا گوکہ رہا پر

میں امیر کو مشورہ دیا کہ امیر کسی دوسرے کے بجائے اپنے بیٹوں میں سے کسی کو نائب السلطنت مقرر کریں۔ ظاہر تھا کہ اگر بیٹوں میں سے کسی کو نائب بنانے کا مشورہ قبول کیا جاتا تو بڑا ہونے کی وجہ سے سیف الدین غازی کو یہ عہدہ ملنا چاہئے تھے مگر امیر زنگی نے مشورہ سرے سے قبول ہی نہیں کیا۔ اس طرح ولی عہد کا مسئلہ پھر کھٹائی میں پڑ گیا۔ دوسری طرف نصرانی ریاستوں نے نصیر الدین جعفر کے قتل کو خوب اچھالا۔ نائب السلطنت کا قتل واقعی ایک اہم واقعہ تھا اور اس سلسلے میں جو کچھ بھی کہا جاتا وہ کم تھا تمام علاقوں اور ریاستوں میں یہ افواہ پھیل گئی کہ موصل میں بغاوت ہو گئی۔ شہزادے سیف الدین نے امیر زنگی کے خلاف بغاوت کر دی اور باپ بیٹے میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ شہزادے نے شاہی محل پر زبردست یلغار کی اور دست بدست جنگ میں امیر زنگی کی جان بچ گئی مگر اس کا نائب باغیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ یہ افواہ اس انداز سے پھیل گئی کہ نصرانی ریاستوں میں انتظامیہ یروٹلم تک ہر شخص نے اسے حقیقت سمجھ کے اس پر یقین کر لیا۔

رہا اگرچہ اب نصرانی علاقہ نہیں تھا بلکہ اس کے حاکم مسلمان تھے۔ لیکن یہاں عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ وہاں کے لوگوں نے بھی اس افواہ پر اسی طرح اعتبار کر لیا جس طرح دوسری نصرانی ریاستوں میں اسے حقیقت سمجھا گیا تھا۔ ارسلان نے اس قتل پر بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ نصیر الدین کے قتل ہونے یا امیر زنگی کے خلاف بغاوت ہونے سے اسے فائدے سے زیادہ نقصان پہنچنے کا امکان تھا۔ رہا میں اس کا قیام مہمانوں کی طرح تھا۔ سروج کی جاگیر اگرچہ امیر زنگی نے اسے واگزار کر دی تھی۔ اس کی قیمتی اشیاء بھی اس کے کنکشن اور اس کے ساتھیوں سے چھین کے سروج میں محفوظ کر دی گئی تھیں مگر ارسلان پاس امیر زنگی کا کوئی ایسا فرمان نہ تھا جسے دکھا کر وہ سروج کی دوبارہ مالک بن سکتی۔ اسے ڈر بھی پیدا ہو گیا تھا کہ اگر امیر کے رہا آنے میں زیادہ تاخیر ہوئی تو کہیں اس کی جاگیر معاملہ جھگڑے میں جھڑ پڑ جائے۔

قل باشر میں دیکا بیٹھا رہا کا معزول شاہ جو سلین دوم اس واقعہ پر بہت خوش ہوا کیونکہ امیر زنگی کے خلاف بغاوت اس کی تقدیر بدل سکتی تھی۔ شاہ جو سلین دوم نے افواہ کے سارے پر ہی اپنے جاسوسوں کو رہا بھیج دیا تھا اور انہیں تاکید کی تھی کہ وہ ارمنی تاجروں سے رابطہ قائم کریں جن کے سارے جو سلین رہا چھوڑ کے قل باشر عسرت کا موسم گزارنے گیا تھا۔ ارمنی تاجروں نے بادل ناخواستہ امیر زنگی کا رہا ہوا تسلیم کیا تھا چنانچہ جب شاہ کے جاسوسوں نے ان سے رابطہ کیا تو انہوں نے اپنے

نے اس طرح کہا جیسے اس نے پادری کا سوال نہیں سنا ہے۔

پادری کچھ دیر حیران نظروں سے انکل فیرو کو دیکھتا رہا پھر سرگوشیوں میں بولا۔ ”انکل فیرو۔ میں آپ سے تنہائی میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں جانتا ہوں آپ مجھ سے اور شہزادی ارسلہ سے کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ فادر انکل فیرو کا لہجہ اکھڑا اکھڑا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ آپ الہا کو ایک بار پھر مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔“

پادری گھبرا گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ”انکل فیرو آپ غضب کر رہے ہیں۔ اس عمل میں کئی مسلمان ملازم بھی ہیں کسی نے سن لیا تو آپ لوگوں کے لئے مشکل ہو جائے گی۔“

”میرے لئے نہیں۔۔۔۔۔“

انکل فیرو کچھ کہنا چاہتا تھا کہ شہزادی ارسلہ آگئی۔ اس کے آنے سے انکل فیرو کی بات کٹ گئی۔ انکل نے پادری کی طرف دیکھا پھر ارسلہ سے مخاطب ہوا۔ ”ارسلہ فادر تم سے لانا چاہتے ہیں اور کچھ باتیں تنہائی میں کرنا چاہتے ہیں۔“

”شہزادی انہیں روکے۔ یہ بات کر رہے ہیں۔ کسی مسلمان نے ان کی باتیں سن لیں خواہ مخواہ بات بڑھ جائے گی۔ پادری نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”مسٹر پادری۔“

انکل فیرو بھڑک اٹھے۔ ”آپ کو بہروپ بھرتا تو آتا نہیں جاسوسی کیا خاک کریں گے۔ اگر آپ کو بات بگڑنے کا خیال تھا تو یہاں آنے سے پہلے آپ نے کم از کم سو دلہہ سوچا ہوتا۔ کسی کی پراسن زندگی کو جنم بناتے ہوئے جنہیں ذرا رحم نہیں آتا۔ تم اور تمہارا بادشاہ آرام سے تل باشر میں بیٹھے ہیں۔ اب تک انہیں الہا کی کوئی فکر نہ ہوئی اب امیر زنگی کو رام مصیبت میں دیکھا تو الہا جنہیں یاد آگیا۔ جاسوسیاں شروع کر دیں۔ جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے ہم تمہارے مفاد پرست بادشاہ سے تعاون نہیں کر سکتے۔“

پادری کو شاید غصہ آگیا۔ انکل فیرو یہ مت بھولو کہ الہا نصرانیوں کا ہے اور شہنشاہ سیلین اسے حاصل کر کے رہیں گے خواہ تم ہم سے تعاون کرو یا نہ کرو۔

ارسلہ کو معاملہ کی تہہ تک پہنچنے میں ذرا بھی پریشانی نہیں ہوتی۔ اس نے سب سے لمبے مہمان خانہ میں پادری ان کا انتظار کر رہا تھا۔ پادریوں کے لمبے چونے کو وہ اس بے طریقے سے پہنے تھا۔ تو انکل فیرو کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ شخص پادری نہیں بلکہ نے پادریوں کا بہروپ بھرا ہے۔

مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا لیکن انہیں اپنے آزاد ہونے کا اب بھی یقین نہ تھا۔ الہا کی باقی آبادی ارمنی اور کلدانی نصرانیوں پر مشتمل تھی۔ جو تاجر پہلے اور نصرانی بعد میں تھے۔ جس وقت امیر زنگی نے الہا کا محاصرہ کیا تھا تو انہی تاجروں کے ہاتھ میں قلعہ کی باگ ڈور تھی انہیں اپنی کامیابی کی پوری امید تھی۔ ان کا خیال تھا کہ شاہ جو سیلین کو جیسے ہی علم ہوگا کہ ان کے صدر مقام کو مسلمان لشکر نے گھیر لیا ہے تو فوراً ”الہا کو بچانے کے لئے لشکر لے آئے گا۔ شاہ جو سیلین کے واپس آنے میں دس پندرہ دن کا عرصہ لگ سکتا تھا اور قلعہ میں دس ماہ سے زیادہ کا سامان موجود تھا اس لئے وہ اطمینان سے مدافعت کر رہے تھے اور منتظر تھے کہ شاہ واپس آکر مسلمانوں کی پشت سے حملہ کرے تو یہ قلعہ کا دروازہ کھول کر سامنے سے حملہ کر کے مسلمانوں کو پچلی کے دوپٹوں کی طرح درمیاں میں پیس کے رکھ دیں گے۔ زنگی کی حکمت عملی کے سامنے قلعہ والوں کی ساری خوش فہمیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ پھر جب قلعہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو وہی ارمنی اور کلدانی تاجر امیر زنگی کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔ اب جبکہ امیر زنگی پر بظاہر ایک مشکل وقت آپڑا تھا۔ تو لوگ تنہائی کے بیگن کی طرح شاہ جو سیلین کی طرف لڑھک رہے تھے اور ان کے جاسوس پورے تعاون کا یقین دلا رہے تھے۔

ایک شب جب یہ لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو ملازم نے ایک پادری کے آنے کا اطلاع دی۔ ارسلہ جب سے امیر زنگی کی پناہ میں آئی تھی اور اس نے امیر کے دئے ہوئے اس محل میں قیام تھا اس وقت سے اس نے اپنے عزیزوں سے رابطہ ختم کر دیا تھا۔ وہ تو ان کے دن گرجا بھی نہیں جاتی تھی۔ الہا میں اس کے کئی جاننے والے موجود تھے لیکن ان سے ملنا بھی نہ چاہتی تھی کہ کہیں امیر زنگی کو اس کی طرف سے کچھ شبہ نہ ہو۔ پادری کے رات کے وقت آنے سے اس کا پریشان ہونا فطری تھا جبکہ یہاں آنے کے بعد اس نے کسی پادری کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔

ارسلہ نے کن آنکھوں سے انکل فیرو کی طرف دیکھا انکل بغیر کچھ کہے باہر نکل مہمان خانے میں پادری ان کا انتظار کر رہا تھا۔ پادریوں کے لمبے چونے کو وہ اس بے طریقے سے پہنے تھا۔ تو انکل فیرو کو یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ شخص پادری نہیں بلکہ نے پادریوں کا بہروپ بھرا ہے۔

”میں فادر کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں“ انکل فیرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ کا نام انکل فیرو ہے؟“ پادری نے کھڑے ہو کر پوچھا۔

”انکل“

”اگر فادر، شہزادی ارسلہ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں وہ اندر موجود ہیں۔“



”مگر یہ۔۔۔۔۔۔ یہ انکل۔۔۔۔۔۔ پوری نے انکل فیرو کو گھور کے دیکھا۔“

”فادر۔ آپ ان کی باتوں کا برا نہ مانیں۔“ شہزادی ارسلہ بڑے یادگار طریقے سے مسکرائی ”ان کی باتوں کے قبضہ میں موکل ہیں اور آسمان کے ستارے کے ستارے ان سے پوچھے بغیر چال نہیں چلتے۔ انکل فیرو کی ہر بات کا مطلب الٹا ہوتا ہے اگر آپ ان سے پوچھیں کہ اس وقت دن ہے یا رات تو یہ فوراً جواب دیں گے کہ اس وقت دن ہے اور سورج سر پر چمک رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ارسلہ نے انکل فیرو کو ملتی نظروں سے دیکھا اور کہا۔ ”کیوں انکل فیرو۔ میں نے کچھ غلط نہیں کہا؟“

انکل فیرو شادی ارسلہ کا مقصد پا گئے تھے۔ انہوں نے خود کو سنبھالا اور ہنس بولے۔ ”ارسلہ تم ہمارا مذاق کر کر رہی ہو۔ ہم فادر سے بھی مذاق کر رہے تھے اور اسے سنجیدہ باتیں سمجھ بیٹھیں۔ رہا دن اور رات کا مسئلہ تو تم میری بات کو کانتی ہو۔“ پھر انکل فیرو نے بھی اپنا رخ پادری کی طرف کر لیا۔ ”فادر۔ آپ جانتے ہیں کہ اس وقت بھر دھبہ ہے لیکن اگر آپ ارسلہ سے پوچھیں گے تو یہ فوراً مجھے جھٹلائیں گی اور حج کے لیے گی کہ اس وقت دن نہیں رات ہے۔“

پادری بوکھلا گیا۔ ”جی ٹھیک ہے۔ مجھے شہزادی عالیہ کی بات کا یقین ہے۔“ اور جاسوس اٹھ کے باہر کی طرف چلا۔

انکل فیرو نے ذرا حیرت آواز میں کہا۔ ”تم شاید مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہو۔ اب کبھی آگے تو میں نہیں بتاؤں گا کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ“

جاسوس دروازے کے پاس پہنچا اور پلٹ کے بولا۔ ”انکل فیرو۔ میں نے تمہارے بارے میں سنا تھا کہ تم بے پرکی اڑاتے ہو۔ کہنے والے سچ ہی کہتے ہیں تمہارے بارے میں۔“

”کیا کیا۔ ذرا سنا تو۔ ٹھہرو ٹھہرو۔“ انکل فیرو دروازے کی طرف بڑھا۔

جب تک انکل فیرو جاسوس کے قریب پہنچتے وہ دروازے سے نکل کے دوڑ لگا چکا تھا ایک ملازم نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تو اس نے وہیں سے آواز لگائی۔ ”کیا یہ چور ہے پکڑ لو اسے؟“

جانے بھی دو کجبت کو۔ بڑا آیا تھا پادری بن کے ”انکل نے جواب دیا۔ ”مذہب آلف بے کا پتہ نہیں اور۔۔۔۔۔۔“

اسی وقت ارسلہ نے اندر سے ہاتھ پکڑ کے انہیں کھینچا۔ ”بس اب آپ اندر آجائے

اور انکل فیرو کھینچے ہوئے اندر چلے گئے۔ انکل آپ کسی وقت۔۔۔۔۔۔“

انکل فیرو نے ارسلہ کو بات پوری نہ کرنے دی اور بیچ ہی میں بول پڑے۔ مجھے سے یہ باتوں کی منافقت دیکھی نہیں جاتی۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ الہا پر حملہ ہوا۔ قلعہ امیر زنجی کے گھیرے میں آیا اور ہمارے شاہ جو سیلین، مل باشر کی زہمت گاہ میں پڑے داد عیش دیتے رہے کیا ان کے پاس لشکر نہ تھا۔ پوری ریاست پر تو امیر زنجی کا قبضہ نہیں ہوا تھا۔ شاہ مل باشر سے نکلے تو ہزاروں لاکھوں لہرائی ان کے ساتھ ہو لیتے مگر انہوں نے تلوار دیوار پر لٹکا دی تھی اور ہاتھوں میں جام و سبوتا سنبھالے تھے وہ میدان جنگ میں کس طرح نکلے اور کہاں نکلے۔ الہا پر تباہی آئی تو ان کا کیا گیا۔ ان کا پورا شاہی خاندان ان کے ساتھ ہے باقی خزانہ وہ ساتھ لے گئے۔ مارے گئے تو عوام۔ دربار ہوئے تو عوام۔ اب یہ خود غرضی ہے کہ امیر کو مصیبت میں گرفتار دیکھا تو لشکر لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں کہتا ہوں اگر یہی معلوم ہو جائے کہ امیر عماد الدین ادھر آ رہا ہے تو شاہ جو سیلین پھر مل باشر میں دیک کے بڑھ جائیں گے۔“

”انکل فیرو۔“ ارسلہ نے ان کی تقریر طویل سے طویل تر ہوئی دیکھی تو فوراً بات لائی۔ ”اسی لئے تو میں کہتی ہوں کہ آپ کسی کسی وقت کام کی بات کر جاتے ہیں۔“

انکل نے چونک کے ارسلہ کا منہ دیکھا۔ ”یہ۔۔۔۔۔۔ یہ تم کہہ رہی ہو۔ تمہارا مطلب یہ کہ میں نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک تھا۔“

”بالکل ٹھیک۔ ایک لفظ غلط نہیں تھا۔“

”پھر تم نے میری مخالفت کیوں کی۔ شاہ کی حمایت کا دم کیوں بھرا۔؟“ انکل فیرو کا موڈ برسنے لگا۔

”جس طرح آپ نے ٹھیک کہا اسی طرح میں نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا۔“

”ارسلہ۔ تم مجھے نہیں بتا سکتیں۔“ انکل نے گھورتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے اشارے اس وقت تو میں نے بات بتادی تھی لیکن اب تمہیں بتانا ہو گا کہ تم نے شاہ جو سیلین کی طرف کیوں کی تھی؟“

”سنئے انکل۔“ ارسلہ نے انکل کو سمجھایا۔ ”میں چاہتی تھی کہ شاہ کو ان کی غلط اور انقت سے آگاہ کیا جائے تاکہ ان کو معلوم ہو سکے کہ ان کی رعایا ان کے بارے میں کیا جانتی ہے۔ آپ نے یہ کام بخوبی کر دیا۔ آپ جس وقت پادری کو پھنکار رہے تھے میں آڑ ماکھڑی سن رہی تھی مگر اتفاقاً میری نظر ایک غلام پر پڑ گئی۔ وہ کان لگائے تمہاری باتیں سن رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ یہ شاہی جاسوس ہے اور تمہاری باتیں شاہ تک پہنچائے گا پس

”اگل گڈ۔ پھر کیا ہوگا۔“ انکل فیرو گھبرا گئے۔ پھر کیٹ کی طرف رخ کر کے بولے۔ ”

”مگر تم نے تو شاہ کے اقدام کی حمایت کی ہے اگر جاسوس نے تمہاری باتیں امیرز تک پہنچادیں تو کیا ہوگا“ فیرو نے بڑی ذہانت کا سوال کیا۔

”میں ایسی بیوقوف نہیں انکل“ ارسلابے پروائی سے بولی۔ ”میں نے غلام کو اپنی سے چونکا کر دیا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دوسری طرف چلا گیا تھا۔ پھر جو باتیں میں نے شاہ پادری کے سامنے کی تھیں وہ شاہی جاسوس کے جانے کے بعد کی تھیں۔“

”اما۔ اندر چلے۔ میں اکیلے گھبرا رہی ہوں۔“ کیٹ بھی مہماں خانہ میں پہنچ گئی۔

”کبھی می کبھی اما۔ کیٹ تم نے اپنی ماں کے کتنے نام رکھ چھوڑے ہیں؟“ انکل فیرو نے اسے چھیڑا

”یہ میرا اور میری ماں کا معاملہ ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کب جا رہے ہیں؟“ کیٹ نے موضوع تبدیل کرنے کے لئے کہا۔

”میں۔۔۔۔۔ میں کہاں جا رہا ہوں۔“ انکل بوکھلا گئے۔

”دیکھئے آپ انکار نہ کیجئے ورنہ میں چلی جاؤں گی۔“

”مگر کہاں۔ کچھ پتہ تو چلے؟“

”موصل۔ امیرزنگی کے دربار میں۔“

”تم نے اچھا یاد دلایا۔ مجھے موصل بھی جانا ہے۔“ پھر ایک لمحہ سوچ کے کہا۔ ”اما ارسلابے۔ میں موصل چلا۔ کیٹ کا یہی مشورہ ہے۔“

”اور اگر کہیں پکڑے گئے تو کیا کریں گے۔“ کیٹ منہ تمہا کے ہنسنے لی۔

”پادریوں کو کوئی نہیں پکڑتا کیٹ۔“

”کیا آپ پادری بن کے جائیں گے؟“

”اور کیا شہزادہ مودود بن کے جاؤں؟“

”کیٹ شرما گئی۔“ ”میں۔۔۔۔ میں بھی چلوں آپ کے ساتھ؟“

”یہ طے ہو چکا ہے کہ تم نہیں جاؤ گی۔“

”میں نہیں جاؤں گی تو آپ راستے میں ضرور پکڑے جائیں گے۔“

”میں پادریوں کے قافلے میں جاؤں گا۔ ان سے کوئی پوچھ کچھ نہیں ہوتی۔“ انکل

نے سیٹی بجائی۔

”انکل آپ مذہب کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتے اگر کوئی پوچھ بیٹھا تو کیا کریں

انکل فیرو کی عدم موجودگی میں ایک جاسوس ارسلابے محل پر آدھمکا۔ اس نے اپنے

ہاں کو شہزادی ارسلابے کا پرانا پادری چلا کر دیا جو سرج میں ان کے مہلج (پادری خانہ) کا

تھا۔ ارسلابے کے ساتھ آنے والوں کو اس کے جھوٹ پر بڑی ہنسی آئی مگر وہ سمجھ گئے کہ

جو سیلین کا جاسوس ہے اور اس بہانے ارسلابے ملنا چاہتا ہے۔ ارسلابے کو اندر اطلاع

دقت سے انہوں نے جاسوس دوڑانا شروع کر دئے ہیں۔ انہیں کیا پتہ کہ یہاں کون کس میں ہے۔ اگر ان کا روز کوئی جاسوس میرے پاس آتا رہا تو راز کھل جائے گا۔ ہم پر ہنداری کا الزام لگے گا اور امیر کی طرف سے جو کچھ دیا گیا ہے وہ سب چھن جائے

کیٹ کے ہوش اڑ گئے۔ ”مئی۔ پھر ان لوگوں کا آنا کسی طرح بند کیجئے نا۔“

”مئی میں بھی سوچ رہی ہوں اے کاش اس وقت تمہارے انکل ہوتے۔“

”اتنا کہہ کر ارسلانے کیٹ کا ہاتھ پکڑا اور اسے لئے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی۔

”پھر آپ نے اس کے لئے کیا سوچا مئی؟“ کیٹ کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔

”کیٹ۔ تم کسی کے ذریعہ باہر نکلو اور اسے شہزادی ارسلان کی طبیعت ناساز ہے۔ ملاقات

کما جائے کہ وہ کل اسی وقت ملاقات کے لئے آئے۔“ ارسلانے یہ سمجھا کر کیٹ کو

اُس کی طرف بھیجا اور خود مسمری پر لیٹ گئی۔ اس نے کیٹ کو یہ بھی تاکید کر دی کہ

لے والا اپنا رد عمل ظاہر کرے یا جواب دے وہ لے کے آئے۔

ذرا دیر بعد شہزادی مسکراتی ہوئی واپس آئی۔ ”مئی وہ تو بہت جزبہ ہو رہا تھا۔ وہ کہہ

افاکہ اسے شہزادی ارسلان کے سامنے پیش کر دیا جائے وہ پیش کرنے والے سے ناراض

لہے ہوں گی بلکہ اسے انعام دیں گی مگر کینئر نے اسے چھٹکار دیا۔“

”دیکھنا نا۔ میں نہ کہتی تھی کہ وہ شاہ کا کوئی جاسوس ہے۔ کل آنے کے بارے میں کیا

اُس نے؟“ ارسلانے بے چینی سے پوچھا۔

”وہ بڑبڑاتا چلا گیا ہے مئی۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔“

”فکر تو کرنا ہی ہو گا کیٹ۔“ ارسلانے ٹھنڈی سانس لی۔ ”تمہارے انکل فیرو پتہ

ن کمال انک کے رہ گئے۔ جدھر جی چاہتا ہے نکل جاتے ہیں۔“

”ارسلان کا جملہ پورا ہی ہوا تھا کہ انکل فیرو مسکراتے ہوئے آموچو ہوئے۔“ ارسلان کا

ناہت بگڑا معلوم ہوتا ہے کیوں بیٹی کیٹ کون آیا تھا؟“

”میں کیوں بتاؤں انکل۔ آپ کے ستارے کیا کہتے ہیں؟“ کیٹ نے انکل فیرو کو امتحان

ڈال دیا۔

میرے ستارے تو کہتے ہیں۔ انکل فیرو مسکراتے ہوئے بولے۔ ”خیر اسے چھوڑو۔ میں

ن ایک دلچسپ قصہ سنا تا ہوں۔ سنو کیٹ۔“

”میں تو سنوں گی۔ مئی سے پوچھ لیجئے انکل۔ انہیں بہت غصہ سوار ہے“

”قصہ سنیں گی تو غصہ ختم ہو جائے گا“ پھر ایک لمحہ رک کے بولے۔ ”تمہیں یاد ہے

کرائی گئی۔ وہ اندر کے کسی کمرے میں تھی کیٹ سامنے کھڑی ملی تو ملازمہ نے اسے خبر دی کہ آپ کا سروج والا باورچی آیا ہے۔ کیٹ کو تعجب ہوا کہ اس کا پرانا باورچی یہاں کیسے آگیا جبکہ سروج سے روانہ ہونے سے پہلے تمام ملازمین کو دو دو ماہ کی پیشگی تنخواہ دے کر ہمیشہ کے لئے رخصت کر دیا گیا۔

کیٹ نے جھانک کے دیکھا۔ برآمدے میں ایک ہونق سا آدمی کھڑا ملازموں سے باتیں کر رہا تھا۔ کیٹ بھاگی ہوئی اندر گئی اور ماں سے سوال کیا۔

”مئی مئی۔ ہمارا باورچی کیسا تھا؟“

”کیا بے شک سوال کر رہی ہو۔ کون باورچی؟“ ارسلان جھلا گئی۔

”مگر وہ تو کہتا ہے کہ سروج میں وہ آپ کا باورچی تھا۔“ کیٹ نے بھولے پن سے کہا۔

”کون کتا ہے۔ تیرا دماغ خراب ہو گیا کیٹ؟“

”وہی کہہ رہا ہے میں کیا جانوں کون ہے۔ سروج میں ہمارا۔“

ازے کون ہے۔ کہاں ہے۔ مجھے دکھاؤ تو چل کے۔“

ارسلان اور کیٹ برآمدے میں کھلنے والے دروازہ کے پاس پہنچ گئیں۔ ارسلانے

جھانک کے دیکھا۔ آنے والا اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ ”اب یہاں رہتا مشکل معلوم

ہوتا ہے کیٹ۔“ ارسلان بڑبڑاتا

”کیا ہوا مئی۔ یہ کون ہے۔“ کیٹ بھی پریشان ہو گئی۔

”یہ تو میں نہیں جانتی یہ کون ہے مگر ہے شاہ جو سلیں کا جاسوس۔“ ارسلان کا مزاج برہم

ہونے لگا۔ ”اس دن کہہ دیا تھا کہ اب یہاں آنے کی ضرورت نہیں مگر انہیں نہ کسی کے

آرام کی فکر ہے اور نہ عزت و آبرو کی۔ ہم امیر زنگی کی روٹیوں پر پڑے ہیں اور یہ لوگ

ہم سے جاسوسی کرانا چاہتے ہیں۔“

”آپ انہیں ڈانٹ کے بھاگ دیجئے مئی۔ یہ کیوں ہمارے پیچھے پڑے ہیں؟“ کیٹ نے

ماں کو ایک ہچکچاہٹ مشورہ دیا۔

”بیٹی کیٹ اگر تمہارا ساتھ نہ ہوتا تو شاید ایسا ہی کرتی۔“ ارسلان فردگی سے بولی۔

”میں۔ میرا کیا دخل ہے مئی؟“

”یہ دو سلطنتوں کی جنگ ہے کیٹ۔“ ارسلانے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”شاہی

جنگوں میں جب تک ایک مرنے نہیں جاتا دوسرے کو اپنی کامیابی کا پورا یقین نہیں ہوتا۔ اب

موصول نے الرہانچ کر لیا ہے مگر تمہارے ماموں جو سلیں اسے واپس لینے کے موقعہ کے

انتظار میں ہیں۔ جب سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ امیر زنگی کے ملک میں بغاوت ہو گئی

کہ کیٹ اس دن جو ایک جاسوس آیا تھا؟  
جاسوس!

”ہاں ہاں جاسوس۔ میں نے اسے خوب پہنکارا تھا۔“  
”کچھ آگے بھی کہئے؟“

”وہ آج مجھے پھر ملا تھا۔“

”وہ آپ کو ملا تھا۔ وہ جو ابھی یہاں سے گیا ہے۔“ کیٹ نے تعجب انگیز لہجے میں کہا۔  
انگل فیرو کہہ رہے ہیں وہ جاسوس انہیں بھی ملا تھا۔  
”کیا واقعی انگل۔ کیٹ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ ابھی تو نکلا ہے یہاں سے۔ کیا کہہ رہا تھا؟“  
ارسلان نے ایک ساتھ کئی سوال پوچھے۔

انگل فیرو بھی کچھ حیرت زدہ ہو گئے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ”یہ سب تو میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے مجھے بتاؤ کہ کون آیا تھا؟“

”جاسوس!“ کیٹ نے خوفزدہ آواز میں جواب دیا۔

”تم نے دیکھا تھا اسے؟“

”ہاں۔ لمبا بے ڈول۔ کتا تھا کہ میں باورچی ہوں۔ سروج میں ہمارے گھر کھانا پکا رہا تھا۔“

”جاسوس اور باورچی۔ تم نے سب کچھ گڈ کر دیا۔ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔“  
”مجھ سے پوچھو۔ میں بتاتی ہوں۔“ ارسلان نے بات اچک لی۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک آدمی مجھ سے ملے آیا۔ میں سمجھ گئی کہ ہونہ ہو وہ کوئی جاسوس ہے کیونکہ اس نے اپنا نام بتانے کے بجائے یہ کہا تھا کہ وہ ہمارا پرانا باورچی ہے۔ ہم نے اپنے باورچی کو جواب دیا تھا اور اسے نہیں بتایا تھا کہ ہم الہا جا رہے ہیں۔“  
”آگے بھی کچھ کہو۔ تم نے اس سے ملاقات کی؟“

”نہیں۔ میں نے کھلوا دیا کہ میری طبیعت خراب ہے۔ کل ملے آجائے۔“

”اس کا حلیہ کیا تھا؟“

”میں نے اسے نہیں دیکھا۔ کیٹ نے دیکھا ہے۔ اس سے پوچھ لیجئے۔“

”انگل میں آپ کو بتا تو چکی ہوں۔“ کیٹ نے کہا۔ ”وہ لمبا بے ڈھنگا۔ دیکھنے میں باورچی بالکل نہیں لگتا تھا۔“

”تو پھر یہ دوسرا جاسوس تھا۔“ انگل نے فیصلہ کر دیا میری ملاقات اس جاسوس سے ہوئی تھی جو اس سے پہلے آیا تھا۔“

”خیر آپ کی کسی سے ملاقات ہوئی ہو مگر وہ کتا کیا تھا؟“ ارسلان سنبھل کے بیٹھ گئی۔  
انگل فیرو کوئی اہم خبر سنانے والے ہوں۔

”بس میری اور اس کی ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی۔ انگل فیرو بے پروائی سے بولے۔  
انگل۔ آپ کی چوری پکڑی گئی۔ ابھی آپ نے کہا تھا کہ آپ کی اس سے ملاقات ہوئی۔ اب مکر رہے ہیں۔“ کیٹ نے واقعی انگل فیرو کا جھوٹ پکڑ لیا تھا۔

”انگل فیرو نے فوراً اقرار کیا“ میں انکار کب کر رہا ہوں۔ وہ ادھر سے آ رہا تھا اور ادھر سے جا رہا تھا۔ ایک گلی کے کڑ پر ہم دونوں کا سامنا ہو گیا اس نے مجھے آواز دی میں جھٹ گلی میں مڑ کے دوسری طرف نکل گیا۔ اس کی آواز دور تک میرا پیچھا کرتی مگر میں آگے بڑھتا رہا۔“

”بڑا اچھا کیا انگل۔“ ارسلان نے تھکے لہجے میں کہا ”ان کم بختوں نے پیچھا پکڑ لیا ہے۔ ابی نہیں چھوڑتے۔ روز ایک نیا آدمی چلا آ رہا ہے۔ جیسے انہیں پتہ ہی نہیں ہم لوگ زندگی کی پناہ میں ہیں اور ان کے دیئے ہوئے محل میں رہتے ہیں۔“

”انگل فیرو نے یوں سر جھکا لیا تھا جیسے مراقبے میں چلے گئے ہوں۔  
”انگل کہاں کھو گئے۔ کیا خواب دیکھ رہے ہیں؟“ کیٹ نے انہیں چونکایا۔

”ہوں۔“ انگل نے پہلے کیٹ کی طرف دیکھا پھر ارسلان سے کہا۔ ”اب کیا فیصلہ ہے؟“

”کس بارے میں۔ کیا فیصلہ؟“

”یہی کہ مجھے موصل چلا جانا چاہئے۔“

”آپ کب موصل جائیں گے انگل۔“ کیٹ کا جی خوش ہو گیا۔

”گھبراتی کیوں ہے۔ تجھے بھی ساتھ لے چلوں گا۔“

”کیا خوب۔ بڑا اچھا فیصلہ کیا ہے ماموں بھانجی نے۔“ ارسلان چڑ کے بولی۔ ”تم دونوں دے۔ میں اکیلے بیٹھ کے کوئے ہنکایا کروں۔ یہ جاسوس میری جان نہیں لے لیں گے؟“  
ا۔ یہ بات تو ہے۔ پھر کیٹ کو نہیں لے جائیں گے۔“

بٹ کا دل ڈوبنے لگا۔

کیٹ کو میرا ذرا بھی خیال نہیں ورنہ خود جانے سے انکار کر دیتی۔ ارسلان نے کیٹ

میں نے کب کہا تھا کہ میں بھی جاؤں گی۔ یہ بات تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی۔  
نے صفائی پیش کی۔

”ارسلا اور کیٹ لپک کے کمرے کی ایک بظلی کھڑکی کے پاس گئیں۔ انہوں نے جب ماکا تو وہ حیران رہ گئیں۔ محل کے ہر طرف مسلح سوار گشت کر رہے تھے۔ صدر دروازے ایک حصہ بھی انہیں نظر آیا۔ وہاں کئی سوار ساتھ ساتھ کھڑے دکھائی دئے۔ ارسلا نے پلٹ کر انکل سے پوچھا۔ ”یہ سب کیسے ہوا انکل۔ یہ آپ کی کوشش ہے یا کم علاقہ نے ہمیں اس محل میں نظر بند کر دیا ہے؟“

”ارسلا۔“ انکل فیرو نے ایک پیر پر گھوم کے پورا چکر لگایا۔ ”یہ سب ہمارے موکلوں کی دھرا ہے۔“

ارسلا کو ابھن ہونے لگی۔ وہ ایک سنجیدہ سوال کر رہی تھی اور انکل فیرو اسے مذاق اڑا رہے تھے۔ وہ انہیں روک نہیں سکتی تھی کیوں کہ انکل فیرو کو جس کام سے روکا جاتا ابداء کے اس کام کو بار بار کرتے تھے۔ ارسلا نے مصالحت کا راستہ اختیار کیا۔

”اگل!“ ارسلا کا لہجہ بہت ہی نرم تھا۔ ”یہ کام آپ کے موکلوں ہی نے کیا ہوگا مگر انہیں کس نے دیا۔ آپ نے یا الہا کے حاکم نے؟“

”دونوں نے حکم دیا ہے ارسلا۔“ انکل فیرو نے دوسرے پیر پر پورے جسم کا زور ڈال کر ایک اور چکر لگایا۔ ”میں نے حاکم کے سامنے فریاد کی کہ ہم لوگوں کو اپنی جان کا سخت دھبہ۔ امیر زنگی نے ہمیں اپنی پناہ میں لے لیا ہے۔ وہ تو موصل چلے گئے۔ اب ہم فریاد کر رہے ہیں۔ اتنا سنا تھا کہ حاکم نے ایک دستے کو حکم دیا کہ انکل فیرو کے محل کی پوری حفاظت کی جائے۔ ذرا سی بھی کوتاہی ہوئی تو سب کے سر قلم کر دئے جائیں گے۔“

ارسلا نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ جاسوسوں سے سخت خراساں تھی۔ اس نے سوچا کہ اگر الہا میں جاسوس اس طرح پریشان کرتے رہے تو وہ چپکے سے کسی طرف نکلے گی۔

”اچھا اب مجھے اجازت دو۔ تمہاری تہائی کا میں نے علاج کر دیا۔“ انکل نے ارسلا کو۔ ”تمہاری طرف کوئی انگلی بھی نہیں اٹھائے گا۔“

ارسلا نے مخالفت کی۔ بولی۔ ”اب جانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس خطرے کو دور کرنے کے لئے آپ جانا چاہتے تھے وہ اپنے آپ دور ہو گیا۔“

”واہ ارسلا۔ یہ کیا بات ہوئی۔“ پھر انکل فیرو نے کیٹ کو دیکھا۔ ”مجھے تو کیٹ کی فکر ملنے جا رہی تھی۔ جس دن اس کی طرف سے اطمینان ہوگا میں اس دن یہ دنیا لوں گا۔“

”انکل!“ کیٹ تڑپ اٹھی۔ ”ایسی بات نہ کیا کیجئے۔ آپ کا سایہ ہمیشہ میرے سر پر

”تمہیں میں لئے کب جا رہا ہوں۔ بیکار میں صفائیاں پیش کر رہی ہو۔؟“ یہ کہنے ہوئے انکل فیرو نے کیٹ کی طرف دیکھا۔

کیٹ کٹ کے رہ گئی۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔

”تو پھر ملے ہو گیا۔“ انکل فیرو نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”پہلے میرا اور کیٹ کا انتظام کیجئے پھر جانے کا نام لیجئے گا۔“ ارسلا نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”تمہارا یہی فیصلہ ہے کہ تم یہاں رہو۔ طبیعت گھبرائے سروج چلی جانا۔“ انکل فیرو نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔ ”میں واپسی پر تم لوگوں کو تلاش کر لوں گا۔“

”الہا میں تو کچھ سارا بھی ہے۔ سروج جا کر میں بالکل بے سارا ہو جاؤں گی۔ میرا

کوئی اور انتظام کز کے جاؤ؟“

”انکل فیرو ابھن میں پھنس گیا۔ ارسلا کا کہنا بھی درست تھا۔ فیرو کے الہا میں ہونے

ہوئے جاسوس دوبار ان کے گھر تک پہنچ چکے تھے۔ جب وہ ماں بیٹی سروج جائیں گی تو پتہ

نہیں جاسوس کیا کیا کریں۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد انکل فیرو نے کہا۔ ”اچھا میں ستاروں کو دیکھوں گا۔ موکلوں

سے بھی مشورہ کروں گا پھر کل جواب دوں گا۔“

”آپ جواب کچھ دیں مگر یہ خیال رکھئے کہ میں اتنے بڑے محل میں تنہا نہیں رہ سکتی۔

مجھے سب سے زیادہ خوف ان کم بخت جاسوسوں کا ہے۔“

”اس کا تو حل ڈھونڈنا ہے ارسلا۔“

”دوسری صبح انکل فیرو چپکے سے کہیں نکل گئے پھر جب دوپہر کو واپس آئے تو بہت

خوش خوش تھے۔

”کدھر چلے گئے تھے صبح ہی صبح؟“ ارسلا نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ آپ بغیر تائے

چلے جاتے ہیں تو میں پریشان ہو جاتی ہوں۔“

”اب کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ میں نے سب انتظام کر لیا ہے۔“ انکل نے ہنسنے ہوئے

کہا۔

”کیا انتظام کیا ہے؟“ ارسلا اور کیٹ نے حیران ہو کر پوچھا۔

کھڑکی سے جھانک کے دیکھو اس محل کو زنگی کے دستے کے سواروں نے گھیرے مگر

لے لیا ہے اندر نہ کوئی داخل ہو سکتا ہے اور نہ باہر نکل سکتا ہے۔ ہم لوگوں کو بھی باہر

جانے کے لئے اپنی شناخت کرانا پڑے گی۔“

رہے۔

”مگر تمہاری مہی — نہیں نہیں ماما کب چاہتی ہیں۔ انہیں بس اپنی جان پیاری ہے۔“ انکل فیرو نے کچھ طنز اور کچھ ہنسی کے انداز میں کہا۔

”آپ ہمیشہ زندہ رہیں انکل۔“ ارسلہ چیخ پڑ۔ ”آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ جب آپ کچھ دیر باہر رہتے ہیں تو میرا کیا حال ہوتا ہے ہر طرف گھرائی پھرتی ہوں۔“

”جانتی ہو حکیموں نے اس مرض کا کیا نام بتایا ہے؟“ انکل فیرو نے ہلکا سا قہقہہ بلند کیا۔ ”ارے وہ آپ کا حکیم والا مسئلہ تو سچ ہی میں رہ گیا۔ کیا آپ حکیم بن کے موصل جائیں گے؟“ کیٹ نے گفتگو کا موضوع ہی بدل دیا۔ اسے دراصل اپنی فکر تھی۔ وہ چاہتی تھی انکل فیرو جلدی سے جلدی روانہ ہو جائیں

میری فکر نہ کرو کیٹ۔ کسی نہ کسی طرح پہنچ جاؤں گا۔“ اس وقت انکل فیرو بہت خوش نظر آرہے تھے۔ ”میرے پاس دواؤں کے دو تھیلے ہوں گے۔ ایک میں حکیم کی دوائیں اور ایک تھیلے میں وہ دوائیں جو ہمارے لہرائی بھائی استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح میں حکیم بھی ہوں گا اور ڈاکٹر بھی۔ اب یہ مریض کی مرضی پر ہو گا کہ وہ کس سے علاج کراتا چاہتا ہے۔ حکیم کا نام لے گا تو تھیلا نمبر ایک سے دوا دوں گا۔ اگر اس نے عیسائی علاج کا نام لیا تو تھیلا نمبر ۲ میرے کام آئے گا۔“

ارسلہ نے ان کی باتوں میں کوئی دخل نہ دیا عمل کے گرد پہرہ لگ جانے سے وہ خود کو محفوظ محسوس کرنے لگی تھی۔ جب تک شہزادے قلب الدین مودود کی کوئی خبر نہ ملی تھی تو اس کا خیال تھا کہ الہا یا سروج میں کسی معقول لڑکے سے اس کا رشتہ کر دے گی اس وجہ سے کہ وہ ان حالات میں ایک جوان لڑکی کی حفاظت نہ کر سکتی تھی۔ اب جب کہ ہر طرف سے اطمینان ہو گیا تھا اور کیٹ کی شادی کی کوئی جلدی بھی نہ تھی پھر ارسلہ بیٹی کے جذبات کو کیوں پکچلی۔ انکل فیرو کے موصل جانے کا یہی مطلب تھا کہ کیٹ کا مسئلہ ایک طرف ہو جائے۔ یا تو شہزادہ مودود اسے اپنی بیوی تسلیم کر کے رخصت کرائے یا پھر وہ کیٹ کو آزاد کر دے کہ وہ جہاں چاہے وہاں شادی کر لے۔ اس طرح کیٹ بھی مطمئن ہو جائے گی۔



انکل فیرو کی روانگی کے وقت کیٹ اور ارسلہ۔ پچھاڑے کھا کھا کے روئیں۔ ان کی آنکھیں سادوں بھادوں بنی ہوئی تھیں اور منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ ان کے ساتھ سینیئر نے آوازیں ملا کے رونا شروع کیا تو یوں معلوم ہوا کہ گھر میں کسی جوان کی موت ہو گئی ہے۔ مردانے میں غلام دھائیں مار کے رو رہے تھے۔ سب کو یہ بتایا گیا تھا کہ انکل فیرو کا

الہا میں نہیں لگتا اس لئے وہ ہمیشہ کے لئے تل باشر جا رہے ہیں۔ ایسی بارغ و بھار ہستی کا چھوٹ جانا واقعی بڑی تکلیف دہ بات تھی۔ ہر صورت انکل فیرو رلا کے سرائے کی طرف چلے جہاں سے دوسری صبح ایک قافلہ تل باشر جا رہا تھا۔

انکل فیرو کے ساتھ بہت مختصر سامان تھا۔ سرائے پہنچے تو ان کی پیٹھ پر تیر کمان کے ساتھ صرف ایک تھیلا تھا جس میں دو چھوٹے تھیلوں میں دوا بات بھری تھی۔ اور ایک میں نلک میوہ۔ ایک تھیلا ہاتھ میں تھا جس میں ایک لمبی چادر تھی جو اوڑھنے اور بچھانے دونوں کا کام دیتی تھی۔ انکل فیرو کے خیال میں سفر کے لئے یہ سامان بھی زیادہ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ صرف ایک تھیلے میں پورا سامان ہونا چاہئے انکل فیرو نے اس قافلے میں اس وجہ سے جانا پسند کیا تھا کہ انہوں نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ وہ تل باشر جا رہے ہیں اس سے یہ فائدہ ہوا کہ محل کے سپرداروں نے انہیں فوراً اجازت دے دی کیوں کہ انہیں معلوم تھا کہ ارسلہ کا بھائی اور الہا کا نکلتا خورہ شاہ اس وقت تل باشر میں تھا۔

صبح کو جب قافلہ روانہ ہونے لگا تو انکل فیرو پر ایک ایسا انکشاف ہوا جسے سن کر انکل فراس باخند ہو گئے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ تل باشر ہوتا ہوا یہ قافلہ ریگستانی علاقہ پار کرنے کے لئے مشرق کی طرف گھوم کے موصل کا رخ کرے گا۔ الہا سے موصل کا ایک بالکل برعکاس راستہ تھا مگر ان دنوں کوئی قافلہ ادھر نہیں جا رہا تھا۔ اب تل باشر۔ حلب۔ حماہ اور نمس ہو کر موصل جانے کا مطلب یہ تھا کہ انکل فیرو اصل فاصلے سے چھ گنا زیادہ فاصلہ طے کریں جب جا کے موصل پہنچیں گے۔ انکل فیرو کو سیاحت یا آوارہ گردی تو کرنا نہیں تھی۔ وہ تو ایک مقصد کے تحت موصل جا رہے تھے پھر وہ اتنا طویل راستہ تھا جس سے محفوظ ہو کر منزل مقصود تک پہنچنا بہت مشکل نظر آتا تھا۔ مگر انکل گھر سے رخصت ہو کے آئے تھے ان کی طبیعت نے گوارہ نہ کیا کہ واپس جا کر دوسرے قافلہ کا انتظار کریں۔

تل باشر جانے والا قافلہ جس سڑک سے گزرا اس کے بالکل قریب وہ محل واقع تھا جس میں ارسلہ اور کیٹ مقیم تھیں۔ قافلہ ادھر سے گزرنے لگا تو انکل فیرو کا دل بے ساختہ ہلا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ وہ محل واپس چلے جائیں مگر فوراً ہی انہیں کیٹ کا خیال آیا۔ ”ایسے خوابوں کے شہزادے کو امیر زندگی کے دربار۔ اور اپنے محل میں دیکھ بھی چکی لاکم اس لئے کسی قدر بے چین تھے۔ اگر وہ واپس جائیں تو کیٹ کو کیا جواب دیں۔ اس سے تو وہ نظریں ملانے کے بھی قائل نہ تھے۔ انہوں نے اپنا چمکا دل مارا اور لڑکے کے ساتھ چپ چاپ چلتے رہے۔

ابھی تک قافلہ والوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ انکل فیرو کون ہیں۔ انکل کی بھی طرفت بے روٹھ گئی تھی۔ مگر انہیں رہ رہ کے یاد آ رہا تھا۔ تل باشر آیا تو انکل فیرو کا دل ایک بار

پھر چلا۔ یہ شہر شاہ جو سلین کے قبضہ میں تھا۔ انکل فیرو ایک عرصہ تک اس شہر میں رہ چکے تھے۔ ہر گلی اور ہر سڑک ان کی جانی پہچانی تھی۔ تل باشر میں داخل ہوتے ان کا دل چاہنے لگا کہ پرانے یاروں سے ملاقات کی جائے۔ بار بار ایسا موقع کہاں ہاتھ آتا ہے مگر کیٹ کی تصویر ایک بار پھر ان کی نظروں میں گھوم گئی۔ انہیں یوں معلوم ہوا جیسے کیٹ ان سے کہہ رہی ہے انکل آپ میرے کام سے جا رہے ہیں۔ زندگی ہے تو دوستوں سے پھر بھی مل سکے ہیں لیکن قافلہ آگے نکل گیا تو پھر پتہ نہیں آپ منزل پر کب پہنچیں انکل فیرو نے سب سے منہ موڑ لیا اور سرائے کی کوشری میں چوروں کی طرح چھپ کے بیٹھ گئے۔ قافلہ دو دن ٹھہر کے پھر آگے چل پڑا۔ انکل طے کر کے چلے تھے کہ جس جگہ سے بھی انہیں موصل جا کے لئے کسی طرف سے کوئی ایسا قافلہ ملا جو سیدھا موصل جا رہا ہو۔ تو وہ اس میں شامل جائیں گے مگر ایسا نہ ہوا اور انکل کو مجبوراً اپنا تھکا دینے والا سفر جاری رکھنا پڑا۔

شام کا وقت تھا اور حماۃ کے قلعہ کی برجیاں زرد دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ دھوپ سے دیرینہ دو گھنٹے کا راستہ ہو گا کہ ایک دم قافلہ پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا۔ قافلہ کے درجن محافظ ڈاکوؤں کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ خوب تلوار چلی۔ قافلے میں جھگڑا ہو گیا جس کا جدر منہ اٹھا بھاگ کھڑا ہوا۔ انکل فیرو بھی اپنے تھیلے سنبھالے ایک طرف بھاگ پڑے۔ قافلہ پر کیا گزری انہیں اس کا پتہ نہیں انہوں نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا اور ا وقت تک بھاگتے رہے جب تک اندھیرا نہیں ہو گیا۔ اب ان کا کچھ دل ٹھہرا۔ ایک اور جگہ کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں مگر کچھ نظر نہ آیا حالانکہ دھوپ کے دن انہوں نے قلعہ کی برجیاں خود دیکھی تھیں۔ انکل فیرو کو یقین ہو گیا کہ وہ شہر سے جانا سمجھا گئے ہیں اس طرح شہر کے قریب ہونے کے بجائے دور دور ہو گئے ہیں۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں ایک ٹیلہ دکھائی دیا۔ چاند چمک رہا تھا اور ہلکی چائے کی ہر طرف ملجی سی سفید چادر بچھ گئی تھی۔ انکل ٹیلے پر چڑھ گئے اور چاروں طرف نگارہ کرنے لگے انہیں بہت دور ایک چراغ سا جھمکاتا معلوم ہوا۔ انکل نے اس رخ گئے تو ایک جھوپڑی نظر آئی جس کے اندر کوئی شخص لیٹا تھا مگر اس کی صورت نظر نہ آتی تھی کیونکہ اس کے پورے جسم پر کپڑا تھا اور ایک دیا اس کے سر پر لٹکا ہوا تھا۔ انکل فیرو ابھی اس بارے میں کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ ان کے پیچھے کچھ آہٹ اور چار مسلح آدمی اک دم ان کے قریب آگئے۔ انکل ہکا بکا ان کا منہ دیکھنے لگے ان کی میں یہ نہ آ رہا تھا کہ یہ لوگ کون ہیں اور آئے کدھر سے جھوپڑی کے پیچھے یا دور دور کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں تیر کمان اور تلواروں سے مسلح چار آدمی چھپ سکتے ہوں۔

کے پاس سوائے جان کے تھا کیا جو انہیں خوف آتا۔

”تم کون ہو اور ادھر کیوں آئے“ اور چاروں نے تلواریں بے نیام کر لیں

”میں سوال میں تم لوگوں سے کرنا چاہتا ہوں۔“ انکل غر ہو کے بولے ”میں جتنا چراغ دیکھ کر یہ سمجھا تھا کہ یہاں رات گزارنے کی جگہ مل جائے گی مگر تم آکر میری میدانوں پر پانی پھیر دیا۔“

”تم اس دیرانے میں رات گزارنا چاہتے ہو۔ یہ کون جگہ ہے؟“ ایک آدمی نے بڑے رعب سے کہا۔

”میں نہیں جانتا۔ تم بتاؤ تو مہربانی ہوگی۔“

یہ ہے بھوتوں کا ڈیرا اور ڈاکوؤں کا مسکن۔“

”پھر میں صبح جگہ پہنچا۔ ان لوگوں سے میری پرانی دوستی ہے۔“ انکل جواب دینے کے بعد زمین پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئے۔ دنوں تھیلے انہوں نے سامنے رکھے اور تیر کمان ایک طرف رکھ دیا۔

چاروں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ایک نے پوچھا۔ ”اس بڑے تھیلے میں کیا ہے؟“

”میں ابھی پوچھ کے بتاتا ہوں انکل فیرو نے بڑے پراسرار انداز میں کہا۔

ان لوگوں نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ ”یہاں تو کوئی نہیں۔ پوچھو گے کس سے۔؟“

اب نے سوال کیا۔

”اپنے موکل سے پوچھوں گا۔ وہ جواب نہیں دیں گے تو پھر ستاروں سے رجوع کروں۔“

ان میں سے ایک جو خاصا لمبا تھا انکل فیرو پر جھکا اور ان کے چوہے کے اوپری سرا پکڑا۔

ان کو اوپر کیا انکل فیرو ہوا میں معلق ہو کر رہ گئے۔ ”اب بتاؤ تھیلے میں کیا ہے؟“

”بتاؤں کیسے۔ دم تو گھٹا جا رہا ہے۔ نیچے اتار دو بتاؤں۔“

اس کے ساتھیوں نے سفارش کی تو انکل فیرو کو زمین پر بیٹھا دیا گیا۔ ”اب بتاؤ تھیلے میں کیا ہے؟“

انکل فیرو نے پہلے ادھر ادھر دیکھا پھر بڑا تھیلہ ان کی طرف بڑھا دیا بولے ”پوچھتے ہو۔ لو کھول کے“

لے آدی نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے کچھ اشارہ کیا۔ ”پہلے بتاؤ کہ میں کیا ہے پھر ہم اسے کھولیں گے۔“

”کیا بتانا ہی پڑے گا؟“

”جلدی بتاؤ ورنہ ——— اور ایک تلوار کی نوک انکل فیرو کی گردن سے

ہی زخمی آدمی کا علاج کر سکتے ہو۔؟“

کیوں نہیں۔ اور میرا کام ہی کیا ہے۔ گاؤں گاؤں گھوم کے بیماروں اور زخمیوں کو لاش کرتا ہوں پھر ان کا دل لگا کر علاج کرتا ہوں۔ جن کی قسمت میں موت نہیں ہوئی وہ ب میرے ہاتھ شفا پا کے چلنے پھرنے لگتے ہیں۔ آزمائش شرط ہے۔ الہا کے طیب کے ذی صفائی دیکھنا چاہتے ہو تو کسی زخمی کو سامنے لاؤ اگر کوئی زخمی نہیں تو کسی کا ہاتھ کاٹ لے۔ میں اسے ابھی اسی جگہ لگا دوں گا اور کوئی شخص پہچان نہیں سکے گا۔“

”یہ تو واقعی کام کا آدمی لگتا ہے۔ ایک نے دوسرے سے کہا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”ہاتھ نکلن کو آری کیا ہے۔ آزما کے دیکھ لو۔“

پہلے نے آگے بڑھ کے زمین پر لیٹے ہوئے آدمی پر سے کپڑا کھینچ لیا۔ انکل فیرو کی اس نظر بڑی تو دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔

”کیا ہوا ڈر گئے۔ تم تو بڑی ڈینگیں مار رہے تھے۔“

”میں کیوں ڈرنے لگا۔“ یہ کہتے ہوئے انکل قدم بڑھا کر پھر آگے آگئے۔ یہ زندہ ہے رگیا؟۔“

”طیب تم ہو۔ خود کیوں نہیں دیکھتے؟“

”یہ کام بھی مجھے ہی کرنا پڑے گا۔“ انکل فیرو نے اس کی نبض دیکھی۔ پھر سینے اور پر ہاتھ رکھا۔

”ابھی زندہ ہے یہ۔ مگر کس کم بخت نے اسے اس قدر زخمی کیا ہے؟۔“

”یہ بعد میں بتایا جائے گا۔ پہلے تم اس کا علاج کرو۔“

انکل فیرو کم از کم مرہم پٹی تو جانتے تھے۔ انہوں نے پانی منگایا پھر کپڑا بھگو کر زخمی کے ا زخم اچھی طرح صاف کئے۔ اس کے بعد جیب سے اپنا ریشمی روبال نکال کے اسے لایا اور اس کی راکھ سب زخموں پر چھڑک کے پٹیاں چڑھا دیں۔ زخمی کے ساتھی بڑی لالچس سے انکل کے کام کو دیکھ رہے تھے۔

”میں نے پٹیاں چڑھا دی ہیں۔ اسے ہوش آئے تو نیم گرم دودھ پلا دیتا۔“ انکل گردن ہٹا کر بولے۔

”اسے کب ہوش آئے گا؟۔“

”یہ تو اوپر والا جانتا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ یہ مرے گا نہیں۔“

”اس کی پٹیاں کب کھلیں گی؟۔“

”ہاں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو۔“ انکل فیرو نے موثرانہ انداز اختیار کیا۔ ”چوبیس

بعد اس کی پٹیاں کھولنا۔ اگر کوئی پٹی زخم پر چٹ گئی ہو تو اسے گرم پانی میں کپڑا بھگو کر

نکالنے لگی۔

”اسے الگ رکھو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہ تلوار ہے اور اس سے گلا کٹ بھی سکتا ہے۔ میرے ستارے یہ کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔“

”پھر تم نے کیوں اس شروع کی۔“ اور ایک دوسری تلوار انکل کے سینے پر لہرائے لگی۔

”کیا کر رہے ہو۔ میں نے بتا تو دیا تھیلے میں تھیلا ہے۔“

”معلوم ہوتا ہے تمہاری موت آئی ہے۔ بتاتے ہو کہ نہیں۔“

”اور کس طرح بتاؤں۔ میں بچ کر رہا ہوں۔ تھیلے اوپر تھیلا۔ تھیلے اندر تھیلا۔“

”یہ کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔“ ایک نے دوسرے سے کہا۔

انکل اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ ”میں تمہیں پاگل دکھائی دیتا ہوں؟“

”باتیں تو ایسی ہی کر رہے ہو۔“

انکل نے بڑے غصے سے بڑا تھیلا اٹھایا۔ اس میں ہاتھ ڈالا اور اس چھوٹے تھیلے کو باہر نکالا لیا جو انہوں نے اس کے اندر رکھا تھا۔ ”دیکھا تم نے۔ دیکھا تم نے۔ تھیلے کے اندر تھیلا اور تھیلے اوپر تھیلا۔“

اب بتاؤ پاگل میں ہوں یا تم لوگ۔“

”تم تو بڑے استاد معلوم ہوتے ہو“ ایک نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا نام ہے

تمہارا۔ کام کیا کرتے ہو؟“

”ایک وقت میں ایک سوال۔ خبردار گھپلا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ انکل فیرو نے بھی

رعب دکھایا۔ ”سنبھل کے کھڑے ہو جاؤ۔ انکل فیرو کا دوبار ہے۔“

”اچھا بتاؤ۔ تمہارا نام کیا ہے؟“ لمبے آدمی نے پوچھا

”انکل فیرو نام پہلے بتا چکے ہیں دوسرا سوال کرو۔“

لمبے آدمی نے کچھ دیر سوچا پھر بولا۔ ”تو تمہارا نام انکل فیرو ہے؟۔“

”وقت ضائع نہ کرو۔ یہ دوائیں ہیں جن کی تاثیر سے مرنا آدمی زندہ ہو جاتا ہے اور

زندہ۔۔۔۔۔۔“

”اور زندہ مرجاتا ہے۔“ دوسرے نے تسخر اڑایا۔

انکل فیرو اک دم چڑ گئے۔ ”تمہارے بھیجے میں عقل کی کمی معلوم ہوئی ہے۔“

”مجھے عقل ہے یا نہیں یہ تو بعد میں پتہ لگے گا۔ میں پہلے تمہاری عقل درست

کردوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کمرے سے خنجر کھینچ لیا۔

”ارے یہ کیا کر رہے ہو۔ میں بڑے کام کا آدمی ہوں۔“ انکل فیرو خوشامد سے بولے

ان میں سے ایک انکل فیرو کے پاس آیا اور پوچھا۔ ”تم بڑے بڑے دعوے کر رہے ہو۔“



”میں نے وہ تمام ہدایات بھی دیدی ہیں جن کے برتنے سے زخمی ایک ہفتہ میں ٹھیک  
 آئے گا۔“  
 ”یہ بھی تم نے بہت اچھا کیا۔“  
 ”ان تمام باتوں کے صلے میں تم لوگ مجھ پر ایک احسان کرو۔“ انکل فیرو کا لہجہ عاجزانہ  
 لیا۔

”ایک احسان نہیں دس احسان کریں گے۔“  
 انکل فیرو کی ہاتھیں کھل گئیں۔ ”تو پھر مجھے ایک گھوڑا دو اور حماۃ جانے والے راستے  
 ال دو۔“  
 ”ایک گھوڑا دیں گے۔ حماۃ کے راستے پر ڈال دیں گے۔“ اکیلا سردار ہی جواب دے  
 گا۔

”تو پھر کرو گھوڑے کا انتظام۔“

”کب جانا ہے؟“

”ابھی جانا ہے۔ حماۃ یہاں سے کتنی دور ہے۔“

ابھی نہیں جانا ہے۔

”ہاں ہاں ابھی نہیں۔ مطلب ہے کہ صبح کو جانا ہے“ انکل نے وضاحت کی۔

”صبح کو نہیں جانا ہے۔“

”پھر کب جانا ہے؟“ انکل فیرو کے ہاتھ پیروں میں سنسنی ہونے لگی۔

”جب زخمی کے زخم بھر جائیں گے تب جاؤ گے۔“

”کیا!“ انکل فیرو کا سر چکرانے لگا۔ ”او گاؤ اب کیا ہو گا۔“

”وہی ہو گا جو تم چاہو گے۔“

”میں چاہتا ہوں مجھے ابھی حماۃ بھجوا دو۔“ انکل فیرو کی آواز روہانسی ہو گئی۔

”تم چلے جاؤ گے زخمی کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

”دیکھ بھال۔۔۔۔۔ اگر وہ مر گیا تو کیا کرو گے؟“

”اس مردے کے ساتھ تم بھی زندہ جلا دیں گے۔“

”میرے احسان کا یہ بدلہ ہے۔ میں نے تمہارے زخمی کی مرہم پٹی کی ہے۔“

”چپ چاپ اس کی دیکھ بھال کرو ورنہ تمہیں بھی اس کے برابر لٹا دیں گے۔“

انکل فیرو سمجھ گئے کہ ان جاہلوں سے بحث کرنا بیکار ہے۔ وہ تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ

۔ انکل فیرو ڈاکوؤں کے ساتھ رہنے کا یہ پہلے تجربہ تھا۔ کچھ دیر بعد ان کا پورا گردہ وہاں

ہو گیا۔ ان میں اور آدمیوں کو تلوار کے زخم آئے تھے۔ انکل فیرو کو ان کی مرہم پٹی

کرنا پڑی۔ اس سے فارغ ہوئے تو ان کے سامنے بھنا ہوا گوشت رکھا گیا۔ گوشت ذائقہ

چھڑانا۔ پھر جس طرح میں نے ریشم جلا کر زخموں پر راکھ چھڑکی ہے اسی طرح تم بھی کرنا۔  
 امید ہے ایک ہفتے میں یہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔ اس بات کا ضرور خیال رکھنا  
 کہ یہ چلنے چلنے نہ پائے ورنہ زخم کھلیں گے اور ان سے خون جاری ہو جائے گا۔ کھانے  
 میں صرف نیم گرم دودھ دینا۔ زمین کے بجائے اسے بستر پر لٹانا۔۔۔۔۔“  
 ”اچھا یہ کیوں بند کرو۔ اتنے بہت سے کام کون کرے گا۔؟“ لمبے آدمی نے اس کی  
 بات کاٹ دی۔

”تم یوقوف ہو لمبے آدمی۔ میں تمہیں۔۔۔۔۔“

”تو نے مجھے یوقوف کہا ہے؟“ اور لمبا آدمی فخر لے کر اس کی طرف بڑھا۔

”نہیں سردار۔ ایسا نہ کرنا ورنہ اپنا ساتھی مر جائے گا۔“ کئی آوازیں ایک ساتھ

اٹھیں۔

انکل فیرو کے ہوش اڑ گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ اس کے احسان تلے رہ

گئے ہیں اس لئے اس نے رعب جھاڑنا شروع کر دیا تھا مگر وہ لمبا آدمی تو ان کا سردار نکلا۔

”سردار مجھے معاف کر دیجئے۔“ انکل فیرو گڑ گڑانے لگے۔ دراصل میں مریض

بارے میں ایسی تدابیر بنا رہا تھا جس سے اس کی جان بچ جائے۔ مگر اس کے معاملے میں ذ

سی بھی بے اختیار طبعی برقی گئی تو اس کا چپٹا محال ہو جائے گا۔“

”پھر اس طرح بولنا۔“ لمبا آدمی نرم پڑ گیا۔ ”ہمیں یوقوف تو تمہارا بادشاہ بھی نہیں

کہہ سکتا۔ ایک بار ایک فوجی نے ہمارے ایک ڈاکو کو تھپڑ مار دیا تھا بس ہم سب اس بار

اس کے گھر پہنچ گئے۔ پھر اسے باندھ کے پہلے اس کے ہاتھ کی تمام اٹھلیاں کاٹ دیں پھر

کا تمام سامان اٹھا کے لئے آئے۔ تم بھی یاد رکھو۔ کسی ڈاکو سے کبھی ہیر نہ رکھنا ورنہ

تمہیں کبھی نہیں بخشے گا۔“

انکل فیرو کی سمجھ میں اب آیا کہ وہی ڈاکوؤں کا گردہ ہے جس نے قافلے پر حملہ

تھا۔ ان کا ساتھی شاید قافلے کے محافظوں کے ہاتھوں زخمی ہوا تھا۔ ان ڈاکوؤں کی وجہ

انکل فیرو راستہ سے ہٹ کر ادھر آگئے تھے مگر وہ جو مشہور ہے کہ تقدیر سے کب بھاگ

سکتا ہے۔ جہاں بھاگ کے جاؤ گے تقدیر تمہارے ساتھ جائے گی۔ انکل فیرو نے سوچا

کسی طرح یہاں سے فوراً نکل لیا جائے ورنہ یہ لوگ وحشی اور جنگلی ہیں۔ پتہ نہیں

بات پر بگڑ جائیں اور کیا کچھ کر ڈالیں۔

”سردار۔ میں نے آپ کے زخمی کے پٹیاں چڑھا دیں ہیں۔“ انکل فیرو نے ڈر

ڈرتے کہا۔

”اچھا کیا تم نے ہم خوش ہیں تم سے۔“ سردار نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔

ہوتے۔

”سردار۔ میں اچھا ہو گیا ہوں۔ انہیں جانے دیجئے۔“

”اور جو اس نے میاں سے جا کے جاسوسی کی پھر کیا ہو گا۔؟“

سردار کی اس بات پر سب ڈاکوؤں نے کان کھڑے کئے۔ زخمی ہونے والا ڈاکو بھی ان ہو گیا مگر انکل فیرو کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر اسے رحم آ گیا۔ ”سردار۔ یہ آدمی ہنس معلوم ہوتا ہے۔ اس نے رات دن ایک کر کے مجھے اچھا کیا ہے۔“

”ہر آدمی اوپر سے اچھا اور بھلا ہنس لگتا ہے۔“ سردار کا لہجہ اب بھی بالکل خشک ”اس نے تمہاری خدمت اور تباداری اپنی غرض سے کی ہے۔ میں نہ کہہ دیا تھا کہ تک تم اچھے نہیں ہو جاتے اسے چھکارا نہیں ملے گا۔ یہ تو پہلے ہی دن تمہارے پٹیاں کے بھاگنے کی فکر میں تھا۔“

”سردار۔ مجھ پر یقین کرو۔ میں کوئی جاسوسی نہیں کروں گا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم میں اس وقت کہاں پر ہوں۔ میں عمر بھر احسان مند رہوں گا سردار۔“

انکل فیرو کا چہرہ کچھ ایسا قابلِ رحم ہو گیا تھا کہ سردار کا دل بھی پسج گیا۔ ”میں تمہیں نہ ساتھی کی سفارش پر چھوڑتا ہوں مگر یاد رکھو اگر خماۃ میں کسی سے ذکر بھی کیا تو میرے ہاتھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ اس کے بعد اس نے سفارش کرنے والے ڈاکو سے کہا۔ ”آج رات اسے گھوڑے پر سوار کرا کے حماۃ کے قریب پہنچا دینا۔ گھوڑے پر سوار نے سے پہلے اس کی آنکھیں باندھ دینا۔ ڈاکوؤں کا اصول ہے کہ وہ اس شخص کو زندہ چھوڑتے جس کے بارے میں مخبری کا شبہ ہو۔“

رات کو انکل فیرو کی آنکھوں پر بہت موٹی پٹی باندھی گئی۔ ان کے سامان کے تھیلے کے دائیں بائیں لٹکا دیئے گئے۔ تیرکنا پشت پر ڈالا گیا اور تلوار بھی زین ہی سے لٹکا گئی۔ احسان کے صلہ کے طور پر ڈاکو نے دیناروں سے بھری ایک تھیلی انکل کے حوالے کی۔ انکل نے بہت انکار کیا مگر ڈاکو نے زبردستی تھیلی اس کے ساتھ کر دی۔ چلتے وقت فیرو سب کو اجتماعی سلام کیا کیونکہ اس کی آنکھیں بند تھیں اور معلوم نہیں تھا کہ اسے کون ڈاکو رخصت کرنے کے لئے اس وقت وہاں موجود تھے۔

انکل فیرو نے جس ڈاکو کی تیار داری اور علاج کیا تھا وہی ڈاکو انکل کو حماۃ پہنچانے آیا۔ انکل کو آنکھ بند کر کے گھوڑے پر بیٹھایا گیا تھا۔ لگام اگرچہ انکل کے ہاتھ میں تھی مگر کے گھوڑے کا کنٹرل ڈاکو کے ہاتھ میں تھا جو دوسرے گھوڑے پر بیٹھا تھا۔ انکل کو اُسے پر اندھا بن کے بیٹھنا بہت کھل رہا تھا مگر ابھی سفر کرتے مشکل سے ایک گھنٹہ

دار تھا مگر تھا گھنٹہ۔ بعد میں آنے والے زخموں کے زخم معمولی تھے۔ پٹی بندھنے کے بعد وہ پھر گھوڑے پر سوار ہو گئے باقی تمام ڈاکو اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ صرف اُن ڈاکو وہاں زخموں کی دیکھ بھال اور سامان کی حفاظت کے لئے رہ گئے۔ جو لوٹ کے لا رہے تھے۔ باقی ڈاکو مدھم چاندنی میں جیسے تحلیل ہوتے چلے گئے۔ ان کے گھوڑوں کی آوازیں اسے اوجھل ہونے کے بعد بھی آتی رہیں۔

”یہ سب کہاں گئے ہیں؟“ انکل فیرو نے ایک ڈاکو کو مخاطب کیا۔

”کام سے گئے ہیں“

”رات میں کیا کام ہوتا ہے؟“

”آدھے آدمی دن میں کام کرتے ہیں اور آدھے رات میں۔ ہم لوگوں کی ڈیوٹی رات میں لگتی ہے۔“

”کچھ دن ڈاکوؤں کے ساتھ رہو گے تو سب پتہ چل جائے گا۔“

”ڈاکو! اور انکل فیرو چود طبق روشن ہو گئے۔“

انکل فیرو کو ڈاکوؤں کے ہاتھ سے رہائی پاتے پاتے ایک ہفتہ لگ گیا وہ بھی اس وجہ سے کہ ان کے زخمی نے زخموں کی پٹیاں خود اتار کر پھیٹک دیں اور سردار کے منع کر کے باوجود گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

”زخمی صاحب اچھے ہو گئے۔ ہیں اب تو مجھے اجازت دے دیجئے۔“ انکل فیرو ڈاکوؤں کے سردار کے سامنے گھٹنوں تک جھک کے بولے۔

”ٹھہر جاؤ۔ زخمی سے پوچھنے دو۔“ سردار جھومتا ہوا زخمی کی طرف چلا۔

”سردار اس سے کیا پوچھنے گا۔ وہ اچک کے گھوڑے پر سوار ہوا ہے۔“

اتنے میں وہ سوار خود ہی ادھر آ گیا۔ اس نے آتے ہی انکل فیرو سے کہا۔ ”انکل تمہارا بہت بہت شکریہ اپنے گھر کا پتہ بتا دو۔ مہینے میں ایک بار تمہارا شکریہ ادا کرتے آ کرے گا۔“

”ارے بھائی۔ میں نے تمہارا پورا شکریہ سن لیا۔“ انکل افسردہ لہجے میں بولے ”ڈنگو

بھائی تم تو اچھے ہو گئے۔ اب مجھے اس مصیبت سے نجات دلا دو۔“

”انکل۔ تم آزاد ہو۔ تمہیں کس نے روکا ہے؟“ اس نے تعجب سے پوچھا۔

”انکل نے جواب دینے کی بجائے سردار کی طرف دیکھا۔“

”سردار۔“ وہ آدمی سردار سے مخاطب ہوا۔ ”انکل کو آپ نے روکا ہے؟“

”روکا تھا۔“ سردار نے خشک لہجہ میں جواب دیا۔ ”اس کو نہ روکا جاتا تو آج تم اچھے

گزرنا تھا کہ ڈاکو نے گھوڑا روک لیا۔

”گھوڑا کیوں روکا۔ ہم کہاں پر ہیں؟“ انکل نے گھبرا کے پوچھا۔

”بالکل نہ گھبراؤ انکل۔“ ڈاکو نے انکل کی آنکھوں کی پٹی کھولتے ہوئے کہا۔ ”گھوڑا اس لئے روکا ہے کہ ہم منزل کے قریب پہنچ گئے اور اس وقت ہم جہاں پر ہیں یہاں سے حماۃ کی سرحد شروع ہوتی ہے۔ حماۃ کی بڑی سرائے یہاں سے نصف گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔“

”یقین نہیں آتا کہ تم ڈاکو ہو۔“ انکل نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا سردار اس قدر بد دماغ اور تم اس قدر رحم دل۔ میں تمہارا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں۔“

”میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑوں گا انکل۔“ ڈاکو بولا۔ ”تمہیں سرائے پہنچانے کے واسطے جاؤں گا۔“

انکل نے اسے حیرانی سے دیکھا۔ ”عجیب طبیعت ہے تمہاری۔ کہاں تو اس قدر اعتقاد کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کے مجھے دیس نکالا دیا گیا اور کہاں تمہارا یہ حال کہ سرائے تک مجھے پہنچانے جا رہے ہو۔ تمہیں خطرہ نہیں معلوم ہوتا کہ میں تمہیں سرائے میں گرفتار کرا سکتا ہوں۔“

”یہ دنیا اعتبار پر قائم ہے انکل۔“ ڈاکو نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”میں نے بڑی دنیا دیکھی ہے۔ انسان اور شیطان کی شناخت مجھے ہو گئی انکل۔ اگر تم مجھے گرفتار کرا کے سولی پر چڑھا دو گے تو میرے ساتھی میرے خون کا بدلہ ان بے گناہ قافلے والوں سے لیں گے جو اپنے بال بچوں کو چھوڑ کے دور دراز علاقوں کا سفر کرتے ہیں تاکہ اپنا سامان فروخت کر کے اپنے اہل و عیال کی پرورش اور اپنی راحت کے لئے دولت پیدا کر سکیں۔“

انکل فیرو کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ڈاکو انہیں لئے ہوئے حماۃ کی کارواں سرائے میں پہنچا۔ اس نے خود ہی کارواں سرائے کے مالک سے ملاقات کی اور انکل کے قیام و طعام کا انتظام کرا دیا۔ اب رات کافی گزر چکی تھی لیکن مالک سرائے نے ان کے لئے کھانا بھیجا۔ کھانے کے بعد ڈاکو تو ان سے رخصت ہو کر چلا گیا اور انکل فیرو موصل جانے کی فکر میں لگ گئے انہیں الہا سے نکلے ہوئے تقریباً دس دن ہو گئے۔ تھے اور وہ اب تک حماۃ پہنچے تھے یعنی وہ موصل سے دور ہوتے جا رہے تھے۔

خوش قسمتی سے انکل کو رات ہی میں معلوم ہو گیا کہ ایک قافلہ صبح کو موصل جا رہا ہے جس کا راستہ اگرچہ ریگستان سے ہو کر جاتا ہے مگر وہ بہت جلد موصل پہنچے گا۔ انکل موصل پہنچنے کی جلدی تھی اس لئے انہوں نے سرائے کے مالک کی مدد حاصل کی اور رات

ی میں سالار قافلہ سے ملاقات کر کے اپنا نام موصل جانے والوں میں لکھوا لیا۔ قس باشر کی طرح حماۃ میں بھی بہت سے لوگ انکل کے جاننے والے تھے مگر انہوں نے موصل جانے کو ہر بات پر فوقیت دی اور صبح کو موصل جانے والے قافلہ کے ساتھ چل پڑے۔

انکل فیرو نے موصل کو اپنے بچپن میں ایک بار دیکھا تھا مگر اب ان کے دماغ میں اس کا محض ایک دھندلا سا خاکہ موجود تھا۔ گلیاں، سڑکیں یا عمارتوں کا کوئی تصور ان کے ذہن میں موجود نہ تھا مگر جب وہ موصل میں داخل ہوئے تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں امیر عماد الدین زنگی نے موصل کی کایا پلٹ کے رکھ دی تھی۔ انکل کے بچپن میں موصل کا علاقہ بالکل خیر اور ویران تھا۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے کی سخت دشواری تھی۔ بڑی عمارتیں ناپید تھیں۔ باغات اور میوہ دار درختوں کا نام و نشان نہ تھا۔ امیر عماد الدین زنگی نے اس شہر کو چن بنا دیا تھا۔ جگہ جگہ باغات۔ خوبصورت عمارتیں اور پختہ سڑکیں ایک شہر سے دوسرے شہر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ امیر نے موصل کے قریب کئی اور آبادیاں اور بستیاں بسادی تھیں۔ موصل کے امیر کے عدل و انصاف کا چار جانب چرچا تھا اور لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کرنے کے لئے موصل میں آکے آباد ہو گئے تھے۔ اب نہ وہ پہلے جیسا موصل تھا اور نہ وہ ویرانے اور خستہ مکانات۔ انکل فیرو کی جس طرف نظر اٹھتی تھی ان کا دل خوش ہو جاتا تھا۔

انکل فیرو دوپہر کے وقت موصل پہنچے تھے۔ ایک اچھی سرائے میں انہوں نے قیام کیا تھے ماندے اتنے تھے کہ کھانا کھا کے جو پڑ کے سوئے تو رات کے کھانے پر سرائے کے ملازم نے انہیں جگایا۔ انکل فیرو گڑبڑا کے اٹھ بیٹھے۔ انہیں انوس ہو رہا تھا کہ وہ خوا خواہ ہو گئے ورنہ شہر میں گھوم پھر کے وہ شہزادہ مودود کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے تھے۔ جوں توں کر کے انکل نے صبح کی۔ سرائے کا مالک نماز سے فارغ ہوا تو انکل اس کے پاس جا بیٹھے۔

”آؤ بھائی مسافر۔ کس شہر کے باسی ہو؟“ سرائے والے نے پیار سے پوچھا۔

”سیٹھ صاحب۔“ انکل نے موقع کے لحاظ سے فائدہ اٹھایا ”میں مسلمان تو نہیں مگر ایک مسلمان ریاست کا رہنے والا ہوں۔“

”اور وہ کون مبارک ریاست ہے جہاں آپ جیسے مذہب لوگ رہتے ہیں؟“ سرائے والے نے بھی بڑے مذہب طریقے سے کہا۔

”وہ ریاست ایسی ہے کہ جس کے حصول کی دعا مسلمان ایک زمانے تک مانگتے رہے۔“ انکل نے بات کو نور نازل دیا۔ ”اس ریاست کو ایک مرد مجاہد یعنی امیر عماد الدین زنگی

نے صرف ایک ہفتہ کے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا۔

”ماشا اللہ۔ ہمارے امیر ایسے ہی شجاع اور دلدار ہیں۔“ سرائے والا مسکرایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ آپ الہا کے مبارک شہر کے رہنے والے ہیں۔“

”بے شک۔ بے شک“ انکل فیرو بھی مسکرائے۔ ”الہا میرا شہر بلکہ میرا ملک ہے کیا شہر ہے وہ بھی۔ آپ کے شہزادہ قطب الدین مودود کو وہ شہر بہت پسند ہے۔ مجھ سے بہت تعریف کیا کرتے تھے۔“

سرائے والے کے کان کھڑے ہوئے۔ ”آپ شہزادہ بہادر کو جانتے ہیں؟“

”ہمارے ستارے اور موکل بھی یہی کہتے ہیں۔ شہزادے ہماری حویلی پر اکثر قدم رنجہ فرمایا کرتے تھے“ انکل نے فوراً اکڑ کے کہا۔

”آپ۔ آپ شہزادے کے دوست ہیں؟“

”شہزادے میرے کرم فرما ہیں۔“

”مگر۔۔۔ آپ سرائے میں ٹھہرے ہیں۔ شاہی محل میں کیوں نہیں گئے؟“

”کیا شہزادے مودود موصل میں موجود ہیں؟“

”بالکل موجود ہیں۔ شام کو گھوڑے پر سوار ہو کے نکلتے ہیں۔ وہ اسی راستے سیر کو جاتے ہیں۔“ سرائے والے نے وہ بات خود ہی بتادی جو انکل فیرو پوچھتا چاہتے تھے۔

انکل فیرو بڑے فخر سے بولے۔ ”تو پھر آج شہزادے قطب الدین مودود اور تمہارے انکل کی ملاقات اس سرائے میں ہوگی۔“

”ملاقات سرائے میں۔ میری سرائے میں؟“ سرائے والے کی آنکھیں پھیل گئیں۔

”شام ہونے دو۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا۔“ انکل کا سر کچھ اور بلند ہو گیا۔

انکل فیرو نے شان میں آکے اتنا بڑا دعویٰ تو کر دیا تھا مگر اب یہ فکر ستانے لگی کہ کہیں شہزادہ قطب الدین مودود اسے بھول نہ گیا ہو یا پھر کسی مصلحت کی بنا پر اسے پہچاننے سے انکار نہ کر دے۔ وہ اسی سوچ میں تھا کہ سرائے والے نے اس کا امتحان لینا شروع کر دیا۔

”مسافر کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم نے اتنا بڑا دعویٰ کیا ہے جو بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔“ سرائے کے مالک نے جیتے الفاظ میں انکل فیرو کا انٹرویو شروع کیا۔

انکل فیرو شام کو پیش آنے والے حالات سے پہلے ہی پریشان تھے۔ سرائے والے کے اس بے گنے سوال سے وہ اور گھبرا گئے۔ سنبھل کے بولے۔ ”بھائی۔ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ شام تک انتظار کرو۔ میری بات کا تمہیں ثبوت مل جائے گا۔“

”تمہاری بات کا تو یقین ہے مسافر۔“ سرائے کے مالک کا انداز بڑا تسخیرانہ تھا۔

”لیکن گرجے نوالے بادل اکثر برسا نہیں کرتے۔ کچھ مجھے بھی تو تمہارا آکا پیچھا معلوم ہونا چاہئے۔“

انکل فیرو کو غصہ آگیا۔ ”ٹھیک ہے جاؤ میں کسی کو نہیں جانتا۔ میرا شہزادے سے کوئی تعلق نہیں۔“

”سوچ لو مسافر۔ تم اپنی بات سے انکار کر رہے ہو۔“ سرائے والے نے اک دم آنکھیں پھیر لیں۔

انکل فیرو نے نرم ہو کے کہا۔ ”انکار نہ کروں تو پھر کیا کروں۔ تمہیں میری بات کا کسی طرح یقین ہی نہیں آتا۔“

”میں یقین کرنے کو تیار ہوں لیکن تمہیں اس بات کا ثبوت دینا ہو گا۔“ سرائے والے کا لہجہ سخت ہو گیا۔

”واہ اچھی زبردستی ہے۔ میں نے بات کی تھی۔ میں نے ہی ختم کر دی۔ دعوے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں۔“ انکل فیرو اب کسی طرح جان چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ فٹ پریشان تھے کہ اس لٹے داغ سے کسی طرح پیچھا چھڑایا جائے۔ مگر سرائے والا ان کی کمزوری سے اور شیر ہوتا جا رہا تھا۔

”مسافر۔ اگر تم ثبوت نہیں پیش کرو گے تو میں تمہارے خلاف قاضی کی عدالت میں مقدمہ پیش کروں گا۔“ سرائے والا جیسے انکل کے پیچھے بچے جھاڑ کے پڑ گیا تھا۔

انکل فیرو نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔ ”اے بھائی۔ تم کس بات کا مقدمہ کرو گے۔ میں نے تم سے ایک بات کہی تھی۔ تم اسے نہیں ماننے چلو قصہ ختم ہوا۔ تم اپنے گھر ش ہو اور میں تمہاری سرائے میں خوش ہوں۔“

انکل کا خیال تھا کہ سرائے والا اس کی شوخ گفتگو پر ہنس دے گا اور یوں بات ختم ہو جائے گی مگر سرائے والا تو انکل کی جان کو چٹ کر رہ گیا تھا۔ ”میں تمہارے خلاف جھوٹ لے کا مقدمہ کروں گا۔ تم نے امیر محترم کے ایک بیٹے سے اپنی دوستی کا دعویٰ کیا۔ پھر تم نے دعوے کو ثابت نہیں کر سکے اس طرح تم نے شہزادے بہادر کی توہین کی ہے۔ تمہیں ملنی چاہئے۔“

ان دونوں کی باتوں میں شدت اور تلخی پیدا ہوئی تو سرائے کے دو چار ملازم وہاں آکر رُے ہو گئے اور انہوں نے سرائے والے کی بلاوجہ حمایت کرنا شروع کر دی۔ انکل فیرو دیکھا کہ پانی سر سے اونچا ہوا جا رہا ہے اور اگر انہوں نے اس کا فوری تدارک نہ کیا تو

انہیں قاضی کے سامنے جا کے ذلیل ہونا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے کہ قاضی بھی اس سرائے والے کی طرح اٹلے دماغ کا آدمی ہو پھر تو اسے سزا بھی بھگتنا پڑے گی۔

انکل فیرو نے ایک جھڑپ جھری لی پھر آگے بڑھ کر سرائے والے کا گریبان پکڑ لیا۔ ”چل۔ میرے ساتھ چل۔ میں جھوٹا نہیں بلکہ تو مکار ہے۔ تو پر دسی سمجھ کے مجھے پریشان کر رہا ہے۔ میں تجھے ساتھ لے چلوں گا۔“ دیکھنے والے تمام لوگ ایک اجنبی مسافر کی اس حرکت پر پریشان ہو گئے۔ سرائے والا بھی گھبرا گیا مگر چونکہ سرائے کا مالک تھا اور اس کے کچھ ملازم بھی موقع پر موجود تھے اس لئے وہ بھی اکڑ گیا میرا گریبان چھوڑ دے ورنہ تیرے لئے برا ہوگا۔“

”برا میرے لئے نہیں بلکہ تیرے لئے ہوگا۔ میں تو تجھے لے جا کے چھوڑوں گا۔“ آخر سرائے کے ایک غلام نے ہمت کر کے انکل فیرو سے پوچھا۔ ”بھائی مسافر۔ تم ہمارے مالک کو کہاں لے جانا چاہتے ہو؟“

”وہاں لے جاؤں گا جہاں اس کو ثبوت مل جائے۔“ انکل فیرو نے بڑے رعب سے جواب دیا اور اپنی گرفت گریبان پر زیادہ سخت کر لی۔

”میرا گریبان تو چھوڑ۔ میں تجھ سے کوئی ثبوت نہیں مانگتا۔“ سرائے والا آپ ہی زہ پڑ گیا۔

”لیکن میں اب ثبوت دے کر رہوں گا۔“ انکل فیرو حاوی آنے لگے تھے۔ بڑی خوشامد درآمد کے بعد انکل فیرو نے گریبان چھوڑا۔ سرائے کے مالک کو سخت غم آ رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ مسافر کو خون کر ڈالے مگر اب کافی مجمع ہو گیا اور وہ مسافر کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

اس نے اپنا بھرم قائم کھنے کے لئے کہا۔ ”ہاں اب بتا تو مجھے کہاں لے جانا چاہتا؟“

”شاہی دربار میں۔ امیر عماد الدین زنگی والی موصل کے سامنے۔“ انکل فیرو نے ایسے رعب سے کہا کہ سرائے والا ہی کیا دوسرے سننے والوں کا رنگ بھی اڑ گیا۔

سرائے والا نرمی سے بولا۔ ”مسافر شاید تم نہیں جانتے کہ دربار کے گرد پہرہ لگتا ہے اندر کوئی گھسنے نہیں دے گا۔“

انکل فیرو نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”اور تم نہیں جانتے کہ الرہا میں، میں امیر دربار میں حاضر ہوا تھا اور امیر نے میری بہن کو الرہا میں ایک نہایت شاندار محل عطا ہے۔ امیر مجھے دیکھتے ہی پہچان لے گا پھر میں تیری کھال ادھر ڈالوں گا۔“

سرائے والے کے پیر کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ انکل فیرو نے ابھی تو شہزادے سے شناسائی کا دعویٰ کیا تھا اور اب وہ امیر موصل سے اپنی ملاقات کا ذکر کر رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ کیسے اٹلے لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ چنانچہ اس نے مصالمانہ انداز اختیار کیا۔ ”مسافر مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی پہنچ کے آدمی ہو۔“

”معلوم تو تم کو شام کو ہوگا جب اس سرائے کے سامنے شہزادے قطب الدین مودود اپنے گھوڑے سے اتر کر مجھ سے بغلیگر ہوگا۔“ انکل فیرو نے گردن اکڑا کے کہا۔ ”تمہیں جلدی ہو اور ابھی ثبوت چاہئے ہو تو میرے ساتھ دربار میں چلو۔ دیکھنا کیسا دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوتا ہے“

”مجھے معاف کر دو مسافر۔ میں کیسے نہیں جانتا۔ کسی ثبوت کی ضرورت نہیں مجھے۔“ سرائے کا مسافر انکل کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔

میں تمہیں اس شرط پر معاف کر سکتا ہوں کہ آج شام تم اور تمہارے یہ سب ساتھ سرائے کے ملازم اس وقت موجود ہوں گے جب شہزادہ قطب الدین مودود ادھر سے گزرے گا۔“ انکل فیرو نے فاتحانہ انداز میں سب پر نظر ڈالی۔

”مجھے منظور ہے میں سب کو یہاں لے کے موجود رہوں گا۔“ سرائے والے نے فوراً تسلیم کر لیا۔ وہ تو ہر صورت میں اس اجنبی مسافر سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔

انکل فیرو اپنے کمرے میں چلے گئے۔ دوسرے لوگ بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر لوٹ گئے یا پھر اپنے کام پر چلے گئے۔ سرائے والا پہلے یہ سوچ کر خوش تھا کہ اس نے ایک مسافر کو اپنے رعب میں لے لیا ہے اور قاضی کا نام لے کر اسے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا ہے مگر جب انکل فیرو نے اسے شاہی دربار میں لے جانے کی دھونس دی تو اس کی ساری شچی نکل گئی اور وہ سر جھکائے ہوئے واپس ہو گیا۔

انکل فیرو پر پھر وہی پہلے والی فکر سوار ہو گئی۔ اگر شہزادے نے اسے نہ پہچانا تو کیا ہوگا بات اتنی آگے نکل چکی تھی کہ وہ واپس بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تو اس نے تمام لوگوں کو تماشہ دیکھنے یا دکھانے کے لئے بلا لیا تھا بلکہ انہیں شام کو آنے کا حکم دیدیا تھا شام آنے میں وقت تھا مگر ہر لمحے اور ہر گھنٹے کے ساتھ انکل فیرو کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اور اب وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہے تھے کہ خدا کرے شہزادہ مودود آج اس راستے سے نہ گزرے۔ اس سے نہ صرف ان کی بات رہ جائے گی بلکہ ان کا رعب بھی بدستور قائم رہے گا۔ انکل نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر شہزادہ آج ادھر نہ آیا تو وہ رات کو اس کے محل تک

انہیں پہنچانے پر مجبور ہو جائے لیکن یہ ایک امید موہوم تھی جس کا تجربہ آنے والے سے ہی ہو سکتا تھا۔

انکل فیرو نے چلتے ہوئے سرائے والے کو ٹٹولا ”کیوں بھائی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ شہزادہ قطب الدین مودود آج تشریف ہی نہ لائیں؟“

”ہو سکتا ہے۔ بالکل ہو سکتا ہے“ سرائے والے نے جوش سے تائید کی جیسے شہزادے کے نہ آنے سے وہ بھی خوش ہو گا۔

انکل فیرو نے اسے کچھ اور چھیڑا۔ ”اگر شہزادے بہادر تشریف نہ لائے تو پھر ثبوت کیسے پیش کروں گا۔؟“

”میں کوئی ثبوت نہیں چاہتا میں نے اپنی بات واپس لے لی ہے۔“

”جب تم نے اپنی بات واپس لے لی ہے تو پھر میرے دعوے سے کیا فائدہ۔“ انکل فیرو نے اس کی بات سے فوراً فائدہ اٹھایا۔

سرائے والا راضی ہو گیا۔ وہ تو جھگڑا ختم کرنا چاہتا تھا۔ ”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں مسافر بس یوں سمجھئے کہ نہ میں نے کوئی بات کی اور نہ آپ نے دعویٰ کیا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں راضی ہوں۔“ انکل فیرو نے بھی جیسے مقدمہ واپس لے لیا۔

”میں بھی راضی ہوں۔“ سرائے والے نے بھی جیسے باز دعویٰ لکھ دیا۔

”تو پھر شہزادے کا انتظار کرنے سے کیا فائدہ۔ سرائے میں واپس چلتے ہیں۔“ انکل فیرو نے مشورہ دیا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں چلے واپس چلتے ہیں“

اس وقت سفید رنگ کا ایک تیز رفتار گھوڑا جس پر رزق برق لباس میں ایک سوار بیٹھا تھا سڑک کی بائیں جانب سے آیا اور دائیں طرف ٹٹکا چلا گیا۔

”شہزادے بہادر کی سواری آ رہی ہے۔ یہ سوار ان کی آمد کا نشان تھا۔“ سرائے والے کا لہجہ بھی سہا ہوا تھا۔

”اچھا شہزادے آرہے ہیں؟“ انکل فیرو ٹھنڈی سانس لے کے رک گئے۔

”آپ تو شہزادے سے ضرور ملیں گے۔؟“

”وہ آرہے ہیں تو ملنا ہی پڑے گا۔“

سرائے والا انکل فیرو کو اس جگہ لے گیا جو اس نے پہلے سے منتخب کی تھی۔ یہ سڑک کے کنارے ایک اونچی جگہ تھی اور ادھر سے گزرنے والے کی نظر سے بچ نہ سکتی تھی۔

انکل فیرو کو وہاں کھڑا کر دیا گیا۔

پہنچنے کی کوشش کریں گے تاکہ ان سے قبل از وقت ملاقات کر کے وہ اپنے آپ کو شناخت کرا دیں اور پھر جب بھی ان کا ادھر سے گزر ہو وہ انکل کو فوراً پہچان لیں۔

دوپہر کا کھانا پریشانی کی وجہ سے انکل سے نہیں کھایا گیا۔ ادھر سرائے کے مالک نے دوپہر کے فوراً بعد لوگوں کو سرائے کے باہر اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر لوگ جمع نہ ہوئے تو مسافر اس کا پھر گریبان پکڑ لے گا اور شہزادے کے علاوہ شاہی دربار میں بھی اس کی درگت بنوائے گا۔ انکل فیرو نے کھڑکی سے جھانک کے دیکھا۔ باہر راستے میں دونوں طرف لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے مجمع دم بدم بڑھتا جا رہا تھا۔

ابھی دوپہر اچھی طرح ڈھلی بھی نہ تھی کہ سرائے کے مالک نے انکل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ انکل فیرو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا انہوں نے بڑی ہمت سے کام لیا اور اٹھ کے دروازہ کھولا۔ سامنے سرائے والا موت کے فرشتے کی طرح موجود تھا۔

ابھی دوپہر ہے شہزادے کس وقت تشریف لاتے ہیں؟“ ان کا دل دھڑک رہا تھا مگر وہ سنبھل سنبھل کے بات کر رہے تھے۔

”فکر نہ کرو۔ میں تیار ہوں۔ شہزادے کے آنے سے کچھ دیر پہلے مجھے اطلاع دینا۔“

”یہ کہتے ہوئے انکل فیرو نے زور سے دروازہ بند کر لیا۔“

کچھ دیر انکل فیرو کمرے میں ٹٹلتے رہے۔ انہیں اب رہ رہ کے کیٹ اور ارسل کی یاد ستا رہی تھی۔ انہیں اس بات پر بھی افسوس تھا کہ انہوں نے موصول کا سفر غلط وقت پر شروع کیا کیونکہ ایک تو شہزادے قطب الدین مودود سے ملاقات ہونا مشکل معلوم ہو رہی تھی اور اگر ملاقات ہو بھی گئی تو وہ کیٹ کو لینے کے لئے اڑ رہا جانے سے رہا پھر اس نے یہ دروازہ کھولا۔

اس ادھیڑ بن میں وقت گزرتا رہا پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ انکل فیرو سمجھ گئے سرائے والا آ گیا ہے۔ انہیں حیرت کی گھبراہٹ تھی۔ دروازہ کھولا اور اس کے ساتھ ہولے۔

عجیب بات یہ تھی کہ وہ دونوں ہی پریشان تھے۔ بات پہلے انکل فیرو نے شروع کی تھی پھر سرائے والا ان پر حاوی آ گیا اور اس نے انکل فیرو کو قاضی کے پاس پیش کرنے کی دھمکی دی۔

انکل فیرو کی تقدیر اچھی تھی ورنہ پردیس میں جانے کہاں کہاں خوار ہونا پڑتا ان کی سمجھ میں سرائے والے کو پریشان کرنے کی ایک نئی ترکیب آگئی جس کے زور پر انکل نے سرائے والے کو ناکوں پر چبوا دیئے تھے اور اس وقت بھی وہ حد درجہ پریشان تھا۔ دوسری طرف انکل اپنی جگہ سے ہوتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ اگر شہزادہ اور ان کا سامنا ہو گیا اور شہزادہ نے انہیں نہ بھی پہچانا تو بھی وہ کوئی نہ کوئی ایسی حرکت ضرور کریں گے کہ شہزادہ

کو سینے سے چمٹا لیا۔

انکل شہزادے کو گلے لگائے ہوئے تھے کہ ان کی نظر سرائے کے مالک پر پڑی۔ وہ منہ کھولے حیران نظروں سے انکل اور شہزادے کو دیکھ رہا تھا۔

”اب تو آپ چلیں گے میرے ساتھ؟“ شہزادے نے اپنا سوال دوہرایا۔

”شہزادے“ محل تو وہی ہے جہاں میں اس وقت ٹھہرا ہوا ہوں۔“ انکل فیرو کا چہرہ ڈوٹی سے دمک اٹھا تھا۔

”آپ شاید اس سرائے میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔؟“

”شہزادے۔ شریف لوگ بر سر رہے سوال و جواب نہیں کرتے۔“ انکل نے شہزادے کو سینے سے الگ کیا۔

”ٹھیک ہے چلے ہم کہیں بیٹھ کے آپ سے گفتگو کرتے ہیں“

شہزادے نے انکل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا اور انکل فیرو اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے سرائے میں داخل ہو گئے۔ شہزادے کے ساتھ والے بھی وہیں رک گئے۔ کسی میں ہمت نہ تھی کہ چوں بھی کرتا۔ سرائے کے مالک پر سحر طاری تھا۔ وہ چپ چاپ انکل فیرو کے پیچھے ہلا آ رہا تھا۔ انکل فیرو نے خود اسے آنے کا موقعہ دیا تھا تاکہ اس کے ذہن سے ہر طرح کا شک و شبہ دور ہو جائے۔

انکل فیرو بھی اپنے کمرے پر پہنچ کر رکے اور پلٹ کے سرائے والے سے بولے۔ ”ہم اندر بیٹھ کے گفتگو کر رہے ہیں خبردار جو کوئی ادھر آیا۔“

”آپ فکر نہ کیجئے مالک۔“ سرائے والا کمر تک دھرا ہو گیا۔ ”ادھر پرندہ بھی پر نہ مار سکے گا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو حکم دیجئے؟“

انکل فیرو نے شہزادے کی طرف دیکھا۔ ”شہزادے کو سرائے والے کی گفتگو ناگوار لگتی تھی وہ جلد سے جلد اپنی محبوبہ کیٹ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے فوراً سرائے والے کو دیکھا۔ سرائے والا سمجھا اور چپ چاپ وہاں سے ٹل گیا؟“

”اب بتائیے انکل۔ سب لوگ کیسے ہیں؟“ شہزادے قطب الدین مودود اندر پہنچتے ہی لالہ۔

الہا میں سب خیرت ہے۔ آپ کی حکومت کا پورا رعب و اب ہے۔“ انکل فیرو چبا چبا کے کہہ رہے تھے۔

”محترم شہزادی ارسلان خیریت سے تو ہیں؟“ شہزادے نے بے چینی سے پوچھا۔

”بالکل خیریت سے ہیں سوائے اس کے کہ بادشاہ جو سیلین کے ایک جاسوس نے انہیں

ذرا دیر بعد ایک سیاہ گھوڑے پر ایک مسلح سوار نمودار ہوا۔ اس کے لباس میں شاید موتی جڑے ہوئے تھے جو جاتی دھوپ میں جگمگا رہے تھے۔ اس سے کچھ ہی پیچھے ایک سوار بڑی شان سے آ رہا تھا۔ انکل فیرو کو اسے پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ وہ امیر کا چھوٹا بیٹا شہزادہ قطب الدین مودود تھا۔ انکل فیرو کا دل اس زور سے اچھلا جیسے اس کے حلق سے باہر آجائے گا۔ انکل فیرو نے تو شہزادے کو پہچان لیا لیکن سوال یہ تھا کہ شہزادہ بھی انکل فیرو کو پہچانتا ہے کہ نہیں۔ شہزادے کا گھوڑا قریب سے قریب تر ہو رہا تھا اور اس لحاظ سے انکل فیرو کی طبیعت غیر ہو رہی تھی۔

شہزادہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انکل اس کے بائیں جانب تھے۔ انہیں خطرہ پیدا ہوا کہ اگر شہزادہ اسی طرح سامنے دیکھتا رہا تو وہ انکل کو بغیر دیکھے نکل جائے گا۔ انکل آگے بڑھ کے اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ شہزادہ اس سے ناراض ہو جائے اور اسے گستاخی سمجھتے ہوئے قتل کا حکم دیدے۔ شہزادہ اس کے بالکل برابر۔ آگیا۔ گھوڑے کا اگلا قدم شہزادے کو انکل فیرو سے دور کر دیتا اور انکل کو اس سے ملنے کی آرزو ہی رہ جاتی لیکن شہزادے کا منہ نہ جانے کیسے اک دم انکل فیرو کی طرف گھوم گیا۔ اس کے ساتھ شہزادے نے گھوڑے کی راسیں اک دم پوری طاقت سے کھینچ لیں۔ شہزادے کے رکتے ہی اس کے دائیں بائیں اور پیچھے چلنے والا پورا جلوس رک کر رہ گیا۔

شہزادے قطب الدین مودود نے پہلے کئی بار آنکھیں جھپکائیں۔ پھر ایک کپڑے سے ملیں جب اس کے سامنے کا منظر بالکل نہ بدلا تو اس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ”انکل۔۔۔۔۔۔ انکل فیرو۔ کیا یہ آپ ہیں۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔“

”میں شہزادے قطب الدین مودود کی خدمت میں سلام پیش کرتا ہوں۔“ انکل خوشی سے پھولے نہ ساتے تھے۔ شہزادے نے انہیں پہچان لیا اور ان کی ڈوٹی ہوئی کشتی سطح آب پر ابھر آئی تھی۔

شہزادہ فوراً ”گھوڑا سے اتر پڑا۔ اسے اترتا دیکھ کے آنے والے تمام سوار پیدل ہو گئے۔

”آپ میرے ساتھ چلے“

”کہاں۔؟“

”محل میں اور کہا؟“ اور شہزادے نے پورے خلوص سے بغلیں ہونے کے لئے اپنے

ہاتھ پھیلا دیے۔

انکل فیرو تو چاہتے ہی یہی تھے۔ انہوں نے بھی اپنے ہاتھ کھولے اور بڑھ کے شہزادے

”میں مزاج عالی سے خوفزدہ تھا۔ خیال تھا کہ کہیں امیر انکار نہ کر دیں۔“ شہزادہ مودود نے بڑے ادب سے کہا۔

”انکار تو ہم آج بھی کر سکتے ہیں۔“

”امیر موصِل اقرار اور انکار پر قادر ہیں۔“ شہزادہ قطب نے بلا توقف جواب دیا۔

”اگر ہم انکار کر دیں تو تم پر کیا گزرے گی؟“

”اپنی بد قسمتی پر ماتم کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں۔ مگر قسم کھاتا ہوں کہ تمام عمر شادی میں کروں گا۔“

امیر عماد الدین زنگی ہنس دیا۔ ”شہزادے کو کیٹ مل جائے گی۔ ہم قلعہ (جعبل) سے اپس آکے شہزادے کو دولہا بنائیں گے۔“

شہزادہ جھک کے آداب بجالایا مگر جانے کے بجائے وہیں کھڑا رہا۔

”کچھ اور کہنا چاہتے ہو؟“ امیر نے دریافت کیا۔

”جی ہاں امیر۔ رہا سے شہزادی کیٹ کے انکل فیرو آئے ہوئے ہیں۔ مجھے چند دنوں کے لئے رہا جانے کی اجازت دی جائے۔“ شہزادے نے ڈرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ جاسکتے ہو۔ مگر شادی ہمارے قلعہ جعبو سے واپس آنے پر ہی ہوگی۔“

امیر عماد الدین زنگی نے یہ کہہ کر شہزادے کو رخصت کر دیا مگر غریب ہو یا امیر۔ کسی ت خدا کو کوئی بات ناگوار گزرتی ہے۔ شہزادہ قطب الدین مودود رہا پر چلا گیا مگر امیر عماد دین زنگی کو قلعہ جعبو سے واپس آنا نصیب نہ ہوا قلعہ کے محاصرہ کے دوران اس کے بچے غلاموں نے اسے سوتے میں شہید کر دیا۔ اس شہادت پر موصِل اور رہا پر کیا گزریں کی تفصیل آپ آئندہ بات میں پڑھیں گے۔ یہاں یہ سمجھ لیجئے کہ امیر زنگی کے قتل کے بعد شہزادہ قطب الدین مودود نے جو اس وقت رہا میں تھا، شہزادی کیٹ سے باقاعدہ عقد کر یا اور اپنی دلہن کو لے کر موصِل واپس آیا حالانکہ موصِل کا حالات یکسر بدل گئے تھے

پریشان کیا تھا۔ میں نے حاکم رہا سے فریاد کی انہوں نے ہمارے محل کے گرد سخت پہرہ لگایا۔ جب سے ہر طرح کی خیریت ہے۔“ انکل فیرو خاموش ہو گئے۔

”اور کچھ بتائیے؟“ شہزادہ بے قابو ہوا جا رہا تھا مگر کیٹ کا نام لیتے نہ معلوم اسے کیوں پریشانی ہو رہی تھی۔

”میں سب کچھ بتانے ہی حاضر ہوا ہوں۔ آپ پوچھتے جائیے میں بتاتا جاؤں گا۔“ انکل فیرو نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”میں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے شہزادی کیٹ۔۔۔۔۔“

انکل فیرو نے شہزادے کو تیز نظروں سے دیکھا۔ ”آپ کو کیٹ ابھی تک یاد ہے؟“

شہزادہ اس گہرے طنز پر تڑپ اٹھا۔ ”مجھے افسوس ہے انکل۔ میں آپ لوگوں سے مل کے نہیں آسکا۔“

”خالی افسوس سے کچھ حاصل نہ ہو گا شہزادے“ انکل فیرو نے بڑی رکھائی سے کہا۔

”پھر مجھے حکم دیجئے۔ میں کیا کروں؟“

”کیٹ آپ کی امانت ہے۔ ہم اسے کہاں تک سینہ سے لگائے رکھیں آپ خود اپنی امانت کو سنبھالئے۔“

شہزادہ سوچنے لگا۔

”اس کی ایک صورت اور بھی ہے شہزادے۔“ انکل نے اسے زیادہ سوچنے کا موقعہ

نہیں دیا۔

”ضرور۔ فرمائیے دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے۔؟“

”آپ کیٹ کو چھوڑ دیجئے۔ ہم اسے اپنے مذہب والے سے بیاہ دیں گے۔ آپ کی

بھی جان چھوٹ جائے گی۔“

”جان ساتھ چھوڑ دے تو پھر جسم میں کیا رہ جاتا ہے“ اور شہزادہ پر جوش ہو گیا۔

”میں آج ہی امیر سے بات کروں گا۔ انہوں نے اجازت دی تو آپ کے ساتھ چلوں گا۔“

”اور اگر اجازت نہ دی تو۔؟“

”تو بھی ساتھ چلوں گا۔“

”شاباش۔ شہزادے آپ نے واقعی مردوں والی گفتگو کی۔“

شہزادے قطب الدین مودود نے رات کو امیر عماد الدین زنگی سے کیٹ کے ساتھ شادی

کی درخواست کی۔ امیر عماد الدین کو اس کے جاسوس نے تمام حالات سے پہلے ہی آگاہ کر

دیا تھا۔ امیر نے مسکرا کے کہا۔ ”تم اس قدر بے چین تھے تو رہا ہی میں کہا ہوتا؟“



نے قتل کی شب شہر سے اپنی غیر حاضری ثابت کر دی اور اس الزام سے بھی صاف بچ گیا۔  
الانکہ نائب السلطنت کے قتل کے وقت وہ موقع پر موجود تھا اور وہ رات اس نے جبار اور  
وقوف کے گھر گزاری تھی یہ دونوں غلام ہلو کشش کے گہرے دوست تھے۔ ہلو کشش  
بچہ خواجہ سرا تھا لیکن رقص و سرود کی محفلوں کا بڑا دلدارہ تھا اور یہی چیز ان سب میں  
لڑک تھی۔ خواجہ سرا ہلو کشش سزا سے تو بچ گیا لیکن امیر نے اسے شہر بدر کر دیا تھا اور  
شہر شہر گھومتا ہوا جعبہ میں آبا تھا۔ اس کے یار غار جبار اور از قوف بھی اس کے  
اتھ ہی آگئے تھے۔

بنی مروان کے پاس نہ باقاعدہ فوج تھی اور نہ کوئی نظام حکومت۔ قلعہ جس کا حاکم بنی  
مروان کا سردار اعلیٰ مروان لنگ تھا۔ کسی زمانہ میں مروان لنگ گھوڑے سے گرا تھا اور  
اس کے پائیں پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ عرصہ تک بستر پر پڑا رہا پھر جب چلنے پھرنے کے  
قابل ہوا تو اسے پائیں پیر پر زور دے کے چلنا پڑتا۔ جس سے وہ لنگڑا معلوم ہوتا جس سے  
اس کا نام مروان لنگ پڑ گیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کا لنگڑا پن ختم ہوتا گیا اور اس  
وقت وہ بالکل صحیح طور پر چلتا تھا مگر اس کے نام کے آگے ”لنگ“ کا جو لفظ لگ گیا تھا وہ  
نہم نہ ہو سکا۔ مروان نے بھی اس سلسلے میں کوئی کوشش نہ کی کیونکہ مروان لنگ کے نام  
سے وہ دور دور تک مشہور ہو چکا تھا مروان لنگ کے منظم یا غیر منظم فوجی دستے جن میں ہر  
ملک اور ہر قوم کے لوگ شامل تھے ان کا کام صرف قرب و جوار کی آبادیوں میں تاخت و  
تاراج کرنا تھا۔ اس لوٹ مار سے جو مال اکٹھا ہوتا اس میں سے سہرا حصہ تو قلعہ کے حفاظتی  
نڈ میں جمع ہوتا اور باقی مال اور رقم برابر برابر کیا پیادہ کیا سوار اور کیا سردار سب میں  
تقسیم ہو جاتی۔

قلعہ میں مختلف قسم کے لوگوں کی آبادی کی وجہ سے مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں  
بھی تھیں۔ کسی کو کسی کے مذہبی معاملات میں دخل دینے کی اجازت نہ تھی اور سب ایک  
دوسرے سے مل کے اس طرح رہتے تھے جیسے ایک ہی قوم کے افراد ہوں۔ ان دنوں قلعہ  
جعبہ میں ایک عیسائی حنینہ امروزیہ کا بڑا چرچا تھا۔ یہ خوبصورت دوشیزہ الرہا کی رہنے والی  
تھی۔ اس کے چار بھائی الرہا کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ بھائیوں کے مرنے کے بعد  
امروزیہ کے والدین پہلے قتل باشر گئے اور شاہ جو سلین دوم کے دربار میں فریاد کی۔ اس نے  
شاہ پر زور دیا کہ وہ الرہا پر حملہ کر کے اس ریاست کی عیسائی آبادی کو مسلمانوں کی غلامی  
سے نجات دلائے مگر اس میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ الرہا کو رہا کرانا۔ شاہ سے مایوس  
ہونے کے بعد امروزیہ کے والدین اپنی بارہ سالہ بیٹی (امروزیہ) کو لئے ہوئے شمال کی تمام

## شہادت امیر زنگی

موصل کے جنوب میں دریائے فرات کے قریب جعبہ کا قلعہ واقع تھا۔  
دمشق اب تک فتح نہ ہوا تھا اور امیر عماد الدین زنگی کی نظریں سوتے جاگتے اسی شہر  
خواب کا طواف کرتی رہتی تھیں اگر قلعہ جعبہ پر امیر کا قبضہ ہو جائے تو وہ ملک شام اور  
خصوصیت سے دمشق پر دباؤ ڈال سکتا تھا اس قلعہ پر بنی مروان قابض تھے۔ قلعہ میں بنی  
مروان کے علاوہ نصرانیوں اور ارمنی مسلمانوں کی بھی کثرت سے آبادی تھی۔ بنی مروان  
ہمیشہ سے خود سر اور بد عمد تھے اور ایک زبانی عمد نامہ کے باوجود موصل کی سرحدوں پر  
تاخت و تاراج کرتے رہتے تھے انہیں وجوہات کی بنا پر امیر عماد الدین زنگی اس قلعہ پر قبضہ  
کرنا چاہتا تھا۔

امیر عماد الدین زنگی کے درجنوں غلام تھے۔ ان غلاموں میں بعض خواجہ سرا بھی تھے  
امیر کا سب سے زیادہ منہ چڑھا غلام ہلو کشش بھی ایک خواجہ سرا تھا مگر الرہا کے حملے کے  
دوران جب اسے لشکر کا سردار بنا کے سروج پر قبضہ کے لئے بھیجا گیا تو وہ ہمک گیا۔ اور  
سروج کے پر امن شہریوں پر اپنے غلام دوستوں کو ظلم و ستم کرنے کی عام اجازت دے  
دی۔ جس کی پاداش میں ہلو کشش کو تمام اعزازات سے محروم ہونا پڑا مگر جلد ہی اسے  
معاف کر دیا گیا۔ شرافت کا تقاضہ تو یہ تھا کہ ہلو کشش تائب ہو کے سیدھے راستے پر  
گامزن ہوتا لیکن اس نے برے دوستوں کا ساتھ نہ چھوڑا اور امیر عماد الدین زنگی کے نائب  
السلطنت نصیر الدین جعفر کے قتل میں بھی اس کا نام آیا۔ ہلو کشش بہت چالاک تھا۔ اس

عیسائی ریاستوں۔ انفاکیہ۔ طرابلس اور یروشلیم میں گھومتے پھرے لیکن انہوں نے محسوس کیا کہ کسی بھی عیسائی ریاست میں اتنا دم نہیں کہ وہ موصل کے شیر امیر عماد الدین زنگی کے مقابلے پر نکلے۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی اور ہر ایک اپنی ریاست کی خیر منا رہا تھا۔ اس نے دمشق کی مسلم ریاست کا بھی چکر لگایا جو موصل کی سب سے زیادہ مخالف اور مسلمانوں کی ایک مضبوط طاقت تھی مگر انہوں نے وہاں کے شاہ آبق اور وزیر اعظم معین الدین انز کو اسی کوشش میں سرگرداں دیکھا کہ امیر موصل ان سے دور رہے اور دمشق پر حملہ آور نہ ہو۔

امروزیہ کے والدین تھک ہار کے قلعہ جعبہ میں آ کے بس گئے تھے جعبہ کے فوجی دستے ہر قوم کے جوانوں پر مشتمل تھے اور وہ سب امیر موصل کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کمزور کرنا چاہتے تھے اربا سے نکلنے وقت امروزیہ کی عمر گیارہ بارہ سال کی تھی مگر اب وہ چودہ سال کی شعلہ جوالہ اور قتالہ عالم حسینہ تھی۔ قدرت نے حسن و جمال میں اسے جس قدر یکساں کیا تھا۔ اتنی ہی وہ بد دماغ اور خود سر لڑکی تھی۔ جوانوں سے تو اسے شدید نفرت تھی۔ کسی فوجی یا فوجی دستے کو دیکھتی تو نفرت سے منہ پھیر لیتی یا زمین پر تھوک کے حقارت کا اظہار کرتی۔ والدین نے اسے گھر میں قید کر کے رکھا تھا۔ باہر نکلتی تو کسی نہ کسی جوان سے بھڑ جاتی اور اس کی اس قدر مٹی پلید کرتی کہ بیچارہ سر پر پیر رکھ کر بھاگتا۔

ہلو کشش جبار اور ازقوف کچھ ہی دن پہلے موصل سے بھاگ کے قلعہ جعبہ پہنچے تھے۔ ہلو کشش ارمنی جبار رومی اور ازقوف ترکی غلام تھا مگر تینوں ہم پیالہ اور ہم نوالہ تھے۔ ہلو کشش کو موصل سے نکالا گیا، تو جبار اور ازقوف اس کے ساتھ ہو لئے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین۔ یہ تینوں ادبش اور لفظی طبیعت کے انسان تھے ہلو کشش کی سرداری کی وجہ سے تمام غلام بے لگام تھے۔ تمام کینزوں کو اپنی زر خرید سمجھتے۔ کبھی کبھی شراب کے نشہ میں کسی شریف زادی پر ہاتھ ڈالتے تو اچھی خاصی جوتے بازی ہو جاتی۔ ہلو کشش تو بیچارہ خواجہ سرا تھا نہ تین میں نہ تیرہ میں جبار اور ازقوف چمٹے ہوئے بد معاش تھے۔ دلیر، نڈر اور ہاتھ پیروں کے توانا۔ برابر کے مقابلے میں توڑنے ہی تھے لیکن دس بیس بھی مقابلہ پر آجائیں تو بھی میدان سے منہ نہ پھیرتے تھے۔

قلعہ جعبہ کے جوانوں پر امروزیہ کا کچھ ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ جس راستے سے امروزیہ نکلتی، مسلم اور عیسائی جوان اس راستے سے کترا کے نکلتے تھے۔ کئی عیسائی مسلمان جوان امروزیہ کے خوبصورت دہن سے غلیظ گالیاں کھا چکے تھے۔ ایک دو کو امروزیہ نے پیٹ کے بھی رکھ دیا تھا۔ جس طرح امروزیہ کے حسن کا چرچا جگہ جگہ تھا اسی طرح امیر موصل

کے ان تین باغیوں کا ذکر بھی ہر ایک کی زبان پر تھا جو ابھی چند ہفتے پہلے قلعہ جعبہ میں داخل ہوئے تھے ہلو کشش وغیرہ کو صرف شہر بدر کیا گیا تھا۔ مگر اس نے یہ مشہور کیا تھا کہ اس سے اور امیر موصل سے کسی بات پر اختلاف پیدا ہو گیا ہے اس بناء پر وہ امیر موصل کو پیش کے لئے چھوڑ کے اپنے دوستوں کے ساتھ جعبہ آیا ہے۔ امیر موصل کے حوالے سے ہلو کشش کے نام سے قرب و جوار کے تمام حکمران واقف تھے۔ مروان لنگ امیر موصل کا سخت ترین دشمن تھا اسے ہلو کشش کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے ہلو کشش کو محل میں بلایا۔ بڑے اتفاقات سے ملا اور ہلو کشش کو اپنا حاحب مقرر کیا۔ حاحب کے اصل معنی دربان کے ہوتے ہیں لیکن امیر وقت سے تعلق رکھنے کی وجہ سے یہ مرتبہ وزیر اعظم سے بھی زیادہ بلند ہو گیا تھا۔ حاحب کے عہدے پر فائز ہونے والا فوراً شاہ وقت کا خاص ہر کارہ بن جاتا تھا ہلو کشش اگرچہ امیر موصل کا حاحب نہیں تھا۔ (موصل کے دربار میں یہ عہدہ نہیں تھا) لیکن اسے حاحب جیسے ہی اختیارات حاصل تھے۔

ہلو کشش نے مروان لنگ کا حاحب ہونے کے بعد اپنے دونوں یاروں کو بھی کام پر لگا دیا تھا۔ اس کے ساتھی سوائے درباری ہاں حضوری کے اور کسی کام سے واقف نہ تھے۔ ہاں شمشیر زنی اور دنگ فساد کے وہ ماہر تھے۔ بہر حال پورے جعبہ میں ان کی دھوم مچی تھی۔ جبار اور ازقوف نے شہر کے غنڈوں کی بھرے بازار میں پٹائی کی تھی اس وجہ سے قلعہ جعبہ کا غنڈہ عناصر بھی ان سے دیتا تھا۔ دربار جعبہ کے یہ دونوں بد معاش بازاروں میں گھوما کرتے یا قوہ خانوں میں بیٹھے گپیں ہانکا کرتے۔ قوہ خانے کے مالکان ان دونوں کی بڑی قدر کرتے تھے کیونکہ جب تک یہ دونوں قوہ خانہ میں موجود رہتے وہاں کسی قسم کا لڑائی جھگڑا نہ ہوتا اور اگر کوئی کوشش کرتا تو یہ تو مند جوان اس کی اچھی طرح مرمت کر دیتے تھے۔

امروزیہ کی حسن و جوانی اور جبار و ازقوف کی غنڈہ گردی ایسی نہ تھی جس کے بارے میں یہ دونوں ایک دوسرے کو نہ جانتے ہوں امروزیہ نے موصل کے دو بہادروں کا نام سن رکھا تھا۔ اسی طرح امروزیہ کے حسن و جمال کی آواز ان دونوں کے کانوں سے ٹکرا چکی تھی لیکن ان کا اب تک آمتا سامنا نہ ہوا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھنا چاہتے ہوں یا ملنے کے بھی خواہش مند ہوں مگر پتہ نہیں وہ اس کی کوشش کیوں نہیں کرتے تھے۔ بعض شہری غنڈے جبار اور ازقوف کے سامنے امروزیہ کا ذکر کر کے ان میں ملاقات کی تحریک کرتے مگر یہ لوگ ہنس کے ٹال دیا کرتے تھے۔ دوسری طرف امروزیہ اگرچہ بہت دماغ دار مشہور تھی مگر اس کی بے شمار سیلیاں تھیں جو اسے ہر دم گھیرے رہتیں۔ امروزیہ ان

ہل منع تھی لیکن شراب کا پورا کاروبار عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھ میں تھا۔ اور ان کے شراب خانے رات دن کھلے رہتے تھے۔ ایسی صورت میں کیا عیسائی کیا مسلمان ان اہل سے سب ہی فائدہ اٹھاتے تھے۔

اور آخر ایک دن دونوں لپکتے شعلوں کا آئنا سامنا ہو ہی گیا۔ دو لپکتی تلواریں، دو زخمی رہتے نہیں امروزیہ کے کان میں کس نے پھونک دیا کہ سامنے سے مست ہاتھیوں کی طرح دوئے ہوئے آنے والے موصل کے باغی جبار اور ازقوف ہیں اسی طرح جبار اور ازقوف نے کانوں تک یہ آواز پہنچ گئی کہ اس کے مقابل عشق چچاں کی طرح بل کھانے والی مہ بن قلعہ جعبو کی حسین ترین امروزیہ ہے۔ جبار اور ازقوف حسب معمول ایک شراب نہ سے نکل کر اپنی ترنگ میں بہکتے اور لڑکھڑاتے چلے آ رہے تھے انہیں اگر علم ہوتا کہ ج ان کا امروزیہ سے سامنا ہو گا تو وہ اپنے استاد ہلو کشش کو ضرور ساتھ لاتے۔ ہلو کشش خواجہ سرا ہونے کی وجہ سے خود تو امروزیہ میں دلچسپی لینے سے قاصر تھا مگر وہ اپنے ستوں کی دلچسپیوں میں ضرور دلچسپی لیتا تھا۔

امروزیہ اپنی سیلیوں کے ساتھ ہنسی کھیلتی چلی آ رہی تھی کہ اک دم اس کا سامنا ان لوں باغیوں سے ہو گیا جو اپنی بہادری اور غنڈہ گردی کی وجہ سے پورے قلعہ میں مشہور تھے۔ نظریں ملتے ہی ان کی رفتار میں کمی اور سانسوں کی توج میں اضافہ ہو گیا اور پھر وہ بے آ کر ایک دوسرے کے سامنے اس انداز میں رکے جیسے پہلوان مقابلے پر آتے ہیں۔ با طرف امروزیہ کی سیلیوں نے اسے اس طرح کنیاں مارنا شروع کیں جیسے کہہ رہی تھیں کہ اب بولو امروزیہ اکیلے میں بہت باتیں بناتی تھیں ادھر ازقوف نے جبار کو ٹوکا مارا۔ بول میرے شیر، گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تیرے ساتھ ہوں اور جبار کو پہل کرنا ہی کی۔

”ازقوف بھائی۔ سنا ہے اس محلہ میں امروزیہ نام کی ایک ماہ پیکر ہے۔ جو خود کو ملکہ سمجھتی ہے۔“ جبار کہہ تو ازقوف سے رہا تھا مگر اس کا رخ امروزیہ کی جانب تھا۔ امروزیہ نے ہوتی کو مخاطب کر کے جبار کو جواب دیا ”ہوتی کہہ دے کہ امروزیہ فسانہ بلکہ حقیقت ہے۔ ایک ایسا شعلہ ہے جس کی لپک قریب آنے والے کو خاکستر کر دیتی ہے اور وہ ایک ایسی کوستانی ندی ہے۔ جس کی وحشی لہروں سے کھیلنے والے غرقاب ہو جاتے ہیں۔“

”ازقوف بھائی۔“ جبار نے منہ بتایا۔ ”تمہاری جان کی قسم اگر کوئی مرد کہتا تو میں ماکہ زبان کے ساتھ پوری بیتی باہر نکال کے رکھ دیتا لیکن یہ تو پھول جیسی تنہا

کے ساتھ بالکل مختلف انداز میں رہتی تھی۔ کوئی شخص یہ اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ جوانوں کو شیر کی نظر سے دیکھنے والی امروزیہ اپنی ہم جویوں میں ایسی خوش رہ سکتی ہے امروزیہ کو اس کی سیلیوں نے اطلاع دی تھی کہ موصل کے دو باغی جوان یہاں آئے ہوئے ہیں۔ جن کی بہادری کے ہر جگہ ڈنکے پٹ رہے ہیں۔

”پھر میں کیا کروں؟“ امروزیہ نے تنگ کر کہا تھا۔  
”کرو کچھ نہ۔ صرف ایک بار ان کا سامنا کر کے دکھا دو۔“ امروزیہ کی سب سے شوخ سیلی ہوتی نے کہا مگر اس کا انداز بھی طنزیہ تھا اور امروزیہ اس کی بات برداشت نہ کر سکی۔  
”تو پھر ہو گا کیا۔ وہ مجھے کھا تو نہیں جائیں گے؟“ امروزیہ کو غصہ آ ہی گیا۔  
”یہی تو دیکھنا ہے کہ کون کس کو کھاتا ہے۔“ ہوتی نے اور گلی میں لگا لی۔  
”جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔“

”تو پھر مقابلے کا انتظام کروں میں؟“ شوخ ہوتی نے چھیڑا۔  
”ہرگز نہیں۔“ امروزیہ نے صاف انکار کر دیا۔ ”ہوتی تم جانتی ہو کہ میں نے آج تک کسی کو چھیڑ کے جھڑا مول نہیں لیا۔ ہاں جس نے مجھ سے شرارت کی میں نے اس کا داغ ضرور درست کیا ہے۔“  
”اس کا مطلب ہے کہ ہمیں اس دن کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

”بالکل۔“ امروزیہ متانت سے بولی۔ ”یہاں اسلامی قانون ہے۔ اگر میں قاضی کے سامنے پیش کی جاؤں گی تو یہ کہہ کر کہ اس جوان نے مجھے چھیڑا تھا میں صاف بچ جاؤں گی۔“

لیکن امروزیہ کی سیلیوں کا یہ انتظار بہت طول کھینچ گیا۔ سیلیاں ہی کیا امروزیہ کے محلے کی تمام عیسائی آبادی اس بات کی شہر تھی کہ وہ دن آئے کہ دونوں بھڑکتے ہوئے شعلے ایک دوسرے کے مقابل ہوں اور وہ کھڑے ہو کر تماشہ دیکھیں۔ جبار اور ازقوف کی آوارگی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا مروان لنگ کی ڈھیل نے انہیں اور زیادہ ویدہ دلہ کر دیا تھا۔ موصل میں انہیں خواتین کو چھیڑنے اور پریشان کرنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ انہیں محاسب اور قاضی شہر کا دھڑکا ہر وقت لگا رہتا تھا مگر قلعہ مروان میں ان پر اس طرح کی کوئی پابندی نہ تھی۔ عیسائی محلوں میں تو بالکل آزادی تھی۔ ایک تو پردہ کا رواج نہ تھا پھر ان میں عورتیں زیادہ آزاد تھیں۔ چھیڑ چھاڑ اور نظر بازی کو ان کی معاشرت میں کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بر سرعام دلداریاں بھی ہوتی تھیں۔ رہی سہی کسر شراب نوشی نے پوری کر دی تھی۔ قلعہ میں بر سرعام شراب پینے کی اجازت تھی اور مسلمانوں کے لئے شراب

ہیں۔

”ہوتی!“ امروزیہ قہقہہ مار کے ہنسی۔ اس کے موتی جیسے دانت چمکے تو جیسے شگوفے مسکرا دئے۔ ”موصول کے یہ تتلیاں پکڑنے والے بچے یہاں کیسے آ گئے۔ ان بیچاروں کے منہ سے دودھ کی خوشبو آتی ہے۔“

”امروزیہ۔ منہ سنبھالو۔“ جبار بھڑک اٹھا۔ بے شک تم خوبصورت اور پری جمال ہو مگر جبار تمہیں یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ تم برسرِ راہے اس کی توہین کرو۔“

”بزدلوں کی یہی نشانی ہے“ امروزیہ نے زہر خند کیا ”تم جیسے لوگ جب مجبور ہو جاتے ہیں تو ہمانے ڈھونڈنے لگتے ہیں۔“

”امروزیہ۔ بکواس بند کرو ورنہ میری تلوار تم پر اٹھ جائے گی۔“ جبار غصہ سے پاگل ہو گیا اور اس نے واقعی تلوار بے نیام کر لی۔

”چپ ہو جاؤ امروزیہ“ ہوتی نے ٹوکا مارا ”غصے میں آدمی پاگل ہوتا ہے۔“

امروزیہ نے جیسے ہوتی کی بات سنی ہی نہیں وہ اسی طرح پھر مسکرائی۔ ”شاباش جبار۔ آگے بڑھو اور ایک عورت کا سر قلم کر دو۔ شاید اسی طرح بہادروں کی فہرست میں تمہارا نام شامل ہو جائے۔“

از قوف اب تک خاموش تھا۔ اس سے نہ رہا گیا فوراً تالی بجاتے ہوئے بولا۔

”واہ۔ واہ کیا خوب تقریر کرتی ہے ہماری باجی۔ بولتی ہیں تو جسے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔“

”خاموش رہ بے وقوف“ امروزیہ نے غصہ سے ڈانٹا ”میں تجھ جیسے پاپی کی بہن نہیں بن سکتی۔ میں ایک بہادر کے ہاتھ میں ہاتھ دینا چاہتی ہوں۔“

”سوچ لو باجی۔ نقصان میں رہو گی۔ پلا پلایا بھائی مل رہا ہے تمہیں“ از قوف نے ہر منکایا۔ ”یوں بہادری میں میرا بھیجواں نہیں۔ یقین نہ ہو تو مقابلے پر آ کے دیکھ لو“ اور از قوف نے بھی تلوار کھینچ لی۔

”بہت خوب یک نہ شد دو شد“ امروزیہ بولی ”تم مل کر حملہ کرو مجھ پر تب دو دواں بھائیوں کا جھنڈا اونچا ہو گا۔“

”میں نے تمہیں بہن کہا۔ امروزیہ“ جبار نے فوراً تردید کی ”جہاں تک میری بہادری کا تعلق ہے تو امروزیہ میرے مقابلے پر کسی کو لا کے دیکھ لے۔“

”اگر ایک کے سامنے ایک آیا اور تم نے اسے مار دیا تو اس میں کیا بہادری ہوئی امروزیہ نے منہ بتایا۔“

”باجی تم فکر نہ کرو“ از قوف نے دخل دیا ”جبار بھائی کو ہم دونوں مل کے ماریں گے۔“

”تم مت بولو از قوف“ جبار نے از قوف کو خاموش کیا ”میں ایک کے بجائے دو سے مقابلہ کر سکتا ہوں۔“

”یہ بھی کوئی بہادری نہیں۔“ امروزیہ کے لہجے میں طنز تھا۔ ”دو سے تو میں بھی نپٹ سکتی ہوں۔“

”میں چار سے اکیلے مقابلہ کر سکتا ہوں۔“ جبار نے سینہ پھلایا۔

”کچھ کچھ ہے اس میں بہادری۔ مگر مکمل بہادری یہ بھی نہیں ہے۔“

”پھر تمہارے خیال میں بہادری کا کیا معیار ہے؟ جبار جل گیا۔

”میرے خیال میں بہادری یہ ہے کہ دشمن کے مورچے میں گھس جاؤ اور انہیں مار کاٹ کے صحیح سلامت واپس آ جاؤ۔“

”بے شک بے شک۔ بہادری یہی ہے مگر جبار بھائی کے ساتھ میں بھی دشمن کے مورچے میں جاؤں گا۔“ از قوف نے اپنی ٹانگ لگا دی۔

جبار نے تلوار نیام میں ڈالی۔ ”وقت آیا تو یہ بھی کر کے دکھا دوں گا۔“

”ہوتی!“ امروزیہ چیخ کے بولی ”کہہ دو جبار سے کہ اس میں مردانگی پیدا ہو گئی ہے میں آج شام سینٹ جوزف کے گر جا میں اس کا انتظار کروں گی۔“

قبل اس کے کہ جبار یا از قوف کوئی جواب دیتے امروزیہ اپنی سیلیوں کے ساتھ دوسری طرف چل پڑی۔ جبار اور از قوف حیران نظروں سے انہیں دیکھتے رہ گئے۔



ہج کے زمانے میں ہر دل زخمی ہوتا ہے جو مر گئے وہ تو ٹھکانے لگ گئے لیکن جن کے برے وہ تمام عمر کے لئے ایک عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ اس زمانہ میں تین مشہور قومیں تھیں۔ یہودی۔ نصرانی۔ مسلمان۔ یہودی راندہ درگاہ تھے انہیں نصرانی اور مسلمان دونوں ہی لغت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ عیسائی تعداد اور طاقت میں زیادہ تھے۔ مسلمانوں کی سب سے بڑی اسلامی خلافت عباسیہ روبہ زوال تھی عباسی خلیفہ کا اقتدار بغداد کی دیواروں کے اندر نہ رہ گیا تھا مگر قدرت کا یہ عجب انتظام تھا کہ جب بھی اسلامی ریاست پر زوال آیا

مسلمانوں کو غیب سے کوئی ایسا جزل یا سردار مل جاتا تھا جو اسلام کی اس گرتی دیوار کو سارا دے کر پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیتا تھا۔

اسلامی خلافت عباسیہ کمزور ہوئی تو سب سے پہلے اسے سلجوقیوں نے سارا دیا۔ سلجوقیوں کا چراغ گل ہوا تو موصل کا اطالیق خاندان جو تاریخ میں اتا ہکتہ موصل کے نام سے مشہور ہیں برسرِ اقتدار آئے امیر عماد الدین زنگی اس خاندان کا پہلا حکمران تھا جس نے نصرانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور صلیبی جنگوں میں ایسا نام پیدا کیا کہ قسطنطنیہ کا شہنشاہ کامنی نس بھی اس کے مقابلہ سے کتر کر بھاگ کھڑا ہوا۔

امروزیہ کے چار بھائی اسی جنگ میں مارے گئے تھے اور وہ مسلمانوں سے شدید نفرت کرتی تھی۔ مسلمان کو دیکھتے ہی انہیں کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا اس نے قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کے خون کا انتقام امیر عماد الدین زنگی سے لے گی لیکن اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ امیر زنگی سے کس طرح انتقام لے۔

امروزیہ نے اپنی قسم اور اپنے انتقامی جذبہ کو بہت چھپا کر رکھا تھا سال بھر تک اس کا یہ خیال رہا کہ شاید شاہ جو سلین مل باشر سے واپس آ کے الہا کو حاصل کر لے گا مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اس وقت کی دوسری نصرانی ریاست یروشلیم کی تھی۔ شاہ بالڈون نے ایک بار شہنشاہ قسطنطنیہ جان کامنی نس کے لشکر کے ساتھ امیر موصل کے خلاف مورچہ لگایا تھا۔ مگر پھر ایک شب یہ مشترکہ لشکر جس میں شہنشاہ کے ساتھ شمال کی تمام بڑی بڑی نصرانی حکومتیں تھیں چپکے سے میدان جنگ میں اپنی کئی بھاری منجنیقیں چھوڑ کے بھاگ گیا تھا یہ دیگر وجوہات کے علاوہ امیر زنگی کا اقبال تھا جس نے ایک عظیم لشکر کو میدان جنگ سے بھگا دیا۔

امروزیہ اسی انتقامی جذبہ کو سینہ میں دبائے قلعہ جعبو میں آ کے آباد ہو گئی تھی اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن امیر زنگی قلعہ جعبو پر ضرور حملہ کرے گا اور اس وقت امروزیہ بذات خود امیر لشکر کے خلاف تلوار بلند کرے گی۔ مسلمانوں سے اس قدر شدید نفرت کے باوجود امروزیہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ امیر عماد الدین زنگی کے خلاف اسے اگر کوئی قابلِ اعتماد حلیف اور ساتھی مل سکتا ہے تو وہ نصرانی کے بجائے کوئی مسلمان ہی ہو سکتا ہے شاید اسی وجہ سے وہ اب تک دوشیزہ تھی اور اپنی اس دوشیزگی کو انتقام کی قربان گاہ پر بیٹھ چڑھانے کے لئے بچا بچا کے رکھ رہی تھی۔

ہلو کشش کو امروزیہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ خواجہ سرا ہونے کی وجہ سے وہ یوں بھی عورتوں سے دور دور رہتا تھا۔ احباب کے ساتھ وہ صرف شغل میلے کے لئے عورتوں کا

رقص دیکھ لیا کرتا تھا۔ سروج میں جو کچھ پیش آیا تھا۔ اس کی ذمہ داری بھی اس نے اپنے دوستوں پر ڈالی تھی۔ انہی کی وجہ سے وہ موصل سے نکلا گیا۔ موصل میں نائب السلطنت نصیر الدین جعفر کے قتل میں وہ شامل تھا مگر اس بارے میں بھی اس کا یہی خیال تھا کہ اگر اس کے دوسرے غلام دوست اسے نہ ابھارتے تو وہ اس قتل سے دور ہی رہتا لیکن وہ دوستوں کا بھی بھوکا اور رسیا تھا۔ خواجہ سرا چونکہ عورتوں سے متنفر ہوتے تھے اس لئے وہ اپنی تمام خوشیاں اپنے دوستوں میں تلاش کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ دوستوں کی وجہ سے اس قدر ذلیل و خوار ہونے کے باوجود ہلو کشش ان کی صحبت نہ چھوڑ سکا۔ اس کے دوست لیے ہی سسی مگر اس پر جان دیتے تھے اور اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔

شام ہونے سے پہلے ہلو کشش کو معلوم ہو گیا کہ امروزیہ نامی نصرانی دوشیزہ نے جبار اور ازقوف کو سینٹ جوزف کے کلیسا میں آنے کی دعوت دی ہے۔ ہلو کشش کو مروان نے تاکید کی تھی کہ وہ اور اس کے دوست قلعہ میں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ مگر کسی غیر مسلم کو چھینرنے کی انہیں اجازت نہیں اور اگر اس سلسلہ میں اس کے پاس شکایت آئی تو وہ اپنی رعایت نہیں کرے گا۔ ہلو کشش اور اس کے دوستوں کو جعبو میں ہر طرح کا آرام آسائش میسر تھا اس لئے اس نے یہ سخت پابندی قبول کر لی تھی۔ مگر جبار جیسے ادباز اور داغ انسان ایسے عمد و بیان کی کب پرواہ کرتے ہیں۔ جبار نے جس روز سے امروزیہ کی یف سنی تھی وہ اس سے ملنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ امروزیہ کی دعوت کو وہ نظر انداز کر نہیں کر سکتا تھا لیکن جب اسے یہ بتایا گیا کہ امروزیہ اور جبار میں کافی دیر تک براہِ تو تو میں میں ہوتی رہی تو ہلو کشش بہت چرخ پا ہوا اور وہ فوراً جبار کے ٹھکانے پر ہا۔ ہلو کشش اور اس کے دوست اگرچہ مروان لنگ کی پناہ اور مسمانی میں تھے لیکن جبار ازقوف ایک مکان میں رہتے تھے اور ہلو کشش نے اپنے لئے مروان لنگ کے محل کے ب ایک جگہ پسند کی تھی یہ انتظام خود ہلو کشش کے کہنے پر کیا گیا تھا۔ اسے معلوم تھا جبار اور ازقوف رات کو بہت دیر سے واپس آنے کے عادی ہیں اور ان کے شب اری کے مشاغل بھی اور ہیں۔ اس لئے ہلو کشش نے اپنے دوستوں کے لئے الگ ش کا انتظام کرایا تھا۔

مغرب کی آذان سے پہلے ہی جبار اور ازقوف اپنے استاد اور دوست ہلو کشش کے لئے پیش ہو گئے۔ ہلو کشش ان کے گھر پیغام چھوڑ آیا تھا کہ کسی دعوت میں جانے سے وہ اس سے (ہلو کشش سے) ضرور ملاقات کریں۔ اس پیغام کے علاوہ ہلو کشش نے آدمی کو شہر کو قہوہ خانوں (جو در پردہ سے نوشی کا انتظام کرتے تھے) میں بھیج دیا تھا

کعبہ اور از قوف جہاں ملیں انہیں اس کا پیغام پہنچا دیا جائے۔

”آج دوپہر کس لڑکی سے ملے تھے جبار“ ہلو کشش غصہ ضبط کر کے مسکرا رہا تھا۔  
جبار نے از قوف کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا کے بولا ”اس غضب کی دوشیزا ہے  
استاد کہ انسان دیکھے تو بس دیکھتا ہی رہ جائے وہ ٹیڑھے چترن لمبی زلفیں، گلہابی رنگت، چلتی  
ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہماریں اس کے جلو میں ہیں اور بولتی ہے تو  
-----“

”تم چپ رہو از قوف۔“ ہلو کشش نے از قوف کو ڈانٹ دیا ”میں جبار سے بات کر رہا ہوں۔ جس لڑکی سے تم نے بات کی جانتے ہو وہ کون ہے؟“۔

”جی ہاں استاد۔ وہ لڑکی امروز یہ ہے۔ قلعہ جمعبور کی حسین ترین دو شیرازہ۔ جوانوں کے دلوں کی دھڑکن خوابوں کی پری۔ پلکیں جھپکائے تو جذبات میں تلاطم آجائے۔ دھڑکنیں تیر ہو جائیں اس کے حسن و جمال کی تو میں تعریف کر ہی نہیں سکتا آپ خود چل کے ملاحظہ فرمائے۔“ از قوف اپنی رو میں کہتا رہا اور ہلو کشش اسے گھور گھور کے دیکھتا رہا۔

”ازتوف۔ تم خاموش نہیں رہو گے۔“ بلوکشیں نے جیسے بے بسی سے کہا۔  
 ”میں نے امروزہ کی تعریف نہیں پوچھی تھی میں یہ جانتا چاہتا تھا کہ امروزہ ہے کوا  
 کس کی بیٹی ہے۔ کس مذہب سے تعلق رکھتی ہے۔“

”دختر کیسا ہے استاد“ از قوف نے پھر بولنا شروع کر دیا ”اس نے آج ہمیں کیسا دعا  
دعوت دی ہے اس لئے وہ یقیناً لہرائی دو شیرہ ہوگی۔“  
بلو کشن جھلا گیا ”از قوف تم خاموش نہیں رہ سکتے تو باہر چلے جاؤ۔“

”میں \_\_\_\_\_ میں تو کچھ بھی نہیں بولا استاد“ اور از قوف نے منہ ہاتھ رکھ لیا۔

”تم کیوں خاموش ہو جبار؟“ ہلوکشی نے جبار کو دیکھا۔  
 ”استاد مجھ سے غلطی ہو گئی۔ آپ معاف کر دیجئے“ جبار نے سچ بخش کے بجائے  
 ہی اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔

”شکر ہے کہ تمہیں اپنے جرم کا احساس ہے“ بلوکشی نے لمبی سانس لی۔  
 ”امروز یہ یہاں کی ایک بڑی مشہور اور خطرناک قسم کی عیسائی لڑکی ہے اس

متعلق مشہور ہے کہ وہ خود جوانوں کو اپنی طرف مخاطب کرتی ہے اور انہیں بھرے بازار  
 ذلیل کرتی ہے ابھی تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے یا پھر وہ کس مقصد  
 تحت اساکرتی ہے۔“

ہلوکش کو امروزیہ کے الفاظ اور آواز پر بڑا تعجب ہوا۔ اس نے یونہی پوچھا ”معلوم ہوتا ہے کہ امیر موصل کے ہاتھوں تمہیں کوئی بڑا زخم لگا ہے جیسی تم اس قدر تلملا رہی ہو۔“

”ہاں مجھے زخم لگا ہے اور ایسا زخم جو شاید قبر تک میرے ساتھ جائے گا۔“

”یہ حادثہ کب اور کیسے پیش آیا امروزیہ؟“ ہلوکش نے دلچسپی سے پوچھا۔ ”سنتا ہاجے تو تو سنو۔ میں نے تمہارے دونوں دوستوں کو اس لئے آج بلایا تھا“ امروزیہ کی گھٹوں میں غصہ سے خون اتر آیا تھا۔ ”تمہارا دوست جبار مجھے کچھ بہادر نظر آیا تھا اور میں ہر وقت بہادروں کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہوں۔ تم نے بھی اپنی بہادری کے کچھ انداز لگائے ہیں اس لئے تم بھی میری کمائی سن سکتے ہو لیکن اتنی جلدی نہیں۔ میں نے دعوت کا ہتمام کیا ہے پہلے سے فارغ ہو لو پھر اطمینان سے داستان سنتا۔“

جبار کو بھی جوش آگیا۔ اس نے تیز آواز میں کہا۔ ”لعلت بھیجو کھانے پینے پر“ میں تو لے امروزیہ کی داستان سنوں گا۔“

”میں جبار کی بات کی تائید کرتا ہوں“ ہلوکش نے تائید کی۔ ”محفل تو بعد میں بھی سکتی ہے کیوں نہ پہلے امروزیہ کی کمائی سنی جائے۔ کیوں از قوف تمہارا کیا خیال ہے؟“

”بہت معقول خیال ہے استاد“ از قوف نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”مگر کمائی میں بات کی کمی رہ جائے گی۔“

”کس بات کی کمی رہ جائے گی از قوف۔“ ہلوکش نے نرم لہجے میں پوچھا۔

”استادیہ بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔“

ہلوکش نے جبار کی طرف دیکھا۔ ”کیوں جبار وہ کون سی بات جسے میں نہیں سمجھتا؟“

”از قوف بتاتے کیوں نہیں۔“ جبار نے از قوف کو غصے سے دیکھا۔ ”کس بات کی کمی ہے؟“

”از قوف نے سر کھجایا۔ ”جبار ہم پہلی مرتبہ ملے تھے تو ہماری تعداد چار تھی لیکن

جبار نے نظریں دوڑا کے فوراً تعداد گن لی ”چار تو اب بھی ہیں۔ امروزیہ۔ میں۔ اور تم۔ چار پورے ہو گئے۔“

”اول ہوں“ از قوف نے انکار میں سر گھمایا۔ ”تعداد تو پوری ہو گئی مگر وہ چار نہیں جو اوقات میں تھے۔“

”رہتی تو ہمیں ہے مگر وہ تمہارے سامنے نہیں آتا چاہتی“ امروزیہ مسکرائی۔

”میرے سامنے کیوں نہیں آتیں کیا میں انسان نہیں ہوں۔“ از قوف اڑ گئے۔ ”ہوتی

کتنی ہے کہ وہ صرف بہادروں کو پسند کرتی ہے۔ بزدلوں سے اسے نفرت ہے۔“ امروزیہ نے یہ بات کہی تو ہنسی میں تھی مگر ہلوکش کو بہت ناگوار گزری۔

”از قوف۔ تم سخت احمق ہو۔“ ہلوکش سخت لہجہ میں بولا۔ ”تم نے انہیں یہ حق

کیوں دیا کہ وہ تمہیں بزدلی کا طعنہ دی رہی ہیں۔ ہمیں آج تک کسی نے بزدل نہیں کہا۔“

”اچھا تو آپ کو بھی بہادری کا دعویٰ ہے؟“ امروزیہ ہلوکش کو ترچھی نظروں سے

دیکھا۔

”اس میں کیا شبہ ہے لڑکی۔ ہماری بہادری کی تو قسم کھائی جاتی ہے۔“ ہلوکش نے

بڑے فخر سے کہا۔

”جیسی موصل سے بھاگ کے قلعہ جعبہ میں پناہ حاصل کی ہے“ اور امروزیہ نے پکو

اس طرح قہقہہ لگایا کہ ہلوکش کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”اتنے غرور سے باتیں نہ کرو امروزیہ“ ہلوکش غصے سے کانپتے ہوئے بولا۔ ”تم نے

ابھی ہمارے تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی ورنہ اس طرح نہ کہتیں۔“

”مجھے تلوار کی کاٹ دکھاتے ہو“ امروزیہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ”اس وقت

تمہاری تلوار نیام سے کیوں نہیں نکلی جب امیر موصل نے تمہیں شہر بدر کیا تھا؟“

ہلوکش پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس نے مشورہ کر رکھا تھا کہ امیر موصل سے

اختلاف کی وجہ سے وہ موصل چھوڑ آیا ہے مگر امروزیہ نے اس قدر اعتماد سے اس کا ہانڈ

پھوڑا تھا کہ وہ انکار نہ کر سکا۔ ہلوکش نے اقرار بھی نہیں کیا اور کھیانی بلی کھبہ نوٹ

کے مصداق امروزیہ کو دبانے کے لئے کہا ”تم نے ابھی امیر موصل کو دیکھا نہیں ہے؟“

”ٹھیک کہہ رہے ہو تم“ امروزیہ نے ٹھیکیاں بھینچتے ہوئے کہا ”تم خداوند یسوع

کی اگر کسی دن میرا اور زندگی امیر کا سامنا ہو گیا تو پھر صرف ایک ہی زندہ بچے گا وہ امیر

میں امروزیہ۔“

”بہت غصہ ہے امیر موصل پر“ ہلوکش کو امروزیہ کے غصہ پر ہنسی آگئی۔ ”اب

موصل کو دیکھ کے شیر بھی نظریں نیچی کر لیتا ہے۔“

”یہ بات بھی تم نے ٹھیک ہی کہی“ امروزیہ بول اٹھی۔ ”امیر موصل کو دیکھ کر نظریں

نیچی کرنے والے تمہارے ہی ایسے بزدل شیر ہوں گے ورنہ تمہاری جگہ اگر میں ہوتی تو

کے سینے پر چڑھ کے وہ زبان کھینچ لیتی جس زبان سے اس نے تمہیں شہر بدر کیا تھا۔“

کہا تھا وہ لفظ بہ لفظ درست تھا اس لئے وہ اسے جھٹلا بھی نہیں سکتے تھے۔ پھر بھی جبار نے اپنی دوستی کی خاطر کہا۔

”امروزیہ۔ ہم تمارے مہمان ہیں۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ قلعہ جعبو کے لوگ یا نصرانی خواتین شریف لوگوں کو گھر بلا کر اس طرح ذلیل کرتی ہیں تو ہم ادھر کا رخ بھی نہ کرتے۔“

”معزز مہمانو۔“ امروزیہ نے فوراً اپنا رویہ بدل دیا۔ ”اگر آپ لوگوں کی میرے الفاظ سے توہین ہوئی ہے تو میں معذرت چاہتی ہوں۔ دراصل میں کہنا یہ چاہتی تھی کہ جس طرح امیر موصل عماد الدین زنگی نے مجھ بے کس پر ظلم کیا ہے اس طرح اس نے اپنے وفاداروں اور جان نثاروں کو بھی ذلیل و خوار کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں امیر موصل سے انتقام لینے سے معذور ہوں مگر کم از کم میرے دل میں انتقام کی آگ تو روشن ہے لیکن مجھے تعجب اس بات پر ہو رہا ہے کہ معزز ہلوکشش اور ان کے ہمراہوں کو جو ہلوکشش کی طرح امیر کے ہی خواہ اور جانباہز ہوں گے جب موصل سے بے عزتی کے ساتھ نکالا گیا تو ان کے چہرے پر ذرا بھی شکن نہ آئی۔ ان کے دلوں میں انتقام کی کوئی چنگاری نہیں پیدا ہوئی۔“

”بس بس امروزیہ۔۔۔۔۔۔ اس قصہ کو مت چھیڑو۔“ ہلوکشش کم طرف تھا اس لئے چھٹک پڑا۔ ”اس دل میں جو لاوا بھڑک رہا ہے اس کا اندازہ تم کر ہی نہیں سکتیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں موصل میں رہ کے امیر کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ میں بہادر نہیں بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ امیر موصل بھی میری طرح ایک بہادر اور شمشیر زن ہے اور میرا یہ کہنا غلط ہو گا کہ میں تھا اس پر قابو پا سکتا ہوں۔ امیر موصل میں اس قدر جرات اور شجاعت ہے کہ وہ چار پانچ آدمیوں کا تما مقابلہ کر سکتا ہے۔ امیر عماد الدین زنگی پر دو چار آدمیوں کے ساتھ حملہ کرنا خود اپنی موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔“

”ٹھہرو ٹھہرو ہلوکشش“ امروزیہ نے اسے بچ میں ٹوک دیا۔ یہ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ امیر موصل پر چھ آدمیوں کے ساتھ حملہ نہیں کیا جا سکتا تو یہ کیسے مان لیا جائے کہ امیر موصل نے نیند کو اپنے قابو میں کر لیا ہے اور وہ ہر وقت جاگتا ہی رہتا ہے۔“

ہلوکشش اور جبار یہ بات سن کے دنگ رہ گئے۔ جبار نے اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”امروزیہ کمال کر دیا تم نے۔۔۔۔۔۔ یہ بات ہماری عقل میں کبھی آئی ہی نہیں۔“ پھر اس نے پلٹ کے ہلوکشش سے کہا۔ ”کیوں استاد۔ اگر امیر موصل پر سوتے

اس وقت امروزیہ کی سہیلی ہوتی داخل ہوئی۔ ”امروزیہ اتنی دیر ہو گئی تمہیں باتیں کرتے ہوئے کیا مہمانوں کو بھوکا ہی رخصت کر دو گی۔“

”اچھا ہوا تم خود ہیں آگئیں ہوتی ورنہ مجھے بلانا پڑتا۔“ امروزیہ نے از قوف کی طرف دیکھا۔

”کیا خاص بات تھی جو مجھے بلانا پڑتا؟“

”تمہاری یاد ہو رہی تھی ابھی۔“

”میری یاد۔ تم ہی نے مجھے کھانا لگانے کو کہا تھا۔“

”اچھا یہ بتاؤ ہوتی صبح ملاقات کے وقت ہم چار تھے نا؟“ امروزیہ کی نظریں اب تک از قوف پر لگی ہوئی تھیں۔

”ہاں چار تھے۔ بالکل چار۔“

”اور اب کتنے ہیں؟“

ہوتی نے سرسری نظر ڈال کے کہا۔ ”اب بھی چار ہیں۔ میں تم اور دو مہمان۔“

”مہمان دو نہیں تین ہیں۔ ذرا غور سے دیکھو ہوتی۔“

ہوتی نے شاید ہلوکشش کو پہلی بار دیکھا ہی نہیں تھا یا پھر اس نے جان بوجھ کے نظر انداز کیا کیونکہ صبح کی ملاقات میں ہلوکشش موجود نہ تھا۔ ”معاف کرنا امروزیہ میں نے نے مہمان کا خیال ہی نہیں کیا تھا۔“

”یہ ہیں ہلوکشش ان دونوں کے استاد۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ہلوکشش اپنی بہادری اور وفاداری کی وجہ سے امیر موصل امیر عماد الدین زنگی کے خاص آدمیوں میں تھے مگر وہ جو کہا گیا ہے کہ زیادہ مٹھاس میں کیڑے پڑتے ہیں تو امیر موصل اس سے اس قدر ناراض ہوئے کہ انہیں موصل سے بیک بینی و دو گوش نکال باہر کیا۔“

امروزیہ نے بڑے سکون سے ہلوکشش کا پورا شجرہ بیان کر دیا لیکن اس پوری تفصیل میں جو خاص باتیں تھیں وہ امروزیہ کو نہیں معلوم ہو سکیں ورنہ وہ ان کا اظہار بھی ضرور کرتی۔ پہلی اور اہم ترین بات تو یہ کہ ہلوکشش عام غلام نہیں بلکہ خواجہ سرا (نارم) غلام تھا۔ دوسرے یہ کہ ہلوکشش سے امیر کی ناراضگی کی امروزیہ نے کوئی وجہ نہیں بیان کی۔ امروزیہ نے یہ غضب بھی کیا تھا کہ اس نے ہلوکشش کے موصل سے نکالے جانے کا ذکر کیا تھا اس سے ہلوکشش کی حد درجہ توہین ہوتی تھی۔ اس لئے ہلوکشش کو اگر ایک طرف امروزیہ کی معلومات پر اگرچہ وہ ناقص تھیں۔ تعجب ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنے توہین پر وہ بہت جڑ بڑ تھا۔ جبار اور از قوف ان حالات سے واقف تھے لیکن امروزیہ نے



میں حملہ کیا جائے تو کیا رہے گا؟“

”رہے گا کیسا؟“ امروزیہ نے دخل دیا۔ ”سوتا ہوا انسان بھی مردہ ہوتا ہے اگر انسان ہمت کرے تو کیا چیز ممکن نہیں۔“

ہلوکش ابھی تک مبہوت ہوا کھڑا تھا۔ اس نے سر کو جھٹکا دے کر حواس اپنے قابو میں کئے۔ ”جبار کاش امروزیہ ہمیں اس وقت ملی ہوئی جب میں امیر کے محافظ دستے میں شامل تھا مجھے اس بات کا تو بھول کے بھی خیال نہیں آیا۔“

”سوئے میں تو میں بھی امیر کو قتل کر سکتا ہوں۔“ ازقوف نے ڈیک ماری۔

”مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب ایسا موقع آئے گا کب؟“ ہلوکش نے فکر مند

ہوتے ہوئے کہا۔

”اس کا حل بھی میں پیش کروں گی۔ چلو پہلے کھانا کھالیں۔“ امروزیہ نے اٹھتے ہوئے

کہا۔

”بالکل ٹھیک“ ازقوف نے تائید کی ”بھوک میں تو ایک ایک کے چار چار نظر آتے

ہیں۔“



یہاں سے اٹھ کے یہ لوگ دوسرے کمرے میں جا بیٹھے۔ وہاں دو میزوں پر کھانا چنا ہوا تھا۔ ایک بوڑھا ملازم خدمت پر موجود تھا۔ ازقوف نے ہوتی کو جانے کون سا اشارہ کیا کہ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”مجھے ابھی بھوک نہیں ہے امروزیہ میں کچھ دیر بعد کھاؤں گی۔“

ہوتی کی بات ختم ہوئی تھی کہ ازقوف بولے۔ ”استاد میری طبیعت بھی کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہی ہے بھوک لگی تو بعد میں کھاؤں گا۔“

جبار نے فوراً ازقوف کی بات پکڑی۔ ”ازقوف تمہیں تو ہر وقت بھوک لگی رہتی ہے عین چلنے کے وقت تم نے کہا تھا کہ کھانا کھا کے چلو پتہ نہیں وہاں کھانا کس وقت ملے اور اب تمہاری بھوک اڑ گئی ہے۔“

”واہ۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے بھوک تو بھوک ہے اس پر کس کا قابو جب جی چاہے لگ آئے اور جب تک چاہے نہ لگے۔“ اور ازقوف بھی وہاں سے ہٹ کے ہوتی کے قریب پہنچ گیا۔

”مگر تم جا کہاں رہے ہو۔“ جبار نے ہنس کے کہا۔

”تو کیا تمہارے نوالے گنوں کھڑے ہو کے؟“

”انہیں جانے دو جدھر جاتے ہیں۔“ ہلوکش نے بات ختم کر دی۔ ”ذرا گھومیں گے تو بھوک لگ آئے گی۔“

ہوتی نے بڑی بے تکلفی سے ازقوف کا ہاتھ پکڑا اور صحن میں نکل گئی۔

”کبھی کبھی ازقوف کا دماغ چل جاتا ہے مگر ہے بڑا با ادب آدمی۔ وفادار ایسا کہ

توں کے پیسنے پر خون بہانے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ہلوکش نے بڑے خلوص سے

تعریف کی اور ازقوف واقعی تھا بھی کچھ ایسا ہی۔

میز پر طرح طرح کے کھانے موجود تھے۔ امروزیہ نے مہمانوں کے لئے کئی طرح

مشروبات کا بھی انتظام کیا تھا۔ ہلوکش اور جبار بلا نوش تھے۔ قلعہ جعبو میں

ب کی تمام دکانیں نصرانیوں یا یہودیوں کے قبضے میں تھیں۔ مگر ان پر خالص شراب

ملتی تھی اور یہ لوگ کافی پینے کے باوجود تشنگی ہی محسوس کرتے تھے اس وقت ان

سامنے تقریباً اتنے ہی قسم کی شراب کی بوتلیں بھی تھیں جتنے اقسام کے کھانے میز پر

تھے۔

کھانے کے دوران ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر امروزیہ نے گفتگو کا رخ اک

موڑ دیا۔ اس نے مہمانوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”جب تک استاد ہلوکش ہم میں

ل نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت تک میں جبار کو ایک معقول اور کام کا آدمی سمجھتی

مگر اب معلوم ہوا کہ تین کے اس گروہ میں سب سے زیادہ سمجھدار اور بہادر

ن استاد ہلوکش ہیں۔“

”بے شک۔ بے شک۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے“ جبار نے بڑی بے چینی

قطع کلام کیا۔ لیکن امروزیہ اس سلسلے میں ایک بات۔“

”خاموش ہو جاؤ جبار۔“ ہلوکش چیخ پڑا۔ وہ سمجھ گیا کہ جبار امروزیہ کو یہ بتانا

ا ہے کہ ہلوکش مرد نہیں ہے بلکہ خواجہ سرا ہے یہ بات اگرچہ ٹھیک تھی لیکن

شش یہ نہیں چاہتا تھا کہ پہلی ملاقات میں امروزیہ کو ہلوکش کے اصل حالات

آگاہ کرے لیکن امروزیہ نے ہلوکش کی اس طرح تعریف کی تھی کہ جبار

شت نہ کر سکا۔ دراصل اسے امروزیہ سے پہلی ہی ملاقات میں محبت ہو گئی تھی۔

ایہ تو معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ بھی جبار کی محبت میں گرفتار ہے یا نہیں لیکن اس

ٹھ کچھ رجحان جبار کی طرف تھا ضرور۔

ہے وہ ایسا مرد ہی نہیں ہے جسے کسی عورت کی ضرورت ہو۔ اس وقت جبار اور کشش کو اپنا ظریف دوست از قوف بہت یاد آ رہا تھا ایسے موقعوں پر از قوف ہی کی معرفت طبعی سے حالات سنبھال لیتا تھا مگر وہ تو اپنی محبوبہ ہوتی کے ساتھ صحن سے لے کر باغ کی سیر کر رہا تھا۔

امروزہ اپنی جگہ بیچ تاب کھا رہی تھی۔ وہ اپنی نظروں میں ذلیل ہو گئی تھی کہ نے خود کو کسی کی آغوش میں جانے کا اعلان کیا۔ چاہے تو یہ تھا کہ آغوش شوق لے بڑھ کے اس کے اس اعلان کا استقبال کرتا مگر ہوا یہ کہ دوسری جانب بالکل ہوشی طاری ہو گئی۔ جیسے امروزہ کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی یا پھر اس کے حسن میں ئی ایسی کمی تھی جو سامنے بیٹھے ہوئے جوانوں کو اس پر مائل نہ کر سکے۔ اس احساس امت کے تحت اس نے کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ موصل کے دونوں جوانمرد کم از کم احساس جمال سے قطعی ناہیں یا پھر ان کے انتخاب کا معیار اس قدر بلند ہے کہ امروزہ جس کے ایک ابرو، اشارے پر قلعہ جمعبور کا ہر جوان اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے وہ جبار اور کشش کو ذرا بھی متاثر نہ کر سکی۔“

”امروزیہ یہ بات نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔۔۔۔۔“ جبار شاید ہلوکشس  
جو انمردی کا بھانڈا اچھوڑنا چاہتا تھا لیکن ہلوکشس نے اسے موقع ہی نہیں دیا اور  
نکال دی۔

”میں جانتا ہوں امروز یہ“ پھر اس نے جبار کو قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ ہمارے حسن کی تعریف نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے تم تو جوانوں کے دل کی دھڑکن اور بوں کی ملکہ ہو۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم جو کچھ جانتی ہو وہی ہم لوگوں کا نصب العین ہے اس لئے اس کام کا نہ تو کوئی صلہ ہے اور انعام ہم سب کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ کسی طرح امیر موصول ملک عدم سدھارے ہمارے دلوں کی آگ ٹھنڈی ہو۔ اب رہا یہ سوال کہ اگر قسمت نے وہ وقت لایا اور میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر زندہ بچ گیا تو میں تمہارے اس اعلان کی رکتے ہوئے تمہیں اپنے گروہ کے سب سے زیادہ جری اور وجیہ جوان یعنی جبار کی فوش میں بخوشی دے دوں گا اس لئے کہ میری کچھ مجبوریاں ہیں اور میں شادی نہیں سکتا۔“

بات ڈھکی کی ڈھکی رہی۔ جبار کو بھی جس بات کا ڈر تھا وہ ختم ہو گیا اور امروزیہ

امروزیہ نے اپنی بات وہیں سے شروع جہاں جبار نے قطع کلام کیا تھا۔ ”اے  
ملو کشش اور شاگرد جبار۔ میں امیر موصل کو کسی طور بھی پسند نہیں کرتی بلکہ یوں  
چاہئے کہ امیر موصل سے مجھے جس قدر نفرت ہے اس سے زیادہ نفرت کسی اور کو  
ہوگی۔“

”معاف کرنا امروزیہ تمہارا قطع کلام ہوتا ہے۔“ ہلوکشی نے اس کی بار کاٹی۔ ”مجھے آج اس بات کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ اب موصل نے واقعی مجھے بڑی ذلت سے نکالا ہے وہ تو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا لیکن اب میرے خلاف کوئی شہادت نہیں مل سکی ورنہ میں آج یہاں موجود نہ ہوتا اسی لئے آ میں یہ کہوں کہ امیر موصل سے مجھے سب سے زیادہ نفرت ہے تو تمہیں میری بات یقین کر لینا چاہئے۔“

”چلو نہ میں جیتی اور نہ تم ہارے“ امروزیہ نے بحث سے گریز کیا ”ہم دونوں، ایک ہی ہستی سے برابر کی نفرت کرتے ہیں۔ اس صورت میں ہم دونوں کے ارادے اور زیادہ مستحکم ہو جائیں گے۔ اور بہت ممکن ہے کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے جو ہم دونوں امیر موصول سے بیک وقت انتقام لے سکیں۔“

”بالکل ٹھیک۔ اس معاملے میں میں تمہارے ساتھ پورا تعاون کرنے پر تیار ہوں“ ہلو کمشن نے امروزیہ کو پیشکش کی۔

”میں بھی تم سے ہر طرح کا تعاون کرنے پر آمادہ ہوں۔ امروزہ نے بڑے جوڑ سے اعلان کیا ”میں نہیں اگر تم امیر سے میرا اور اپنا انتقام لینے میں کامیاب ہو گے ا میں اپنا مذہب تبدیل کر کے تم سے شادی کر لوں گی۔“

امروزیہ کے اس اعلان نے بلو کشی کو ہکا بکا کر دیا اور جبار حواس باختہ ہو گیا۔  
تبار کو یہ گمان ہوا کہ کہیں بلو کشی واقعی امروزیہ کو اس کے ہاتھ سے نہ لے بھاگے  
ملا لکھ پیچا رہے بلو کشی خواجہ سرا تھا اور کسی خواجہ سرا کا کسی عورت سے شادی کرنا  
یک ناممکن سی بات تھی۔

یہ گفتگو ایک ایسے موڑ پر آگئی تھی جس نے جبار اور ہلوکش دونوں کے لہلہ تالے لگا دئے تھے ہلوکش اپنے منہ سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ خواجہ سرا ہے اور عورت اس کے لئے ایک حرف بے معنی کے سوا کچھ۔ خواجہ سرا دراصل مردانگی ایک ایسا جذبہ تھا۔ جسے کوئی سننے کے لئے آمادہ بھی نہ تھا پھر بھلا جبار کیسے کہتا کہ مروزیہ نے جس شخص کی بہادری سے متاثر ہو کر اس کی زوجیت میں جانے کا اعلان

جس خاموشی کو اپنی توہین سمجھ رہی تھی وہ بھی غلط ثابت ہوئی۔ جبار نے کچھ اور وضاحت کر دی ”امروزیہ استاد نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے استاد کو اپنی مجبوریاں ہیں از قوف اور ہوتی نہ معلوم اس وقت کہاں ہیں اور اپنے مستقبل کا کیا تانا بانا بن رہے ہیں اس لئے اسے بھی معذور ہی سمجھنا چاہئے۔ پس ہمارے کامیابی کی صورت میں تم جیسا چاہو گی وہی ہو گا۔ تم پر کوئی زور نہیں دیا جائے گا۔“

”کیا کہہ رہے ہو جبار۔“ امروزیہ نے متانت سے کہا ”میں اپنا حس و جوانی داؤ پر لگا رہی ہوں یہ ایک کھلا ہوا اعلان ہے جو چاہے اس خونی کھیل میں شریک ہو سکتا ہے شرط صرف کامیابی کی ہے کامیاب ہونے والے کو اختیار ہو گا خواہ مجھے اپنے پاس رکھے یا کسی کے حوالے کر دے۔“

”خیر۔ یہ باتیں تو بعد کی ہیں۔“ ہلوکشس بولا ”ہماری اس وقت کی گفتگو سے یہ بات صاف ہو گئی کہ ہم سب کا ایک ہی مقصد ہے اب غور یہ کرنا ہے کہ اس مقصد کو حاصل کس طرح کیا جائے۔ یہ بات مشہور ہے کہ اگر دو دل مل جائیں تو وہ پہاڑوں کو توڑ پھوڑ سکتے ہیں اور ہم اس وقت دو کے بجائے تین ہیں۔“

تین نہیں چار ہیں۔ استاد جبار نے لقمہ دیا ”اب از قوف کو کیوں بھول رہے ہیں وقت پڑنے پر وہ بہت کام آتا ہے۔“

”پھر چار نہیں پانچ کو جبار“ امروزیہ نے دخل دیا۔ ”میری ہوتی نے کیا خطا کی ہے جو تم اسے چھوڑ رہے ہو۔ وہ میری راز دار بھی ہے اور جاسوسی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ دیکھنے میں خاموش نظر آتی ہے لیکن ہلوکشس کے متعلق اسی نے تمام معلومات اکٹھا کی ہیں۔“

”کیا وہ موصل گئی تھی!“ ہلوکشس نے گہرا کے پوچھا۔

”نہیں وہاں نہیں گئی۔ یہ تمام باتیں اس نے مروان لنگ کے محل سے معلوم کی ہیں“ امروزیہ مسکرائی تو جبار کے ذہن پر بجلیاں سی گرنے لگیں۔ ”اگر ہوتی موصل گئی ہوتی تو مجھے معلوم ہو جاتا کہ استاد شادی سے کیوں انکار کر رہے ہیں۔“

”خیر اس کی فکر تمہیں نہیں ہونا چاہئے۔ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے میں خود تمہیں بتا دوں گا۔ ہلوکشس اب معاملہ کی بات کرنا چاہتا تھا۔ ”امروزیہ کھانا ختم ہو چکا ہے اتنی بہت سی باتیں بھی ہو چکی ہیں مگر ہم اپنے کام کا کوئی منصوبہ نہیں بنا سکے۔ تمہارے یاد دلانے سے میرے دل میں انتقام کی آگ پہلے سے زیادہ روشن ہو گئی ہے۔“

اور یہ صرف —————۔“

”اس وقت کہیں دور سے ہوتی کا نسوانی قہقہہ سنائی دیا۔ اس آواز کو سنا سب نے لیکن پہچانا صرف امروزیہ نے ہوتی بہت خوش ہے یہ قہقہہ اسی کا ہے“ پھر کچھ سوچ کے بولی ”جبار ہم ایک مسئلہ پر گفتگو کر رہے ہیں کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ ہم ان دونوں کے آنے کا انتظار کریں یا انہیں بلا لیں؟“

”میں کم از کم از قوف کے بارے میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اس کا کسی مشورہ میں شریک ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ ہوتی کے بارے میں تم زیادہ بہتر جانتی ہو۔“ جبار نے اپنی رائے دی۔

”صلاح مشورہ کے سلسلے میں ہوتی بھی صفر کے برابر ہے میں نے تو صرف از قوف کی وجہ سے کہا تھا کہ کہیں اسے یہ بات ناگوار نہ گذرے“ امروزیہ نے بھی وضاحت کر دی۔

”اچھا تو پھر کیا صلاح ٹھہرتی ہے؟ ہلوکشس نے بات آگے بڑھائی۔“

”میرا خیال ہے کہ ہمیں صاف صاف گفتگو کرنا چاہئے کیوں جبار؟“ امروزیہ کا التفات اب جبار کی طرف زیادہ ہو گیا تھا کہ ہلوکشس نے خود کو شادی کے جھیلے سے الگ کر لیا تھا۔

”بالکل کھلی گفتگو ہونی چاہئے۔ لحاظ کرنے اور گلی لپٹی سے معاملات اکثر خراب ہو جاتے ہیں۔“ جبار نے امروزیہ کی بات کی تائید کی۔

امروزیہ نے بڑے مدبرانہ انداز سے کہا ”یہ بات صاف ظاہر ہے کہ امیر موصل پر جاگتے ہیں جبار اور ہلوکشس دونوں مل کے بھی قابو نہیں پاسکتے۔“

”اس میں کوئی شبہ نہیں امروزیہ“ جبار نے بلا جھجک کہا ”اگر میں نے ایسی غلطی کی تو سوائے سرگوانے کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا۔“

استاد کا کیا خیال ہے؟“ امروزیہ نے ہلوکشس کی طرف دیکھا۔

ہلوکشس خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے چونک کے امروزیہ کو دیکھا پھر دھیمے

لہجے میں بولا امروزیہ تمہاری باتوں سے میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا ہے اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو کامیابی کے زیادہ امکانات ہیں۔ اور ناکامی کی صورت میں بچ نکلنے کی بھی امید کی جاسکتی ہے۔“

”یہ کس طرح ہو سکتا ہے استاد۔ ذرا تفصیل سے بتائے؟“ جبار بے چین ہو گیا

ازقوف ابھی تک اس قدر بے تکلف نہ ہوا تھا کہ ہوتی اسے اس طرح خطاب کرتی مگر یہ نصرانی تہذیب اور ماحول کا اثر تھا کہ ہوتی نے تمام تکلفات بالائے طاق رکھ کے ازقوف سے صاف طور پر اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ ازقوف نے سوچا کہ ہوتی کے اس بے تکلفانہ اظہار محبت کا جواب وہ بھی اسی بے تکلفی سے دے لیکن اس کی رگ ظرافت فوراً پھڑکی۔ یہ رگ تو اس وقت بھی پھڑکی تھی جب ہوتی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ٹھٹھانا شروع کیا تھا ازقوف کے جسم پر چونیاں سے دوڑنے لگی تھیں۔ اور ہاتھ کانپنے لگا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے اوپر قابو پایا تھا یوں تو

بالکل غلط ہے میں نے امروزیہ کی آنکھوں سے جبار کی محبت جھلکتے دیکھی ہے۔  
”اور میری آنکھوں میں ذرا جھانک کے دیکھو تو —————“ ہوتی کی آواز  
جذبات سے بھرانے لگی۔

”تمہاری آنکھوں میں“ ازقوف نے جھک کے آنکھوں میں جھانکا۔ ”ان آنکھوں  
میں تو ایک خوبصورت سا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔“

”خوبصورت چہرہ۔ کس کا چہرہ ہے؟“ ہوتی کو غصہ آگیا۔

”چہرہ تو میرا ہی ہے اگر ناپسند ہو تو آنکھوں کو نکال پھینکو ہائے میں تو ڈر گئی  
تھی۔ تم بڑا بے تکاذق کرتے ہو۔ ہوتی نے روٹھ جانے والی صورت بنائی۔

”ارے تم امروزیہ کی قسم کا ذکر کر رہی تھیں کیا قسم کھائی ہے اس نے؟“ از  
قوف نے پھر چھیڑا۔

”نہیں۔ تمہیں نہیں بتاؤں گی وہ ایک راز کی بات ہے مجھے امروزیہ نے منع کر  
دیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ میں تمہاری نظروں میں بے اعتبار ہوں۔“ ازقوف نے  
فوراً اپنا رخ موڑ لیا چلو واپس چلتے ہیں سیر کا سارا لطف تم نے غارت کر دیا ہے۔“

ازقوف کا لہجہ ساٹ ہو گیا۔  
”ارے ناراض ہو گئے؟“

”ناراض اپنوں سے ہوا جاتا ہے تم مجھے اپنا کب سمجھتی ہو پھر ناراض ہونے سے  
فائدہ۔“ ازقوف نے اپنی مصنوعی ناراضگی کا اظہار بڑے طنز بھرے الفاظ میں کیا۔

”اچھا بھی سنو۔ ہے راز کی بات کسی اور کو مت بتانا۔“

”واہ۔ میں استاد اور جبار سے بھلا کیسے چھپا سکتا ہوں ہم تینوں ایک دوسرے  
کے راز دار ہیں ہماری کوئی بات آپس میں چھپی ہوئی نہیں۔“ ازقوف نے پہلے ہی

پیش بندی کر لی۔  
”میں نے ان سے چھپانے کو کب کہا ہے“ ہوتی نے فوراً بات پلٹ دی۔ ”میں  
نے تو یہ کہا ہے کہ کسی اور سے نہ کہنا۔“

”ٹھیک ہے جبار اور استاد سے ضرور کہوں گا اگر وہ کسی اور کو بتادیں تو میں ذمہ  
دار نہیں۔“ ازقوف کو اور زیادہ اکرانے کا موقع مل گیا۔

”بھئی حد ہو گئی ازقوف۔“ ہوتی چڑ گئی ”تم ہر بات میں مین میخ نکالتے ہو۔“  
”میں مین میخ نکالتا ہوں یا تم ہر بات میں کیڑے ڈالتی ہو۔“ ازقوف کے چہرے

سے جھوٹا یا سچا غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ ”ایک تو یہ کہہ کر تم نے میری توہین کی کہ کسی  
سے نہ کہنا کیا میں تمہارے اعتماد کے قابل نہ تھا اگر اعتماد نہ ہو تو اس سے بات کہنا ہی  
نہ چاہئے۔ بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ راز صرف اس وقت تک راز ہے جب تک  
تمہارے سینہ میں ہے سمجھ گئی نا۔“

”بڑے بوڑھے یہ کہتے ہوں گے۔“ ہوتی کب خاموش رہنے والی تھی ”لیکن  
عقل مندوں سے میں نے یہ سنا ہے کہ اپنے مرض کو تجربہ کار حکیم سے اور اپنا راز سچے  
دوست سے نہ چھپانا چاہئے ورنہ نقصان ہو گا۔“

”اچھا بھئی تمہاری بات سچی۔ اب کو کیا بات ہے؟“ ازقوف زچ ہو کے رہ گیا۔  
”بات یہ ہے کہ —————“ پھر ہوتی اک دم رک گئی اور غور سے ادھر ادھر  
دیکھنے لگی اس نے بات کو ذرا دبا کے کہنا شروع کیا ”یہ جو اپنی امروزیہ ہے  
نا۔“

”ہاں ہاں کہو۔ میں برہ نہیں ہوں۔“

”ہاں تو بات ہے کہ یہ جو امروزیہ ہے نا۔“

”کچھ آگے بھی کہو گی یا ہے نا۔“ ہے نا کرتی رہو گی؟“ ازقوف بگڑ گیا ”یہ تم  
لوگوں کا گھر ہے تمہارے لوگ یہاں رہتے ہیں پھر تم کس سے ڈر رہی ہو؟“

”اچھا خیر سنو۔ وہ جو الہا کی جنگ ہوئی نا۔“ ہوتی ایک لمحے کے لئے  
رکی۔ ”پھر وہی نا۔“ اب آگے کہنے کی ضرورت نہیں۔ نہیں سنتا ہے مجھے  
راز تمہارا“ ازقوف کو واقعی غصہ آگیا۔

”چلو۔“ نا کو سچ سے نکال دیا تو الہا میں جب جنگ ہوئی اس وقت امروزیہ  
قلعہ میں تھی۔ اس کے چار بھائی تھے۔ بڑے کڑیل جوان ایک سے ایک خوبصورت  
چوڑے سینے لائے قد۔“

”سرخ و سفید رنگت، گھونگر والے بال۔“ ازقوف نے دخل دیا ”تم بات بتا رہی  
ہو یا امروزیہ کے بھائیوں کی تعریف میں قصیدہ پڑھ رہی ہو۔ مرد کو اگر جوان کہہ دیا  
بائے تو تمام خوبیاں اس میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں۔ آگے بتاؤ کیا ہوا ان چاروں  
کڑیل جوانوں کا؟“

”ہوا کیا۔ بس ایک ایک کر کے وہ ہو گئے۔“ ہوتی نے اس قدر اختصار سے کام  
لیا کہ بات ہی آدمی رہ گئی اور مطلب الجھ کے رہ گیا۔

”میں سمجھا نہیں۔ یہ وہ ہو گئے سے تمہارا کیا مقصد ہے؟“

”صرف سمجھنا نہیں بلکہ زور دے کے انہیں عملی قدم اٹھانے پر مجبور کرنا“  
 ہوتی ہے از قوت پر اس کام کی اہمیت ظاہر کی۔ ”تمہارے استاد کا دل بھی تو امیر زرنگی  
 نے دکھایا ہے۔ کیا ان کے دل میں انتقام کا جذبہ نہ ہو گا؟“۔

”مشکل نہیں۔ ناممکن۔۔۔۔۔“ ازوف نے پورا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی اچھا ہوا کہ میں بک رہا تھا ورنہ اگر میں کچھ کہہ رہا ہوتا اور تم سن رہی ہو تیں تو ضرور پتھر کی ہوجاتیں اچھا تو میں کیا کہہ رہا تھا؟“

”کہہ رہے تھے کہ میں واپس چلنا چاہئے۔“ ہوتی نے ٹال دیا۔  
”بالکل ٹھیک کہا۔ ہمیں واپس چلنا چاہئے کیونکہ مجھے سخت بھوک لگی ہے۔“  
”مگر کھانا تو اب تک ختم ہو چکا ہو گا۔“

جب یہ دونوں امروزیہ کے پاس پہنچے تو کھانا واقعی ختم ہو چکا تھا۔ امروزیہ نے ہوتی کو گھور کے دیکھا لیکن ہوتی اس طرح مسکراتی جیسے کہہ رہی ہو کہ سب ٹھیک ہے رات کا پی ہو چکی تھی ہلوکش اور جبار کئی صراحیاں لٹھا چکے تھے۔ ازقوف کے ابس آتے ہی ہلوکش نے جھومتے ہوئے امروزیہ سے اجازت حاصل کی اور دونوں دستوں کو لے کر واپس ہوا۔

ادھر ہوتی نے اپنی اور ازقوف کی تمام گفتگو سے امروزیہ کو مطلع کیا اسی طرح امروزیہ نے اس منصوبے کی تفصیل بیان کی جو اس کے اور ہلوکش وغیرہ کے درمیان طے پایا تھا۔ دونوں اپنی اپنی کامیابی پر خوش تھیں۔ انہیں مستقبل میں بھی کامیابی کی بدھنھی کیونکہ وہی کامیابی ان کی زندگی میں ہماریں لا سکتی تھی۔

موصل کے حالات پر سکون ہوئے تو امیر عماد الدین زنگی کو دمشق کی یاد پھر ستانے لگا۔ رہا پر قبضہ نے اس کے اور ابس کے لشکر کے حوصلے بڑھائے تھے۔ اسے معلوم تھا رہا کا شاہ جو سلین، تل باشر میں ہے اور رہا نکل جانے کے بعد اس کی واپسی کے لئے پیر مار رہا ہے وہ تل باشر کے لئے کوئی فیصلہ کرنے والا تھا کہ موصل سے اس کے نائب قتل کی خبر آئی اور اسے تل باشر کا خیال ایک طرف رکھ کے موصل آنا پڑا۔ موصل حالات تو اس کے واپس آنے کی خبر سن کے ہی ٹھیک ہو گئے تھے۔ پھر بھی امیر نے ل پہنچ کے اپنے نائب کے قتل کے سلسلے میں چند آدمیوں کو قتل کرایا اور ہلوکش کو ر کر دیا گیا امیر کے ان اقدام سے موصل کے حالات بالکل پر سکون ہو گئے اور امیر کو کے خلاف منصوبہ بندی کرنے کا موقع ملا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس دفعہ دمشق پر اس قدر سے حملہ کیا جائے کہ ناکامی یا واپسی کا کوئی امکان نہ رہے۔

انہی دنوں امیر عماد الدین زنگی کا دماغی سکون اس وقت برباد ہو گیا جب اس کے ماٹے اطلاع دی۔ ”اپنے محترم۔ ہلوکش یہاں سے بھاگ کے مران لنگ کی پناہ میں ہے۔“

”جذبہ ہے مگر وہ ٹھنڈا پڑا ہے میں اس کے نیچے آگ جلاؤں گا پھر جب وہ گرم ہو گا تو استاد دن میں بھی آسان کے ستارے توڑ لائیں گے۔ تم میرے استاد کی شجاعت اور دلیری کو نہیں جانتی۔“ ازقوف نے شیخیاں بکھارنا شروع کر دیں۔

”کیا تمہارے استاد اتنے ہی بہادر ہیں؟“ ہوتی نے اپنے اطمینان کے لئے پوچھا۔  
”اتنے بہادر کیا چیز ہے۔ وہ جتنے بہادر ہیں اس سا بہادر پورے قلعہ جعبو میں کوئی اور نہیں۔ یقین نہ ہو تو دنگل کرا کے دیکھ لو۔ تلوار، نیزہ بازی، کشتی لڑنے میں تو ان کا ثانی ہی نہیں۔ اگر جعبو میں کوئی پہلوان ہو تو مجھے بتاؤ۔ میں دونوں کا جوڑ کرا دوں گا۔ پھر دیکھنا کون بہادر ہے۔ اور میدان چھوڑ کے کون بھاگتا ہے۔“

”بس بس۔ میں سمجھ گئی۔ اب تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنے استاد کو اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ امیر موصل امیر عماد الدین زنگی کے خلاف کام کرنا شروع کر دیں۔ یہ میری درخواست ہے۔“

ہوتی نے واقعی بڑی لجاجت سے کہا۔  
”تم بڑی خوش قسمت ہو ہوتی۔ کام پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔“ ازقوف ہر لمحے بے تکلف ہوتا جا رہا تھا۔ ”تمہاری کامیابی یقینی ہے اس لئے کہ تم چلتی گاڑی پر سوار ہوئی ہو اور گاڑی اپنی منزل پر پہنچنے والی ہے کنارہ صاف نظر آ رہا ہے بس ساحل پر کشتی لگنے کی دیر ہے پھر تمہاری پانچوں انگلیاں کھلی ہیں اور سر کڑھائی میں ہو گا۔“  
ازقوف نے اتنی تیزی سے بولنا شروع کیا کہ ہوتی حیران رہ گئی۔  
”میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ آخر تم کتنا کیا چاہتے ہو؟“ ہوتی انگلیاں چٹکانے لگی۔

”میری باتیں ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتیں جو سمجھتا ہے وہ پتھر کا ہو جاتا ہے۔“

”ہائیں کیا کہہ رہے ہو ازقوف؟“  
”وہی کہہ رہا ہوں جو تم سن رہی ہو اگر کوئی اور ہوتا تو اب تک پتھر کا ہو گیا ہوتا مگر تم پر میرا طلسم اثر نہیں کرے گا کیونکہ تم میری۔“  
”ازقوف۔ ہوش میں آؤ؟“

”میں بالکل ہوش میں ہوں۔ ہاں میں کیا کہہ رہا تھا؟“  
”میں نہیں جانتی تم کیا بک رہے تھے؟“ ہوتی جھلا اٹھی۔

امیر موصل کے اس خط یا المٹی میٹم نے قلعہ جعبہ کے حاکم مروان لنگ کے حوا  
اذا دئے وہ امیر کی طاقت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اتنے بڑے اور خطرناک امیر۔  
پڑوس میں اپنا وجود باقی رکھنا ہی کار دارد تھا نہ کہ اب امیر غضب ناک ہو گیا تھا۔ اس۔  
پہلے بھی امیر کئی بار ناراض ہوا مگر مروان لنگ نے خوشامد در آمد کر کے جان بچالی تھی  
ایسی ہی ترکیبوں سے قلعہ جعبہ کا وجود اب تک برقرار تھا۔ لیکن اب تو بات بالکل



”گھبراؤ نہیں ہوتی۔ از قوف بس آتا ہی ہو گا“ امروزیہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ہم

”لیکن یہ خطرہ کچھ دن کے لئے ضرور ٹل گیا اس دوران ہم اپنے منصوبہ کو نئی شکل دیں گے۔ اب ہمیں جال بھینکنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ شکار خود ہی جال کی طرف آنے کے لئے پرتل رہا ہے۔ ہاں تم ذرا احتیاط کرنا۔ ہو سکتے تو کلیانہ خود جانا اور نہ اپنے ساتھیوں کو جانے دینا تاکہ امیر موصل تک یہی خبریں پہنچیں کہ ہلو کشس یا تو جعبہ میں پوشیدہ ہے یا خوف کی وجہ سے کسی اور طرف نکل گیا ہے۔“

”سب لوگ خاموش ہو جاؤ۔ دیکھو استاد کیا کہہ رہے ہیں؟“ امروزیہ نے فوراً ہلوکش کی طرف توجہ دی ”فرمائیے ہم لوگ گوش بر آواز ہیں؟“۔

”امروزیہ تمہیں معلوم ہے کہ پچھلے دو چار دن میں یہاں کیا تبدیلی ہوئی ہے؟“ ہلوکش نے بھی سب کو چھوڑ کے امروزیہ کو مخاطب کیا وہ دراصل بات کرنے ہی امروزیہ سے آیا تھا۔

”کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی“ امروزیہ نے بے پروائی سے جواب دیا۔  
”پہلی تبدیلی یہ ہے کہ موصل سے امیر زنگی کا قاصد ایک خاص پیغام لے کے آیا تھا۔“

”قاصد آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟“ امروزیہ نے اب بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔

”فرق یہ پڑتا ہے کہ امیر زنگی نے مروان لنگ سے مجھے اور میرے دوستوں کو طلب کیا ہے اس نے حکم دیا ہے کہ ہلوکش اور اس کے ساتھیوں کو پایہ زنجیر موصل کے دربار میں بھیجا جائے ورنہ قلعہ جعبو کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے گی۔“ ہلوکش نے شکایت بھری نظروں سے امروزیہ کو دیکھا۔ ”امروزیہ کیا یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ کیا ہم لوگوں کی گرفتاری کا تمہیں کوئی افسوس نہ ہو گا؟“۔

ہلوکش کا لہجہ بڑا تلخ اور طنزیہ تھا جبار اور ازقوف دنگ رہ گئے لیکن امروزیہ نے شاید ہلوکش کے لہجے کی تسخیر کو محسوس ہی نہیں کیا۔ اس نے بڑے اطمینان سے کہا۔ ”ہر بات کی اپنے وقت پر اہمیت ہوتی ہے ابھی ہلوکش اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کا وقت نہیں آیا۔ اگر ایسا وقت آگیا تو قلعہ کے لوگ دیکھیں گے کہ امروزیہ اپنے دوستوں کو بچانے کے لئے کس طرح سینہ سپر ہوئی ہے۔“

”امروزیہ کے دعوے پر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔“ ہلوکش نے زہر خند کیا ”شاید امروزیہ ہماری گرفتاری کا انتظار کر رہی ہیں اور انہیں جو قدم اٹھانا ہے وہ ہمارے گرفتار ہونے کے بعد اٹھائیں گی یعنی جب سانپ نکل جائے گا تو یہ لیکر کو پیش کی۔ سن لیا تم نے میرے دوستوں میں نے امروزیہ کو اپنا ہمدرد سمجھا تھا لیکن یہ ہماری گرفتاری کی شہر ہیں۔“

”ہلوکش!“ امروزیہ کو شاید اب تسخیر کا احساس ہوا۔ وہ جھج سی پڑی۔ ”غلط بات مت کہو۔ جعبو کا قلعہ دار شاید تمہیں کسی وقت گرفتار کرا دے لیکن یاد رکھو کہ امروزیہ یہاں ہرگز نہیں ہونے دے گی۔ تمہارے طرف جو ہاتھ اٹھے گا وہ کاٹ دیا جائے گا۔“

”یہ دوسرا دعویٰ ہے“ اور ہلوکش نے تقبہ لگایا۔ ”امروزیہ تم دعوے کرتی رہو گی ورنہ ہمیں گرفتار کر کے موصل روانہ کر دیا جائے گا۔“

”میرا دعویٰ غلط ہے تو تمہاری بات اس سے زیادہ غلط ہے ہلوکش۔“

امروزیہ نے بڑی سختی سے تردید کی۔ ”میری آنکھیں بند نہیں ہیں قلعہ جعبو اور

بھی اس کے بغیر اداس ہو رہے ہیں۔“  
”میں کیوں گھبرانے لگی۔ ازقوف میرا کون لگتا ہے؟“ ہوتی جھینپ گئی۔  
”کیوں جھوٹ بول رہی ہو۔ دل پہ ہاتھ رکھ کے بتاؤ۔ کیا یہ محفل سونی سونی نہیں ہے؟“ امروزیہ اسے چھیڑنے پر ادھار کھائے بیٹھی تھی۔

”میرا دل اتنا کمزور نہیں ہے امروزیہ“ ہوتی نے سنبھل کے کہا۔ ”میں اجنبیوں کو دل میں اتنی جگہ نہیں دیتی کہ بعد میں پچھتا پڑے۔ پردیسیوں کا بھلا کیا اعتبار۔ یہ دھوپ کا پرچھاواں ہوتے ہیں۔ ابھی اس جگہ ابھی اس جگہ۔“

امروزیہ نے بھری نظروں سے جبار کو دیکھا۔  
”میں تمہاری تائید نہیں کر سکتا۔ ہوتی جبار نے فوراً مخالفت کی ”اگر پردیسیوں کی ولداری کی جائے تو وہ دیس والوں سے زیادہ وفادار ثابت ہوتے ہیں۔ دیس والے صرف یار کی گلی کے چکر لگاتے ہیں مگر دیسی اور پردیسی جیتے جی گلی کے چکر لگاتے ہیں اور مرتے ہیں تو وصیت کر کے کہ انہیں اسی گلی میں دفن کیا جائے۔“

ہوتی نے شکلیوں سے امروزیہ کو دیکھا۔ ”جبار بھائی آپ نے اچھا فیصلہ کیا میں وعدہ کرتی ہوں کہ اگر آپ کی قبر اس گلی میں بنی تو میں بلا ناغہ چراغ جلائے آیا کروں گی۔ خواہ کسی کو برا ہی کیوں نہ لگے۔“

”جبار کی قبر یہاں بنے نہ بنے لیکن تیری قبر اسی گلی میں بنے گی۔“  
امروزیہ جل گئی تھی۔

اس موقع پر ایک دم ازقوف کے آنے کی خبر ملی۔ اس کا سب کو انتظار تھا۔ ازقوف خراماں خراماں چلے آ رہے تھے۔ وہ دروازے پر تھے کہ امروزیہ نے کہا ”لہجے وہ تشریف لائے جن کا انتظار تھا۔“

”شکریہ مس امروزیہ۔ مگر یہ بتائیے کہ قبر کو کون یاد کر رہا تھا کون خوش نصیب اس کو بچے میں اپنی قبر بنانا چاہتا ہے۔“ ازقوف نے داخل ہوتے ہوئے جواب دیا۔

”اگر یہ فخر آپ حاصل کرنا چاہیں تو کسی کو اعتراض نہ ہو گا۔“ امروزیہ نے فوراً کہا۔  
”سبحان اللہ سبحان اللہ“ کیا خوبصورت مشورہ ہے مگر اس کی اجازت ہوتی سے حاصل کرنا ہو گی۔“ ازقوف نے بھی بھرپور جواب دیا۔

”کیوں ہوتی کی اجازت کی کیوں ضرورت ہو گی کیا وہ قبرستان کی ٹھیکیدار ہے؟“  
”یہ تو میں نہیں جانتا لیکن کم از کم میری قبر کے لئے آپ کو ہوتی سے اجازت ضرور لینا ہو گی۔“ ازقوف نے شوخ نظروں سے ہوتی کو دیکھا۔

ہلوکش بہت دیر سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتا مگر اس نوک چھوٹک کی وجہ سے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دے رہا تھا آخر ہلوکش نے جھلا کر دخل دیا۔ ”یہ فضول باتیں ہوتی ہی رہیں گی یا کوئی کام کی بات بھی ہو گی۔“

سب نے گھبرا کے ہلوکش کی طرف دیکھا۔ یہ لوگ اپنی باتوں میں ہلوکش کو بالکل

موصول میں پس پردہ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے تمہاری بہ نسبت میں زیادہ واقف ہوں۔  
 ”میں نے جو کہا ہے وہ غلط ہے کیا“ ہلوکش کا جیسے دماغ الٹا ہو گیا۔ ”میں غلط بات  
 زبان سے نہیں نکالتا امروزیہ۔ اور میں یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ کوئی دوسرا میرے سامنے  
 غلط بیانی کرے۔“

”ہلوکش مجھ سے بڑھ بڑھ کے باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔“ امروزیہ کو بھی غصہ  
 آگیا۔ ”تم سوچ رہے ہو کہ موصول سے آنے والے قاصد کی مجھے خبر نہیں۔ یہ خیال اپنے  
 ذہن سے نکال دو۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ قلعہ دار مروان لنگ نے امیر کو کیا جواب  
 بھجوایا ہے۔“

”اچھا تو پھر بتاؤ کہ مروان لنگ نے قاصد کو کیا جواب دیا ہے؟“ ہلوکش کا خیال تھا  
 کہ اس طرح وہ امروزیہ کو جھٹلا کے ذلیل کر دے گا مگر وہاں معاملہ الٹا ہو گیا۔  
 ”سنو ہلوکش“ امروزیہ پر سکون لے جے میں بولی۔ ”میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں وہ  
 باتیں بتاؤں جو تمہیں مروان لنگ سے معلوم ہو سکتی ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو  
 قلعہ دار دہری بازی کھیل رہا ہے یا تم مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہو۔ موصول کے قاصد  
 نے امیر زنگی سے وہی مطالبہ کیا تھا جس کا تم نے مجھ سے ابھی ذکر کیا ہے لیکن قلعہ دار  
 مروان لنگ نے قاصد کو جو جواب دیا ہے وہ تم مجھ سے چھپا رہے ہو حالانکہ مجھے سب  
 باتیں معلوم ہیں تم مجھ پر طنز نہ کرو ہلوکش ہم دونوں کا مقصد ایک ہی ہے اس لئے ہمارے  
 درمیان کوئی پردہ نہ ہونا چاہئے۔ قلعہ دار نے اس وقت قاصد کو یہ کہہ کر ٹال دیا ہے کہ  
 ہلوکش کسی جگہ پوشیدہ ہو گیا ہے اور اسے بہت جلد تلاش کر کے موصول بھیج دیا جائے  
 گا۔“

ہلوکش اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔ ”امروزیہ یہ بات تم سے کس نے کہی تمہارا  
 قلعہ دار کے پاس آنا جاتا تو نہیں؟“

مجھے یہ باتیں کس ذریعہ سے معلوم ہوئیں اس کے بتانے کی ضرورت نہیں۔  
 امروزیہ کے لے جے میں بڑا استقلال تھا۔ ”رہا قلعہ دار کے پاس میرے آنے جانے کا  
 سوال تو اس کے بارے میں صرف یہ کہہ سکتی ہوں کہ میں اس سے صرف ایک بار ملی  
 تھی۔ میرے اور اس کے درمیان یہ زبانی کلامی معاہدہ ہوا ہے کہ اگر موصول نے کسی وقت  
 قلعہ جمعبہ پر حملہ کیا تو قلعہ کی تمام عیسائی آبادی مدافعت کے لئے اپنی جانیں پیش کر دے  
 گی۔“

”میں معافی کا خواستگار ہوں امروزیہ۔“ ہلوکش نے فوراً معذرت کی ”مجھے نہیں  
 معلوم تھا کہ تم اس قدر طاقتور ہو۔ پھر تو تم موصول کے تمام حالات سے بھی بخوبی واقف ہو  
 گی؟“

”کیوں نہیں ہلوکش میرے آدمی ہر جگہ کام کر رہے ہیں۔ لیکن اتنا کچھ حاصل  
 ہونے کے باوجود میں اب تک امیر موصول سے انتقام نہیں لے سکی۔“ امروزیہ نے تمام

رازوں سے پردہ اٹھا دیا۔ ”مجھے محسوس ہوا کہ بغیر کسی جواں مرد مسلمان کے تعاون کے میں  
 اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جبار اور تم سے ملنے اور اس قدر تعلقات برعہانے کا  
 بھی یہی مقصد ہے۔ عیسائیوں میں بھی اچھے اچھے جواں موجود ہیں لیکن وہ امیر موصول کا نام  
 نکلے ہی دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ میں انہیں قابل اعتماد نہیں سمجھتی۔“

ازقوف بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔ ”حضرات اور حاضرین میرا مطلب ہے کہ اس محفل  
 میں موجود مرد اور خواتین۔ یعنی میں ————— آپ ————— استاد —————  
 جبار —————۔“

”کیا بکواس شروع کر دی ازقوف۔“ جبار نے چیخ کے کہا۔ ہر وقت ہنسی مذاق اچھا  
 نہیں ہوتا۔ دیکھتے نہیں کہ استاد اور امروزیہ میں کیسی سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔

”لیکن میں اور آپ بھی یعنی ہم لوگ کسی بھی سنجیدہ گفتگو کو اتنی دیر تک طول دینے  
 کے حق میں نہیں اور موضوع تبدیل کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔“ اور ازقوف نے فوراً  
 اپنا ہاتھ اونچا کر دیا۔ ”آپ لوگ میری تائید میں ہاتھ اٹھائیے۔“

”جبار اور امروزیہ کو ایک ساتھ ہنسی آگئی۔

”میں ازقوف کی تائید کرتا ہوں۔“ جبار نے بھی اپنا ہاتھ اٹھا دیا۔

اب ازقوف کے ہنسنے کی باری تھی۔ ازقوف کی باتوں پر دوسرے تو ہنستے تھے لیکن وہ  
 بہت کم ہنستا تھا مگر اس وقت اسے زور کی ہنسی آئی۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”دوستو آپ  
 کو وفاداری کی حد اور انتہا دیکھنا ہو تو ادھر دیکھئے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے ہوتی کی طرف  
 اشارہ کیا۔

ہلوکش امروزیہ اور جبار کی نظریں بے ساختہ ادھر اٹھ گئیں اور وہ تینوں ایک ساتھ  
 ہنس پڑے۔ ہوتی کا ایک ہاتھ ازقوف کی تائید میں اوپر اٹھا تھا اور وہ سر جھکائے شرم سے  
 دہری ہوئی جا رہی تھی۔

ہلوکش اپنی جگہ سے اٹھ کے امروزیہ کے پاس آگیا۔ ”امروزیہ تمہارے جاسوس  
 بڑے زبردست معلوم ہوتے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ امیر زنگی کا حملہ ہو گا کہ نہیں اور اگر حملہ ہو  
 گا تو کب تک متوقع ہے؟“

”استاد کو فکر کی ضرورت نہیں لیکن یقین دلاتی ہوں کہ اگر امیر عماد الدین زنگی نے  
 کسی وقت قلعہ جمعبہ کا رخ کیا تو اس کی خبر پہلے مجھے پھر قلعہ دار مروان لنگ کو ہوگی۔“

امروزیہ نے اس قدر وثوق سے کہا گویا قلعہ جمعبہ پر حملہ کرتے وقت امیر زنگی  
 امروزیہ سے صلح مشورہ کرے گا۔

”ٹھیک ہے مجھے تمہاری بات کا اعتبار ہے امروزیہ“ ہلوکش نے سینہ پر ہاتھ رکھ کے  
 کہا۔ ”اب ایک بات کا مشورہ بھی دو امروزیہ“ ہلوکش نے جیسے امروزیہ کو اپنا استاد تسلیم  
 کر لیا تھا۔



”امروزیہ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔“ جبار اس کے ہاتھ کے لمس سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ ”ایک طرف تم کہتی ہو کہ عہد پورا ہونے سے پہلے تم مجھ سے شادی نہیں کر سکتیں دوسری طرف مجھے شائع بھی نہیں کرنا چاہتیں۔ آخر ان دو متضاد باتوں کا کیا مطلب ہے؟“

”ان باتوں کا مطلب ہے کہ مجھے تم سے محبت ہے میں نہ تو بھائیوں کے انتقام سے ہاتھ اٹھا سکتی ہوں اور نہ تمہیں ہتھیار کر سکتی ہوں۔“ اس کے ساتھ امروزیہ نے اپنے دوسرے ہاتھ سے جبار کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا۔

جبار محبت کے دھارے میں بے خود ہو کر بننے لگا۔ وہ یہ بھول ہی گیا کہ ابھی چند ساعت پہلے ایک اجنبی جوان اور امروزیہ ہنس ہنس کے باتیں کر رہے تھے امروزیہ اسے محبت کی گولیاں کھلا کر اندر چلی گئی۔ جبار کچھ دیر خلا میں گھومتا رہا پھر چپ چاپ واپس آ گیا۔

امروزیہ یہ سمجھتی تھی کہ وہ بہت چالاک ہے۔ اس کے موصل کے چپے چپے میں جاسوس موجود ہیں جو اسے شر کی خبروں کے علاوہ عمل کے اندر باہر کی بھی خبریں پہنچاتے رہتے ہیں لیکن یہ اس کی غلطی تھی۔ امیرزنگی نے قلعہ جمعیہ اپنا قاصد اس لئے بھیجا تھا کہ وہ مروان لنگ کی طاقت کا اندازہ کرنا چاہتا تھا دوسرے اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ ہلوکش قلعہ میں موجود ہے یا نہیں وہ بات اسے مروان کے ذریعہ سے معلوم ہو گئی۔ مروان نے یہ بہانہ کیا کہ ہلوکش اور اس کے ساتھی کہیں پوشیدہ ہو گئے ہیں اس کا صاف مطلب تھا کہ ہلوکش قلعہ جمعیہ پہنچ گیا ہے اس طرح امیرزنگی نے ایک معمولی جنگی چال چل کے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جسے معلوم کرنے کے لئے اسے زیادہ وقت درکار ہوتا۔

امیر عماد الدین زنگی نے اب دوسری چال چلی۔ ایک دن اس نے بحرے دربار میں اعلان کیا کہ قلعہ جمعیہ سے قاصد واپس آگیا ہے۔ قلعہ کے حاکم نے یقین دلایا ہے کہ ہلوکش کو جلد از جلد گرفتار کر کے موصل روانہ کر دیا جائے گا اس لئے جمعیہ کی مہم منسوخ کی جاتی ہے لیکن لشکر تیار ہو چکا ہے اس لئے کل ہم قلعہ جمعیہ کی طرف روانہ ہوں گے جہاں شاہ جو سلین چھپا بیٹھا ہے۔ امیرزنگی نے صرف زبانی ہی اعلان نہیں کیا بلکہ دوسری صبح کو اس کا لشکر واقعی قلعہ جمعیہ کی طرف جا رہا تھا یہ ایک اہم خبر تھی۔ اس کا چرچا ہوتا ہی تھا۔ امروزیہ کے آدمی اس خبر کو لے اڑے اور بھانگ بھانگ قلعہ جمعیہ پہنچ کے امروزیہ کو اطلاع دی۔ امروزیہ ایک کڑھم کی عیسائی عورت تھی۔ مسلمانوں سے اس نے اپنا مطلب پورا کرنے کے لئے تعلقات بدھار رکھے تھے اسے الہا اور قلعہ جمعیہ سے اب تک محبت تھی چاہئے تو یہ تھا کہ اس وقت وہ قلعہ جمعیہ میں تھی اس لئے پہلے حاکم قلعہ مروان لنگ کو مطلع کرتی مگر اس نے ایک تیز رفتار سوار قلعہ جمعیہ کی طرف روانہ کر دیا۔ جس نے

قلعہ جمعیہ کے شاہ جو سلین کو امیرزنگی کے ارادے سے آگاہ کر دیا تھا۔ امیرزنگی کو موصل سے روانہ ہوتے دیکھتے ہوئے تھے مگر یہ نہیں کہ وہ کس قدر ست رفتاری سے سفر کر رہا تھا کہ وہ قلعہ جمعیہ کی طرف پہنچ چکا تھا۔ شاہ جو سلین کے ہاتھ پیر بھول گئے تھے۔ وہ ہوشیار تو پہلے سے تھا لیکن اسے امیرزنگی کی آمد کی خبر اس قدر اچانک ملی تھی کہ گھبرا گیا اور جس قدر فوج اکٹھا ہو سکی وہ سرحد پر بھیج دی۔ جو سلین امیر موصل سے ایک جنگ قلعہ کے باہر کرنا چاہتا تھا۔ جہاں تک قلعہ کا تعلق تھا جو سلین نے اسے اس قدر مضبوط کر دیا تھا کہ قلعہ ایک طویل عرصہ تک امیر کے حملوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

دوسری طرف قلعہ جمعیہ میں امروزیہ اور جبار میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔ جبار چاہتا تھا کہ امروزیہ اس سے فوراً شادی کر لے کیونکہ امیر موصل کے قلعہ جمعیہ کی طرف آنے کی ابھی کوئی خبر نہ تھی جبکہ امروزیہ اس بات پر اڑی ہوئی تھی کہ اس کے اور جبار کے درمیان جو زبانی معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے امروزیہ اور جبار میں صرف اس صورت میں شادی ہوگی جب جبار امیر موصل کو شہید کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ یہ مقدمہ ہلوکش کے سامنے بھی پیش ہوا تھا اور اس نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ زبانی معاہدہ کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ ہی قلعہ میں ایک اور گل کھلا تھا۔ یہ گل ازقوف اور ہوتی نے کھلایا تھا۔ ہوتی اپنی مرضی سے مسلمان ہو گئی تھی۔ اور اس نے قاضی کے سامنے پہنچ کے ازقوف سے شادی کر لی تھی۔ ان دونوں کی شادی کے امروزیہ اور جبار دونوں خلاف تھے مگر وہ کچھ نہ کر سکتے تھے ازقوف نے ہلوکش اور جبار کا ساتھ چھوڑ کر ایک مسلم محلہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔

قلعہ جمعیہ میں رونما ہونے والے یہ ذاتی قسم کے واقعات اور معاملات تھے مگر ایک شب اس وقت جب تقریباً قلعہ کی تمام آبادی محو خواب تھی، قلعہ دار مروان لنگ فیصل پر بھانکتا ہوا دکھائی دیا۔ اسے چراغ جلتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ امیرزنگی کا لشکر جمعیہ کی حدود میں داخل ہو کر بڑی تیزی سے قلعہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مروان لنگ نے اس خبر کو عام نہیں ہونے دیا کہ بدامنی نہ پیدا ہو جائے۔ اس نے قلعہ کے تمام دروازے اسی وقت بند کر دیے اور مشہور کرایا کہ چند بد معاشوں کی گرفتاری کے لئے گھر گھر تلاشی ہوگی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شریف لوگ گھروں میں پابند ہوئے اور آوارہ لوگ محفوظ پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔

صبح کو راز کھلا کہ قلعہ کا محاصرہ کر لیا گیا ہے۔ فیصل کے بھائیوں پر تیز انداز بھائے گئے تھے اور تیل کھولنے کے لئے کڑھاؤ چڑھے ہوئے تھے۔ امیرزنگی نے ایک بار پھر اپنی جنگی حکمت عملی سے جمعیہ پر نصف فتح حاصل کر لی تھی موصل سے باشر اور قلعہ جمعیہ

قلعہ جمعیہ تک ہر ایک کو یہی معلوم تھا کہ امیر عماد الدین زنگی کا لشکر آہستہ آہستہ قتل باشر کی طرف جا رہا ہے لیکن امیر زنگی نے موصل سے دو منزل آگے بڑھنے کے بعد اپنے لشکر کو ایک ایسے جنگل میں پوشیدہ کر دیا جہاں تک لوگوں کا مشکل سے گزر ہوتا تھا پھر وہ دن کے بجائے رات میں سفر کرتا ہوا یہ عظیم لشکر قتل باشر سے صرف ایک منزل پر پہنچے اب لشکر کو پوشیدہ رکھنا مشکل تھا امیر زنگی نے دن کے وقت جمعیہ کی طرف کوچ کیا اور رات ہونے پر قلعہ کی فصیلوں تک پہنچ گیا امیر نے آتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔

اس ناگہانی مصیبت نے قلعہ والوں کی عقل ٹھکانے لگا دی۔ موت سامنے دیکھی تو دشمنوں کے دل خود بخود صاف ہو گئے۔ قلعہ دار مروان لنگ کے دل میں ہلوکش کی بارے میں جو شکوک تھے وہ ختم ہو گئے۔ امروزہ اور جبار نے بھی اپنے دل صاف کر لئے اور سب پانچ شیر و شکر ہو گئے۔ قلعہ میں گھر جانے سے ہر شخص پریشان تھا سوائے ہلوکش اور جبار کے۔ ہلوکش کو تقدیر نے ایک سہرا موقعہ عطا کیا تھا۔ کہ اگر چاہے تو وہ امیر زنگی کے خیمے تک پہنچ سکتا ہے۔ جبار کے لئے بھی یہ محاصرہ ایک زریں موقعہ تھا۔ وہ اپنا عہد پورا کر کے امروزہ سے شادی کر سکتا تھا۔ دوسری شب ہلوکش اور جبار میں اس معاملہ پر تمام رات گفتگو ہوتی رہی۔ جبار اس مسئلہ میں امروزہ کا تعاون بھی حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن ہلوکش نے اسے منع کیا۔ اس نے جبار سے کہا کہ گامیابی کی صورت میں تو امروزہ اس کی ہو ہی جائے گی اور اگر اس نے امروزہ کو اپنے ارادے سے آگاہ نہ کیا اور بد قسمتی سے وہ ناکام ہو گیا تو اس کی شرم رہ جائے گی اور امروزہ کی نظر میں وہ ایک بہادر انسان کی حیثیت سے ہمیشہ محترم سمجھا جائے گا۔ ہلوکش نے اپنے منصوبہ سے قلعہ دار مروان لنگ کو بھی آگاہ نہیں کیا۔ ہلوکش حاکموں اور شاہوں کی ٹون مزاحیہ اچھی طرح جانتا تھا یہ لوگ خوش ہوں تو مخالف کی گالیاں کھا کے بھی ہنستے ہیں ورنہ دوستوں کو بلاوجہ سولی پر بھی چڑھا دیتے ہیں۔ ہلوکش کو یہی خطرہ تھا کہ اگر امیر زنگی اور قلعہ دار میں صلح ہو گئی تو مروان لنگ اسے گرفتار کر کے امیر زنگی کے حضور میں پیش کر دے گا۔ ہلوکش نے مروان لنگ سے ملنا جلنا بالکل بند کر دیا۔ مروان لنگ کو اپنی پڑی ہوئی تھی۔ اسے کہاں اتنی فرصت تھی کہ ہلوکش کو تلاش کراتا۔

قلعہ کا محاصرہ طویل کھینچتا جا رہا تھا۔ امیر زنگی حسب دستور اپنے ایک بیٹے نور الدین زنگی اور سردار شیر کوہ کو اپنے ساتھ لایا تھا چھوٹے بیٹے قطب الدین۔ مودود کو وہ اس دفعہ موصل ہی میں چھوڑ آیا تھا امیر زنگی کا ہمیشہ سے یہ طریقہ رہا تھا کہ وہ رات کے وقت اپنی خواہگاہ یا میدان جنگ میں خیمے کے گرد اپنے با اعتماد غلاموں کا پہرہ لگاتا تھا ان غلاموں میں ترکی، ارمنی اور رومی نسل کے لوگ شامل ہوتے تھے لیکن جس وقت سے امیر کا اعتماد خواجہ سرا ہلوکش پر سے اٹھا تھا اس نے اپنی حفاظت کے انتظامات میں کچھ تبدیل کر دی

تھی۔ اب اس کے محافظ تو وہی با اعتماد غلام ہوتے تھے لیکن ان پر امیر اپنا ایک با اعتماد سردار یا شہزادہ بطور حاکم مقرر کرتا تھا۔ چنانچہ نئے انتظامات کے تحت قلعہ جمعیہ کے محاصرے کے وقت سردار شیر کوہ اور شہزادہ نور الدین زنگی باری باری سے امیر کے محافظوں کے حاکم ہوتے۔ اس طرح غلاموں کو ہر وقت شیر کوہ اور شہزادہ کا دھڑکا لگا رہتا اور وہ پوری رات جاگ کے امیر زنگی کے خیمے کی حفاظت کرتے تھے۔

ہلوکش اور جبار اپنے مکروہ منصوبہ کی تکمیل کے لئے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ ہلوکش روز رات کے وقت قلعہ سے گندرا پانی نکلنے والے راستے کے ذریعہ باہر نکلتا اور اندھیرے کا فائدہ اٹھا کے امیر زنگی کے خیموں تک پہنچ جاتا۔ امیر زنگی کے خیمے کے محافظ سوائے چند کے تمام پرانے ہی غلام تھے یہ غلام نہ صرف ہلوکش کے دوست تھے بلکہ ہلوکش کے ماتحت بھی رہ چکے تھے چنانچہ رات کا بیشتر حصہ ہلوکش غلاموں کے خیموں میں گذارتا اور صبح ہونے سے پہلے قلعہ میں واپس چلا جاتا۔ روز رات کو ہلوکش اور اس کے احباب ایک نیا منصوبہ بناتے مگر صبح ہونے سے پہلے اس کا خاتمہ ہو جاتا ان منصوبوں کے خاتمہ کی اصل وجہ شہزادہ نور الدین اور سردار شیر کوہ تھے۔ ہر رات ان دو میں اس ایک ان غلاموں کا حاکم ہوتا اور اس کی موجودگی میں غلام بے بس رہتے اور کوئی غلط قدم نہ اٹھا پاتے۔

لیکن شدنی اور ناگہانی پر کس کا اختیار ہے انسان امیر ہو یا غریب وہ کتنا ہی سر پہنچے۔ انتظامات کرے مگر ہونے والی بات ہو کے رہتی ہے۔ شہزادہ نور الدین زنگی اگرچہ ایک گہرو جوان تھا لیکن روز روز کی شب بیداری نے اس پر اثر کیا۔ انسان اگر شب بیداری میں عبادت کر لے تو اللہ اس کی مدد کرتا ہے لیکن نور الدین زنگی کو ہر دوسری رات کو باپ کے خیمے پر چوس کھڑا ہونا پڑتا تھا وہ اس طرح کے کام کا عادی نہ تھا اس لئے پیار پڑ گیا۔ شیر کوہ بہت پریشان ہوا۔ میدان جنگ میں شہزادہ کا پیار ہونا محاصرہ پر اثر ڈال سکتا تھا۔ شہزادہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیماری کی خبر امیر موصل کو پہنچائی جائے اس کی رات کی ڈیوٹی بھی شیر کوہ نے سنبھال لی شہزادہ دن بھر خود کو سنبھالے رکھتا اور باپ پر اپنی بیماری کو ظاہر نہ ہونے دیتا۔ شیر کوہ اور شہزادے نے تمام لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ شہزادے کی بیماری کی اطلاع امیر کو نہ ہونے پائے۔ اس طرح سوائے امیر کے اور تمام لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سردار شیر کوہ ہر رات امیر زنگی کے خیمے پر جاگ جاگ کے سویرا کرتا ہے۔

شیر کوہ نے شہزادے نور الدین کو آرام دینے کا یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جب نصف شب کے قریب امیر زنگی سونے کے لئے خیمے کے اندر چلا جاتا تو شیر کوہ شہزادے کو اشارہ کر دیتا کہ وہ بھی اپنے خیمے میں جا کے سو جائے اور شہزادے کو اس طرح آرام مل جاتا تھا ایسا ہر دوسری شب کو ہوتا تھا۔ اس انتظام میں جمعرات کو ذرا سا فرق پڑتا تھا وہ اس طرح کہ اس رات کے لئے امیر کا حکم تھا کہ شیر کوہ پورے قلعہ کا چکر لگائے ایک روایت یہ بھی

شہزادہ نور الدین زنگی مطمئن ہو کر اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا بعض اوقات بڑے عجیب و غریب واقعات پیش آتے ہیں مشہور ہے کہ جوئیس سیزر کو اس کے قتل سے کچھ دن پہلے پچ بازار میں ایک نجومی نے روک کر اسے قتل سے آگاہ کیا تھا۔ اور قتل کی تاریخ بھی بتا دی تھی لیکن جوئیس سیزر نے اسے نہیں مایا اور وہاں تھا کچھ اسی قسم کا واقعہ اس وقت بھی پیش آیا تھا۔ شہزادہ نور الدین زنگی اپنے خیمہ پر پہنچا تو اس کے ملازم خاص نے بڑے گھبرائے لہجے میں پوچھا۔ ”آقا امیر محترم خیریت سے تو ہیں؟“۔

اس سے فارغ ہو کر وہ باقی دو کی طرف بڑھا جو قلعہ کی طرف بھاگ رہے تھے ان کی قریب پہنچا تو ایک نقاب پوش نے دوسرے سے کہا ”امروزیہ تم نکل جاؤ میں اسے روکتا ہوں۔“

امروزیہ تو نکل گئی مگر شیر کوہ کی تلوار پیغام اجل بن کے نقاب پوش پر گری اور وہ واصل جہنم ہوا یہ نمک حرام جبار تھا۔ ہلو کشی پہلے مارا جا چکا تھا۔ قاتلوں میں سے صرف امروزیہ نے اندھیرے کا فائدہ اٹھایا اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

شیر کوہ نے واپس آ کر دیکھا خیے میں امیر کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی اور کوئی وہاں موجود نہیں۔ اسی وقت شیر کوہ کے غلام نے بتایا کہ شہزادے کے خیے میں نیا امیر چننا جا رہا ہے۔“

شیر کوہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔“

امیر عماد الدین زنگی کی شہادت کی خبر پورے مشرق وسطیٰ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی رہا کا فاتح اگرچہ ابدی نیند سو گیا تھا۔ لیکن اس نے ایک ایسی سلطنت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ جس بنیاد پر اس کے بیٹے نور الدین زنگی اور اس کے بعد صلاح الدین ایوبی نے ایک ایسی مضبوط سلطنت قائم کی جس کی سرحدیں مصر اور شمالی افریقہ تک پہنچ گئیں۔

قارئین کرام۔ ناول فاتح رہا اختتام پذیر ہوا۔ اگر آپ اس سلسلہ کے آگے کے واقعات مطالعہ کرنا چاہیں تو میرے دو اور ناول نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی طلب فرمائیے جو چھپ کر تقریباً تیار ہو چکے ہیں۔

آپ کا

الماس (ایم۔ اے۔)

مارچ ۱۹۹۳ء